مسلمانوں کا
نظامِ تعلیم و تربیت

سید مناظر احسن گیلانی

مسلمانوں کا
نظامِ تعلیم وتربیت

سید مناظر احسن گیلانی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

297.4 Gilani, Sayyid Manazar Ahsan
Muslmaanon Ka Nazaam-i Taleem-o Tarbiat/ Sayyid Manazar Ahsan Gilani.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2008.
600pp.
1. History - Islam - Education.
I. Title.

2008
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-2123-4

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جس میں نہایت تحقیق وتفصیل سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنانے کے بعد اس ملک کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کی کیا خصوصیتیں تھیں اور وہ کتنا دلآویز اور دلپذیر اور اس وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے کس قدر مکمل تھا' اسی کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تعلیم کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار معرکتہ آلاراء مباحث آگئے ہیں۔

تالیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ؒ

عرضِ حال

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ان چند گنے چنے علماء میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، مولانا موصوف نے جو کتاب بھی لکھی، اس میں معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آئے گا، ترتیب وتہذیب پر کبھی کوئی خاص توجہ نہیں کی، مگر نتائج کے اخذ کرنے اور ایک واقعہ سے دسیوں استدلال قائم کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔

جیسا کہ خود حضرت گیلانی نے اپنی اسی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ چار پانچ صفحہ کا مضمون لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تھا، چھٹی کے دن تھے۔ پھر کیا تھا دماغ میں معلومات کا خزانہ محفوظ ہی تھا، قلم کو نہیں روکا اور صرف بیس دن میں اس سائز پر یہ دو جلدیں تیار ہو گئیں، اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا رحمتہ اللہ علیہ کس بلا کے لکھنے والے تھے۔

مسودہ جب پریس کو دینے کا وقت آیا، تو اس قدر اطمینان حاصل نہ تھا کہ کتاب پر نظر ثانی کرتے، یا ابواب اور عنوان قائم کرتے، حد یہ ہے کہ فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی نہ کر سکے، چوں کہ حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ جس دور کے پروردہ تھے، اس دور میں فارسی زبان کوئی نامانوس زبان نہ تھی، اس لیے اور بھی ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، چنانچہ اسی حال میں یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔

اِدھر یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، ندوۃ المصنفین کے بانی اور ناظم حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ کو تقاضے سننے پڑتے تھے، مفتی صاحب موصوف نے جب اس کتاب کے جدید ایڈیشن کا ارادہ کیا، تو خیال آیا کہ عنوانات کے نہ ہونے سے پڑھنے والا تکان محسوس کرتا ہے اور مسلسل عبارت دیکھ کر پڑھنے والا اکتا سا جاتا ہے، دوسرے فارسی عبارتوں کا ترجمہ نہ ہونے سے بہت سے اہل علم بھی اس لطف سے محروم رہتے ہیں، جو اس طرح کی کتابوں سے حاصل ہونا چاہیے، اس لیے انہوں نے اس کمی کی تلافی ضروری سمجھی۔

اس اہم کام کے لیے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی نظر خاکسار پر پڑی، چنانچہ فرمایا یہ کام تم سے ہی ہو سکتا ہے، ہمت کرو، میں نے جواب دیا، کتاب بھجوا دیں، اپنی حد تک جو کچھ کر سکتا ہوں، اس سے دریغ نہیں کروں گا، چنانچہ کتاب آئی اور خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا گیا، یہ پہلی جلد آپ کے سامنے ہے، جس پر پانچ سو سے زیادہ عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی بڑھایا گیا ہے، جو پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ آپ حضرت اچھی طرح

جانتے ہیں کہ میرے پاس تھوڑے بہت شوق و ذوق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے حکم کی تعمیل، پھر حضرت سید گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے قلبی عقیدت و محبت، بس اسی نے اس جرأت پر مجبور کیا، ورنہ سچ یہ ہے کہ میرے بس سے یہ بات باہر تھی۔

حضرت گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل عبارت کا ٹکڑے کر کے عنوان لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس لیے غلطیوں کا امکان ہے، اسی طرح ترجمہ میں بھی بعض جگہ بڑی دقتیں پیش آئیں، بہر حال اللہ تعالیٰ میری یہ حقیر خدمت قبول فرمائیں اور اسے فلاح دارین کا ذریعہ بنائیں۔

ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ اگر عنوانات یا ترجمہ کے سلسلہ میں کوئی ناہمواری اور خامی نظر آئے، تو اسے خاکسار کی طرف منسوب کریں، مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا دامن اس سے قطعاً پاک و صاف ہے۔

الہ العالمین! تو جانتا ہے، کہ ایک ایسے بے مایہ انسان نے اس اہم کام کی ہمت کی ہے، جسے تہی دامنی کا ہر آن احساس ہے، اب اس کی عزت و آبرو تیرے ہاتھ ہے۔ ''مخمل میں ٹاٹ کا پیوند'' سنتا آ رہا تھا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ اس گناہ کا ارتکاب خود کرنا ہوگا، بہر حال اس بے جا جرأت کا اعتراف ہے، مگر تیرے فضل و کرم سے ایک لمحہ بھی مایوس نہیں، پروردگار عالم! اپنے خاص فضل و کرم سے علم و عمل کی دولت سے بہرہ ور فرما دے اور قلب و دماغ کو جلا بخش دے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

آخر میں اپنے ان اساتذہ کرام اور بزرگوں کی خدمت میں ہدیہ عقیدت و محبت پیش کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، جن کی توجہ کی بدولت اس لائق بھی ہو سکا، دعا ہے کہ اللہ ان میں سے جو زندہ ہیں ان کا سایہ تادیر قائم رکھے اور جو اللہ کو پیارے ہو چکے ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔ یارب العالمین۔

طالب دعا: محمد ظفیر اللہ غفرلہ، مفتاحی پورہ نوڈیہاوی

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند۔ 10 محرم الحرام 1380ھ

فہرستِ مضامین

فراہمی کتب

خطاط اور نقل نویس

تعلیمی مضامین

ہندوستانی نصابِ تعلیم پر ایک نظر

ہندوستان اور معقولات

معاشی انقلاب کا نتیجہ

درسِ حدیث کی اصلاح

ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ

قدیم نصاب کی خصوصیات اور اس کے نتائج

قدیم علماء تاریخ کی روشنی میں

جماعت بندی

ہندی تصوف اور ہندوستانی صوفیا

خواجگانِ چشت کا محورِ عمل

علم کی تعلیمی شکل خواجگانِ چشت میں

خاتمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

1857ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کر لیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام اپنے قومی خصائص و روایات اور ملی شعائر و علامات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیتی ہیں، بلکہ ایک مدت تک عمل تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ ان سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اب ان کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلیدی سرمایہ افتخار رہ جاتی ہے۔ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان ارباب فکر وعلم نے اس خطرہ کا اسی وقت احساس کر لیا اور اس کا سدباب کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان ارباب فکر کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، کیونکہ سیاسی طاقت وقوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب ومحکوم ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہ سکتے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود ارباب فکر میں دو طبقے ہو گئے۔

قدیم نصاب درس کی طرف توجہ

ایک طبقہ جو علماء کرام کا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصابِ درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعہ دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق بعض اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج کل عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ گروہ علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے۔

طبقہ متجددین اور اس کا نظریہ

اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا' یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم وفنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال' وضع قطع اور فکر ودماغ کے اعتبار سے علماء کے گروہ کی ضد ہیں۔

دوطرح کی تعلیمی درسگاہیں

بہرحال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک قدیم' دوسری جدید۔ ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں۔ تعلیم جدید کی درس گاہ ''اسکول اور کالج'' کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام بھی وہی پرانا ''مدرسہ'' رہا۔ اگرچہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور ان کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں' لیکن یہ امر نہایت افسوسناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا' یہ صورتحال ایک عرصہ تک قائم رہی۔

تحریک خلافت اور اس کا اثر

1920ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس تحریک نے علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کردیا اور اب دونوں طبقوں کی باہمی کشمکش اور آویزش خود بخود کم ہونے لگی۔ آپس کے میل جول' باہمی تبادلہ خیالات' وطنی اور ملکی سیاسیات' بین الاقوامی حالات سے واقفیت' ان تمام چیزوں کا ایک نہایت اچھا اثر یہ ہوا کہ ہر طبقہ کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس پیدا ہوگیا۔ اس سلسلہ میں کبھی مسلم یونیورسٹی کے حلقہ سے آواز اٹھی کہ مسلمانوں کو مغرب کی کورانہ تقلید نے ایک نہایت خطرناک راستہ پر ڈال دیا ہے' ان کے نصاب تعلیم میں اسلامیات ودینیات کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیے' اسی طرح علماء کرام کی زبان سے یہ بارہا سننے میں آیا کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم سے قدیم فلسفہ یونان وغیرہ ایسی غیر ضروری چیزوں کو خارج کرکے ان کی جگہ جدید علومِ عصریہ کو شامل کرنا چاہیے۔

چار مرکزی درس گاہیں

مسلم یونیورسٹی کے حلقہ میں اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا تھا اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں جنم لیا اور اُدھر

اصلاح نصاب عربی سے متعلق علمائے کرام کے جو خیالات تھے وہ ندوۃ العلماء کے محسوس پیکر میں ظاہر ہوئے۔ اب اس وقت یہی چار درسگاہیں ہیں جو مسلمانان ہند کی تعلیم کے مرکزی ادارے سمجھے جاتے ہیں' خالص دنیوی درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' خالص دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند' دینی مگر دنیوی درس گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ' دنیوی مگر دینی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

تعلیمی مشکلات اور اُن کے حل کی تلاش

لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حالات میں اب بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانان ہند کی تعلیمی مشکلات کا حل اب تک زعمائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے' بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ضرورت اس شد و مد کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی جتنی کہ اب کی جاتی ہے۔ آئے دن اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں تحریروں اور تقریروں میں گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سب امور کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کا کوئی خاطر خواہ حل دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقبل کے لیے اپنی تعلیم کا خاکہ مرتب کرتے وقت کبھی اپنی گزشتہ تعلیم کا پورا نظام پیش نظر نہیں رکھا اور نہ ان پر یہ حقیقت مخفی نہ رہتی کہ گزشتہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ایک ہی رہا ہے جو علوم دینیہ اور دنیویہ دونوں پر مشتمل ہوتا تھا' علوم دینیہ سے مراد تفسیر و حدیث اور فقہ اور ان کے لوازم و مبادی ہیں اور علوم دنیویہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا ہر زمانہ میں چرچا اور رواج رہا ہے اور جن کا پڑھنا پڑھانا' تہذیبی و تمدنی' اقتصادی اور سیاسی مسائل میں فکری یا عملی طور پر ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی گزشتہ تعلیم کے اس خاکہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر اس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی نظام تعلیم مرتب کریں تو ان کی بہت سی مشکلات اور بہت سے وساوس اور شبہات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب اور اس کی حیثیت

پیش نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) اسلامی ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں' سینکڑوں بلند پایہ محققانہ مقالات اور متعدد علمی اور وقیع تصنیفات آپ کی وسعت نظر اور علوم اسلامیہ و دینیہ میں آپ کی محققانہ بصیرت کی شاہد عدل ہیں' حجم کی موزونیت کے لیے کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے' دوسرا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ آپ کو اس کے لیے کچھ زیادہ دنوں تک زحمت کش انتظار نہیں ہونا پڑے گا' جیسا کہ آپ خود محسوس کریں گے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف نے نہایت جامعیت اور تفصیل سے اپنے مخصوص طرز انشا میں یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں شروع سے لے کر اب تک مسلمانوں کا نظام تعلیم و

تربیت کیا رہا ہے' نصاب تعلیم میں کن کن علوم وفنون کا درس شامل ہوتا تھا۔ طریق تعلیم کیا تھا؟ طلباء کے قیام وطعام کا کیا انتظام ہوتا تھا؟ اساتذہ اور طلباء کے آپس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوتے تھے' عام لوگ اور امراء واعیان ملک ان طلباء کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے' پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس کا بھی کتنا اہتمام ہوتا تھا۔ غرض یہ ہے کہ تعلیم اور تعلّم سے متعلق بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو اور جس پر فاضل مصنف نے سیر حاصل کلام نہ کیا ہو۔ بے شبہ اردو لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس جامعیت سے ہمارے گذشتہ نظام تعلیم و تربیت پر بحث کی گئی ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

6 جمادی الاول 1363ھ

دیباچہ

عجب اتفاق ہے، دار العلوم دیو بند کے مجلّہ شہریہ ''دار العلوم'' کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو، دار العلوم ایک تعلیم ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کر کے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کر کے میں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب ''مآثر الکرام'' کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کار آمد دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھایا، لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا اور میں لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت 750 صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

یہ کیا ہے، کوئی مضمون ہے، مقالہ ہے، کتاب ہے، تجویزوں کا مجموعہ ہے یا تاریخی واقعات کا ذخیرہ، مجھے خود نہیں معلوم، کیا ہے۔ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری اور وہ بھی ایک خاص حال میں، تعلیم کے ابتدائی دن اپنے دیہاتی مستقر گیلانی (بہار) میں گذرے، وہاں سے اُٹھا، راجپوتانہ ٹونک کی ایک معقولی اور منطقی آزاد درس گاہ مولانا برکات احمدؒ کے حلقۂ درس میں پہنچایا گیا، وہاں حدیث پڑھی، شیخ الہند حضرت سیدی والمرشدی مولانا محمود حسنؒ کی صحبت کی سعادت میسر آئی، علامہ کشمیریؒ سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اصغر حسین نیز دیگر اساتذہ کی عنائتیں شاملِ حال رہیں، دیو بند ہی میں دار العلوم کے ماہوار مجلّات، ''القاسم'' و ''الرشید'' کی ادارت، کچھ درس وتدریس کی خدمت انجام دیتا رہا۔ وہاں سے بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خانقاہ مونگیر پہنچا دیا گیا، تقریباً ڈیڑھ سال کے قریب قریب خانقاہی زندگی میں ندوۃ العلمائی رنگ میں بھی جاری وساری تھا، گذاری، اور مقدر نے بالآخر میرا آخری ٹھکانہ مشرق کی اس جامعہ کو بنایا جس نے پہلی دفعہ مغربی علوم وفنون طور طریقہ رنگ ڈھنگ میں مشرقیت کے اجزاء وعناصر شریک کیے ہیں۔ بیس سال سے زیادہ مدت گذری جب سے زیرِ ظلِ عافیت سلطان العلوم، سلطان الشعراء، شاہِ جم جاہ معارف پناہ، مخدوم الملت، محبوب الامۃ، سراج الشرق، وارث السلطنت المغلیہ، شہریار دکن، جلالۃ الملک النواب میر عثمان علی خاں بہادر ایدہ اللہ بنصرہ العزیز خلد اللہ ملکہ اسی جامعہ میں معلم الصبیانی کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ خالص مشرقی مدارس کی تعلیم کے بعد مغربی طرز کی اس جامعہ کے ہر شعبہ میں میرے عملی اشتراک نے خیالات کا ایک سلسلہ تعلیم کے متعلق پیدا کر دیا ہے، خود نہ مجھ میں عزم ہے نہ ارادہ، عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہوں، اور عمر بھی جو کام کرنے کی ہو سکتی ہے، گزر چکی، منتشر طریقہ سے برسوں کے یہی مدفونہ خیالات

آپ کو اِن اوراق میں بکھرے ہوئے نظر آئیں گے، اسی لیے اب اس کتاب کی حیثیت نہ کسی تجویزی مضمون کی باقی رہی اور نہ کسی تحقیقی مقالہ کی، اور سچ تو یہ ہے کہ تجویز ہو یا تحقیق دونوں سے مجھے کوئی خاص لگاؤ ہے بھی نہیں، بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری، ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والوں سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی یہ محنت ہے۔ طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا، اور اسی مسودہ کو پریس میں بھیج رہا ہوں۔ عجلت ہی کی وجہ سے فارسی کے اقتباسی و استدلالی فقرات کا ترجمہ بھی نہ کر سکا، کچھ اس پر بھی اعتماد ہے کہ اُردو پڑھنے والی جماعت ابھی فارسی سے اتنا زیادہ بیگانہ نہیں ہوئی ہے کہ است و بود کے ترجمہ کی بھی حاجت ہو، اسی لیے جہاں جہاں کوئی نادر و ناموس الفاظ آئے ہیں اُن کے معانی لکھ دیئے گئے ہیں، بعض فقرے اگر مشکل تھے تو اُن کا ترجمہ یا حاصل ترجمہ درج کر دیا گیا ہے۔ اس پر بھی اگر لوگوں نے دشواری محسوس کی تو آئندہ اشاعت میں ان شاءاللہ سب کا ترجمہ کر دیا جائے گا، اگرچہ ضخامت کتاب کی بلاوجہ بڑھ جائے گی اور بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ بہر حال جس حال میں کام ہوا ہے، نقائص کا رہ جانا ایسی صورت میں خلافِ توقع نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مواقع میں بے ربطی بھی نظر آئے، ایک تو یونہی میرا دماغ کچھ غیر مربوط سا فطرتاً ہے، اسی کے ساتھ پندرہ بیس دن میں فنی ترتیب آسان بھی نہ تھی، اب تو جو ماحضر ہے پیش ہے، دل صد پارہ کی چند ٹوٹی پھوٹی قاشیں ہیں، شاید کہ ان کا بھی کوئی خریدار نکل آئے کہ ولکل ساقطۃ لاقطۃ پڑھنے والوں سے اتنی التجا ضرور ہے کہ حسبِ ذیل امور کا خصوصی طور پر توجہ کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔

(1) اس وقت ملک میں دو مستقل تعلیمی نظامات کے برخلاف وحدتِ نظام کی جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے اور جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کیا وہ واقعی قابلِ توجہ محلِ نظر و فکر نہیں ہیں؟

(2) وحدتِ تعلیم کے نفاذ سے پہلے عربی کے غیر سرکاری آزاد مدارس میں غیر مقابلاتی صناعات اور معاشی فنون کے اضافہ کا جو مشورہ دیا گیا ہے، وہ کس حد تک قابلِ عمل ہے۔

(3) جامعاتی اقامت خانوں کے فردوسی نظامات کیا ہندوستان طلبہ کے آئندہ معاشی توقعات کی بنیاد پر قابلِ نظرِ ثانی نہیں ہے۔

(4) مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا جو نقشہ خاکسار نے پیش کیا ہے، مروجہ طریقوں کے مقابلہ میں کیا وہ زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

(5) دماغی تنور کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں قلبی تنوم و خوابیدگی کا جو عارضہ پھیل رہا ہے۔ کیا اُس کے نتائج اِس قابل نہیں ہیں کہ اِن کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ چند کلیاتی امور ہیں جنھیں اس کتاب کے مختلف مقامات پر آپ کو ڈھونڈھنا چاہیے۔

اِن کے سوا تصوف اور صوفیاء کے متعلق جن بدگمانیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہی لوگ نہیں جو ان بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں بلکہ روٹھے ہوؤں سے بھی عرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے مخلی بالطبع ہو کر آپ کو واقعات پر غور کرنا چاہیے۔ ان امور کے سوا اصل کتاب میں یا حواشی اور فٹ نوٹس میں جن جزئیات کا موقعہ موقعہ سے ذکر

کرتا چلا آیا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ اِن شاء اللہ مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ ان سے ہوگا۔ خصوصاً اس ملک میں جس کا سب کچھ چھن چکا ہے۔ لے دے کر پچھلوں کا اپنے اگلوں، اُن کی عظمتوں اور کارناموں پر جو تھوڑا بہت ناز باقی تھا، اس پر ڈاکے ڈالے جارہے ہیں، غیروں سے کہلوایا جاتا ہے کہ

''ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک محقق کو (ایسا محقق جس نے ہندوستان کی شاید ہی کبھی صورت دیکھی ہو، بلکہ پیرس کی گلیوں میں ہندوستان کو ڈھونڈھتا رہا) ہاں تو اسی محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب (اسلام) کی بُری طرح مٹی پلید ہوئی۔ (تمدنِ ہند از محقق لیبان صاحب، ص 320)

اور جو اپنے ہیں وہ اسی کو شہادت قرار دے کر تشریح کرتے ہوئے اقرار کرتے ہیں کہ

''اس ملک کی قسمت میں اسلام کے ایسے پیامبر (صوفیاء، علماء) آئے، جو اس کے (یعنی اسلام کے) احکام سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی تو اس پر عامل نہ تھے۔'' (''الفرقان''، شاہ ولی اللہ نمبر)

کتنی مطابق واقعہ توجیہ ہے کہ:

''اللہ کی کتاب عربی زبان ہے، اور یہ خدا کے بندے (ہندوستان میں اسلام کے پیامبر) فارسی لکھتے اور بولتے تھے، عربی [1] سے اُن کو دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔'' (مجلّہ ''الفرقان'')

سب کا خلاصہ آخر میں اِن الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔

''نتیجہ ظاہر ہے، بھارت کی سرزمین پر حجاز سے نکلے ہوئے، نکھرے ہوئے توحیدی مذہب کی مٹی پلید ہوگئی۔''

الغرض اسلام کی مٹی پلید ہوتے ہوئے غریب لیبان نے تو دُور سے دیکھا تھا، وہ بیچارہ خدا جانے اسلام سے بھی واقف ہے یا نہیں، اور ہمارے بزرگوں کو تو وہ کیا جان سکتا ہے، جب ان ہی سے پیدا ہونے والی نسلوں کو اپنے بھارت کی پوتر سرزمین میں یہ نظر آرہا ہے کہ جن سے اُن کو صرف وجود اور وجود کے سارے لوازم ہی نہیں، بلکہ اگر انصاف کریں گے تو نظر آئے گا کہ اُن ہی سے دین بھی ملا ہے اور ایمان بھی، علم بھی اور فضل بھی، وہی اسلام کی مٹی پلید کرنے والوں کی شکل میں دکھائی دے رہے ہیں، اللہ اللہ حکومت کی جادوگری، تیرا کیا کہنا ہے، کہ

ناموسِ چند سالۂ اجدادِ نیک نام
در زیرِ پائے غرب وریسر چش نہادہ ایم

جن صاحب کے مضمون سے میں نے مذکورۂ بالا چند فقرے نقل کیے ہیں، کوئی ناواقف عامی آدمی نہیں، انگریزی درسگاہوں کے بگاڑے ہوئے بھی نہیں، بلکہ ایک مشہور مرکزی اسلامی دارالعلوم کے چند ممتاز شہ پاروں میں آپ کا شمار ہے، اُن کے علم وفضل کا مجھے بھی اعتراف ہے، نیازمندی کا تعلق رکھتا ہوں، اسی لیے تکلیف بھی زیادہ ہوئی، عزیزوں کے اس حال پر جگر پیٹتا ہو، کلیجے کے ٹکڑے اُڑتے ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیجیے، خیال تو کیجیے، ایک اچھے لکھے پڑھے عالم

کے قلم سے جب یہ الفاظ نکلیں کہ ہندوستان میں

"دینِ توحید، ہندوانہ آلودگیوں سے لت پت ہوگیا، اللہ کی کتاب سامنے نہ ہو، تو پھر ہندوانہ عقیدے ویدانت کی دوراز کار موشگافیوں کا اسلامی عقاید میں گھل مل جانا کیا تعجب ہے۔"

کیا تماشے کی بات ہے، دعویٰ خود کرتے ہیں اور دلیل میں پھر اُن ہی آسمانی شہادتوں کو پیش فرماتے ہیں، جو یورپ کے آسمانوں سے نازل ہورہی ہیں، یہ لکھتے ہوئے کہ شہادتیں سن لیجیے، کتنی پاکیزہ شہادت سناتے ہیں، لیبان لکھتا ہے۔

"اگر ہندوستان میں دینِ محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں اور یہاں کے مذہب وعقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے" بلکہ ہندوان سے (مسلمانوں سے) اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا یہ (مسلمان) ہنود ہے۔" (ص 135)

تقریباً نصف صدی بلکہ کچھ زیادہ ہی مدت سے اس قسم کی ناوک اندازیوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ہے جو جاری ہے۔

اس کتاب میں رہ رہ کر ان ہی ٹیسوں اور ہوکوں کی ہچکیاں آپ کو محسوس ہوں گی جو ان ہی تیروں کے زخموں نے مجھ میں پیدا کی ہیں، مجھے رُلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہے تب کراہا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہوگئے ہوں، قابو سے قلم کہیں باہر ہوگیا ہو، اس میں مجھے معاف رکھا جائے گا، میں احسان فراموش ہوتا، اگر جاننے کے باوجود بھی نہ جاننے والوں کے سامنے واقعات کی حقیقی روئداد نہ پیش کرتا۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ نیب۔ بہرحال۔ زدیم برصفِ رنداں وہرچہ باداباد

عبدہ الامھن الجانی المغرور بالامانی

السید مناظر احسن الگیلانی غفر اللہ ولمن ربّاہ حیدرآباد دکن۔ جوار الجامعۃ العثمانیہ

صباح یوم الجمعہ 25 ذیقعدہ 1361ھ مطابق 4 دسمبر 1942ء

حاشیہ

(1) غیر ذمہ دارانہ قلم کی ان بے باکیوں کو ملاحظہ فرمایئے ہندوستانی علماء وصوفیہ کو عربی سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، جن صاحب نے یہ الفاظ لکھے ہیں، کیا وہی بتاسکتے ہیں کہ خود انہوں نے یا ان کے اساتذہ کو جو کچھ بھی عربی آتی ہے، وہ بیرون ہند کے کسی عالم سے سیکھی گئی ہے۔ خیر اس کی تفصیل تو آئندہ آپ کتاب میں پڑھیں گے لیکن سردست میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی ممالک کی زبان عربی ہے، جو فارسی نہیں عربی ہی میں لکھتے اور بولتے ہیں کیا وہاں کے عوام نے اسلام کو اپنی اصلی صورت پر باقی رکھا ہے، مصر ہو یا عراق، شام ہو یا الجیریا، بلکہ خود عرب ہی کا کیا حال ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اسلام اب بھی بسا غنیمت ہے، آج بھی غنیمت ہے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کل بھی غنیمت ہے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کل بھی غنیمت تھا، چند جزئی واقعات سے کلیات بنالینے کی مشق جن اُستادوں نے سکھائی ہے اب اس مشق سے اس کے برعکس بھی تو کام لے سکتے تھے، بجائے مسجد گنی کے ہاتھ سے اس تیشہ سے بیزم شکنی کا بھی تو امکان تھا، فہل من مذکر!

ہندوستان کا علمی ارتقاء

کہنے والے نے کہا تھا اور کتنا سچ کہا تھا۔

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
جی میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں
(عارف مشرق)

نہ ریل تھی، نہ موٹر، نہ تار اور نہ ٹیلی فون، اور نہ امنِ راہ کے یہ بلند بانگ دعوے، لیکن

ملتان سے بہار

''شیخ طاہر جد شیخ عبدالعزیز قدس اللہ اسرار ہما از ولایتِ ملتان رفتہ در بلدۂ بہار رسید (1)'' (مآثر الکرام وغیرہ) شیخ طاہر، شیخ عبدالعزیز قدس سرہ کے دادا شہر ملتان سے چل کر بہار پہنچے۔ یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکر بار کے دادا شیخ طاہر ملتان سے چلتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے، سیکھتے ہوئے بالآخر بہار پہنچ جاتے ہیں اور ''پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود۔'' (اخبار الاخیار، ص 195)۔ ''شیخ بدھ حقانی کی خدمت میں رہ کر علم حاصل کیا۔''

مُلّا موہن بہاری

یوں ہی ''ملا موہن بہاری قدس سرہ کہ نامِ اصلی او محی الدین اسب مولد و منشاء بلدۂ بہار، در نہ وسالگی کلام اللہ حفظ کردو بخدمت پدر خود مُلا عبداللہ (2) کسبِ علوم نمود و در ہفدہ سالگی فاتحۂ فراغ خواند و چندے در وطنِ خود بہ درس و افادہ پرداخت۔ بعد ازاں بہ ملازمت شاہجہان بادشاہ رسید، و بہ تعلیم شاہزادہ محمد اورنگ زیب معین گردید'' (مآثر الکرام۔ ص 43)۔ ''مُلا موہن قدس سرہ جن کا اصلی نام محی الدین ہے، ان کا مولد و منشاء شہر بہار ہے، انہوں نے نو سال کی عمر میں کلام اللہ حفظ کیا اور اپنے والد ماجد مُلا عبداللہ سے علم دینی حاصل کیا اور سترہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی۔ کچھ دنوں اپنے وطن میں ہی درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے، پھر شاہجہاں بادشاہ کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور شاہزادہ محمد اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔''

طلبِ علم کے لیے ملتان سے بہار کا سفر

پڑھنے کے لیے ایک شخص ملتان سے بہار جا رہا ہے اور پڑھانے کے لیے دوسرا بہار سے دلّی آ رہا ہے، یہ تھا آمدورفت کا وہ سلسلہ جس کا تانتا ہند کے اس فراخنائے اعظم میں بندھا ہوا تھا۔ مشرق سے مغرب، مغرب سے مشرق، جنوب سے شمال، شمال سے جنوب، قافلوں پر قافلے تھے جو چلے آ رہے تھے چلے جا رہے تھے تاکہ سیکھا جائے یا سکھایا جائے، پڑھا جائے یا پڑھایا جائے۔ ہزارہا میل مربع سرزمین کی اس وسعت کا اندازہ کیجیے، سوچیے کہ ہر صوبہ، ہر صوبہ کی ہر سرکار، ہر سرکار کے ہر پرگنے میں قضاۃ بھی ہیں، مفتی بھی ہیں، مدرسین بھی ہیں اور صاحبانِ ہدایت وارشاد بھی ہیں۔ کیسا عجب زمانہ اور کیسا دلچسپ تماشا تھا!

آنکھوں دیکھی شہادت

حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں، گویا اپنی آنکھوں دیکھی شہادت پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہندوستان کی عام نہیں خاص اور اعلیٰ تعلیم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

> ''اگرچہ جمیع صوبہ جاتِ ہند بہ وجود حاملانِ علوم تفاخر دارند سیما حصار پائے تخت خلافت (یعنی دلّی) کہ بواسطہ مراجعیت صاحب کمالان ہر قسم در آنجا فراہم آیند واز تراکمِ افکار واجتماع عقولِ اہلِ عصر، کمالاتِ نفسِ ناطقہ راچہ علم عقل ونقلی وجہ غیراں بہ پایہ بالا ترمی رسانند'' (ص 221)
>
> ''اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے ہی جید علماء سے بھرے پڑے ہیں لیکن دلّی کو خصوصیت حاصل ہے، پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے صاحبِ فضل وکمال کا مرجع بنی ہوئی ہے۔ ہر علم وفن کے باکمال علماء موجود ہیں اور علومِ عقلیہ ونقلیہ دونوں کو یہاں عروج حاصل ہے۔''

ان مختصر الفاظ میں اسلامی ہندوستان کے علمی ارتقاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے' ایک ایسے شخص کے قلم سے جو افکار کے اس تراکم اور عقول اہلِ عصر کے اسی اجتماع سے خود بھی مستفید ہو کر علم کو ایک زینہ سے اُٹھا کر دوسرے زینہ تک چڑھانے میں مصروف تھا، اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد چونکہ ''خود پورب'' یعنی بلگرام کے رہنے والے ہیں، ہندوستان کی حد تک اُنہوں نے وہیں پڑھا اور پورب ہی میں سیکھا جو کچھ سیکھا۔ اس لیے جن لوگوں میں خود تھے' مکانی قرب کی وجہ سے اُنہی لوگوں کے معائنہ کا ان کو کافی موقع ملا تھا۔

لفظ پورب کی تحقیق

''سبحۃ المرجان'' میں اَلفُوَارِبہ جو خود ان کا گھڑا ہوا لفظ ہے یعنی فورب (پورب) سے بنایا گیا ہے۔ مراد پورب

کے علماء ہیں۔اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الفواربه جمع الفوربی نسبته الی الفورب معرب پورب بضم الباء الفارسیته و هو ملک وسیع فی الجانب الشرقی من دهلی و عبارة عن ثلاث صوب صوبه اودھ و صوبه الله آباد و صوبه عظیم اباد

''الفواربہ الفوربی لفظ کی جمع ہے یعنی پورب کی طرف جو پورب کا معرب ہے یہ نسبت ہے،اور پورب دلّی سے بجانب مشرق ایک وسیع ملک کا نام ہے۔دراصل پورب کا اطلاق تین صوبوں پر ہوتا ہے۔صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد،صوبہ عظیم آباد (یعنی جواب پٹنہ کے نام سے مشہور ہے)'' الصوبہ دراصل بڑی فراخ محدود زمین کا نام ہے جس میں صوبہ کا دارلامارۃ (کیپٹل) اور دوسرے شہر ہوتے ہیں۔ہر شہر کے ساتھ چند قصبے (پرگنے) اور ہر قصبہ کے حلقہ میں مختلف دیہات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے پرگنوں کی طرف منسوب ہیں۔

پورب کے قصبات اوران کے اجمالی حالات

مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ(3) اس کے بعد پھر فرماتے ہیں:

وقصبات الفورب فی حکم البلدان لانها مشتملة علی ا لعمارات العالیه و علی محلات الشرفاء والنجباء والمشائخ و العلماء وغیرهم من الاقوام المختلفة وارباب الحرف المتنوعة وعلی المساجد و المدارس و الصوامع و مساجد ها معمورة بصلوة الجمعة والجماعات یصح ان یطلق علی القصبة اسم البلدة (ص53)

''دراصل پورب کے قصبات کی حیثیت شہروں کی ہے کیونکہ اونچی اونچی عمارتوں سے عموماً یہ معمور ہیں،اُن میں شرفاء،نجباء،مشائخ (صوفیا) علماء کے مستقل محلے ہیں جن کا تعلق مختلف قوموں سے ہے۔ان قصبوں میں مختلف پیشوں اور دستکاریوں کے جاننے والے بھی رہتے ہیں۔ان میں مساجد بھی ہیں مدارس بھی ہیں خانقاہیں بھی ہیں۔ان قصبوں کی مسجدیں جمعہ اور جماعت سے ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ان قصبوں کو بجائے قصبہ کے شہر کہنا زیادہ درست ہے۔''

ہندوستان کا شیراز اوراس کے علمی چرچے

یہ بیان تو فورب اور فواربہ کے متعلق ''سبحۃ المرجان'' میں ہے۔''مآثر الکرام'' میں اسی پورب کے متعلق شاہجہاں بادشاہ اسلام انار اللہ برہانہ کے مشہور شاہانہ فقرہ ''پورب شیراز مملک ماست'' کونقل فرمانے کے بعد ہندوستان کے صرف اس ایک حصہ پورب کے علمی چرچوں کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ اس علاقہ میں:

''بہ فاصلہ پنج کردہ نہایت دہ کردہ(4) تخمیناً آبادی شرفاء نجباداشت کہ از سلاطین وحکام و طائف وزمین مدد معاش داشتہ اند،ومساجد ومدارس وخانقاہات بنانہادہ ومدرسان عصر در ہرجا

ابواب علم برروئے دانش پژوہاں کشادہ وصدائے "اطلبوا العلم" دردادہ۔"

"پانچ سے لے کر دس کردہ تک شرفاء کی آبادی ہے جن کو سلاطین وحکام کی طرف سے وظیفہ اور زمین وجائیداد حاصل ہے اور مساجد، مدارس اور خانقاہیں بنی ہوئی ہیں اور ہر جگہ مایۂ ناز مدرسین نے مسندِ علم وفن بچھا رکھی ہے، اور "اطلبوا العلم" (طلب علم) کی صدا دے رکھی ہے۔"

طلبِ علم کا خوشگوار نقشہ

پھر "اطلبوا العلم" کے اس صلائے عام کی تعمیل جس شکل میں ہوتی تھی اس کی تصویر مولانا ہی کے قلم نے یہ کھینچی ہے:

"طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا موافقت دست وہد بہ تحصیل مشغول می شوند۔"

"طلبہ ایک شہر سے دوسرے شہر فوج در فوج جاتے آتے رہتے ہیں اور جہاں راس آتا ہے تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔"

ان طلبہ کے طعام وقیام کے نظم کی جو صورت تھی اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند خدمت ایں جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند۔"(5)

"ہر آبادی کے مخیّر حضرات طلبہ کی دیکھ بھال رکھتے ہیں اور ان کی خدمت کو اپنے لیے بڑی سعادت جانتے ہیں۔"

گویا آج بورڈنگ ہاؤس اور اقامت خانوں کے کپکپا دینے والے مصارف سے تعلیم کے جس مسئلہ کو حل کیا جا رہا ہے، پڑھنے والے بچوں کے ماں باپ جن مصارف کی تکمیل میں دیوانے بنے ہوئے ہیں، جائیدادوں کو بیچ بیچ کر بلکہ بسا اوقات ماں اور بہنوں کے زیوروں کو بھی فروخت کر کر کے جس مقصد کو آج ہندوستان میں حاصل کیا جا رہا ہے، صرف دو ڈھائی صدی پہلے یہ مسئلہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اُسے سوچا جائے بلکہ ہر آبادی کے باشندوں کا باورچی خانہ علم کے پیاسوں کا باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور ان کے مکانات، محلّہ کی مسجدوں کے حجرے، ان طلبہ کے لیے اقامت خانوں کا کام دے رہے تھے، بڑے بڑے شہروں ہی کی حالت یہ نہ تھی بلکہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی چھوٹی سی کتاب "مآثر الکرام" میں جن بزرگوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان کے جو حالات درج کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام، کوڑا، سہالی، کچند، قنوج، دیوہ، مسولی، خیرآباد وغیرہ جیسے قصبات میں بھی فری لاجنگ اور فری بورڈنگ کا یہ نظم قائم تھا اور اسی پر دلّی، لکھنؤ، سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہار، عظیم آباد، احمد آباد، بریلی وغیرہ شہروں کو قیاس کرنا چاہیے۔

طلبہ کے قیام کا نظم

یہ تو صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں مدارس کے قیام کا رواج مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں نہ تھا "ہندوستان کے اسلامی مدارس" کے عنوان سے میرے مرحوم دوست ابوالحسنات ندوی (رُکن دارالمصنفین) نے کافی مواد تاریخوں سے مدارس کے متعلق جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کا جو مطلب ہے اس کا جواب آپ کو آئندہ اوراق میں ملے گا۔

لیکن اس کے ساتھ سچی بات یہی ہے کہ زیادہ تر اس ملک میں مساجد اور شہروں یا قریٰ وقصبات میں امراء کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں سے بھی مدرسہ کا کام عموماً لیا جاتا تھا۔ میر طفیل محمد بلگرامی جنھوں نے قریب "ہفتاد سال برمسند تدریس و بہ احیاءِ علوم پرداختند" یعنی ستر سال تک بلگرام میں درس و تدریس کا بازار جنھوں نے پوری قوت کے ساتھ گرم رکھا تھا، بقول مولانا آزاد "طلبہ را از حضیض شاگردی بہ اوج اُستادی رسانیدند" طلبہ کو شاگردی کی پستی سے نکال کر استادی کی بلندی پر پہنچاتے ہیں۔

علمی مدارس اور ان کی ذمہ داری

لیکن طلبہ کی ایک دنیا کو شاگردی کی پستی سے اُٹھا کر جو اُستادی کی بلندیوں تک پہنچا رہا تھا، کیا اس کے مدرسہ کی تعمیر کے لیے چندوں کی فہرست کھولی گئی تھی اور شہر شہر، گاؤں گاؤں میں سفر اور دوڑائے گئے تھے؟ مولانا آزاد جو یکے از تلامذہ میر طفیل محمد ہیں، خود اپنی چشم دید گواہی ان الفاظ میں قلم بند فرماتے ہیں کہ:

"بعد از تکمیل تحصیل در بلگرام طرحِ اقامت ریختند در اوائل بہ خانہ سید محمد فیض زمیندار کہ از اعیان سادات بلگرام است اقامت داشتند۔"

"علم وفن کی تکمیل کے بعد بلگرام میں رہ پڑے۔ ابتدا میں سید محمد فیض صاحب زمیندار کے دولت کدہ پر اقامت پذیر ہوئے جو بلگرام کے معزز سادات میں ہیں۔"

یعنی سید محمد فیض زمیندار کی ڈیوڑھی ان کا پہلا مدرسہ تھا، اور اس کے بعد۔

"قریب سی سال تا دمِ واپسیں در محلّہ میدان پورہ در دیوان خانہ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل نوراللہ مرقدہ سکونت ورزیدند۔"

"تیس سال کے لگ بھگ یعنی اپنی وفات تک محلّہ میدان پورہ میں علامہ میر عبدالجلیل نوراللہ مرقدہ کے دیوان خانہ میں سکونت پذیر رہے۔"

مدارس کی علمی حیثیت

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ میر طفیل محمد صاحب "گلستان" اور "بوستان" کے پڑھانے والے میاں جی تھے۔ خود

مولانا غلام علی کا بیان ہے:

''کتب درسی از ہدایت تا نہایت بہ جناب استاد المحققین میر طفیل محمد رَوَّح اللہ روحہ گذرانیدم۔''

''میں نے درسی کتابیں اول سے آخر تک استاد المحققین میر طفیل محمد روح اللہ روحہ سے پڑھیں۔''

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کا حلقۂ درس میں حسّان الہند مولانا غلام علی جیسے یگانہ وفرزانہ علامہ دہر نے اول سے آخر تک درسی کتابیں تمام کی ہوں اس کے تعلیمی نصاب کا کیا پیمانہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ستر سالہ مدرسہ کہاں قائم رہا۔ بلگرام کے ایک زمیندار اور ایک رئیس عالم کے دیوان خانہ میں (6)۔

میر طفیل محمد کی جلالت شان

میر صاحب کی علمی جلالتِ شان کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ مولانا آزاد ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

''مجمع البحرین معقول ومنقول ومطلع النیرین فروع واصول۔''

''معقول ومنقول کے مجمع البحرین اور اصول وفروع کے مطلع النیرین۔''

بلکہ اپنی ساری کتاب میں مولانا آزاد نے استاد المحققین کے لقب سے ان کو ملقب کیا ہے۔ شاگردوں کا تذکرہ تقریباً بیسیوں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ میر صاحب کے اساتذہ میں قاضی علیم اللہ گپندوی اور سید قطب الدین شمس آبادی کا بھی نام ہے۔ ''سلم'' و ''مسلم'' کے مصنف مُلّا محب اللہ بہاری کے اُستاد بھی قطب الدین شمس آبادی ہیں۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ مُلّا محب اللہ بہاری اور میر طفیل محمد صاحب دونوں ایک ہی دسترخوان کے زلہ رباؤں میں ہیں۔ اور میر طفیل محمد کے متعلق تو مجھے تعارف کے اتنے الفاظ بھی لکھنے پڑے، ہندوستان کی طرف سے اسلام کی خدمت کے لیے چند مایہ ناز گرامی ہستیاں جو پیش ہوئی ہیں، ان میں حضرت ملک العلماء، بحر العلوم نور اللہ مرقدہ بھی ہیں۔ آپ کا اصلی نام عبدالعلی تھا، درس نظامیہ جس نام کی طرف منسوب ہے یعنی مُلّا نظام الدین فرنگی محلی کے آپ اکلوتے نور چشم ہیں، علماء ہند میں جن لوگوں کی کتابیں اسلامی ممالک مثلاً مصر وغیرہ میں مقبول اور مطبوع ہوئیں ان میں مولانا بحر العلوم بھی ہیں، شمال خصوصاً جنوبی ہند میں علم کی روشنی بہت کچھ آپ کی تدریسی کوششوں کی رہینِ منت ہے، ان شاء اللہ اسی کتاب میں آپ کے جستہ جستہ حالات آئندہ بھی ملیں گے، اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ ان ہی ملک العلماء، بحر العلوم کی درسگاہ، اس زمانے میں جب شاہجہاں پور میں آپ کا قیام تھا، جہاں قائم تھی۔ صاحب ''اغصان اربعہ'' نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ شاہجہاں پور کے نواب عبداللہ نے

''اندرون قلعہ در حویلی خود جائے داد و تا حیات حافظ رحمت خاں ہمانجا سکونت داشتہ بہ

تدریس علوم ومطالعہ کتب اشتغال داشت ودر فضلائے عصر تام وسربرآوردہ وصدہا مردم در خدمت اوودراں دیار فاتحہ فراغ خواندہ دراطراف منتشر گشتند۔" (ص 123)

دیکھا آپ نے ایک امیر کی حویلی کے دروازے پر بحرالعلوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور مشرق ومغرب، شمال وجنوب کے لوگ اس کی موجوں سے سیراب ہو رہے تھے۔

اساتذہ کا حال

اساتذہ کا یہ گروہ جو ملک کے قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں میں پھیلا ہوا تھا، کیا کسی سے تنخواہ وغیرہ طے کرنے کے بعد کسی جگہ بیٹھتا تھا، آج اس کو کون باور کر سکتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے مولانا نورالحق "تیسیر القاری بخاری" کی جنہوں نے فارسی زبان میں شرح فرمائی ہے اور متعدد جلدوں میں نواب محمد علی مرحوم (7) (امیر بنارس) ورئیس ٹونک نے کثیر مصارف سے اسے طبع بھی کرایا تھا۔

ان ہی مولانا نورالحق کے ایک شاگرد سید محمد مبارک محدث بلگرامیؒ کے حالات میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے کہ ان کے وہی استاد المحققین استاد یعنی مولانا طفیل محمد بلگرامی نے اپنا یہ چشم دید واقعہ مولانا آزاد سے بیان کیا:

"روزے شرف خدمت حضرت میر (مبارک) دریافتم برائے تہیۂ وضو برخاستہ بود ناگاہ برزمین اُفتاد بہ سرعت تمام شتافتہ نزدیک رفتم بعد ساعتے افاقت آمد۔"

"ایک دن حضرت میر مبارک کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ حضرت موصوف وضو کے اہتمام کے لیے اٹھے تھے کہ اچانک گر گئے، میں لپک کر تیزی سے نزدیک گیا، ایک گھنٹہ بعد افاقہ ہوا۔"

اساتذہ کا فاقہ اور ان کی خودداری

لیکن جانتے ہو کہ میر مبارک محدث بے ہوش ہو کر کیوں گر پڑے تھے۔ میر طفیل محمد ہی کی زبانی اس کا افسانہ سنیے:

"کیفیت استفسار کردم، بعد مبالغہ بسیار فرمود"

"میں نے وجہ دریافت کی، بہت دیر تک کہنے سننے سے فرمایا۔"

مبالغہ بسیار کے بعد کیا فرمایا:

"سہ روز است کو مطلقاً از جنس غذا میسر نیامد۔"

"تین دن گزر گئے اور اس عرصہ میں غذا بالکل نہ مل سکی۔"

گویا تین دن سے کھیل اُڑ کر مُنہ میں میر صاحب کے نہیں پڑی تھی۔ پھر کیا اس فاقہ کے بعد انہوں نے چندہ کا

اعلان کیا تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں:

''دریں سہ روز بایچ کس لب بہ اظہار نہ کشود ودام نہ گرفت۔''

''ان تینوں دنوں میں نہ کسی کے سامنے لب کھولا اور نہ قرض ہی لیا۔''

علم کی غیرت کا یہ حال ہے اور دین کی پاسداری کا قصہ اس سے بھی آگے بڑھا ہوا۔ میر طفیل محمد فرماتے ہیں کہ:

''مرا بسیار رقت دست داد فی الفور از آنجا بہ مکان خویش رفتم وطعام شیریں کہ مرغوب ایشاں مہیا ساختہ حاضر آوردم اول بشاشتِ بسیار ظاہر نمود ودعا ہا کرد۔''

''مجھے بہت ترس آیا، فوراً وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر پہنچا اور شیریں کھانا جو آپ کو مرغوب تھا تیار کر کے خدمت بابرکت میں حاضر کیا، پہلے خوشی کا اظہار کیا اور دعائیں دیں۔''

مگر یہ تو اپنے سعادت مند شاگرد کی ہمت افزائی کے لیے بشاشت تھی، دینی ذمہ داریوں کا احساس اب بیدار ہوتا ہے اور فرماتے ہیں۔ تین دن بھوکے بیہوش ہو کر گرنے والے میر مبارک فرماتے ہیں:

''سخنے گویم بشرطیکہ شما گران خاطر شوید، گفتم حضرت بفرمائیدہ۔''

''ایک بات کہوں، اگر تمہیں بار خاطر نہ ہو، میں نے عرض کیا، حضرت بخوشی فرمائیں۔''

دینی حمیّت

دینی نکتہ نوازی سُنیے، اپنے اسی شاگرد سے جس کی خاطر شکنی بھی منظور نہیں۔ فرماتے ہیں:

''باصطلاح فقراء ایں راطعامِ اشراف گویند۔''

''صوفیاء کی اصطلاح میں اسے اشرافِ نفس کا کھانا کہتے ہیں۔''

یعنی نفس نے جس کی طرف لو لگائی تھی۔ یہ ایسا کھانا ہے کیونکہ اظہارِ حال کے بعد اور میر طفیل محمد کے جانے کے بعد میر مبارک کے نفس سے ظاہر ہے کہ اس کھانے کی اُمید قائم کر لی تھی، اس کے بعد میر مبارک فرماتے ہیں:

''ہر چند نزد فقہاء اکل آں جائز است دور شرع بعد از سہ روز میتہ حلال، امادر طریقہ فقراء اکل طعامِ اشراف جائز نیست۔''

''یہ درست ہے کہ فقہا کے نزدیک اس کا کھانا جائز ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ تین دن کے بعد شریعت میں مردار حلال ہو جاتا ہے، لیکن فقراء کے یہاں ''اشراف'' کا کھانا جائز نہیں ہے۔''

یعنی مخلوق سے توقع قائم کرنے کے بعد جو چیز سامنے آئے ان لوگوں کے لیے اس چیز کا لینا جائز نہیں ہے جنہوں نے:

لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت (دعا نبوی)

''نہیں روکنے والا ہے اس سے کوئی جسے تو دے اور نہ دینے والا ہے اُسے جس کے لیے تو روک دے۔''

پر کمر ہمت چست کی ہو اور جنہوں نے

مایفتح اللہ للناس من رحمة فلا ممسک لھا وما یمسک فلامرسل له من بعده.
(القران العظیم)

''آدمی کے لیے اللہ جس رحمت کو کھول دیتا ہے پھر اُس کا روکنے والا کوئی نہیں اور جسے روک دیتا ہے اُس کا جاری کرنے والا بھی اس کے بعد کوئی نہیں۔''

ہی کے تجربہ کا نام ''الحیٰوۃ الدنیا'' قرار دے رکھا ہے۔

شاگرد کا کمال ادب اور مذاق شناسی

میر طفیل محمد استاد کے مذاق شناس تھے، بغیر کسی اصرار اور ردوکد کے کھانا سامنے سے اُٹھالیا اور چلے گئے۔ اوٹ میں جانے کے بعد پھر لوٹے اور اب کھانا پیش کر کے اُستاد سے پوچھتے ہیں:

''ہرگاہ بندہ طعام رابرداشتہ بروحضرت راتوقع بود کہ بازخواہم آورد۔''

''خاکسار جب کھانا اٹھا کر حضرت کے سامنے سے لے گیا، تو آپ کو واپسی کی توقع تھی؟''

میر مبارک نے جواب دیا کہ ''نے'' نہیں میر طفیل محمد نے عرض کیا:

''حالا ایں طعام بے توقع حضرت آوردہ ام طعام اشراف نماند۔''

''اس وقت یہ کھانا خلاف توقع لایا ہوں، لہٰذا یہ طعام اشراف باقی نہیں رہا۔''

سعید شاگرد کے اس حُسن تدبیر پر اُستاد خوش ہوئے اور بولے:

''شما عجب فراستے بہ کار بردید۔''

''تم نے عجیب سمجھداری کا ثبوت دیا۔''

اس منطق سے جو منطق نہیں واقعہ تھا، استاد کو شکست کا اعتراف کرنا پڑا اور

''طعام بہ رغبت تمام تناول فرمود۔''

''کھانا پوری رغبت سے تناول فرمایا۔''

مگر وہی جس نے

الیس اللہ بکاف عبده (القران)

''کیا اپنے بندے کے لیے اللہ کافی نہیں ہے۔''

کے قرآنی سوال کے جواب میں

حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولی و نعم النصیر.

''ہمارے لیے اللہ سب ہے، بڑا اچھا وکیل (پشت پناہ) کتنا اچھا یارائی فرما۔''

کی چٹان سے اپنی زندگی کے جہاز کو باندھ دیا تھا۔ ابھی تو آپ نے دیکھا کہ جب تک وہ

زلزلوا زلزالا شدیدا (القران)

"جھنجھوڑ دیے گئے اچھی طرح جھنجوڑ کے ساتھ۔"

کے مقام پر تھا تو بھوک کی شدت سے اسے بیہوش ہو ہو کر گرنا پڑتا تھا، مگر چند ہی دنوں کے بعد ان ہی میر مبارک محدث کو دیکھا جاتا ہے، اسی بلگرام میں دیکھا جاتا ہے کہ نصر اللہ کا ظہور ان کے سامنے بایں شکل ہو رہا تھا کہ:

صبر واستقامت کا ثمرہ

"میر (مبارک محدث) از محلہ سید واڑہ عشیرۂ (کنبہ) خود در میانے اقامت گزید ورعایا کرد وسجد ومنازل سکونت تعمیر نمود۔"

"میر مبارک اپنے کنبہ اور محلہ سید واڑہ سے اُٹھ کر ایک میدان میں اقامت گزیں ہو گئے اور رعایا کو آباد کیا اور مسجد اور سکونتی مکانات تعمیر کرائے۔"

صرف یہی نہیں کہ مسجد اور رہنے کے مکانات میر مبارک نے بنوائے اور مستقل ایک گاؤں رعایا کا اپنے مکان کے اِردگرد آباد کیا، بلکہ:

"گردِ آبادی سورے محکم از خشت وگچ کشید تا از آسیب وزدان وحوش وسباع محفوظ باشد۔"

"آبادی کے چاروں طرف ایک مضبوط فصیل (دیوار) کھچوادی، تاکہ چور اور وحشی جانور اور درندوں سے یہ محفوظ رہے۔"

گویا ایک مستقل گڑھی تیار ہوگئی لیکن ایک فقیر کو رعایا کی کیا ضرورت تھی۔ کیسا عجیب مذاق تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اپنی اس گڑھی میں میر مبارک محدث نے جن رعایا کو بسایا تھا وہ:

"بیشتر از قوم جانگ آباد کرد کہ اینہا اکثر دیندار نماز خواں می باشند۔"

"زیادہ کپڑے بُننے والوں کو آباد کیا، اس وجہ سے کہ یہ اکثر دیندار اور نمازی ہوتے ہیں۔"

پارچہ بافوں کی دینداری

جس سے صرف میر صاحب کے نصب العین ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس غلط خیال کی بھی تردید ہوتی ہے، جو سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جس طبقہ نے ہندوستان میں عملاً یداور دستکاری کے اس فن کو یعنی پارچہ بافی کو رزقِ حلال کا ذریعہ بنایا تھا، وہ اسلامی حکومت کے عہد میں دین وعلم کے زیور سے قطعاً خالی تھا اور اس نے اپنی دینداری، جوشِ اسلامی میں جو شہرت اس زمانہ میں حاصل کی ہے، یہ سب برٹش راج کی برکت ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے یہ واقعہ گیارہویں صدی کا بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ کم از کم آج سے دو ڈھائی سو سال پیشتر بھی پارچہ بافوں کا یہ گروہ اپنی دینداری اور نماز خوانی میں امتیازی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور میرے نزدیک تو دین اور دین پر عمل یہی سارے علموں کی جان ہے۔

ایک عجیب واقعہ اور ایک عالم کا ایثار

البتہ اس سلسلہ میں مولانا غلام علیؒ نے ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے کہ انہی پارچہ بافوں میں ایک شخص نماز میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ میر مبارک محدث نے بلا کر پوچھا کہ بھائی! تم جماعت میں کیوں نہیں آتے۔ اس نے جواب دیا کہ جماعت کی پابندی کی وجہ سے میری کمائی میں نقصان ہوتا ہے یعنی آنے جانے میں وقت لگ جاتا ہے۔ میر صاحب نے پوچھا کتنا نقصان ہوتا ہے، بولا ایک پیسہ کا نقصان روزانہ ہوتا ہے۔ میر صاحب نے فرمایا یہ ایک پیسہ مجھ سے لے لیا کرو۔ حسبِ وعدہ روزانہ ایک پیسہ اس کو ملنے لگا۔

ایک دن میر مبارک نے دیکھا کہ بلا وضو وہ نماز میں شریک ہو گیا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ ''نماز را بے طہارت می خوانی؟'' اُس نے جواب دیا کہ ''بہ یک پیسہ دو کار نمی تواں کرد'' ایک پیسہ میں دو کام نہیں ہو سکتا ہے، یعنی ایک ہی پیسہ میں آپ نماز اور وضو دونوں کام لینا چاہتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ''میر بے اختیار خندہ زد و پیسہٗ دیگر برائے وضو اضافہ کرد۔'' میر صاحب بے اختیار ہنس پڑے اور دوسرا پیسہ وضو کے لیے بڑھا دیا۔

بہرحال آخر میں تو مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''رفتہ رفتہ حائک را رغبت دلی در نماز بہم رسید و از تقاضائے اُجرت در گذشت۔''

''آہستہ آہستہ اس کپڑا بننے والے کا دل نماز میں لگ گیا، اور اُجرت کا تقاضا ترک کر دیا۔''

فتح یاب رحمت

فاقہ و فقر کی اس کیفیت کے بعد میر مبارک محدث پر فتح یاب، ارسال رحمت اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کیسے ہوا؟ مولانا آزاد نے اس کو بھی لکھا ہے کہ ''نواب مکرم خاں بن نواب شیخ میر عالمگیری در خدمت میر اعتقاد عظیم داشت و خدمات شایستہ بہ تقدیم رسانید'' اور یوں:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب.

''اللہ کو جس نے وکیل بنا لیا تو وہ اس کے لیے بس ہے اللہ سے ڈر کر (بری باتوں سے جو رکا) یعنی تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی راہ نکال دیتے ہیں اور روزی پہنچاتے ہیں، ایسی جگہ سے جہاں سے اُسے امید نہ ہو۔''

کی تفسیر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو رہی تھی حالانکہ خود میر مبارک محدث نے جس طرح تعلیم حاصل کی تھی جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد:

''از اول تا آخر ایام اقامت دہلی در خانہ شیخ نور الحق بن شیخ قدس اللہ اسرار ہما سکونت ورزیدہ و علم حدیث از آنجناب اخذ کرد۔''

''دہلی کے زمانہ قیام میں اول سے آخر تک شیخ عبدالحق محدث کے صاحبزادہ مولانا شیخ نور الحق کے گھر رہے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔''

پہلے زمانہ کی سادگی

ظاہر ہے کہ خانہ شیخ نور الحق میں میر صاحب کو کیا جگہ ملی ہوگی، کیا ان کے لیے باتھ روم اور ڈرائنگ روم کا نظم کیا گیا ہوگا، برقی قمقموں سے کمرہ جگمگاتا ہوگا۔ بجلی کے پنکھے سر پر گردش میں ہوں گے۔ ان کے لیے سرونٹ، دھوبی، حجام، ریزر، صابن، کنگھا، آئینہ یا بناؤ سنگھار کے دیگر ساز وسامان مہیا کیے گئے ہوں گے، توارث کے قانون کو پیشِ نظر رکھ کر پچھلوں کے حال پر اگر اگلوں کا قیاس درست ہوسکتا ہے۔ نیز آئندہ آپ کے سامنے جو مواد پیش ہوں گے ان کی بنیاد پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ خانہ شیخ نور الحق میں میر مبارک کے لیے چٹائی کے فرش والے تنگ وتاریک حجرے کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ متاخرین علماء ہند میں مولانا محمد حسین الہ آبادی جو اپنی وفات کی خاص نوعیت کی وجہ سے یعنی بہ مقام اجمیر حالت سماع میں آپ کا انتقال ہوا، اس واقعہ کی وجہ سے آپ کی شہرت علمی ودینی خواص سے گذر کر عوام کے دائروں تک پہنچی ہوئی ہے۔

ایک طالب علم کا ذوق علم

ان کی سوانح عمری جسے ان کے خلف سعید حفیدِ رشید مولانا حافظ محمد الفاروقی (فاضل مصر) نے حال میں شائع کی ہے۔ اسی کتاب میں مولانا مرحوم کا طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا فاروقی رقمطراز ہیں۔ اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ مولانا کے والد کی مالی حالت اچھی تھی اس لیے مصارف کافی ملتے تھے مگر والد کے بھیجے ہوئے روپے کتب فروشوں کے نذر ہو جاتے اور خود طالب علمی کی پوری زندگی لکھنؤ میں انہوں نے جو گذاری اس کی تفصیل یہ ہے:

''فرنگی محل کے پل کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو مسجد ملا مبین کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد میں ایک حجرہ ہے جو اتنا تنگ ہے کہ اس میں تین چار آدمی مشکل سے لیٹ سکتے ہیں جس کے دروازہ سے صرف چند گز کے فاصلہ پر پاخانہ بنا ہوا ہے۔ اس کی کافی بدبو حجرہ میں رہتی ہے۔ مسجد کے دروازہ پر ایک سائبان ہے جہاں نصف شب تک کباب والوں کی دکان کے چولہے کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ اس مسجد کی موجودہ حالت یہ ہے لیکن میں نے اپنے اساتذہ سے سُنا کہ مولانا مرحوم (مولانا محمد حسین) کی طالب العلمی کے زمانہ میں اس سے بھی کم راحت کے سامان کے ساتھ وہاں تھے، اسی مسجد میں آپ نے طالب العلمی کا پورا زمانہ بسر فرمایا۔ (کتاب مذکور، ص9)

سادگی کا زندگی پر اثر

لیکن کیا طالب العلمی کی اس زندگی کا اثر آئندہ زندگی پر بھی مرتب ہوتا تھا؟ عجب لوگ ہیں جن چیزوں کو

انسان کی فطرت خود چاہتی ہے۔ بنگلوں اور گملوں میں کون نہیں رہنا چاہتا۔ موقعہ ملے تو باغ وچمن کی لذت گیریوں سے عموماً کون گریز کرتا ہے لیکن خدا جانے اس زمانہ میں اس کا وسوسہ کیوں ہوتا ہے کہ اگر طلباء کو سادہ زندگی کا عادی بنا دیا جائے گا تو آئندہ رنگین زندگی کی ہوس ان کے اندر سے نکل جائے گی۔ فرض کیجیے کہ اس قسم کی خواہش اگر نکل بھی جائے تو اس میں انسانیت کا کیا نقصان ہے۔ تکلف کی زندگی سے تو سادہ زندگی بہرحال اگر باہر نہیں تو اندر کو مسرور رکھنے میں گونہ ممد ہوتی ہے۔

محدث ابن نصر مروزی

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں مشہور محدث علامہ محمد بن نصر مروزی کے ترجمہ میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے، اگرچہ اس قصہ کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے لیکن تعلیمی زندگی سے تو اس کا بہرحال ضرور تعلق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر یہاں کر دیا جائے۔

الخطیب لکھتے ہیں کہ محدث مروزی نے جب درس حدیث کا حلقہ قائم کیا اور ملک میں ان کے درس کا چرچا ہوا، جیسا کہ اُس زمانہ کا دستور تھا ابھی میر مبارک محدث کے قصہ میں گذرا کہ خدا نے میر صاحب کی خدمت کے لیے نواب مکرم خان کو آمادہ کر دیا تھا۔ محدث مروزی کے ساتھ ایک نہیں متعدد امراء کا یہ سلوک تھا یعنی:

كان له من اسمعيل بن احمد والى خراسان يصله فى كل سنة باربعة الاف درهم ويصله اخوه اسحق باربعة الاف درهم ويصله اهل سمر قندبار بعة الاف درهم.

”خراسان کے گورنر اسماعیل بن احمد سالانہ چار ہزار درہم اور اسمٰعیل کے بھائی اسحٰق بھی چار ہزار درہم سمرقند کے باشندے بھی چار ہزار درہم سالانہ کے ساتھ محمد بن نصر مروزی کی خدمت میں کرتے تھے۔“

محدث موصوف کی فراخ چشمی

لیکن بارہ ہزار کی مستقل سالانہ آمدنی کے باوجود محدث موصوف اتنے شاہ خرچ فراخ چشم واقع ہوئے تھے کہ آخر سال تک ان کے پاس ایک کوڑی بھی باقی نہیں رہتی تھی، کہنے والوں نے علامہ سے ایک دن کہا کہ:

لو جمعت منها لنائبة کیا اچھا ہوتا کہ کسی آڑے وقت کے لیے اس آمدنی سے آپ کچھ پس ماندکیا کریں۔

جواب میں انہوں نے جو بات کہی تھی اسی کا نقل کرنا مقصود ہے۔ فرمایا:

يا سبحان الله انا بقيت بمصر كذا وكذا سنة فكان قوتى و ثيابى و كاغذى و حبرى و جميع ما انفقه على القسى فى السنة عشرين درهماً افترى

ان ذهب هذا لايبقى ذلك.

''واہ سبحان اللہ! میں مصر میں اتنے اتنے سال تک رہا (یعنی طالب العلمی کرتے رہے) اس زمانہ میں میری خوراک، میرے کپڑے، میرے کاغذ، میری روشنائی اور جو کچھ بھی میرے مصارف سال بھر میں ہوتے تھے کل بیس درم سب کے لیے کافی ہوتے تھے۔ پھر کیا تم خیال کرتے ہو کہ اگر یہ بارہ ہزار سالانہ کی آمدنی جاتی بھی رہے تو بیس درہم کی سالانہ آمدنی بھی باقی نہ رہے گی۔'' (الخطیب۔ ج 3، ص 317)

سادہ زندگی کا فائدہ

ایک حکیمانہ بات ہے جو محدث نے فرمائی، آدمی جب کم خرچ کی زندگی کا کسی زمانہ میں عادی ہوتا ہے پھر اگر اُسے کسی وقت زیادہ بھی دے تو اس سے نفع اُٹھانے یا دوسروں کو نفع پہنچانے میں وہ تنگی نہیں محسوس کرتا۔ بقول مروزی جس نے بیس درم سالانہ کے اندر مصر میں برسوں گزارا ہو، اس کی نگاہ میں بارہ ہزار سالانہ کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ ہوا تو خرچ کیا ورنہ بیس درم والی زندگی کا تجربہ تو موجود ہی ہے۔ پھر اُسی حالت کی طرف واپس ہونے میں اس کو خوف و خطر کیوں محسوس ہو گا جو اُن لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہیں بیس درم والی زندگی سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو۔ بہر حال ہندوستان کے باہر ہو یا اندر مسلمانوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد اُسی پر قائم کی تھی۔ طالب العلمی کے زمانہ میں خواہ مخواہ ایٹی کیٹ آموزی، صفائی اور خدا جانے کن کن ناموں کا پردہ ڈال کر آج طلباء کو جن تنعماتِ لایعنی کا عادی بنایا جاتا ہے، ہمارے اسلاف اس کو بالکل غیر ضروری سمجھتے تھے۔

ایامِ تعلیم میں سادگی

تعلیم کے ایامِ تعلیم کے لیے ہیں نہ کہ بننے اور سنورنے، نوعروسی اور دولہا بننے کی مشق کا وہ کوئی عہد ہے۔ باقی وہ وسوسہ کہ جو آج خرچ کا عادی نہیں بنایا جائے گا کل اس کے سینے میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آج جسے صفائی اور ستھرائی زیبائش و آرائش کی مشق نہ کرائی جائے گی تو کل بھی اپنے آپ کو وہ صاف ستھرا نہ رکھ سکے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ اس کا کیا جواب دے رہی ہے۔ بیس درم سالانہ سے زیادہ جس بیچارہ کو سالہا سال تک خرچ کرنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کتنی سیر چشمی سے بارہ ہزار سالانہ خرچ کر رہا ہے۔

محدث میر مبارک کی نظافت

یہی میر مبارک محدث ہیں، ان کے مصارف کا حال بھی آپ پڑھ چکے، اب ان کی صفائی و پاکیزگی، نظافت و لطافت کا حال بھی مولانا غلام علی کی عینی شہادت کی بموجب سُن لیجیے۔ کہاں تو ایک زمانہ دلّی میں گذرا کہ صرف شیخ نور الحق

کے مکان کا ایک تنگ وتاریک حجرہ میر صاحب کے لیے کافی تھا، لیکن جب عملی زندگی میں انہوں نے قدم رکھا بلگرام میں ان پر خدا نے فتوحات کے دروازے کھولے تو مولانا آزاد کا بیان ہے: ''معاش بہ وضع صفاونزاکت می کرد'' صفا ہی نہیں بلکہ اُس میں نزاکت بھی شریک تھی، کیسی نزاکت انہیں سے تفصیل سُنیے، فرماتے ہیں:

''نشست گاہ خاص وپیش مسجد چناں مصفا و پاکیزہ می داشت کہ نمونۂ سینۂ صاف دلاں و دیدۂ پاک بیناں باید گفت۔''

''خاص نشست گاہ اور مسجد کے آگے ایسی صفائی اور پاکیزگی ہے کہ جیسے پاک دلوں اور پاک نگاہ والوں کا سینہ۔''

حضرت آزاد پر میر صاحب کی اس صاف ستھری، دُھلی دُھلائی اور اُجلی زندگی کا اتنا اثر تھا کہ بے اختیار اس واقعہ کی تحریر کے وقت میر صاحب کی اس خصوصیت کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا ہے اور اپنے ایک شعر کا محمل ان ہی کی اس پاک زندگی کو قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں۔ کہ گویا راقم الحروف (آزاد) ایں بیت را از زبانِ میر گفتہ۔

حباب خوش منشم می زیم بہ وضع و صفا
ز آب صرف بنا کردہ اند منزل من

صعوبت ومشقت کا کردار پر اثر

آج خبر سے آنکھیں بند کر کے مبتداء ہی میں جو اُلجھے ہوئے ہیں یا دوسروں کو الجھا رہے ہیں، ناعاقبت اندیشوں کے اس طبقہ کو کون سمجھا سکتا ہے کہ عنفوان شباب میں مشقتوں صعوبتوں کو بہرحال آدمی جھیل لیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شباب کی ان ہی گرمیوں کے بعد آئندہ زندگی کی سردیوں اور سہولتوں کا صحیح لطف حاصل ہوتا ہے۔ سرد گرم چشیدہ زندگی اپنے اندر جو پختگی رکھتی ہے سیرت وکردار کی یہ استواری ان لوگوں میں تلاش کرنا فضول ہے جن کی پوری زندگی سرد ماحول میں گزری ہو۔

آرام دہ زندگی اور اس کا انجام

لیکن آج گنگا اُلٹی بہائی جارہی ہے۔ مشقت وصعوبت، تحمل وبرداشت کے جو دن ہیں ان کو عوام کے چندوں پر نوابوں اور راجواڑوں کی خیراتی امدادوں کے بل بوتے پر ان بچوں پر گزارا اور گزروایا جاتا ہے، جو نعمتوں اور سہولتوں کے پھولوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس قسم کے مسرفانہ غیر ضروری مصارف کی عادی زندگی کی پیاس پیدا کر کے نوجوانوں کو جب ان کی نوجوانی ختم ہونے کو آتی ہے، دارالاقاموں کی چند سالہ بہشت سے کشمکشِ حیات کی اس وادی پُر خار، بلکہ وادی نار کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جس میں سو پچاسوں میں سے بمشکل دس بیس تشنہ کامان ملازمت وامیدوارانِ خدمت کی سیرابی کی ایک حد تک گونہ صورت نکل سکتی ہے، لیکن نوے فیصدی بیچارے اسی جہنم کے شعلوں میں جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں جن کا

بجھانے والا اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں، نہ حکومت ان بہشتی ڈگریوں کی خریدار اور نہ پبلک ان معاشی اجازت ناموں کی طلب گار۔

خسر الدنیا والاخرة ذلک هو الخسران المبین.

''برباد ہوئی دنیا اور ''الآخرت'' کی زندگی وہی ہے کھلا ہوا خسارہ۔''

پست اخلاقی

پیاس، جھوٹی غیر فطری پیاس پیدا کرنے والے بے سوچے سمجھے بھوک میں بھوک پیاس میں پیاس کا اضافہ کرتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی نہیں جو یہ سوچتا ہو کہ ان بھوکوں کو روٹی اور ان پیاسوں کو پانی یعنی وہی روٹی وہی پانی جس کی صورت ایک دفعہ ان شاہی اقامت خانوں میں دکھا دی جاتی ہے اور ایک دفعہ دیکھا ہے پھر اُسی کے دیکھنے کی تمنا، وہ اگر نہ ملی تو پھر اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔

تعلیم سے جن کے دماغوں کو جگمگایا جارہا ہے، تنور و وسعتِ نظر کا وعدہ کر کے باپوں سے جو بچے چھینے گئے تھے اب ان کے متعلق شکایت ہے کہ وہ سرکاری محکموں میں چھچھوری حرکتیں کرتے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، فریب و مکر سے حکومت کے خزانوں پر ایک طرف اور پبلک کی جیبوں پر دوسری طرف علانیہ ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ علم کی ڈگریوں، فضیلت کے طیلسانوں کے مالک ہونے کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ان سے ایسے دَنِی اور سفیہانہ افعال صادر ہوتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتوں کی خودکشی

اور یہ حال تو ان کا ہے جنہیں کسی نہ کسی طرح حکومت نے شکاری ٹٹوں کے پیچھے چھپنے کا موقع دے دیا ہے لیکن جو مسکین ان سرفرازیوں سے محروم ہیں وہ پھانسیوں میں لٹک رہے ہیں، اپنے آپ کو شوٹ کر رہے ہیں یا مفسدوں اور انارکسٹوں کی جماعت میں شریک ہو رہے ہیں، ناواقف پبلک کے جذبات میں اشتعال پیدا کر کر کے ملک کے امن و امان کو غارت کر رہے ہیں، فردوسی دارالاقاموں سے نکالی ہوئی آدم کی تعلیم یافتہ اولاد پر ہر طرف فقرے کسے جارہے ہیں، طنز اور طعنوں کے تیروں سے بیچاروں کے دل و جگر کو چھلنی بنا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ قصور کس کا ہے؟ خود اُن پیاسوں کا؟ یا مصنوعی غیر ضروری پیاس پیدا کرنے والوں کا؟ ولوج سے پہلے خروج اور آمد سے پہلے رفت کی راہوں سے جو بے پروائی برتتے ہیں اُن کا انجام آج کیا ہمیشہ یہی ہوا ہے، یہی ہوگا، المتقین کے سوا حسن العاقبۃ کے جیتنے میں آخر کون کامیاب ہوا ہے۔

ہمیں تو سکھایا گیا تھا کہ اس راہ میں قدم رکھتے وقت ہی پکارنے والے پکار رہے تھے۔

بقدر الکد تکتسب المعالی

ومن طلب العلا سهر اللیالی

(برائیاں اور فضیلتیں مشقت کے حساب سے تقسیم ہوتی ہیں، جو بلندی کا طالب ہے اُسے راتوں کو جاگنا پڑے گا)۔ (کتاب تعلیم المتعلم)

سمجھادیا گیا تھا کہ ۔

در رہ منزلِ جاناں کہ خطرہاست بجاں
شرط اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی

جتادیا گیا تھا ع جس کو ہو جان ودل عزیز میری گلی میں آئے کیوں؟ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ منزل جاناں کے راہروؤں کے سامنے آخر زندگی تک جو کچھ بھی پیش آتا تھا، زیادہ تر وہی ہوتا تھا، جس کی پیش بینی پہلے ہی سے حاصل ہو چکی تھی۔ تکلیف تو ہمیشہ خلاف توقع حادثوں سے ہوئی ہے، لیکن جس کے سامنے وہی حوادث پیش ہوں جن کا اسے منتظر بنایا گیا ہو وہ کیوں بھڑ کے گا۔(7)

خودداری کا خون

کہا جاتا ہے، ان کی طرف سے کہا جاتا ہے جن کے اندر ہی میں نہیں باہر میں بھی اپنا کچھ باقی نہیں ہے۔ چہرہ سے، پیشانی سے، گریبانوں سے، ٹانگوں سے الغرض ہر اس جگہ سے جہاں اس کا امکان تھا، اپنی خودی کو پوچھ پوچھ کر دوسروں کو بھرا گیا ہے چپکایا گیا ہے۔ ان ہی کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اقامت خانوں کی موجودہ عصری زندگی میں خودداری (سلف ریسپکٹ) کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبہ کی اقامت کے قدیم طریقوں میں خودی اور خودداری مجروح ہوتی تھی۔

محدث میر مبارک کی خدمت میں گورنر کی حاضری

جس کی غیروں میں فانی زندگی اپنے دعوے کی خود تردید کر رہی ہو، میں اس برروئے تو کی دروغ بیانیوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں، لیکن ان ہی میر مبارک محدثؒ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے، یعنی وہی جس کے طلب علم کی زندگی دوسرے کے گھر اور دوسرے کے باورچی خانہ کی روٹیوں پر گذری تھی، ان ہی میر مبارک محدث کی مجلس میں لکھنؤ کا گورنر (حاکم) غیرت خاں آتا ہے، مولانا آزاد فرماتے ہیں: ''غیرت خاں حاکم لکھنؤ بہ ادراک شرف خدمت آمد۔'' مگر جس لباس میں آتا ہے میر صاحب کے نزدیک مسلمان کی خودی پر اس سے چوٹ پڑتی تھی۔ وہ بلگرام میں ہے اور اسی بلگرام کے دارالخلافہ لکھنؤ کا وہ حاکم ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''خان پائچہ زیر جامہ دراز شکن دار'' نامشروع'' پوشیدہ۔''

ایک ناجائز طرز عمل پر محدث کا اعتراض

کوٹ اور پتلون کے اس عہد میں اب کون سمجھ سکتا ہے کہ زیر جامہ کیا بلا تھی اور اس کا پائچہ کیا تھا۔ ''دراز شکن'' کی

اصطلاح کا کیا مطلب ہے۔ تاہم آخری لفظ ''نامشروع'' سے وہی بات معلوم ہوتی ہے، کہ محمد رسول اللہؐ نے مسلم کی خودی کی تعمیر جن ظاہری اور باطنی عناصر سے فرمائی تھی ان میں سے کوئی عنصر غائب تھا اور بجائے اس کے کوئی اجنبی جز، اس میں شریک ہو گیا تھا، میر مبارک محدث اپنے صوبہ کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کو اس حال میں پاتے ہیں، خاموشی کو ایمانی ضعف کی دلیل خیال کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ حیرت خاں کے اس ''نامشروع'' لباس پر ''میر اعتراض کرد'' (میر نے اعتراض کیا)۔

گورنر کی غیرت دینی

آگے کے واقعہ کا تعلق میر سے نہیں بلکہ غیرت خاں کی غیور فطرت کی حیرت انگیز جسارت سے ہے۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''میر اعتراض کرد'' کے جواب میں غیرت خاں نے تلوار کھینچ لی تھی اور میر کا سر مبارک جسد سے جدا ہو کر زمین پر پڑا ہوا تھا، یا یہ نہیں تو کم از کم میر پر ''تنگ نظری'' کوتاہ خیالی کا الزام لگا کر ان کے اعتراض کو قہقہوں میں غیرت خاں کی بے غیرتی نے اُڑا دیا تھا۔ آج مسلمانوں کے ان سادہ رخوں، سادہ دلوں کو کون سمجھائے جنہیں باور کرایا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ مسکینوں، عقل کے ان مسکینوں نے باور بھی کر لیا ہے کہ ہر وہ بات جس میں ان کی ''خودی'' کی ضمانت مستور ہے وہی چھوٹی بات اور ناقابل لحاظ ہے، بلکہ لحاظ کرنے والا ہی تنگ سینہ، تنگ چشم، تنگ دل، مذہبی جنون، مبتلائے ''فینے ٹزم'' ہے، رجعت کا شکار ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہے صرف اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں خود اپنے آپ سے چھین لیا گیا ہے، اب ہم خود نہیں ہیں بلکہ وہی ہیں جو کچھ ہمیں دوسرے رکھنا اور بنانا چاہیں، کہنے والے نے کہا تھا اور سچ کہا تھا:

اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی
اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

نامشروع عمل کی فوراً اصلاح

یہی افتاد ہے۔ جس میں ہم گرفتار ہیں اور مولانا آزاد جس زمانہ کا قصہ سنا رہے ہیں، گو وہ زیادہ دن کی بات نہیں ہے اور کسی دوسرے ملک کی نہیں اسی دیارِ مرحوم کی تھی، جس کے ہم بھی کبھی شہریار تھے، جب غیر تو ہمیں کیا چھینتے، ان ہی کو ان سے چھین کر اپنی خودی ان میں ہم ہی بھر رہے تھے۔ ہم دوسروں میں کیا جذب ہوتے، دوسرے ہم میں منجذب ہونے کو اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ غیرت خاں کی غیرت بھی اسی عہدِ خودی کی پیداوار تھی جس میں مسلمان باطن میں ہو یا ظاہر میں محمد رسول اللہؐ فداہ ابی وامی اور ان کی شریعتِ غرّا کے سوا اپنے اندر کسی اور چیز کا پانا برداشت نہیں کر سکتا تھا، غلطی سے اگر کوئی اجنبی کانٹا، کسی وجہ سے چبھ بھی جاتا تھا تو اولاً خود ہی اس کی چبھن محسوس کرتا تھا، ورنہ کسی معمولی تنبیہ سے ہوش میں آ جاتا تھا اور جہاں سے ہٹا تھا بعجلتِ ممکنہ کانٹے کو نکال کر اسلامی توازن کے کانٹے کو سیدھا کر لیتا تھا۔ غیرت خاں کو میر مبارک نے چونکا دیا۔ وہ چونک گیا اور کیسی چونک مولانا آزاد راوی ہیں:

''غیرت خاں احتساب میررا قبول کرد۔''

''غیرت خاں نے میر صاحب کی یہ پکڑ قبول کی۔''

اور صرف قبول کر د ہی نہیں بلکہ

''ہماں وقت پائچہ را بہ دست خود قطع کرد۔''

''اور اسی وقت پائچہ اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالا۔''

چھوٹی بات تھی لیکن سامنے میں، پر اس چھوٹی بات کے پیچھے اسلامی غیرت کی جو بڑی آگ چھپی ہوئی تھی، کیا غیرت خاں کے بس میں تھا کہ اس کی تپش کے بھڑک اٹھنے کے بعد سینہ سے اُسے لگائے رکھتا۔ مولانا آزاد کا بیان ہے کہ اُٹھنے سے پہلے اس اجنبی غیر اسلامی کانٹے کو بھسم کر کے اس نے رکھ دیا۔

عبرت وبصیرت

اور یہ ہیں اس راہ کے نقوشِ پا کی، دلچسپ کہیے یا دلسوز شوخیاں جن پر ابھی ابھی اسی ملک میں اسی آسمان کے نیچے، اسی زمین پر کل ڈیڑھ دوصدی پہلے گزرنے والے گزر رہے تھے، تماشا اور عجب تماشا تھا، پر:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

وہی راستہ ہے، ان ہی گزرنے والوں سے نکلنے والے اب بھی گزر رہے ہیں، مگر کس حال میں لٹ رہے ہیں، لٹتے جا رہے ہیں، کھو رہے ہیں اور کھوتے جا رہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ لٹنے والوں کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ تم ہی لوٹ رہے ہو، کھونے والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم ہی پا رہے ہو، اف! متاع کارواں کی تاراجی شاید اتنی جاں گسل نہ ہوتی اگر تاراجی کے احساس کو بھی غارت گر تاراج نہ کرتے، لیکن متاع بھی لٹ گئی، لٹ رہی ہے اور متاعِ عزیز کے لٹنے کا جو احساس تھا وہ بھی لوٹ لیا گیا، پہلی صورت میں تو لوٹنے کی امید تھی، لیکن اس لُوٹ سے کون بدل سکتا ہے۔ آخر:

ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

انسانی فطرت کا پارینہ دستور ہے الا ان یاتی اللہ بامرہ۔

غیرت خاں کے اس واقعہ سے جہاں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقامت خانوں کے قدیم جاگیری و مسجدی نظاموں کی بے خودی میں جس ناقابل تسخیر خودی کی پرورش ہوتی تھی وہ کتنی عجیب طاقت تھی کہ ہر اس قوت سے ٹکرانے کے لیے تیار رہتی تھی جس سے اسلامی خودی پر زد پڑتی تھی۔ وہیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ میر مبارک محدث کے متعلق مولانا آزاد نے جو یہ سنایا کہ نواب مکرم خاں عالمگیری امیر شیخ میر کے صاحبزادے میر صاحب کے ساتھ ''اعتقادِ عظیم داشت و خدمات شائستہ بہ تقدیم رسانید'' بڑا اعتقاد رکھتے تھے اور لائق ومناسب خدمتیں بجالاتے تھے۔

ان خدمات شائستہ کی نوعیت کیا ہوتی تھی، خدمت کرنے والے خدمت کرتے تھے یا ان سے خدمت لے کر خدمت کرنے والوں کو ممنون کیا جاتا تھا، اپنے صوبہ کے مطلق العنان مغل گورنر کے سامنے جس کی زبان نہیں رُکتی تھی، دل نہیں دبتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے مناسب حال دوسری ہی صورت ہوسکتی ہے اور مولانا آزاد کے الفاظ ''اعتقادِ عظیم داشت'' سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آہ! آج کون باور کرسکتا ہے اور کون باور کراسکتا ہے، کہ علم ودین کے جن نمائندوں کو ''املاق'' یا معاشی مشکلات کی دھمکیاں دی جارہی ہیں، چند دن پیشتر وہی ہر اس شخص کو دھمکی دیتے تھے جسے معاشی فراغبالیوں پر ناز تھا، اُف، دنیا میں ہمیشہ دینے والے محسن سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دنیا نے مدتوں یہ تماشا دیکھا کہ محسنیت کا مقام ان ہی کو حاصل تھا، جو کسی سے خدمت لے کر اس کو اپنا احسان مند بناتے تھے اور

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

خیر درد کی یہ داستان طویل ہے، ذکر تو ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا تھا اور آپ نے دیکھا کہ کالج بلڈنگ بورڈنگ لاجنگ کی تمام مشکلات (8) کو کتنی آسانیوں کے ساتھ حل کیا گیا تھا۔

(مجلّہ ''دارالعلوم'' کی نیت سے جو مضمون لکھا گیا تھا وہ بس یہاں ختم ہوگیا۔ آگے اب وہ اضافہ ہے۔ جس نے اس مضمون کو کتاب بنادیا)۔

حواشی

(1) عجیب بات ہے کہ لفظ ''بہار'' جو ''ویہار'' کا ایک تلفظ ہے، یہ بدھ مذہب کی تعلیمی خانقاہوں کا نام تھا۔ اس صوبہ میں، چونکہ اس مذہب کی تعلیم گاہوں کی کثرت تھی، حتیٰ کہ اس میں ہندوستانِ قدیم کا سب سے بڑا مرکز نالندہ بھی موجود تھا جس میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبا، کی تعداد بارہ بارہ ہزار تک پہنچ جاتی تھی، حال میں حکومتِ ہند نے راجگیر کے پاس مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہارؒ کے مکان کے قریب اس کے کھنڈروں کو نمایاں کیا ہے۔ میلوں میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے اس قدیم جامعہ کی عمارتیں دفن تھیں۔ جن لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا ہے اور اس کے بعد نالندے کے اس مدرسہ کی عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں، اس کے دروازے اور اس کے اندر میں دارالطلبہ کے جو مختلف قطعات بنے ہوئے ہیں جب ان کو دیکھتے ہیں تو دیر تک حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ نالندہ کے مدرسہ کا نقشہ جو تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کو دیکھ کر کسی نے دیوبند کی عمارتوں کا نقشہ قائم کیا ہے۔ وہی سُرخ سُرخ موٹی موٹی اینٹوں سے نالندہ کی بھی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جن سے دیوبند کے مدرسے کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قدیم ہند میں حالانکہ عموماً پتلی اینٹوں کا رواج تھا لیکن خلاف دستور نالندہ میں موٹی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ مٹی کے لوٹوں کا وہ ذخیرہ ہے جو اس ''موتکفہ'' آبادی سے برآمد ہوئے ہیں یعنی مسلمانوں کی مسجدوں میں مٹی کے بدھنے جیسے ہوتے ہیں بجنسہٖ اسی شکل وصورت کے ہزاروں کی تعداد میں نکلے ہیں۔ ڈھائی تین ہزار سال کے فاصلہ کے بعد ہندوستان میں تاریخ نے واقعہ کو عجیب طریقہ سے دُہرایا ہے۔ کم از کم دارالعلوم دیوبند سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک دفعہ تو نالندہ کے ''ویہار'' کا معائنہ ضرور کرنا چاہیے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے، اگر نالندہ کی آخری 'ہا' کو زائد قرار دیا جائے جیسا کہ ہندی زبان کا دستور ہے تو دیوبند و نالند ہم

قافیہ الفاظ بھی ہیں۔ بہر حال اسی مدرسہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذیلی مدارس کی وجہ سے باہر کا نام بہار ہو گیا ہے۔ اسلامی عہد میں بھی ابوالفضل نے بہار کے شمالی حصہ ترہت کے متعلق لکھا ہے۔ ''ترہت از دیرگاہ بنگاہ (مرکز) ہندی دانش'' آئین اکبری (ج2، ص67) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ہندی دانش'' (فلسفۂ ہند) کا بہار مدت تک مرکز رہا۔ میں نے جو عبارتیں ''مآثر الکرام'' سے نقل کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی علوم کی مرکزیت کا مقام بھی بہار کو اسلامی عہد میں حاصل تھا، ملتان سے لوگوں کا بہار پڑھنے کے لیے آنا صاحب قران شاہجہان کا اپنے سب سے بڑے اقبال مند بیٹے اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے بہار ہی سے۔ ایک عالم مُلا موہن کو بُلانا آخر کس بات کی دلیل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیری عہد میں اسلام نے جو سنبھالا اس ملک میں لیا اُس میں مُلا موہن کی تعلیم کو دخل نہ تھا۔ خصوصاً جب مُلا موہن کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم کی ابتداء اور انتہا دونوں بہار ہی میں ہوئی۔ بہار ہی سے وہ پڑھ کر دلّی آئے اور شاہزادہ کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ بہر حال مجھے تو اس لفظ بہار کی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرنا تھا۔ عجیب بات ہے کہ بخارا جو مشرقی ممالک کا علمی و اسلامی مرکز تھا، کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی ''وِیہارا'' کا ایک تلفظ ہے۔ جس کی تصدیق ان سرحدی پٹھانوں کے تلفظ سے ہوتی ہے جو ح کو ہمیشہ خ کی شکل میں تلفظ کرتے ہیں۔ بلخ کا مشہور تاریخی نوبہار بھی بودھسٹ مذہب ہی کی خانقاہ کا نام تھا۔ ابوالفضل نے بودھ کے ذکر میں بُدھا کا نام شاکیہ منی بتا کر اُس کے باپ کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''پدراو (بدھا) راجہ سدھودن مرزبان بہار'' جس کا مطلب یہی ہوا کہ سدھودن یعنی بدھا کے والد کی راج دہانی بہار ہی میں تھی، لیکن شاید انگریزی تقسیم میں اس کو گورکھپور میں شامل کر دیا گیا ہے، مگر بُدھ اور بدھسٹ مذہب کو جو تعلق بہار سے ہے اُس سے ابوالفضل ہی کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ اسلامی عہد میں بہار کا صوبہ جونپور تک کے علاقہ کو شامل تھا۔ زمانیہ، غازی پور، بلیا یہ سب بہار ہی کے اضلاع تھے۔ دیکھیے تاریخ ہند فرید آبادی۔

(2) ''بہار مجمع علماء بود'' یہ شیخ عبدالحق و شاہ ولی اللہ کا بیان ہے۔ جس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ پایۂ تخت میں بہار کے علماء بہار ہی میں تحصیلِ علم کر کے پہنچتے تھے، مُلا احمد سعید مفتی عساکر شاہ جہانی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ ''از توابع بہار بود و تحصیل علم از والد خود ملا سعد یافت کہ سر برداردہ ان دیار بود'' (بادشاہ نامہ۔ ج2)

(3) اس زمانہ میں بلگرام کے باشندے چونکہ امامیہ مذہب رکھتے ہیں، اس لیے اس کا گوش گذار کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنا تذکرہ مولانا غلام علی نے جہاں درج فرمایا ہے وہاں لکھتے ہیں: ''الفقیر غلام علی بن السید نوح الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبلگر امی مولداً و منشاءً الحنفی مذہباً والچشتی طریقۃ'' ص114۔ صرف الچشتی نہیں بلکہ حضرت مجدد الف ثانی کے معتقد، آخر جس کے الفاظ یہ ہوں ''المجدد الثانی والبرہان الساطع علی شرفیۃ النوع الانسانی سحاب باطل روی الترب والنجم المطارہ نیرٌ اعظم بلغ المشارق والمغارب انوارہ الخ'' ص47 سبحۃ المرجان۔ ان کے مشرب کے لیے اتنی شہادت کافی ہے۔

(4) مغل عہد میں میل اور کوس کے سوا کروہ سے بھی مسافت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں دو میل کے قریب قریب اسے سمجھنا چاہیے۔

(5) مآثر الکرام۔ ص222

(6) کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ شہر، محلہ، قصبہ یا موضع کا رئیس اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے کسی عالم کو ملازم رکھ لیتا تھا لیکن ان رئیس زادوں کے ساتھ دوسرے غرباء کے بچے بھی مفت تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ ''مشارق الانوار'' حسن لاہوری صنعانی کے متعلق ''فوائد الفواد'' میں حضرت سلطان جی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ''پسر والی کول (علی گڑھ) را تعلیم کردے صد تنکہ بیافتے۔'' ص104

(7) جیسا کہ معلوم ہے ٹونک کی ریاست سنبھل کے ایک پٹھان امیر خاں کو قائم کی ہوئی ہے۔ انہیں امیر خاں کے پوتے اور موجودہ والی ریاست کے دادا محمد علی خاں مرحوم کو حکومت برطانیہ نے بنارس میں، بجرم بغاوت نظر بند کر لیا تھا۔ نواب مرحوم کا مشغلہ اس زمانہ میں علمی و دینی رہ گیا تھا۔

(8) یہاں ایک دلچسپ نفسیاتی لطیفہ کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ محقق طوسی کی رسائی جب ہولا کو خاں تاتاری بادشاہ کے دربار تک ہوئی تو ایک رصد خانہ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا۔ ہولا کو خاں سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ کیا خرچ ہوگا اس نے پوچھا۔ طوسی نے کروڑوں کا حساب بتایا، ہولا کو خاں بیچارا جاہل سردار علم کی اس کی نگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی تھی۔ مصارف کا حال سن کر اس نے کہا کہ اتنے روپے برباد کرنے کا کیا

حاصل؟ طوسی بڑے جز بز ہوئے۔ جاہل کے دل میں ہیئت و نجوم کے مسائل کی وقعت کیسے بٹھائی جائے۔ سوچ کر کہا ستاروں کا حال اس رصد خانہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جس سے آئندہ واقعات کے متعلق صحیح پیشین گوئیوں میں مدد ملتی ہے۔ ہولاکو خاں نے کہا کہ بالفرض کسی جنگ میں مجھے شکست ہونے والی ہو اور نجوم کے ذریعہ سے اس کا علم قبل از وقت حاصل ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس شکست کو فتح سے بدلنے کی کوئی صورت نکالیں۔ طوسی نے کہا کہ یہ کس کے بس کی بات ہے، جو واقعہ ہونے والا ہے، وہ تو بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ ہولاکو خاں نے کہا۔ پھر اس پیشین گوئی کا کیا فائدہ؟ محقق طوسی کے لیے یہ سوال بڑا سخت تھا۔ لیکن دل میں ایک بات آئی۔ بولے، آپ ایک طشت لے کر کسی کو چھت پر یہ حکم دے کر بھیجئے کہ جس وقت صحن میں اپنے درباریوں کے ساتھ آپ بیٹھے ہوں، وہ زور سے اس طشت کو چھت سے نیچے گرائے۔ آپ یہ کر لیجیے، تب جواب عرض کروں گا۔ ہولاکو خاں نے یہی کیا۔ طشت کے گرنے کا حال چونکہ ہولاکو خاں اور طوسی کو معلوم تھا اس لیے یہ دونوں جہاں تھے وہیں بیٹھے رہے، لیکن دربار کے دوسرے آدمی جو اس سے قطعاً ناواقف تھے طشت کے اچانک اس طرح زمین پر گرنے سے ان میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کوئی اِدھر بھاگا، کوئی اُدھر، کسی نے کچھ خیال کیا، کسی نے کچھ۔ الغرض طوفان بدتمیزی پیدا ہو گیا۔ طوسی نے ہولاکو کو خطاب کر کے اب پوچھا۔ فرمائیے، ہم اور آپ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں، لیکن دوسرے بدحواس ہو ہو کر اِدھر اُدھر کیوں بھاگے؟ ہولاکو نے کہا کہ ہم دونوں طشت کے گرنے سے واقف تھے، ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ بس نجوم سے آئندہ واقعات کا علم جن لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے وہ واقعات کو ٹال تو نہیں سکتے لیکن اپنی جگہ اسی طرح مطمئن رہتے ہیں۔ جیسے طشت گرنے کے وقت ہم اور آپ مطمئن رہے۔ طوسی نے رصد خانہ کی ضرورت اس تدبیر سے ہولاکو خاں کی ذہن نشین کی۔ ہولاکو کے دل کو بھی بات لگ گئی۔ رصد خانہ کی منظوری اس نے دے دی۔ (فوات الوفیات)

(9) اس موقع پر ایک واقعہ یاد آ گیا، جسے فقیر نے براہ راست اپنے محسن کریم و مربی عظیم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دار العلوم دیوبند سے براہ راست سنا تھا۔ فرماتے تھے کہ دار العلوم دیوبند میں مدت تک وہی جاگیری اور مسجدی نظام اقامت طلبہ کا جاری تھا، لیکن زمانہ اور ضرورت دونوں کے مطالبوں سے تنگ آ کر ارباب مدرسہ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست مدرسہ کی خدمت میں مطبخ کے جدید نظام کو استمزاجاً پیش کیا، حضرت نے فرمایا کہ دل کی پوچھتے تو میرے نزدیک امام طلب کے ان چند دنوں میں طلبہ علم کا دوسروں کے در پر جا کر کھانا، دوسروں کے گھروں میں رہنا، اپنے اندر ایک بڑے اصلاحی راز کو پوشیدہ رکھتا ہے، فرمایا کہ علم بہرحال آدمی کو بلندی اپنی اپنی حیثیت سے عطا ہی کرتا ہے، عوام پر امتیاز بخشتا ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب ہنگام طلب کی خواریاں بیداری اور تنبیہ کا کام دیتی ہیں، عوام کا مجمع مولوی کے ہاتھ چومنے کے لیے ٹوٹتا ہے، اس وقت مولوی کا یہ خیال کہ ابھی کچھ دن پہلے گلیوں کی ٹھوکریں اور دروازوں کی جھڑکیاں کھاتا پھرتا تھا، سعید روحوں کو بے راہ روی سے باز رکھتی ہیں، مرض کے علاج کا کام دیتی ہیں۔ مولانا گنگوہی نے اس کے بعد فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مذاق ہے۔ اپنے دل کی حالت ہے۔ باقی جب زمانہ کا مطالبہ مطبخ کا ہے تو تمہیں اختیار ہے، دار العلوم کا موجودہ مطبخی نظام جس میں بحمد اللہ ابھی قدیم اصلاحی عناصر شریک ہیں، یہ حضرت گنگوہی کے اسی عطا فرمودہ اختیار کا نتیجہ ہے۔

فراہمی کتب

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ سوال کتابوں کی فراہمی کا بھی ہے۔ مطابع اور پریس کے اس زمانہ میں کچھ ایسا خیال پھیلا ہوا ہے کہ ایک تو یوں ہی اس زمانہ میں کتابوں کا مسئلہ پیچیدہ تھا خصوصاً ہندوستان کی تہی دامانی اور افلاس کے جو افسانے اس زمانہ میں بیان کیے جاتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں اس کی حالت سب سے زیادہ زبوں اور قابل رحم تھی، کسی صاحب کو کسی جگہ یہ واقعہ مل گیا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جب اپنی تفسیر فارسی ''فتح العزیز'' لکھنے بیٹھے تو امام رازی کی مشہور ''تفسیر کبیر'' بھی انہیں ہم دست نہ ہو سکی، بہ مشکل قلعۂ معلی کے شاہی کتب خانہ سے چند دن کے لیے عاریۃً ان کو یہ کتاب ملی تھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا مطالعہ

ممکن ہے خاص کر ''تفسیر کبیر'' کے متعلق کوئی ایسی خاص صورت شاہ صاحب کو پیش آ گئی ہو، لیکن اس جزئی واقعہ کو کلیہ بنالینا اور اسی بنیاد پر ہندوستان کے کتابی افلاس کا فیصلہ کر دینا بالکل عجیب ہے۔ آخر کسی تاریخ میں اگر یہ جزئی واقعہ کسی کو ملا ہے تو کیا تاریخ ہی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا نہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان تھا:

علمے دیدہ ام و یاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است (ملفوظات عزیزیہ۔ ص 36)

''یعنی جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کو یاد بھی رکھتا ہوں ان کی تعداد ڈیڑھ سو ہے۔''

اگر حضرت شاہ صاحب کی طرف اس واقعہ کا انتساب صحیح ہے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اتنے علوم کیا کتابی سرمایہ کے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں؟(1)

شاہ ولی اللہؒ کا وسعتِ مطالعہ

خود حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی کتابیں، ''تحفۂ دبستاں'' ان کے فتاویٰ، مولانا اسمٰعیل شہید کی ''عبقات'' اور

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تالیفات ''رائقہ علی الخصوص ازالہ''، ''حجۃ''، ''انصاف'' کیا ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لیے اس جزئیہ سے جو کلیہ بنایا گیا ہے کوئی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب اپنی کتابوں میں ابن حزم، ابن تیمیہ اور اُن سے پیشتر کے بزرگوں کے اقوال براہ راست ان کتابوں سے جو نقل فرماتے ہیں، قدیم فقہاء امام ابو یوسف، امام شافعی وغیرہمؒ کی کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں۔ حدیث کے جن نایاب متون سے آثار واحادیث نقل فرماتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ طباعت کے عام رواج کے باوجود آج بھی ہندوستان میں ان کتابوں میں سے بعضوں کا ملنا دشوار ہے۔ جن پر شاہ صاحب اور ان جیسے علماء کو دسترس حاصل تھی، مجھے خیال آتا ہے کہ ریاست ٹونک کے ایک امیر مرحوم عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں مصنف عبدالرزاق (متن حدیث کی نادر معتبر کتاب) کے ایک نسخہ کی نقل عرب سے خرید کر آئی تھی، اُس وقت کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب میں مصنف کا جو نسخہ ملا تھا، وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کتب خانہ ہی سے منتقل ہو کر عرب پہنچا تھا، غالباً شاہ صاحب کی مہر یا دوسرے علامات اس پر موجود تھے۔ (2)

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنہیں شاہ عبدالعزیزؒ بیہقی الہند کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے، ان کی ''تفسیر مظہری'' جس نے دیکھی ہے، خصوصاً حدیث کے متون کا تذکرہ جس طریقہ سے اس میں کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کتابیں ان کے پاس تھیں۔

ملا محب اللہ بہاریؒ کی علمی یادداشت

عالمگیری عہد کے مشہور عالم ملا محب اللہ بہاری (3) صاحب ''سلم''، ''مسلم'' کی کتاب ''مسلم الثبوت'' کا جو نسخہ مصر سے شائع ہوا ہے (4)، اس کے آخر میں ملا محب اللہ کی ایک خود نوشتہ عجیب یادداشت چھاپ دی گئی ہے، میں بجنسہٖ ناشر کتاب کے الفاظ کے ساتھ اسے نقل کرتا ہوں، ناشر نے یہ لکھ کر کہ:

> وجد باخر نسخة الاصلی مما ہو من کلام المولف لبیان ما اطلع علیه من کتب الاصول عند تالیف و تعلیق حواشیه مانصه
>
> ''مسلم الثبوت کے اصل نسخہ میں خود مولف کتاب کا بیان درج ہے جس میں بتایا گیا کہ اس کتاب اور اس کے حواشی کی تالیف کے وقت ان کے سامنے اصول فقہ کی کون کون سی کتابیں تھیں۔''

''مسلم الثبوت'' کی تصنیف کے وقت مصنف کے پیش نظر کتابیں

پھر اصل عبارت درج کی گئی ہے۔ حمد ونعت کے بعد ملا محب اللہ نے لکھا ہے کہ اصل کتاب کی تالیف سے

فارغ ہونے کے بعد میرے بعض دوستوں نے فرمائش کی کہ خود ہی اپنی اس کتاب کے مشکلات کی تشریح میں ایک حاشیہ لکھوں۔ بہر حال اصل متن اور اس کے حواشی لکھنے کے وقت جو کتابیں اُن کے سامنے تھیں، ان کی فہرست خود ان ہی کے قلم سے یہ ہے:

> واعلم انه قدجمع الله بفضله لدی حین تصنیفی لهذا الکتاب، من کتب الحنفیه کتاب البزدوی واصول السرخسی وکشف البزدوی و کشف المنار و البدیع وشرحة الشراح والتوضیح والتلویح التحریرلا بن الهمام و التقریر والتیسیر مع شروحه، ومن کتب الشافعیة المحصول للامام و الاحکام للامدی و شرح المختصر للقاضی و تعلیفاته مع حاشیة السیدالشریف والابهری وشرح الشرح للتفتازانی و حاشیة الفاضل میرزا جان، والردود و العنقود و المنهاج للبیضاوی وشرحه للاسنوی ومن کتب المالکیة المختصر و المنتهی لابن الحاجب.

> ''معلوم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے پاس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں حسب ذیل کتابوں کا ذخیرہ جمع کرا دیا تھا: حنفیوں کے اصول فقہ کی کتابوں میں سے تو البز دوی اور اصول سرخسی، کشف بزدوی، کشف المنار اور البدیع نیز البدیع کے۔ شارحوں نے جو اس کی شرحیں لکھی ہیں، توضیح وتلویح ابن ہمام کی تحریر (اس کی شرح) التقریر اور التیسیر اپنے مختلف شروح کے ساتھ یوں ہی شافعیوں کی کتابوں میں سے المحصول، امام رازی کی، الاحکام الامدی کی، شرح مختصر قاضی کی، نیز اس کے تعلیقات سید شریف کے حواشی کے ساتھ، الابہری کی شرح نیز تفتازانی کی شرح الشرح اور فاضل میرزا جان کا حاشیۂ الردود اور العنقود نامی کتابیں بھی۔ قاضی بیضاوی کی منہاج اور انہوں نے اس کی جو شرح لکھی ہے اور مالکیوں کی کتابوں میں ابن حاجب کی مختصر اور منتہی الاصول۔''

اہل علم جانتے ہیں کہ مُلّا محب اللہ نے اصولِ فقہ کی کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے، کتنی جامع اور حاوی فہرست ہے۔ اس فن کی اہم کتابوں میں خود ہی غور کیجیے کہ آخر کونسی کتاب رہ گئی ہے۔ صرف احناف کے اصول کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ شافعی مالکی اصول فقہ کی امہاتِ کتب بھی جب اس ملک میں پائی جاتی تھیں اور اہل علم کے زیرِ مطالعہ تھیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتابی سرمایہ کی کمی کا جو عام پروپیگنڈہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے متعلق کیا گیا ہے، اس میں اصلیت کا کتنا حصہ ہے۔

''فتاویٰ عالم گیری''

کتنی عجیب بات ہے، یہ سارے واقعات جن سے لوگ ناواقف نہیں ہیں، قطع نظر کر لیا گیا اور ایک امام رازی

کی تفسیر کے نہ ملنے کے قصہ کو اتنا اچھالا گیا کہ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند مکتبی اور درسی کتابوں کے سوا اس ملک میں اسلامی علوم کا شدید قحط تھا۔ عالمگیر کے عہد کی اصول فقہ کی فہرست آپ دیکھ چکے۔ میں کہتا ہوں کہ ''فتاویٰ عالمگیری'' پر کس عالم کی نظر نہیں پڑتی۔ انصاف شرط ہے، علم فقہ کی جن مشہور و غیر مشہور طویل ومختصر، معتبر و نامعتبر کتابوں کے بکثرت حوالے اس فتاویٰ میں دیئے گئے ہیں، کیا ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ شرح وقایہ، ہدایہ، کنز وقدوری اور اس کی معمولی شرحوں کے سوا ہندوستان میں فقہ کا ذخیرہ نہیں پایا جاتا تھا۔(5)

شاہ نورالحق دہلوی کے پیش نظر کتابیں

ہندوستان کی کتابی بے مائیگی کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر لوگوں کا اشارہ کن کتابوں اور کس قسم کی کتابوں کی طرف ہے۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ نورالحق جن کا ذکر میر مبارک محدث کے ذکر میں گزر چکا ان کی شرح بخاری، فارسی (6) میں موجود ہے۔ اس کے دیباچہ ہی پر یاروں کی نظر ہوتی تو شاید آج جن کتابوں پر ناز کیا جاتا ہے، وہ ناز باقی نہیں رہتا، ان کتابوں کا نام لیتے ہوئے جن سے شیخ نے اپنی شرح میں استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''زبدہ وخلاصہ ایں چند شرح کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی، شرح تراجم وقسطلانی کہ متداول علماء روزگار است۔'' (تیسیر القاری۔ج 1،ص3)

خط کشیدہ الفاظ قابلِ غور ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کی یہ شروح علماء ہند میں عام طور پر عہد جہانگیری وشاہجہاں میں متداول تھیں۔ جامعہ عثمانیہ میں چند سال ہوئے ایک امیر کا قلمی کتب خانہ آیا تھا، اس میں بھی فتح الباری قلمی، عینی قلمی موجود تھی۔ انتہا یہ ہے کہ کتاب الاسرار ابوزید دبوسی بھی اس کتب خانہ میں تھی۔

مسلم سلاطین کی علم پروری

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دلی کی مرکزی حکومت بلکہ صدیوں کی طوائفی حکومتوں کی تاریخ پڑھنے، شادی آباد مانڈو (سی۔ پی) احمد آباد (گجرات) لکھنوتی یا گور (بنگال) کے سوا دکن چاروں حکومتوں میں علم وفن کے عشاق سلاطین جو گزرے ہیں، اور ان کے شاہی کتب خانوں میں دنیا جہان سے ہر فن کی جو کتابیں منگائی جاتی تھیں۔ خود ہر ملک سے علماء اپنے ساتھ کتابیں لاتے تھے اور تحفوں میں بادشاہوں کے پاس پیش کرتے تھے۔

غیر ملکی علماء ہندوستان میں

دوسرے ممالک کے سلاطین ہندی بادشاہوں کے پاس مسلسل سفارتیں بھیجتے رہتے تھے، خود پائے گاہ خلافت سے بھی خلعت اور سند حکومت اس ملک کے سلاطین کے نام وقتاً فوقتاً جو آتی رہتی تھی، اگر ان تعلقات سے لوگوں کو واقفیت

ہوتو ہندوستان کی کتابوں کے افلاس کا افسانہ ان کے لیے افسانہ بن کر رہ جائے گا۔ براہ خشکی اور براہ دریا(7) اسلامی ممالک سے آنے والوں کا جوتانتا اس ملک میں بندھا ہوا تھا، صرف ایک علی عادل شاہ فرماں روائے بیجاپور کے پاس محض شیراز سے جو لوگ آئے اور انعام واکرام ووظائف لے کر واپس ہوئے ان کی تعداد خود ایک شیرازی رفیع الدین جو علی عادل شاہ کا خانسامانِ شاہی تھا، دس ہزار بتاتا ہے۔ میں کسی دوسری جگہ ایک اور ضرورت سے اس کی عبارت بھی نقل کروں گا۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے محمد تغلق کے حالات میں لکھا ہے:

''درآں سال چنداں مردم از ولایت خراسان وعراق وسمرقند بامید بخشش سلطاں درہند آمدند کہ دریں دیار بغیر از ایشاں طائفۂ دیگر کم بہ نظر می آمد۔'' (بداؤنی۔ ج1، ص232)

''اس سال خراسان، عراق اور سمرقند سے اتنے آدمی سلطان کے انعام واکرام کی امید پر ہندوستان آئے کہ اس ملک میں ان کے سوا کوئی دوسرا کوئی ایسا کم نظر آتا تھا۔''

سکندر لودھی کی علم نوازی

کچھ ایک اسی بادشاہ کے زمانہ کا یہ حال نہیں ہے، سکندر لودھی جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے شیخ محدث نے اس علم پرور معارف نواز بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''از اکناف عالم از عرب وعجم بعضے بہ سابقۂ استدعا وطلب وبعضے بے آں درعہد دولت او تشریف آوردہ وتوطن ایں دیار را اختیار کردند۔'' (اخبار الاخیار۔ ص227)

''اکناف عالم عرب وعجم سے کچھ سابق بلاوے پر اور کچھ بغیر بلائے اس کی حکومت کے زمانہ میں تشریف لائے اور اسی ملک میں وطن اختیار کر کے بس گئے۔''

صرف دلی (پایۂ تخت) ہی کی یہ کیفیت نہ تھی، صوبوں میں جو مستقل حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوتی رہیں اُن کی قدردانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔

شاہ محمود خلجی

شادی آباد مانڈو (مالوہ) کے بادشاہ محمود خلجی کے ذکر میں مورخین لکھتے ہیں:

''زربہ اطراف عالم فرستادو مستعداں را طلب داشت وبالجملہ بلاد مالوہ درزمان او یونان ثانی گشت۔'' (مآثر رحیمی۔ ج1 ص125)

''اطراف عالم میں روپے بھیجے اور ذی استعداد کو بلایا، ماحصل یہ ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں مالوہ ــــ یونان ثانی بن گیا۔''

اور مغلیہ حکومت ہمایوں کے زمانہ میں جب زیر بار منتِ ایران ہوئی، تو اس وقت کا حال ظاہر ہی ہے بقول بداؤنی کتنے

ایسے تھے کہ:

پار بودم قطبک و امسال قطب الدین شدم
گر بیایم سال دیگر قطب دین حیدر شوم

جب ''قطبکوں'' کی یہ کیفیت تھی، تو اسی سے اندازہ کیجیے کہ جو لوگ واقعی الملۃ والدین تھے ہندوستان نے ان کے کھینچنے میں کیا کمی کی ہوگی، پھر کیا جوق در جوق علماء کا جو گروہ ہندوستان کھنچا چلا آ رہا تھا، وہ خالی ہاتھ آتا تھا(8)۔ مشہور تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو بلایا جاتا تھا، خود نہ آتے تو اپنی مصنفہ کتابیں ہندوستان بھیج دیتے تھے۔

سلطان محمد شہید کی خدمت میں شیخ سعدی شیرازی کے علمی تحفے

بداؤنی میں بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد شہید صوبہ دار ملتان (پنجاب) کے ذکر میں ہے کہ:

دو نوبت زر بسیار از ملتان بشیراز فرستادہ التماس قدوم شیخ سعدیؒ علیہ نمود و شیخ بعذر پیری نیامد اما بہ تربیت میر خسرو سلطان را وصیت فرمود، وسفارش او فوق الحد نوشتہ وگلستاں و بوستاں نہ سفینہ اشعار بخط خود ارسال داشت۔'' (ج1، ص130)

''ملتان سے دو مرتبہ کافی روپے شیراز روانہ کیا اور شیخ سعدیؒ سے آنے کی درخواست کی لیکن شیخ بڑھاپے کے عذر کی وجہ سے نہیں آئے، مگر میر خسرو کے لیے بادشاہ کو تاکید لکھ بھیجی، اور ضرورت سے زیادہ سفارشی کی، نیز گلستاں، بوستاں اور سفینۂ اشعار (اپنے قلم سے لکھے ہوئے) روانہ کیا۔''

اور اس قسم کے واقعات نادر نہیں ہیں، بنگال سے حافظ شیراز کی طلبی، یا دکن میں مولانا جامیؒ اور دوسرے علماء کی دعوت کے قصے زباں زدِ عام ہیں۔ ہندوستان کتابوں کے مسئلہ میں کتنا چوکنا اور بیدار رہتا تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

سلطان محمد تغلق کی علم دوستی

قاضی عضد نے ''مواقف'' کا متن جب لکھا تو محمد تغلق نے اس کتاب کو اپنے نام معنون کرنے اور قاضی صاحب کو ہندوستان بلانے کے لیے ایک خاص عالم کو شیراز روانہ کیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''آوردہ اند کہ سلطان محمد مولانا معین الدین را بہ ولایت فارس نزد قاضی عضد ایجی فرستادو التماس نمود کہ بہ ہندوستان تشریف آرد و متن مواقف را بہ نام او را سازد۔'' (مآثر۔ص185)

''بیان کیا گیا کہ سلطان نے مولانا معین الدین کو فارس قاضی عضد ایجی کی خدمت میں بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان تشریف لائیں اور ''مواقف'' کو ان کے نام انتساب کریں۔''

آج تو اس مردہ قوم کے متعلق آپ جو چاہیں رائے قائم کریں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے جو ذوق تھا(9) اس وقت صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، چونکہ بحث صرف ہندی نظامِ تعلیم تک محدود ہے، ورنہ سفر میں اسلامی علماء کتابوں کی جو مقدار اپنے ساتھ رکھتے تھے سُن کر لوگوں کو حیرت ہوتی۔ چالیس چالیس، پچاس پچاس اونٹوں پر بعض علماء اپنے ساتھ کتابیں بھی ساتھ لیے پھرتے تھے۔ خود صاحبِ ''قاموس'' کا بھی یہ حال تھا۔ اسی ہیئت کے ساتھ وہ ہندوستان بھی پہنچے تھے۔

ہندوستانی علماء کا کتابوں سے ذوق

آخر آخر زمانہ تک اسی ہندوستان کے مولویوں کا کتابوں کے ساتھ یہ ربط تھا کہ ملا عبدالنبی احمد نگری جو بارہویں صدی کے عالم ہیں، اپنی کتاب ''دستور العلماء'' میں احمد نگر کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے بچپن کے زمانہ میں مرہٹوں نے ایک دفعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ فوجدار شہر جس کا نام ابراہیم خان تھا، مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ کھڑا ہوا مرہٹوں نے شہر میں آگ لگا دی۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں:

''راقم الحروف دراں وقت بہ سن بلوغ نرسیدہ بود با والد ماجد مرحوم بعد نماز ظہر بقلعہ رفت۔''

''راقم اس زمانہ میں سن بلوغ نہیں پہنچا تھا، والد ماجد مرحوم کے ساتھ نماز ظہر قلعہ گیا۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے والد جو احمد نگر کے قاضی بزرگ تھے، انہوں نے اپنے نوکروں چاکروں کو حکم دیا کہ:

''مستورات را بہر عنوان بقلعہ رسانند و اہتمام فرستادن کتب خانہ از ہمہ اسباب خانہ پیش تر را دانند چنانچہ شیخ مذکور (خادم قاضی) را در جائے نماز ہائے مسجد جامع بستہ بر سر مزدوراں فرستاد۔'' (ج 3، ص 41)۔

''جیسے بن پڑا عورتوں کو قلعہ پہنچایا، پھر تمام اسباب خانہ کے پہلے کتب خانہ کو منتقل کرنے کی فکر ہوئی، چنانچہ جامع مسجد کے جائے نمازوں میں باندھ کر مزدوروں کے سر پر ڈالا اور وہاں سے اسے منتقل کیا۔''

حالانکہ سارا شہر جل رہا تھا، مرہٹے گھروں میں گھس کر لوٹ مار مچائے ہوئے تھے، لیکن اس کتابی ذوق کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایسی حالت میں بھی قاضی صاحب کے سامنے سب سے زیادہ جو چیز اہم تھی، وہ کتابوں کا معاملہ تھا۔ ملا عبدالنبی خود لکھتے ہیں کہ مستورات اور کتابوں کے سوا

''اثاث البیت و دولت کہ در خانہ ماندہ بود ہمہ بغارت رفت۔''

''گھر کا سارا سامان جو کچھ تھا سارا تباہ و برباد ہو گیا۔''

یہ اثاث البیت جن کو چھوڑ کر قاضی صاحب نے صرف کتابوں کے بچا لینے کو سب سے اہم خیال کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی،

ملا عبدالنبی نے ایک دیکھنے والے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''از خانہ شریعت پناہ (قاضی صدر) دوازدہ شتر از ظروف وفروش وغیرہ متاع خانہ بار کردہ بروند۔''

''قاضی شریعت کے گھر سے بارہ اونٹ سامان جیسے ظروف وفروش وغیرہ لاد کر لے بھاگے۔''

بارہ اونٹوں کا ساز و سامان چھوڑ دیا گیا اور صرف کتابیں بچ گئیں۔اسی کو قاضی صاحب نے غنیمت خیال کیا۔یہ آخر زمانہ کی بات ہے جب مرہٹوں کا تسلط اس ملک پر ہو چکا تھا۔اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمان آثارِ حیات سے لبریز تھے، ان کا کیا حال ہوگا۔

سلیمہ سلطان بیگم کا علمی ذوق

ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اکبر کے شاہی کتب خانہ سے ایک کتاب ''خردافزا'' نامی گم ہوگئی تھی شاہزادی سلیمہ سلطان بیگم کو اس کتاب کی ضرورت ہوئی، کتب خانہ میں نہ ملی، شاہی کتب خانہ ایک زمانہ میں ملا عبدالقادر کی نگرانی میں تھا۔ لیکن ملازمت ترک کر کے وہ بداؤں چلے آئے تھے۔صرف اس کتاب کی تلاش میں شاہزادی نے کتنی دلچسپی لی، اس کا اندازہ ملا صاحب کے اس بیان سے کیجیے، فرماتے ہیں:

''بہ تقریب نامۂ خردافزا کہ از کتاب خانہ گم شدہ بود مجملے سلیمہ سلطان بیگم مرا چند مرتبہ یاد فرمودند، ہر چند قاصداں از یاراں ببداؤں رفتند بہ تقریب مواقع آمدن نشد آخر حکم کردند کہ مدد معاش اورا موقوف دارند وخواہی نخواہی طلبند (ج 3، ص 377)

''نامۂ خردافزا نامی کتاب کتب خانہ سے گم ہوگئی، اس سلسلے میں سلیمہ سلطان بیگم نے چند بار مجھے یاد کیا اور بارہا قاصد بدایوں گئے مگر آنے کا موقع میسر نہ آیا، آخر حکم دیا کہ جب تک میں حاضر نہ ہو جاؤں اس وقت تک جاگیر ضبط رکھی جائے۔''

خیال تو کیجیے کہ ایک کتاب کی کیا حقیقت ہے۔لیکن شاہزادی کے علمی مذاق کا یہ حال ہے کہ بہرحال اس کا پتہ چلانا چاہیے، ملاؔ کو جاگیر کی دھمکی دی جاتی ہے۔

کتابوں کی فراہمی کا نظم

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کے ساتھ ہی بیرونی اسلامی ممالک سے آمد و رفت کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا، حج کا قافلہ بھی خصوصاً مغلوں کے عہد میں لاکھوں لاکھ روپے کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔اس کا کام ایک کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی تھا۔اکبر نے سب کچھ بند کر دینے کے باوجود حج کے قافلہ کی روانگی کو بدستور جاری رکھا۔

نوادر (10) علوم کی کتابوں کا اکبر کتنا شائق تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے پاس تحفے اور ہدیے میں عرب سے لوگ کتابیں بھیجا کرتے تھے، اسی ذوق وشوق کا نتیجہ تھا کہ نادر کتابیں اس کے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حموی کی ''معجم البلدان'' جیسی ضخیم کتاب صرف یہی نہیں کہ اکبر کے کتب خانہ میں موجود تھی بلکہ ملا عبدالقادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ بھی اکبر نے کرایا تھا۔

اکبر کی علم دوستی اور ''معجم البلدان'' کا ترجمہ

اس کتاب کے ترجمہ میں جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانہ میں انسائیکلوپیڈیا وغیرہ جیسی کتابوں کی تالیف میں بجائے واحد شخص کے مصنفوں اور مؤلفوں کی ایک جماعت سے جو کام لیا جاتا ہے اکبر اپنے زمانہ میں اس پر عمل پیرا ہو چکا تھا، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:

''دوازدہ کس فاضل را جمع نمودہ چہ عراقی و چہ ہندی وآں را مجزی (جزء پر تقسیم کر کے) ساختہ تقسیم فرمودند مقدار دو جز حصہ فقیر رسید در عرض یک ماہ ترجمہ کردہ پیش تر از ہمہ گزرانیدہ وسیلۂ التماس بجانب بداؤں ساختم وبدرجہ قبول پیوست۔'' (ج 3، ص 375)۔

''بارہ فضلاء کو جمع کیا، ان میں عراقی و ہندی کی کوئی تمیز نہ تھی، اور اس کتاب کو جز پر تقسیم کر کے سبھوں پر بانٹ دیا۔ دس جز فقیر کے حصہ میں بھی آیا، تمام سے پہلے ترجمہ کر کے حاضر کر دیا، اور بداؤں کی اجازت حاصل کی۔''

اجتماعی تالیف کا یہ طریقہ اکبر نے کچھ اسی ایک کتاب کے ترجمہ میں اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ''مہابھارت'' اور ''تاریخِ کشمیر'' کے ترجمہ میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی تھی، نیز اکبر نے ''تاریخ الفی'' جو اپنے زمانہ میں مرتب کرائی تھی، سب کا یہی حال تھا۔

عالمگیر کی علم پروری

خود ہندوستان کا وہ سرمایۂ ناز فقہی کارنامہ یعنی ''فتاویٰ ہند'' یہ جو عام طور سے ''فتاویٰ عالمگیری'' کے نام سے مشہور ہے، جس کے متعلق میں نے شاہ ولی اللہؒ کے مقالہ میں ان ہی کی زبانی یہ شہادت نقل کی ہے کہ بادشاہ بہ نفس نفیس خود اس کتاب کی تدوین میں عملاً اُسے غور سے سنتے تھے، روزانہ جتنا کام ہو چکتا تھا بالالتزام لفظاً لفظاً اُسے غور سے سُنتے تھے، موقعہ موقعہ سے مناسب اصلاح وترمیم بھی بادشاہ کی طرف سے عمل میں آتی تھی، شاید یہ خصوصیت ہندوستان ہی کی اس فقہی کتاب کو حاصل ہے کہ عالمگیرؒ جیسا بادشاہ اس کے اراکین تدوین میں خود شریک تھا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح اکبر ایک ایک کتاب کو بجائے شخص واحد کے چند آدمیوں سے مرتب کراتا تھا، عالمگیر نے بھی اپنے اس ''فتاویٰ'' کی تدوین کا کام علماء کی ایک کمیٹی کے سپرد کیا تھا۔ افسر اعلیٰ تو اس سررشتہ کے مُلا نظام جو غالباً بُرہان پور کے رہنے والے ہیں، تھے۔ لیکن ان کے سوا چار اور اراکین کے نام بھی تاریخوں میں لیے جاتے ہیں۔

''فتاویٰ عالمگیری'' کی تدوین

''تاریخ مرأۃ عالم'' کے حوالے سے بُرہان پور کی تاریخ میں یہ فقرہ منقول ہے کہ علاوہ ملا نظام افسر تدوین کے:

''یک (11) ربع مفوض بہ قاضی محمد حسین جون پوری محتسب عسکر، ویک ربع بہ سید علی اکبر سعد اللہ خانی ویک ربع بہ ملا حامد جون پوری تلمیذ میرزا زاہد ویک ربع محمد اکرام لاہوری معلم شاہزادہ کام بخش بود'' (ص 43)

''ایک چوتھائی قاضی محمد حسین جون پوری محتسب فوج کے سپرد کیا اور ایک چوتھائی سید علی اکبر سعد اللہ کے اور ایک چوتھائی مرزا زاہد کے، جو ملا حامد جونپوری کے شاگرد تھے اور ایک چوتھائی محمد اکرام لاہوری کے حوالہ کیا، جو شاہزادہ کام بخش کے استاد تھے۔''

کم از کم مجھے نہیں معلوم کہ تصنیفی کاروبار نے کسی دوسرے اسلامی ملک میں اتنی وسعت حاصل کی تھی کہ حکومت نے ایک ایک کتاب کی تالیف کے لیے علماء کی باضابطہ کمیٹیاں مقرر کی ہوں، اس سے ملک کے بادشاہوں کے علمی وکتابی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے سامنے سلاطین ہند کا علمی پہلو نہیں ہے کہ وہ تو خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے۔ کاش کسی کو اس کے جمع کرنے کی توفیق ہو۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی علم سے دلچسپی

میں صرف ان کی کتابوں سے دلچسپیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں، ظاہر ہے۔ کہ جس ملک کے بادشاہوں کو کتابوں کے جمع کرنے کا والہانہ شوق ہو، کیا اسی ملک کے متعلق کتابی قحط کا شکوہ صحیح ہوسکتا ہے، افسوس ہے کہ شاہی کتاب خانوں کی کتابیں بھی اور ان کتابوں کے ساتھ ان کی فہرستیں بھی انہی ممالک میں منتقل ہوگئیں جہاں ان کا خزانہ منتقل ہوا، جواہرات منتقل (12) ہوئے۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ دلّی کے سلاطین ہوں یا صوبجات کے ملوک اپنے اپنے زمانہ میں علم کی کتنی بڑی دولت ان لوگوں نے جمع کی تھی، کبھی کبھی پرانے کتب خانوں میں جواب بھی ہندوستان کے بعض مقامات میں بطور بقیۃ السیف کے رہ گئی ہیں، وہ کتابیں نظر آجاتی ہیں جن پر سلاطین کی مہریں یا ان کے قلم سے کتاب کے متعلق کوئی یادداشت ثبت ہے۔

کتب خانہ خدا بخش پٹنہ

علی الخصوص عظیم آباد پٹنہ المعروف بہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں خدا بخش مرحوم نے ایسی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

کتاب خانہ حبیبیہ علی گڑھ

اس زمانہ میں عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے زر کثیر صرف فرما کر جہاں جہاں

سے ممکن ہوا ہے ان جواہر پاروں کا ایک قیمتی مجموعہ اپنے ''کتب خانہ حبیبیہ'' میں جمع بھی کیا ہے اور یہ مشغلہ ابھی جاری ہے۔

وزیر خواجہ جہاں گیلانی کا کتب خانہ

اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک صوبجاتی حکومت بیدر کے مشہور علم دوست وزیر خواجہ جہاں گیلانی مشہور بہ محمود گاواں کے کتب خانہ کے متعلق مولوی ابوالحسنات مرحوم نے ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں والی کتاب میں ''حدیقۃ الاقالیم'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''پینتیس ہزار کتابیں مختلف علوم وفنون کی نکلیں۔'' (ص60)

یہ بادشاہی کتاب خانہ نہیں بلکہ ایک وزیر کے کتب خانہ کی کتابوں کی تعداد ہے۔

ملا فیضی کا کتب خانہ

شاہنواز خاں نے ''مآثر الامراء'' میں نقل کیا ہے کہ جب مُلا فیضی کا انتقال ہوا اور اکبر نے ان کے ذاتی کتب خانہ کے ضبط کا فرمان نافذ کیا تو معلوم ہوا کہ:

''نزد شیخ (فیضی) چہار ہزار و سہ صد کتب صحیح ونفیس داخل سرکار بادشاہ شد۔''

(ج1،ص585)

''چار ہزار تین سو صحیح ونفیس کتابیں شیخ فیضی کے یہاں سے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں۔''

خیال تو کیجیے ایک شخص جو نہ بادشاہ ہے اور نہ وزیر بلکہ عہد اکبری کا ایک عالم امیر ہے۔ اس کے کتب خانہ سے چار چار ہزار صحیح ونفیس کتابیں جس زمانہ میں برآمد ہوتی تھیں۔

کتب خانہ مفتی صدرالدین

کہا جاتا ہے اسی ملک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کتابوں کے لحاظ سے ہندوستان میں خاک اُڑتی تھی اور یہ لوگ تو خیر گونہ حکومت سے تعلق بھی رکھتے تھے، مفتی آزردہ بطنی مولانا صدرالدین خاں صاحب (جو اُجڑی دِلی کے مفتی تھے) لیکن باوجود اس کے ان کے براہ راست شاگرد مولوی فقیر محمد صاحب نے اپنی کتاب ''حدائق الحنفیہ'' میں لکھا ہے کہ غدر کے مقدمہ میں مفتی صاحب کو جب رہائی حاصل ہوئی تو لاہور تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی کورٹ میں نیلام ہوا تھا، حضور لارڈ جان لارنس کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دِلی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے، مطالبہ کیا لیکن جائیداد منقولہ کا واپس ہونا معذر تھا اس لیے مطلب میں کامیاب نہ ہوسے (حدائق۔صفحہ 482) تین لاکھ کی کتابوں کی تعداد کیا ہوگی، خود سوچنا چاہیے۔

کتب خانہ میر محمد علی

مولوی ابوالحسنات مرحوم نے ایک گمنام مولوی میر محمد علی کا ذکر کیا ہے جو مہابت جنگ کے زمانہ میں عظیم آباد سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔ لکھا ہے کہ اکیلے اس مولوی کے پاس دو ہزار کتابوں کا کتب خانہ تھا۔ تلاش کیا جائے تو عہد اسلامی میں ایسے ذاتی کتب خانوں کا اور بھی پتہ چل سکتا ہے۔

سید ابراہیم دہلوی کا کتب خانہ

سکندر لودھی کے عہد کے ایک غیر مشہور عالم سید ابراہیم دہلوی کا تذکرہ فرماتے ہوئے شیخ محدث دہلوی نے ''اخبار'' میں لکھا ہے:

''چنداں کتب و اکثر بخط او از کتاب خانہ او برآمدہ کہ از حد و حصر خارج۔'' (ص 25)

''ان کے کتب خانہ سے اس قدر کتابیں نکلیں کہ حد و شمار سے خارج ہیں اور ان میں اکثر کتابیں خود ان کے قلم کی لکھی ہوئی تھیں۔''

''اکثر بخط او'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ جب خطاطی کا ہنر کسی صاحب ذوق کے اندر موجود ہو، وہ جا ہے جتنی کتابیں بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہ چند سرسری واقعات ہیں جو میں نے اِدھر اُدھر سے بغیر کسی مزید کدوکاوش کے پیش کر دیے ہیں۔ ان واقعات کو ایک طرف رکھیے اور اس کے بعد اس لطیفے کی حقیقت پر غور کیجیے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس ''تفسیر کبیر'' بھی موجود نہ تھی، ہو سکتا ہے کہ نہ موجود ہو لیکن کسی عالم کے پاس اگر کوئی کتاب اتفاق سے نہ پائی جائے تو کیا اس کا یہ مطلب صحیح ہو سکتا ہے کہ ایسا ملک دُنیا جہان کی ساری علمی کتابوں سے قطعاً خالی تھا۔

ایک علمی بحث اور اس کے لیے کتابوں کی طرف رجوع

آج جس ہندوستان میں شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق امام رازیؒ کی تفسیر کا ایک حال یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ اُسی ہندوستان کے متعلق مولانا غلام علی آزاد یہ واقعہ خود ''تفسیر کبیر'' رازی ہی کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ ان کے استاد یعنی استاد المحققین میر طفیل محمد صاحب آغاز شباب میں آگرہ تشریف لے گئے۔ وہاں نواب فضائل خاں کے دربار تک ان کی رسائی ہوئی۔ نواب نے چند مولویوں کو سامنے پا کر مشہور قرآنی آیت ''**علی الذین یطیقونہ** ''(13) کا ذکر چھیڑ دیا۔ عام توجیہہ کہ بابِ افعال کی ایک خاصیت سلب مادہ بھی ہے، اس لیے مطلب یہ ہے جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو، اس کا ذکر ہوا، اس پر میر طفیل محمد صاحب نے فرمایا کہ:

''ہمزۂ سلب در باب افعال سماعی ست نہ قیاسی۔''

''ہمزہ سلب باب افعال میں سماعی ہی قیاسی نہیں ہے۔''

یعنی باب افعال کے ہر لفظ میں اس خاصیت کو مان لینا صحیح نہ ہوگا، جب تک خود لفظ اطاقت کے متعلق ائمۂ لغت سے اس کی تصریح نہ دکھادی جائے کہ سلب مادہ کی حیثیت سے عربی زبان میں اطاقت کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ میر طفیل محمد کا بیان ہے کہ اتنی سے معمولی بات کے لیے

''تفسیر کبیر امام رازی وکشاف و بیضاوی وتفاسیر دیگر، واز لغت کتب صحاح جوہری وقاموس وغیرہ ملاحظہ کردند۔'' (مآثر الکرام۔ ص 151)

''تفسیر کبیر، وکشاف، بیضاوی اور دوسری تفسیریں اور کتب لغت میں سے صحاح، جوہری اور قاموس وغیرہ دیکھی گئیں۔''

مجھے اس وقت اصل مسئلہ سے بحث نہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ معمولی معمولی مسئلوں کے لیے جس ملک میں ''تفسیر کبیر'' نکلا کرتی تھی، اسی ملک کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں کہ محض ایک شاہ عبدالعزیزؒ کے واقعہ کی وجہ سے اس پر فقدانِ کتب یا کتابی افلاس کا الزام لگانا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے؟۔

حواشی

(1) افسوس کہ باوجود تلاش کے مجھے ایک چیز نہیں ملی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شاہ عبدالعزیز کے کتب خانہ میں پندرہ بیس ہزار کتابیں تھیں، شاہ صاحب نے ان سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس وقت حوالہ یاد نہ رہا۔ علوم کے بالاتر اعداد پر متحیر نہ ہونا چاہیے کیونکہ مسلمانوں نے علوم کی فروعی تقسیموں کو بہت پھیلا دیا تھا۔ صرف حدیث ومتعلقات حدیث ہی کی تعداد اتنی سے متجاوز ہے۔ وقس علی ہذا۔

(2) ''تذکرۂ رحمانیہ'' جو محدث پانی پتی حضرت قاری عبدالرحمٰنؒ کی سوانح عمری ہے، اس میں لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب حضرت شاہ اسحٰق صاحب اور ان کے بھائی شاہ یعقوب دونوں ہجرت کی نیت سے عرب روانہ ہونے لگے، تو کتب خانہ حضرت شاہ صاحب (شاہ اسحٰقؒ) نے بوقت ہجرت اپنے ساتھ لیا، اس کا وزن نو من تھا۔ اس کے علاوہ جتنا ذخیرہ باقی رہا اس کے متعلق مجھے (قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور نواب قطب الدین خاں صاحب) کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کردیا جائے، چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی (ص 51)۔ یہ روایت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے حوالے سے منقول ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہؒ کے کتب خانہ کا ایک حصہ عرب منتقل ہوا۔ مصنف عبدالرزاق غالباً اسی ذریعہ سے مدینہ پہنچا۔

(3) جن اسماء واعلام کا ذکر میری اس کتاب میں آیا ہے اگر سب پر تشریحی نوٹ دینے کا التزام کیا جاتا تو کتاب خدا جانے کتنی ضخیم ہوجاتی۔ مگر بعض خاص معلومات کا جن سے تعلق ہے، دل ان کے چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں۔ یہ مُلّا محب اللہ جو اپنی نسبتِ بہاری سے ظاہر ہے کہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں، مولانا آزاد نے ''سبحۃ المرجان'' میں لکھا ہے کہ کڑا نام گاؤں جو محب علی پور پرگنہ سے صوبۂ بہار میں تعلق

رکھتا ہے، پیدا ہوئے اور بہار کی ایک شریف قوم ملک جس کی اس زمانہ میں بھی اس صوبہ میں معقول تعداد ہے، اور دینی و دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں میں امتیاز رکھتی ہے، نہ صرف قدیم بلکہ جدید تعلیم یافتوں کا ایک بڑا طبقہ بہار میں ملک ہی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی کتاب ''سلم'' و ''مسلم'' جو بقول مولانا شبلی درس نظامیہ کے نصف نصاب کو اپنے نیچے تقریباً دو سو سال اس نے دبائے رکھا، قاضی حمد اللہ، مُلا حسن، مُلا مبین، شرح سلم بحر العلوم، یہ نظامیہ درس کی مشہور کتابیں ''مسلم'' ہی سے تعلق رکھتی ہیں (دیکھیے مقالات شبلی۔ مضمون درس نظامیہ) لیکن بظاہر اسی چیز نے ملا محب اللہ مرحوم کو محسود اقران بنا دیا۔ یوں تو اپنے زمانہ میں دنیاوی حیثیت سے ترقی کے اس آخری نقطہ پر پہنچ کر رہے جو ملا گیری کے پیشہ کرنے والوں کی معراج کمال تھا، یعنی شاہ عالم بن اورنگ زیب نے بر سر حکومت آنے کے بعد ان کو بقول مولانا آزاد ''صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان'' کے منصب جلیل پر سرفراز کیا، جو ہندوستان میں شیخ الاسلامی کے عہدہ کے مرادف تھا، یوں بھی وہ کبھی اودھ (لکھنؤ) اور دکن میں حیدر آباد کے قاضی رہے، آخر میں اورنگ زیب نے اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم کے لیے شاہ عالم گورنر کابل کے ساتھ کابل بھی بھیج دیا تھا۔ اس سے اُس زمانے کے مسلمانوں کی الوالعزمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہار میں پیدا ہوئے، شمس آباد (قنوج) میں قطب الدین شمس آباد سے تعلیم حاصل کی، ابھی لکھنؤ میں ہیں، کل دکن میں، پرسوں کابل میں، بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ملا کو محسود اقران بنا دیا اور ان کو بدنام کرنے کی یہ عجیب کوشش کی گئی کہ کسی صاحب نے منطق میں ایک رسالہ لکھا جس کے عام مسائل کی عبارتیں ہی نہیں بلکہ ''سُلّم'' کا مشہور معرکتہ الاراء دیباچہ ''سبحانہ ما اعظم شانہ'' سے ملتا جلتا خطبہ بھی لکھا۔ مولانا محمود الحسن ٹونکی کی قلمی کتاب ''معجم المصنفین'' میں کچھ الفاظ اس کے نقل بھی کیے ہیں۔ **الحمد لمن هو عن الكلية و الجزئية تعالىٰ وعن الجنس والفصل تبرى فلا يحدفلايحديه نعم يتصور بوجه يمتازبه** اور لطیفہ یہ گھڑا کہ مشہور معقولی و کلامی مصنف مرزا جان کی طرف اُس کو منسوب کر دیا، مقصد یہ تھا کہ محب اللہ کی کتاب سرقہ ثابت ہو۔ تماشے کی بات یہ ہے کہ ایک ایرانی عالم کی کتاب ''روضات الجنات'' جس میں علماء کے حالات ہیں خود مرزا جان اور ان کے معاصر ابوالحسن الکاشی کے متعلق لکھا ہے۔ **كان منتحلان من كثير الكتب الغير المتداوله** (ص 566)۔ (یعنی یہ دونوں غیر مشہور کتابوں سے چرایا کرتے تھے) لکھا ہے کہ زیادہ تر غیاث منصور کی کتابوں سے یہ دونوں حضرات سرقہ کیا کرتے تھے۔ غالباً مرزا جان کی طرف منسوب کرنے کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ وہ خود اس مسئلے میں بدنام تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''سلم'' جیسی کتاب اگر مرزا جان صاحب کے قلم سے پہلے ہی نکل چکی ہوتی تو جہاں ان کی معمولی بیسیوں کتابیں علماء میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسا متن متین گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑ جاتا، نیز مُلا محب اللہ کی عبارت میں جو آمد ہے، اور اس جعلی کتاب میں جو آورد ہے خود دلیل ہے اس کے جعلی ہونے کی۔ محب اللہ ایک خاص طرز تعبیر کے موجد ہیں، ''سلم'' میں بھی ان کا یہی رنگ ہے لیکن مرزا جان کی کسی کتاب کی عبارت ''سلم'' کی طرز کی نہیں ہے۔

(4) یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان بلکہ اسلام کے مشرقی علاقوں کی تصنیفات کا رواج اسلام کے مغربی علاقوں مثلاً افریقہ یا اندلس میں کم ہوا۔ خصوصاً پچھلی صدیوں میں جو کام مشرقی ممالک میں ہوا اس سے مغربی علاقوں کے علماء زیادہ واقف نہ تھے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ آٹھویں صدی کے مشرقی علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **فلم ترلهم من بعد الامام ابن الخطيب و نصير الدين الطوسى كلا مايعول على نهاتة فى الاصابتة** (479) مطلب یہ ہے کہ ابن الخطیب یعنی امام رازی اور طوسی کے بعد ابن خلدون کو مشرقی ممالک کے علماء کی کوئی قابل ذکر معتبر کتاب نہ مل سکی، پھر خود ہی لکھا ہے کہ **به مشكل قد دلنا على ذلک كلام بعض علمائهم فى تاليف و صلت الينا الى هذه البلاد وهو سعدالدين التفتازانى** (ایضاً) جس کا مطلب یہی ہوا کہ علامہ تفتازانی کی بعض کتابیں ابن خلدون تک پہنچی تھیں حالانکہ اسی زمانہ میں قطب الدین شیرازی، قطب الدین دہوی، سید شریف

جرجانی، سعدالدین دوانی جیسے ارباب تحقیق کا قلم ان ممالک میں جواہر پاشیوں اور درافشانیوں میں مصروف تھا۔

(5) اورنگ زیب عالمگیر ہی کیا یہ تو اُس زمانہ کی کتاب ہے جب ہندوستان اسلام کے قدیم اوطان میں ایک پرانا وطن بن چکا تھا، تتارخانیہ جو فیروز تغلق کے عہد میں مرتب ہوا، اسی کے دیباچہ کو کوئی پڑھ لیتا تو سمجھ سکتا تھا کہ ہندوستان کتابی حیثیت سے مغلوں ہی کے عہد میں نہیں بلکہ ان سے بھی پہلے اور بہت پہلے کتنا مالدار تھا۔ فقہ حنفی کے حاویات، مبسوطات، مجامع، مجتبیوں اور فتاویٰ کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کا تتارخانیہ کے دیباچہ میں یہ کہتے ہوئے ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ تدوین کتاب میں فلاں فلاں کتابیں زیرِ نظر تھیں۔ تتارخانیہ تو ایک ضخیم فتاویٰ ہے۔ ''فتاویٰ حمادیہ'' جو چھپ بھی چکا ہے نسبتاً ایک جلد میں چھوٹا سا فتاویٰ ہے، میں شاید مبالغہ نہیں کروں گا اگر یہ کہوں کہ کم از کم دو اچھی تقطیع کے صفحات پر بھی ان کتابوں کی فہرست مشکل ہی سے سما سکتی ہے، جن کے نام بحیثیت مآخذ اس کتاب کے دیباچہ میں درج ہیں، نہ صرف حنفی بلکہ فقہ شافعی کی کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ مؤلف کے پیش نظر تھا، مگر ان چیزوں کو کون دیکھتا ہے، جو کچھ غیروں نے کہہ دیا جب اسی پر ایمان لانے کا ارادہ کر لیا گیا ہو، تو اب جستجو کی حاجت کیا ہے۔ ہماری غفلتوں کا تو یہ حال ہے کہ اچھے لکھے پڑھے مولویوں میں بھی ننانوے فیصدی شاید ہی اس سے واقف ہوں گے کہ ''فتاویٰ حمادیہ'' ہندوستان میں مدون ہوا ہے، حالانکہ دیباچہ میں بھی مصنف بیچارے نے اپنا نام ابوالفتح رکن بن حسام الدین بھی المفتی الناگوری بتا بھی دیا ہے۔ جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف ہی خود عالم تھے بلکہ ان کے والد حسام الدین بھی المفتی تھے، اصلی وطن تو ان کا ناگور تھا، لیکن اسی میں لکھا ہے کہ نہروالہ (گجرات) کے دارالسلطنت میں یہ کتاب اس زمانہ کے مفتی اعظم علامہ قاضی حماد بن قاضی اکرم کے اشارہ سے لکھی گئی۔ یہ بھی اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے قاضی حماد کو نعمان الثانی کا خطاب بھی ملا تھا، ابوالفتح رکن خود بھی عالم تھے، والد حسام بھی عالم اور لکھا ہے کہ ان کا بیٹا بھی اس کتاب کی تدوین میں شریک تھا، جس کا نام تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن اتنا تو معلوم ہوا کہ طبقۂ اہل علم سے ان کا بھی تعلق تھا۔ ہندوستان (جونپوری) میں ''فتاویٰ ابراہیم شاہی'' بھی مرتب ہوا ہے۔

(6) واقعہ یہ ہے کہ کشفاً خیال کیجیے یا ضرورۃً جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں نے قرآن مجید کو فارسی اور اُردو کا لباس پہنا کر اس ملک ہندوستان پر احسان عظیم فرمایا ہے، اُسی طرح شیخ محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کا ترجمہ ضروری مطالب کے ساتھ اور ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق نے بخاری کا ترجمہ ضروری شرح کے ساتھ کر کے اس ملک پر اسی قسم کا احسان کیا تھا۔ شاہ صاحب کو تو اس ملک کی حالت دیکھ کر تقریباً دو سو سال بعد ترجمہ کے ذریعہ سے دین کی عمومیت کا خیال آیا لیکن بجنسہٖ یہی خیال شیخ محدث کو بھی ہوا۔ فارسی میں مشکوٰۃ کا ترجمہ انہوں نے خود کیا اور بخاری کا ترجمہ و شرح ان کے صاحبزادے نے ان ہی کے اشارے سے کیا، جیسا کہ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ''تذکرۂ علماء ہند'' کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا ہے۔ مولانا نورالحق نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی تھی۔ غالباً وہ بھی فارسی میں ہوگی۔ شاہ عبدالحق ہی کے خاندان کے ایک بزرگ مولانا سلام اللہ کی ایک ضخیم شرح عربی زبان میں موطا امام مالک کی فقیر کی نظر سے ریاست ٹونک میں صاحبزادہ عبدالرحیم خاں مرحوم کے کتب خانہ میں گذری تھی۔

(7) ایک عام خیال لوگوں کا یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دریا کا سفر لوگ کم کرتے تھے۔ خطرات کے خیال سے بھی اور مہینوں بلکہ برسوں آمد و رفت میں خرچ ہو جاتے تھے لیکن دونوں باتیں عدم علم پر مبنی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے عربوں کی جہاز رانی پر جو مضمون لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سفر کم نہیں کیا جاتا تھا۔ دکن کی ساحلی حکومتوں کی تاریخ میں تو اس کا مواد وافر ہے۔ رہا مدت سفر کی طوالت ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی ایسی سرعت رفتاری جہازوں میں کہاں تھی، لیکن شیخ محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں اپنے اُستاد شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات میں لکھا ہے کہ عرب سے وہ ہندوستان آئے اور واپس ہوئے۔ آمد و رفت کی کل مدت اتنی تھی ''مدت آمدن

کشتی از آنجاب پانزدہ شانزدہ روز بود وازیں جانب چہل روز" (ص 270) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ دن میں اس زمانہ میں بھی، بحرِ ہند اور عرب کو عبور کر کے آدمی حجاز پہنچتا تھا۔

(8) کسی موقع پر شمس الدین نام محدث کا ذکر آئے گا، علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے، لکھا ہے کہ چار سو صرف حدیث کی کتابیں ان کے ساتھ تھیں۔

(9) یہی متن "مواقف" اور مصنف قاضی عضد کے اسی قصہ میں یعنی محمد تغلق نے مولانا عمرانی کو جب شیراز بھیجا، یہ حال جب شاہ ابو اسحاق جو اس زمانہ میں شیراز کا بادشاہ تھا، معلوم ہوا اور اُس نے سُنا کہ شاہِ ہند "مواقف" کو اپنے نام معنون کرانا چاہتا ہے تو قاضی عضد کے پاس حاضر ہوا کہ بیوی کے سوا اب وہ سب کچھ جو میرے پاس ہے حتیٰ کہ حکومت بھی لے لیجیے لیکن آپ کو نہ ہندوستان جانے دیا جائے گا اور نہ یہ کتاب کسی دوسرے کے نام معنون ہو سکتی ہے، شیخ محدث اور مولانا آزاد کی کتابوں میں آپ کو اس واقعہ کی تفصیل ملے گی۔

(10) مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں سے ترجمہ کرانے کا کام اکبر کے زمانہ میں جو انجام دیا گیا ہے، ایک مبسوط و مفصل مضمون کا مواد ہے۔ دربارِ اکبری میں تھوڑی بہت تفصیل اس کی مولوی محمد حسین آزاد نے کی ہے۔ اسی سلسلہ میں آزاد نے اکبری زمانہ کی ایک تصنیف "ثمرة الفلاسفہ" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ کسی مغربی زبان غالباً لاطینی سے فارسی میں اکبر کے حکم سے عبدالستار بن قاسم نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ "خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے!" کتاب کے دیباچہ سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ مصنف عبدالستار نے چھ مہینے کے عرصہ میں زبان مذکور جس میں اصل کتاب تھی، پادری جزو غوشویر سے سیکھ لی، یہ پادری جزو غوشویران پرتگالی پادریوں میں تھا جو گووا بندر سے اکبر کی دعوت پر دربار میں پہنچے تھے۔ عبدالستار نے لکھا ہے کہ چھ مہینے میں اتنی قابلیت بہم پہنچائی تھی کہ بولنے کی قدرت تو نہیں پیدا ہوئی تھی لیکن کتاب کا مطلب خاصہ نکال لیتا تھا۔ ابوالفضل نے بھی جہاں گووا بندر کے پادریوں کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ "یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا" غالباً اسی قسم کے کاروبار کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال مغربی زبانوں سے ہندوستان کا تعلق گویا اسی زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اور اگر یہ سوال ہو کہ یوروپین زبانوں کی کتابوں کا ہندوستان میں کب سے ترجمہ شروع ہوا تو غالباً اس فہرست میں پہلا نام اس ثمرة الفلاسفہ کا رکھا جائے گا۔ کاش! پنجاب کے کوئی بزرگ خلیفہ محمد حسین کے کتب خانہ سے اس پہلی مغربی زبان سے ترجمہ شدہ کتاب کا سراغ لگاتے اور اس کے مضامین سے عام لوگوں کو آگاہ کرتے۔

(11) تعجب ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں یہ کس ماخذ کی بنیاد پر لکھا ہے کہ اراکینِ تدوین میں بہار کے بھی دو عالم شریک تھے۔ جن میں ایک پھلواری شریف کے رہنے والے تھے۔ کسی صاحب کو ماخذ معلوم ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔

(12) میرے مرحوم دوست مولوی مظہر علیم سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جن کا روزنامچہ کہیے یا سفرنامہ "سفرنامہ مظہری" کے نام سے ان کے بھائی مولوی حلیم انصاری صاحب نے ان کی وفات کے بعد جمع کر کے شائع کر دیا ہے اور بنگال، بہار، دکن، کاٹھیاواڑ، گجرات، صوبجات متوسطہ وغیرہ کے دیہاتوں اور قریوں میں مسلمانوں کی جو حالت اس زمانہ میں ہے اس کے متعلق بڑے دلچسپ ہی نہیں بلکہ بڑے دل دوز معلومات درج ہیں۔ بڑے بڑے امراء، نواب، علماء، فقراء کی اولاد اس ملک کے گوشہ گوشہ میں کس طرح پھیلی ہوئی ہے اس کا حال آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ پرانے خاندانوں میں شاہی وثائق یا پرانی کتابیں جہاں کہیں نظر پڑی ہیں، ان کا ذکر بھی کہیں کہیں کرتے چلے گئے ہیں، اسی سلسلہ میں کمیلا (مشرقی بنگال) کے ایک رئیس نواب حسام حیدر کا بھی تذکرہ درج کرتے ہوئے ایک

موقعہ پر لکھتے ہیں کہ "نواب حسام حیدر صاحب نے ایک قرآن شریف قلمی مذہب ومطلا دکھایا، دبیز چکنے کاغذ پر بخط ولایت لکھا ہوا تھا، بڑی تقطیع ہے، اس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں" یہاں تک تو خیر معمولی بات ہے۔ جس چیز کی وجہ سے میں نے اس قصہ کا ذکر کیا ہے وہ ان کے بیان کے یہ آخری دو فقرے ہیں، لکھتے ہیں: کہ "یہ قرآن "خاص دارا شکوہ" کی تلاوت کا مصحف ہے، مہر اس کی موجود ہے۔" صاحب قران ثانی (شاہ جہاں بادشاہ کے چہیتے لختِ جگر کا قرآن ہے) اور کیلا کے نواب صاحب کے پاس یہ پہنچا کس ذریعہ سے ان ہی سے سنیے، لکھتے ہیں:

"ایک یوروپین لیڈی سے نواب صاحب نے لیا تھا" (سفرنامہ مظہری۔ ص 58)

شاہی کتاب خانہ کس طرح لوٹا گیا اور کن کن ہاتھوں تک یہ جواہر پارے پہنچے، اس کا اندازہ آپ کو اسی ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ مرحوم نے اور اور مقامات کے نادر نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس الذہبی کی 'الکاشف'' کا نسخہ خط کوفی میں دیکھا۔ 947ھ کی کتابت تھی۔ ایک نسخہ "منطق الشفا" ابن سینا 1097ھ کا مکتوبہ خانہ عالمگیری کا نسخہ تھا (ص 52) از یں قبیل مختلف مقامات میں اس قسم کی نادر چیزیں ان کو نظر آئی تھیں۔

(13) اہل علم تو اس آیت کے متعلقہ مباحث سے واقف ہی ہیں۔ جو نہیں جانتے ہیں ان کے لیے لکھا جاتا ہے کہ روزہ جب فرض کیا گیا تو اس میں جہاں مسافروں اور مریضوں کو مہلت دی گئی کہ وہ بعد کو رکھ سکتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ جو روزے کی اطاعت رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ کے کھلا دیا کریں۔ اطاقت کے کیا معنی ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنفی مذہب میں آدمیوں کو تین حصوں میں بانٹا گیا ہے، ایک وہ جنہیں کوئی عذر روزہ رکھنے میں مانع نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ان پر تو مقررہ وقت یعنی رمضان میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو عذر رکھتے ہیں۔ عذر والوں کی بھی دو قسمیں ہیں، اسی لیے تیسری قسم پیدا ہوگئی، یعنی عذر ان کا ایسا ہے جس کے متعلق توقع کی جاسکتی ہے کہ مرنے سے پہلے ازالہ ہوجائے گا، مثلاً سفر سے مسافر گھر واپس آجائے یا بیماری سے اچھا ہوجائے لیکن بعض لوگوں کا عذر ایسا بھی ہوسکتا ہے جس سے نجات عام حالات میں موت تک نہیں ہوسکتی مثلاً شیخ فانی کی جوانی واپس ہونا، ناممکن ہے۔ بس ان معذوروں کے لیے جن کا عذر زوال پذیر ہے یہ حکم ہے کہ زوال عذر کے بعد روزوں کی قضاء کریں۔ پر جن کا عذر زوال پذیر نہیں ہے، ان ہی کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک یہ تینوں قسموں کا حکم نہ بیان کیا جاتا روزہ کا قانون ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ ہدایہ میں شیخ فانی وغیرہ کے حکم کو اسی آیت یطیقونہ سے نکالا گیا ہے جو دلیل ہے کہ فقہاء احناف نے اس لفظ کا ترجمہ یہی قرار دیا ہے کہ روزہ بہ مشقت رکھ سکتے ہوں یعنی رکھنے کی صلاحیت تو نہ ہو لیکن خواہ مخواہ رکھنا چاہتے ہوں۔ ان کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ لغت سے بھی اطاقت کے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے اور یطوقونہ کی قرأت بھی اسی کی موئد ہے۔

اس آیت کی اور توجیہیں بھی ہیں، جن میں حضرت شاہ ولی اللہ والی تاویل یعنی صدقہ فطر پر اس کو محمول کیا جائے۔ اس حنفی توجیہہ کے بعد زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ انسانوں میں ایک تیسری قسم پیدا ہوتی ہے یعنی وہی لوگ جن کا عذر زوال پذیر ہوا تو ان کا حکم کہاں سے نکالا جائے گا، اگر اس آیت کا وہ مطلب نہ بیان کیا جائے گا جو صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔

خطّاط اور نقل نویس

اگر آپ سچ پوچھتے ہیں تو میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ پریس اور مطابع کے اس عہد سے پہلے کم از کم کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بعض وجوہ سے نسبتہً زیادہ آسان تھا، شہروں اور قصبوں میں آبادی کا ایک خاص طبقہ تقریباً ہر جگہ پایا جاتا تھا، جس کی گذر اوقات ہی ''ورّاقیت'' پر تھی، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم لفظ ''ورّاق'' کی تشریح کرتے ہوئے ''فوائد مبہیہ'' میں لکھتے ہیں:

الورّاق ...... اسم لمن یکتب المصاحف و کتب الحدیث وغیرھا و قد یقال لمن یبیع الورق وھو الکاغذ ذکرہ السمعانی. (ص 16)

''ورّاق نام ہے ان لوگوں کا جو قرآن مجید اور حدیث اور ان کے سوا دوسری کتابوں کے نقل کرنے کا کام کرتے ہیں، کبھی کاغذ فروش کو بھی ورّاق کہتے ہیں، سمعانی نے یونہی لکھا ہے۔''

چونکہ ان لوگوں کی گذر اوقات کی یہی واحد شکل تھی اس لیے وہ اس کا پتہ چلائے رکھتے تھے کہ کون کون سی کتابیں شہر میں کس کس کے پاس پائی جاتی ہیں، صرف فرمائش کی دیر ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اس کتاب کی نقل حاصل کر کے طالب کو پہنچا دیتے تھے۔

نقل نویس کا ذوق

ہندوستان میں انہی ورّاقوں کو نسّاخ بھی کہتے تھے۔ یہ لوگ گاہکوں کی تلاش میں کس طرح سرگرداں رہتے تھے اس کا اندازہ آپ کو دلّی ہی کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ''فوائد الفواد'' میں منقول ہے کہ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنجؒ کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو ''جامع الحکایات'' عوفی کی ضرورت تھی لیکن غریب آدمی تھے اتنے پیسے ہاتھ پر نہیں چڑھتے تھے کہ اس کی نقل کا انتظام کریں۔ سلطان فرماتے ہیں کہ:

''روزے نسّاخے حمید لقبؒ بخدمت او (شیخ نجیب الدین) آمد، شیخ نجیب الدین گفت دیر بازست کہ ما می خواہیم کو جامع الحکایات را بنویسانیم ہیچگونہ میسر نمی آید۔''

''ایک دن حمید نسّاخ شیخ نجیب الدین کی خدمت میں آیا، شیخ نے کہا کہ ہماری خواہش ہے

کہ جامع الحکایات نقل کراؤں، مگر کچھ میسر نہیں ہوتا۔''

حمید نساخ نے اس کے بعد جو جواب دیا ہے، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کتابوں کے مہیا کرنے میں ان نساخوں کا کیا حال تھا، سلطان جی نے اس کے بعد فرمایا کہ:

''حمید گفت حالے چہ موجود اری۔''

''حمید نے پوچھا، اس وقت آپ کے پاس کتنا ہے؟''

''شیخ (نجیب) گفت یک درم۔''

''شیخ نجیب نے جواب میں کہا ایک درم۔''

حمید غریب کو یہ ایک درم بھی غنیمت معلوم ہوا۔

''آں درم گرفتہ ازاں کاغذ خریدہ آورد و در کتابت شد۔''

''اس درم کو لے لیا اور اس سے کاغذ خرید کر لے آیا۔ اور کتاب میں مصروف ہوگیا۔''

آگے قصہ کا تتمہ یہ ہے کہ سلطان جی نے فرمایا:

''یک درم راچند کاغذ موجود شدہ باشد۔''

''ایک درم کا کتنا کاغذ آیا ہوگا۔''

چند کاغذ سے غالباً چند اجزاء مراد ہیں، جس سے گونہ اس زمانہ میں کاغذ کی قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

قلمی کتب فروشی

مُلا عبدالقادر بداؤنی نے مشہور شاعر عرفی شیرازی کے تذکرہ میں اس کے معاصر ثنائی شاعر کے دواوین کی عام مقبولیت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اُن سے بھی اس زمانہ کی کتب فروشی کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہیچ کوچہ و بازارے نیست کہ کتاب فروشاں دیوان این دو کس (عرفی وسنائی) را در سر راہ گرفتہ نائیستند و عراقیاں و ہندوستانیاں نیز بہ تبرک می خرند (1)۔''

''کوئی کوچہ و بازار ایسا نہیں ہے کہ کتاب بیچنے والے ان دونوں شاعر عرفی وسنائی کے دیوان راستہ پر لیے ہوئے نظر نہ آتے ہوں، عراقی و ہندوستانی وہ تو تبرک سمجھ کر خرید رہے تھے۔''

ہندوستان کے شہروں میں اگر واقعی کتب فروشی کا یہی حال تھا کہ ہر کوچہ و بازار میں کتب فروش کتابیں لیے کھڑے رہتے تھے تو پریس کے اس عہد کو اس لحاظ سے کیا ترجیح حاصل ہوسکتی ہے۔ (2)

قلمی نسخوں کی اشاعت کا حال

اس زمانہ کے وراقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے کتابوں کے نسخے ملک میں کتنے وسیع پیمانہ پر پھیل جاتے تھے

اس کا اندازہ بھی آپ کو ان ہی ملا عبدالقادر کی اسی تاریخ سے ہوسکتا ہے جس سے میں نے مندرجہ بالا عبارت نقل کی ہے۔ مُلا صاحب نے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اکبر اور اکبری دربار کا سارا کچا چٹھا کھول کر اس میں رکھ دیا تھا، اس لیے مُلاّ صاحب نے زندگی بھر تو اس کتاب کو صیغۂ راز میں رکھا۔ اندیشہ تھا کہ ذرا سی بھی بھنک حکومت کو لگی تو اُن کی ہی نہیں بلکہ ان کے آل اولاد خانماں کی خیر نہ تھی، لیکن جب وفات ہوئی تو نساخوں نے کسی طرح اس کی نقل حاصل کی اور ملک میں اتنی سرعت کے ساتھ اس کے نسخے پھیلا دیئے کہ جہانگیر جیسا مطلق العنان بادشاہ بھی مُلا کی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کرا سکا۔ اسی کتاب کی آخری جلد میں جو مقدمہ درج ہے، اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو مُلاّ عبدالقادر ''تا حیات خود مخفی داشتہ در زماں جہانگیر پادشاہ کہ خبر بمسامع ایشاں رسید۔'' (اپنی زندگی بھر مخفی رکھا، جہانگیر کے زمانہ میں ان کے کانوں میں یہ آواز پہنچی) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ بگولا ہو گیا، مُلا بیچارے سے انتقام لینے کی صورت کیا تھی؟ نزلہ ان کے خاندان پر ٹوٹا۔ لکھا ہے:

''اولاد اورا (عبدالقادر را) طلب داشتہ مورد اعتراض ساختند۔''

''ان کی اولاد کو بلا کر مورد اعتراض بنایا۔''

واللہ اعلم کیا کچھ ان غریبوں کو سنایا گیا، بہرحال ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا:

''آں ہا گفتند ما خورد سال بودیم خبرے نداری۔''

''ان بچوں نے کہا ہم کمسن تھے ہمیں کوئی خبر نہیں۔''

تاریخ مُلاّ عبدالقادر کے سلسلہ میں شاہی ہدایت

حالانکہ ظاہر ہے کہ مُلاّ کے ''مخفی نسخہ'' کو آخر نساخوں تک کس نے پہنچایا ہوگا۔ ملا صاحب کی اولاد یا ان کی بیوی۔ ان کے سوا مُلا بیچارے کے اس راز خونخوار سے اور کون واقف ہو سکتا تھا، مگر خدا نے فضل کیا، جہانگیر کی سمجھ میں کچھ بات آ گئی، تاہم اس کے بعد بھی شاہی فرمان ہوا کہ مُلاّ کی اولاد سے مچلکہ لیا جائے کہ اس کتاب کی اشاعت نہ ہونے پائے۔ ان بیچاروں نے مچلکہ دیا جیسا کہ لکھا ہے:

''مچلکہ نوشتہ دادند کہ نزد ما بہم رسد سیاست کردنی باشیم۔''

مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، ان لوگوں کے مچلکہ لینے سے کیا ہوتا۔ کتاب تو ملک میں پھیل چکی تھی، خیال کیا جاسکتا ہے کہ جہانگیر نے کوئی دقیقہ اس کتاب کے غائب اور مفقود کرانے میں اٹھا چھوڑا ہوگا، لیکن اس زمانہ کی ''وراقیت'' اور ''نساخیت'' کا نظام اتنا وسیع پیمانہ پر پھیلا ہوا تھا کہ حکومت بھی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کرا سکی اور ملا کی وفات سے لے کر تا ایں دم ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مل سکتی ہے اور اب تو خیر چھپ ہی گئی ہے۔

نقل نویسوں کا ملک میں پھیلا ہوا جال

حالانکہ اس زمانہ میں حکومتیں جب چاہتی ہیں تو مطبوعہ کتابوں کو ضبط کر کے چند ہی دنوں میں ان کو دنیا سے

ناپید کر دیتی ہیں، لیکن جہانگیر کی حکومت قاہرہ ایک کتاب کو معدوم کرنے پر قادر نہ ہو سکی، وجہ ظاہر ہے کہ پریس کی وجہ سے نقل کتب کا رواج نہ رہا۔ جن کتابوں کے چھاپنے کی ممانعت کر دی جائے گی ان کا ناپید ہو جانا ناگزیر ہے، لیکن اس زمانہ میں گلی گلی کوچہ کوچہ میں آپ کو نساخ مل سکتے تھے۔ حکومت ان کی نگرانی کہاں تک کر سکتی تھی۔ آج ان چابک دستیوں کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے جو نساخیت اور وراقیت میں لوگوں کو اس زمانہ میں حاصل تھی بلکہ نقل کتب کے جن کمالات کا تذکرہ جستہ جستہ طور پر کتابوں میں پایا جاتا ہے، اگر آج اُن کا بیان کیا جائے تو مشکل ہی سے باور کیا جا سکتا ہے۔ وہی لوگ نہیں جو اس پیشہ کو معاشی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے تھے، بلکہ عام خوش باش لوگوں کی مہارت بھی عجیب تھی۔

نقل نویس کی زود نویسی اور شرح ملا جامی کی نقل

بلگرام کے ایک عالم شاہ طیب قدس سرہ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے: ''شرح مُلا جامی را در یک ہفتہ من اولہ الی آخرہ نوشت'' (مآثر۔ ص 53) شرح جامی کی ضخامت سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ہفتہ میں بڑی تقطیع پر چار پانسو صفحوں کی ایک کتاب کا اوّل سے آخر تک نقل کر دینا اس زمانہ میں کیا قابلِ تصور بھی ہو سکتا ہے۔

''بہجۃ المحافل'' کی نقل تیئس یوم میں

یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، ان ہی میر طیب کے متعلق مولانا ہی لکھتے ہیں:

''بہجۃ المحافل کہ کتابے ست ضخیم در سیر نبوی تصنیف یحییٰ بن ابی بکر العامری الیمنی در بست و سہ روز کتابت کرد۔''

''بہجۃ المحافل جو سیرت نبوی میں یحییٰ بن ابی بکر العامری الیمنی کی تصنیف ہے، اسے تیئس دنوں میں نقل کیا۔''

اب یہ کتاب چھپ چکی ہے، ملتی ہے دیکھ لیجیے، اس کی ضخامت کو ملاحظہ فرمالیجیے اور تیئس دن کی مدت خیال کیجیے، ظاہر ہے کہ اسی میں زندگی کے دوسرے ضروری اور دینی مشاغل بھی شریک ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ قلم کیا تھا، ہوائی جہاز تھا۔ میر طیب کی اسی سرعتِ کتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''کتب خانہ عظیمے از خط خوش نمط خود یادگار گذاشت۔''

''ایک عظیم کتب خانہ یادگار چھوڑا، جو خود اپنے قلم کا نقل کیا ہوا تھا۔''

اور یہی وہ بات تھی جس کا ذکر میں نے کیا تھا کہ نساخی اور کتابت کا ہنر جس کے ہاتھ میں ہو اس کے لیے کتابوں کی فراہمی اس زمانہ میں کچھ دشوار نہ تھی، جو ایک ایک ہفتہ میں پوری شرح جامی نقل کر کے رکھ دیتا ہو، سوچیے تو بڑی سے بڑی کتابوں کا نقل کر لینا اس کے لیے کیا دشوار ہو سکتا ہے۔

قلمی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ

واللہ اعلم میر طیب کے کتاب خانہ میں کون کون سی کتابیں تھیں، لیکن ''بہجۃ المحافل'' جیسی کتاب جب ان کے کتب خانہ میں موجود تھی جس سے عوام تو عوام اس زمانہ کے عام علماء جنہیں فن سیرت سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے، مشکل ہی سے واقف ہوں گے، حالانکہ اس فن کی معتبر کتابوں میں اس کا شمار ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کو نوادر فن کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا اور کچھ میر طیب کا یہ کوئی خصوصی مذاق نہ تھا، صرف ''مآثر الکرام'' میں آپ کو متعدد علماء ایسے نظر آئیں گے جن کے تراجم میں مولانا آزاد عموماً اس قسم کے الفاظ ارقام فرماتے ہیں مثلاً:

''خط شاں نسخے بہ پختگی وشیرینی می نوشت وکتب درسی بیروں از حصر در قید کتابت آورد'' (ص 225)

''کتب درسی'' سے کیا کریما، مامقیماں مراد ہے۔ مولانا آزاد ہی ان کتب درسی کی تفصیل فرماتے ہیں:

''مطول وتلویح بہ خط شیریں نمط موجود ست۔''

''مطول اور تلویح عمدہ لکھی ہوئی موجود ہے۔''

حاشیہ نویسی

اور صرف نقل ہی پر کفایت نہیں کی جاتی، بلکہ

''ہر یک کتاب را من اولہ الی آخرہ تحشیہ نمود۔''

''ہر کتاب پر اول سے آخر تک حاشیہ لکھتے۔''

عموماً ان حاشیوں کی حیثیت کیا ہوتی تھی، شیخ کمال ایک عالم کے ذکر میں مولانا آزاد نے لکھا ہے:

''کتب درسی از صرف ونحو ومنطق وحکمت ومعانی وبیان وفقہ واصول وتفسیر وغیر ہا مجموع بدست مبارک کتابت کرد وہر یک کتابت را من اولہ الی آخرہ محشّٰی ساخت بہ حیثیتے کہ متن محتاج شرح وشرح محتاج حاشیہ نماند۔'' (مآثر الکرام۔ص 229)

درسی کتاب میں جیسے منطق، نحو، صرف، حکمت، معانی وبیان، فقہ، اصول فقہ اور تفسیر وغیرہ ان کتابوں کی اپنے مبارک ہاتھ سے کتابت کی، پھر ان میں سے ہر ایک کتاب پر شروع سے آخر تک اس طرح حاشیہ چڑھایا کہ نہ متن شرح کا محتاج رہا اور نہ شرح حاشیہ کی۔''

بہ ظاہر اس عبارت کا مطلب وہی معلوم ہوتا ہے کہ بین السطور کے حواشی اور ضمیروں پر ہندسے لگا کر متعلقات کو ''ص'' کے حرف سے نمایاں کر کے کلام کی تعقید اور پیچیدگیوں کے ازالہ کا جو عام دستور عہد قدیم میں تھا، اسی پر عمل کیا گیا تھا۔

نقل میں صحت کا اہتمام

اور صرف یہی نہیں کہ کتابیں نقل کی جاتی تھیں، اُن کی خدمت کی جاتی تھی، ان کو اس طرح حل کر کے رکھ دیا جاتا تھا کہ شروح وحواشی کی امداد کے بغیر مطلب سمجھ لیا جائے۔ بلکہ اسی کے ساتھ مولانا آزاد جیسے محتاط بزرگ کے یہ الفاظ ہیں:

''کہ در تمام کتاب نقطہ غلط نہ تواں یافت۔''

''پوری کتاب میں ایک نقطہ کی غلطی نہیں مل سکتی تھی۔''

شیخ مبارک ناگوری کے پاس اپنی قلمی کتابوں کا ذخیرہ

اسی عجیب وغریب مشق اور چابک دستی کا نتیجہ تھا کہ ایک ایک آدمی صرف اپنے قلم سے مستقل کتب خانہ مہیا کر لیتا تھا۔ مشہور ابوالفضل وفیضی اکبر کے درباریوں کے والد شیخ مبارک ناگوری کے حالات میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''پانصد مجلد ضخیم بدست خود تحریر نمود۔'' (ص198)

''پانچ سو ضخیم کتابیں اپنے قلم سے تحریر فرمائیں۔''

اپنے ہاتھ سے پانسو صرف کتابیں نہیں بلکہ ضخیم کتابوں کا نقل کرنا اس زمانہ میں بلاشبہ ایک افسانہ سے زیادہ شاید نہ سمجھا جائے لیکن خدا نے انسان میں جو کمالات پوشیدہ کیے ہیں، جب ان کمالات کو بروئے کار لانے پر کوئی قوم آمادہ ہو جاتی ہے تو وہ ہوا پر بھی اُڑ سکتی ہے، سمندر کو گھر بنا سکتی ہے اور جو کچھ کر سکتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن جن کے مردہ اخلاف کو دیکھ کر ان کے زندہ اسلاف کی طرف اس قسم کے عجائب کا انتساب محلِ غور وتامل بنا ہوا ہے، شاید قوموں کی موت وحیات کا قانون ان کے سامنے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ آپ کو آج اسی پر تعجب ہو رہا ہے کہ ایک شخص (مُلا مبارک) جن کا ظاہر ہے کہ کتابت ہی پیشہ نہ تھا بلکہ پچاس سال تک آگرہ میں اپنے درس وتدریس کا غلغلہ بھی انہوں نے بلند کر رکھا تھا۔ اس شخص نے پانچ سو ضخیم مجلدات کو کس طریقہ سے نقل کیا تھا۔

شیخ جنید حصاری کی سرعت کتابت

لیکن شیخ محدث دہلوی نے تو اپنی کتاب ''اخبار الاخیار'' میں اسی ''زود نویسی'' اور مشق کتابت کے واقعات اس سے بھی عجیب تر نقل کیے ہیں۔ حصار (مشرقی پنجاب) میں حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جنید حصاریؒ تھے، شیخ محدث نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

''سرعت کتابت او بحدے بود کہ آں را حمل جز بخارق عادت نتواں نمود۔''

''اتنی تیز رفتاری سے کتابت کرتے تھے کہ سوائے کرامت کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

تین دن میں اعراب قرآن کی کتابت کا واقعہ

پھر اس معجزانہ زودنویسی کی خود تفصیل فرماتے ہیں کہ

"در سہ روز تمام قرآن مجید با اعراب می نوشت (3)"

تین دن میں پورا قرآن مجید اعراب کے ساتھ لکھ ڈالتے تھے۔"

تین دن میں قرآن کے تیسوں پاروں کا لکھنا اور صرف لکھنا ہی نہیں بلکہ اعراب یعنی زیر، زبر، پیش وغیرہ حرکات بھی ہر ہر حرف پر لگانا، واقعہ تو یہی ہے کہ شیخ جنید کی اسے کرامت ہی خیال کرنا چاہیے، مگر کیا کیجیے کہ واقعہ ایک نہیں ہے۔

عبدالوہاب المتقی محدث برہان پوری کو کتابت میں ملکہ

یہ تو شیخ محدث کا شنیدہ ہے۔ بُرہان پور کے مشہور محدث حضرت عبدالوہاب المتقی جو صاحب "کنزالعمال" شیخ علی المتقی کے ارشد تلامذہ و خلفاء میں ہیں اور ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حجاز پہنچ کر ان ہی سے زیادہ تر استفادہ فرمایا تھا، ان کے براہِ راست شاگرد ہیں، اپنے انہیں استاد شیخ عبدالوہاب کے متعلق "اخبارالاخیار" میں لکھتے ہیں کہ "ایشاں خط نستعلیق را بسیار خوب نوشتند۔" یہ اس وقت کا حال ہے جب شروع شروع مکہ معظمہ گئے تھے اور شیخ علی المتقی کے حلقہ میں شریک ہوئے تھے۔ شیخ علی نے ان کو خط نسخ (عربی) کی مشق کا حکم دیا۔ چند ہی دنوں میں وہ صاف ہو گیا، حتیٰ کہ "دراندک مدّت خط نسخ نیز حسن صورت پذیرشد" محدث دہلوی نے پھر ان کی زودنویسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کتابے بود موازنۂ دوازدہ ہزار بیت" شیخ علی المتقی جو شیخ عبدالوہاب سے عموماً لکھوانے کا کام لیتے تھے، ان کو اسی بارہ ہزار بیت کی کتاب لکھوانے کی جلدی تھی۔

بارہ ہزار اشعار بارہ شب میں

شیخ محدث فرماتے ہیں، "دراستکتاب واستنساخ آں استعجال می کردند" شیخ عبدالوہاب نے اپنے پیر کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اتنی طویل کتاب کو کتنے دن میں لکھا؟ محدث دہلوی کی اپنے استاد کے متعلق یہ شہادت ہے کہ "در دوازدہ شب تمام کردند۔" شب کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں دن بھی شریک تھا۔ خود شیخ محدث کی تصریح ہے: "ہر شب ہزار بیت می نوشتند با کتابہائے دیگر کہ درروزمی کردند۔" (ص 269۔ اخبار) "ہر رات ہزار بیت لکھتے تھے، ان دوسری کتابوں کے علاوہ جنہیں دن میں لکھا کرتے تھے۔"

حواشی

(1) ج2،ص285

(2) حال ہی میں ''اخبار ہندو'' (مدراس) میں ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب 1557ء میں چھپ چکی تھی لیکن ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے۔ ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں ست رفتاری کی ایک وجہ یہ تھی کہ مشہور کتابوں کی نقل کے لیے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے رکھا تھا۔ (اخبار ہندو۔ مدراس 1943ء)

(3) آج یہ باتیں محل حیرت ضرور ہیں لیکن جیسا کہ آگے آپ پڑھیں گے ہزار ہزار سطروں کا یومیہ لکھ لینا لوگوں کے لیے جب مشکل نہ تھا، تو تین دن میں پورا قرآن اگر لکھ لیا جاتا تھا تو کیا تعجب ہے۔ ''تذکرۂ خوشنویساں'' نامی کتاب میں جو ایک معتبر کتاب ہے، آئندہ بھی ممکن ہے اس کے حوالے آئیں۔ اسی کتاب میں ''مولانا سیمی'' کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> ''در پیشۂ مہارت داشت، در ہر فن مرد مستعد صاحب کمال۔ دل در نیشاپور بودے بعد ازاں بہ مشہد مقدس رضوی ساکن شد و در عہد علاؤ الدولہ شاہزادہ بن بائسنغر مولانا سیمی در یک شبانہ روز سہ ہزار بیت نظم کرد و بطور کتابت خوش نویسانہ نوشتہ'' (ص45۔ منشورہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

غور کرنے کی بات ہے کہ تین ہزار اشعار اتنی قلیل مدت یعنی کل چوبیس گھنٹوں میں صرف منظوم ہی نہیں ہوئے بلکہ شاعر نے انہیں لکھ بھی لیا، صرف لکھا ہی نہیں بلکہ خوشنویسانہ شان کے ساتھ لکھا، مسلمانوں نے جب مہارت کو اس نقطۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، تو میں نہیں سمجھتا کہ محض اس لیے کہ اس زمانہ میں ایسے ماہرین چابکدست چونکہ نہیں پائے جاتے اس لیے باور کرنا چاہیے کہ کسی زمانہ میں بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ یہ کونسی منطق ہو سکتی ہے۔

تصنیفات وتالیفات

پھر جب ایک رات میں ہزار بیت ایک شخص لکھ سکتا تھا، دن کے دوسرے لکھنے پڑھنے کے مشاغل کے ساتھ لکھ سکتا تھا اور یہ شیخ ہی کے استاد کا قصہ ہے تو شیخ جنید اگر تین دن میں قرآنِ کامل باعراب لکھ لیتے تھے، اس میں کیوں تعجب کیجیے۔ قومیں جب زندہ ہوتی ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے۔

علماء اسلام کی تصنیفات اور کتابت کا اندازہ

ابن جوزی، ابن عساکر، ابن حجر، السیوطی، الامام الرازی، الخطیب البغدادی، الذہبی وغیرہ علماء اسلام نے علم کے جن ذخیروں کو مہذب اور مرتب کیا ہے، ان کی تنقیح وتحقیق کی ہے۔ دنیا میں آج اُن کے کارناموں کا سرمایہ بحمداللہ موجود ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم جس چیز کو سوچ نہیں سکتے، وہی ان بزرگوں نے کر کے دکھایا ہے۔ ان میں کتنے ہیں جن کی پوری عمر کے حساب سے روزانہ تین چار جز تصنیف کا اوسط پڑتا ہے۔

ابن شاہین کی تصنیفات

الخطیب نے ابن شاہین (1) محدث کے ذکر میں ان کی اُس روشنائی کا حساب جو حدیثوں کے لکھنے میں خرچ ہوئی ہے اگر اس کو جمع کیا جائے تو شاید منوں سے متجاوز ہوگی۔

علی المتقی کی تصنیفات

اور سچ تو یہ ہے کہ لوگ اس غریب ہندوستان کو گھر سمجھ کر شاید اس کی قدر نہیں پہنچانتے ورنہ اسی ہندوستان کے تو آخر شیخ علی المتقی بھی تھے، جن کی ایک ہی کتاب ''کنز العمال'' کی ضخامت کیا کم تھی، ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کتاب کے سوا لکھا ہے کہ:

''توالیف وے از صغیر وکبیر وعربی وفارسی از صد متجاوز ست (2)۔''

ان کی چھوٹی بڑی سو سے زیادہ عربی فارسی کتابیں تالیف تھیں۔''

تصنیفات فیضی

خود فیضی جس نے نسبتاً کم عمر پائی ہے، ''مآثر الامراء'' میں لکھا کہ

''صد و یک کتاب تالیف شیخ است (مآثر الامراء۔ج 1،ص 585)

''ایک سو ایک شیخ کی تصنیف ہیں۔''

خواجہ حسین ناگوری کی تصنیفات

ہم ناخلف ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متروکوں کی حفاظت نہ کر سکے ورنہ اسی ہندوستان میں خواجہ حسین ناگوریؒ گزرے ہیں، اِن کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ان کی ایک تفسیر ''نورالنبیؐ'' نامی ہے، جس کی تمیں جلدیں ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں:

''او تفسیر دارد مسمیٰ نورالنبی بر ہر جزوے از قرآن (یعنی ہر پارہ) مجلدے نوشتہ است وحل تراکیب نہ بیان معانی قرآن از انچہ در تفسیر ہامی باشد بہ تفصیل وتسہل ہر چہ تمام تر بیان فرمود۔'' (ص 186)

''ان کی ایک تفسیر نورالنبی نام ہے، ہر پارہ ایک ہی جلد ہے، اس میں حل تراکیب معانی و بیان کا بیان جو دوسری تفسیروں میں ہوتا ہے، سب مفصل آسان طرز پر موجود تھا۔''

اور تیس جلدوں میں یہ تفسیر ان کی ایک ہی کتاب نہیں ہے۔ ''مفتاح العلوم'' سکاکی کی قسم ثالث پر بھی ان کی شرح ہے۔ شیخ احمد غزالی جو امام غزالی کے بھائی ہیں، ان کی مشہور سوانح پر بھی ان کا حاشیہ ہے۔ اس کے سوا بھی چیزیں ہیں، یوں ہی دولت آبادی کی تفسیر ''بحر مواج'' از یں قبیل متقدمین میں بھی متاخرین میں بھی۔

شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیفات

حضرت شاہ ولی اللہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیفوں کی مقدار کیا کچھ کم ہے، خصوصاً مؤخر الذکر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس کے کچھ ہی بعد وفات پا گئے۔ ان کی عمر کو دیکھیے اور تصنیف کے سوا تدریس و افتا کے کاروبار کو ملاحظہ فرمائیے۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ہم بے برکتوں کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس پر ان بزرگوں کے اوقات کا قیاس کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ خود در زمانہ تست کے مصنفوں میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کی تالیفات کی تعداد کماً اور کیفیۃً کیا ان ہی نوادر کی زندہ توثیق اپنے اندر نہیں رکھتیں۔(3)

مولانا عصمت اللہ سہارن پوری کی تصنیفات

اللہ اللہ یہی ہندوستان تھا جس میں ایسے مصنف بھی گذرے ہیں جو قوتِ بینائی سے محروم ہو چکے تھے لیکن

تصنیف وتالیف کا سلسلہ برابر جاری تھا اور کیسی تصنیف! گیارہویں صدی کے مشہور مصنف صاحب الحواشی المفیدہ سہارن پور کے رہنے والے مولانا عصمت اللہ کے متعلق مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں:

''از مشاہیر علماء ہنداست اگر چہ مکفوف (نابینا) اند، اما بینایاں را راہ دانش و بینش می نمودند۔''

''ہندوستان کے مشہور علماء میں سے ہیں، گو نابینا ہیں، لیکن بیناؤں کو دانش و بینش کی راہ سوجھاتے ہیں۔''

''شرح جامی'' اور ''تصریح'' (ریاضی کی مشہور درسی کتاب) کے حواشی ملا عصمت اللہ مرحوم کی جس نے دیکھی ہے وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سہارن پور کے بظاہر ان نابینا عالم کو خدا نے کیسی اندرونی بینائی عطا فرمائی تھی خصوصاً ''تصریح'' کی شرح جو چھپ بھی چکی ہے، کم از کم اپنی طالب العلمی کے دنوں میں اس سے زیادہ سلجھی ہوئی کتاب مسائل تصریح کے حل کے سلسلے میں مجھے نہیں ملی تھی۔

مُلا مبارک اور ان کی تصنیفات

مُلّا مبارک ناگوری پدر ابوالفضل و فیضی کے حالات میں مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ

''در پایانِ عمر بآنکہ باصرہ از کار رفتہ بود بہ قوت حافظہ تفسیرے بہ قید قلم آورد در چہار مجلد مسمّیٰ 'منبع عیون المعانی۔''

''اخیر عمر میں آنکھیں کام نہیں کرتی تھیں، مگر قوت حافظہ سے ایک تفسیر چار جلدوں میں لکھ ڈالی جس کا نام ''منبع عیون المعانی'' ہے۔''

مولانا نے ارقام فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں مُلّا مبارک نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ:

''عبارت را مسلسل تقریری کردو دبیران (کاتبان) کسوت تحریری پوشانیدند۔''

(ص198)

''مسلسل عبارت بولتے جاتے، اور کاتب لکھتے جاتے۔''

گویا مُلّا نے بہ طریق املا یہ تفسیر لکھوائی تھی۔

بہر حال مُلّا مبارک اپنے اعدات واطوار، اخلاق و عادات، افکار و خیالات کے لحاظ سے کچھ ہی ہوں، لیکن منقولات میں ان کا جو پایہ بیان کیا گیا ہے خصوصاً احمد آباد پہنچ کر الخطیب ابوالفضل الگازرونی سے استفادہ کا نادر موقع ان کو جو مل گیا تھا اور جیسا کہ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں مُلّا کے متعلق لکھا ہے کہ الگازرونی سے:

''اسالیب تصوف و اشراق برخواندند و فراواں کتب نظر و تالہ (الٰہیات) دیدہ شد خاصہ شیخ ابن عربی ابن فارض و صدرالدین قونوی۔''

''اسالیب تصوف و اشراق حاصل کیا اور ابن عربی، ابن فارض اور صدرالدین قونوی کی

بہت سی کتابیں دیکھیں۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی علوم میں مُلّا مبارک کی حذاقت و مہارت غیر معمولی تھی۔ الگازرونی کوئی معمولی عالم نہ تھے، وہ علامہ جلال الدین دوانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ دوانی کا جو مقام عقلیات میں ہے، اس سے اہل علم کے طبقہ میں کون ناواقف ہے اور یہ حال تو مُلّا کا عقلی علوم میں تھا۔ حدیث مُلّا مبارک نے میر رفیع الدین الایجی الشیر ازی سے آگرہ میں پڑھی تھی اور میر رفیع الدین صاحب کے متعلق ابوالفضل ہی نے لکھا ہے:

"در جزیرۂ عرب انواع علوم نقلی از شیخ سخاوی مصری قاہری تلمیذ شیخ ابن حجر عسقلانی برگرفت۔" (آئین اکبری۔ ج3، ص205)

"جزیرۂ عرب میں مختلف علوم نقلی شیخ سخاوی مصری قاہری سے حاصل کیں، جو ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے۔"

یعنی بدو واسطہ مُلّا مبارک ناگوری حافظ الدنیا علامہ ابن حجر العسقلانی کے شاگرد تھے، اس تعلق سے حدیث و سیر و رجال کا جو مذاق مُلّا میں پیدا ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔

اسی بنیاد پر باہمہ مالہ و ما علیہ(4) یہ توقع شاید غلط نہ ہو کہ مُلّا مبارک کی یہ املا کرائی ہوئی تفسیر اپنے اندر کچھ نہ کچھ خصوصیت ضرور رکھتی ہوگی، ضخامت بھی کم نہیں ہے۔ مولانا غلام علی نے "مآثر الکرام" میں تو "چہار مجلد" میں اس تفسیر کو بتلایا ہے، اب خدا جانے کاتب کی غلطی ہے یا کیا ہے، فیضی کی بے نقط تفسیر (جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا) اس کے خاتمہ نگار واللہ اعلم کون صاحب ہیں، یہ لکھا ہے کہ:

"از تصانیف وے تفسیرے ست مثل تفسیر کبیر امام در چہاردہ مجلد کبار کہ فیضی در سواطع ذکر وے کرد۔"

"ان تصنیفات میں ایک تفسیر ہے، جو تفسیر کبیر کی طرح ہے اور چودہ ضخیم جلدوں میں ہے، فیضی نے سواطع میں اس کا ذکر کیا ہے۔"

مگر "سواطع" میں مجھے اس چہاردہ مجلد کبار کا پتہ تو نہ چلا البتہ اتنا اشارہ اس کے دیباچہ میں ضرور ہے کہ میرے والد نے ایک تفسیر "الامام" کے طرز پر لکھی ہے۔ جس سے ظاہر ہے امام رازی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس خاتمہ نگار نے مُلّا مبارک کی اس تفسیر کا نام بھی ذرا بدل دیا ہے۔ یعنی "منبع نفائس العیون" لیکن مولانا غلام علی کا بیان تو کم از کم نام کی حد تک زیادہ قابل اعتماد ہونا چاہیے۔ البتہ جلدوں کی تعداد میں ممکن ہے کہ مولانا کی کتاب میں "دہ" کا لفظ چھوٹ گیا ہو۔

مُلّا مبارک کی تفسیر

طباطبائی بہار کے مشہور مورخ نے "سیر المتاخرین" میں بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے، مگر ایک عجیب واقعہ کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''شیخ مبارک در زمانِ حیات خود تفسیرے برائے قرآن مجید درست تصنیف کردہ بود و شیخ (ابوالفضل) بعد رحلتِ پدر بے آنکہ موافق رسمِ دنیا عنوان کتاب بنام پادشاہ موشح گرداند نسخہ ہائے بسیار نویسانده با کثر ولایاتِ اسلام فرستاد۔''

''شیخ مبارک نے اپنی زندگی میں قرآن مجید کی ایک عمدہ تفسیر لکھی تھی، شیخ ابوالفضل نے باپ کی وفات کے بعد جیسا کہ دنیا کا دستور ہے اسے بادشاہ کے نام کے ساتھ انتساب کیا اور اس کے متعدد نسخے لکھوا کر بہت سے اسلامی شہروں میں بھیج دیا۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل کو اپنے باپ کے اس کارنامہ پر اتنا ناز تھا کہ اظہار فضل کے لیے اسلامی ممالک میں اس کے نسخے بھیجے گئے مگر ''صلہ نہ شد بلاشد'' طباطبائی کا بیان ہے کہ:

''چوں ایں (عدم ادخال نام بادشاہ) بعرض اکبر رسید از غرور یکہ داشت برآشفت و شیخ ابوالفضل را مورد عتاب گردانید۔''

''جب اکبر کو اس کی خبر ہوئی، اپنے غرور کی وجہ سے برہم ہوا اور شیخ ابوالفضل کو موردِ عتاب بنایا۔''

تفسیر اور اکبر

لکھا ہے کہ دربار میں آمد و رفت بند کر دی گئی، بڑی مشکل سے اُڑی ہوئی چڑیا پھر ہاتھ آئی۔ میرا خیال ہے اور طباطبائی کی اسی عبارت سے ذہن منتقل ہوا کہ غالباً یہ تفسیر ممکن ہے کہ اکبر ہی کے اشارے سے لکھی گئی ہو اسی لیے ناراضی بھی زیادہ ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ''آئین اکبری'' میں ابوالفضل نے ایک مستقل باب اس کا باندھا ہے کہ اس میں اکبر کے اقوال جمع کیے جائیں۔ ''می فرمودندی فرمودند (5)'' اس کا عنوان ہے۔ ان ہی ''می فرمودندوں'' میں ایک می فرمودند اکبر کا یہ بھی ہے۔

''فقرہ 122 می فرمودند عجب است کہ در زمانِ پیغمبر ما(6) تفسیر قرار نہ گرفت تا دگر گونگی راہ نیافتے۔''

''فرمایا تعجب ہے کہ ہمارے پیغمبر کے عہد میں تفسیر نے قرار نہ پایا، تاکہ دوسرے گونگے کوئی راستہ نہ پاتے۔''

''دگر گونگی'' سے غالباً اکبر کی مراد مفسرین کے مختلف اقوال کی طرف ہے اور یہی اختلاف کا ہتھکنڈا تھا جس سے علماء سوء اس کے دربار میں اپنے دوسرے معاصرین پر سبقت لے جانے کی کشمکش میں مصروف ہوئے جس کا قصہ ''الف ثانی کی تجدید'' کے ذیل میں بیان کر چکا ہوں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کسی اچھی تفسیر کا اکبر بھی آرزومند تھا۔ ممکن ہے کہ مُلّا مبارک نے اسی آرزوئے شاہانہ کو پورا کیا ہو۔ عتاب کی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بھی ہو کہ کتاب میں نے لکھوائی

اور اُس شخص نے مجھے الگ کر کے صرف اپنے باپ کی فضیلت کا علم بلند کر دیا۔

فیضی نے بھی جب اپنی تفسیر پوری کی، تو مُلّا عبدالقادر کا بیان ہے کہ ''چند جز برائے انتشار در عراق فرستاد۔'' (منتخب ص 393) ''چند حصے عراق میں شہرت کے لیے بھیجا۔''

تفسیر کی اشاعت

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ فیضی کی اس تفسیر کا ایک خاص موقع پر ذرا تفصیل سے ذکر کروں گا اور وہیں معلوم ہو گا کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس وقت ابوالفضل نے اپنے والد کی تفسیر کے ''نقول بسیار'' جو اکثر اسلامی ممالک میں بھیجے اور فیضی نے اپنی تفسیروں کے بعض اجزاء عراق روانہ کیے، اس سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ بعض وجوہ سے اس زمانے میں کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ عہد پریس و مطابع سے بھی زیادہ آسان تھا۔ آج تو کسی کتاب کی اشاعت طباعت سے پہلے ناممکن ہے، لیکن اس زمانہ میں کتابت کے معمولی مصارف سے نقول کا حصول چونکہ آسان تھا، یا مصنف خود بھی اپنی تصنیف کی چند نقلیں تیار کر سکتا تھا۔ اس لیے بآسانی ہر جگہ کتاب پہنچ جاتی تھی اور اس کے بعد نقل در نقل کا سلسلہ ورّاقوں کے ذریعے سے شروع ہو جاتا تھا اور یوں تھوڑے دنوں میں کتاب پورے اسلامی ممالک میں پھیل جاتی تھی۔

بہر حال گفتگو اس میں ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں تعلیم کا جو نظام تھا اس میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ کیسے حل کیا گیا تھا؟ میں نے اسی کے متعلق بعض چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں۔

سیاہی اور کتابوں کی تقسیم کا ذوق

واقعہ یہ ہے کہ اس عہد کے کتابی مذاق کا اندازہ اس زمانہ میں صحیح طور پر کیا بھی نہیں جا سکتا۔ کتابوں کی اشاعت اور اس لیے کہ لکھنے لکھانے میں سہولت پیدا ہوگئی، بعض علماء نے اپنی عبادت و ریاضت کا ایک جزیہ بھی قرار دے رکھا تھا کہ طلباء میں کتابیں تقسیم کرتے تھے، قلم بانٹتے تھے اور حد یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے سیاہی بنا بنا کر اہل علم میں تقسیم کیا کرتے تھے۔

صاحب ''کنز العمال'' کا ذوق

فخر الہند حضرت شیخ علی متقی صاحب ''کنز العمال'' کے حال میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ علاوہ اس مشغلہ کے یعنی ''درداد ن کتب و اسباب کتب واعانت دریں باب بحد بود'' یعنی جہاں تک ممکن تھا لوگوں میں کتاب اور اسباب کتب تقسیم فرماتے تھے (7)۔ انتہا یہ ہے کہ ''بدست خود سیاہی درست می کردند و بطالب العلمان می دادند۔'' ''اپنے ہاتھ سے سیاہی بناتے، اور طلبا میں تقسیم فرماتے۔''

صاحب ''مجمع البحار'' کا ذوق

مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا احمد بن طاہر فتنی (پٹنی) جو گجرات کے مشہور محدث عالم تھے اور غریب الحدیث میں ''مجمع البحار'' رجال میں ''مغنی'' ان کی متداول کتابیں ہیں۔ ان کے حال میں مولانا نے لکھا ہے کہ سیاسی بنا کر اہل علم میں تقسیم کرنے کا ذوق ان پر اتنا غالب تھا کہ:

''مداد برائے نسخہ نویساں علوم حل می کرد، بہ حدے کہ در وقت درس گفتن ہم بہ حل کردن مرکب مشغول می بود۔'' (مآثر الکرام۔ ص 195)

''نسخہ نویسوں کے لیے روشنائی بنایا کرتے تھے اور اس میں اس حد تک انہماک تھا کہ اثنائے درس میں بھی روشنائی بنانے میں مشغول ہوتے۔''

سیاہی بنانے کا دستور

دست بکار، وزبان گفتار آنِ واحد میں شیخ نے ان دونوں سعادتوں سے متمتع ہونے کا عجب طریقہ نکالا تھا اور اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں ''فراہمی کتب'' کے مسئلہ کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ زبان سے سبق بھی پڑھا رہے ہیں اور ہاتھ سے سیاہی بھی گھوٹی جا رہی ہے۔ بازار سے سوان اور واٹر مین کی دواتوں کی خریدنے والی نسلیں تو آج اس سے بھی ناواقف ہیں کہ سیاہی بھی گھر میں بنانے کی چیز ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے تک پرانے مکتبوں میں تھوڑا بہت رواج اس کا باقی تھا، لیکن اب تو وہ بھی نابود ہو گیا۔ مُلّا عبدالنبی احمد نگری نے اپنی کتاب ''دستور العلماء'' میں سیاہی بنانے کے چند نسخے بھی درج کیے ہیں، لیکن اب ان کی نقل کرنے سے کیا فائدہ۔

ان محدثین کبار جن پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہے، آج تو آپ شیخ علی متقی اور مُلّا طاہر کا صرف نام سُن رہے ہیں، لیکن جس عہد میں یہ اکابر موجود تھے اس وقت ان کی عظمت وجلالت کا پھریرا جس بلندی پر اُڑ رہا تھا، اس جلالت اور عظمت کے باوجود سیاہی گھونٹنے کا کام کرنا اور وہ بھی اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے نہیں بلکہ نسخہ نویسوں اور طلبہ علم میں تقسیم کرنے کے لیے ایسے معمولی ہلکے شغل میں مشغول ہونا بلاشبہ حیرت انگیز اور اس بلند معیار کو ظاہر کر رہا ہے جو علم اور دین کو اُس زمانہ میں حاصل تھا۔

مُلّا احمد بن طاہر کی خدمات

مُلّا احمد بن طاہر وہی بزرگ ہیں، جن کے متعلق مولانا آزاد اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ گجرات کے مہدوی فتنہ کے مقابلہ کا عزم کرتے ہوئے شیخ نے اپنی دستار سر سے اتار دی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ جب تک اس فتنہ کا استیصال کلی نہ ہولے گا، سر پر فضیلت کے اس عمامہ کو نہیں باندھوں گا۔ شیخ اسی حال میں تھے کہ گجرات پر اکبر حملہ کرتا ہے اور

مغلیہ محروسہ کا گجرات جز بن جاتا ہے۔ اکبر کو شیخ اور شیخ کے اس مقدس عزم کی خبر ملتی ہے۔ اس وقت اکبر مُلّا عبدالقادر کا مقتدی اکبر تھا۔ فیضی اور ابوالفضل کا بظاہر پیر اور بہ باطن مرید نہیں ہوا تھا، سنتے ہیں اکبر نے کیا کیا۔ وہ شیخ احمد کے آستانہ پر حاضر ہوتا ہے اور ''پادشاہ دستار بدست خود بر سر شیخ (احمد بن طاہر) پیچید۔'' اکبر اپنے ہاتھ سے مُلّا احمد کی اُتری ہوئی یا اُتاری ہوئی پگڑی کو باندھتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے:

''باعثِ ترک دستار بہ سمع رسید، نصرت دین متین بر وفق ارادہ شما بر ذمۂ معدلت من لازم است۔'' (ص 195)

''یعنی پگڑی اتارنے کا جو سبب میرے کان تک بھی اس کی خبر پہنچی ہے، دینِ متین کی امداد و نصرت آپ کے ارادہ کے مطابق میرے جذبۂ عدل پر واجب ہے۔''

لوگ کہتے ہیں کہ ابوالفضل و فیضی کے ذکر میں میرا قلم قابو سے باہر ہو جاتا ہے مگر ''دینِ متین کی نصرت کی اس عزیز قوت'' کو جن قوتوں نے برباد کیا، برباد ہی نہیں کیا، بلکہ بجائے نصرت کے اسی قوت کو اسی دین کی تحقیر و اہانت، بغض و عداوت میں لگا دیا، انصاف شرط ہے۔ کیا ان کے ذکر پر اسلامی و ایمانی جذبات اپنے تلاطم کو روک سکتے ہیں، اور یہ تھا مُلّا احمد کا مقام رفیع دنیا میں لیکن باوجود اس کے وہی جس کے سر پر اکبر بادشاہ پگڑی باندھتا تھا، اس کا ہاتھ ''مداد برائے نسخہ نویسانِ علوم حل می کرد'' کے مشغلہ میں بھی مصروف تھا۔

شیخ علی المتقی کا مقام سلطانِ وقت کی نظر میں

یہی کیفیت شیخ علی المتقی کی تھی جو مُلّا احمد بن طاہر کے استاد تھے۔ محدث دہلوی شیخ عبدالحق نے ''اخبار'' میں لکھا ہے کہ گجراتی سلطان بہادر خاں مدت العمر اس آرزو میں رہا کہ شیخ متقی اس کے شاہی محل سرا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سعادت اندوزی کا موقعہ دیں، لیکن آرزو پوری نہیں ہوتی تھی۔ وقت کے قاضی عبداللہ المسندی کو بادشاہ نے تیار کیا کہ کسی طرح سمجھا بجھا کر ایک ہی دفعہ سہی شیخ کو شاہی کوشک میں لے آئیں، المسندی بڑی جدوجہد کے بعد کامیاب ہوئے مگر شیخ نے شرط کر دی تھی کہ بادشاہ کے ظاہر یا باطن میں اگر کوئی اجنبی غیر اسلامی عنصر نظر آئے گا، تو میں خاموش نہیں رہ سکتا، برسرِ دربار ٹوک دوں گا۔ شرط منظور کر لی گئی۔ شیخ سے بادشاہ نے کہلا بھیجا ''ملازماں ہر چہ دانند بگویند و بکنند'' شیخ تشریف لائے اور جو جی میں آیا، گجرات کے اس بادشاہ کے منہ پر فرماتے چلے گئے۔ محدث دہلوی نے لکھا ہے ''نصیحتے کہ بائست کرد'' اور اُٹھ کر چلے آئے۔

شاہی نذرانہ ایک عالمِ ربانی کی نگاہ میں

اس کے بعد کیا ہوا، اس زمانہ کے مولوی کے سینے میں حوصلہ ہے جو یہ سن سکتا ہے فرماتے ہیں، لاکھ دو لاکھ نہیں، ''یک کرور تنکہ'' ''گجراتی فتوح فرستاد'' (ایک کروڑ گجراتی تنکہ نذرانہ بھیجا)۔

واللہ اعلم گجراتی تنکہ کی کیا قیمت تھی، تاہم وہ تنکہ ہی تھا، روپیہ سے کیا کم ہوگا اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ نہیں بلکہ میرے نزدیک تو ہم جیسوں کے لیے یہ دل ہلا دینے والا شرم سے گردنوں کو جھکا دینے والا واقعہ ہے کہ

''آں مبلغ یک کرور تنکہ گجراتی را بہ تمام بقاضی عبداللہ المسندی مذکور دادند۔''

''یہ ایک کرور گجراتی رقم پوری کی پوری قاضی عبداللہ المسندی کو بخش دی۔''

دنیا کے بادشاہ نے جو کچھ بھی بھیجا تھا، دین کے بادشاہ نے اس کو پھر اسی کے ملازم کے حوالہ کر دیا۔ فرمایا کہ:

''ایں فتوح بہ توسل او آمدہ است پس مستحق او ہمون است۔''

''یہ نذرانہ انہی کے واسطہ سے آیا ہے لہٰذا وہی اس کے مستحق ہیں۔''

شیخ علی المتقی کی اس رفعت شان کو ملاحظہ فرمائیے اور اس کے ساتھ شیخ محدث کے الفاظ:

''بدست خود سیاہی راست می کردند۔''

کے عمل پر غور کیجیے، سوچئے کہ علم کے خدمت گاروں نے محمد رسولؐ کے وفاداروں نے چلنے والوں کے لیے کیسے عجیب وغریب نمونے چھوڑے ہیں۔

شیخ علی المتقی کی بے مثال علمی خدمات

شیخ علی المتقیؒ کی زندگی میں تو اسی اشاعت ونشر کتب کے متعلق اس سے بھی زیادہ نادرہ کاریاں نظر آتی ہیں۔ ''اخبار الاخیار'' ہی میں ہے اور اس لیے یہ شہادت زیادہ قابل توجہ ہے کہ شیخ محدث نے اس واقعہ کو علی المتقی کے براہ راست تلمیذ وخلیفہ شیخ عبدالوہاب سے بگوش خود مکہ معظمہ میں سنا ہے۔ گو آخر میں ان کا مستقل قیام مکہ معظمہ ہی میں ہو گیا تھا، عرب میں بیٹھ کر منجملہ دیگر تعلیمی وتدریسی، تصنیفی وتالیفی، ارشادی وتذکیری خدمات کے علم کی خدمت کی ایک صورت یہ بھی نکالی تھی کہ ''کتابہا از دیار عرب مفید وکمیاب بہم می رسید نسخ متعددہ از واستکتاب فرمودہ بہر کس می دادند'' یعنی نادر اور کمیاب مفید مخطوطات کو صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ یوں بھی ان کے متعدد نسخے نقل کرواتے اور جو بھی ضرورت مند ہوتا، اسے یہ چیز تحفتہً عطا فرماتے اور اس سے بھی عجیب تر ان کا طرزِ عمل ہے کہ

''وبہ بلاد دیگر کہ آں کتاب درانجا وجود نہ داشت می فرستادند۔''

''اور دوسرے شہروں میں جہاں یہ کتاب نہ ہوتی بھیجتے۔

ہندوستان میں کتابوں کا ذخیرہ

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا ایک عالم ام القریٰ قبۃ الاسلام میں مستقل قیام کر کے اس کام کو انجام دیتا ہے کہ جن جن ملکوں میں جن مصنفین کی کتابیں نہیں پہنچی ہیں، انہیں نقل کرواتا ہے اور بغیر کسی معاوضہ کے وہاں ان کتابوں کو بھیجتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں شیخ اپنے وطن ہی کو بھول جاتے ہوں گے؟ میرے نزدیک تو ہندوستان میں نوادر کی فراہمی کا

بڑا ذریعہ حضرت شیخ کا یہ طرزِ عمل بھی ہوگا۔ خدا نے عمر بھی کافی دی تھی۔ لکھتے ہیں کہ ''نود سال زیست'' (نوے سال زندہ رہے)۔ ہر سال اسلامی ممالک سے حجاج کے قافلے عرب پہنچتے تھے، ان کی عظمت کا آفتاب اس وقت سمت الراس پر چمک رہا تھا۔ ''کنز العمال'' (احادیث نبویہ کا جو دائرۃ المعارف ہے) اس کی تالیف نے سارے دنیائے اسلام میں غلغلہ بلند کر دیا تھا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک سے ''للسیوطی (8) منة علی العالمین و للمتقی منة علیه'' (یعنی سیوطی کا احسان تو دنیا پر ہے اور سیوطی پر شیخ متقی کا احسان ہے) کی تاریخ سند ان کو مل چکی تھی، اس لیے فتوحات بھی کافی ہوتے تھے، لیکن ان فتوحات کا ایک بڑا مصرف کتابوں کی نشر واشاعت کا یہی ذوق تھا۔

قابلِ پیروی اُسوہ

نوادر کتب کی اشاعت اور ان کے افادہ کے دائرہ کو عام کرنے کا یہ نادر متقیانہ طریقہ اب بھی اگر سچ پوچھیے تو اس قابل ہے کہ ارباب توفیق اس پر عمل کر کے علم اور دین کی بڑی اہم اور قیمتی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ جنہیں خدا نے ثروت دی ہے وہ دوسروں سے نادر مخطوطات نقل کرا کے ان مقامات تک پہنچا سکتے ہیں جہاں وہ کتابیں نہ پہنچی ہوں اور غیر مستطیع اہل علم جہاں بیسیوں مجاہدات وریاضات میں اپنا وقت صرف فرماتے ہیں، اگر اپنے عزیز واقارب کا ایک حصہ اس کام کے لیے بھی مختص کر دیں تو وہ اپنے پیچھے ایک بہترین فاتحہ خواں کو دنیا میں چھوڑ کر رہگرائے عالمِ آخرت ہو سکتے ہیں۔ علی الخصوص ہر سال سرزمین حجاز میں حاجیوں کا جو قافلہ جاتا ہے، اگر ان ہی حجاج میں اس کا بھی ذوق پیدا کیا جائے کہ جہاں لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ عرب سے خاکِ شفا، یورپ کی بنی ہوئی جانمازیں، تسبیحیں، کپڑے وغیرہ لاتے ہیں اگر اپنے ساتھ کسی نادر مخطوطہ کی نقل بھی حجاز سے اپنے علاقہ کے علماء یا مدارس کے لیے لایا کریں، تو اس سے ایک طرف علم اور دین کے مہمات کی اشاعت میں یوماً فیوماً ترقی ہوگی، وہ تو بجائے خود ہے، دوسری طرف میرے نزدیک ساکنانِ حرم والذین عند رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان کی معاشی دشواریوں کے حل کی تدبیروں میں ایک مفید کارگر تدبیر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں مرکزی مقامات ہیں باوجود ان تمام بربادیوں کے اب بھی ان مقامات کے سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں یا خانگی مکانوں میں ایسی عجیب چیزیں محفوظ ہیں جن کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔

نادر مخطوطات کی طلب

ایک بڑا گروہ قاطنین حرمین ومہاجرین کا اب بھی ایسا ہے جو نقلِ کتب کے شریفانہ پیشہ کو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر انجام دینے کو دستِ سوال کے دراز کرنے سے شاید بہتر خیال کرے گا۔ بلکہ مخطوطات نادرہ کی نقل کا کام تو ایسا کام ہے کہ ہندوستان کے اہل علم بھی اس سے نفع اٹھا سکتے ہیں۔ الحمد للہ اب بھی ہندوستان میں ایسے چند ادارے ہیں جہاں ان کتابوں کی اچھی قیمت مل جاتی ہے صرف حکومتِ آصفیہ حرسہا اللہ تعالیٰ کا شاہی کتب خانہ آصفیہ سالانہ بیس ہزار روپیہ کی رقم ان مخطوطات کی خریداری پر صرف کرتا ہے، اور دوسرے امراء مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی بھی کافی رقم

دے کر نادر کتابیں خریدا کرتے ہیں، ہندوستان میں فرض کیجیے کہ آپ کی کتاب نہ بھی فروخت ہو تو امریکہ، یورپ میں اسلامی مخطوطات کے خریدنے والے لوگ موجود ہیں اور اچھی قیمتیں دے کر کتابیں خریدتے ہیں۔

حواشی

(1) ''تاریخ بغداد'' میں ابن شاہین کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے ''صنف ثلاثة مائة و ثلاثين مصنفاً'' (ابن شاہین نے تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں) اور کیسی کتابیں؟ احدها التفسير الكبير الف جز و المسند الف جز و خمسمائه جزو تاريخ مائه و خمسين جزاً و الزهدمائه (یعنی ایک ہزار جز میں ان کی تفسیر کبیر تھی اور ایک ہزار پانسو جز، میں مسند، تاریخ ایک سو پچاس جز، زہد کی کتاب سو جزء) الخطیب نے ان کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے۔ كتبت باربعمائه رطل حبرا (میں نے چارسو رطل حبر (روشنائی) سے لکھا ہے) اسی کے بعد محمد بن عمر بن اسماعیل داؤدی کے واسطہ سے یہ قول بھی منقول ہے، داؤدی کہتے تھے۔ سمعت ابا حفص بن شاهين يقول حسبت يونا مااشتريت به الحبرالى هذالوقت فكان سبعمائة درهم (یعنی میں نے لکھنے میں جتنی حبر (روشنائی) استعمال کی ہے اس کا ایک دن حساب کیا تو پانسو درہم ہوئے) آگے الداؤدی کا یہ اضافہ بھی ہے کہ ''و كنا نشترى الجرار بعة ارطال بدرهم (یعنی چار رطل روشنائی ہم ایک درہم میں خریدا کرتے تھے) رطل کو اگر آدھ سیر کے مساوی بھی مان لیا جائے تو اس حساب سے خود ہی غور کیجیے کہ ابن شاہین نے روشنائی کی کتنی مقدار خرچ کی تھی۔ الخطیب نے دوسرے مقامات میں لکھا ہے کہ حبر اور مداد میں فرق تھا۔ مداد تو سیاہ روشنائی کو کہتے تھے اور حبر سرخ روشنائی کو۔ ایسی صورت میں گویا ابن شاہین کے متعلق اس حساب کا تعلق صرف سرخی سے رہ جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب، دیکھو تاریخ بغداد۔ ج 11، ص 267

(2) یہ تو ان کی تصنیفات کی تعداد ہے، نقل کتب میں بھی شیخ کو کمال تھا۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی نے ''طبقات الصوفیۃ الکبریٰ'' میں ان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اطلعنى علىٰ مصحف بخط كل سطر ربع حزب فى ورقه واحدة'' (یعنی کل ایک ورق میں پورا قرآن انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ ایک سطر میں پاؤ پارہ ختم کر دیا گیا تھا۔)

(3) بحمد اللہ ابھی اسلام کا یہ زندہ معجزہ، ہم مسکینوں کے سر پر سایہ فگن ہے ومتعنا الله بطول حياته۔ 1930ء یعنی آج سے بارہ سال پہلے مجلس مبارک میں کتابوں کا ذکر آیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے پیر کی دعا کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا تھا کہ اس وقت تک پانسو انتیس کتابیں حضرت تصنیف فرما چکے ہیں اور اس طرح شمار نہیں کیا کہ مثلاً بارہ جلدیں تفسیر کی ہیں وہ بارہ شمار کی گئی ہوں بلکہ ان کو ایک ہی کتاب قرار دے کر پانسو انتیس ہوتی ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ ان بارہ سالوں میں اور کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ ان سطروں کی کتابت کے بعد خدا کی یہ رحمت خزانہ رحمت کی طرف منتقل ہو گئی۔ اللهم اغفره۔

خود شیخ محدث عبدالحق دہلوی کے متعلق ''تذکرہ علماء ہند'' میں لکھا ہے۔ ''میگوئند کہ تصنیفاتش خورد و کلاں از صد متجاوز است۔'' اسی کتاب میں یہ عجیب بات شیخ کے متعلق لکھی ہے کہ ''اشعار بہ شمار ابیات تقریباً پنج لک می رسد''۔ (تذکرہ علماء ہند۔ ص 109)۔ لیکن میرے نزدیک غالباً مصنف تذکرہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ محدث کبھی کبھی شعر بھی موزوں فرمالیتے تھے۔ ''اخبار'' میں آپ کے اشعار کے نمونے موجود ہیں۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ درج کرتے ہوئے آپ کے اشعار کا ذکر کیا ہے لیکن پانچ لاکھ اشعار کا انتساب شیخ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ غالباً بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہوا ہے کہ شیخ محدث کے قلم نے پانچ لاکھ ابیات لکھے، یہی بیت کا لفظ وجہ مغالطہ ہے۔ عموماً مراد اس سے شعر ہی لیا جاتا ہے، لیکن اس زمانہ میں ایک سطر کو بھی ایک بیت کہتے تھے۔ غالباً شیخ محدث نے جو کچھ لکھا ہے سطروں کے لحاظ سے اس کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچی ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اشعار کے لحاظ سے سب سے مکثر شاعر ہندوستان میں مرزا بیدل عظیم آبادی ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد مولانا آزاد نے چار لاکھ بتائی ہے۔

(4) البداؤنی باوجود یکہ مُلّا کے بھی شاگرد ہیں لیکن اپنی تاریخ میں اکبری فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''این ہمہ آتش از آگرہ (ملا مبارک کا تعلیمی مرکز) ''برخاستہ کہ خانماں اکابر واصاغر ازاں سوخت'' بداؤنی سے سچ لکھا ہے۔

تو اے مرد سخن پیشہ کہ بہر چند مستے دوں
ز دین حق بماندستی بہ تیروی سخن دانی
چہ سستی دیدی از سنت کہ رفتی سوئے بے دیناں
چہ تقصیر آمد از قرآں کہ گردی گرد والآنی

یہی خاندان تھا جو ''کل'' کو چھوڑ کر ''الآن'' کی لذتوں میں ڈوب گیا تھا۔ وشر الناس شرار العلماء ''سخن پیشوں'' نے ہمیشہ دنیا پر مصیبت دنیا پر مصیبت نازل کی اور آج بھی ''تیروی سخن دانی'' ہی کے بل بوتے پر حدیث کا بھی انکار ہو رہا ہے۔ قرآن کا بھی مطلب بدلا جا رہا ہے۔ خالی اللہ المشکی۔

(5) حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں مُلّا عبدالقادر کے حوالے سے اکبر کی جن فتنہ سامانیوں کا ذکر کیا ہے، بعضوں کو اس پر اعتراض ہے کہ مُلّا کا بیان حجت نہیں ہے، حالانکہ میں نے مُلّا عبدالقادر کا ''حلف نامہ'' بھی نقل کیا ہے۔ لیکن پھر بھی لوگوں کو اعتبار نہ ہوا۔ ایسے حضرات کے لیے مناسب ہوگا کہ اس کی فرمودند کا مطالعہ فرمائیں کہ اس میں وہ سب کچھ ہے جو عبدالقادر نے لکھا ہے۔ دشمن کی شہادت اگر قابل اعتبار نہیں تو کیا دوست کی گواہیوں میں شک کیا جائے گا۔

(6) ''آئین اکبری'' میں بھی پہلی اور غالباً آخری جگہ ہے جس میں ''پیغمبر ما'' کا لفظ اکبر کے منہ سے نکلا ہے، ورنہ وہ خود بھی اور ابوالفضل بھی اسلام کا ذکر ہمیشہ ''کیش احمدی'' سے کرتے ہیں گویا ''دہی محمد نزم'' اُس زمانہ میں ''احمد نزم'' بن چکا تھا۔ تاہم اس فقرہ میں اس لفظ پر میری نظر جب پڑی تو خیال گذرا کہ ''بہانہ جوئی'' جس رحمت کا قانون ہے وہاں یہ انتساب کون کہہ سکتا ہے کہ بیکار جائے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اکبر بیچارہ تو دنیا سے چلا گیا اور اُس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ بعضوں نے تو لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کی بھی توفیق ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے مجددؒ کے مقالہ میں اکبر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے میرا اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو اس شخص کی ناسمجھی خامی عقل سے پیدا ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ اکبری فتنہ کی تاریکی کا جسے علم نہ ہوگا، مجدد کی تجدید کی روشنی کا وہ کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ **وبضدھا تتعرف الاشیاء۔**

(7) اور یہ مسلمانوں کا کسی زمانہ کا ایک عام دستور معلوم ہوتا ہے۔ خاکسار جب ٹونک میں پڑھتا تھا تو چند علمی گھرانے شہر میں ایسے تھے جن

سے طلبہ اپنے پڑھنے کے لیے کتابیں مانگ کر لایا کرتے عموماً بے عذر دے دی جاتی تھیں۔ صاحب ''تذکرہ علماء ہند'' نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ جن دنوں مچھلی شہر میں وہ پڑھتے تھے، وہاں مفتی علی کبیر صاحب کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔ ''کتاب بہ کہ می طلبید یم بھوں ہیئت کہ داشت از المماری برآوردہ می داد'' البتہ دیتے ہوئے مفتی صاحب ایک دلچسپ شعر ضرور پڑھتے تھے۔

کتابم می دہم لاکن بایں شرط
کہ طبل و بوق و صندوقش نہ سازی

مطلب یہ تھا کہ طلبہ کتابوں کے استعمال میں بے احتیاطی کرتے ہیں۔ کوئی صاحب تو طبلہ بنا کر بجاتے ہیں، کوئی ورقوں کا باجہ بناتے ہیں، کوئی ہر قسم کے کاغذ جلدوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں جس سے جلد ٹوٹ جاتی ہے بعض کتابوں سے تکیہ کا کام بھی لیتے ہیں، مطلب یہ تھا کہ یہ حرکتیں نہ کرنی چاہئیں۔

(8) یہ فقرہ علامہ الوالحسن البکری کا ہے، جو عام طور سے اہل علم میں مشہور ہے تمام حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا خیال جلال الدین السیوطی کو پیدا ہوا اور ''جمع الجوامع'' کے نام سے انہوں نے ایک کتاب تالیف بھی کی لیکن ترتیب کے اعتبار سے استفادہ اس کتاب سے آسان نہ تھا۔ شیخ متقی نے نئے سرے سے اس کام کو ایسی عمدہ ترتیب سے انجام دیا کہ سیوطی کی کتاب کی جگہ ان ہی کی کتاب نے لی۔ حیدرآباد کی ریاست کو فخر ہے کہ اسی کے مطبع دائرۃ المعارف نے سب سے پہلے اس کتاب کو شائع کیا۔ بعد کو مسند احمد کے حاشیہ پر اس کا خلاصہ مصر سے بھی شائع ہوا۔ علی متقی نے اس ضخیم کتاب کے سوا جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد 100 کے قریب پہنچتی ہے۔

علماء کے ذرائع معاش

عربی مدارس کے طلبہ کی معاشی دشواریوں کو دیکھ دیکھ کر عموماً لوگوں کا خیال اِدھر مائل ہو رہا ہے کہ کوئی ایسی چیز ان مدارس کے نصاب میں شریک کی جائے جس سے اس دشواری کے حل میں طلبہ کو آئندہ زندگی میں کچھ مدد مل سکے، بلکہ اب تو یہ سوال عربی مدارس سے زیادہ انگریزی کلیات و جوامع میں اہم بنا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں خاکسار ایک خاص خیال رکھتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے صناعات اور دستکاریاں جن میں یورپ سے مقابلہ ہے۔ مثلاً پارچہ بافی صابن سازی وغیرہ، اولاً ان چیزوں کے لیے ہزار ہزار روپوں کی مشنری کی ضرورت ہے، سیکھنے والے سیکھنے کے بعد بھی عموماً کسی کارخانے کی وہی ملازمت جس سے بھاگنا چاہتے تھے اسی کی تلاش میں طلبہ سرگرداں نظر آئیں گے، بلکہ نظر آ رہے ہیں اور مشنریوں کے بجائے اگر ان ہی چیزوں کو جنہیں غیر ممالک میں مشنری سے بنایا جاتا ہے ہم ہاتھ سے بنائیں مثلاً سوت چرخے سے کاتیں، کاٹج انڈسٹری کے اصول پر طلبہ کو پارچہ بافی سکھائیں تو یہ واقعہ ہے کہ مشنری کے ذریعہ سے بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نہ لاگت میں کر سکتی ہیں، نہ وقت میں نہ قیمت میں۔ اور بازار میں یہ خیال کہ وطن اور قوم یا مذہب کے نام کے وعظ سے سودا بیچ لیا جائے گا۔ میرے نزدیک تجربہ کے لحاظ سے تو غیر بازاری اور فکر کے لحاظ سے بازاری خیال ہے۔ بازار میں چیزوں کی عمدگی، نفاست، قیمت کی کمی وغیرہ یہی چیزیں وعظ کا کام کرتی ہیں۔

مدرسوں میں شعبۂ کتابت کی ضرورت

اسی لیے میرا خیال ہے کہ انگریزی مدارس و کلیات والے خواہ کچھ ہی کریں، وہاں تو سوچنے والے دماغ اور ہوتے ہیں اور کام کرنے والے اور۔ غیر مکلفوں کے اس طبقہ کو سمجھانا سخت مشکل ہے لیکن عربی مدارس کے ارباب حل و عقد چاہیں تو غیر مقابلاتی صناعات جن میں یورپ جاپان وغیرہ والے مشنری ممالک مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ عموماً یہ صنعتیں مقامی ہی ہوتی ہیں۔ عربی مدارس میں انہیں اگر مروج کیا جائے تو امید ہوتی ہے کہ علاوہ معاشی منافع کے خود دین کا سر جو آج ''چہ خورد بامدادِ فرزندم'' کے بوجھ کے نیچے دب کر مجبور ہے کہ ہر جاہل کندۂ ناتراش کے آگے جھکا رہے، شیروں کی ان روبہ مزاجیوں میں اس سے بہت کچھ تخفیف کی امید ہو سکتی ہے اور ایسی دستکاریاں یا پیشے ایک نہیں

متعدد ہیں۔ یہی استکتاب (نقل کتب) کا فن ہے۔ اگر طلبہ میں خطاطی کا شوق پیدا کیا جائے صرف نقل کتب ہی نہیں، کاپی نویسی (1) مختصر نویسی، کمپوز کرنے کے کام، نامہ نگاری، وقائع نگاری، اخبار نویسی یہ سب ایسے کام ہیں جو علم سے مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ جاہلوں کے ہاتھ سے نکل کر اگر اس قسم کے پیشے اہل علم کے ہاتھ میں آجائیں گے تو کام زیادہ بہتر صورت میں انجام پا سکتا ہے۔ اَن پڑھ جاہل کاتبوں سے جن مصنفین کو پالا پڑا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ان کو وہی مرزا صائب کا شعر۔

ہر گزاز چنگیز خاں برعالم صورت نرفت
آنچہ از دستِ کاتباں برعالم معنی گزشت

پڑھ پڑھ کر بسا اوقات سر پیٹ لینا پڑتا ہے۔

دوسرے جائز پیشے اور اُن کی اہمیت

اور علم سے اگر کسی پیشہ کو مناسبت نہ بھی ہو مثلاً زرگری، نجاری، آہنگری، خیاطی، معماری، طباخی، مرغبانی، مویشیوں کی پرورش، باغبانی، کاشتکاری، زمینداروں کے دیہاتوں کا نظم، حساب و کتاب وغیرہ وغیرہ بیسیوں ایسے کام ہیں جنہیں علم سے براہ راست ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ سارے کاروبار چونکہ مقامی ہیں، یورپ سے نہ زرگر آئیں گے، نہ معمار نہ طباخ نہ حلوائی، اس لیے مشرقی ممالک سے مقابلہ کا اِن پیشوں میں خوف بھی نہیں ہے، بلکہ علمِ دین کے پڑھنے والے طلبہ سے اُمید کی جاتی ہے کہ عموماً ان میں (2) خدا کا خوف ذمہ داریوں کا احساس زیادہ ہوگا، آج جاہل بے دین پیشہ وروں سے دنیا چیخ اُٹھی ہے۔ ایک تولہ خالص دودھ بھی آپ شہروں میں تلاش کیجیے، تو مشکل ہی سے مل سکتا ہے، یہی حال تمام پیشوں کا ہے۔ نسلِ آدم ایماندار دستکاروں اور ملازموں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بڑے بڑے زمیندار ہیں جنہیں اپنے ہر ہر گاؤں کے لیے منیجروں، تحصیلداروں کی خدمات کی ضرورت ہے، لیکن دیانتدار مولوی ان فنون سے ناواقف ہیں اور جو ان چیزوں کو جانتے ہیں وہ دین و دیانت سے عاری۔

جائز پیشوں میں ذلت نہیں

بحمداللہ پیشوں کے متعلق ذلت کے احساس کا مسئلہ مسلمانوں کی تاریخ ختم کر چکی ہے۔ جس سے ہر کہ و مہ واقف ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

ہر چہ گیرد علتے علت شود
کفر گیرد کاملے ملت شود

پیشے دراصل ذلیل نہیں ہیں، بلکہ ذلیلوں اور جاہلوں کے ہاتھ میں بیچارہ پیشہ جا کر ذلیل ہوگیا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جس پیشے کو ہاتھ میں لے گا۔ اسی وقت اس میں عزت پیدا ہو جائے گی۔

ایک ہندوستانی مُفسرِ قرآن اور طباخی

آپ باہر کیوں جائیں، اسی ہندوستان میں ایک مولانا عثمان خیرآبادی تھے۔ ''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے مولانا عثمان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کا پیشہ طباخی کا تھا، اور طباخی بھی کس چیز کی، سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

''سبزی (ترکاری) پختے از شلغم و چقندر و مانند آں و دیگ پختے واں را می فروختے۔'' (ص 32)

''شلغم و چقندر وغیرہ کی ترکاری کی دیگ پکا کر بیچتے تھے۔''

یہ نہ خیال کیجیے کہ یہ نام کے مولانا تھے، سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ ''بس بزرگ کسے بود او رتفسیرے ہست'' قرآن کا مفسر ہے اور شلغم چقندر پالک سب کو ملا کر ترکاری پکاتا ہے اور بیچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پکنے کے بعد ان کی دیگ کو خالی ہونے میں کیا دیر لگتی ہوگی، اور یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان میں اسلام نے پہلی دفعہ قدم رکھا تھا، کیونکہ شیخ عثمان خیرآبادی کا زمانہ سلطان المشائخ سے بھی پہلے ہے۔

مولانا احمد حسن کانپوری کے صاحبزادے اور پیشہ حلوائی

میرا تو چشم دید واقعہ کانپور کا ہے۔ مشہور صاحب درس عالم محشی مثنوی مولانا روم مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم کے منجھلے صاحبزادے جو خود عالم بھی تھے، کانپور میں صرف غالباً امرتیا یا اور بھی دو ایک قسم کی مٹھائی خاص طریقے سے بناتے تھے، بناتے کیا تھے اپنی نگرانی میں بنواتے تھے، لیکن چونکہ ہر چیز مٹھائی میں دیانتداری سے دی جاتی تھی، گھی بھی خالص ہوتا تھا، دوسرے اجزاء بھی خالص، دھوکہ فریب جو عام جاہل حلوائیوں کا شیوہ ہے نہ دیا جاتا تھا، آج کانپور میں سینکڑوں آدمی اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ بننے کے گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مٹھائی کا ملنا ناممکن تھا، خریدار گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے، بسا اوقات پیشگی دے کر اپنا حصہ آدمی کو محفوظ کرانا ہوتا تھا، حالانکہ اسی کانپور میں سینکڑوں حلوائی صبح سے شام تک بیٹھے دُکانوں پر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہ طباخی کے پیشہ سے حضرت مولانا خیرآبادیؒ کی عزت پر حرف آیا، یہی کیا کم ہے کہ سلطان المشائخ جیسی ہستی ایسے شاندار الفاظ میں ان کی توصیف کرتی ہے۔ آج چھ سو سال کے بعد ان کے ذکر پر اپنی کتاب میں مَیں مجبور ہوا ہوں، اور نہ مولانا احمد حسن مرحوم کے صاحبزادے کو کانپور نے کبھی تحقیر کی نگاہ سے دیکھا، مولانا کی مٹھائی سارے کانپور میں زبان زدِ عام تھی۔

مولویوں کا گذر بسر

آج عوام کے چندوں پر مولویوں کی گذر بسر کا جو دارومدار رہ گیا ہے اور اس کی وجہ سے ملک کے تاجروں،

رئیسوں، خوش باشوں کے سینوں کے وہ بوجھ بنے ہوئے ہیں، اس دباؤ کے تحت بسا اوقات حق پوشی کے جرم کا مجرم بھی بننا پڑتا ہے۔ کیا ان دنیوی و دینی بے آبروئیوں سے بھی زیادہ کسی پیشے کے اختیار کرنے میں بے آبروئی کا احتمال ہے؟ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مدرسہ میں اس قسم کی ہر دستکاری کو داخل کیا جائے بلکہ موقعہ مناسب خیال کر کے ایک ایک دو دو پیشوں کو داخل کر دینا کافی ہوسکتا ہے خصوصاً جس علاقہ میں مسلمان پیشہ وروں کی کمی محسوس ہوتی ہو۔ کہیں مسلمان خیاط نہیں ملتے، کہیں مسلمان مُزین نہیں ملتے، کہیں زرگری کا پورا کام غیر اقوام کے ہاتھ میں ہے۔ ان علاقوں کے عربی مدارس کو دیکھ بھال کر اپنے یہاں اسی قسم کی دستکاری یا ہنر کی تعلیم کا نظم طلبہ کے لیے کر سکتے ہیں۔

ایک ذیلی بات تھی، لیکن مدت سے دماغ میں موجزن تھی۔ گوشہ نشینی موقع نہیں دیتی کہ لوگوں سے دل کی کہوں، مناسب مقام دیکھ کر خیالات کا اظہار کر دیا گیا: ''فذکر فان الذکریٰ تنفع المومنین'' شاید کسی کو میری بات پسند آ جائے۔

اشاعتِ کتب کی خدمت

میں گفتگو تو شیخ علی متقیؒ کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل پر کر رہا تھا کہ جہاں کتابیں نہیں ہوتی تھیں وہاں نقل کرا کے بھیجا کرتے تھے، مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، باوجودیکہ طباعت نے بہتر سے بہتر کتابوں کو اہلِ علم تک پہنچا دیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جو کچھ چھپ چکا ہے اس سرمایہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی زیورِ طبع سے عاری ہے۔ علوم نادرہ ہی نہیں بلکہ اسلام کے علوم عامہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف، رجال، تاریخ وغیرہ وغیرہ تک علوم کی بیسیوں ضروری کتابیں غیر مطبوع ہیں، جن کی کام کرنے والوں کو اب بھی ضرورت ہے۔ ضرورت کے اس تریاق کو مطابع کے عراق سے وابستہ کیے رہنا، مار گزیدوں کی تو نہیں لیکن علم گزیدوں کی موت ہے۔ کاش استکتاب کے اس طریقہ کو جاری کر دیا جاتا تو بڑا کام نکلتا۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے جواں ہمت عالم مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اس سلسلہ میں بڑی دلیری اور جواں مردی کا کام کیا۔ صحاح کے سوا آٹھ نئی کتابوں کی حدیثوں کا ایک مجموعہ جمع الفوائد کا نشان ان کو حجاز سے واپسی کے وقت دمشق میں ملا، معلوم ہوا کہ شام کے گاؤں کفر سوسہ کے ایک عالم محمود بن رشید العطار کے پاس اس کا ایک نسخہ ہے۔ مولانا اُس گاؤں تک گئے۔ علامہ محمود نے ان کے اس شوق کو دیکھ کر کتاب حوالے کر دی۔ مولانا غالباً دمشق یا بیروت ہی سے اپنے ساتھ ٹائپ بھی خرید کر لائے اور صرف اس کتاب کی طباعت کے لیے ٹائپ کا یہ مطبع قائم کیا۔ ان کو دوسرا نسخہ سندھ میں پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں بھی مل گیا۔ دونوں کا مقابلہ کر کے آخر کتاب چھاپ کر علماء تک پہنچا ہی دی۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

مُلّا معین ہروی اور خدمت کتب

مسلمانوں کو کتابوں کے لکھوانے، تقسیم کرنے کا ذوق دراصل ایک مستقل داستان ہے۔ مشہور واعظ ملا معین

ہروی جو اپنی کتاب ''معارج النبوۃ'' کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں، بلکہ ان ہی کے دیوان کو مطبع نولکشور نے حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ کے نام سے شائع کر دیا ہے، ان ہی کے پوتے جن کا نام بھی شیخ معین تھا، یہ اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور لاہور کے قاضی (3) مقرر ہوئے۔ مُلّا عبدالقدر بداؤنی نے ان کے متعلق منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ ''مدد معاش خودرا کہ کلی بود صرف کاتباں می کرد تا کتب نفیس قیمتی می نویسانید وآں را مقابلہ فرمودہ مجلد ساختہ بہ طالب العلماں می بخشید ومدت العمر کاروبار پیشہ اوایں بود۔ ہزاراں مجلد ازیں قبیل بمردم بخشیدہ باشد۔'' (بداؤنی۔ ج 3، ص 96)

کتابت کا دین سے تعلق

بہرحال اس زمانہ کے مسلمانوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن ہمارے بزرگوں نے علم اور وہ بھی علمِ دین کی کتابت (4) کو دین ہی کا ایک جز قرار دیا تھا۔ عموماً چاہا جاتا تھا کہ دین کے اس کام میں اپنا حصہ بھی حسب استطاعت حاصل کیا جائے، علماء کی دوات کی روشنائی شہیدوں کے خون کے برابر ہوگی۔ یہ حدیث صحیح نہ بھی ہو، لیکن الم کے تین حرف کے تلفظ میں حدیث صحیح کے رو سے جب بحساب فی حرف دس نیکی، تیس نیکیاں ملتی ہیں تو ان ہی حروف کی مکتوبہ شکلوں کی تشکیل جو نطقی حالت سے یقیناً زیادہ پائیدار ہے اور اس کے افادہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، کہ اشخاص سے منتقل ہو کر نسلوں تک اس کے دوررس نتائج اپنے منافع کو پہنچاتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ اس پر بھی ''مجازاتِ حسنیٰ'' کا یہ قانون کیوں منطبق نہ ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا اس کے متعلق ہمیشہ یہی خیال رہا۔ (5)

سلطان عالمگیر اور کتابت

یہی وجہ ہے کہ عوام تو عوام خود سرزمین ہند میں محی الملۃ والدین اورنگ زیب انار اللہ برہانہ ہی نہیں جن کے دستِ مبارک کے مصاحف آج بھی مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ دولتِ اسلامیہ ہندیہ کے ابتدائی عہد میں بھی ایسے سلاطین گذرے ہیں جنہوں نے کتابت قرآن ہی کو اپنی معاشی زندگی کے ساتھ معادی فلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔ کیا ان کے سامنے ''والحسنۃ بعشرۃ امثالھا'' کا قرآنی انعام کتابت مصاحف میں نہ تھا؟

سلطان شمس الدین التمش اور کتابت

تاریخوں میں حضرت سلطان ناصر الدین بن شمس الدین التمش کے حالات میں جہاں یہ لکھتے ہیں جس سے اسلامی حکومتوں کے بجٹ کے مدات کا بھی سرسری اندازہ ہوتا ہے:

> ''خراج و باج ممالک در مواجب سپاہ و نذر درویشانِ خدا آگاہ وظائف و درار فضلاء و ارباب استحقاق ووجوہِ مسکیناں و زیردستاں و عمارت و مساجد و خانقاہ و مہمان سرائے و اجرائے انہار و غیر ذلک انچہ از آثار خیر و اسباب ذکر جمیل تواند بود خرچ کردے'' (سیر المتاخرین۔ ج 1، ص 109)

''خراج اور ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی اسے سپاہیوں کی تنخواہ، خدا آگاہ درویشوں کے نذرانے، اربابِ فضل وکمال اور مستحقین کے وظیفے، مسکینوں اور غریبوں کی دلجوئی اور عمارت، مساجد، خانقاہ، سرائے اور نہر وغیرہ اسبابِ خیر کے بنانے پر خرچ کر ڈالتا۔''

اسی کے ساتھ تقریباً مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ:

''درسالے دو مصحف بخطِ خود نوشتہ آنرا قوت ساختے۔''

''سال میں دو قرآن پاک اپنے قلم سے لکھتا اور اس سے رزق کا سامان کرتا۔''

آخر اس بادشاہِ دین پناہ کے سامنے آخرت (6) کا ثواب نہ تھا تو اس واقعہ کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے کہ:

''نوبتے یکے از نوکران سرکار مصحف کہ بخطِ سلطان بود از روئے خوشامد بقیمت گراں خرید چوں ایں خبر بگوش سلطان رسید منع کرد کہ آئندہ مصحف را بخطِ من اظہار نکنند بلکہ بطور اخفا کہ احدے بر تحریرِ من وقوف نیابد بدمیفر وختہ باشد۔'' (سیر المتاخرین۔ ج1، ص109)

''ایک مرتبہ ایک سرکاری نوکر نے مصحف کو اس وجہ سے کہ سلطان کا لکھا ہوا تھا، خوشامد میں گراں خرید کیا، لیکن جونہی یہ خبر سلطان کو ملی، منع کر دیا کہ ہرگز کسی پر یہ ظاہر نہ ہو کہ میرا لکھا ہوا ہے، بلکہ پوشیدہ طور پر اس کے ہاتھ بیچا جائے، جو میری تحریر نہ پہچانتا ہو۔''

شاہانِ ہند اور کتابت

باون سال تک اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں اور اُنیس سال تک سلطان نصیر الدین نے یعنی اکہتر سال تک اسی ہندوستان نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ اورنگِ حکومت اور چترِ شاہی کے نیچے بھی قرآن لکھا جا رہا ہے۔ دنیا میں اور بھی ادیان و مذاہب ہیں ان میں سلاطین وفرماں روا گزرے ہیں، لیکن اس کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے۔

خواتین کا ذوق کتابت

اسلامی سلاطین کے اسی عجیب وغریب ذوق کا نتیجہ تھا کہ شاہی خانوادہ کی خواتین مُخدّرات میں بھی ایسی خاتونیں ملتی ہیں جنہوں نے چند سورتیں نہیں بلکہ پورا قرآن اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ ''شاہجہان نامہ'' میں سال ہشتم کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ امیر تیمور گورگان کی حقیقی پوتی ملک شاد خانم کے دستِ خاص کا لکھا ہوا مصحف بادشاہ کے سامنے پیش ہوا، اصل عبارت یہ ہے:

''مصحفے بود بخطِ ملک شاد خانم بنت محمد سلطان میرزا ابن جہانگیر میرزا ابن صاحبِ قران امیر تیمور گورگان کہ بخطِ ریحاں درکمالِ متانت نوشتہ در خاتمہ اسم ونسب خود برقاع نگاشتہ۔''(7)

(منقول از سیر المتاخرین۔ ص263)

''ایک قرآن پاک جو ملک شاد خانم کے قلم کا خط ریحاں میں بہت عمدہ لکھا ہوا تھا، اخیر میں خط رقاع میں اپنا نام ونسب بھی لکھا ہوا تھا۔''

اس واقعہ سے صرف مصحف نگاری کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ بھی کہ شاہی خاندان کی عصمتیاں سراپردۂ عفت میں خطاطی کا فن کس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آج تو ہم عام مسلمانوں کے لیے بھی خطِ ریحان اور خط رقاع کی اصطلاحات نامانوس ہو چکی ہیں، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ کے کشور کشاؤں میں جس فاتح اور کشور کشا کا نام آج بھی اپنی مثال بہ مشکل پیدا کر سکتا ہے، اسی امیر تیمور گورگان کی پوتی بھی قرآن صرف لکھتی نہیں بلکہ ایک خط ریحان کے التزام کے ساتھ بکمال متانت پورے قرآن کو ختم کرتی ہے اور جس عہد کے سلاطین وشاہی خاندان بلکہ شاہی خاندان کا یہ حال ہو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں عوام کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔

خط بابری اور اس کی تاریخ

ملا عبدالقادر (8) بداؤنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

''خط بابری را بابر بادشاہ اختراع نمودہ ومصحف باں نوشتہ بمکہ معظمہ فرستادہ۔''

(ج 3، ص 273)

''خط بابری سلطان بابر کی ایجاد ہے اور اس خط میں انہوں نے قرآن لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا۔''

اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحیی مشہدی وغیرہ نے اس خط کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی باتوں کا ملک میں عام طور سے عام مذاق پھیلا ہوا تھا، بعض بزرگوں کا ذکر تو پہلے بھی آیا ہے۔

شیخ فخر الدین اور کتابت قرآن

حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک مرید شیخ فخر الدین مروزی بھی ہیں۔ یہ بھی اس وقت تک جب تک انگلیاں کام دیتی رہیں، آنکھوں میں قوت بینائی موجود تھی۔ بقول محدث دہلوی ''پیوستہ کتابت کلام مجید کردے۔'' چونکہ حافظ بھی تھے اس لیے لکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ کام کب تک کرتے رہے، شیخ نے لکھا ہے:

''چوں پیر معمر شداز کتابت باز ماند۔''

کتابت کی اُجرت

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے حوالے سے کتابتِ قرآن کے متعلق ان کی جو خصوصیت شیخ محدث نے نقل کی ہے، اس سے اُس زمانہ میں کتابت کی عام اُجرت کا بھی چونکہ پتہ چلتا ہے۔ اس لیے چراغ دہلی کے اس بیان کو یہاں درج کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ ''آنچہ فخر الدین مروزی روزے کتابت کرد از خلق پر سیدے ایں کتابت بچہ ارزد'' یعنی

لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس کتابت کی بازار میں کیا قیمت لگائی جا سکتی ہے۔ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ''شش گانی جزوے'' یعنی فی جزو ''شش گانی۔'' بہ ظاہر مروجہ سکوں میں جو آخری سکہ بمنزلہ پیسے کے ہوتا تھا۔ جسے جیتل کہتے تھے وہی مراد ہے، کیونکہ آگے کا فقرہ اس کے بعد یہ ہے کہ مولانا فخر الدین لوگوں سے اس کے جواب میں کہتے کہ ''او گفتے من چہار جیتل بستانم زیادہ نستانم'' یعنی بجائے چھ جیتل کے حضرت نے اپنی کتاب کا دام فی جزو چار جیتل ہی مقرر کر لیا تھا اور اس سے زیادہ نہیں لیتے کہ ''اگر کسے برائے تبرک زیادہ از چہار جیتل کردے نستدے۔''

مولانا فخر الدین کا بڑھاپا

لکھا ہے کہ بڑھاپے تک چار جیتل فی جز کے حساب سے قرآن کی کتابت کا مشغلہ کرتے رہے، لیکن جب بالکل معذور ہو گئے تب قاضی حمید الدین ملک التجار نے سلطان علاؤ الدین خلجی سے سفارش کی کہ ان کی امداد شاہی خزانہ سے جاری فرمائی جائے۔ بادشاہ نے ایک تنکہ (غالباً نقروی روپیہ مروجہ) یومیہ مقرر فرمایا، لیکن ان کو اسی پر اصرار تھا کہ دن بھر کتابت کی مزدوری کی جو اُجرت میری ہوتی تھی وہی دی جائے۔ ''ہماں شش گانی بد ہید بعدہ بخیل بسیار و شش گانی قبول کرد۔''

مولانا جلال الدین مانکپوری اور کتابت

اس سلسلہ میں غالباً اس کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ فی جز ایک ''شش گانی'' تو بھاؤ تھا، لیکن اپنی کتابت کی خوبی نیز مطلاّ و مذہب اور دوسرے لوازم جو اس زمانہ میں خصوصاً قرآنی نسخوں میں اختیار کیے جاتے تھے، جیسا کہ ظاہر ہے قیمتیں مختلف ہوتی تھیں، شیخ محدث نے مولانا جلال الدین مانکپوری کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''خوردن او داز وجہ کتابت بود مصحف می نوشت و بدہلی می فرستاد و پانصد تنکہ ہدیہ شدے۔'' (ص 178)

''ان کا ذریعہ معاش کتابت تھی، قرآن لکھ کر دہلی بھیجتے اور پانچ سو تنکہ ہدیہ مل جاتا۔''

قلمی قرآن مجید کی قیمت

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک قرآن کا ہدیہ پان پان سو تنکہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن حضرت سلطان جی نظام الاولیاءؒ کے حوالہ سے ''فوائد الفواد'' میں ایک واقعہ قاضی برہان الدین (دہلی) کا درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک تنکہ میں بھی قرآن عموماً مل جاتا تھا۔ قاضی برہان الدین کے اس قصہ میں ہے کہ ''یک تنکہ را مصحف خرید۔'' (ص 110)۔ آج طباعت کے زمانے میں بھی قرآن مجید کا ہدیہ اس سے کم نہیں ہے۔

مشغلہ تصحیح قرآنی

بہر حال ان واقعات سے مجھے تو اس زمانہ کے مسلمانوں کے ذوق کتابت کا اظہار مقصود تھا۔ مسلمانوں میں

قرآن کی کتابت کو کتنی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان واقعات سے بھی ہوسکتا ہے کہ جن سے کتابت کا کام بن نہیں پڑتا تھا تو وہ قرآنی نسخوں کی تصحیح میں وقت گذارنے کو زادِ آخرت بناتے تھے۔ مولانا آزاد نے ''مآثر الکرام'' میں میر محمد جان بلگرامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور مدینہ کی زندگی میں انہوں نے اپنا دینی مشغلہ یہ مقرر کیا تھا کہ:

''از صبح تا شام در مسجد نبوی می نشست و مصاحف وقف روضۂ مقدسہ را بہ تصحیح می رساند و اوقات گرامی را دریں شغل شگرف صرف می ساخت۔'' (مآثر۔ص 280)

''صبح سے شام تک مسجد نبوی میں بیٹھے ہوتے اور ان قرآن پاک کی تصحیح میں لگے رہتے جو روضۂ مقدسہ پر وقف تھے۔ اپنے اوقات اسی مبارک شغل میں صرف کرتے۔''

''مہابھارت'' کا ترجمہ عہد اکبر میں

اس سلسلے میں دلچسپ قصہ تو خود ملاّ عبدالقادر کا ہے۔ اکبر نے انہیں جب ''مہابھارت'' کے ترجمہ کا حکم دیا تو گو وہ بھی بھاشا سے واقف تھے لیکن ''مہابھارت'' کی سنسکرت عبارت کا براہِ راست سمجھنا ان کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے ''دانایان ہند (پنڈتوں) راجمع کردہ حکم فرمودند کہ کتاب مہابھارت راتعبیری کردہ باشند'' (پنڈتوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ کتاب ''مہابھارت'' کا مفہوم سمجھاتے جائیں) جس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دانایانِ ہند سنسکرت کی عبارت کے مفہوم کو سمجھاتے ہوں گے اور یوں فارسی میں اس کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے کتاب کا ترجمہ ہوسکتا ہے یا نہیں مُلا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ طریقۂ کار کو اکبر نے خود سمجھایا:

''چند شب بہ نفس نفیس معانی آں را بہ نقیب خاں (رفیق ترجمہ ملا) خاطر نشان ساختند تا ماحصل رابفارسی املاء می کرد۔''

''چند رات بہ نفس نفیس نقیب خاں کو اس کے معانی ذہن نشین کیے، تاکہ اس کا خلاصہ فارسی لکھیں۔''

مُلاّ عبدالقادر اور ''مہابھارت''

الغرض نقیب خاں کی معیت میں مُلاّ عبدالقادر نے ترجمہ کے اسی خاص طریقے سے ''مہابھارت'' کو فارسی لباس پہنانا شروع کیا۔ مُلاّ کا بیان ہے کہ ''در مدت چہار ماہ از ہژدہ فن از مزخرفات لاطائل کہ ہژدہ عالم دراں متحیر است دو فن نوشتہ شد۔'' اب واللہ اعلم مُلاّ صاحب سے بات نہ بن پڑی، یا قصداً ان کی جانب سے کوتاہی ہوئی، کچھ بھی ہوا ہو، مُلاّ صاحب موردِ عتاب شاہی ہوئے۔ خود ہی لکھتے ہیں کہ:

''چہ اعتراض کہ نشنید و حرام خورم و شلغم (9) خورم ایں معنی درشت گویا نصیبۂ فقیر ازیں کتابہا ہمیں بود النصیب مایصیب۔'' (ص 320)

''کون سا اعتراض تھا جو نہ سنا، حرام خور اور شلجم خور میرے لیے سخن تکیہ بنا لیا گیا تھا، اور یہ سب اسی کتاب کی وجہ سے تھا، مختصر یہ کہ مقدر تھا حصہ میں آیا۔''

مُلّا عبدالقادر پر اکبر کا غصہ

ملا بیچارے پر اکبر کا یہ غصہ اخیر وقت تک باقی رہا۔ ایک اور موقع پر ''مہابھارت'' ہی کے ترجمہ کی کسریوں نکالی گئی، جس کے مُلّا ہی ناقل ہیں کہ میں ''جھروکہ کے درشن'' کے سامنے دوسروں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''فقیر را پیش طلبید ندو خطاب بہ شیخ ابوالفضل فرمودند کہ ما فلانے را عبارت از فقیر باشد جوانے فانی صوفی مشرب بے خیال می کردیم اما او خود چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب اور رانتواند برید۔''

''فقیر کو خدمت میں بلایا اور شیخ ابوالفضل کو خطاب کر کے کہا کہ ہم فلاں کو (مراد فقیر تھا) ایک صوفی مشرب جوان سمجھتا تھا، مگر وہ ایسا متعصب فقیہہ ظاہر ہوا کہ کوئی بھی تلوار اس کے تعصب کی گردن نہیں کاٹ سکتی۔''

ابوالفضل نے عرض کیا کہ ان سے کیا حرکت سرزد ہوئی، جواب میں وہی مہابھارت کا قصہ نکلا۔ ''فرمودند درہمیں رزم نامہ کہ عبارت از مہابھارت باشدودوش بریں معنی نقیب خاں را گواہ گرفتہ ام۔''

مُلّا عبدالقادر اور کتابت قرآن

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا خیال یہی تھا کہ مُلّا نے قصداً مذہبی تعصب کی وجہ سے ''مہابھارت'' کے ترجمہ میں کوتاہیاں کی ہیں۔ بہرحال بیچارے مُلّا کو اس ترجمہ کا معاوضہ ان شکلوں میں جب ملا تو کفارہ کی جو شکل ان کی سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا جائے، خود لکھتے ہیں:

''ہمدریں سال حق سبحانہ، تعالیٰ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید تا بخط نسخ و روشن و خوانا نوشتہ با تمام رسانیدہ و بلوح وجدول مکمل وقف روضۂ منورہ حضرت غوث الانامی مرشدی وملاذی میاں شیخ داؤد جھنی دال قدس سرہ ساختہ۔'' (البداوئی۔ ج 3، ص 394)

''اسی سال اللہ تعالیٰ نے کاتب کو کلام پاک کی کتابت کی توفیق عطا کی، خط نسخ روشن میں لکھ کر ختم کیا اور لوح وجدول پورا کا پورا حضرت شیخ داؤد جھنی کے روضہ کے لیے وقف کر دیا۔''

موسیقی کے بجائے قرآن کی طرف میلان

مُلّا صاحب کی اس فارسی عبارت میں لوح وجدول کے جو الفاظ آئے ہیں، عہد مطابع کے پیدا شدوں کو شاید

اس کی اہمیت کا علم نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے موسیقی کی چونکہ ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اس کا عام رجحان اس کے خلاف ہی رہا جس کی بحث کچھ آئندہ صوفیۂ ہند کے سماع کے سلسلہ سے ان شاء اللہ آئندہ آئے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری موسیقیت فنِ تجوید وقرأت میں گم ہوگئی اور وہی چیز جس کے ذریعہ سے خدا جانے شیطان کتنے گھرانوں کو اُجاڑ چکا تھا، کتنے نوجوان اسی موسیقی کے بت پر جذبات سے بے قابو ہوکر بھینٹ چڑھ گئے اور کون جانتا ہے کہ عصر حاضر کے سینماؤں اور تھیٹروں، میوزک ہالوں کے ہاتھوں کتنے جوانوں کی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں، دلرُباؤں سے لو لگانے میں شیطان کو جتنی مدد موسیقی سے ملی ہے اتنا کارگر حربہ مردم کش آلات کے بعد بنی آدم کی تباہی کا اسے شاید ہی (10) ملا ہو، کتنی مائیں، کتنے باپ ہیں جن کو اپنے عشق نواز بچوں سے جو عموماً اسی میوزک کے میٹھے زہر کے مارے ہیں ہاتھ دھونا پڑا، لیکن یہ اسلام کا کمال ہے کہ امالہ کے قانون پر عمل کرکے اتنے بڑے شر سے بھی خیر کا کام نکال لیا گیا۔ ایک قاری جب اپنے خاص لحن سے قرآن پڑھتا ہے، روحیں ان سے اپنے اندر جو بالیدگی اور رفعت محسوس کرتی ہیں، اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں، جن میں فطرتاً حسنِ صورت سے متاثر ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہو۔ (11)

مصوری کے بجائے قرآن پاک میں مینا کاری

بہر حال کچھ امالہ کی یہی کیفیت ہمیں تصویر کشی کے مسئلہ میں نظر آتی ہے یعنی حیوانی مصوری (12) کو اسلام نے جو حرام قرار دیا، تو غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن کاری کے سارے رجحانات اور میلانات منجملہ دیگر مباح فنونِ لطیفہ کے قرآنی لوح اور جدول سازی کے متعلق نادرہ نمائیوں کی طرف راجع ہوگئے۔ لوح یعنی کتاب کے ابتدائی ورق اور جس ورق سے کتاب شروع ہوتی تھی اس کی ناصیہ (پیشانی) پر جو گل کاریاں کی جاتی تھیں، نیز ہر ورق کے حوض کو لکیریں کھینچ کر جو دیدہ زیبی اور کتابت میں رعنائی پیدا کی جاتی تھی جس کی ابتداء جہاں تک میرا خیال ہے قرآن ہی سے ہوئی اور قرآن سے پھر متجاوز ہوکر دوسری کتابوں میں اس عمل کا رواج ہوا۔ یہ بھی گویا جذبۂ مصوری کے امالہ کی ایک شکل ہے۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں سونے، چاندی، موتی، مختلف رنگین جواہرات کو محلول اور سیال کرکے ان کے مختلف رنگوں سے جو کام لیا ہے اور اسی سلسلہ میں جلدوں کی صنعت میں جو ترقیاں کی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود ان کا ایک مستقل کارنامہ ہے، اس سے ان کے ذہنی اور علمی استغراق کا پتہ چلتا ہے، امارت بھی کی تو کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا تعلق قرآن اور علم ہی سے باقی رکھا۔ قدیم قلمی کتابوں کے کتب خانوں میں جن کا بڑا حصہ تو غیروں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، لیکن تھوڑا بہت بچا کھچا جو ذخیرہ ابھی ملک کے بعض گوشوں میں باقی رہ گیا ہے خصوصاً حیدرآباد کے شاہی کتاب خانہ یا نواب صاحب رام پور کی لائبریری، خدا بخش خاں مرحوم بانکی پور (پٹنہ) کے مشرقی کتب خانے، سیدی مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ العالی کے کتب خانہ حبیبیہ وغیرہا میں اب بھی مسلمانوں کی اُن حسن کارانہ صناعیوں کا معائنہ کیا جاسکتا ہے اور اس مرحوم امت کے اس شغف مُفرط کا سراغ ملتا ہے، جو کتابوں سے کسی زمانہ میں اسے پیدا ہوگیا تھا۔ بلا مبالغہ اس سلسلے میں ایک ایک کتاب پر ہزار ہزار روپیہ صرف کیے جاتے تھے۔

''شاہنامہ فردوسی'' کے پچھتّر اشعار پر چالیس ہزار خرچ

تاریخ ''حدیقۃ العالم'' میں لکھا ہے کہ ایران کے بادشاہ عباس صفوی کو شوق ہوا کہ فردوسی کے ''شاہنامہ'' کا ایک شاہی نسخہ تیار کرایا جائے۔ عماد کاتب اس کام کے لیے بلایا گیا۔ عماد نے شرط پیش کی کہ ایک خاموش باغ کے مکان میں جگہ دی جائے اور ساز وسامان کی جو ضرورت ہو وہ پوری کی جائے۔ بادشاہ نے وزیر کو بلا کر حکم دے دیا کہ عماد کی فرمائش پوری کی جائے۔ باغ اور بنگلہ، نوکر چاکر سب حاضر کر دیئے گئے۔ طلاکاری وجواہر نگاری کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی، اس کی ابتدائی قسط کی فہرست وزیر کے پاس پیش ہوئی، اس کی بھی منظوری دے دی گئی۔ چند دنوں کے بعد عباس نے وزیر سے شاہ نامہ کی کتابت کا حال پوچھا۔ وزیر نے رپورٹ کی کہ اب تک پچھتر شعر مثنوی کے لکھے گئے ہیں اور چالیس ہزار صرف ہو چکے ہیں، باوجود بادشاہ بلکہ کج کلاہ ایران ہونے کے اس کے ہوش اڑ گئے۔ مصارف کا یہی معیار آخر تک باقی رہا تو پوری کتاب کی لاگت گویا کروڑوں ہی تک پہنچے گی۔ ہمت چھوٹ گئی اور عماد کو حکم دے دیا گیا کہ کام کو روک دیں۔

فی شعر کی قیمت ایک ہزار

اس حکم نے عماد میں غصہ کی لہر دوڑا دی۔ اسی وقت اپنے ایک ایک شعر کو اس نے کاٹ کر وصلی کی شکل میں بدل دیا۔ سوار ہو، نقیب جو آگے آگے جا رہا تھا اُس کو حکم دیا کہ بازار میں آواز لگاتے جاؤ ''عماد کاتب کے قطعات فی قطعہ ہزار روپے کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔'' کہتے ہیں اصفہان کے بازار کے اس سرے سے دوسرے سرے تک عماد کی سواری پہنچنے نہیں پائی تھی کہ پچھتروں شعر بک گئے۔ حکومت کے خزانے کے چالیس ہزار جو صرف ہوئے تھے عماد نے وزیر کے پاس اس کو بھیج دیا اور پینتیس ہزار کی رقم مزید بچ گئی۔ میرے خیال میں اس میں کوئی مبالغہ نہیں (13)۔ اس زمانہ میں جب پرانے قدر دانوں کو میں نے دیکھا ہے کہ عماد یا رشید کے قطعات کی قیمت تین تین سو چار چار سو دیتے ہیں تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب مسلمانوں میں آج کا ایک روپیہ ہزار روپے کی مساوی قیمت رکھتا تھا، اس زمانہ میں ایک ایک قطعہ کو ہزار ہزار روپے میں لینے والے اگر مل گئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ (14)

ہندوستان اور کاغذ

یہی ہندوستان جس میں لوگ شیرازہ بندی سے بھی واقف نہ تھے بلکہ ہر ورق دوسرے ورق سے الگ ہوتا تھا، جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس ملک کی کتابیں:

> ''بیش تر بر برگ تار (15) وتوز (16) بفولادی قلم برنوشتہ وامروز کاغذ در نوشتن از چپ آغاز ندو ورق باہم پیوستہ نباشد وشیرازہ رسم نہ بود۔'' (آئین اکبری۔ ج 3، ص 48)

''بہت پہلے تاڑ وتوز کے پتوں پر آہنی قلم سے لکھتے تھے اور آج کل کاغذ پر بائیں سے لکھنا

شروع کیا ہے اور اس وقت نہ ورق یکجا ہوتے تھے اور نہ شیرازہ بندی کا رواج تھا۔"

ابوالفضل نے امروز کا لفظ جو بڑھایا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کا رواج اس ملک میں مسلمانوں کے عہد میں ہوا۔ میں نے حاشیہ میں "روضۃ الصفاء" سے جو عبارت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیجانگر میں اس وقت تک جس زمانہ میں اس رپورٹ کا لکھنے والا آیا ہے اور وہ ان دنوں میں آیا ہے، جب دکن کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، صرف یہ علاقہ باقی تھا، معلوم ہوتا ہے کہ قدامت پرستی کی وجہ سے بیجانگر کی حکومت نے اس وقت تک کاغذ کا استعمال شروع نہیں کیا تھا اور ہندوستان کی تاریخ وغیرہ کے متعلق جو عام مواد کمیاب ہے، اس کی زیادہ وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کے پاس کاغذ نہیں تھا۔ تاڑ کے پتوں پر چند مذہبی ضروری باتیں لکھ لیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم میرا یہ خیال ہے، ممکن ہے ارباب تحقیق کی رائے کچھ اور ہو۔ بہرحال اگر کاغذ اس ملک میں مستعمل ہوگا بھی تو بہت کم۔ زیادہ تر کام وہی تاڑ کے پتوں یا سلیٹ کی تختیوں سے لیا جاتا تھا، یا زمین پر ملتانی مٹی سے بچوں کو حساب وغیرہ کی مشق لکھوا کر کرائی جاتی ہوگی جس کی یادگار اب تک پُرانے پاٹھ سالوں میں ملتی ہے۔ لیکن جب مسلمان اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ کاغذ لائے، مختلف شہروں میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم تھے۔ خصوصاً کالپی کا کاغذ بہت مشہور تھا۔ لیکن "مآثر الکرام" میں ایک واقعہ کے ذکر میں کالپی کے کاغذ کی یہ خاصیت بتائی گئی ہے کہ "کاغذ کالپی در آب زود متلاشی می گرد" (ص 58) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالپی کا ساختہ کاغذ پانی میں بآسانی گل جاتا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں جو کاغذ کشمیر میں بنتا تھا، مُلّا عبدالقادر نے اس کے متعلق اپنی کتاب میں ایک عبارت یہ نقل کی ہے "نقوش آں از کاغذ شستن چناں می رود کہ ہیچ اثرے از سیاہی نماند۔" (ص 144، ج 3) جس سے معلوم ہوا کہ پانی سے دھونے کے بعد کاغذ پھر جیسا کا جیسا ہو جاتا تھا، اب بھی کشمیری کاغذ پر قرآن چھپا ہوا نظر آتا ہے تو بہت چکنا اور مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اتنا چکنا کاغذ کہ پانی سے حروف کو دھو دیجیے پھر جیسا تھا ویسا ہی ہو جائے۔ شاید اب بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔

بہار اور کاغذ

بہرحال معلوم نہیں کہ اور کہاں کہاں کاغذ کی صنعت مسلمانوں کے آنے کے بعد اس ملک میں جاری ہوئی۔ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں اکبری قلمرو کے ہر صوبہ کی دستکاریوں اور پیداواروں کا ذکر کیا ہے لیکن کاغذ سازی کے سلسلے میں اس نے صرف بہار ہی کا نام لیا ہے۔ بہار میں بھی سرکار بہار جو اب ایک معمولی قصبہ اور سب ڈویژن ہے اس کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

> "در سرکار بہار نزدیک موضع راجگر کان سنگ مرمر ست از و زیور ہا بر سازند، و کاغذ خوب می شود۔"
>
> "سرکار بہار میں راجگر کے پاس سنگ مرمر کی کان ہے جس سے زیورات بناتے ہیں اور کاغذ بھی خوب ہوتا ہے۔"

"سیر المتاخرین" کے مصنف نے بھی حالانکہ تمام صوبوں کے کچھ نہ کچھ مصنوعات کا ذکر ہر صوبہ کے ذیل میں

کیا ہے، زیادہ تر ابوالفضل ہی سے اس کا بیان ماخوذ ہے، لیکن تقریباً دو سو سال بعد انہوں نے بھی صرف یہی لکھا کہ "و کاغذ در موضع ارول و بہار خوب بہم رسد۔" (ص 19) گویا ابوالفضل کے بیان پر صرف اتنا اضافہ کیا کہ قصبہ بہار کے سوا ارول جو ضلع گیا میں قدیم شرفاء کی ایک بستی سے زیادہ اب کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس میں بھی "کاغذ خوب" کی بہم رسانی کی خبر دی ہے۔ آخر میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان دونوں مقامات بہار و ارول میں:

"اکنوں ہم می سازند اگر کارفرمائے بہم رسد و زرے خرچ کند شاید بہتر از آنکہ می سازند ساختہ آید۔"

"اب بھی بناتے ہیں، اگر کام کرنے والے فراہم ہو جائیں پہلے سے بہتر بنے۔"

مولوی مقبول احمد صمدانی نے میر عبدالجلیل بلگرامی کی سوانح عمری میں سرکاری گزیٹر سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ 1703ء تک انگریزی کتابیں پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھیں (حیات جلیل۔ ص 149) لیکن بتدریج آن قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ کارفرماؤں کا خاتمہ ہو گیا اور "زر" بجائے حوصلہ افزائی کے حوصلہ شکنی میں صرف ہوا۔ تقریباً چالیس سال سے تو میں جانتا ہوں کہ ان مقامات کو اب کاغذ سازی سے کوئی تعلق باقی نہ رہا ہے، شاید بہار میں ایک محلہ جو اب اسٹیشن بھی ہے، کاغذی محلہ کے نام سے جو مشہور ہے کسی زمانہ میں اسی میں کاغذ بنتا ہو۔

دوسرے مقامات میں کاغذ سازی

ممالک **(17)** محروسہ سرکار عالی حضور نظام میں بھی اورنگ آباد میں قدیم طرز کے کاغذیوں کی ایک نسل پائی جاتی تھی جو دم توڑ رہی تھی **(18)**، نیز بعض دوسرے اضلاع مثلاً کریم نگر وغیرہ کے بعض قصبوں میں اس کے بنانے والے موجود ہیں، لیکن اِدھر چند سالوں سے حکومت آصفیہ کے کارفرماؤں کی توجہ اس صنعت کے احیاء کی طرف مبذول ہوئی ہے اور زر بھی خرچ کیا جا رہا ہے، بحمد اللہ ہر قسم کے کاغذ فراہم ہونے لگے ہیں۔ سرکاری دفاتر میں ان کا تھوڑا بہت رواج بھی ہو چلا ہے اور شاہی فرامین جس کا نام "جریدہ غیر معمولی" ہے وہ عموماً اسی کاغذ پر طبع ہوتا ہے۔ بعض کتابیں بھی اس پر چھپی ہیں۔

ہندوستان میں مجلد کاپیاں

خیر یہ تو ایک ذیلی بحث تھی، نظر سے گذری ہوئی بات تھی موقع سے ذکر آ گیا، جی نہ چاہا کہ چپ چاپ گذر جاؤں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خواہ کاغذ کہیں بنتے ہوں، لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں کاغذ کی فراوانی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ عام کاغذ لکھنے پڑھنے اور کتب نویسی کے ملتے تھے، بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ سلطان جیؒ کے زمانہ میں جو ظاہر ہے کہ ہندی اسلام کے قرونِ اوّل ہی میں شمار ہو سکتا ہے، اس زمانہ میں سادہ کاغذوں کی مجلّد کاپیاں بھی مسودہ نگاری کے لیے ملتی تھیں اور وہ بھی سفید کاغذ کی "فوائد الفواد" میں ایک موقع پر خود حضرت نظام الاولیاءؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"مردے مرا کاغذ ہا سپید داد یکجا جلد کردہ من آں را بستدم فوائد شیخ ہم در آنجا ثبت

کردم۔'' (ص 31)

''ایک آدمی نے مجھے بہت سادہ کاغذ دیا، اسے ایک جگہ مجلد کرلیا اور اسی میں فوائد شیخ قلم بند کیا۔''

جس ملک میں لوگ کتابوں کی جلد بندی سے بھی ناواقف تھے اور دو ورق بھی باہم پیوستہ نہ ہوتے تھے، وہاں سادہ کاغذوں کی مجلد بیاضوں کا رواج ہو چکا تھا، اور یہی مجھے عرض کرنا تھا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوستان علمی وکتابی کاروبار اور اس کی مختلف نوعیتوں کے اسباب وادوات، آرائش وزیب وزینت کے لحاظ سے دوسرے اسلامی ممالک سے اگر بڑھا ہوا نہیں تھا تو کم بھی نہ تھا۔ مُلّا عبدالقادر کی لوح وجدل نگاری، جلد بندی کے ذیل میں بے ساختہ قلم سے یہ چند زائد چیزیں نکل گئیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ہر جز کا تعلق ''تعلیم وتعلم'' اور اس کے ساز وسامان ہی سے ہے۔

کتابت قرآن مُلّا عبدالقادر کی نظر میں

میں دراصل یہ بیان کر رہا تھا کہ مسلمان دینی کتابوں کی کتابت، ان کی تصحیح ومقابلہ وغیرہ کے کام کو بھی دین ہی کا ایک جز سمجھتے تھے اور اسی سلسلہ میں ملا عبدالقادر کی قرآن نویسی کا بھی ذکر اس لیے کیا گیا تھا کہ مُلّا صاحب نے جس نقطۂ نظر سے لکھا تھا، وہ دلچسپ تھا اور اسی کا ذکر یہاں مقصود تھا۔ اپنی مصحف نگاری کے مندرجہ بالا تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

''امید کفارۂ کتابہائے گزشتہ کہ چوں اعمال بندہ سیاہ ست گردیدہ مونس ایام حیات وشفیع بعد ممات گردد۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔'' (منتخب۔ ص 394)

''قرآن پاک کی کتابت کا مقصد یہ ہے کہ گزشتہ کتابوں کا کفارہ بنے، اس لیے کہ بندہ کے اعمال اچھے نہیں ہیں اور اس طرح زندگی میں یہ خدمت مونس اور بعد موت شفیع بن سکے۔''

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اکبر کے حکم سے جن مزخرفات کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا کام محض ملازمت اور بادشاہ کے خوف سے ان کو کرنا پڑا تھا، اسی کے کفارہ کی ایک صورت مُلّا صاحب نے یہ نکالی تھی اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ مسلمان اس کام کو ایک اہم دینی خدمت سمجھتے تھے۔ مُلّا صاحب بیچارے نے اپنے اس کام سے کفارہ کے سوا اس کی بھی توقع کی ہے کہ زندگی میں اس سے اُنس حاصل کروں گا اور اُمیدوار ہوئے ہیں کہ مرنے کے بعد ان ہی حروف قرآنی کی شفاعت اور سفارش سے ان کی نجات ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ صحیح حدیث کے رو سے قرآن کی تلاوت کا اثر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ میدانِ قیامت میں بادلوں کی شکل میں یا پرندوں کے پرے کی شکل میں پڑھنے والے کے سر پر سایہ فگن ہوں گے، تو قرآن لکھنے والے اسی قسم کی توقع اپنے مکتوبہ حروف سے اگر قائم کریں تو کیا تعجب ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کے مصنفین اپنی کتابوں میں قرآن کی آیتیں جو جابجا استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اس میں بشارت ہے وانما الاعمال بالنیات۔

تصحیح کتب کا ذوق

آپ دیکھ چکے کہ ہمارے اسلاف تو قرآن کی کتابت ہی نہیں صرف تصحیح کو بھی ایک مستقل عبادت کی حیثیت

سے اختیار کرتے تھے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں قرآن کی بھی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

شیخ عبدالوہاب المتقی کا ذوقِ تصحیحِ کُتب

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب المتقی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

''کتابے کہ نادر الوقوع کثیر النفع می بود کہ بسبب عدم تداول از حلیہ صحت عاطل گشتہ اصول نسخ آں را مہما امکن بہم رسانیدہ صورت تصحیح می دادند۔'' (اخبار۔ص 272)

''جو کتابیں کہ نادر الوقوع اور کثیر النفع تھیں اور متداول نہ ہونے کی وجہ سے زیورِ صحت کھو چکی تھیں، حتی الوسع اسے فراہم کرکے تصحیح فرمایا کرتے تھے۔''

یعنی قرآن کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر کتاب جو شیخ کے نقطۂ نظر سے نفع بخشی میں اہمیت رکھتی تھی، لیکن بے توجہی یا عدم استعمال کی وجہ سے صحت سے محروم ہوگئی تھی، ان کے ''اصولِ نسخ'' یعنی تلاش کرکے اصل نسخے شیخ بہم پہنچاتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا ان کی تصحیح میں کوشش کرتے تھے، گویا آج یورپ میں پُرانی کتابوں کے ایڈٹ کرنے کا جو عام طریقہ جاری ہے، مختلف قدیم نسخے مہیا کیے جاتے ہیں اور سب سے مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس کے معاوضہ میں مصححین کافی معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو صرف اسی تصحیح ومقابلہ کے صلہ میں جو کسی پرانے نسخہ کے متعلق کوئی انجام دیتا ہے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لوگوں کو مل رہی ہیں، لیکن سُن رہے ہو مسلمان بغیر کسی معاوضہ کے محض حسبۃً للہ ''نادر الوقوع کثیر المنافع'' کتابوں کے ایڈٹ کرنے کے کام کو بھی دین ہی کا کام سمجھ کر کرتے تھے۔

سید ابراہیم دہلوی اور تصحیح

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شیخ عبدالوہاب المتقی کا یہ کوئی ذاتی مذاق تھا۔ اسی ہندوستان کے ایک دوسرے بزرگ سید ابراہیم دہلوی جن کے کتب خانہ کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ بقول شیخ محدث ''بیرون از حد وحصر وضبط بود'' ان کا بھی مشغلہ جیسا کہ شیخ ہی نے لکھا ہے، یہ تھا کہ

''کتب بسیار از ہر علم مطالعہ کردہ تصحیح فرمودہ ومشکلات راچناں حل کردہ کہ ہر کرا ادنیٰ مناسبتے باشد نظر در کتاب او کافی ست واحتیاج استاد نیست۔'' (ص 250)

''ہر علم کی بہت سے کتابیں مطالعہ فرما کر تصحیح فرماتے اور مشکلات اس طرح حل کرتے، کہ جس کسی کو معمولی مناسبت بھی ہوگی، ایک نظر دیکھ لینا کافی ہے اور استاد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔''

پہلے زمانہ میں اسی کام کا نام ''کتاب بنانا تھا'' میں نے پہلے بھی کسی صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے کتب خانہ کی کتابیں سب بنائی ہوئی تھیں۔ لیکن بظاہر ان کا کام صرف درسی کتابوں تک محدود تھا، لیکن سید ابراہیم صاحب کے یہاں درسی وغیر درسی کی خصوصیت نہ تھی۔

''صحیحین'' کی کتابت گورنر کے حصہ میں

کچھ یہ نہ خیال کیا جائے کہ عام اہل علم ہی تک یہ مذاق محدود تھا۔ قرآن ہی نہیں حدیث کی ضخیم ضخیم کتابوں کی خدمت اس زمانہ کے نام گرامی امراء وقت بھی سرمایۂ سعادت خیال کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے ایک محمد شاہی امیر روح الامین خاں کے متعلق جو بلگرام کے رہنے والے تھے اور نادرشاہ کے معرکہ میں بالآخر وہ شہید بھی ہوئے، ان ہی کے ترجمہ میں یہ بتاتے ہوئے کہ ''ہمیشہ صاحب باطبل وعلم وخیل وحشم زیست وچند کے بہ حکومت بست ودو محال عمدہ پنجاب کہ سیالکوٹ وجالندر جملہ است پرداخت'' لیکن اس طبل وعلم وخیل وحشم کے ساتھ، اور پنجاب کے ایک بڑے علاقہ کی گورنری کے مشغلوں کے باوجود انہوں نے نیکیوں اور سعادتوں کے سمیٹنے کا ایک ذریعہ یہ بھی بنا رکھا تھا، جیسا کہ مولانا آزاد ہی راوی ہیں:

> ''در پایانِ عمر کہ سن شریفش از ہفتاد تجاوز نمود صحیح بخاری ومسلم رابدست خود کتابت کردو محشیٰ ساخت۔'' (ص289)
>
> ''اخیر عمر جبکہ آپ کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی، صحیح بخاری اور مسلم اپنے ہاتھ سے کتابت کی اور پھر حاشیہ چڑھایا۔''

''صحیحین'' پر حاشیہ

روح الامین خاں بلگرام ہی کے رہنے والے ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے، ستر سال کی عمر ہے اور بخاری ومسلم جیسی ضخیم کتابوں کی کتابت کرتے ہیں، صرف کتابت نہیں۔ بلکہ ''محشی ساخت'' دونوں پر حواشی بھی لکھتے ہیں، اور یہ تھی پیرانہ سروں کی جواں ہمتی، بڑھاپے کی علمی اولوالعزمیاں اور اُس پر کمال یہ ہے کہ اس عمر کے بعد درجۂ شہادت سے بھی فائز ہوتے ہیں۔ اُف قوموں کو جب زندگی بخشی جاتی ہے، تو پھر ان سے کیسے کیسے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور جب موت طاری ہوتی ہے تو اُن کی افسردگیاں بھی کتنی دردناک ہوتی ہیں۔

تصحیح بخاری کی عظمت

اور روح الامین خاں کا واقعہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کے لکھنے لکھانے کا ایسا معلوم ہوتا ہے امراء کے عام طبقہ میں ایک عام ذوق پایا جاتا ہے۔ خود مولانا غلام علی آزاد کے حقیقی نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا شمار عالمگیری امراء میں تھا، مدت تک سندھ میں بھکر اور سیوستان کی وقائع نگاری (19) جیسی اہم خدمت ان کے سپرد رہی۔ فرخ سیر کے آغاز حکومت تک۔ مگر باوجود اس شوکت واُبہت امارت ودولت کے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میر عبدالجلیل صاحب

نے صحیح بخاری کا ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا تھا، لیکن ابھی اس نسخہ کی تصحیح و مقابلہ کا موقع نہ ملا تھا کہ اپنی خدمت سے وہ معزول ہو کر سندھ سے روانہ ہو کر دلی چلے۔ معزولی کی وجہ یہ تھی کہ سندھ میں نباتِ سفید کا مزہ رکھنے والے اولوں کے برسنے کی خبر انہوں نے بادشاہ کو دی تھی۔ وزیر کو بدگمانی ہوئی کہ بادشاہ کو صرف خوش کرنے کے لیے میر صاحب نے یہ واقعہ گھڑا ہے اسی لیے معزولی کا حکم بھیج دیا۔ بہر حال مجھے تو اس ذوق اور والہانہ تعلق کا ثبوت پیش کرنا ہے، جو مسلمانوں کو علم و دین کی کتابوں سے تھا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ سندھ سے چلے تھے اپنی چھوٹی ہوئی ملازمت اور وہ بھی کیسی ملازمت قریب قریب اس کی وہی حیثیت تھی جو آجکل ریاستوں میں رزیڈنٹوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی ملازمت پر دوبارہ بحالی کی کوشش کرنے کے لیے، لیکن بخاری کی تصحیح و مقابلہ کا کام رہ گیا ہے۔ اس کا خیال آیا اور سندھ سے نکل کر نوشہرہ پہنچے تھے کہ وہیں محض بخاری کے اس کام کے لیے خیمہ زن ہو گئے۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

> ''آں جناب بہ عزم شاہ جہاں آباد خیمہ را بہ نوشہرہ کہ موضعے ست در سواد بھکر برآوردند و محض برائے مقابلہ صحیح بخاری شش ماہ یکث کردند۔''

> ''شاہ جہاں آباد کے عزم سے جناب والا نے نوشہرہ میں خیمہ لگایا، جو علاقہ بھکر میں ایک جگہ ہے اور صرف بخاری شریف کے مقابلہ کے لیے یہاں چھ ماہ قیام کیا۔''

اس ذوق کی کوئی انتہا ہے، دوسرا آدمی کہتا تو شاید اُسے مبالغہ خیال کیا جاتا، لیکن مولانا آزاد تو ان کے حقیقی نواسے ہیں، خود اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ اتنی بڑی اہم نوکری کا معاملہ ہے، چاہیے تو یہی تھا کہ ہانپتے کانپتے کسی طرح دار السلطنت پہنچ کر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے، لیکن ان بے نیازیوں کو دیکھتے ہو، جو دین اور علم نے ان بزرگوں میں پیدا کی تھیں۔ جانتے ہیں کہ وزیر اعظم مخالف ہے، اسی کے مشورہ سے بادشاہ نے معزول کیا ہے۔ ساری عزت و آبرو کا دار و مدار اسی عہدہ پر ہے، جس سے اچانک محروم ہونا پڑا ہے۔ تاخیر میں ہر طرح کے احتمالات قدرتی طور پر دماغ میں آتے ہوں گے، لیکن دل کی ٹھنڈک سے ساری دماغی شورشوں کی تلافی ہو رہی تھی، بھکر کے سواد میں اُتر جاتے ہیں کہ بخاری کی تصحیح و مقابلہ کا رکا ہوا کام پورا ہو لے، تب دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ صرف یہی نہیں کہ کسی مسجد میں اُتر گئے تھے، خیمہ خرگاہ اور اُس کے لوازم سب ساتھ تھے، مولانا آزاد رقمطراز ہیں:

> ''چوں توابع و لواحق بسیار در رکاب بود مبالغ الوف بہ صرف در آمد۔''

> ''چونکہ بہت سے نوکر چاکر ساتھ تھے، اس لیے ہزار ہا ہزار خرچ ہوا۔''

خدم و حشم، پیادوں، دوندوں کے ساتھ ایک اجنبی مقام میں چھ چھ ماہ تک رئیسانہ نوابی زندگی پر جو خرچ ہو سکتا ہے ظاہر ہے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اس والہانہ اور عاشقانہ کیفیت میں علم کے سوا دینی جذبہ کا بھی کافی اثر ہمیں ماننا چاہیے تھا، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کے سامنے یہ یک کرشمہ دو کار کا بھی نکتہ ہو اس لیے کہ مسلمانوں میں سلفاً عن خلف ایک تجربہ کی بات یہ چلی آ رہی ہے کہ حل مشکلات میں بخاری شریف کے ختم کو بالخاصیت دخل ہے۔

حملہ تاتار اور ختم بخاری

دوسرے مورخین نیز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے "بستان المحدثین" میں لکھا ہے کہ تاتار کا وہ فتنۂ ہائلہ جس نے اسلامی ممالک کو ساتویں صدی میں اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا تھا، فتنہ کا یہ سیلاب ترکستان، خوارزم، بخارا، ایران و عراق حتیٰ کہ پایۂ تختِ خلافت دارالسلام بغداد کو برباد کر چکا تھا، عباسی خلیفہ مستعصم ہولاکو کے ہاتھوں شہید ہو چکا تھا۔ جب اسی سیلاب نے شام کی طرف رُخ کیا تو اس وقت جیسا کہ شاہ صاحب ارقام فرماتے ہیں:

"چوں ہنگامۂ تتار رو داد و افواج ستم امواج آں اشقیاء بدیار شام توجہ نمود حکم سلطانی نفاذ یافت کہ علماء جمع شدہ ختم صحیح بخاری بخوانند۔" (بستان المحدثین۔ ص 127)

"جب تاتاریوں کا ہنگامہ ظاہر ہوا، اور ستم ڈھانے والی فوج ان بدبختوں کی طرف سے شام کے شہروں پر حملہ آور ہوئی، تو شاہی حکم ہوا کہ علماء جمع ہو کر ختم بخاری پڑھیں۔"

ختم بخاری کا اثر

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ابھی ختم میں ایک دن باقی تھا کہ مشہور محدث امام حضرت علامہ تقی الدین بن دقیق العید جامع مسجد تشریف لائے اور ختم کرنے والے علماء سے پوچھا کہ بخاری کیا ختم ہوگئی۔ عرض کیا گیا کہ "یک میعاد باقیست" لیکن ختم بخاری کے نسخہ کا مسلمانوں کو جو ہمیشہ سے تجربہ تھا، آج بھی وہی سامنے تھا۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ابن دقیق العید نے کشفاً اعلان کیا:

"مقدمہ فیصل شد وی روز وقت عصر فوج تتار شکست فاحش خوردہ برگشت و مسلمانان در فلاں صحرا متصل فلاں بکمال خوشی و خرمی مقام کردند۔"

"یہ مقدمہ فیصل ہوا کہ اسی دن عصر کے وقت تتاری فوج کھلی ہوئی شکست کھا کر واپس ہوگئی اور مسلمان فلاں صحرا میں فلاں مقام کے پاس کمال خوشی و خرمی سے اقامت گزیں ہوئے۔"

دراصل معرکہ کا میدان دمشق سے سینکڑوں میل دور تھا، شامی فوج آگے بڑھ کر دشمنوں کو روکنے کے لیے بھیجی گئی تھی، شیخ کا یہ ایک کشفی بیان تھا، لوگوں نے عرض کیا: "ایں خبر را شایع بکنیم" شیخ (20) نے اجازت دے دی، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ

"بعد چند روز مطابق در برید سلطانی رسید۔" (ص 127)

"چند دنوں بعد سلطان ڈاک سے اسی کی اطلاع موصول ہوئی۔"

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کے ختم کا یہ ایسا تجربہ ہے، جس کا مشاہدہ خود مجھے بھی اپنے ایک دوست کے سلسلہ میں ہوا۔ عقلی طور پر ایک ایسا کام جو بہ ظاہر ناممکن تھا میرے سامنے اس کا ظہور ہوا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ان کے والد جو

ایک صاحب دل عالم تھے انہوں نے بخاری شریف کا ختم کیا تھا۔ پس کیا تعجب ہے کہ میر عبدالجلیل صاحب کے سامنے یہ بات بھی رہی ہو اور ہوا بھی یہی کہ دلّی پہنچنے کے ساتھ ہی بغیر مزید کدو کاوش کے غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اپنے منصب پر بحالی کا فرمان ان کو مل گیا۔

دوسری کتابوں سے ذوق

خیر اس واقعہ میں تو آپ کو علم سے زیادہ دین کا دباؤ نظر آتا ہے، گو میرے نزدیک حقیقی علم ہی کا نام دین ہے اور سچے دین ہی کی تعبیر علم صادق سے کی جاتی ہے، مگر اسی زمانہ میں اسی ہندوستان میں ہم نوشہرہ کے سواد میں مغل دربار کے اگر ایک امیر کبیر کو تصحیح و مقابلہ بخاری میں مشغول پاتے ہیں، تو ٹھیک انہیں دنوں میں مرشد آباد بنگال میں دریائے بھاگیرتی کے کنارے ایک شاہی محل میں ایک امیر عالم کو پاتے ہیں کہ وہ فلسفہ و حکمت کی سب سے نادر کتاب جو میرے نزدیک تو ''شفا'' و ''اشارات'' ''شرح حکمۃ الاشراق'' جیسی اساسی کتابوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے یعنی مجلس اخوان الصفا کے فلسفیانہ رسائل کے ساتھ بجنسہٖ اسی خدمت میں مصروف ہے جو بخاری شریف کی میر عبدالجلیل صاحب فرما رہے تھے، طباطبائی نے ''سیر المتاخرین'' میں ایک شیعی عالم سید محمد علی کا ذکر کیا ہے۔ یہ اورنگ آباد دکن کی آب و ہوا اور یہاں کا آصفی (21) ماحول ظاہر ہے کہ ان کے مناسب حال نہ تھا، اس لیے مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے بالآخر وہ اس زمانہ کے مشہور ناظم بنگالہ علی وردی خاں مہابت جنگ کے شیعی دربار میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ چاہیے تھا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ علی وردی خاں (22) جو ناظم کیا بنگال و بہار واڑیسہ کا مطلق العنان فرمانروا تھا، اس نے ان کے لیے بیش قرار وظیفہ جاری کر دیا اور دریائے بھاگیرتی مرشد آباد جس کے ساحل پر ہے، لب دریا ان کو عالی شان شاہی محل رہنے کے لیے عطا ہوا۔ مہابت جنگ روزانہ ''کافی'' (شیعہ حدیث) کی کتاب کا درس بھی ان سے لیتا تھا۔

مگر فلسفہ و منطق ہی سہی، بخاری نہ سہی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بایں ہمہ عیش و عشرت، دولت و امارت میر محمد علی کے جو مشاغل مرشد آباد میں تھے۔ اس کا اندازہ آپ کو طباطبائی ہی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:

> ''کتاب اخوان الصفا و خلان الوفا کہ در حکمت است چندیں نسخہ فراہم آوردہ با کمال تنقیح و تحقیق مقابلہ نمودہ جابجا اکثر عبارات نامناسب (23) و نامفہوم را بعبارت مناسب و قریب الفہم تغیر دادہ من حیث اللفظ والمعنی تسہیل و تصحیح فرمود و چند رسالہ کثیر النفع برآں افزودہ می تواں گفت کہ تصنیفے ست جدید۔''

> ''کتاب ا''خوان الصفا و فلان الوفا'' جو حکمت میں ہے، اس کے چند نسخے جمع کر کے پوری تنقیح و تحقیق کے ساتھ مقابلہ کیا اور جابجا اکثر نامناسب اور نامفہوم کو مناسب اور قریب الفہم عبارت سے بدل دیا الفاظ و معانی دونوں اعتبار سے تسہیل و تصحیح کر دی۔ پھر چند نفع بخش رسالوں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا، اس طرح کہ گویا اسے تصنیف جدید کہا جا سکتا ہے۔''

ہندوستانی علماء کا ذوق

عربی زبان میں عقلی علوم کا جو ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ میں ''اخوان الصفا'' کے ان رسائل کے بعد بھی کیا کوئی ایسی کتاب رہ جاتی ہے جسے ان رسالوں پر مزیت حاصل ہو۔ غریب علماء کا نہیں بلکہ اہلِ علم کے امیر طبقوں میں جب ایک طرف بخاری اور دوسری طرف فلسفہ وحکمت کی چوٹی کی اس کتاب کے ساتھ دلچسپیوں کا یہ حال ہو، سوچنا چاہیے کہ آخر ہندوستان کے اسلامی عہد میں کس قسم کے علوم کی گرم بازاری کی توقع کی جاتی ہے اور ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے آگے آگے دیکھیے سنتے ہیں کیا۔

میر عبدالجلیل بلگرامی کا ذوق علم

یہی میر عبدالجلیل صاحب بلگرامی ہیں۔ کچھ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ان کا ذوق علمی صرف بخاری کی حد تک محدود تھا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

''کتاب خانہ عظیمے درزمرۂ باقیات صالحات گذاشتہ اند۔'' (مآثر الکرام۔ص 265)

''باقیات صالحات میں ایک عظیم کتب خانہ چھوڑا۔''

علم بھی ہو، شوق بھی ہو، پھر کتابوں کی فراہمی میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی، خصوصاً اسی کے ساتھ جب ہمارے سامنے مولانا آزاد اس شہادت کو بھی پیش کرتے ہیں کہ ''اکثر ایں کتب رابدست مبارک خود اصلاح ومقابلہ نمودہ اند'' اور صرف یہی نہیں بلکہ ''ونسخ بسیار بہ خطِ خاص خود نوشتہ اند۔'' ذرا ''نسخ بسیار'' کے الفاظ پر غور کیجیے۔ وقائع نگاری کی خدمت جلیلہ کے ساتھ نقل کتب کا مشغلہ اس زمانہ میں کیا قابل تصور بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل صاحب غیر معمولی علم وفضل کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے بہترین خطاط بھی تھے۔ خاکسار نے ان کے خط کے بعض نمونے حیدرآباد میں ایک صاحب کے پاس دیکھے ہیں۔ کیا پاکیزہ خط تھا۔ خط نستعلیق میں تو ایک خاص طرز کے گویا موجد تھے، خطاطی کے متعلق اپنے ایک شعر میں انہوں نے ایک شاعرانہ دعویٰ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دانی کہ خوشنویسی ما از برائے چیست
مائیم واسطی و قلم نیز واسطی

قلم واسطی

فونٹن کے اس قرن میں اس غریب واسطی قلم کو کون پہچان سکتا ہے، لیکن بجنسہٖ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے جس کی وجہ سے فونٹن قلموں کی قیمت بڑھتے ہوئے چالیس پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، یعنی نوک کا نہ گھسنا، اسی لیے نوک کے بنانے میں قیمتی چیزیں خرچ کی جاتی ہیں اور قلم کا دام بڑھتا چلا جاتا ہے، مگر مسلمانوں نے خدا جانے کہاں سے

ڈھونڈ ھ ڈھانڈ ھ کے کلک کی ایک قسم ایجاد کی تھی جسے واسطی قلم کہتے تھے۔ زانگشت کے برابر تو وہ موٹا ہوتا تھا اور رنگ گویا ٹھیک چوکلیٹ کا بیچ بیچ میں اس کے پھول جیسی چیزیں قدرتی طور پر نمایاں ہو جاتی تھیں۔ اس قلم کی خوبی یہی تھی۔ ایک دفعہ بنالیا گیا پھر اس قط پر برسوں لکھتے چلے جایئے، کیا مجال ہے کہ حروف میں کچھ تفاوت پیدا ہو۔ بعض خاندانوں میں یہ قلم اب تک تبرک (24) کے طور پر پایا جاتا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ اور ذوق کتابت

عجب زمانہ تھا، مسلمانوں نے اس فن کتابت کے ذوق کو کتنا اعزاز بخشا تھا کہ سلاطین وقت بھی خطاطی میں کمال پیدا کرنا اپنی عزت خیال کرتے تھے۔ پُرانی کتابوں پر بعض مشہور بادشاہوں کے قلم کی لکھی ہوئی سطریں نظر پڑتی ہیں تو آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ جو اپنے خاندانی روایات کے خلاف سنّی ہو گیا تھا، جس کی تبرکانہ اپنی عظمت وجلالت اور حسن کاری کی خصوصیتوں کی وجہ سے بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اُسی ابراہیم عادل شاہ کے حالات میں لکھا ہے کہ

''اگر چہ درآں زماں خوش نویساں جمع آمدہ بودند لکن بادشاہ (25) بادشاہِ قلمہا بود ثلث ونسخ و نستعلیق وغیرہ راباں درجہ حسن ومتانت رسانیدہ بود کہ بہ خط خوش قلمان عصر قلم نسخ کشیدہ۔''

(بستان السلاطین۔ ص 275)

''لیکن بادشاہ جو تمام قلموں کا بھی بادشاہ تھا ثلث، نسخ اور نستعلیق وغیرہ خط اس قدر اچھا لکھتا تھا کہ گویا اس نے تمام ہم عصر خوش نویسوں کے خط پر خطِ نسخ پھیر دیا تھا۔''

غالباً سرسری طور پر اِدھر اُدھر سے جتنے تاریخی معلومات آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، کیا ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد انصافاً اب بھی ہندوستان کے عہد اسلامی کو کتابوں کے لحاظ سے مفلس ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

حواشی

(1) الحمدللہ دارالعلوم دیوبند کا شعبہ کتابت بڑی خوبی سے اس خدمت کو انجام دے رہا ہے اور جاہل کاتب کی جگہ عالم کاتب لے رہے ہیں۔ (ظفیر صدیقی)

(2) کچھ زیادہ دن کی بات نہیں حضرت مولانا انوار اللہ خانؒ جو بعد کو استاذ السلاطین اور صدر المہام امور مذہبی کے عہدہ تک حکومت آصفیہ میں پہنچے، ان کی سوانح عمری ''مطلع الانوار'' میں لکھا ہے کہ ابتداء میں مولانا محکمہ مالگذاری مختصر نویسی کی ملازمت پر بحال ہوئے۔ لیکن اس ملازمت کو صرف اس بات پر چھوڑ دیا کہ ''ایک سودی لین دین کی مسل کا خلاصہ لکھنا پڑتا تھا۔'' (ص 11) پھر برسوں سخت معاشی

پریشانیوں میں گرفتار رہے، لیکن اس ملازمت کی طرف رجوع نہ ہوئے۔ سرسالار جنگ اور نواب خورشید جاہ نے چپ چاپ مولانا سے استفسار کیے بغیر اعلیٰ حضرت نواب میر علی خاں مرحوم کی تعلیم کے لیے آپ کا تقرر کردیا۔ آپ کو جب خبر ہوئی تو مولانا جو اس زمانہ میں حسبۃً للہ مدرسہ نظامیہ کا کام کرتے تھے، یہ فرمایا کو قومی خدمت کو چھوڑ کر میں اس ملازمت کو قبول نہیں کرسکتا۔ آخر بڑے ردو کد اور استخارہ کے بعد ان کو بہرحال وہ خدمت انجام دینی پڑی جس کے نتائج بحمد اللہ آج تک لوگوں کے سامنے ہیں۔

(3) ان کے قضا کے قصے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ بدائونی کا بیان ہے کہ جب تک قاضی رہے لوگوں کا بیان ہے کہ ہمیشہ مدعی و مدعا علیہ میں مصالحت ہی کرانے کی کوشش کی اور کبھی خود کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ لکھا ہے کہ ''اگر مدعی الحاح بر فیصل قضا می نمود اور بالحاح و عجز وزاری می گفت کہ از برائے خدا شما با یک دگر صلح نمایند تا من دریں میاں ماخوذ نہ شوم و شرمندہ باشم و نیز می گفت کہ شما ہر دو دانائید و من تنہا ناداں را با دو دانایاں کار افتادہ پس مرا شرمندہ درگاہ خدائے تعالیٰ مسازید'' یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ''زنے از غیب شوہر طلب تفریق می کرد'' (یعنی مفقود الخبر کی بیوی مالکی مذہب کے رو سے چار سال بعد اپنا نکاح دوسرے مرد سے کرسکتی ہے) اسی قانون کا نفاذ چاہتی تھی، چونکہ مسئلہ اختلافی تھا اس لیے قاضی معین بیچارے ''کفاف او راز خود می داد و گفت ایں قدر وجہ معیشت بہ گرد و انتظار شوہر برا ز وجدا مشو۔'' اس سلسلہ میں عہد عثمانی کے ایک حاکم تقی یار جنگ کا خیال آتا ہے۔ سنتے ہیں کہ جب کسی سزا کا فیصلہ کرتے تو قلم سے فیصلہ لکھتے جاتے اور روتے جاتے۔ کہتے کہ دیکھیے فیصلہ کرنے والا ہمارے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے۔ ان کی عادت بھی یہی تھی کہ حتی الوسع فریقین کو مصالحت پر آمادہ کرتے۔

(4) اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات کا خیال آیا۔ خاکسار جب دارالعلوم دیوبند کے ادنیٰ خدام میں تھا تو کسی جلسہ کے سلسلہ میں حصار جانا ہوا۔ حصار میں مدت ہوئی ''تفسیر مظہری'' قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے چند پارے عجیب وغریب کاغذ پر چھپے تھے۔ یعنی ظاہری شکل کاغذ کی بہت ہی ادنیٰ درجہ کی تھی، تاہم علم پر چھاپنے والے احسان عظیم کیا تھا، کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ حصار جب پہنچا تو خیال گذرا کہ ناشر کتاب سے ملوں، معلوم ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ میں نے لوگوں سے کاغذ کی اس ربودگی کی وجہ پوچھی تو عجیب بات معلوم ہوئی کہ ناشر کتاب سے ملوں۔ معلوم ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ میں نے لوگوں سے کاغذ کی اس ربودگی کی وجہ پوچھی تو عجیب بات معلوم ہوئی کہ ناشر صاحب کوئی صاحب دل آدمی تھے۔ جب اس کتاب کی اشاعت کا عزم ہوا تو عام مطابع میں ظاہر ہے کہ پاک کاغذ، پاک سیاہی، پاک پانی، پاک پتھر، باوضو کاتب و پریس مینوں کا نظم کون کرسکتا ہے، چونکہ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا، ان صاحب دل بزرگ نے باضابطہ حصار میں جس طرح بن پڑا، کاغذ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا۔ ان صاحب دل بزرگ نے باضابطہ حصار میں جس طرح بن پڑا کاغذ بنوایا اور طہارت کے تمام ضوابط کے ساتھ بنوایا، ان ہی ضوابط کے تحت اس تفسیر کو طبع کرا رہے تھے۔ پھر کیا عذر پیش آیا یا اجل مسمی آ گیا۔ چند پاروں پر کتاب ختم ہوگئی۔ حکومت آصفیہ نے مولوی محی الاسلام پانی پتی کو چند سال ہوئے بیش قرار رقم اس کتاب کے چھاپنے کے لیے دی ہے مگر افسوس چند پاروں سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔

(5) دین کے سوا خود علم کی اشاعت کا جو ذوق مسلمانوں میں تھا اور اس اشاعت کے لیے جو تدبیریں ان کی سمجھ میں آتی تھیں، ان میں مشہور تاریخی واقعہ وہ ہے جس کا تعلق گو ہندوستان سے نہیں ہے لیکن مسلمانوں کی اشاعتی تدبیروں میں ایک خاص تدبیر کا اس سے پتہ چلتا ہے اس لیے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ میرا اشارہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ المتوفی 718ھ کی مشہور تاریخ ''جامع التواریخ'' کی طرف ہے جو ''جامع رشیدی'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مؤلف تاتاری حکومت کے وزراء میں تھے۔ اسی تعلق سے انہوں نے چار ضخیم جلدوں میں ترکوں اور تاتاریوں کی تاریخ لکھی ہے۔ کتاب عام طور سے مشہور ہے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ اس کتاب کو خواجہ رشید الدین

نے فارسی میں لکھا تھا اور پھر اس کا ایک ترجمہ عربی میں بھی کیا، اس لیے کہ ان کی تاریخ کے دونوں نسخے دنیا میں پھیلتے رہیں۔ یہ خاص ترکیب کی کہ تبریز شہر کے باہر ایک چک جو ''ربع رشید'' کے نام سے موسوم تھا، وقف کر دیا تھا۔ مقصد اس وقف کا یہ تھا کہ ''ان تکتب فی کل سنة نسخه من المجوعة و ترسل الی احدیٰ بلادالاسلام نسخة بالعربية و نسخة بالفارسية'' (تاریخ عراق۔ص 20) (یعنی ہر سال اس مجموعے کے دو دو نسخے اس وقف کی آمدنی سے لکھوائے جائیں اور اسلامی ممالک میں سے کسی ملک میں بھیج دیے جائیں، ایک نسخہ عربی میں تیار کیا جائے اور ایک فارسی میں) جب تک یہ وقف موجود رہا یہ کام ہوتا رہا۔ میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ جہاں دیگر دینی علمی اغراض کے لیے اس زمانہ میں مسلمانوں کے ارباب ثروت اوقاف کرتے رہتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ ہر صوبہ میں کچھ اوقاف کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی کیے جائیں، اس ذریعہ سے علم کا ایک بڑا ذخیرہ جو اشاعت و طباعت سے محروم ہے شائع ہو جائے گا اور واقفوں کو آخرت کے ثواب کے ساتھ دنیا میں بھی ایک نفع عاجل یہ ملے گا کہ بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کے ساتھ ان کے نام کو بھی بقائے دوام کی سند مل جائے گی۔ کاش! اس کی طرف لوگوں کو توجہ ہو۔

(6) اس بادشاہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ گھر کی خانہ داری کے لیے اپنی بیوی کے سوا کوئی ملازمہ وغیرہ نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ملکہ نے پریشان ہو کر کہا کہ آخر میں کب تک اس طرح کام کرتی رہوں، کوئی تو ملازما دو۔ سلطان نے فرمایا ''صبر کن تا خدائے تعالیٰ در آخرت نتیجۂ شائستہ دہد۔'' (اسیر۔ص 109)

(7) مسلمانوں نے خطاطی کے آرٹ کو جن جن شکلوں میں ترقی دی ہے، اپنی مختلف نوعیتوں کی وجہ سے ان کے بیسیوں نام ہو گئے۔ ریحان اور رقاع خط ہی کی ایک قسم تھی۔ ان کے سوا خلفاء بنی امیہ وعباسیہ کے عہد میں قلم الجلیل، قلم السجلات، قلم الدیباج، قلم الطومار، قلم الثلثین، قلم الذنبورا، قلم المفتح، قلم الحرم، قلم العمود، قلم القصص، قلم الخرفاج، قلم المرصع، قلم النسخ قلم الرباسی، قلم غبار الحلبه، خط تعلیق، خط شفیعہ، خط نیزیز، خط شکستہ اور آخر میں خط نستعلیق کا رواج ہوا۔ عموماً ارباب کمال ان تمام شکلوں کی مشق پیدا کرتے تھے۔

(8) جہانگیر کے مشہور شاہزادہ پرویز کے متعلق بھی لکھا ہے ''در علم عربی و فارسی و نوشتن خطوط بغایت آراستہ و پیراستہ بود، اکثر اوقات را بہ کتابت کلام اللہ صرف نمود۔'' (تذکرہ خوشنویساں غلام محمد ہفت رقمی۔ص 91) اور یہی ایک شاہزادہ نہیں، اسی کتاب میں آپ کو شاہجہان، جہانگیر، داراشکوہ اور بیسیوں خانوادۂ شاہی کا نام خطاطوں کی اس فہرست میں ملے گا اور یہ کہ ان میں ہر ایک فارسی کے ساتھ عربی کا بھی خطاط اور عالم ہوتا تھا، لیکن آج ان ہی کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ عربی سے ان کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ بل کذبو بما لم یحیطو بعلمه۔

(9) واللہ اعلم یہ گالی اکبر کی اپنی ایجاد تھی، شاید شلجم سے نفرت ہوگی اس لیے حرام خور کے ساتھ شلغم خور کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ یا شلغم کی ترکاری عام طور پر پسند نہ تھی، سعدی نے بھی ''شلغم پختہ بہ از نقرہ خام'' میں شلغم کی مذمت کی ہے۔

(10) یہ عجیب بات ہے کہ ہابیل کو قتل کر کے جب آدم علیہ السلام کا قاتل بیٹا قابیل عدن کے مشرق کی طرف نود کے علاقہ میں جا بسا۔ پھر اس کو عورت کہاں ملی جبکہ اس وقت نسل آدم پھیلی نہ تھی، الگ مسئلہ ہے۔ ''معارف'' میں ایک مضمون کے نوٹ میں خاکسار نے اپنا ایک خواب وخیال درج کیا ہے جس سے ڈارون کے نظریہ ''قردہ'' پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال اس وقت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تورات میں اس کے بعد ہے کہ قابیل سے اس کی بیوی حاملہ ہوئی اور ایک نسل قابیل کی اسی ذریعہ سے دنیا میں پھیلی۔ اسی نسل کے متعلق تورات ہی میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ ''بین اور بانسری بجانے والے کا باپ'' بھی انہیں میں سے تھا اور اسی نسل میں توبلقائن نامی شخص بھی تھا جو پیتل اور لوہے کے سب تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا (پیدائش۔ باب 4، 21-22) غور کرنے کی بات ہے کہ آلات موسیقی اور

آلات آدم کشی میں اس وقت تک دنیا کی کن قوموں کو خصوصیت حاصل ہے، بلکہ اگر تحلیل و تجزیہ سے کام لیا جائے تو ان قوموں کے سارے ایجادات کی تہ میں بالآخر یہی دونوں مقاصد کارفرما نظر آئیں گے۔ گزشتہ عبارت میں تو بلقائن کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ مشرقی یورپ کا جو حصہ آج کل بلقان کے نام سے مشہور ہے، قائن آدم کے قاتل بیٹے کا نام ہے اور اسی کی تیسری پشت میں تو بلقائن ہے۔ کیا یورپ میں جس راستہ سے بنی آدم کا داخلہ ہوا اُس کو بلقان اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ ایک قرینہ یہ بھی ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یورپ کے باشندے آدم کے کس بیٹے کی نسل سے ہیں اور عرب میں ہبل نامی جو مشہور بت تھا کیا وہ ہابیل کے نام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آدم کی ظالم و مظلوم نسلوں کا کچھ سراغ ان اسماء کی مناسبتوں سے کیا مل سکتا ہے۔

(11) جیسا کہ میں نے عرض کیا ہندوستانی صوفیہ خصوصاً چشتیہ کو سماع کے مسئلہ میں آج جتنا بدنام کیا جا رہا ہے، اس کی اصل تاریخی حقیقت تو آئندہ معلوم ہوگی، لیکن اس موقعہ پر سلطان المشائخ کے ملفوظات مبارکہ ''فوائد الفواد'' کے جامع امیر حسن علاء سجزی کے ایک لطیفہ کا خیال آ گیا۔ حضرت سلطان جی کی مجلس میں سماع کے جواز و عدم جواز کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں بعض علماء غیر مزامیری سماع کے مسئلہ میں بھی انتہائی شدت سے کام لے رہے تھے۔ بات حکومت تک پہنچی جس کا قصہ آگے آ رہا ہے۔ حسن علاء نے حضرت سلطان جی سے عرض کیا:

> ''بندہ ایں طائفہ را کہ منکر سماع اند نیکوی داند و بر مزاج ایشاں وقوفے تمام دارد غرض انکہ ایشاں سماع نمی شنوند هم چنیں گویند کہ ما ازاں نمی شنوم کہ حرام است بندہ سوگند نمی خورد امارا است عرضداشت می دارد کہ اگر سماع حلال بودے ہم ایشاں نہ شنیدندے۔''

سلطان جی یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگے۔ ''گفت ارے چوں ایشاں راذوقے نیست چہ گونہ شنیدندے و بر چہ شنیدندے۔'' اس سلسلے میں مجھے بھی ایک بات یاد آئی۔ بعض خشک مزاجوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ساری چیزیں جن کا وعدہ اہل ایمان سے جنت میں کیا گیا ہے، یہ نہیں کہ شرعی ممانعت کی وجہ سے دنیا میں ان سے احتراز کرتے ہیں بلکہ خشکی کی مشق بڑھاتے ہیں اور اس حد تک اس مشق میں آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان چیزوں سے اپنے دل میں کراہت، نفرت، چڑ پیدا کر لیتے ہیں اور اسی کو دینی احساس کی بیداری کا کمال سمجھتے ہیں۔ لیکن میں تو خیال کرتا ہوں کہ جذبات کو مردہ کر کے شریعت پر عمل شاید اتنا باعث اجر نہ ہو، جتنا کہ جذبات کی بیداری کے ساتھ ان کو عقل کے قابو میں اور عقل کو ایمان کے قابو میں رکھا جائے۔ میں تو اکثر ایسے حضرات کے متعلق یہ کہا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے اندر جنت کی نفرت اور دوزخی چیزوں کی رغبت گویا پیدا کر لی ہے۔

(12) تعجب ہے کہ تصویروں کے مفاسد کا اعلان آج خود ان ہی تصویروں کی زبانی ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف ''اصنامیات'' ہی تک ان کی گمراہیاں محدود تھیں، اگرچہ انسانیت کو جو نقصان ''اصنامی نظام حیات'' سے پہنچا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ اُخروی خسران کے ساتھ ساتھ آدمی کی کمائی ہوئی آمدنیاں پانی کی طرح اصنامی اوہام پر ہزار ہا ہزار سال تک بہتی رہی ہیں، جن کا اس زندگی میں بھی قطعاً کسی قسم کا کوئی نفع انسان کو نہیں پہنچا۔ ایسا شرمناک فعل کہ خود کرنے والے بھی اب اس کے ارتکاب پر شرماتے ہیں اور جھوٹی طفل تسلیوں سے اپنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بالآخر دیانند سرسوتی جی اور برہمو سماجی طبقوں کے ضبط سے بات باہر ہو گئی اور ملمع سازیوں کو چھوڑ کر ان بیچاروں کو اصنامی نظام کے خلاف شدت سے آواز بلند کرنی پڑی، لیکن یہ تو پرانے زمانے کی بات ہے۔ آج عریاں پکچروں، سینمائی فواحش کی راہ سے شیطان کا جو بے پناہ حملہ نسل انسانی پر ہوا ہے کہ آدمی کے بچے جنسی جذبات کے سلسلہ میں خرخشیوں کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جن سے شاید اب تو گدھوں کو بھی شرم آتی ہو۔ اعصاب بشری پر صرف عورت سوار ہو گئی ہے۔ ہوائے دل کے تازہ وارد

نوجوانوں کی زندگی صرف سوزش اور جلن بن کر رہ گئی ہے۔ بلوغ سے پہلے خام بالغوں کو بالغ بنادیا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں کا یہی حال ہوگیا ہے۔ بتدریج ان بے راہ رویوں کے جو نتائج ان آئندہ نسلوں پر مرتب ہونے والے ہیں جن کی قوتوں اور توانائیوں کی موجودہ نسلیں امین ہیں، کون کہہ سکتا ہے ان غریب آنے والوں پر ان ہی تصویروں کے ذریعہ سے کیا ظلم توڑا جا رہا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ روحانی اطباء کی بات اگر نہیں سنی جارہی ہے تو جسمانی اطباء آخر کب تک آدم کے بچوں کے اس ذبح عام کا صبر کے ساتھ معائنہ کرتے رہیں گے۔

زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھے گا، نبی عالم کی ایک ایک بات کی تصدیق پر اسے مجبور ہونا پڑے گا اور یہ تو تصویر سازی کا مضر پہلو ہے۔ اب اس پر اگر ہم غور کرتے ہیں کہ آخر اس کا کوئی مفید پہلو بھی پیدا ہو سکتا ہے، تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بڑے لوگوں کا نام سن کر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ ان کی صورت کیسی تھی۔ اس کا بھی علم ہوتا۔ لیکن ایک وہمی خواہش سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے۔ ہم میں سے بڑے سے بڑا آدمی بھی ظاہر ہے کہ وہی دو آنکھیں، دو ٹانگیں، دو کان رکھتا ہے۔ جن سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی محروم نہیں بلکہ شاید حیوانات بھی ان میں انسان کے ساتھ ہیں۔ بڑائی کا مدار باطنی سیرت وکمالات پر ہے۔ جو تصویروں میں منتقل نہیں ہو سکتے اور جو چیز تصویر میں آتی ہے اُس کو بڑائی سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا۔ حسن کاری کے جذبہ کا استعمال تو اس کے لیے بیسیوں راہیں کھلی ہوتی ہیں۔

(13) اسی قصہ کو مولوی غلام محمد ہفت قلمی نے اپنی کتاب ''تذکرہ خوشنویساں'' میں بھی دہرایا ہے لیکن بعض اجزاء میں کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً غلام محمد نے لکھا ہے ''میر ابیات مذکور را مقروض نمودہ بہ ہفتاد کس از شاگردان خود تقسیم کرد ہر یک یک تومان (ایرانی سکہ) حاضر کرد'' (کتاب مذکور۔ صفحہ 92) اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عباس صفوی نے اس قصہ میں میر عماد پر سنیت کا الزام لگا کر شہید کرادیا۔ اسی کتاب میں یہ بھی ہے ''در الوائل شاہجہاں ہر کہ خط میر عمادی گزرانید یک صدی منصب می یافت'' یعنی میر عماد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی سی چیز مثلاً کوئی قطعہ ہی کیوں نہ ہو، ایک صدی منصب کا حقدار صرف اس لیے بنادیتا تھا کہ دربار شاہی میں اس نے پیش کیا ہے۔ دوسرے مشہور خطاط آقا رشید دیلمی کے تذکرہ کا یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک شاعر نے مدحیہ قصیدہ رشید کی شان میں کہہ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ رشید نے اس قصیدہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے شاعر کو واپس کردیا ''شاعر محزوں برآمد'' کہ صلہ کا امیدوار تھا، چاہتا تھا کہ رشید سے کوئی رقمی انعام ملے گا لیکن ''چوں طالبان خطش (خط رشید) شنیدند زیادہ ز آنکہ توقع صلہ وانعام در خیال داشت بادوادہ آن قصیدہ نوشتۂ آقا را از دگر فتند و خیلے ممنون گشتند۔'' (ص 100) ایک اور خطاط میری خلیل اللہ جو عادل شاہی حکومت بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل کے استاد تھے، ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ایک شخص جو میر خلیل کے خط کے قدر دانوں میں تھا کسی کے پاس معلوم ہوا کہ ان کا کوئی مخطوطہ ہے۔ ''بہ ہفت صد روپیہ پیش آمد سودا نہ کرد'' بالآخر ایک قطعہ کی قیمت کیا دینی پڑی ''بہ اسپ عرب مبادلہ نمود'' علم و ہنر کی قدر شناسیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے؟

(14) مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں اس مشہور داستان کا ذکر کرتے ہوئے، جس کا اب تو اُردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے۔ یعنی داستان امیر حمزہ۔ مطبع نولکشور نے تو خدا جانے اس داستان کو کہاں تک بڑھادیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ طلسم ہوشربا، ہفت پیکر، نورافشاں وغیرہ جن کے مطالعہ کا شرف اس فقیر کو عہد طفولیت میں ملا تھا۔ اب تو ان کی مجموعی مجلدات سو سے متجاوز ہوں تو عجیب نہیں لیکن مُلّا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً فارسی زبان میں اس داستان کی سترہ جلدیں تھیں۔ واللہ اعلم یہ داستان کہاں لکھی گئی، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مُلّا عبدالقادر نے ان سترہ جلدوں اور ''شاہ نامہ'' کے متعلق لکھا ہے کہ اکبر نے ''شاہ نامہ وقصہ امیر حمزہ را بہ ہفتدہ جلد در مدت پانزدہ

سال نویسانیدند وزر بسیار در تصویراں خرچ شد۔'' (ج 2، ص 320) اسی کتاب کی تیسری جلد میں میر سید علی مصور تخلص جدائی کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا صاحب نے لکھا ہے۔ ''قصہ امیر حمزہ در شانزدہ جلد مصور باہتمام وے اتمام یافتہ ہر جلد سے صندوقے و ہر ورقے یک ذرع در یک ذرع و در ہر صفحہ صورتے۔'' (ج 3، ص 211) جس کا یہی مطلب ہوا کہ سترہ اٹھارہ جلدوں کی یہ کتاب اس طرح لکھی گئی تھی کہ ایک ہاتھ چوڑا ایک ہاتھ لمبا ہر جلد کا ہر ورق تھا اور ہر ورق میں ایک تصویر بنائی گئی تھی۔

(15) حال میں ایک قدیم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں خریدا گیا ہے جس میں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک کافی ذخیرہ ہے کرتے۔ یہ تھے کہ لوہے کے قلم سے ان پتوں پر جو تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے ہوں گے اور ان کے کناروں کو تراش کر گول کر لیا جاتا تھا، اس کے بعد لوہے کے قلم کی نوک سے صرف نشانات بنا دیے جاتے تھے۔ پھر سنبھالو یا اسی قسم کے عرق دار پتوں کو ہاتھوں سے مل کر ان نشانات پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے نشانات نمایاں ہو جاتے تھے۔ پرانے زمانہ میں عینکوں کے لیے جیسے خول ہوتے تھے ان ہی میں تیس تیس چالیس چالیس پتوں کا ایک مجموعہ ایک ڈوری سے نتھا ہوا ان خولوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ان پتوں کی کتابوں میں کس قسم کے مضامین ہیں اب تک ان کا پتہ نہیں چلا ہے۔ زیادہ تر تلنگی، کنڑی، مرہٹی زبانوں میں ہیں اور بعض سنسکرت میں بھی ہیں۔ جامعہ کے بعض ہندو پروفیسروں نے مجھ سے کہا کہ ان میں زیادہ تر پرانے زمانے کے قصے کہانیاں یا جھاڑ پھونک وغیرہ جیسی چیزیں ہیں۔ مُلّا عبدالقادر نے بھی فیروز شاہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ جب کانگڑہ فتح ہوا تو اس کے مندروں سے بھی بہت سی کتابیں برآمد ہوئیں۔ بادشاہ نے ان کتابوں کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ مُلّا نے لکھا ہے کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں میں بعض کتابیں میری نظر سے بھی گزری ہیں۔

''بعضے ازاں در علم پنگل یعنی فنون موسیقی و اقسام اکھاڑہ کہ آں را پاتری بازی گویند و بعضے در غیر آں و اکثر اں را بے ماحصل یافت۔'' (ص 249)

اکھاڑہ سے مراد وہ اکھاڑہ نہیں ہے جس میں کشتی گیری کا فن سکھایا جاتا ہے، بلکہ مُلّا نے پاتری بازی سے جس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہی مقصود ہے۔ ابوالفضل نے اپنی خاص زبان فارسی شدہ میں اسی اکھاڑہ کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ''اکھاڑہ نشاط بزمے ست، در شبستان بزرگاں ایں مرز (سرزمین) پراستہ گرود'' پھر اُس نے اپنی اسی زبان میں بتایا ہے کہ گھر کی چھوکریوں کو ساز و نغمہ سکھایا جاتا ہے اور چار عورتیں جو ''نگورد'' ہوتی ہیں ''برقاصی در آئند'' و چہار بسرائیدگی، الغرض یوں آٹھ چھوکریاں گاتی اور ناچتی ہیں اور ''چہار بداں بمط تال نوازند'' یعنی تالیاں بجاتی ہیں۔ اسی طرح سے مختلف قسم کے ڈھول جن کے مختلف نام ہوتے ہیں، وہ بجاتے جاتے ہیں۔ ہندوستان جب اپنا سب کچھ کھو چکا تھا، دام مارگی فرقوں نے عبادت کی ان شکلوں کو مندروں میں مروج کیا تھا، اور باضابطہ اس کو فن بنا دیا گیا تھا۔ دراصل پچھلے زمانہ میں ہندوستان میں کتابیں جو لکھی گئیں ان کا تعلق اسی قسم کی باتوں سے تھا۔ ٹھیک آج جو حال یورپ کا ہے کہ فائن آرٹس (فنونِ لطیفہ) کے نام سے ہرنا کردنی کو کردنی بنا دیا گیا ہے۔ و یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے فن کاغذ سازی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تاڑ کے پتوں سے جو کام نکالا، اس میں ذہانت سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن اسی ملک میں مسلمانوں نے جب مسلم قرآن کی اتنی چھوٹی تقطیع میں لکھ کر دکھا دیا تھا جو انگوٹھیوں کے نگینے کی جگہ سما جاتا تھا، یا بازو بند بنا کر سلاطین و امراء بطور تعویذ کے استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ چنے کی ایک دال پر پوری قل ھو اللہ کی سورت تک لکھی جاتی تھی، مُلّا عبدالقادر بداؤنی نے شریف نام شخص کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ''پدرش (خواجہ عبدالصمد) در یک طرفہ دانہ خشخاش سورۂ اخلاص تمام درست و خوانا نوشتہ و طرف دیگر نیز ازیں مقولہ'' خشخاش کے دانہ کی ایک طرف پر سورۂ قل ھو اللہ کو اس طور پر لکھنا کہ ہر شخص پڑھ سکتا ہو، بظاہر عقل میں یہ بات نہیں آتی اور یہ تو باپ کا کمال تھا۔ میاں شریف صاحبزادے بھی کم نہ تھے۔ مُلّا صاحب ہی نے لکھا ہے ''پسرش

در یک دانہ خشخاش می گویند کہ ہشت سوراخ باریک کردہ و تار ہا دراں گزرانیدہ و در دانہ برنج صورت سوارے مسلح و جلودارے در پیش مع دیگر خصوصیات از تیغ و سپر و چوگان وغیرہ آں نقش نمودہ'' (ج 3، ص 310)۔ (برنج) چاول کے ایک دانہ پر مسلح سوار کو ان چیزوں کے ساتھ مصور کرنا بلاشبہ عجب کمال تھا اور اب بھی ان لکھنے والوں کی یادگاریں بعض پرانے خاندانوں میں موجود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں تاڑ کے پتوں پر لکھنا ظاہر ہے کہ کیا کمال کی بات ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز غالباً ہندوستان میں لکھنے ہی کے متعلق ایسی تھی جس سے غالباً مسلمان واقف نہ تھے، ''روضۃ الصفا'' کے آخر میں دکن کی مشہور راجدھانی بیجانگر کے کچھ حالات بھی درج ہیں، غالباً ''قران السعدین'' سے ماخوذ ہیں، وہ لکھتا ہے کہ:

> ''کتابت ایشاں بر دو نوع ست، یکے بقلم آہن کہ بر برگ جوز ہندی کہ دو گز طول بر نگارند و ایں نوع کتابت کم بقا باشد دیگر بر جنس سیاہ سنگ نرم کہ آں را بساں قلم تراشند و چیز بانو پسند واز اں سنگ رنگ سفیدی بریں جنس سیاہ پدید آید و ایں کتابت دیر بماند۔''

جوز ہندی تو وہی تاڑ کے پتوں سے مراد ہے، لیکن آخری چیز جو اس نے لکھی ہے بہ ظاہر اس کا اشارہ سلیٹ اور پنسل جو پتھر ہی کی ہوتی ہے اس کی طرف ہے۔ سلیٹ ہی پر جب لکھتے تو سیاہ پتھر سے سفید حروف نکل آتے ہیں، لیکن اجنبی مسافر ہونے کی وجہ سے اس کو غلطی لگی اور یہ لکھ دیا کہ ''ایں کتابت دیر بماند'' حالانکہ الٹی بات ہے۔ غالباً خود تجربہ نہیں کیا۔ پتھر پر کسی چیز کو لکھتے ہوئے رائے قائم کر لی کہ یہ نقش جب حجر میں ہو رہا ہے تو النقش فی الحجر ہی ہوگا اور یہی دلیل ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے وہ سلیٹ والی ترکیب کتابت سے ناواقف تھے اور یہ کوئی خاص چیز اسی ملک کی ایجاد ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ جب اس ملک میں مسلمان متوطن ہو گئے تو ہندوؤں سے اس چیز کو انہوں نے اخذ کیا ہوگا، اسی لیے میں نے اس کا ذکر بھی کیا کہ ہندی نظام تعلیم کے ایک طریقۂ کتابت کا اس سے پتہ چلتا ہے۔ عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ پنسل سلیٹ والی ترکیب یہ اسکولوں کی پھیلائی ہوئی ہے صحیح نہیں ہے۔ بعض عربی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تاڑ کے پتوں کے سوا ہندوستان میں ریشمیں کپڑوں پر بھی لکھنے کا دستور تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(16) توز کیا چیز ہے؟ ہندوستان ہی کی چیز ہے۔ لیکن مختلف کتابوں میں اس کی جو شرح کی گئی تھی دل کو نہیں لگتی تھی۔ لیکن البیرونی کی ''کتاب الہند'' میں اس کی تفصیل ملی۔ انجمن ترقی اُردو کے ترجمہ سے اس کی عبارت نقل کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے ''وسط اور شمالی ہند میں درخت توز کی چھال (لکھنے کے لیے) استعمال کرتے ہیں، جس کی ایک قسم سے کتابوں کے غلاف بنائے جاتے ہیں۔ اس کو بھوج پتر بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ لانبی اور پھیلی ہوئی انگلیوں کے برابر یا اس سے کم چوڑی ہوتی ہے۔ اس کو کسی طریقے سے مثلاً تیل لگا کر اور صیقل کر کے سخت اور چکنا کر لیتے ہیں اور اس پر لکھتے ہیں'' (ترجمہ اُردو۔ ص 225) لیکن اس سے بھی زیادہ تفصیل طبی کتاب ''محیط اعظم'' میں دی گئی ہے۔ لکھا ہے: ''و آں پوست درخت ہندی کشمیری ذی طبقات کثیرہ میل طبقات ابرک بود، ہر طبقہ مثل کاغذ و خطوط مستقیم سرخ سفید مثل الف بر آں کشیدہ و مردم ہند بچہ قلیاں (حقہ) بکار می برند۔'' البیرونی نے لکھا ہے کہ اُن اوراق کی ترتیب مسلسل ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے، پوری کتاب کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی دو تختیوں کے درمیان جو کتاب کے برابر ہوتی ہیں بندھی رہتی ہے اور ان کتابوں کا نام پوتھی ہے۔ محیط اعظم میں دوسرے موقع پر ''توز'' کے تحت میں لکھا ہے۔ ''شجر عظیم ست چوں چوب آں را بر آتش نہند از اں روغن مثل روغن بلساں سائل شود و صمغ (گوند) آں کہربا ست'' واللہ اعلم ہندوستان میں رواج ہے کہ دال یا پلاؤ وغیرہ میں ایک قسم کے پتے بنام تیز پات ڈالتے ہیں۔ کیا ''تیز'' کا لفظ ''توز'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بھوج پتر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بھوج کے معنی ہندی میں کھانے کے ہیں۔ یعنی وہ پتہ جو کھانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ مصالحہ کے یہ پتے اسی درخت توز کے

ہوں۔ بہر حال صاحب محیط اعظم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تہ بہ تہ بالکل رول دیئے ہوتے کاغذ کی مانند قدرتی طور پر یہ چھال درخت توز میں پیدا ہوتی ہے۔ کمان پر چڑھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ یہ چھال اچھی خاصی مضبوط ہوتی تھی۔

(17) شائرل کی کتاب کے حوالہ سے اسلامی درسگاہوں کے مصنف نے یہ عبارت نقل کی ہے کہ ''جنوبی ہند میں لڑکے نرکل سے چینی کاغذ پر لکھتے ہیں۔'' یہ گول کنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کے زمانہ کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن میں کاغذ چین سے آتا تھا، گویا دکن میں کاغذ کی صنعت سلاطین آصفیہ کے زمانہ سے مروج ہوئی۔

(18) جون پور کے پاس ہی پرانے زمانہ میں ایک بڑا مشہور شہر ظفر آباد تھا، جو قریب قریب اب کھنڈر ہو گیا ہے، پھر بھی تھوڑی بہت آبادی ابھی باقی ہے۔ ایک صاحب نے ''چراغ نور'' کے نام سے اس کی تاریخ لکھی ہے، اس میں بیان کرتے ہیں کہ اس قصبہ میں پانچ سو دکانیں کاغذ بنانے کی تھیں، بظاہر دکان سے مراد کارخانے ہیں۔ لکھا ہے کہ سال میں تین چار لاکھ روپیہ کی تجارت تھی، واللہ اعلم۔ یہ سب بیان ان کا کہاں تک صحیح ہے، لیکن ایک مفید بات اس کتاب میں خوب ہی مل گئی۔ مصنف کتاب نے کاغذیوں کے خاندان والوں سے ان کاغذوں کی قسمیں اور نام پوچھ کر درج کر دیئے ہیں، ان کے بیان کے مطابق ظفر آباد میں جو کاغذ بنتے تھے ان کی قسم اور نام یہ تھے (1) اردلی غالباً یہ تو وہی اردل بہار کے کاغذ کی نقل ہوگا (2) نصیری (3) ہیرانندی (4) راسی (5) موٹھا (6) پتنگی۔ غالباً پتنگ کا باریک کاغذ ہوگا (7) چوکھوٹا (8) مسلم۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ٹاٹ اور نار سڑا کر اسی کو کوٹ کر سجی کا کھارو ے کر پانی میں صاف کر کے یہ کاغذ بناتے تھے۔ اب ظفر آباد کی آبادی کل ہزار بارہ سو گھروں پر مشتمل ہے، کاغذی شیوخ کہلاتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے مقالات میں سے خانخاناں عبدالرحیم خاں پر جو مقالہ لکھا اس میں ذکر کیا ہے کہ ابری کا کاغذ ہندوستان میں خانخاناں کی ایجاد ہے، اور ایک کاغذ عکاسی کی ایجاد کا انتساب بھی خانخاناں کی طرف کیا ہے لیکن مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ ''کاغذی عکاسی'' کا کیا مطلب ہے وہ میری سمجھ میں نہ آیا۔

(19) شاہی عہد کا یہ ایک بڑا اہم عہدہ تھا۔ ہر علاقہ میں ایک خاص سررشتہ وقائع نگاری کا قائم تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ بادشاہ اپنے ملک کے ہر علاقہ کے حوادث و واقعات سے براہ راست واقفیت حاصل کر کے اپنے آپ کو پورے ملک کے ساتھ وابستہ رکھے، گویا وقائع نگار یا بادشاہ وقت کی آنکھیں ہوتے تھے جو ملک کے ہر واقعہ پر اسی ذریعہ سے ٹکٹکی باندھے رکھتی تھیں۔ چونکہ وقائع نگار روز روز کے واقعات کی رپورٹ بصیغۂ راز آستانہ شاہی تک کیا کرتا تھا، اس لیے علاقہ کے تمام حکام وولاۃ قضاۃ سب پر ان کی نگرانی قائم رہتی تھی۔ وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا تھا، لیکن دوسرے اپنے آپ کو اس کے دباؤ میں پاتے تھے، اسی لیے اس عہدہ کے لیے کسی ایسے آدمی کا انتخاب ہوتا تھا جو دل و دماغ، عقل و دین دونوں میں کمال رکھتا ہو۔ علاقہ کے نوابوں، جاگیرداروں، حکام سے کوئی کمزوری سرزد ہوتی تھی، تو ان کا پہلا کام یہی تھا کہ وقائع نگار کو ہموار کیا جائے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی رشوتیں پیش ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد بھی اپنے نانا کے ساتھ کبھی کبھی سندھ میں رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ احمد یار خاں زمیندار نے ایک شخص کو بلاوجہ قتل کر دیا تھا۔ نانا صاحب کے پاس خطیر رقم لے کر حاضر ہوا کہ رپورٹ شاہی دربار میں اس واقعہ کی نہ کی جائے۔ لیکن اس عہدہ کے لیے ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا۔ اگر ان نقرئی وطلائی زنجیروں سے ان کا ہاتھ باندھا جا سکتا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں وقتی طور پر میر صاحب کو وزیر اعظم نے اس لیے معزول کر دیا تھا کہ سندھ میں اولے برسے تھے۔ چکھنے والوں نے چکھا تو بالکل نبات سفید کا مزہ تھا، واقعہ تھا لکھا گیا۔ وزیر کو اس خبر پر اعتبار نہیں ہوا اور اس نے محض اس ایک خبر کی وجہ سے معزولی کا فرمان بھجوا دیا۔ اس سے اُس عہدے کی نزاکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ الہ یار خاں عثمانی بلگرامی اپنی تاریخ ''حدیقۃ الاقالیم'' میں لکھتے ہیں کہ بلگرام میں بھی اس آسمانی قند و نبات کے کچھ نمونے آئے تھے۔ لکھا ہے کہ ''تا سالہا ماندہ

درر نگ وصافی وبراقی چوں ژالہ ونمک سنگ وقوامس انچناں سخت بود کہ وباون دستہ آہنی بسختی شکستہ می شد وخواصش آں بود کہ ہر کسے کہ چند روز درچشم کشیدے ناخنہ وجالہ ومائدہ وگل چشم وامسال آن کہ مانع ابصارمی شد ہر طرف می گردیدے وصحیح چشماں راروشنائی چشوم می افزودوداشتن اوردرچشم باشناں دفع می نمود۔'' (حدیقۃ الاقالیم۔ص 646)

(20) یہ شیخ ابن دقیق العیدان چند استثنائی ہستیوں میں ہیں جن میں عقل کے ساتھ علم اور علم کے ساتھ دین اور دین کے ساتھ اخلاص یہ سارے صفات جمع ہو گئے تھے۔ علامہ ذہبی جوان کے دیکھنے والوں میں ہیں، ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ان کا بسیط تذکرہ درج کیا ہے خود اپنی رائے بھی قلم بند کی ہے۔''**كان من اذكياء زمانه واسع العلم كثير الكتب مديما للسهر مكبا على الاشتغال ساكناً وقوداً ورعاً قل ان ترى العيون مثله**'' (اپنے وقت کے بڑے ذکی آدمیوں میں تھے۔ علم ان کا وسیع تھا، کتابوں کا کافی ذخیرہ اپنے پاس رکھتے تھے، شب بیداری کے پابند تھے، ہمیشہ مشغول ہی رہتے تھے۔ بھاری بھر کم مطمئن دل والے تھے، بڑے پرہیزگار، آنکھوں نے ان جیسی ہستیوں کو کم ہی دیکھا ہے) اور قطب الدین الحلبی کے حوالہ سے بھی ان کی رائے یہ نقل کی ہے۔''**لم يُر في عصره مثله**'' (اپنے وقت میں ان کے جوڑ کا آدمی نہ دیکھا گیا) 625ھ میں بہ مقام ینبع (حجاز) میں پیدا ہوئے، اپنے عہد کے اساتذہ سے علوم دینیہ خصوصاً حدیث وفقہ واصول حاصل کیا۔ مصری حکومت اصرار کر کر کے مصر کے قضاء القضا (چیف جسٹس) کے عہدہ پر مقرر کرتی رہی، لیکن ہر چند سال کے بعد استعفاداخل کرتے تھے۔ عموماً یہ اس صورت میں ہوتا تھا جب حکومت دین کے معاملہ میں کچھ مساہلت سے کام لینا چاہتی تھی۔ ارض فرعون (مصر) کے سلاطین پر اتنا اثر تھا کہ شیخ جب کسی ضرورت سے بادشاہ کے پاس جاتے تعظیم کے لیے بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنی جگہ چھوڑ دیتا تھا، شیخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ لکھی ہے کہ''**كان كثير الشفقة على المشتغلين كثير البر لهم**'' (یعنی اپنے شاگردوں پر بڑے مہربان تھے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے)۔ 702ھ میں ستر کی عمر پا کر وفات پائی۔ شیخ نے اگرچہ کم کتابیں لکھی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے ان میں بعض کی تکمیل نہ ہو سکی تاہم ان کی کتاب''الامام فی الاحکام'' جو غیر مکمل ہے اس سے ان کی جلالت شان اور اجتہادی نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ لوگ ان کو المالکی الشافعی دونوں نسبتوں کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ۔ ج4، ص 362)

(21) طباطبائی نے لکھا ہے کہ سید محمد علی جب ایران سے اورنگ آباد پہنچے تو''ناصر جنگ ناظم دکن (یعنی آصف جاہ ثانی شہیدؒ) تکلیف ماندن کرد لیکن بر بناء فساد اوضاع او قبول نہ کرد واز آنجا بحیدرآباد ودر آنجا چندے قیام کردہ از راہ سیکا کول بہ بنگالہ'' (ج3، ص 617)
افسوس ہے کہ سلاطین آصفیہ کے ساتھ''سیر المتاخرین'' کا مصنف محض مذہبی تعصب کی بنیاد پر موقعہ بے موقعہ چوٹ کرنے سے نہیں چوکتا، کبھی حضرت آصف جاہ انار اللہ برہانہ کو دنیادار، زمانہ شناس اور خدا جانے کن کن الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ یہاں بھی ناصر جنگ شہید جن کے حالات مولانا آزاد نے اپنی چشم دید گواہیوں سے جو لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معارف نواز، دین پرور بادشاہ تھے۔ غالباً ان کے تسنن کی تعبیر طباطبائی نے''فساد اوضاع'' سے کی ہے۔ حالانکہ خود اقرار کرتا ہے کہ میر محمد علی جو ایک شیعہ عالم تھے مگر باوجود شیعہ ہونے کے صرف علمی قدر دانی تھی ناصر جنگ کی کہ قیام اورنگ آباد پر مُصر تھے مگر پھر بھی یہ متعصب مورخ ان کی طرف فساد اوضاع کا انتساب کرتا ہے۔

(22) مغل حکومت کا چراغ سحری جس وقت بجھنے کے لیے جھلملا رہا تھا، اُس وقت اس چراغ حکومت کی چند خاص جاندار کرنوں میں یہ مہابت جنگ ناظم بنگالہ بھی تھے۔ صاحب''سیر المتاخرین'' مہابت جنگ کے درباریوں میں بھی تھے، اس لیے اپنی کتاب میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ بہادری اور استقامت کا ایک دلچسپ واقعہ مہابت جنگ کے متعلق یہ بھی نقل کیا ہے کہ شکار کے لیے اڑیسہ کی

طرف غالباً گئے ہوئے تھے، فوج جو ساتھ تھی پانچ چھ سو سے زیادہ نہ تھی۔ اچانک معلوم ہوا کہ مرہٹوں کی برگی نے حملہ کر دیا ہے، مہابت جنگ خیمہ میں تھے، حکم دیا کہ ہاتھی کس کر لایا جائے، لوگوں پر بدحواسی طاری تھی، لیکن مہابت جنگ اطمینان سے مقابلہ کے لیے تیار ہوئے، ہاتھی آ گیا۔ سیڑھی لگائی گئی، لیکن عجلت میں نواب کی جوتیاں نہیں مل رہی تھیں، لوگ تقاضا کر رہے تھے کہ حضور سوار ہو جائیں۔ مرہٹے بالکل سر پر پہنچ گئے، مگر نواب ٹہلتے رہے جب تک جوتیاں نہ ملیں سوار نہ ہوئے۔ بہرحال مقابلہ ہوا اور حسب دستور مرہٹے بھاگے بعد کو جب پوچھا گیا کہ اس پریشانی کی حالت میں جوتیوں کے پہننے پر کیوں اصرار فرمایا جارہا تھا تو بولے کہ "بعد آنے شما خواہید گفت کہ مہابت جنگ از فرطِ اضطراب کفش پا گزاشتہ بدر رفت۔" (ج 2، ص 305) یہ چیز بھی مہابت جنگ کے متعلق غالباً قابل ذکر ہی ہو کہ اپنے عہد میں اسے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں میں ایک لیڈر خیال کیجیے یا کسی علاقہ کا حاکم، بہرحال مہابت جنگ کے متعلق اس کے دربار کے مورخ کی یہ چشم دید گواہیاں ہیں کہ "اغلب دو ساعت بخواب می بود کہ برمیخواست واز حجلی طہارت فراغت نمودہ شروع بہ نوافل واورادی فرمود اول صبح نماز واجب ادا کردہ......" پھر کاروبار حکومت میں مشغول ہوتا۔" واز آنجا برآمدہ وضوی نمودہ نماز ظہر خواندہ یک جز تلاوت کلام الٰہی کردہ نماز عصری خواند۔" (ص 609) خلاصہ یہ ہے کہ فرائض پنجگانہ کے ساتھ تہجد اور تلاوت تک کا پابند تھا۔ کیا مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں اور مسلمان حکام کے لیے اس میں عبرت نہیں ہے۔

(23) میر محمد علی صاحب کا یہ کام علمی حیثیت سے یقیناً قابلِ قدر ہے خصوصاً چند اور رسائل کا اضافہ ان کے کمال کی دلیل ہے، واللہ اعلم دنیا میں اب یہ نسخہ پایا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کس فن کی تکمیل انہوں نے کی۔ اس لیے کہ حکمت وفلسفہ کی تو شاید ہی کوئی ایسی شاخ باقی ہو جس پر کوئی رسالہ اس مجموعہ میں موجود نہ ہو۔ مدرسوں میں اس کے چند اوراق علم الحیوان کے ادبی حیثیت سے رکھے گئے ہیں، طلبا عام طور پر اسی کو اخوان الصفا سمجھتے ہیں لیکن اصل واقعہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ طبعیات، الٰہیات، ہیئت، ہندسہ حتیٰ کہ موسیقی تک ہر ایک فن پر مستقل رسالہ اس مجموعہ میں شریک ہے۔ بمبئی میں مدت ہوئی اس کا ایک مجموعہ چھپا تھا، لیکن شاید اب وہ بھی نایاب ہے۔ میں نے ایک قلمی نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا تو اس مطبوعہ مجموعے میں نظر آیا کہ بہت سے رسائل نہیں ہیں۔ مذہبی حیثیت سے ان رسائل کے متعلق لوگوں کا جو خیال بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ بڑی چالاکی سے اس میں دین کو فلسفہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں میں اس کی حقیقت کھولی گئی ہے۔ مگر مجھے میر محمد علی کے اس طرز عمل پر تعجب ہے کہ کسی دوسرے کی کتاب میں کسی نامناسب عبارت کو پا کر بجائے اس کی تردید یا نوٹ وغیرہ لکھنے کے اصل کتاب کی عبارت ہی بدل دینا بالکل عجیب ہے۔ مسلمانوں کے بعض فرقوں پر یہ الزام ہے کہ وہ دوسروں کی کتابوں میں رد و بدل کر دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے تو اس الزام کی کچھ تصدیق ہوتی ہے۔ خصوصاً جب ان کے شدید مقصد کی یہ شہادت ہو، واللہ اعلم

(24) خاکسار کے جدِ امجد مرحوم مولانا محمد احسن گیلانی بھی بڑے خطاط تھے۔ نسخ، نستعلیق، شفیعہ، شکستہ ان چار خطوں میں ان کو کمال تھا۔ ان کی لکھی ہوئی بعض وصلیاں میرے پاس موجود ہیں۔ ان ہی کے ترکہ میں واسطی قلم بھی ہے۔ عجیب عجیب قسم کے مسطر، قطزن کی ہڈیاں، دیگر لوازم کتابت، واقعہ یہ ہے کہ عہد اسلامی کے کاغذ، روشنائی، دوات، جدول، لوح، جلد بندی ہر ایک ایک مستقل عنوان کا مضمون ہے۔ دواتوں کے سلسلہ میں پڑھیے، تاریخوں میں ملے گا کہ بادشاہوں کی طرف سے لوگوں کو سنگ یشب کی دواتیں انعام میں ملتی تھیں۔ غلام محمد ہفت قلمی نے اپنے "تذکرہ خوش نویساں" میں سید محمد امیر رضوی کا ذکر کرتے ہوئے کتابت کے متعلق ان کی مختلف دستکاریوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "نکاشی ولوح وجدول وصحافی وعلاقہ بندی وسنگتراشی وغیرہ دستگاہے کمال داشت۔" (ص 71) بجز سنگتراشی کے جتنے الفاظ ہیں سب کا تعلق کچھ نوشت وخواند کے متعلقات سے ہے اور سنگ تراشی کا ایک شعبہ مُہر کنی وحکاکی و

عقیق سازی بھی ساز مرہ کے ہنر تھے جن کے ارباب کمال اسلامی عہد میں ہر شہر اور ہر قصبہ میں پائے جاتے تھے۔ میر محمد رضوی کے ذکر میں ایک اور چیز عجب ہاتھ آئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ میر، اپنی خطاطی میں آقا رشید دیلمی کے تتبع تھے۔ آقا رشید سے آخر میں ان کی عقیدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ سالانہ ان کا عرس بھی دلّی میں انہوں نے قائم کیا تھا، لیکن عرس کیا تھا، سنیے: ''از چند سال عرس آقا عبدالرشید در ماہ محرم مقرر نمودہ۔ اکثر اساتذہ و خطاطان وغیرہ شاہجہان آباد در مجلس مذکور حاضری شوند و علاقات یک دیگر مسرور و شاد کام می گردند و در تذکار خط و خطاطان می گزرانند'' (کتاب مذکور۔ ص 27) گویہ یہ عرس مشرقی نہیں بلکہ Death Anniversary (برسی کی تقریب) منائی جاتی تھی۔ عرس کو آج جو کچھ سمجھا جا رہا ہے کیا اس تاریخی اشارہ سے ہم اسے کچھ اور بھی سمجھ سکتے ہیں؟

(25) ''تذکرہ خوش نویسانِ ہند'' جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شایع کیا ہے، اس میں میر خلیل اللہ خطاط جو ابراہیم عادل شاہ کے خطاطی میں استاد تھے، یہ لکھا ہے کہ ''کتاب نورس تصنیف زمان ابراہیم عادل شاہ میر مذکور بخوشخطی نوشتہ گذرانید'' بادشاہ خیلے محظوظ شدہ مخاطب بہ ''بادشاہ قلم'' ساخت، لیکن کیا صرف خشک خطاب ہی پر قصہ ختم ہو گیا؟ آگے سنیے، فن کے قدر شناسوں کا حال سنیے۔ مصنف کتاب لکھتے ہیں ''و بر تخت خود نشانیدہ و وزراء و سائر اعیان دولت بر کابش دادہ بخانہ اش رسانیدند۔'' (ص 80) گویا خطاب جب بادشاہی کا دیا گیا تھا تو تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی، غریب میر کو واقعی بادشاہ بھی بادشاہ نے بنا دیا۔ تخت پر بٹھایا، وزراء، امراء کو ساتھ کیا کہ اسی شان کے ساتھ میر صاحب کو گھر تک پہنچا آئیں، اللہ اللہ کیا دن تھے۔ ابو اسحاق شاہ شیرازی بیوی کے سوا حکومت اور حکومت کے ساتھ جو کچھ تھا سب قاضی عضد کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ محمد تغلق نے ہندوستان سے ان کو بلایا تھا اور ''مواقف'' کے متن کو چاہا تھا کہ میرے نام معنون کریں۔ علم کا اقبال فن کا عروج کیا اس سے بھی زیادہ بلندی کسی زمانہ میں حاصل کر سکا ہے۔؟

تعلیمی مضامین

اب میں چاہتا ہوں کہ اس عہد کے ان مضامین کے متعلق بھی تھوڑا بہت تذکرہ کروں جن کی اُس زمانہ میں تعلیم دی جاتی تھی، اگرچہ یہ ایک بڑی طویل بحث ہے، لیکن جب اس وادی پُر خار میں پاؤں رکھ ہی دیا گیا ہے تو جو شکستہ گستہ معلومات ہیں، اُنہیں پیش کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم سے سردست بحث نہیں ہے بلکہ پیشِ نظر اعلیٰ تعلیم کے مضامین ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ہندوستان ہو یا ہندوستان سے باہر اور آج ہو یا کل، میں سمجھتا ہوں کہ ہر قابل ذکر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں قرآن (تفسیر)، حدیث، فقہ، عقائد کی علمی تعلیم، صحبت و بیعت کے ذریعہ سے ہوائے دل کے تازہ واردوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور سب سے بڑی چیز یعنی للّٰہیت یا اخلاص باللہ میں رسوخ کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں کی گئی ہے۔ ان پانچ چیزوں سے کسی زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام کبھی خالی نہیں (1) رہا، گویا ان مضامین کی حیثیت موجودہ نصابی اصطلاح کے رو سے لازمی مضامین کی تھی، یہ اور بات ہے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کسی امر کو کسی ملک میں کسی خاص زمانہ میں خاص اسباب و وجوہ کے تحت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہو، مثلاً ہندوستان میں مسلمان جب شروع شروع میں آئے ہیں تو فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ تصوف (یعنی وہی صحبت و بیعت کے ذریعہ سے سیرت و کردار کی استواری، عقائد میں استحکام واخلاص) کا ملکہ پیدا کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس ملک میں ان دو مضامین کے سوا اور دوسرے مضامین مثلاً قرآن وحدیث وغیرہ سے ہندوستان ناآشنا تھا۔

حدیث کے متعلق غلط پروپیگنڈا

ناواقفوں سے تو بحث نہیں، لیکن اچھے پڑھے لکھوں کی زبان وقلم سے کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن سے عام مغالطہ پھیلا ہوا ہے، خصوصاً بعض مورخین نے خدا ان پر رحم کرے، حضرت نظام الدین سلطان جی کے متعلق کہیں یہ قصہ نقل کر دیا ہے کہ سماع کے مسئلہ میں مولویوں سے بحث ہوئی اور امام غزالی کے مشہور قول ''یجوز لا هله ولا یجوز

لغیر اھلہ'' کو حدیث قرار دے کر مجلس مناظرہ میں پیش کیا گیا، گویا یہی واقعہ اس کی دلیل ہے کہ ہمارا یہ ملک فن حدیث سے بالکل ناواقف تھا۔

اسلام کا داخلہ ہندوستان میں

اِس قصہ میں کس حد تک اصلیت ہے اس کا پتہ تو آپ کو خود آئندہ میرے پیش کردہ واقعات سے چل جائے گا، مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ الزام ہندو علماء ہند کی طرف جو منسوب کیا جاتا ہے، اُس کا تعلق کس زمانہ سے ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہمارا یہ ملک دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں گونہ نومسلم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، وطن بنا کر اسلام اس ملک میں چھ سو سال بعد غوری انار اللہ برہانہ کے حملوں اور کامیابیوں کے بعد داخل ہوا، جو گویا اس سے ساتویں صدی ہجری جو غوری کے غلام قطب الدین ایبک کی بادشاہی کی صدی ہے، یہی اس ملک میں اسلام کی پہلی صدی ہے۔ ایبک کی تخت نشینی 603ھ میں ہوئی۔

علوم حدیث کی خدمت کا اعتراف غیر ملکیوں کو

اب کھلی ہوئی بات ہے کہ پچھلی صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد تو فن حدیث میں ہندوستان نے وہ مقام حاصل کر لیا جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مقالہ میں کر چکا ہوں کہ علامہ رشید رضا مصری کو یہ تسلیم کرنا پڑا۔

> ''لولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فی هذه العصر يقضىٰ عليها بالزوال من امصار الشرق، فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهىٰ الضعف فی اوائل القران الرابع عشر.''[2] (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)
>
> ''اگر علوم حدیث کے ساتھ ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں مبذول نہ ہوتی تو اسلام کے مشرقی علاقوں میں اس علم کا خاتمہ ہو جاتا، کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز سب ہی میں دسویں صدی ہجری سے چودہویں تک تو ضعف کمال کو پہنچ گیا تھا۔''

شاہ صاحب سے پہلے علماء کی آمد

رہا شاہ صاحب سے پہلے، تو اس سلسلے میں پہلی بات تو وہی ہے جس کا ذکر ضیاء الدین برنی نے اپنی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں کیا ہے، مگر افسوس کہ لوگوں نے برنی کے اس بیان کو شاید اہمیت نہیں دی۔

واقعہ یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اختتام پر اسلامی دنیا کو فتنہ تاتار کی مہیب شکل میں جس فتنۂ عظیم اور ''شر مستطیر'' سے دوچار ہونا پڑا، پھر عجب بات ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے نئے آباد کار مسلمانوں کے لیے بھی

''شر''''خیر'' کا قلزم زخار بن گیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلامی اقتدار کے بعد ہر فن اور کمال کے نمائندوں کا ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جانا ایک تو یوں ہی ایک قدرتی بات تھی، کسی قوم وملت کی حکومت کا سرچشمہ شیریں جس ملک میں بھی ابل پڑتا ہے، اس حکومت سے تعلق رکھنے والے ''مردم ومور'' یا چھوٹوں بڑوں کا اس کی طرف پل پڑنا کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس پر تعجب کیا جائے، لیکن برنی کے اس بیان کو پہلے پڑھیے۔ وہ لکھتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ جو لوگ:

''از حادثہ چنگیز خاں ملعون دریں دیار آمدہ بودند۔'' (فیروز شاہی۔ص 111)

''ملعون چنگیز خاں کے حادثہ سے متاثر ہو کر اس ملک (ہندوستان) میں جو لوگ آئے۔''

علماء کے متعلق التمش کا اعتراف

پہلے اہل بیت (3) نبوت کے ان بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق برنی کا بیان ہے کہ ''ہر یکے در صحبت نسب و بزرگی حسب عدیم المثال بودند و در کمال تدین وتقویٰ آراستہ۔'' اس کے بعد ان علماء وفضلاء کی ایک طویل فہرست وہی ہے جو چنگیزی فتنہ سے نجات پا کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ سلسلہ ان بزرگوں کی آمد کا قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کے زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ برنی نے بلبن کے حوالے سے سلطان شمس الدین التمش کے ان اعترافی الفاظ کو نقل کیا ہے کہ

''بار ہا بر سر جمع بگفتے کہ من چگونہ توانم خدا تعالیٰ را شکر گویم کہ مرا با عوان وانصار بزرگ گردانید کہ ایشاں ہزار بار بہ از من اند و ہر بار کہ ایشاں بر رسم سلاطین پیش من از پستری روز و دست پیش می کنند و در دربار پیش من ایستادہ می شوند من از بزرگی وسروری ایشاں شرمندہ می شوم و می خواہم کہ از تخت فرود آیم دوست و پائے ایشاں بوسم۔'' (ص 137)

''میں خداوند تعالیٰ کا کتنا شکر اس واقعہ پر ادا کروں کہ اس قسم کے مددگاروں اور پشت پناہوں سے اس نے میری یاوری فرمائی، جن میں ہر ایک مجھ سے کہیں بہتر ہے، پھر لوگ بادشاہوں کے عام رواج کے مطابق مرے آگے پیچھے چلتے ہیں اور (نذر وغیرہ) کے لیے مرے سامنے ہاتھ بڑھاتے ہیں اور دربار میں میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان لوگوں کی بزرگی اور سرداری کو دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے اور چاہتا ہوں کہ تخت سے اتر کر ان کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دوں۔''

عہد بلبن میں علماء کی آمد

پھر شمسی عہد کے بعد بلبن کے زمانہ میں بقول برنی ''چند بزرگ از بقایا بزرگان شمسی ماندہ بود۔'' ان ہی کو

روشناس کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چندیں علماء سرآمدہ کہ از نوادر استاداں بودند برصدر افادت سبق می گفتند چنانکہ مولانا برہان الدین بلخ، ومولانا برہان الدین بزاز، ومولانا نجم الدین دمشقی، ومولانا سراج الدین سنجری، ومولانا شرف الدین ولوالجی، وصدر جہاں منہاج الدین جرجانی، وقاضی رفیع الدین گازرونی، و قاضی شمس الدین مراجی، وقاضی رکن الدین سامانہ، وقاضی جلال الدین کاشانی، وقاضی جلال الدین کاشانی، وقاضی قطب الدین کاشانی، و پسر قاضی قطب کاشانی، وقاضی لشکر، وقاضی سدید الدین، و قاضی ظہیر الدین، وقاضی جلال الدین و چندیں استادان ومفتیان وسرامدگان کہ از شاگردان و پسران علماء عہد شمسی در گفتن سبق ونوشتن جواب فتویٰ معتبر بودند۔'' (ص 111)

''اتنے بڑے بڑے علماء کرام آئے کہ وہ سب بہترین اساتذہ فن تھے اور پڑھانے میں ماہر، جیسے مولانا برہان الدین بلخ، مولانا برہان الدین بزاز، مولانا نجم الدین دمشقی ومولانا سراج الدین سنجری ومولانا شرف الدین ولوالجی وصدر جہاں منہاج الدین جرجانی، وقاضی رفیع الدین گازرونی، وقاضی شمس الدین مراجی وقاضی رکن الدین وقاضی جلال الدین کاشانی، وقاضی قطب الدین کاشانی، و پسر قاضی قطب کاشانی، وقاضی لشکر وقاضی سدید الدین وقاضی ظہیر الدین وقاضی جلال الدین، اور ایسے باکمال اساتذہ اور مفتیان کرام جو عہد شمسی کے علماء کے شاگردوں اور لڑکوں میں سے پڑھانے اور فتویٰ دینے میں معتبر سمجھے جاتے تھے۔''

پھر بلبن ہی کے زمانہ کے صوفیہ ومشائخ کا ذکر کر کے آخر میں یہ لکھ کر کہ

''ہم چناں حکماء واطباء عہد بلبنی نظری خود نداشتند۔''

ایسے حکماء اور اطباء کہ عہد بلبنی میں ان کی نظیر نہ تھی۔''

ضیاء الدین نے چند سربرآوردہ اطباء کے نام بھی لیے ہیں مثلاً مولانا حمید الدین مطرز مولانا بدر الدین دمشقی کو پیش کرتے ہوئے سابق الذکر کی خصوصیت یہ بیان کی ہے۔''در نجوم وطب بقراط جالینوس عہد بود'' اور مولانا بدر الدین کے زہد وتقویٰ کی تعریف بھی طبی صداقت کے ساتھ بیان کی ہے۔

علم حدیث کی خدمت ہندوستان میں شاہ صاحب سے پہلے

پھر آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس ملک نے اسلام کی آمد کی پہلی صدی کے آغاز میں ایک نہیں متعدد معتبر کتابیں فن حدیث میں پیش کی ہوں، جن میں ایک بخاری کی شرح بھی ہے، اور ایک بخاری کی شرح نہیں۔ ''مصباح الدجیٰ''، ''مشارق (4) الانوار''، ''معرفۃ الصحابہ'' میں ''درۃ السحابہ'' یہ چار کتابیں دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی ہوں۔ کیا اسی ملک پر الزام لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں سے زمانہ تک تعلق نہیں رکھا۔ آخر میں نے جن کتابوں کا نام

اوپر درج کیا ہے کیا اہل علم نہیں جانتے کہ ان کے مصنف علامہ رضی الدین ابوالفضائل المشہور بہ حسن الصغانی الہندی ہیں۔
گھر کی مرغی کو آپ جو بھی سمجھ لیں لیکن السیوطی نے ''بغیۃ الوعاۃ'' میں لکھا ہے کہ

کان الیہ المنتھی فی اللغۃ

''اپنے زمانہ میں لغت کے فن کی انتہا ان ہی پر ہوئی تھی۔''

لغت کی مایہ ناز کتاب ایک ہندوستانی کے قلم سے

آج ساری دنیائے اسلام بلکہ یورپ کے مستشرقین کے ہاتھوں میں عربی لغت کی کتاب ''قاموس'' جو متداول ہے، کیا واقعی یہ مجد الدین (5) الفیروز آبادی کا کام ہے۔ اس فن کی کتابوں سے جو واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسی ہندوستان کے عالم رضی الدین العلامہ نے ''العباب'' کے نام سے جو کتاب لغت میں لکھنی شروع کی تھی اُسی کا اور ''المحکم'' کا خلاصہ فیروز آبادی نے کر دیا ہے۔ بیچارے ہندی عالم کا کام نامکمل رہ گیا، یعنی ''میم'' تک پہنچتے پہنچتے ممات ہوگئی، صرف چند حروف رہ گئے تھے، بس اسی کو ابن سیدہ کی ''المحکم'' سے لے کر صاحب ''قاموس'' نے خلاصہ کر دیا۔ صغانی کی کتاب رہ گئی اور فیروز آباد کا کام چل نکلا اور اسی لیے السیوطی کے اس دعوے کا تعلق کسی خاص ملک اور زمانہ سے نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام سے ہے۔ عربی زبان کے اس ہندی لغوی کے بعد جس نے جہاں کہیں بھی عربی لغت پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ایک لحاظ سے صغانی ہی کا زلہ رُبا ہے، ان ہی کی محنت وتلاش، تبحر واجتہاد کا رہین منت ہے۔

علامہ صغانی

حدیث میں بھی علامہ رضی الدین حسن صغانی کا جو مذاق تھا اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جو مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم نے اپنے ''طبقات الحنفیہ'' میں حدیث ہی کے متعلق ان کی دو تالیفات کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے یعنی:

ومن تصانیفہ رسالتان فیھما الاحادیث الموضوعۃ

''ان کی تصنیفات میں دو رسالے اور ہیں جن میں موضوع حدیثوں کو انہوں نے جمع کیا ہے۔
لکھا ہے۔''

ادرج فیھما اکثیراً من الاحادیث الموضوعۃ ذلک من المشددین کابن الجوزی.

''اس میں انہوں نے بہت سی حدیثوں کو موضوع احادیث کے ذیل میں درج کر دیا ہے
اسی لیے ان کا شمار سخت گیروں میں ہے جو ابن جوزی کا حال ہے کہ بخاری تک میں دو حدیثوں پر
ان کو وضع کا شبہ ہے۔''

علامہ سخاوی نے ''فتح المغیث'' میں بھی ان کی دونوں کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی تنقید میں ان کا معیار بہت سخت تھا۔ آخر تشدد میں جسے ابن جوزی کا مماثل خیال کیا جاتا ہو، جنہوں نے بیچارے امام بخاری کو

نہیں بخشا ہے اس کی تنقید کی معیاری بلندی کیا کم ہوسکتی ہے (6)۔ بہرحال رضی الدین صغانی تو اسلامی ممالک میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ان کی کتاب "مشارق" عام اسلامی ممالک میں مدت تک زیرِ درس رہی، لیکن دتی میں یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اس وقت یہی ایک ممتاز عالم تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء جن کا زمانہ صغانی کے قریب ہی قریب ہے، بلکہ لقاء ثابت نہ ہو تو معاصرت یقینی ہے۔ دتی کے علمی ماحول کے صغانی کے زمانہ میں کیا حالت تھی فرماتے ہیں کہ:

"دراں ایام در حضرت دہلی علماء کبار بودند باہمہ (صغانی) در علوم تساوی بود اما در علم حدیث از ہمہ ممتاز و ہیچ کس مقابل او نبود۔" (فوائد الفواد۔ ص 104)

"ان دنوں میں بڑے بڑے علماء دتی میں تھے جو علوم میں صغانی کے مساوی تھے، لیکن صغانی کو علم حدیث میں سب پر امتیاز حاصل تھا، اس علم میں ان کا مدِ مقابل کوئی دوسرا نہ تھا۔"

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ لغت وادب میں صغانی کے جوڑ کے لوگ دتی میں موجود تھے بلکہ یہ بھی کہ حدیث سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ بیگانہ تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے، البتہ صغانی کا ہم پلہ محدث کوئی نہ تھا۔

نظام الاولیاء کے عہد میں علمی ذوق

اور یہ رپورٹ تو ہندوستان میں اسلام کی پہلی صدی کے نصف کی ہے یعنی 650ھ جو صغانی کی وفات کا زمانہ ہے۔ اسی کے بعد حضرت نظام الاولیاءؒ کی عجیب وغریب خانقاہ قائم ہوتی ہے، جس میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا اجتماع ہوجاتا ہے۔ مجلس سماع کا ایک مجہول واقعہ تو وہ ہے جو عوام میں افسوس ہے کہ خواص میں بھی کلی نتائج کا ذمہ دار ہے لیکن ہم آپ کے سامنے ایک چشم دید شہادت اس عہد کی پیش کرتے ہیں۔ "سیر الاولیاء" حضرت سلطان جی کے حالات میں ایک معتبر کتاب ہے۔ اس کے مصنف امیر خورد کرمانی ہیں جنہوں نے خانقاہ نظامیہ کے علماء کی نگرانی میں تربیت وتعلیم حاصل کی ہے، اس لیے حضرت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے قریب قریب دیکھ کر لکھا ہے۔ اسی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ میر خورد نے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کی خانقاہ معارف پناہ میں جن علماء کا اس زمانہ میں اجتماع ہوگیا تھا، ان میں ایک مشہور عالم حضرت مولانا فخر الدین زراوی بھی ہیں۔ مدرسوں میں صرف کی ایک کتاب زراوی انہی کی طرف منسوب ہے، میر خورد کہتے ہیں کہ:

"والد کاتب ایں حروفؒ نزدیک خانہ سلطان المشائخ بکرایہ ستدہ بود و درس ساختہ و متعلمان خوب طبع را جمع گردانیدہ تا کاتب حروف چیزے بخواند۔" (سیر الاولیاء۔ ص 208)

"کاتب الحروف کے والد نے سلطان المشائخ کی خانقاہ کے نزدیک ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا، جہاں درس دیا کرتے تھے اور اچھے طلبہ کو جمع کرلیا تھا، تاکہ اس طرح کاتب الحروف کچھ پڑھ لے۔"

''ہدایہ'' کا درس

گویا میر خورد کے والد نے حضرت المشائخ کی خانقاہ سے متصل ایک چھوٹا سا مدرسہ (7) ہی قائم کر دیا تھا۔ اس مدرسہ میں خانقاہ کے علماء مختلف اوقات میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ آ کر درس دیا کرتے تھے۔ میر خورد کہتے ہیں کہ چاشت کی نماز کے بعد مولانا فخر الدین ہدایہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ جو خود ان کی آنکھوں کا دیکھا ہوا درج کرتے ہیں کہ مولانا حسب دستور ''ہدایہ'' پڑھا رہے تھے کہ:

''روزے آں عالم ربانی مولانا کمال الدین سامانی کہ از مشاہیر علمائے شہر بود بدیدن سلطان المشائخ آمد چوں از خدمت سلطان المشائخ بازگشت سبب فرط اتحاد یکہ بخدمت مولانا فخر الدین داشت دریں مجلس حاضر شد۔'' (سیر الاولیاء۔ ص 268)

''ایک دن عالم ربانی مولانا کمال الدین سامانی جو مشاہیر علماء میں تھے، سلطان المشائخ کی زیارت کو تشریف لائے، وہاں سے جب واپس ہوئے تو اس تعلق کی وجہ سے جو انہیں مولانا فخر الدین سے تھا، اس مجلس میں حاضر ہوئے۔''

یعنی کمال الدین سامانی کوئی غیر حنفی عالم تھے یا کیا قصہ تھا؟ اس لیے کہ اس زمانہ میں علماء احناف کے سوا اس ملک میں ''شوافع'' وغیرہ بھی موجود تھے۔ سلطان المشائخ کے زمانہ میں اودھ کے شیخ مولانا فرید الدین نامی بھی شافع المذہب مشہور عالم تھے، علاؤالدین نیلی ان ہی کے شاگرد تھے، ''اخبار الاخیار'' میں نیلی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

''پیش مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود کشاف خواند۔'' (ص 93)

''مولانا فرید الدین شافعیؒ سے جو اودھ کے شیخ الاسلام تھے تفسیر کشاف پڑھی۔''

صاحب ''سیر الاولیاء'' نے بھی ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ:

''درحیات سلطان المشائخ دانشمندے (عالمے) بغدادی مالکی مذہب درغیاث پور رسید۔''

(سیر الاولیاء۔ ص 226)

''سلطان المشائخ کی زندگی میں ایک بغدادی مالکی المذہب عالم غیاث پور تشریف لائے۔''

درس ''ہدایہ'' میں ''صحیحین'' سے استدلال

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی علماء کے سوا دوسرے مذاہب کے علماء سے ہندوستان بالکلیہ خالی نہ تھا۔ بہر حال کوئی وجہ ہوئی ہو، مولانا کمال الدین کو دیکھ کر ہدایہ پڑھانے کا طریقہ مولانا فخر الدین نے عجیب طریقہ سے بدل دیا۔ میر خورد لکھتے ہیں کہ:

''چوں خدمت مولانا کمال الدین ویدا حادیث تمسکات ہدایہ راترک دادہ۔''

(سیر۔ص93)

''جب مولانا کمال الدین کی خدمت دیکھی، ''ہدایہ'' کی حدیثوں سے استدلال ترک کر دیا۔''

یعنی حنفی مذہب کے مسائل کی تائید میں صاحب ''ہدایہ'' جن حدیثوں کو عموماً پیش کرتے ہیں، مولانا فخر الدین نے ان حدیثوں سے استدلال کرنا ترک کر دیا۔ پھر کیا کرنے لگے، جس ملک کو خود اسی ملک کے رہنے والے آج جہل و نادانی کے الزام سے رسوا کر رہے ہیں، اسی ملک میں آج سے چھ سو سال پہلے یہ تماشا دیکھا جارہا تھا کہ:

''تمسکات ہدایہ ترک دادہ باحادیث صحیحین تمسک می داد۔''

''ہدایہ کی حدیثیں چھوڑ کر صحیحین کی حدیثوں سے استدلال فرمانے لگے۔''

سمجھ رہے ہیں، مولانا فخر الدین نے بغیر کسی سابقہ تیاری کے اچانک ایک مقام سے جہاں سبق ہو رہا تھا، یہ رنگ بدلا کہ صاحب ''ہدایہ'' کی پیش کردہ دلیلوں کو چھوڑ کر حنفی نقطۂ نظر کی تائید میں ''صحیحین'' کی حدیثیں پیش کرنی شروع کر دیں۔ آج کہا جاتا ہے کہ ''ہدایہ'' کی جن حدیثوں کے نیچے ارباب حاشیہ ''غریب جداً'' ''نادر اجداً'' کے الفاظ لکھ کر دیا کرتے ہیں۔ یہ غرابت وندرت صرف لفظی حد تک ہے، ورنہ اگر الفاظ سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان ہی حدیثوں کے مفہوم اور مفاد کو اکثر و بیش تر صحاح کی حدیثوں کے الفاظ سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثری حیثیت سے یہ دعویٰ صحیح ہے، لیکن میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی ہندوستان کے مدعیانِ حدیث دانی میں کوئی ہستی ایسی ہوگی جس کے سامنے ''ہدایہ'' پیش کیا جائے اور بغیر کسی سابقہ تیاری کے وہ ''ہدایہ'' کے الفاظ کو چھوڑ کر اس کے مفاد کو صحاح کی حدیثوں سے ثابت کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ الا ماشاء اللہ۔

مسئلہ سماع پر بحث

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی کے نصف اوّل میں اگر حسن صغانی نے دلّی میں حدیث کے بازار کو رونق دے رکھی تھی، تو اسی صدی کے دوسرے نصف میں مولانا فخر الدین زرادی جیسے محدث جلیل یہاں موجود تھے۔ اسی سماع کی مجلس مناظرہ کے قصہ کو میر خورد نے بھی بیان کیا ہے لیکن کیا بیان کیا ہے؟ کیا یہ کہ امام غزالی کے قول کو ہندوستانی مولویوں کا معصوم گروہ حدیث قرار دے کر جواز سماع پر اس سے استدلال کر رہا تھا اور جو حرمت کے قائل تھے، ان میں بھی کسی کے پاس اتنا علم بھی موجود نہ تھا کہ اس قول کے حدیث ہونے کی غلطی کا ازالہ کر سکے، بلکہ جواب میں کہا تو یہ کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ اصل قصہ کی تفصیل تو آئندہ معلوم ہوگی۔ مجھے صرف مولانا فخر الدین کے اس تبحر اور وسعت نظر کا ثبوت پیش کرنا ہے جو علم حدیث میں انہیں حاصل تھا۔ میر خورد نے لکھا کہ بحث کی ابتداء کرتے ہوئے:

''روئے مبارک بجانب علماء شہر کردہ ایں سخن گفت کہ شما از دو جنسہ یک جنسہ گیرید گر جنسہ حرمت گیرید حل ثابت کنم واگر جنسہ حال گیرید حرمت ثابت کنم۔'' (ص268)

''علماء شہر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ دو پہلوؤں میں ایک پہلو اختیار فرمالیں، اگر حرمت کا پہلو اختیار کریں، حلت ثابت کروں اور اگر حلت کا پہلو اختیار کریں، حرمت ثابت کروں۔''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مولانا کے پاس دعوے کے دونوں پہلوؤں حلت و حرمت کے متعلق دلائل کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں نیز ان کے وسیع مباحث کا جن لوگوں کو صحیح علم ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا فخر الدین جو کچھ فرمارہے تھے یقیناً ایک متجر عالم ہی یہ کرسکتا ہے کیونکہ گفتگو مطلق سماع میں ہورہی تھی نہ کہ مزامیر کے ساتھ۔ جیسا آئندہ معلوم ہوگا، اس کے مخالف تو سلطان المشائخ خود ہی تھے۔

سلطان جی اور حدیث

اب نہ جاننے والوں سے کیا کہا جائے، خود سلطان المشائخ جن کے متعلق ''بجوز لابلہ'' والا لطیفہ مشہور کیا گیا ہے گو ظاہر ہے کہ ان کا مشغلہ نہ درس و تدریس کا تھا اور نہ تصنیف و تالیف کا، لیکن میر خورد جوان کے دیکھنے والے ہیں، ان ہی کا بیان ہے کہ حدیث کا وہی مجموعہ جس میں دو ہزار دو سو چھیالیس بحذف استاد علامہ صغانی نے صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیثیں جمع کی ہیں، یہ مجموعہ حضرت نظام الاولیاء نے صرف پڑھا نہیں تھا، بلکہ:

''مشارق الانوار را یاد گرفت۔'' (سیر الاولیاء۔ص101)

''مشارق الانوار فرمالیا۔''

یعنی سلطان جی کو بخاری و مسلم کی دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ اِس زمانہ میں بھی ہندوستان کا کوئی ممتاز محدث یا عالم پایا جاتا ہوگا، جسے بخاری و مسلم کی اتنی حدیثیں زبانی یاد ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اس مجموعہ کو یاد کیا تھا، بلکہ ان کی سند بھی میر خورد نے نقل کی ہے۔ ان کے استاد مولانا کمال الدین سند میں یہ ارقام فرمانے کے بعد:

بان قرء هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على ساطر هذه السطور

''صحیحین (بخاری و مسلم) سے حدیثوں کا یہ مجموعہ اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کو (سلطان جی) نے ان سطروں کے لکھنے والے پڑھا۔''

یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ:

قراة بحث واتقان و تنقيح معانيه و تنقير مبانيه

''یہ پڑھائی ان کو اس طریقہ سے ہوئی کہ کامل بحث و تحقیق، استواری و اتفاق کی پابندی کی گئی، حدیثوں کے معانی کی تنقیح کی گئی اور ان کی بنیادوں کو کھود کھود کر ظاہر کیا گیا۔''

ہندوستان میں علم حدیث

علم حدیث کے ساتھ ہندی اسلام کی پہلی صدی میں دلّی کے علمی حلقوں کی دلچسپیوں کا جو حال تھا اس کا اندازہ ان چند نمونوں سے بآسانی ہوسکتا ہے اور یہ میں نے چند اجمالی اشارے کیے ہیں ورنہ اس صدی کے متعلقہ معلومات جو اِدھر اُدھر کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اگر انہیں سمیٹا جائے تو اچھا خاصا رسالہ بن جائے۔ میں نے قصداً حضرت سلطان المشائخ ہی کے متعلق بعض چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ ان ہی مبارک ذات کو اکثر دیکھتا ہوں کہ ''نام نیکو رفتگاں'' کی بربادی کے جو درپے ہیں عموماً اس سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں۔ مغالطہ کی وجہ شاید حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ بھی ہے جو''فوائد الفواد'' کے نام سے مشہور ہے، گویا لوگ اس کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ کسی نے قصدوارادہ کے ساتھ تصنیف کے لیے قلم اٹھایا ہو، حالانکہ اپنی مجلسوں میں آئندوروند کے سامنے مختلف اوقات میں جو آپ گفتگو فرماتے تھے امیر حسن علاء سجزی نے ان ہی کو قلمبند کرلیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی اس قسم کی گفتگو میں ہر طرح کی باتیں کرتا ہے۔ فضائل اعمال وغیرہ جن کے متعلق آج ہی نہیں ہمیشہ سے محدثین کو شکایت ہے کہ لوگوں میں ضعیف روایتیں مروج ہوگئی ہیں، اس قسم کی حدیثوں کا تذکرہ ان کی مجلس میں آجاتا تھا۔ بسا اوقات آپ ٹوک بھی دیتے تھے۔ اور فرماتے کہ ''ایں قول مشائخ است۔'' یعنی حدیث نہیں بزرگوں کا قول ہے۔ ''فوائد الفواد'' میں ہی اس قسم کے الفاظ متعدد مقامات میں ملیں گے۔ کبھی پوچھنے والوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''ایں حدیث در کتب احادیث کہ مشہور است ومعتبر نیامدہ۔'' (فوائد۔ ص233) حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہوتا تو آپ فرماتے:

''انچہ در صحیحین اس آں صحیح باشد۔'' (ص103)

''جو کچھ صحیحین میں ہے، وہ درست ہوگا۔''

سلطان المشائخ اور حدیث

ایک اور مسئلہ اس سلسلے میں یعنی اس کے اکابر کے کلام میں جو حدیثیں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق یہ خیال کرلینا کہ باضابطہ فن اصولِ حدیث کی انہوں نے تنقیح فرمائی تھی، ان کے مشاغل کے لحاظ سے غالباً صحیح بھی نہ ہوگا۔ بسا اوقات یہ صورت پیش آئی ہے کہ معتبر عالم مثلاً اپنے کسی اُستاد سے انہوں نے طالب علمی میں کوئی حدیث سُنی، استاد جب صاحب کمال ہو تو قدرتاً آدمی اس پر اعتماد کرتا ہے اور اسی اعتماد کی بنیاد پر ان کی کہی ہوئی باتوں کا گفتگو میں ذکر کردیتا ہے، مثلاً سلطان المشائخ ہی کو دیکھیے۔ ایک دفعہ اپنی مجلس میں ایک حدیث کا آپ نے ذکر کیا۔ کسی پوچھنے والے نے حدیث کی صحت وضعف کے متعلق سوال کیا، اس وقت آپ نے جواب میں فرمایا:

''من ایں در کتابے ندیدہ ام از مولانا علاء الدین اصولی کہ استاد من بود در بداؤں شنیدم۔''

(فوائد۔ ص265)

''میں نے یہ حدیث کسی کتاب میں نہیں دیکھی ہے، اپنے استاذ محترم مولانا علاء الدین اصول سے بداؤں سُنی ہے۔''

مولانا علاء الدین ایک صاحب تقویٰ، صاحب علم ودیانت بزرگ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے استادوں کی بات اگر عام گفتگو میں کوئی نقل کردے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے نقل کرنیوالے کے متعلق اس قسم کی رائیں قائم کی جائیں، جن کا تماشا اس زمانہ میں ہم کررہے ہیں، بلکہ میں تو اس قسم کی حدیثوں کا الزام خود محدثین کے ایک طبقہ پر عائد کرتا ہوں، حالانکہ ان کا پیشہ ہی زندگی بھر علم حدیث کی خدمت تھا، مگر باوجود اس کی تیسری اور چوتھی صدی میں محدثین کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے انتہائی بے احتیاطیوں سے کام لے کر اپنی کتابوں میں رطب ویابس ہر قسم کی حدیثیں بھر دیں۔ بیچارے امام غزالی اور اسی قسم کے بعض ائمہ کو ان ہی متاخرین محدثین کی وجہ سے بدنام ہونا پڑا اور دوسروں نے یہ دیکھ کر کہ امام حجۃ الاسلام کی کتاب میں یہ حدیث موجود ہے، ان پر بھروسہ کرکے تذکرہ میں یا خطوط میں اُسے نقل کردیا۔

علم حدیث کی اہمیت اور اس پر رائے زنی میں احتیاط

خلاصہ یہ ہے کہ اکابر صوفیہ کے کلام میں ایسی حدیثیں اگر کبھی نظر آئیں تو میرے نزدیک اس باب میں ان کا مطعون ٹھہرانے میں عجلت نہ کرنی چاہیے۔ ان کی معذوریوں کو بھی سامنے رکھ کر رائے قائم کرلینی چاہیے، بلکہ اسی کے ساتھ مجھے تو اس زمانے کے لوگوں کی یہ عام عادت کہ اِدھر کان میں حدیث پڑی اور ذرا سی غرابت یا اجنبیت اس میں محسوس ہوئی، بے تحاشا قہقہے لگا کر غلط ہے، بے اصل ہے، موضوع ہے، قصاصوں کی روایتیں ہیں، یہ طریقہ علمی سنجیدگی سے بھی بعید ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ حدیثوں پر قطعی وضع واختلاق کا حکم لگانا قریب قریب اسی قدر دشوار ہے، جتنا کہ کسی حدیث کی صحت کی قطعیت کا فیصلہ۔

ایسی حدیثیں جو عام متداول کتابوں میں نہ ملتی ہوں، یا ان میں موجود ہوں لیکن آپ کے حافظہ میں موجود نہ ہوں یا لفظاً نہیں بلکہ مفاداً موجود ہوں اور آپ کی نظر اس مفاد یا نتیجہ پر نہ پہنچی ہو، جب آئے دن حدیثوں کے متعلق یہ تجربات ہوتے رہتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایسی صورت میں ایک سنجیدہ رائے ایسی حدیثوں کے سننے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتی ہے جیسا کہ سلطان المشائخ نے ایک دن فرمایا:

''حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ ایں حدیثِ رسول نیست، اما ایں تواں گفت کہ در کتبے کہ ایں احادیث جمع کردہ اند واعتبار یافتہ اند نیامدہ۔'' (فوائد۔ ص 233)

''لوگ جو احادیث سنیں، ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حدیث رسولؐ نہیں ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کی جن کتابوں میں یہ ہیں، وہ کتابیں قابلِ اعتبار نہیں۔''

بلکہ بسا اوقات اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ حدیث صحاح ہی میں موجود تھی، لیکن روایت کرنیوالے نے جو مطلب اس سے پیدا کرکے آنحضرتؐ کی طرف اپنے الفاظ میں منسوب کیا تھا، اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں گیا تھا۔

حدیث کے سلسلہ میں بڑھی ہوئی جرأتیں

ابھی ''ہدایہ'' کی حدیثوں کا ذکر گذر چکا کہ ''ہدایہ'' کی جن حدیثوں پر لوگوں نے ندرت اور غرابت کا حکم لگایا ہے، لفظاً یہ حکم صحیح ہو تو ہو لیکن معناً قاطبۃً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو سلطان المشائخ کی یہ محتاط اور سنجیدہ رائے اب بھی ان لوگوں کے لیے قابلِ غور ہے، جنھوں نے اپنے لفظی شقشقوں اور بقبقوں سے کانوں کو گھائل کر رکھا ہے۔ ان ہی بے احتیاطیوں اور ذمہ داریوں کے احساس کی کمی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بالآخر بے ادبوں، بے باکوں کا ایک گروہ، ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان بیچارے صوفیہ ہی کیا خود بخاری و مسلم کی حدیثوں کے مقابلہ میں العیاذ باللہ خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کیا کہیے، شقاوتیں اور بدبختیاں تو اب آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پیغمبر کے کلام کو پیغمبر ہی کا کلام مان کر مدعیانِ اسلام کا ایک گروہ اس کی تعمیل اپنے لیے غیر ضروری ٹھہرا رہا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جب واقعی علم و معرفت والوں کی طرف سے نیم بیضہ کی ستم رانی روا رکھی جائے گی تو مسکینوں کے جس گروہ کی ساری پونجی اُردو ترجموں کی وہ کتابیں ہیں جن کی سو باتوں میں سے بہ مشکل دس باتیں وہ سمجھ سکتا ہے، وہ اپنی اس عداوت میں اندھا ہو کر جو قدرتاً جہل کو علم کے ساتھ ہے۔ ''ہزار مرغ بہ ہیچ'' پر جری نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ عالم کا علم بہر حال حقیقت سے دور ہونے میں عالم سے مزاحمت کرتا ہے، لیکن جن کی باگ صرف جہل کے ہاتھوں میں ہو، ان بیچاروں کو کون تھام سکتا ہے۔

علم حدیث کا ادب

بہر حال اس زمانہ میں لوگ دین کی مصلحت جس چیز میں بھی سمجھیں، لیکن علم اور دین جن سے منتقل ہو کر ہم تک وراثۃً پہنچا ہے، ان بزرگوں کو تو ہم پاتے ہیں کہ موضوع سے موضوع جعلی حدیث جس کا جعلی ہونا اجلی البدیہیات میں ہوتا تھا، یونہی آدمی یقین کر سکتا ہے کہ وہ قطعاً بے بنیاد ہے، ملاحظہ فرمائیے حضرت سلطان المشائخ اس کو بھی موضوع ہی قرار دیتے ہیں، مگر کس لب و لہجہ میں۔ ایک شخص مجلسِ مبارک میں حاضر ہوتا ہے، پوچھتا ہے۔

> ''از بعضے علویاں (شیعہ) شنیدہ شدہ است کہ حضرت مصطفےؐ خطے نوشتہ بود کہ فرزندان من بعد از من مسلمانان را اگر خواہند بفروشند ابوبکر یا عمر خطابؓ پارہ کردند۔ ایں راست است؟''
>
> ''بعض شیعوں سے سنا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے تحریر فرمایا تھا کہ ہمارے لڑکے اگر چاہیں، ہمارے بعد مسلمان کو بیچ دیں، اس تحریر کو حضرت ابوبکر اور عمر بن الخطاب نے چاک کر دیا، کیا شیعوں کی یہ روایت درست ہے؟''

آنحضرتؐ کا یہ فرمان اپنے فرزندوں (جن کی برہمنیت توڑنے کے لیے حضورؐ نے آلِ ہاشم پر بھکشا اور دان یعنی صدقہ حرام فرما دیا ہے) ان ہی فرزندوں کو برہمنیت کبریٰ کا یہ مقام عطا کرنا کہ مسلمانوں کو بیچ کر چاہیں تو اپنی ضرورت

پوری کر سکتے ہیں۔ جس قسم کی بات ہو سکتی ہے ظاہر ہے، غالباً خود علماء شیعہ بھی اس کو موضوع ہی سمجھتے ہوں گے (8)۔ اتنی کھلی ہوئی واضح موضوع حدیث ہے مگر سلطان المشائخ سائل کو جواب دیتے ہیں۔

''خیز ایں معنی در ہیچ کتابے نیامدہ است اما عزیز داشتن ایشاں و گرامی داشتن فرزندانِ رسول اللہؐ واجب است۔''

''اس معنی کی حدیث کسی کتاب میں نہیں ہے لیکن ان لوگوں کو عزیز رکھنا اور فرزندان رسولؐ کی توقیر واجب ہے۔''

بہر حال اس زمانہ میں حدیثوں پر حکم لگانے کا جو طریقہ تھا اُس کی مثال پیش کرنی تھی۔

سلطان المشائخ کا مقام

خیال گذرتا ہے کہ شاید ان بزرگوں کی نظر ان چیزوں پر نہ تھی، جن کی بنیاد آج لمبے چوڑے دعوے کیے جاتے ہیں۔ میں سلطان المشائخ کی سوانح عمری اس وقت نہیں بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ دکھاتا کہ حدیث اور فقہ کے جوہری اور اساسی حقائق پر ان کی کتنی گہری نظر تھی، خصوصاً حنفی فقہ کا حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو تعلق ہے، اور ابن مسعود کا جو خاص طریقہ روایت کرنے میں تھا یعنی آنحضرتؐ کی طرف منسوب کر کے وہ بہت کم حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، مرسل اور متصل کی صحت اور عدم صحت کے عالمانہ مباحث اس سلسلے میں جو پائے جاتے ہیں، اسی عام مجلس میں باتوں ہی باتوں میں ان امور کی طرف وہ عمیق اور گہرے اشارے کرتے چلے گئے ہیں، حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ نہ ان کا پیشہ تھا اور نہ ان کا کاروبار، خدا نے ان کو جس کام کے لیے پیدا کیا تھا، وہی کام اتنا اہم تھا جس کی مشغولیت ان کو ان ذہنی اور علمی مباحث میں مشتغل ہونے کا وقت ہی کب دیتی تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ عالم ہونا محدث ہونا مفسر ہونا تو آسان ہے اور بکثرت تھوڑی بہت محنت سے لوگ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہو ہی رہے ہیں، یورپ نے تو ان علوم کی مہارت کے لیے اسلام کی بھی شرط باقی نہیں رکھی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علم کا تعلق راست مطالعہ سے ہے۔ دین و بے دینی کو اس میں چنداں دخل نہیں۔ لیکن عالم نہیں، عالم گر، فقیہہ نہیں فقیہہ ساز ہونا آسان نہیں ہے۔ ایسے نفوسِ طیبہ لاکھوں اور کروڑوں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جنہیں خدا ولی ہی نہیں ولی ساز تراش بنا کر پیدا کرتا ہے۔ ان کی صحبت میں حیوان انسان بنتے تھے اور انسانیت سے بھی اعلیٰ مقام حاصل کرتے تھے، بشرطیکہ انسانیت سے کوئی اونچا مقام ہو بھی، ہم میں آج کتنے ہیں جنہیں خود اپنے آپ کو بھی واقعی مسلم اور مومن بنانے میں کامیابی ہوئی ہے، عمر گذرتی چلی جاتی ہے۔ معلومات کا ذخیرہ دماغ میں بھرا چلا جاتا ہے، لیکن بجائے دماغ کے ہمارے دلوں کا آپریشن کیا جائے تب پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں شکوک و شبہات و وساوس واوہام کی کتنی چنگاریاں چھپی ہیں۔ کیسی چنگاریاں جنہیں موقع ملتا ہے تو العیاذ باللہ آن کی آن میں ایمانی زندگی کے سارے سرمایہ کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہیں، خیال کرنے کی بات ہے، ان لوگوں کا مقابلہ ان بزرگوں سے کوئی معنی رکھتا ہے جن کے ایک ایک خادم نے زمین کے بڑے بڑے علاقوں کو ایمان و اسلام، ایقان و سکینت کی دولت سے بھر دیا ہے۔ آج دریائے تاپتی کے کنارے مسلمانوں کا وہ عظیم

مرکزی شہر بُرہان پور، جس کے در و دیوار شکستہ اس کے کھنڈر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ حضرت نظام الاولیاء کے صفِ نعال سے اٹھنے والے ایک بزرگ حضرت برہان الدین غریب نے اسی اُجڑے ہوئے مقام کو سرزمین دکن میں ایمان کی روشنی پھیلانے کا مرکز بنایا تھا، خود اس شہر کا نام "بُرہان پور" ان ہی کے اسم گرامی کی یادگار ہے، شیخ محدث لکھتے ہیں:

"وایں برہان پور کہ شہرے مشہور است بنام شیخ آباداں ست۔" (اخبار الاخیار۔ ص94)

"یہ مشہور شہر بُرہان پور شیخ کے نام پر آباد ہے۔"

اخی سراج الدین اور خدمتِ دین

آج بنگال کے تین کروڑ مسلمانوں پر مسلمانوں کو ناز ہے کہ اتنی بڑی آبادی کسی خالص اسلامی واحد ملک کی بھی نہیں ہے، لیکن غریب الدیار اسلام نے اس ملک میں جب قدم رکھا تھا، تو لوگوں کو کیا معلوم کہ اس کی پالکی کو کندھا دینے والے کون کون لوگ تھے، ایک لڑکا۔

"ہنوز موئے ریش آغاز نہ شدہ بود در حلقۂ ارادت شیخ در آمدہ بود، ودر سلک خدمت گاراں پرورش یافتہ۔" (اخبار۔ ص86)

"ابھی سبزہ بھی نہ آیا تھا کہ شیخ کے ارادت مندوں میں داخل ہو چکے تھے اور خدمت گاروں سے منسلک ہو کر پرورش پانے لگے تھے۔"

سلکِ خدمتگاراں میں اسی پرورش پانے والے لڑکے کا نام بعد کو اخی سراج الدین عثمان ہوا، جس نے نظام الاولیاء کی خانقاہ سے نکل کر سارے بنگال میں آگ لگا دی۔ ایمان و عرفان کا چراغ روشن کر دیا۔ پنڈوہ کے علاء الحق والدین جن کا آج سارا بنگال معتقد ہے، ان ہی اخی سراج عثمانؒ کے تراشیدہ ہیں، اُف جس ذاتِ ہمایونی نے اپنی ایک ذات قدسی صفات سے ایسے ایسے "مردان راہ" پیدا کیے جن سے خدا ہی جانتا ہے کہ نسل انسانی کی کتنی تعداد جو اپنے مالک سے بچھڑی ہوئی تھی، پھر اسی آستانہ پر پہنچ گئی۔ میرا دماغ ان لوگوں پر کھولنے لگتا ہے جو شاید خود اپنی ایک ذات کو بھی مسلمان بنانے میں جیسا کہ چاہیے کامیاب نہیں ہوئے جس کا احساس دوسروں سے زیادہ خود اُنہی کو ہوگا، آج اُنہی کی دراز زبانیں ان بزرگوں پر کھل رہی ہیں، ان کے قلم کی تیز نوک ان کی پاکیوں کو مجروح کر رہی ہے، جن کے طفیل میں خدا ہی جانتا ہے کتنوں کو پاکی میسر آئی۔ ایک سلطان المشائخ ہی کی ذات ہے۔ بنگال اور دکن کے سوا "آئینِ اکبری" کی گویا شاہی رپورٹ ان کے متعلق جو درج ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں میں سے ایک ایک نے کیا کیا ہے اور اپنے محبوب رسول اللہ کے پیغام اور دین کو دنیا کے کن کن گوشوں تک پہنچانے میں وہ کامیاب ہوا ہے۔

سلطان المشائخ کے تربیت یافتہ مشائخ

سلطان المشائخ کے نمائندے سرزمین ہند کے کن کن علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں:

''شیخ نصیرالدین چراغ دہلی، امیر خسرو، شیخ علاء الحق، شیخ اخی سراج الدین در بنگالہ، شیخ وجیہہ الدین یوسف در چندیری، شیخ یعقوب و شیخ کمال در مالوہ، مولانا غیاث در دھار، مولانا مغیث در اجین، شیخ حسام در گجرات، شیخ برہان الدین غریب، شیخ منتخب، خواجہ حسن در دکھن۔''

(آئینِ اکبری۔ص170)

دیکھ رہے ہیں، دین کے اس نیر تاباں کی کرنوں کو دیکھ رہے ہیں، دلّی کے اُفق سے طلوع ہو کر اس نے اپنی روح پرور اور جاں آفریں شعاعیں کہاں کہاں پہنچائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بزرگوں کا یہ گروہ جن جن علاقوں میں پہنچا ہے اپنے ساتھ وہ علم کی دولت کو بھی لے گیا ہے۔ ان میں ہر بزرگ اس کا مستحق ہے کہ ان کے دینی خدمات اور علمی مجاہدات پر الگ الگ کتابیں لکھی جائیں۔ میری بحث دراصل علم حدیث کے متعلق ہو رہی تھی۔ حدیثوں کے متعلق ہندوستان کے بزرگوں کا جو طرزِ عمل تھا۔ اس کی چند مثالیں پیش کر رہا تھا۔

ہندوستان میں خدمت حدیث

بہرحال سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں کی طرف سے ہندوستان پر علم حدیث کے متعلق آج الزام لگایا جا رہا ہے، وہ چاہتے کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہندوستان جہاں صحیح معنوں میں اسلام ساتویں صدی کے آغاز میں داخل ہوا، وہ چاہتے ہیں کہ زُہری اور امام مالک، امام بخاری، ترمذی وغیرہ کی طرح حدیث کی تدوین میں حصہ لیتا؟ اسماء الرجال کا فن مرتب کرتا، خیال کرنے کی بات ہے کہ اس کام کی تو نوعیت ہی ایسی تھی کہ بجز ان ملکوں کے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہنچ گیا، دوسرے ممالک جو صدیوں بعد اسلام کے وطن بنے ان کو حصّہ لینے کا موقع ہی کیا تھا۔ یہ سعادت تو انہی بزرگوں کے لیے مخصوص تھی جو اسلام کے قدیم اوطان میں پیدا ہوئے۔ البتہ اس کے بعد حدیث میں کام کرنے کی جو راہ باقی رہ گئی تھی یا اب بھی کھلی ہوئی ہے وہ اس علم کی تعلیم و تدریس، تشریح و تنقیح، نشر و اشاعت ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیے تو کس زمانہ میں ہندوستان کا قدم پیچھے رہا ہے۔ اسلام کی پہلی صدی جو ہندوستان میں تھی، اس میں گذر چکا کہ ہندوستان ہی کے ایک عالم نے پایۂ تخت خلافت میں درس کے لیے صحیحین کی حدیثوں کا مجموعہ پیش کیا جو صدیوں تقریباً اکثر اسلامی ممالک میں درسی نصاب میں شریک رہا۔ میری مراد حسن صغانی کی ''مشارق'' سے ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر گذر چکا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران، ترکی، مصر، شام ہر جگہ کے علماء کو ہم دیکھتے ہیں کہ ''مشارق'' کی شرح لکھ رہے ہیں۔ جب ہندوستان کی ان ہی صدیوں میں اس مجموعہ کے زبانی یاد کرنے کا رواج تھا تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ ہندوستان میں ''صحیحین'' کی دو دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پائے جاتے تھے۔ گذر چکا کہ سلطان المشائخ کا شمار بھی ان ہی حفاظ میں ہے۔

بخاری کے حافظ ہندوستان میں

''یادِ ایام'' میں مولانا عبدالحی مرحوم سابق (9) ناظم ندوۃ العلماء نے نقل فرمایا ہے کہ اسی ہندوستان میں مولانا

عبدالملک عباسی تھی جن کے متعلق کہا جاتا ہے:

كان حافظا للقران و صحيح البخاری لفظا و معنا و كان يدرس عن ظهر قلبه.

''وہ قرآن کے حافظ تھے اور صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی الفاظ بھی اور اس کے مطالب بھی اور صحیح بخاری کا درس زبانی دیتے تھے۔''

آپ سُن چکے کہ ان ہی پرانے دنوں میں مولانا فخرالدین زراوی جیسے محدثین اس ملک میں موجود تھے جن کی فنی مہارت کا یہ حال تھا کہ سابقہ تیاری کے بغیر ''ہدایہ'' کی حدیثوں کی جگہ صحیحین کی حدیثوں سے حنفی مذہب کے مسائل کو حل کر سکتے تھے۔

حافظ مشکوٰۃ شریف ہندوستان میں

ان ہی دنوں میں جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان فن حدیث سے بیگانہ تھا، صحاح ستہ کا وہ ضخیم مجموعہ مشکوٰۃ جس میں صحاح کے سوا حدیث کی دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی جمع ہیں زبانی یاد کرنے والے لوگ موجود تھے۔ ''تذکرۂ علماء ہند'' میں بابا داوٗد مشکوٰتی کے ذکر میں ہے:

''درفقہ وحدیث وتفسیر وحکمت ومعانی ید طولیٰ داشت وحافظ مشکوٰۃ المصابیح بود بدیں وجہ اورا مشکوٰتی می گفتند۔'' (ص 60)

''فقہ، حدیث، تفسیر اور حکمت ومعانی میں کمال رکھتے تھے، اور مشکوٰۃ شریف کے حافظ تھے، اسی وجہ سے ان کا لقب ''مشکوٰتی'' ہو گیا۔''

ستر ہزار حدیثوں کا حافظ ہندوستان میں

صاحب ''الیانع الجنی'' نے حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ محمد فرخؒ کے متعلق لکھا ہے:

كان يحفظ سبعين الف حديث متنا و اسناداً جرحاً تعديلا۔ (ص 66)

''ان کو ستر ہزار حدیثیں متن اور سند کے ساتھ اس طور پر یاد تھیں کہ ہر ایک سند کے رواۃ کے متعلق جرح وتعدیل کے اعتبار سے جو مباحث ہیں وہ بھی زبانی یاد تھے۔''

بہار میں بخاری ومسلم کا حافظ

پھلواری شریف (بہار) کے مشہور علمی ودینی مرکز میں مسلسل تین چار سو سال تک علم حدیث کے درس وتدریس کا باضابطہ سلسلہ جاری رہا۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک تلمیذ رشید مجاز فی الحدیث مولانا ابوسعید ظہور الحق قدس سرہ العزیز گذرے ہیں، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ بخاری ومسلم زبانی یاد تھی، نیز حصن حصین بھی۔ اسی کے ساتھ مولانا ظہور الحق کی ''توہمات الفلاسفہ'' اور ''الاعیان فی المنطق'' کے متون کا جنھوں نے مطالعہ کیا ہے

وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عقلیات میں بھی ان کا پایہ کتنا بلند تھا۔ افسوس ہے کہ پھر دونوں قیمتی متن زیورِ طبع سے اب تک محروم ہیں۔ مولانا ظہور الحق کو صحیحین زبانی یاد تھی۔ اس کا تذکرہ مولانا عبدالغنی ندوی پھلواری نے اپنے اس مقالہ میں کیا ہے جو ''معارف'' مئی 1929ء میں چھپا تھا۔

حفاظِ حدیث ہندوستان میں

تیرہویں صدی کے آخر میں مولانا رحمت اللہ الہ آبادی ایک محدث تھے جن کے متعلق لکھا ہے: ''کتب صحاح ستہ برزبان داشت'' (تذکرۂ علماء۔ ص 62) اور مولانا قادر بخش سہسرامی کے دیکھنے والے تو شاید اب بھی موجود ہوں گے جو صحاح کے ورق کے ورق زبانی سناتے چلے جاتے تھے۔ بخاری کی حدیثیں سند کے ساتھ بیان کر کے فتح الباری، عینی وغیرہ شروح کی عبارتیں تک مولانا زبانی سناتے تھے۔

الغرض اوّل سے لے کر آخر تک ایک طبقہ ہندوستان میں ہمیشہ پایا گیا جسے ہم حفاظِ حدیث میں شمار کر سکتے ہیں۔

حدیث کی خدمت کی ایک شکل درس و تدریس کی ہو سکتی تھی، سو اس کا حال یہ ہے کہ دلی کو جن دنوں اسلامی حکومت کے پایۂ تخت ہونے کی سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی، یعنی پانچویں صدی کی ابتداء تھی، آپ کو لاہور میں شیخ اسماعیل محدث نشرِ حدیث میں مشغول نظر آئیں گے۔ تذکرہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ:

''شیخ اسماعیل از عظمائے محدثین و مفسرین بود۔''

''شیخ اسماعیل کبارِ محدثین و مفسرین میں تھے۔''

لکھا ہے کہ:

''در اول کے علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آوردہ۔''

''یہ پہلے شخص ہیں، جو علم حدیث و تفسیر لاہور لائے۔''

شیخ اسماعیل کا ایک بڑا کام یہ بھی تھا کہ:

''ہزار ہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند۔''

''ہزاروں انسان ان کی مجلس میں مشرف باسلام ہوئے۔''

جانتے ہیں ان کی وفات کس سنہ میں ہوئی ہے:

''در سال چہار صد و چہل و ہشت ہجری در لاہور در گذشت۔'' (ص 23)

''448ھ میں لاہور میں انتقال ہوا۔''

حدیث کا مذاکرہ

حدیث کے ایسے مدرسین بھی اسی سرزمین ہند میں موجود تھے کہ ''سی و شش مرتبہ مذاکرہ صحیح بخاری از اوّل تا آخر

نمود۔'' (تذکرہ علماء ہند) ان کا نام مُلاّ عنایت اللہ کشمیری تھا۔ 1125ھ میں وفات پائی۔ چھتیس چھتیس دفعہ بخاری کو مذاکرہ کے ساتھ ختم کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ان ہی مُلاّ عنایت سے پہلے اکبری عہد میں مولانا محمد مفتی نامی بزرگ تھے۔ یہ لاہور میں افتاء کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ لکھا ہے کہ'' ہر بارے کہ ختم صحیح بخاری ومشکوٰۃ المصابیح می کرد مجلسے عظیم ترتیب دادے وطبخ بغرا حلویات می فرمود وعلماء و صلحاء خورانیدے۔'' (تذکرہ منتخب۔ص 213)

اکبر ہی کے زمانہ میں ایک اور محدث شیخ بہلول دہلوی تھے جن کے متعلق اسی کتاب ''تذکرہ علماء ہند'' میں ہے کہ ''علم حدیث را خوب ورزیدہ۔'' (ص 32) اور صرف بالائی ہند پنجاب وکشمیر، دلی وغیرہ ہی کا یہ حال نہ تھا، نویں صدی کے عالم شیخ بھکاری کاکوروی تھے جن کے اصولِ حدیث میں ایک کتاب ''منہج'' کے نام سے ہے۔ مشہور مداح النبی حضرت محسن کاکوروی آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

نومسلم محدث

انتہا یہ ہے کہ نومسلم ہندوؤں میں سے بعض نے فنِ حدیث میں کمال پیدا کیا تھا۔ جوہرناتھ کشمیری ان ہی نومسلم محدثین میں ہیں، لکھا ہے کہ حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے اور ''از مُلاّ علی قادر ہروی وابن حجر مکی اجازت حدیث بسند معنعن یافتہ۔'' (تذکرہ۔ص 44)

ان ہی ابن حجر مکی کے ایک اور شاگرد مشہور میر سید شریف جرجانی کے پوتے مولانا مرتضیٰ شریفی ہیں۔ بداؤنی میں ہے۔

''درعلوم ریاضی واقسامِ حکمت ومنطق وکلام فائق برجمیع علمائے ایام بود از شیراز بمکہ رفتہ علم حدیث درملازمتِ شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت۔''

''علومِ ریاضی، حکمت ومنطق اور کلام کی قسموں میں تمام علماء سے فائق تھے، شیراز سے مکہ گئے، اور شیخ ابن حجرؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا اور تدریس کی اجازت حاصل کی۔''

مکہ معظمہ سے میر صاحب آگرہ آئے اور بقول بداؤنی ''بہ اکثرے علماء وفضلاء سابق ولاحق تقدیم یافت وبدرس علوم وحکم اشتغال داشت۔'' (ج3،ص 321)

ہندوستان کی عورتیں اور علم حدیث

اکبر کے عہد میں وفات پائی۔ حافظ دراز پشاوری قاضی مبارک کے حاشیہ کی وجہ سے ارباب درس میں خاص شہرت رکھتے ہیں، لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ایک طرف ان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ ''درفقہ وحدیث واصول یگانہ روزگار۔'' اور دوسری طرف یہ بھی ہم ان ہی کے ترجمے میں پڑھتے ہیں کہ:

''اکثر علوم از والدۂ ماجدہ خود کہ عالمہ و فاضلہ بود تحصیل نمودہ بر مسندِ افادت و افاضت متمکن شد و تمام عمر گرامی بدرس طلبہ و تالیف صرف کرد۔''

''اکثر علوم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کیے جو ایک عالمہ فاضلہ تھیں، اس کے بعد مسند افادت پر بیٹھے اور پوری عمر طلبہ کے پڑھانے اور تصنیف و تالیف میں گذار دی۔''

جس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی والدہ صاحبہ بھی محدثہ تھیں، ان پر حدیث کا فن اتنا غالب تھا کہ بخاری کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی تھی۔ تذکرہ میں ان کی تالیفات میں ''منہج الباری شرح فارسی بخاری۔'' (ص 60) کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے۔

ہندوستانیوں کا علم حدیث سے شغف

مجھے استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ ابتداء عہدِ اسلامی سے آخر تک ایک ملک میں علم حدیث کے درس و تدریس کا رواج جو رہا ہے اس کے چند نمونے پیش کر رہا ہوں۔ خدمتِ حدیث کی تیسری صورت تالیف و تصنیف ہو سکتی تھی۔ یہ دعویٰ کہ ہندوستان نے لے دے کر صرف ''مشارق'' کا مجموعہ دنیائے اسلام کو دیا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ صرف یہی کارنامہ جیسا کہ گذر چکا، ہندوستان کی طرف سے کافی ہو سکتا تھا لیکن قطع نظر ان چند مشہور تالیفات کے جن کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق اور ان کے خانوادے کا کام یا شیخ علی متقی کا سارے جہان اسلامی پر ''کنز العمال'' کے ذریعہ سے احسان، لیکن بات محض انہی کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ ابھی حافظ دراز پشاوری کے تذکرے میں بخاری کی فارسی شرح کا ذکر گذر چکا ہے۔ شیخ بہلول کے رسالہ ''منہج فی اصول الحدیث'' کا ذکر بھی آپ سُن چکے ہیں۔

ہندوستانی شارحینِ بخاری

اب سُنیے دسویں صدی ہجری میں زید پور جو جون پور کا ایک قصبہ ہے یعنی گجرات و سندھ کا کوئی شہر نہیں ہے شمالی ہندوستان کے مشرقی علاقہ کا یہ قصبہ ہے۔ یہاں کے مولانا عبدالاوّل زید پوری ایک محدث جن کی وفات 968ھ میں ہوئی، ان کی تالیفات میں ''فیض الباری شرح صحیح بخاری'' (ص 106) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ہندی عالم شیخ نورالدین احمد آبادی ہیں جن کی ایک سو ستر کتابوں میں ہم ایک کتاب ''نور القاری شرح بخاری'' (تذکرہ۔ص 248) بھی پاتے ہیں۔ خود مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتابوں میں بھی ہے ''ضوء الدراری شرح صحیح بخاری تا کتاب الذکر۔'' (تذکرہ۔ص 254) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

دوسری کتب حدیث کے شارحین

یہی حال تراجم کا بھی ہے۔ شیخ محدث دہلوی کے ترجمہ مشکوٰۃ یا ان کی ''شرح لمعات'' اسی طرح ان کے

صاحبزادے شیخ نورالحق کی ''تیسیر القاری ترجمہ بخاری'' وترجمہ صحیح مسلم کا ذکر گذر چکا ہے۔شاہ صاحب کے خاندان کے ایک عالم مولانا سلام اللہ گزرے ہیں جن کی ایک ''شرح موطا المحلی'' ٹونک کے کتب خانہ میں ''حسن الخط'' کی کئی جلدوں میں موجود ہے۔انہی مولانا سلام اللہ کے والد جن کا نام ہی شیخ الاسلام تھا، ''تذکرہ علماء ہند'' میں لکھا ہے کہ مصنف شرح فارسی صحیح بخاری ست'' (ص 76) اوران کے دادا حافظ فخرالدین کی ''شرح فارسی صحیح مسلم'' (تذکرہ) موجود ہے۔اسی طرح مشکوٰۃ المصابیح پر ہندوستان کے مختلف علماء نے حواشی وشروح لکھے۔شیخ محدث کے سوا حضرت مجددالف ثانی کے صاحبزادے شیخ محمد سعید الملقب بخازنؒ کے تالیفات میں۔''حاشیہ بر مشکوٰۃ المصابیح نوشتہ'' (تذکرہ۔ص190) اور جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علماء کے قلم سے پائے جاتے ہیں، مشکوٰۃ کے حواشی وشروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے۔آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادرو بے مثال کتاب جس کا نام ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔بظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن اپنے تجزیہ وتتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مشکوٰۃ ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمادیا ہے کہ اسلام ایک فلسفہ کی شکل میں بدل گیا ہے۔ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو، اسی لیے میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو عموماً مشکوٰۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں۔حضرت شاہ صاحب نے علاوہ اس بے نظیر کتاب کے ''موطا'' کی فارسی وعربی شرحوں میں جن مجتہدانہ نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔اس کے سوا آپ نے چھوٹے چھوٹے رسالے علمِ حدیث اور حدیث کا جو تعلق فقہ سے ہے، اس پر جو کتابیں لکھی ہیں یا معرفۃ الصحابہ میں آپ کی فقید المثال کتاب ''ازالۃ الخفاء''، ''قرۃ العینین'' وغیرہ ہندوستان کا وہ سرمایہ ہے جس پر ہمارا یہ نیم مسلم ملک ناز اور بجا ناز کرسکتا ہے۔پچھلے دنوں میں ترمذی کی شرح مبارکپوری کی، اور ابوداؤد کی شرح عظیم آبادی کی صحیح مسلم کی شرح علامہ عثمانی مولانا شبیر احمد کی، بخاری کی املائی شرح علامہ امام کشمیری کی، اسی طرح آثار السنن علامہ نیموی کی، اطفاء الفتن علامہ تھانوی کی، نیز ترمذی کی املائی شرح علامہ کشمیری ومولانا رشید احمد گنگوہی کی، اور ابوداؤد کا حاشیہ مولانا خلیل احمد کا، مؤطا کا حاشیہ مولانا زکریا سہارنپوری کا، مفتی عبداللطیف رحمانی کی شرح غیر مطبوعہ ترمذی کی، موطا امام محمد کی شرح مولانا عبدالحیی فرنگی محلی کی، اور ازیں قبیل چھوٹی بڑی کتابوں کی ایک بڑی تعداد اس سلسلے میں لکھی گئی۔فن حدیث کے خدمات میں جس ملک کے پاس اتنا بڑا عظیم سرمایہ ہو، میں نہیں سمجھتا کہ کس بنیاد پر اس کو اسی فن کے متعلق لاپروائی کے ساتھ متہم کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح تعلیقاتِ حدیث میں غریب الحدیث رجال، معرفۃ الصحابہ وغیرہ میں بھی ہندوستان نے ہر زمانہ میں کام کیا ہے۔حسن صغانی اور احمد بن طاہر فتنی کی کتابوں کے سوا بستان المحدثین شاہ عبدالعزیزؒ کی، مقدمہ صحیح مسلم علامہ عثمانی کی، نخبۃ الفکر کی شرح ملا وجیہ گجراتی کی۔

پانچویں صدی بعد سے فن حدیث کی خدمت ہندوستان میں

میں تفصیل کے درپے نہیں ہوں بلکہ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کسی زمانہ میں علمِ حدیث سے بیگانہ نہیں رہا۔ پانچویں صدی کی ابتداء سے علامہ اسماعیل محدث نے حدیث کو ہندوستان میں جب سے پہنچایا، شمالی ہند ہو یا جنوبی، مغربی

علاقے اس ملک کے ہوں یا مشرقی، سب ہی جگہ اس ملک کے خدام نظر آتے ہیں، جنہوں نے درساً و تالیفاً و حفظاً اس فن کی خدمت انجام دی اور اب تک دے رہے ہیں بلکہ دن بدن ہندوستان کا تعلق علمِ حدیث سے بڑھتا چلا جاتا ہے(10)۔ یہ خیال کہ حدیث میں ہمارا جو مستقبل شاندار نظر آتا ہے اس کی تعمیر میں ماضی کی تاریخ کو کوئی دخل نہیں ہے، قطعاً غلط ہے۔ میرے نزدیک تو بزرگوں کا موروثی مذاق ہی تھا جو بتدریج حسب اقتضاء زمانہ بڑھتا رہا۔ پچھلے دنوں چونکہ علم بالحدیث کا دعویٰ کر کے ایک فرقہ اس ملک میں اُٹھا اور اسلام کے طویل الذیل ابواب بیوع، وصایا، معاقل، شفعہ، دیات، مساقاۃ، مہایاۃ، دعویٰ، اقرار، شہادت سیر، جہاد، حج وصوم، زکوٰۃ، صلوٰۃ میں سے صرف صلوٰۃ کے باب سے اس نے کل تین یا چار مسئلوں (قراۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع الیدین، وضع الیدین علی التسترہ) کا انتخاب کر کے چیخنا شروع کیا کہ اس ملک کے مسلمانوں کو حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان چار مسئلوں میں ان کا طریقۂ عمل حدیث کے خلاف ہے۔ حالانکہ ان مسائل چہارگانہ میں سے تین مسئلوں کے متعلق جو مطالبہ تھا وہ صرف اولیٰ اور بہتر ہونے کا تھا، یعنی بہتر یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں میں جو طریقہ مروج ہے اُس کو چھوڑ کر ان عالمین بالحدیث کے مشورہ کو قبول کیا جائے۔ اتنی شدت سے اس کا غلغلہ بلند کیا گیا کہ علماء ہند کو مجبوراً اپنی حدیث دانی کی مہارت کا اظہار کرنا پڑا، بلاشبہ ایک شر تھا، جس سے خیر پیدا ہوا، یعنی علم حدیث کی طرف توجہ نسبتاً علماء ہند کی بڑھ گئی۔

ہندوستان میں اسماء الرجال کی خدمت

اور اب تو حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تصنیفی و تالیفی کاروبار کے سوا علم حدیث کی مستقل شاخ فن اسماء الرجال کی کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان کو ایسی خصوصیت حاصل ہوگئی ہے کہ آج ساری دنیائے اسلام اس فن کی کتابوں میں ہندوستان کی محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا عظیم کارنامہ حکومتِ اسلامیہ ہندیہ آصفیہ کے مطبع دائرۃ المعارف کا ہے۔ بارہ بارہ جلدوں تک کی کتابیں اس فن کی اسی مطبع نے شایع کیں۔ اور ایک نہیں تقریباً ایک درجن کتابیں اسماء الرجال کی دائرۃ المعارف کی نشریات مخصوصہ میں ہیں۔ ان کے سوا متن حدیث میں مسند طیالسی و مستدرک اور شرح حدیث میں سنن بیہقی کی دس ضخیم جلدیں شائع کر کے اسلامی جہان کو اس مطبع نے ششدر کر دیا ہے۔ اسی مطبع نے ہندوستان کے اس کام کو یعنی ''کنز العمال'' کو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، چھاپ کر شایع کیا۔ نیز رجال کی بعض مختصر نادر کتابیں مطبع احمدیہ الہ آباد سے بھی شایع ہوئیں۔ اور ڈابھیل کی نومولود مجلس علمی نے اپنی عمر کے اسی قلیل عرصہ میں نصب الرایہ زیلعی اور فیض الباری امام کشمیری کی املائی شرح بخاری چھاپ کر ہمارے سامنے بڑے بڑے توقعات قائم کر دیئے ہیں۔

حیدر آباد کی علمی خدمت

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اسلامی سلطنت آصفیہ نے آثار نبوت کی نشر و اشاعت میں جتنا بڑا کام ہے، مشکل ہی سے کسی دوسرے اسلامی ملک کی اسلامی حکومت اس کی نظیر پیش کر سکتی ہو۔ یہ اکثر حضرات کو معلوم نہ ہوگا کہ

مسند امام احمد بن حنبل مع ''منتخب العمال'' جو مصر میں چھپا ہے۔ اس کے مصارف بھی آصف سادس نواب سر محبوب علی خاں مرحوم والی حیدر آباد دکن نے ادا کیے ہیں مگر تاکید تھی کہ کسی کو پتہ نہ چلے واللہ مخرج ما کنتم تکتمون۔ اللہ آج میرے ذریعہ یہ ظاہر کرتا ہے اور ہندوستان میں سلاطین اسلامی کا فنِ حدیث سے یہ تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اسی جنوبی ہند میں جہاں آج دائرۃ المعارف اپنے طلائی کارناموں کو تاریخ کے اوراق پر ثبت کر رہا ہے۔ آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے سلطان شاہ بن حسن بہمنی المتوفی 799ھ کے ترجمہ میں منجملہ اور باتوں کے ہم یہ بھی پاتے ہیں:

جعل الارزاق السنیة للمحدثین لیشتغلوا بالحدیث بجمع الهمة والفراغ الخاطر و کان یعظمهم غایة التعظیم (نزہۃ الخواطر۔ ص157)

''محدثین کی اس بادشاہ نے بڑی بڑی تنخواہیں جاری کر رکھی تھیں تاکہ باطمینانِ قلب کامل توجہ کے ساتھ علم حدیث کی اشاعت میں مصروف رہیں۔ یہ بادشاہ محدثین کی بڑی عزت کرتا تھا۔''

اسی دکن کی دوسری اسلامی حکومت بیجاپور میں جب ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا جس نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا تھا، اور آثار شریف، نیز مسجد جامع میں اس نے درس حدیث کے لیے خاص کر کے علماء مقرر کیے تھے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ گویا سب سے پہلے سرزمینِ ہند میں دارالحدیث قائم کرنے کا فخر ہند کے جنوبی حصہ ہی کو حاصل ہے۔

سلاطین ہند اور علماء ہند

اب نہ سوچنے والوں کو کیسے سمجھایا جائے ورنہ اسی پر لوگوں کی نظر ہوتی کہ ہندوستان میں جس وقت امن و امان کا دور دورہ تھا، یہی وہ زمانہ ہے جب تاتاری فتنہ نے وسط ایشیا، خراسان، ایران، عراق عرب، عراق عجم یعنی ان تمام علاقوں کو جہنم کدہ بنا رکھا تھا، جہاں اسلامی علوم کے مراکز قائم تھے۔ ایسی صورت میں سلاطین ہند کی عام علمی قدردانیوں کا حال سن کر ہر قسم کے علماء کا ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی بات تھی، نیز ہندوستان سے ہر سال حجاج کا قافلہ عرب آ جا رہا تھا، حرمین میں حدیث کے حلقوں کا دستور نایادگار زمانہ سے جاری تھا، کیا یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے علماء حجاز جائیں اور اتنی سہولت سے ان کو حدیث کی سند ان مقامات میں مل رہی ہو، اس سے وہ مستفید نہ ہوں، ہندوستان کے صوفیوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ ملک کی فضا چونکہ انہی کے زیر اثر تھی اس لیے انہوں نے زیادہ تر تصوف اور تصوف کی کتابوں کو ہندوستان میں مروج کیا، حالانکہ اگر واقعات کا یہ مطالعہ کرتے تو ان کو نظر آتا کہ ہندوستان کے اکابر صوفیہ ہی پر حدیث کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا۔ مشہور بات ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء حدیث ہی سے متاثر ہو کر باوجود سخت حنفی ہونے کے قراۃ خلف الامام کرتے تھے۔ امیٹھی اودھ کے ایک مرکزی بزرگ صوفی شیخ فیاض جن کا شاید آئندہ بھی ذکر آئے گا، بداؤنی نے ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے۔

مخدوم بہاریؒ کا تحفہ

بجنسہ یہی بات ہندی تصوف کے دوسرے رکن رکین حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحیٰی منیریؒ کی

طرف منسوب ہے کہ وہ بھی حدیث ہی کے زیر اثر فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے تھے(11)، ان ہی مخدوم بہاری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ دیوہ کے ایک بزرگ مولانا زین الدین دیوی جب بہار حضرت سے ملنے گئے تو ان کی خدمت میں جو تحفہ انہوں نے پیش کیا تھا وہ کوئی تصوف کی کتاب نہیں بلکہ:

اھدی الیه صحیح مسلم بن الحجاج النیشاپوری۔ (نزہۃ الخواطر۔ص46)

''تحفہ میں ان کے سامنے انہوں نے صحیح مسلم بن الحجاج النیشاپوری پیش کی تھی۔''

علامہ سخاویؒ کے شاگرد ہندوستان میں

یہ تھا ہندوستان کا رنگ آٹھویں صدی میں اور یہ رنگ بتدریج پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔ حافظ ابن حجر کے خلیفۂ اکبر علامہ سخاوی کے ایک نہیں متعدد شاگردوں نے ہندوستان کو وطن بنایا اور جیتے جی اس ملک میں حدیث کا درس دیتے رہے، جن میں مولانا رفیع الدین الایجی ایشرازی اور مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا راجح کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساحلی شہر احمد آباد کے محدث تھے، لیکن سخاوی کے دوسرے شاگرد مولانا رفیع الدین تو شمالی ہندی کے مرکزی شہر آگرہ میں درسِ حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے۔

''تذکرہ علماء ہند'' میں لکھا ہے کہ:

''در معقولات شاگرد مولانا جلال الدین دوانی و در حدیث شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی الحافظ المصری ست۔'' (ص65)

''معقولات میں مولانا جلال الدین دوانی کے شاگرد ہیں اور حدیث میں حافظ شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاویؒ مصری کے۔''

شیخ محدث نے اخبار میں لکھا ہے:

''مشافہۂ حدیث را از وے (سخاوی) شنید و مدت مدید تلمذ نمود۔'' (ص252)

''حدیث خود انہیں سے مشافہۃً سنی اور عرصہ تک شاگردی میں رہے۔''

سکندر لودھی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ آگرہ میں اسی بادشاہ کی خواہش سے آپ نے قیام فرمایا اور حدیث کا حلقہ قائم کیا۔

سلاطینِ ہند پر الزام

کیا تماشا ہے کسی صاحب کو ایک بے سند قصہ ہاتھ آ گیا۔ شمس الدین ترک نامی کوئی صاحب تھے جو چار سو کتابیں حدیث کی لے کر ہندوستان کی طرف چلے لیکن ملتان ہی میں خبر ملی کہ ہندوستان کا بادشاہ علاؤالدین خلجی نماز پنجگانہ کا پابند نہیں ہے۔ اس لیے رنجیدہ ہوئے اور اُلٹے پاؤں لوٹ گئے۔ گویا ان ترک صاحب کا لوٹ جانا علمِ حدیث سے

ہندوستان کی محرومی کا سبب بن گیا ورنہ خدا جانے کیا واقعہ پیش آ جاتا، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوٹ کر کہاں تشریف لے گئے۔ خلجی کے زمانہ میں تو وسط ایشیا، خراسان وایران تا تاری کفار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، کیا اسی فتنہ کی طرف لوٹ گئے اور اگر کسی اسلامی حکومت ہی کی طرف اُلٹے پاؤں لوٹے تو ان کو دنیا کے کس خطہ میں ایسا بادشاہ مل گیا ہو گیا جو اپنے وقت کا قطب تھا۔ یہاں بادشاہوں پر تنقید ہو رہی ہے اور حال تو یہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے فرمانروا جو خلفاء کے نام سے موسوم ہیں ان کی زندگی دینی معیار پر کتنی درست تھی بلکہ ایک بڑی تعداد ان کی جیسی تھی وہ معمولی تاریخ پڑھنے والوں پر بھی مخفی نہیں۔ پھر کیا ان خلفاء کے زمانہ میں دمشق وبغداد کو چھوڑ کر محدثین بھاگ گئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی صاحب کا کوئی خاص حال ہو، ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ سلاطین بلکہ خلفاء کے ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود علماء اپنے فرائض میں مشغول رہے، زیادہ سے زیادہ اگر کسی نے کچھ زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے تو یہی کیا ہے کہ فاسق امراء سے امداد لینی انہوں نے منظور نہیں کی۔ (12)

ہندوستان میں غیر ملکی علماء ومحدثین

ایک طرف تو شمس الدین صاحب ترک کا یہ حال لوگ سناتے ہیں، لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ علاؤ الدین خلجی نہیں بلکہ ہندوستان کا وہ خونین بادشاہ محمد تغلق جس کے مظالم کے داستان کی گونج اس وقت تک ختم نہیں ہوئی ہے اور آئندہ اپنے اپنے موقع پر کچھ حالات اس کے اس کتاب میں بھی ملیں گے بہر حال علاؤ الدین خلجی جیسا کچھ بھی تھا لیکن محمد تغلق کے مقابلہ میں تو شاید اس کو فرشتہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسی تغلق کے عہد میں شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال عالم نہیں، بلکہ علامہ جمال الدین مزی، حافظ شمس الدین ذہبی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلمیذ رشید مولانا عبدالعزیز اردبیلی دلی تشریف لاتے ہیں اور محمد تغلق کے دربار میں باریاب ہوتے ہیں۔ ''نزہتہ الخواطر'' میں مولانا عبدالعزیز کے تذکرہ میں یہ الفاظ درج ہیں:

> قرأ بدمشق علی شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیة الحرانی و برهان الدین البرکج و جمال الدین المزی و شمس الدین الذهبی و علیٰ غیره من العلماء ثم قدم الهند و تقرب الیٰ محمد شاه تغلق فاحسن الیه و اکرمه۔ (ص 99)
>
> ''دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین بن تیمیہ حرانی اور برہان الدین برکج وجمال الدین مزی و شمس الدین ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی تھی، پھر ہندوستان آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے، بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی عزت کی۔''

علماء کی قدر افزائی

ابن بطوطہ کے حوالہ سے صاحب ''نزہتہ'' نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ مولانا عبدالعزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن ایک حدیث سنائی جو بادشاہ کو بے حد پسند آئی، بہت خوش ہوا، اتنا خوش کہ جوش مسرت میں:

قبل قدمی الفقیه وامران یوتی بصینة ذهب فیها الفاتنکة فصبها علیه بیده وقال لک مع الصینة. (نزہتہ۔ص 65)

''اس عالم (عبدالعزیز اردبیلی) کے بادشاہ نے قدم چوم لیے اور حکم دیا کہ سونے کی سینی میں دو ہزار تنکے لائے جائیں خود بادشاہ نے اٹھ کر مولانا پر ان تنکوں کو نچھاور کیا اور کہا کہ سینی کے ساتھ یہ تنکے آپ کے ہیں۔''

غور کرنے کی بات ہے کہ شمس الدین ترک جیسے گمنام مولوی سے جب آج یہ نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ علم حدیث کا جو دریائے بے کراں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، وہ خلجی کی بے دینی کی وجہ سے لے کر واپس ہو گئے اور اسی لیے ہمارا ہندوستان علمِ حدیث سے بیگانہ ہو کر رہ گیا، لیکن ابن بطوطہ کی اس چشم دید شہادت سے میں کیا نتیجہ نکالوں۔ سخاوی، مُلّا علی قاری، ابن حجر مکی وغیرہ کے تلامذہ کے سوا ابن تیمیہ، ذہبی، مزی جیسے کبار محدثین کے براہِ راست شاگرد جس ملک میں آئے اور قیام کیا، ایسی زبردست قدر افزائیاں جن کی ہوئی ہوں کہ سر پر تنکے نچھاور کیے جاتے ہوں، وہاں علم حدیث کے چرچے کی کیا نوعیت ہو سکتی ہے۔ سو آپ کے سامنے محض سرسری طور پر صرف ''تذکرۂ علماء ہند'' جیسی عام کتابوں سے جو فہرست محدثین کی اور اُن کی خدمات کی آپ کے سامنے نکال کر میں نے رکھ دی ہے، کیا وہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے کافی نہیں جو اس زمانہ میں پھیلائی جا رہی ہیں۔

کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اس سے شاہ ولی اللہؒ کی قیمت پیدا کرنی مقصود ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سعدی کا مطلب کچھ اس کے سوا ہے، یعنی برطانوی عہد میں عمل بالحدیث کے نام سے مسئلہ چہارگانہ کا جو فتنہ اٹھایا گیا اور ان ہی چار مسئلوں کی اشاعت کا نام حدیث کی اشاعت رکھا گیا ہے، در پردہ ہندوستان کی حدیث کی سرگرمیوں کو اسی فتنہ کی طرف منسوب کرنا مقصود ہے، اب[13] حدیث کی بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے ہندی نصابِ تعلیم کے متعلق جو دوسری مشہور تنقید ہے، ذرا اس کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔

حواشی

(1) البتہ بعض نادر مثالیں اس زمانہ میں کبھی کبھی ایسی بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس زمانہ میں بھی یک فنی ہوتے تھے، یعنی اس خاص فن کے سوا دوسرا کوئی فن انہیں آتا ہی نہ تھا۔ سلطان المشائخ کی زبانی ''فوائد الفواد'' میں منقول ہے کہ دلی میں ''دانشمندے (مُلّا) بود ضیاء الدین لقب درزیر پائے منارہ درس کردے'' ان ہی ضیاء الدین صاحب سے سلطان جی راوی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''فن از فقہ ونحو وعلوم دیگر ہیچ خبر نداشتم ہمیں علم خلافی (اصول فقہ) آموختہ بودم۔'' (ص 88)

(2) عام اسلامی ممالک کی بے تعلقی فن حدیث سے کس حد تک پہنچ گئی تھی اس کا ایک افسوسناک ثبوت یہ ہے کہ اور تو اور صحاح ستہ کی کتابوں میں سے بھی بعض کتابیں مثلاً ابن ماجہ اور شاید سنن ابی داؤد بھی ہندوستان کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی اور اسلامی ملک میں نہیں چھپ سکی ہے اور اس پر بھی ہندوستان ہی حدیث سے بیگانہ ٹھہرایا جاتا ہے۔

(3) سادات کے سلسلے میں برنی نے سادات سامانہ وسادات بیانہ وسادات بداؤں کے ساتھ سادات جخیر کا ذکر کیا ہے، بعض کتابوں میں اس کا تلفظ ''جگ نیر'' بھی کیا گیا ہے، بہار میں بارہ گانواں کے سادات اس وقت تک اپنے آپ کو جاجنیری سادات کہتے ہیں۔ اسی خاندان سے خاکسار کا بھی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی نسبی تعلق ہے۔ برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلبن کے عہد میں مذکورہ بالا مقامات سادات کے خاص مرکزی اوطان تھے۔ سامانہ بیانہ بداؤں تو اب بھی مشہور و معروف مقامات ہیں، لیکن جخیر یا جگ نیر کا پتہ نہیں کہ کہاں تھا، سندھ اور راجپوتانہ کے درمیان اب بھی جغرافیہ میں ''جگ نیر'' کے لفظ سے ایک آبادی کی نشاندہی کی جاتی ہے، ممکن ہے کہ یہی جخیر ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

(4) آہ غریب ''مشارق الانوار'' کو اس کے وطن نے بھلا دیا، قدامت آدمی کو تھکا دیتی ہے، نئی چیز میں لذت ہوتی ہے ورنہ شیخ یہ ہے کہ متن حدیث پڑھانے کے لیے اس سے اچھا مجموعہ ''مقطوع الاسناد'' حدیثوں کا شاید اب بھی پیش کرنا دشوار ہی ہے، اس میں ''صحیحین'' سے (2246) دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثوں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا گیا ہے حسن صغانی ہندوستان سے سفارت پر بغداد گئے تھے۔ مستنصر باللہ عباسی خلیفہ کا عہد تھا، اسی خلیفہ کے حکم سے حدیثوں کا یہ مجموعہ انہوں نے مرتب کیا جس کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ نے یہ کتاب شیخ سے پڑھی تھی۔ خدا نے اس کتاب کو غیر معمولی حسن قبول عطا فرمایا۔ قاسم بن قطلو بغا، فیروز آبادی صاحب قاموس، اکمل الدین، بابرتی، ابن الملک کرمانی جیسے علماء اس کے شارح ہیں۔ بعض شرحیں چار چار ضخیم جلدوں میں ہیں۔ کشف الظنون میں تفصیل دیکھیے۔

(5) الفیروز آبادی کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، پہلے یہ اپنے نسب کو مشہور امام الاساتذہ ابو اسحاق شیرازی کے نسب سے ملاتے تھے، لیکن لوگوں نے اس انتساب کا اس لیے انکار کیا کہ الاستاذ کی نسل منقطع ہو چکی تھی، لیکن لکھا ہے ''و کان لایبالی من ذالک'' (یعنی لوگوں کے اس طعن کی پروانہیں کرتے تھے) اور اپنا نسب نامہ ابو اسحاق شیرازی سے ہی ملاتے رہے مگر جب یمن میں ان کو قضا کا عہدہ مل گیا تو ''ثم ارتقیٰ فادعی بعد ذلک نه من ذریة ابی بکر الصدیق'' (یعنی حضرت ابوبکر کی اولاد سے اپنے کو شمار کرنے لگے) ''و کتب بخط الصدیقی'' (اور اپنے دستخط میں الصدیقی لکھنے لگے) ہو سکتا ہے الشیرازی صدیقی ہوں، لیکن معلوم نہیں ابن حجر نے اخیر میں یہ کیوں لکھا ''ان النفس تابی قبول ذلک'' (یعنی دل نہیں مانتا) واللہ اعلم۔ یہ فیروز آبادی بڑے سیاح عالم ہیں۔ اونٹوں پر کتابیں لاد کر ایک اسلامی ملک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے رہتے تھے اور وہاں کے سلاطین سے انعام و جوائز حاصل کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آئے تھے۔ بڑی آؤ بھگت یہاں بھی ہوئی، تیمور لنگ نے پانچ ہزار اشرفی نذر پیش کی، بایزید یلدرم کے دربار میں بھی پہنچے تھے، وہاں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ آخر میں یمن کے قاضی ہو کر وہیں انتقال فرمایا۔ یمن کے بادشاہ الملک الاشرف اسماعیل کے پاس ایک کتاب اپنی ایک طبق میں بھر کر پیش کی، اس نے اس کو چاندی سے بھر کر واپس کیا۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ دو سو سطریں یاد کیے بغیر میں سوتا نہیں۔ ابن سیدہ کی ''محکم'' اور صغانی کی ''عباب'' دونوں کو ملا کر ساٹھ جلدوں میں لغت لکھی تھی، اسی کا خلاصہ ''قاموس'' ہے۔ پھر ایک ہندی عالم علامہ مرتضیٰ نے 10 جلدوں میں ''قاموس'' کی شرح ''تاج'' لکھی۔ گویا ''قاموس'' کا یہ کام ہندوستان ہی میں شروع ہوا اور اسی خاک پاک کے ایک فرزند کے ہاتھ سے عربی لغت کی یہ مشہور و معروف کتاب ختم ہوئی اور پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عربی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

(6) چونکہ صغانی کی وفات 650ھ میں بہ مقام بغداد ہوئی جب وہ دلی دربار کی طرف سے سفیر بن کر بغداد گئے، اس لیے یہ یقینی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ان کا زمانہ پایا ہوگا۔ کیونکہ آپ کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی، غالباً ملاقات ثابت نہیں۔ بہر حال ''فوائد الفواد'' میں آپ نے شاید اپنے اساتذہ ہی سے یہ بات سنی ہوگی جو نقل فرمایا ہے کہ ''اگر حدیثے براو مشکل شدے رسولؐ را در خواب دیدے وصحیح کردے۔'' (ص 103) ممکن ہے کہ الصغانی کی شکایت جن لوگوں نے تشدد کی کی ہے اس میں کچھ اس واقعہ کو بھی دخل ہو۔

یہ یادرکھنا چاہیے کہ سلطان المشائخ نے صغانی کی کتاب ''مشارق'' مولانا کمال الدین زاہد سے پڑھی تھی اور مولانا کمال الدین الزاہد نے مولانا برہان الدین بلخی سے بلخی نے خود صغانی مصنف کتاب سے گویا سلطان المشائخ اور صغانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔

(7) یوں تو خدا جانے دلّی کے علم خیز معارف نیز خانقاہ میں کتنے علماء جمع ہو گئے تھے لیکن جن کے تراجم کتابوں میں ملتے ہیں ان میں شمس الدین یحییٰ، مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا علاؤ الدین نیلی، مولانا فخری الدین زرادی، مولانا وجیہہ الدین یوسف کلاکھری، مولانا سراج الدین عثمان، مولانا وجیہہ الدین پائلی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا فصیح الدین، مولانا فخر الدین مروزی، مولانا جمال الدین، مولانا جلال الدین اودھی، خواجہ کریم الدین سمرقندی، قاضی شرف الدین فیروز، مولانا بہاؤ الدین ادہمی، مولانا ضیاء الدین شیرازی وغیرہم حضرات اپنے وقت کے غیر معمولی علم وعمل کے نمونے تھے۔ ان بزرگوں میں سے بعضوں نے ہندوستان کے بعض صوبوں میں اسلام کی مستقل تاریخ پیدا کی ہے۔ مگر ہندوستان جاہل تھا اس لیے کہ اسلام یہاں براہِ عرب نہیں بلکہ براہِ خراسان آیا تھا۔ گویا بخاری، ترمذی، ابوداؤد بجستانی، امام مسلم نیشاپوری، صحاح ستہ کے یہ سارے مصنفین عربی ممالک کے حضرات تھے؟ یورپ ایک نظریہ گڑھتا ہے، کسی نہ کسی راہ سے مسلمانوں میں اسے پھیلا دیتا ہے، پھر نسلیں گزرتی جاتی ہیں جو کچھ یورپ نے پھیلا دیا اس میں شک کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔

(8) کیونکہ قرطاس کا جو واقعہ شیعوں میں مشہور ہے اس کے متعلق تو کہتے ہیں کہ اس میں خلافت کا فیصلہ لکھا جانے والا تھا، میں کہتا ہوں کہ بالفرض یہی ہو لیکن کس کی خلافت کا فیصلہ، اس کا جو دین اور نماز میں نائب بنایا گیا تھا، ظاہر ہے کہ ہوتا تو شاید اسی کے لیے ہوتا، ابن عباس نے اس کو رزیہ (مصیبت) جو قرار دیا تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اگر خلافت صدیقی میں آجاتی تو جھگڑا نہ ہوتا، یعنی بجائے اقتضاء کے نص صریح ان کی خلافت کے لیے مہیا ہو جاتی۔

(9) مولانا مرحوم ہندوستان کے ان مخلص علماء میں تھے جنہوں نے نام پیدا کرنے سے زیادہ بہت زیادہ کام کیا ہے۔ عربی زبان میں ہندوستان کی سیاسی علمی جغرافیائی ضخیم تاریخیں آپ نے لکھی ہیں لیکن بجز ایک مختصر قطعہ کے ان کی محنتوں کا یہ سارا ذخیرہ زیورِ طبع سے محروم ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کس کے لیے مقدر ہے۔

(10) خود ہندوستان کے مسلمانوں کو ان خدمات کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو، جو آثار نبویہ کی اشاعت میں یہ ملک انجام دے چکا ہے یا دے رہا ہے مگر بیرونِ ہند کی اسلام دنیا کے اعترافات کا حال یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی دو کتابیں **نہایة السول فی اقضیة الرسول** اور **نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام** کا ذکر کر کے ایک مراکشی عالم نے لکھا ہے:

> **ولولم تنشر الامة الهندية اثرا غير هذا المجموعة المقدسة لكان كافيا واری ان التابط بهما على كل مسلم متعين۔** (التراتیب الاداریہ للکتانی۔ ج 1، ص 3)
>
> ''اگر ہندوستان کی امت اسلامیہ کی طرف سے ان دو مقدس مجموعوں کے سوا اور کوئی دوسری چیزیں پیش نہ بھی ہو تو یہی دو کتابیں ان کی طرف سے کافی ہو سکتی ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی بغلوں میں ان دونوں کتابوں کو ضرور رکھے۔''

(11) اس سے بحث نہیں کہ ان بزرگوں کا یہ خیال ترک قرأۃ خلاف سنت ہے کہاں تک صحیح ہے۔ جب امام شافعی جیسے ائمہ اس کے قائل ہیں تو پھر ان بزرگوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو یہ دکھانا ہے کہ جن کو حدیث کے باب میں بدنام کیا گیا ہے ان کا تعلق حدیث سے کیا تھا۔

(12) ہماری علمی تاریخوں میں علماء سلف کے متعلق عموماً یہ الفاظ ملیں گے کہ فلاں صاحب نہ سلطان سے جوائز لیتے تھے نہ اخوان سے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ۔ بعض سلطان سے نہیں لیتے تھے لیکن اخوان سے لیتے تھے، جیسے سفیان ثوری۔ اخوان سے مراد عام مسلمان جو ان سے عقیدت رکھتے ہوں۔ بعض سلطان اور اخوان دونوں سے لیتے تھے جیسے ابراہیم نخعی، امام اوزاعی **ولكل وجهة هو موليها۔**

(13) ہندوستان میں علمِ حدیث کی خدمت میں کیا کچھ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پڑھنی ہو تو مولانا سید سلیمان ندوی کے مضامین کے اس سلسلے کو پڑھنا چاہیے جو مدت ہوئی اس عنوان سے ''معارف'' میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں ہے، ورنہ شاید اور اضافہ کرتا۔ مولانا نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب ہی گویا لکھ دی ہے۔

ہندوستانی نصابِ تعلیم پر ایک نظر

جو کچھ آج ہے، یہی کل بھی تھا، جن دماغوں کی یہ منطق ہے اُن کی طرف سے ایک بڑا الزام ہندوستانی مولویوں پر یہ بھی ہے کہ ان کے نصاب کا بڑا حصہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور ذہنی موشگافیوں بلکہ عقلی کج بحثیوں میں گم ہو گیا ہے، جن کی تعبیر عموماً ''معقولات'' کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت نے جس وقت اس ملک میں دم توڑا اور اپنی آخری سانس پوری کی ہے اس وقت عربی تعلیم گاہوں میں جو نصاب مروج تھا، اس کا یہی حال تھا۔ متن، متن کے ساتھ شرح، شرح کے ساتھ حاشیہ، حاشیوں کے حاشیوں کا ایک بے پایاں سلسلہ تھا جو پڑھایا جاتا تھا اور قدیم درسگاہوں میں شاید اب بھی پڑھایا جاتا ہے۔(1)

ہندوستان کا نصابِ تعلیم

لیکن معقولات کی بھرمار کا یہ قصہ کیا ہمیشہ سے ہے؟ میں اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، گویا یہ اس کی اجمالی تاریخ ہوگی۔ اس ملک کے تعلیمی نصاب کو جن انقلابات سے گذرنا پڑا ہے کہ ساتویں صدی یعنی باضابطہ وطن بنا کر مسلمان اس ملک میں جب آباد ہوئے تو اُس وقت عربی زبان عقلی علوم کی کتابوں سے معمور ہو چکی تھی، اس لیے ہمارا وہ حال تو ہو نہیں سکتا تھا، جو ان اسلامی ممالک کا ہے جہاں پہلی صدی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ ان ممالک میں مدت تک مسلمانوں کے تعلیمی نصاب میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ، نہ یہ چیزیں تھیں نہ رہ سکتی تھیں، لیکن جس زمانہ میں ہم اس ملک میں آئے ہیں، اس وقت اگرچہ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے مسلمانوں نے اس ملک میں پہنچ کر تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا، اس میں بچوں کو حسب دستور پہلے قرآن ناظرہ پڑھا لیا جاتا تھا۔ قرآن پڑھانے والے معلموں کو عموماً مُقری کہتے تھے۔ آج ان مقریوں کی جو بھی حالت ہو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے دنوں میں اس مسئلہ کو اتنی کسمپرسی میں نہیں ڈال دیا گیا تھا، جس میں وہ ہمارے عہدِ مرگ میں مبتلا ہے۔ حضرت نظام الاولیاء سلطان جی سے ''فوائد الفواد'' میں یہ بیان منقول ہے کہ بداؤں جو حضرت کا مولد پاک ہے، وہاں جس شخص سے اپنے بچپن میں قرآن پڑھا تھا وہ ایک غلام ہندو تھا۔ حضرت والا ہی کی زبانی اس ''غلام ہندو'' مقری کی تعلیم کا حال سنیے۔ فرماتے ہیں۔

''غلام ہندو بود و اشادی مقری گفتندے، یک کرامت او آں بود کہ ہر کہ یک تختہ قرآں پیش او خواندے خدائے تعالیٰ او را تمام قرآن روزی کردے۔'' (فوائد الفواد۔ ص 154)

''غلام ہندو تھا، اسے ''شادی مقری'' کہتے تھے، اس کی ایک کرامت یہ تھی۔ کہ جو شخص ان سے ایک حصہ قرآن کا پڑھ لیتا، اللہ تعالیٰ اسے پورا قرآن عطا فرما دیتے۔''

قرآن پڑھانے والے اساتذہ کی استعداد

ظاہر ہے کہ اس لفظ ''ہندو'' سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ہندو مذہب رکھتے تھے، بلکہ مطلب یہی ہے کہ نسلاً ہندو تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام شادی رکھ دیا گیا تھا۔ یہ لاہور کے رہنے والے کسی صاحب کے غلام تھے، جن کا پیشہ بھی یہی بچوں کو قرآن پڑھانا تھا۔ اسی ملفوظ میں اس کا بھی ذکر ہے کہ ان کے آقا لہاور (لاہور) میں رہتے تھے، غالباً مسلمان ہونے کے بعد اپنے آقا ہی سے قرآن پڑھا، انہوں نے آزاد کر دیا، بداؤں میں آ کر آقا ہی کے پیشہ کو اختیار کر لیا۔ بہر حال باوجود نسلاً ہندو ہونے کے سینے، بچوں کو قرآن پڑھانے والے اس زمانہ میں کس قابلیت کے لوگ ہوتے تھے۔ سلطان جی ہی کی شہادت ہے کہ ''قرآن بہ ہفت قرأت یاد داشت۔'' (فوائد۔ 154) یعنی سبعہ کے قاری تھے۔ یہ تو علم کا حال تھا۔ قال کے ساتھ جو حال تھا اس کا اندازہ تو حضرت ہی کے اسی بیان سے ہو سکتا ہے جس کی تعبیر آپ ہی نے کرامت سے فرمائی ہے۔ اس کے سوا ان کی بعض اور کرامتوں کا بھی اس کتاب میں ذکر ہے۔ اس سے مسلمانوں کی اس نسلی بے تعصبی کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کا تحفہ ہر جگہ مسلمان تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ اللہ اللہ شودروں کو ملیچھ اور ناپاک سمجھنے والا۔ وید کی آیت اگر ان کے کان میں پڑ جائے تو پگھلے ہوئے رانگے سے اس کان اور کان والے کو ختم کر دینا جس ملک کا مذہبی عقیدہ اور دھرم تھا، کیسا عجب تماشا تھا کہ اسی ملک کے ایک غلام کو قرآن پڑھایا جاتا ہے، قرآن کی ساتوں قرأتوں کا ماہر بنایا جاتا ہے اور درسِ قرآن کی مسند پر اسے جگہ دی جاتی ہے۔ قریشی اور ہاشمی سادات شاگرد بن کر اس کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اور فن تجوید

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مقری یعنی بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام وہی لوگ کرتے تھے جو باضابطہ فنِ قرأت سے واقف ہوتے تھے۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں دلّی کے ایک مقری کا ذکر صاحب ''نزہۃ الخواطر'' ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

الشیخ الفاضل علاء الدین المقری الدھلوی احد العلماء المبرزین فی القراۃ التجوید کان یدرس و یفید بدھلی۔ (ص 85)

''شیخ فاضل علاؤ الدین مقری دہلوی ان لوگوں میں سے ایک آدمی ہیں جو قرأۃ و تجوید میں

سر آمد روزگار تھے۔ دلّی میں لوگوں کو پڑھاتے اور فائدہ پہنچاتے تھے۔''

جستہ جستہ کتابوں میں اس زمانہ کے مقریوں کا جو ذکر ملتا ہے، اگر جمع کیا جائے تو ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔

فارسی کا درس ہندوستان میں

قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ سلطان جیؒ کے تذکرہ میں میر خورد لکھتے ہیں۔

والدہ در مکتب فرستاد، کلام اللہ بخواند وتمام کرد وکتابہا خواندن گرفت۔'' (ص 95)

'' والدہ نے مکتب بھیجا، کلام اللہ پڑھ کر ختم کیا، اور دوسری کتابیں پڑھنے لگے۔''

ان '' کتابہا'' سے فارسی ہی کی کتابیں مراد ہیں، جو عموماً اس زمانہ میں مکاتب میں پڑھائی جاتی تھیں کہ وہی حکومت کی زبان بلکہ مسلمانوں کی زبان تھی۔ فارسی اور فارسی کتابوں کا مذاق مسلمانوں پر کتنا غالب تھا۔ اس تاریخی لطیفہ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ طباطبائی صاحب ''سیر المتاخرین'' نے بنگالہ کے بازیگروں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ دلّی میں آ کر تماشے ان بازیگروں نے دکھائے۔ ان میں ایک دلچسپ تماشہ یہ بھی تھا۔

'' کلیات سعدی شیرازی آوردند بکیسہ گزاشتہ چو برآوردند دیوان حافظ برآمد آں راچوں بکیسہ بردند دیوان سلمان ساوٗجی برآمد، بازچوں کیسہ نمودند دیوانِ انوری ہم چناں چند مرتبہ کتاب رادر کیسہ کردند وہر مرتبہ کتاب دیگر برآوردند۔'' (سیر المتاخرین۔ ج 1، ص 245)

'' کلیات سعدی شیرازی لاتے، اور اسے تھیلے میں ڈالتے، پھر جب نکالتے، دیوان حافظ تو دیوان سلمان ساوٗجی نکلتا، پھر تھیلے میں ڈالتے پھر نکالتے تو دیوان انوری، ایسے ہی چند مرتبہ کتاب تھیلے میں ڈالتے اور نکالتے اور ہر مرتبہ ایک دوسری کتاب نکلتی۔''

سوچا جا سکتا ہے جس دور میں بازیگر بھی بازیگری میں سعدی وحافظ، سلمان ساوٗجی، انوری کے دواوین وکلیات ہی دکھایا کرتے تھے۔ اس وقت عام پبلک پر فارسی کی ان کتابوں کا کیا اثر ہوگا۔ انگریزی کی عمر بھی ہندوستان میں قریب قریب سو ڈیڑھ سو سال کے ہو چکی ہے لیکن کیا اس تماشے میں ہندوستانیوں کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس میں شکسپیئر، ٹنی سن، ورڈس ورتھ، ملٹن وغیرہ کی نظموں کی کتابیں دکھائی جائیں۔

بہر حال تعلیم کی ایک منزل تو فارسی ہی کی کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اگر چہ مجھے اس میں شک ہے کہ فارسی تک پڑھنے والے طلبہ بھی عربی میں کچھ شُد بُد پیدا کر لیتے تھے یا نہیں، چونکہ باوجود تلاش کے اب تک کوئی صریح شہادت(2) اس سلسلہ میں مجھے نہیں ملی ہے، اس لیے دعویٰ تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ کے لکھے پڑھے آدمیوں کا جہاں کہیں تذکرہ ملتا ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی بہت عربی اتنی عربی جس سے قرآنی آیتوں کا مطلب عام مشہور حدیثوں کا ترجمہ سمجھ لیتے ہوں، سب ہی سیکھ لیتے تھے۔ اسی لیے اس زمانہ کے لوگ بے تحاشا اپنے مراسلات وخطوط نیز

کتابوں میں قرآنی آیات اور حدیثوں کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ دانشمندوں (یعنی باضابطہ عربی زبان جاننے والوں) میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔

عربی کی تعلیم

کچھ بھی ہو، تعلیم کی ایک منزل ایسی ضرور تھی، جس کے ختم کرنے والے دانشمند، یا مولوی یا مُلّا مولانا وغیرہ الفاظ کے مستحق نہیں قرار پاتے تھے۔ اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی تھی، یعنی باضابطہ عربی زبان میں عربی اور اسلامی علوم کے سیکھنے کا مرحلہ پیش آتا تھا۔ جہاں تک تلاش وتتبع سے معلوم ہوتا ہے تعلیم کا یہ حصہ بھی دو منزلوں میں منقسم تھا۔ میر خورد نے سلطان جیؒ کے ذکر میں لکھا ہے:

"چوں در علمِ فقہ واصول فقہ استحضارے حال کرد، شروع در علم فضل کرد۔" (ص 101)

"علم فقہ واصول فقہ میں جب کمال حاصل کر چکے، تو درجہ فضل کی کتابیں شروع کیں۔"

"شروع درعلمِ فضل کرد" اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجہ تو فاضل کا تھا، جو علوم اور کتابیں اس درجہ میں پڑھائی جاتی تھیں ان ہی کا نام علمِ فضل تھا۔ اور اس سے پہلے گویا جو کچھ پڑھایا جاتا تھا فضل کے مقابلہ میں ہم اس کو "علمِ ضروری" کا درجہ قرار دے سکتے ہیں، یعنی اس کو ختم کیے بغیر کوئی مولوی (جسے اس زمانہ میں دانشمند کہتے تھے) کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا تھا۔ دانشمندی کے اس درجہ کے لیے کن کن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا، اس کا پتہ حضرت عثمان سراج صاحب بنگال کے اس واقعہ سے چلتا ہے، میں کسی جگہ ذکر کر چکا ہوں کہ بنگال سے بالکل نوعمری میں یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں آکر شریک ہوگئے تھے، اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم کا شوق رکھتے تھے، کیونکہ میر خورد ہی نے لکھا ہے جب بنگال سے یہ دلّی پہنچے تو:

"کاغذ وکتاب خود کہ جز آں دیگر رختے نداشت۔" (ص 388)

"کتاب اور کاغذ کے سوا کوئی دوسرا سامان ان کے پاس نہ تھا۔"

یعنی کاغذ وکتاب کے سوا کوئی دوسرا سرمایہ اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن خانقاہ میں پہنچ کر واردین وصادرین کی خدمت میں کچھ اس طرح مشغول ہوئے کہ لکھنے پڑھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔

عثمان سراج کی تعلیم

میر خورد لکھتے ہیں کہ جس وقت ہندوستان کے مختلف اقطار وجہات میں حضرت نے چاہا کہ اپنے نمائندوں کو روانہ کریں تو قدرتاً بنگال کے لیے ان ہی کی طرف خیال کیا جاسکتا تھا کہ ما ارسلنامن رسول الا بلسان قومہ (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان کے ساتھ) قرآنی اصول کا اقتضا بھی یہی تھا لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ دانشمندی کے ضروری درجہ کی بھی تکمیل انہوں نے نہیں کی ہے، تو فرمایا:

''اوّل درجہ دریں کار علم ست'' (ص 288)

''پہلے اسی درجہ کا علم درکار ہے۔''

حضرت مولانا فخر الدین بھی مجلس میں تشریف فرما تھے، انہوں نے سلطان جی سے عرض کیا:

''در شش ماہ او را دانشمند (مولوی) می کنم۔''

''چھ ماہ میں اُن کو میں مولوی بنا دوں گا۔''

اور اسی کے بعد ''دانشمندی'' کے ضروری درجہ کی تعلیم حضرت عثمان سراج کی شروع ہوگئی، ان کو جو کتابیں پڑھائی گئی تھیں میر خورد بھی ان کتابوں میں حضرت عثمان سراج کے شریک تھے۔ انہوں نے ان کتابوں کی فہرست دی ہے، لکھا ہے:

''الغرض خدمت مولانا سراج الدین در کبر سن تعلیم کرد، و برابر کاتب حروف (میر خورد) در آغازِ تعلیم میزان و تصریف و قواعد و مقدمات او تحقیق کرد۔'' (ص 289)

''کافی عمر ہو جانے کے بعد مولانا سراج الدین کی تعلیم شروع کی، کاتب الحروف برابر آغازِ تعلیم میزان اور گردان وغیرہ کے قواعد سے ساتھ تھا، اور پڑھتا تھا۔''

جس کا مطلب یہ ہوا کہ شروع میں جیسا کہ اب بھی دستور ہے، صَرف کی تعلیم سے ابتداء کی گئی، اس وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ میزان ہی سے عربی زبان شروع ہوتی تھی (3)۔ آگے کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ صَرف میں جو جو چیزیں سکھائی جاتی ہیں، مثلاً تصریف (گردان) قواعد (تعلیل وغیرہ کے قاعدے) ان کو یاد کرائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان کی سادہ گردانوں کے بعد صرف کے متعلق جو دوسری چیزیں ہیں کسی خاص کتاب کا پڑھنا شاید ضروری نہ تھا، خصوصاً سراج عثمان کے ساتھ مولانا فخر الدین کا جو وعدہ شش ماہ کا تھا اس کے لیے بھی غالباً ان کو خود اس کے لیے کام کرنا پڑا۔ میر خورد نے لکھا ہے کہ:

''مولانا فخر الدینؒ علیہ بہجت اور تصریفے مختصر و مفصل تصنیف کرد و او را عثمانی نام نہاد۔'' (ص 289)

''مولانا فخر الدین نے ان کے واسطے مختصر و مفصل گردان کی ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام ''عثمانی'' رکھا۔''

غالباً یہ وہی کتاب ہے جو عربی مدارس میں اس وقت تک زرادی کے نام سے مشہور ہے۔

درجۂ دانشمند اور اس کا نصاب

خلاصہ یہ ہے کہ صرف کی تعلیم کے بعد دانشمندی یا مولویت کے درجۂ ضروری میں ان کو جو کتابیں پڑھائی گئیں، وہ یہ ہیں جیسا کہ میر خورد ہی رقمطراز ہیں کہ حضرت عثمان سراج نے مولانا فخر الدین سے صَرف کی تعلیم پانے کے بعد:

''پیش مولانا رکن الدین اندرپتی برابر کاتب حروف کافیہ و مفصل و قدوری و مجمع البحرین تحقیق کردو، بمرتبۂ افادت رسید۔'' (ص 289)

''کاتب حروف ہمیشہ مولانا رکن الدین اندر پتی سے کافیہ، مفصل، قدوری اور مجمع البحرین پڑھتا رہا، اور افادت کے لائق ہوا۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کے سوا نحو میں کافیہ و مفصل اور فقہ میں قدوری و مجمع البحرین یہ دونوں کتابیں دانشمندی کے ضروری درجہ کے لیے کافی سمجھی جاتی تھیں۔ کافیہ تو نصاب میں اب بھی شریک ہی ہے، البتہ مفصل اب ایک زمانہ سے خارج از درس ہو چکی ہے۔ اس کی قائم مقامی شرح مُلا جامی کرتی ہے۔ اسی طرح فقہ میں قدوری بھی نصاب میں اس وقت تک شریک ہے۔ البتہ ''مجمع البحرین'' نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہ ''مجمع البحرین'' ''شرح وقایہ'' کی قائم مقام تھی۔

''مجمع البحرین'' اور اس کی جگہ ''شرح وقایہ''

عام طور پر علماء اب ''مجمع البحرین'' سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ابن الساعاتی کی مشہور کتاب ہے۔ قدوری اور النسفی کے فقہی منظومہ دونوں کے مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر ابن الساعاتی نے یہ متن مرتب کیا تھا اور بڑا جامع مفید متن تھا۔ اس کی جگہ ''شرح وقایہ'' کب سے مروج ہوئی صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن مُلا عبدالقادر نے شیخ احمدی فیاض (4) انبٹھوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''فقیر در صحبت شریف ایشاں رسیدہ نائیکہ شرح وقایہ می گفتند۔'' (ص 84)

''فقیر ان کی صحبت میں حاضر ہوا، جس زمانے میں شرح وقایہ پڑھاتے تھے۔''

بہر حال میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں دانشمندی کے لیے علم کا جتنا حصہ ضروری خیال کیا جاتا تھا، ہم اس کو شرح جامی اور ''شرح وقایہ'' تک کی تعلیم کے مساوی قرار دے سکتے ہیں۔ آگے میر خورد ہی نے لکھا ہے ''بہ مرتبہ افادت رسید'' یعنی عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جتنے علم کی ضرورت اس زمانہ میں کافی سمجھی جاتی تھی چونکہ اتنا علم فراہم ہو چکا تھا اس لیے حضرت سلطان جی نے ان کو افادہ کے مقام پر سرفراز فرمایا۔

بہر حال اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے کہ فضل کے مقابلہ میں علم کا جو ضروری درجہ تھا اُس میں بس یہی صرف و نحو اور فقہ کی دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس درجہ تک ہمارے نصاب میں اس زمانہ کی حد تک نہ منطق کی کوئی کتاب داخل تھی اور نہ فلسفہ کی۔

ہاں! اس کے بعد فضل کا درجہ شروع ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ملا عبدالقادر وغیرہ اس درجہ کی کتابوں کو ''کتب منتہیانہ'' بھی کہتے ہیں۔

درجۂ فضل کی کتابیں

بالکل یقینی طور پر تو نہیں بتایا جا سکتا لیکن جستہ جستہ جو چیزیں مجھے ملی ہیں، مثلاً مولانا قاسم جو سلطان جی

کے خواہرزادہ ہیں۔ ان کی ''تفسیر لطائف التفسیر'' کے حوالہ سے میر خورد نے نقل کیا ہے کہ مولانا جمال الدین دہلوی سے انہوں نے:

''بشرف اجازت ہدایہ بزدوی وکشاف ومشارق ومصابیح مشرف کرد۔'' (ص 207)

اور ایک اور سندھی عالم جلال الدین نامی ہی کے ذکر میں صاحب ''نزہتہ الخواطر'' لکھتے ہیں:

یدیم اشتغالہ بالہدایہ وابزدوی والمشارق والمصابیح والعوارف وغیرہا۔'' (نزہتہ۔ص 250)

''ہمیشہ ہدایہ، بزدوی، مشارق، مصابیح، عوارف وغیرہ کتابوں میں مشغول رہتے تھے۔''

(یعنی درس وتدریس ان کتابوں کے لگے رہتے تھے۔)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ فضل یا جن کا نام ''کتب منتہیانہ'' تھا، وہ صرف یہی تھیں، یعنی فقہ میں ہدایہ، اگرچہ ممکن ہے کہ ''ہدایہ'' کے ساتھ بعض دوسرے متون علاوہ قدوری و''مجمع البحرین'' کے پڑھائے جاتے ہوں، کیونکہ محمد تغلق کے عہد کے مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی جنہیں تغلق نے شیراز قاضی عضدالدین صاحب ''مواقف'' کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، ان کی تصنیفات میں ہم ''کنز الدقائق'' کی شرح کا نام بھی پاتے ہیں۔ صاحب ''نزہتہ'' لکھتے ہیں:

وللعمرانی مصنفات جلیلة منها شروح و تعلیقات علی کنز الدقائق والحسامی و مفتاح العلوم. (ص 165)

''عمرانی کی چند بلند پایہ کتابیں ہیں جن میں کنز الدقائق حسامی ومفتاح العلوم کے شروح و تعلیقات بھی ہیں۔''

ظاہر ہے کہ درس میں اگر یہ کتاب ''کنز'' نہ تھی تو شرح لکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی طرح اصول فقہ میں اصول بزدوی آخری کتاب معلوم ہوتی ہے اور اس کا چرچا ہم ہندوستانی تعلیم کے ابتدائی عہد میں بہت زیادہ پاتے ہیں، لیکن جیسے فقہ میں ''ہدایہ'' کے ساتھ کچھ اور ذیلی متون کا پتہ چلتا ہے، گزشتہ بالا عبارت نیز اس کے سوا دوسرے قرائن وتصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں الحسامی اور اس کی شرح تحقیق بھی اس زمانہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ مُلّا عبدالقادر نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ بداوَنی سے:

''زمانیکہ شرح صحائف درکلام وتحقیق دراصول فقہ بملازمتش می خواندم۔'' (بداوَنی۔ص 56)

''جس زمانہ میں فنِ کلام میں شرح صحائف اور اصول فقہ میں تحقیق ان کی خدمت میں پڑھتا تھا۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اکبری عہد سے پہلے حسامی کی ''شرح غایۃ التحقیق'' یہاں زیر درس تھی، ''کنز'' کے متعلق بھی مُلّا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ میاں حاتم سنبھلی سے:

''از کتاب کنز فقہ حنفی نیز سبقے چند تیمناً وتبرکاً خواند۔'' (ج 3،ص 2)

''کنز فقہ حنفی کے چند اسباق بھی تبرکاً پڑھے۔''

جو دلیل ہے کہ ''کنز'' بھی نصاب میں شریک تھی۔

''منار'' اور اس کی شرح

اسی طرح ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیان دلّی کے عالم مولانا سعد الدین محمود بن محمد کا تذکرہ ہم کتابوں میں پاتے ہیں، جن کے تالیفات میں ''منار'' کی ایک شرح ''افاضۃ الانوار'' کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نصاب میں اصول فقہ کا یہ مشہور متن یعنی ''المنار نسفی'' بھی داخل تھا۔ بعد کو اسی کی بہترین شرح مُلا جیون ہندی نے ''نور الانوار'' کے نام سے لکھی جو مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔

''کشاف'' سے شغف

تفسیر میں عموماً ''کشاف'' کا ذکر کیا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ''کشاف'' سے ہندوستانی علماء کو خاص دلچسپی تھی۔ آٹھویں صدی کے ایک ہندی عالم مولانا مخلص بن عبداللہ نے ''کشف الکشاف'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا ذکر حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' میں اور مُلّا علی قادری نے ''آثار جنیہ'' میں کیا ہے۔ حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاءؒ باوجودیکہ تعلیمی و تدریسی کاروبار سے بے تعلق ہو چکے تھے، لیکن ''کشاف'' سے آپ کو بھی خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ ''فوائد الفواد'' میں مختلف مواقع پر اس کا ذکر ملتا ہے۔ میر خورد نے بھی حضرت والا کے ایک مرید مولانا رکن الدین چغمر کے تذکرہ میں لکھا ہے:

> ''درخط بے مثال زمانہ، بیشترے کتب معتبر چنانکہ کشاف و مفصل و جز آں بہ جہت حضرت سلطان المشائخ کتابت کردہ رسانید۔'' (ص 317)
>
> ''خوش نویسی میں بے مثال تھے، بہت سی معتبر کتابیں جیسے کشاف اور مفصل وغیرہ لکھ کر حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچائیں۔''

تفسیر ''مدارک''

الغرض تفسیر میں معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ میں اس کو خاص اہمیت حاصل تھی، اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں ''مدارک'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔ شیخ محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں مولانا محمد شیبانی جن کا ذکر آگے بھی آ رہا ہے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے:

> ''تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے۔'' (ص 186)
>
> ''اہل مجلس میں تفسیر مدارک بیان فرماتے۔''

تفسیر کی دوسری کتابیں

تفسیر ہی میں دو اور کتابوں ''ایجاز'' اور ''عمدہ'' کا بھی ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند کا ان

کے ساتھ بھی اشتغال رہتا تھا۔ ''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ کے حوالے سے ایک قصہ کے سلسلے میں یہ بیان منقول ہے:

''از مولانا صدرالدین کولی شنیدم کہ اوگفت من وقتے بر مولانا نجم الدین سنامی بودم اواز من پرسید بچہ مشغول باشی، گفتم بہ مطالعہ تفسیر پرسید کدام تفسیر۔ گفتم کشاف وایجاز وعمدہ۔ (ص 109)

''مولانا صدر الدین کولی سے میں نے سنا کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن مولانا نجم الدین سنامی کی خدمت میں حاضر تھا۔ مولانا نے پوچھا، کس کام میں مشغول ہو؟ میں نے کہا، تفسیر کے مطالعہ میں۔ سوال کیا، کون سی تفسیر، میں نے کہا کشاف، ایجاز اور عمدہ کے۔''

یوں ہی تفسیر نیشاپوری (5)، تفسیر عرائس البیان، تفسیر ناصری، تفسیر زاہدی یہ سب کتابیں بکثرت علماء کے زیر نظر تھیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جس عہد میں علماء اور مشائخ ہی نہیں بلکہ اس ملک کے وزراء وامراء بھی قرآن کی تفسیر لکھا کرتے تھے تو پھر اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس فن کے ساتھ دوسروں کی دلچسپیوں کا کیا حال ہوگا۔

فتاویٰ تتارخانیہ

تغلقیوں کے عہد کے مشہور امیر کبیر تاتارخاں (6) ہیں، جن کے حکم سے ''فتاویٰ تتارخانیہ'' مُدون ہوا۔ ان کے حالات میں صاحب ''نزہتہ الخواطر'' نے لکھا ہے:

صنف کتابا فی التفسیر و سماہ التاتار خانی وھوا جمع ما فی الباب.

''انہوں نے ایک کتاب تفسیر میں لکھی جس کا نام تاتارخانی ہے اور اپنے موضوع میں وہ ایک جامع کتاب ہے۔''

خیر! فضل کے درجہ کی لازمی درسی کتاب ''کشاف'' ہی معلوم ہوتی ہے، حدیث میں ''مشارق الانوار'' کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ''مصابیح'' بھی پڑھائی جاتی تھی۔

فن ادب

یہ تو دینیات کی کتابوں کی کیفیت تھی۔ باقی نحو وصرف کے سوا علمِ آلیہ میں معانی وبیان، بدیع، عروض وقوافی کی کتابوں کے ساتھ ادب کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ عام طور پر ان کو علومِ عربیت یا لغت ہی کہتے تھے۔ میر خورد نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

''بقدر دوازدہ سالہ کم وبیش لغت می خواندم۔''

سلطان المشائخ ہی کے ایک مرید مولانا شمس الدین دہلوی کے ذکر میں صاحب ''نزہتہ'' نے نقل کیا ہے:

کان فاضلاً بارعاً فی العروض والقوا فی والشعر ولا نشاء و کثیر من العلوم و الفنون. (56)

''یہ فن عروض و قوافی شعر و انشا وغیرہ علوم میں ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔''

ادب و معانی سے شغف

افسوس ہے کہ ان علوم کی کتابیں جو اس عہد میں زیرِ درس تھیں، تفصیل سے ان کا پتہ نہیں چلتا البتہ مولانا معین الدین عمرانی کے ذکر میں گذر چکا کہ انہوں نے سکاکی کی ''مفتاح العلوم'' پر شرح لکھی تھی۔ بظاہر قیاس یہی ہوتا ہے کہ یہی کتاب معانی بیان و بدیع میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ تفتازانی کی دونوں کتابیں مختصر و مطول بعد کو ہندوستان پہنچیں۔ اسی طرح ادب میں صرف ''مقاماتِ حریری'' کا پتہ چلتا ہے۔ سلطان المشائخ نے تو حریری زبانی یاد کی تھی۔ شیخ محدث دہلوی کے اس بیان سے کہ ''مقاماتِ حریری پیش شمس الملک کہ صدر ولایت بود تلمذ کرد و یاد گرفت۔'' (ص 55) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید پوری حریری حضرت نے یاد فرمائی تھی، لیکن میر خورد نے لکھا ہے کہ:

> شمس الملۃ والدین کہ در علم و فضل در عصر خود مستثنیٰ بود و بیشترے استادانِ شہر شاگرد او بود ایں علم بحث کرد و چہل مقالہ حریری یاد گرفت (سیر الاولیاء۔ ص 101)
>
> ''شمس الملۃ والدین جو علم و فضل کے اندر اپنے زمانہ میں ممتاز تھے، اور شہر کے اکثر اساتذہ ان کے شاگرد تھے، علم ادب حاصل کیا اور حریری کے چالیس مقالے زبانی یاد کیے۔''

جس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ صرف حریری ہی آپ نے شمس الملک سے نہیں پڑھی تھی بلکہ ''ایں بحث کرد'' یعنی علم ادب کی تعلیم ان سے حاصل کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کامل حریری نہیں بلکہ اس کے چالیس مقالے یاد کیے تھے۔

کتب معقولات آٹھویں صدی میں

بہرحال اس زمانہ کے ضروری اور نصاب فضل دونوں کے متعلق جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصولِ فقہ کی دینیات میں اور نحو و صرف، ادب، معانی، بیان وغیرہ کی عربیت کے سلسلہ میں تعلیم ہوتی تھی۔ ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ تعلیم کس حد تک کافی ہو سکتی تھی، اس کا ذکر تو ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ میں بالفعل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معقولات کے جس الزام سے ہندی نظامِ تعلیم کو بدنام کیا جا رہا ہے اس کا ان صدیوں میں یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی میں پتہ بھی نہیں چلتا۔ انتہا یہ ہے کہ منطق و فلسفہ، ریاضی وغیرہ تو دور کی چیزیں ہیں۔ علم کلام تک کی کتابوں کا ذکر عام علماء کے تدریسی نظام میں نہیں ملتا، البتہ آٹھویں صدی جب ختم ہو رہی تھی اور دلی میں لودیوں کے آہنی پنجوں نے پھر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سلطان سکندر لودھی کے عہد میں جو ایک خاص تعلیمی انقلاب ہوا جس کا ذکر ابھی آ رہا ہے، اس وقت کتابوں میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے، مُلا عبد القادر بداؤنی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از منطق و کلام در ہند شایع نہ بود۔''

(بداؤنی۔ ج1، ص324)

سکندر لودھی 894ھ میں تخت نشین ہوا، یعنی نویں صدی گویا گذر رہی تھی، اس وقت تک یہاں کے نصاب میں منطق اور کلام دونوں علوم کا سرمایہ لے دے کر قطبی اور شرح صحائف پر ختم ہو جاتا تھا۔ قطبی کو خیر سب ہی جانتے ہیں، لیکن یہ شرح صحائف کوئی اتنی ہی معمولی کتاب ہے کہ طاش کبریٰ زادہ نے اس کی شرح کا تو ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ صحائف کے متن کے متعلق لکھا ہے:

الصحائف للسمر قندی لم افقه علی ترجمة. (ص49)

''صحائف سمرقندی کی کتاب ہے، میں سمرقندی کے حالات سے مطلع نہ ہو سکا۔''

علم کلام اور فتاویٰ تتارخانیہ

بہرحال شرح شمسیہ یعنی قطبی کے ساتھ ممکن ہے کہ منطق کے بعض چھوٹے رسائل ایساغوجی وغیرہ بھی پڑھائے جاتے ہوں، بلکہ کلام کی حالت تو اس سے بھی زبوں تر معلوم ہوتی ہے۔ فتاویٰ تتارخانیہ میں کلام اور کلامی مباحث کے متعلق یہ عجیب فقرے پائے جاتے ہیں، جسے خصوصیت کے ساتھ دولت ترکیہ عثمانیہ کے ایک عالم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ہندوستان کے علماء کا جو خیال اس زمانہ تک علم کے متعلق تھا چونکہ اس کا پتہ چلتا ہے۔ میں بھی نقل کرتا ہوں، فتاویٰ تتارخانیہ میں علمِ کلام کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔

انها تودی الیٰ اثارة الفتن و البدع و تشویش العقائد اویکون الناظر فیه قلیل الفهما و طالباً للغلبة لاللحق. (منقول از مفتاح السعادہ)

''علمِ کلام کے مسائل سے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور نئی باتیں بدعات کو گویا برانگیختہ کرنا ہے۔ عقائد میں ان سے پراگندگی اور پریشانی پھیلتی ہے۔ یا کلامی مسائل سے دلچسپی لینے والے عموماً کم سمجھ ہوتے ہیں یا ان کا مقصود تلاش حق نہیں بلکہ صرف دونوں کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔''

علم کلام کے نقصانات

آج ممکن ہے کہ قدیم علمائے ہند کے اس فیصلہ کو تنگ نظری پر محمول کیا جائے، لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ کلامی مباحث جس زمانہ میں بھی کسی ملک میں چھڑے ہیں، بجز فتنوں کی پیدائش اور نئے نئے خیالات، نئی نئی موشگافیوں کے اس کا حاصل کسی زمانہ میں بھی کچھ نکلا ہے؟

''غیبی حقائق''، یعنی جن سے عموماً علمِ کلام میں بحث کی جاتی ہے مثلاً عذاب قبر، حشر و نشر، الجنۃ والنار، معادیات کے سلسلہ میں یا حق تعالیٰ کی صفات و ذات کے مسائل مبداء میں، ان کے متعلق صاف اور سیدھا راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ

پیغمبر کو سچا مان کر پھر جو کچھ پیغمبران غیر محسوس غیبات کے متعلق علم عطا کرتے چلے جائیں، بغیر کسی ترمیم واضافہ کے آدمی اس کو مانتا چلا جائے جو صحابہ کا حال تھا، ورنہ دوسری راہ یہ ہے کہ سرے سے پیغمبر کے دعوئے نبوت ہی کا انکار کر دیا جائے، لیکن پیغمبر کو سچا بھی مانتے چلے جانا، اور ہر وہ علم جو پیغمبر عطا کرتے ہوں اس میں شک اندازی بھی کرتے رہنا، سوچنے کی بات ہے کہ بلادتِ فہم، قلتِ عقل کے سوا اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے یا پھر وہی بات ہوتی ہے کہ بعض ناپاک ونجس اغراض کو سامنے رکھ کر لوگ ان مباحث میں اس لیے الجھتے ہیں تا کہ اپنی ذہانت کی داد لیں، انشاء کا زور دکھا کر عوام کو احمق بنائیں جس کا تماشا آج ہم ان رسائل واخبارات میں دیکھ رہے ہیں، جنہوں نے اس قسم کے مذہبی مسائل کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ کبھی جنت کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے، کبھی ملائکہ کا، کبھی عرش کا، کبھی کرسی کا۔ کیا اپنے تفوق کے سوا ان لوگوں کے سامنے تلاشِ حق کا واقعی کوئی جذبہ ہوتا ہے؟

میں تو خیال کرتا ہوں کہ صرف یہی چند فقرے ان تازہ دم زندہ مسلمانوں کی صحتِ فہم، سلامتِ ذہن کا کافی ثبوت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ زندہ قوموں کی زندگی کی پہلی علامت یہی ہوتی ہے کہ قدرت ان کے فہم عموی کو سلجھا دیتی ہے۔ اس کا کتنا کھلا ثبوت ہمیں ان مسلمانوں کی اس رائے میں مل رہا ہے جو پردیس میں آباد ہونے اور اپنا دین پھیلانے کے لیے اس ملک میں حاکمانہ قوتوں کے ساتھ آئے تھے۔

خیر اس وقت میری بحث کا دائرہ صرف ایک تاریخی مسئلہ تک محدود ہے۔ کہنا یہی چاہتا تھا کہ معقولات کا جو الزام ہندوستان کے اسلامی نصاب پر لگایا جاتا ہے اس کی ابتدائی تاریخ تو یہ تھی کہ دو سال یعنی سکندر لودھی کے زمانہ تک معقولات کا جتنا حصہ ہمارے نصاب میں پایا جاتا تھا، وہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اتنے دنوں تک ہندوستان ان عقلی علوم سے ناآشنا رہا، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مسئلہ تو نصاب کا ہے، نصاب کی حد تک تو میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف ضروری بلکہ فضل کے درجوں میں بھی معقولات کا عنصر صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، یعنی لازمی طور پر اس نصاب کے ختم کرنے والوں کو معقولات کی جن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا وہ صرف یہ تھیں، لیکن جو لوگ کسی خاص فن یا شعبۂ زندگی میں ترقی کرنا چاہتے تھے ان کے لیے راستہ بند نہ تھا۔

فن تاریخ اور تعلیمی نصاب

اسی زمانہ میں جس وقت اس ملک میں مذکورۂ بالا نصاب نافذ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ عوام ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سلاطین وملوک کے متعلق کتابوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً محمد تغلق ہی کے متعلق آپ کو عام تاریخوں میں یہ فقرہ ملے گا:

"در اکثر علوم خصوص تاریخ و معقولات ونظم وانشاء وغیرہم مہارت تام داشت۔"

(سیر المتاخرین۔ ج1، ص224)

''اکثر علوم بالخصوص تاریخ، معقولات اور نظم وانشاء میں مہارت نامہ رکھتا تھا۔''

ظاہر ہے کہ جن فنون میں محمد تغلق کی خصوصی مہارت کا ذکر کیا گیا ہے ان میں تاریخ تو ایسا علم اس زمانہ میں نہیں سمجھا جاتا تھا، جس میں وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے آدمی استاد کا محتاج ہو۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں عہدِ حاضر سے پہلے کسی ملک اور قوم نے تاریخ کو تدریسی مضمون نہیں قرار دیا تھا، بلکہ ہمیشہ اس فن کا شمار ان فنون میں تھا، جن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ صرف مسلمانوں نے اپنے عہد میں تاریخ کے اس حصہ کو جس کا تعلق نبوت وعہدِ نبوت وصحابہ سے تھا، چونکہ دین کی بنیاد اس پر قائم تھی۔ اس لیے حدیث وسیر کے نام سے ایک خاص فن مرتب کر کے انہوں نے درس میں داخل کیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے یورپ نے اپنے نشأۃِ جدیدہ میں حدیث ہی کی جگہ اپنے اسلاف یونان وروما کی تاریخوں کو تعلیمی نصاب میں داخل کیا۔ بتدریج پھر یہی ذوق اتنا غالب آیا کہ یونانیوں اور رومیوں سے آگے بڑھ کر ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ جدید یونیورسٹیوں میں شریک نصاب ہوگئی اور گو عام طور سے اس زمانہ میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ تاریخی واقعات کی تنقیح وتنقید کے اصول کو ابتداً یورپ نے مشہور اسلامی مورخ ابن خلدون سے سیکھا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابن خلدون نے اصولِ حدیث ہی کی روشنی میں بجائے خاص روایات کے عام تاریخی حوادث وواقعات پر بھی ان کو منطبق کرنا چاہا ہے۔

تاریخ اور ہندوستان

حقیقت یہ ہے کہ یوں بھی اسلامی مورخین کے ایک بڑے طبقہ کی نگاہوں سے تحقیق وتنقید کے یہ قاعدے اوجھل نہیں تھے۔ البرنی نے ایک ہندوستانی مورخ مولانا کبیر الدین دہلوی کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں میں اُن کا ترجمہ ''نزہتہ الخواطر'' سے نقل کرتا ہوں، آپ ان پر غور کیجیے۔ البرنی مولانا کبیر الدین دہلوی کو ان الفاظ میں روشناس کرتے ہیں:

احد العلماء البارعين فى السير و التاريخ لم يكن له نظير فى عصره فى الانشاء والترسل و البلاغة لانشاء بليغ بالعربية و الفارسية و مصنفات عديارة فى التاريخ.

''ان علماء میں تھے جنہیں سیر وتاریخ میں خاص امتیاز حاصل تھا، انشاء اور فن ترسل وبلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، عربی وفارسی میں ان کے بلیغ انشاء کے نمونے موجود ہیں، ان کی متعدد کتابیں تاریخ میں بھی ہیں۔''

ان مدحی الفاظ کے بعد سنیے، وہی لکھتے ہیں:

صنف كتبا فى فتوح السلطان علاء الدين محمد شاه الخلجى و لكنه بالغ فيها فى المدح و الاطراء و التانق فى العبارة خلافاً لأداب المورخين من ايراد

الخير والشر والحسن والقبح و المناقب و المعائب. (نزہتہ۔ص 11)

''انہوں نے علاؤ الدین خلجی کی فتوحات کے متعلق چند کتابیں لکھیں لیکن اپنی ان کتابوں میں بادشاہ کی مدح سرائی میں مبالغہ کیا اور عبارت میں زبردستی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جو مورخین کے طریقے کے خلاف ہے یعنی مورخ کا فرض تو یہ ہے کہ بھلی بری تعریف کی ہو یا مذمت کی سب ہی طرح کی باتیں جو واقع ہوئی ہوں، انہیں بیان کرے۔''

گو چند مختصر فقرے ہیں لیکن اسی سے آپ کو اسلامی مورخین کے اس نقطۂ نظر کا سُراغ مل سکتا ہے جو تاریخی واقعات کے اندراج میں ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

تاریخ کی حقیقی حیثیت

بلکہ سچ یہ ہے کہ اس زمانہ کی تاریخوں کی وثاقت واعتماد کا خواہ جتنا بھی جی چاہے ڈھنڈورا پیٹا جائے اور اس کے مقابلہ میں اسلامی مورخین کی تحمیق وتجہیل میں جتنا بھی مبالغہ کیا جائے لیکن جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اس کا کیسے انکار کیا جائے۔ آج بجائے تاریخ نگاری کے تاریخ سازی کا جو کام ہر قوم انجام دے رہی ہے، رائی سے پربت بنانے کی جو کوششیں مسلسل جاری ہیں، مقصد پہلے طے کر لیا جاتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے واقعات جمع کیے جاتے ہیں، ان میں پیشہ وارانہ چابکدستیوں سے رنگ بھرا جا رہا ہے اور ان ہی بنیادوں پر ایسی گمنام کسمپرسی قومیں جو چند صدیوں پہلے کسی شمار وقطار میں بھی نہ تھیں، انتہائی دیدہ دلیریوں کے ساتھ ان کی تہذیب وتمدن کا افسانہ اونچے سُروں میں گایا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس ومیکانکی ترقیوں کا موجودہ عہد بھی ان کے سامنے بے حقیقت تھا۔ ایک طرف تو یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف تحقیق وتنقید کے ان مدعیوں کو دیکھا جا رہا ہے کہ گزشتہ واقعات ہی نہیں، بلکہ جن حوادث سے دنیا اس وقت گذر رہی ہے، اُن ہی کی تعبیر ہر قوم کے مورخین ایسے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کے بیان کو صحیح مانا جائے تو دوسرے کے بیان کو قطعی جھوٹ قرار دینے پر انسانی منطق مجبور ہو جاتی ہے۔ ابھی ابھی چند سال پیشتر جنگ عظیم کے حادثہ ہائلہ سے یورپ نکلا ہے، جنگ کے مختلف فریقوں نے دن کی روشنی کے اس واقعہ کو جن شکلوں میں پیش کیا ہے، کیا ان سے حقیقت تک پہنچنا آسان ہے؟

اسلامی مؤرخین اور فنِ تاریخ

لیکن آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ اسلامی مورخین کے ابوالآبا علامہ ابن جریر طبری المولود 224ھ نے آج سے تقریباً ہزار سال پیشتر اپنی مشہور تاریخ کے دیباچہ میں حسب ذیل رائے تاریخی واقعات کے اندراج میں قلم بند کی ہے:

وليعلم الناظر فى كتابنا هذا ان اعتمادى فى كل ما احضرت ذكره فيه ماشرطت انى راسمه فيه انما هو على ماروبت من الاخبار اللتى اناذا كرها

والأثار اللتی انا مسند ھا الیٰ رواتھا دون ما ادرک بحجج العقول و استنبط بفکر النفوس الا الیسیرا بقلیل منه.

''میری کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کتاب میں جن واقعات کے ذکر کا میں نے ارادہ کیا ہے اور جن کی نگارش کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے، ان کے متعلق میرا بھروسہ صرف ان خبروں پر ہوگا، جن کا میں اس کتاب میں ذکر کروں گا اور جن کی سند ان واقعات کے بیان کرنے والوں تک میں پہنچاؤں گا۔ لیکن عقلی استدلال اور ذہنی قیاس سے جو نتائج پیدا کیے جاسکتے ہیں میں اُن کا ذکر نہیں کروں گا، مگر بہت تھوڑی نادر چیزیں۔''

اس کے بعد علامہ اپنے اس طرزِ عمل اور التزام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اذا کان العلم بما کان من اخبار الماضیین وما ھو کائن من انباء الحادثین غیر واصل الیٰ من لم یشاھدھم ولم یدرک زمانھم الا باخبار المخبرین و نقل الناقلین دون الا ستخراج بالعقول ولا استنباط بفکر النفوس.

(الطبری۔ ج1،ص5)

''کیونکہ گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات اور جو حوادث گذر چکے ہیں ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، اور نہ انہوں نے ان کا زمانہ پایا ہے، ان حوادث کے متعلق نقل کرنے والوں نے جو نقل کیا ہو، ان کے علم کی یہی صورت ہے نہ کہ عقلی قیاس آرائیوں اور فکری جولانیوں کی راہ سے ان کا علم حاصل کیا جائے۔''

ذمہ داری کا یہی صحیح احساس اسلامی مورخین میں اس وقت تک بیدار رہتا تھا جب وہ واقعات کو اپنی کتابوں میں درج کرتے تھے، اسی لیے ہر قسم کے جنبہ داریوں سے الگ ہوکر ایک مورخ کا جو فرض ہوسکتا ہے وہ ادا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کبیر الدین دہلوی کی تاریخ ناقابلِ اعتبار ٹھہرائی گئی۔ ان پر الزام یہی لگایا گیا ہے کہ خیر کے ساتھ شر کا، اچھی باتوں کے ساتھ بُری باتوں کا، حسن کے ساتھ قبح کا، مناقب ومحامد کے ساتھ معائب ومثالب کا ذکر انہوں نے نہیں کیا، جو مورخ کے فرضِ منصبی کے قطعاً خلاف ہے، لیکن کیا کیجیے کہ تنقید وتحقیق، تبصیر وتفتیش کے ان بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ جن کے چرچوں سے کان بہرے ہوگئے ہیں عملاً اس زمانہ کا محقق مورخ جو کچھ بھی کررہا ہے وہ یہی کررہا ہے۔

اسلامی مورخین کی دیانتداری

''المعجب فی اخبار المغرب'' غلام محی الدین ابومحمد بن عبدالواحد المراکشی کی مشہور کتاب ہے۔ مغرب اقصےٰ اور اندلس کے حالات کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے، حالانکہ المراکشی کے قلم سے عیسائی بادشاہوں کے ذکر میں بے اختیار ''طعنة الله'' کے الفاظ عموماً اس کتاب میں مسلسل نکلتے چلے گئے ہیں لیکن باوجود اس کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک

جنگ کے حالات درج کرتے ہوئے المراکشی نے لکھا کہ عیسائی شہر دند میں محصور تھے، مسلمانوں نے معاشی دروازے ہی ان پر صرف باہر سے بند نہیں کیے، بلکہ شہر میں پانی جس راستے سے جاتا تھا اس کو بھی بند کر دیا۔ عیسائی سخت پریشان ہوئے، پیاس سے لوگ مرنے لگے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ شہر میں کافی شور و غل مچا ہوا ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ پیاس سے تنگ آ کر عیسائیوں کے مذہبی پیشوا دعا میں مشغول ہیں اور عوام آمین کہہ رہے ہیں، اس کا ہنگامہ ہے۔ المراکشی کا بیان ہے کہ اچانک بادل اٹھا اور اس زور کی بارش ہوئی کہ گویا مشکوں کا منہ کھول دیا گیا ہے۔ عیسائیوں کی دعا قبول ہوئی اور انہوں نے شہر کے آبی خزانوں (مہاریج) کو بارش کے پانی سے بھر لیا اور اتنی قوت اس کے بعد ان کو حاصل ہوئی کہ مسلمانوں کے بادشاہ امیر المومنین ابو یعقوب کو محاصرے کے اٹھا لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ (معجب۔ ص 181) سوال یہی ہے کہ مسلمان مورخ کے سوا کسی قوم کے مورخوں کے دل و جگر میں اتنی قوت ہو سکتی ہے کہ ایک واقعہ جس کی توجیہ اتفاقی حوادث سے ہی ہو سکتی ہے، لیکن وہ غیر مسلم قوم کی دعا کا نتیجہ اس واقعہ کو قرار دیتا ہے۔

بہر حال میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا جب کبھی فیصلہ کے لیے آمادہ ہوگی تو اس کے سامنے کچھ قومیں تو ایسی نظر آئیں گی جن کے حال کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی ان کی کوئی قومی تاریخ ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر اقوامِ عالم کا یہی حال ہے اور عصر جدید کی روشنی میں قومیں جو اپنی تاریخیں بنا رہی ہیں، چونکہ یہ تاریخیں لکھی نہیں گئی ہیں بلکہ بنائی گئی ہیں اس لیے ان پر اعتماد کی کوئی امکانی صورت آنے والوں کے سامنے باقی نہ رہے گی۔ لے دے کر تاریخ کا جو حصہ بھی اسناد کا درجہ حاصل کرے گا وہ اسلامی مورخین کی یہی غیر جانبدارانہ تاریخیں ان شاء اللہ ثابت ہوگی، مگر دنیا کبھی انصاف کے لیے آمادہ ہوگی، اس کی توقع مشکل ہے۔

حواشی

(1) خاکسار نے مولانا برکات احمد ٹونکیؒ سے "مبحث علم" کا رسالہ قطبیہ اس طریقہ سے پڑھا تھا۔ قطبیہ، قطبیہ کی شرح میر زاہد کا منہیہ، پھر دونوں کے حواشی غلام یحییٰ بہاری کے، پھر مولانا عبد العلی بحر العلوم کا حاشیہ اور ان سب پر مولانا عبد الحق خیر آبادی کا حاشیہ، بیچ بیچ میں خود مولانا بھی اپنے ان حواشیو کو پڑھاتے تھے جو اپنے استاذ کے حاشیہ پر انہوں نے لکھے تھے یعنی مولانا عبد الحق کے حاشیہ پر حاشیہ۔

(2) ہندی مسلمانوں کا تعلیمی نصاب جیسا کہ معلوم ہے خراسانی تعلیم گاہوں کے نصاب کا تابع تھا، ہم خراسان کے مشہور شہر ہراۃ کے متعلق پڑھتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری تک مکتب خانوں میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ عربی ادب کی تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ کمسن بچے فارسی اشعار کا شعر ہی کی شکل میں بزبان عربی ترجمہ کرنے کی قدرت پیدا کر لیتے تھے۔ جامی نے "نفحات الانس" میں شیخ الاسلام انصاری کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ان ہی کی زبانی ان کی تعلیمی سرگزشت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتداء میں "دبیرستان زنی" یعنی زنانہ مدرسہ میں داخل کیے گئے، جب چار سال عمر ہوئی تب مردانہ مکتب خانے میں شریک ہوئے، مکتب ہی کی زندگی میں فرماتے ہیں

کہ میں عربی میں شعر کہنے لگا ایک مکتبی ساتھی نے ان سے کہا کہ فارسی مصرعہ۔ ''آب آید باز در جوئے کہ روزے رفتہ بود۔'' کا ترجمہ عربی میں کرو، ان کا بیان ہے کہ فی البدیہہ اسی وقت میں نے عربی کا یہ شعر لکھ کر دیا۔ ''عھد نا الماء فی نھرونر جو کماز عموا رجوع الماء فیه'' اور بھی اس قسم کی چند چیزوں کا شیخ الاسلام نے تذکرہ کیا ہے (نفحات۔ص 304) جس سے چند باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں باضابطہ ''دبیرستان زنانی'' کا بھی رواج تھا، اور عمر کی خاص حد تک بچے اور بچیوں کو ساتھ تعلیم دی جاتی تھی، آخری بات وہی کہ فارسی کے ساتھ بچپن ہی میں عربی کی تحریر وتقریر کی مشق پر بھی کافی زور دیا جاتا تھا، ممکن ہے کہ تاتاریوں کے حملہ کے بعد عربی کا اتنا زور مکاتب میں نہ باقی رہا ہو، لیکن رسم قدیم کے مٹے مٹائے نشانات اگر کچھ دنوں بالکلیہ مٹنے سے محفوظ رہ گئے ہوں تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ہندوستان کے تعلیمی نصاب پر بھی اس کا اثر پڑا ہو تو یہ قرین قیاس ہے۔

(3) مُلّا عبدالقادر بداؤنی اپنی تاریخ کے متعدد مقامات پر اس قسم کی عبارت لکھتے ہیں مثلاً شیخ وجیہ الدین گجراتی کے متعلق ہے کہ ''از صرف ہوائی تا قانون شفاء ومفتاح'' یعنی صرف ہوائی سے لے کر ان بڑی بڑی کتابوں جیسے قانون وشفا ابن سینا، مفتاح سکا کی پر ان کے حواشی ہیں جس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند میں فلسفہ طب، بلاغت کی یہ اعلیٰ کتابیں مروج تھیں، ان ہی کے ساتھ ''صرف ہوائی'' کتاب بھی اس زمانہ میں ابتدائی کتاب صرف کی تھی۔

(4) مُلّا صاحب نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ''تفسیر حدیث وسیر، تاریخ خوب می دانست'' حدیث ہی کا غالباً اثر تھا کہ ''در قرأت فاتحہ عقب امام نسبت بہ میاں می گفت'' یعنی ان کی طرف منسوب ہے، کہ قرأۃ خلف الامام کے قائل تھے۔ (بداؤنی۔ج 3)

(5) تفسیر نیشاپوری کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان ہی میں بمقام دولت آباد دکن لکھا گیا ہے۔ خود اسی کتاب میں سورۃ النساء کے خاتمہ پر مصنف ہی نے لکھا ہے۔ **علقه الحسن بن محمد المشتهر بنظام الينشاپوری ببلاد الهند فی دار مملكتها المدعو بدولت آبادی اوائل صفو** 730ھ دیکھو تفسیر مذکور بر حاشیہ (جریر طبری۔ ج6، ص30) یعنی 730ھ میں بمقام دولت آباد کتاب کا یہ حصہ لکھا گیا اور یہ وہی زمانہ ہے جب دلّی کو اُجاڑ کر محمد تغلق نے دولت آباد کو بسانا چاہا تھا۔ بظاہر مصنف کتاب بھی دلّی سے دولت آباد تمام مہاجرین کے ساتھ آئے۔ آٹھویں صدی کے آغاز کی غالباً یہ پہلی تفسیر ہے جس میں معنوی خصوصیات کے ساتھ بڑی خصوصیت ترجمہ کی ہے۔ ایران میں جو نسخہ اس کا چھپا ہے اور بعض قلمی نسخے اس کے فقیر کی نظر سے گذرے ہیں سب میں بالالتزام بزبان فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ درج ہے۔ کیا تعجب ہے کہ محمد تغلق ہی کے اشارہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہو۔

(6) امیر تاتار خاں کی شخصیت بھی اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق کو اپنے فتوحات کے سلسلہ میں ایک پڑا ہوا بچہ ملا جس کے متعلق معلوم ہوا کہ آج ہی کا پیدا شدہ ہے۔ بے رحم ماں باپ اس بچہ کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے۔ بادشاہ کو بچہ پر ترس آیا اور حکم دیا کہ شاہی نگرانی میں اس بچہ کو لے لیا جائے۔ یوں تاتار خاں کی پرورش شاہی محل میں ہونے لگی۔ خدا کی شان جب جوان ہوئے تو غیر معمولی دل ودماغ کا ثبوت پیش کرنے لگے۔ غیاث الدین نے ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ کی اور خاص لوگوں میں ان کو داخل کر لیا۔ محمد تغلق کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی بڑے بڑے جلیل عہدوں کے فرائض انجام دیئے۔ فیروز کے عہد میں وزارت کے منصب پر مدتوں قابض رہے، علم سے خاص دلچسپی تھی، تاتار خاں کے حکم سے مولانا عالم نے چار ضخیم جلدوں میں فقہ حنفی کا فتاویٰ مرتب کیا جس نے تمام اسلامی ممالک میں خاص شہرت حاصل کی، حلب کے ایک عالم ابراہیم بن محمد نے اس فتاویٰ کی ایک تلخیص بھی تیار کی ہے، ''کشف الظنون'' میں اس فتاویٰ کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے اکثر علماء کو بھی نہیں معلوم کہ یہ فتاویٰ کہاں تیار ہوا، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ تاتاریوں میں سے کسی مسلمان بادشاہ کی مرتب کرائی ہوئی کوئی چیز ہے۔ کتابوں میں بکثرت اس کے حوالے آتے ہیں۔ اور ایک یہی کیا ''فتاویٰ حمادیہ'' حنفی فقہ کا کتنا مشہور فتاویٰ ہے، لیکن کون جانتا ہے یہ کتاب بھی ہندوستان ہی میں لکھی گئی۔

ہندوستان اور معقولات

یہ تو ایک ذیلی بات تھی جس کا ذکر کردیا گیا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ محمد تغلق کے متعلق جب کہا جاتا ہے کہ معقولات میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا تو اس مہارت کا کیا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اس نے عام مروجہ نصاب کے مطابق صرف قطبی اور صحائف تک علومِ عقلیہ کی تعلیم ختم کردی تھی، اور باوجود اس کے بھی اس کا شمار فنونِ عقلیہ کے ماہرین میں تھا یا یہ خیال درست ہوسکتا ہے کہ درساً تو اس کی تعلیم عقلی علوم کی انہیں کتابوں تک محدود تھی، آئندہ اس نے صرف مطالعہ کے زور سے اپنی قابلیت بڑھائی تھی۔

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قطبی صرف منطق کی ایک کتاب ہے، فلسفہ کے کسی مسئلہ سے اس کتاب سے دور کا بھی تعلق نہیں رہی صحائف وہ تو عقائد کی ایک مختصر کتاب تھی، بھلا اس کے پڑھنے والے کو نظر الٰہیات، طبعیات و ریاضیات وغیرہ کے فلسفیانہ ابواب تک کیسے پہنچ سکتی ہے، اور نہ ان کتابوں کو پڑھ کر بذاتِ خود کوئی شفاء اشارات مجسطی وغیرہ کا مطالعہ کرسکتا ہے اور ہم محمد تغلق کو دیکھتے ہیں کہ وہ زیادہ شائق اِن ہی کتابوں کا تھا۔

ایک معقول کتاب پر انعام

''البدر الطالع'' شوکانی کے حوالے سے صاحبِ نزہت نے محمد تغلق کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''اھدی الیہ رجل اعجمی الشفاء لا بن سینا بخط یاقوت فی مجلد واحد فاجازہ بمال عظیم یقال انہ قدرہ مائتا الف مثقال او اکثر.'' (ص135)

'' ایک ایرانی شخص نے محمد تغلق کے دربار میں ابن سینا کی شفاء کا ایک نسخہ پیش کیا جو یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور ایک جلد میں تھا، تغلق (اس سے اتنا خوش ہوا) کہ پیش کرنے والے کو اس نے بڑا انعام دیا جس کا اندازہ کیا گیا تو دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ ہوگا۔''

کتابوں کے پیش کرنے پر جواہرات کا شاہی انعام

اس کی تصریح شوکانی نے نہیں کی ہے کہ مثقال سے کیا مراد ہے۔ چاندی کی یہ مقدار تھی یا سونے کی ''صبح الاعشیٰ''

میں بھی قلقشندی نے ابن الحکیم الطیاری کے حوالے سے تغلق ہی کا یہ قصہ نقل کیا ہے:

ان شخصاً قدم له کتبا یحثی له حیثة من جوهر کان بین یدیه قیمتها عشرون الف مثقال من الذهب. (ج5،ص95)

''ایک آدمی نے محمد تغلق کے سامنے چند کتابیں پیش کیں، تو بادشاہ نے جواہرات جو اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے حوالہ کیے، ان جواہرات کی قیمت سونے کے سکہ کے لحاظ سے بیس ہزار مثقال تھی۔''

محمد تغلق اور استاذ کی قدر افزائی

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں بھی عقلیات ہی کی تھیں، بہر حال محمد تغلق کے اس اعلیٰ فلسفیانہ مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ کسی اُستاد سے پڑھے بغیر اتنی بصیرت ان علوم میں اس نے پیدا کر لی تھی۔ آخر فلسفہ تاریخ نہیں ہے جس میں مزاولت اور کثرت مطالعہ سے آدمی چاہے تو تبحر پیدا کر سکتا ہے۔ پھر جب تاریخ ہمیں بتلاتی یہی ہے کہ مولانا عضدالدین جن کے متعلق ''نزہتہ الخواطر'' میں ہے:

احد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمة

''منطق و فلسفہ کے سر برآوردہ علماء میں سے ایک ہیں۔''

اور یہی مولانا عضدالدین تغلق کے اُستاد تھے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے کہ:

قرأ علیه شاه محمد تغلق

''محمد تغلق شاہ نے انہی مولانا عضدالدین سے تعلیم پائی تھی۔''

ان کی تعلیم سے محمد تغلق کس حد تک متاثر تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو اسی کتاب میں ہے:

اعطاء اربعة ماته الاف تنکه یوم ولی الملک.

چار لاکھ تنکے اس نے مولانا کو اس دن عطا کیے جس دن وہ ملک کا والی ہوا'' (یعنی تخت نشین ہوا۔)

منطق و فلسفہ کی قدر و منزلت

میرا خیال ہے کہ تغلق نے ان ہی مولانا عضدالدین سے فلسفہ اور معقولات کی کتابیں پڑھی تھیں، اب ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ کا رجحان ان علوم کی طرف ہو، ناممکن ہے کہ ملک کے عام باشندوں پر اس کا اثر نہ پڑے۔ بھلا جس زمانہ میں منطق و فلسفہ کے اساتذہ کو چار چار لاکھ روپیہ وقتِ واحد میں بمد انعام بخشا جاتا ہو، فلسفہ کی ایک ایک کتاب کے معاوضہ میں پیش کرنے والے کو دو دو لاکھ مثقال مل رہے ہوں۔ اس زمانہ میں لوگوں کا جتنا رجحان بھی ان علوم کی طرف زیادہ ہو گیا ہو، محلِ تعجب نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جب ''الناس علیٰ دین ملوکھم'' کے عام کلیہ کا ممالک پر

زیادہ اثر ہو۔

معقولی علماء

غالباً یہی وجہ ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے علماء جو منطق وفلسفہ، ریاضی، ہیئت و ہندسہ میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ دلّی میں ان کی معقول تعداد پائی جاتی ہے۔ وہی مولانا معین الدین عمرانی جو شیراز قاضی عضد الدین کولانے کے لیے بھیجے گئے تھے، علاوہ علوم دینیہ کے لکھا ہے کہ:

کان ذاقوة فی النظر و مما رسته جیدة فی المنطق والکلام. (ص165)

''ان کی نظری قوت بڑی دقیق تھی، منطق اور کلام میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔''

محمد تغلق ہی کے درباریوں میں ایک مولانا علم الدین بھی تھے، برنی نے اپنی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ان کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ معقولات کے تمام فنون میں یگانۂ روزگار تھے۔ صاحب ''نزہتہ'' نے بھی لکھا ہے:

احد العلماء المبزرین فی العلوم الحکمیة ...... کان یدرس ویفید بدهلی.

''علوم حکمیہ (فلسفیانہ علوم) میں ان کا شمار سربرآوردہ لوگوں میں تھا۔ یہ دلّی میں درس دیتے تھے اور لوگوں کو علمی فوائد پہنچاتے تھے۔''

آگے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''**جعله محمد شاه تغلق ندیماله و کان یقربه ویذاکره فی العلوم.** (ص85)

محمد شاہ تغلق نے ان کو اپنا مصاحب بنا لیا تھا، بادشاہ کے مقربین میں تھے، محمد شاہ ان سے علمی مسائل میں بحث ومباحثہ کرتا تھا۔''

اور کچھ ایک محمد تغلق کی خصوصیت نہیں ہے۔ تغلق سے پہلے اور تغلق کے بعد جن جن خاندانوں کے سلاطین دلّی میں یا دوسری صوبہ داری حکومتوں میں تھے تقریباً ہر ایک کے زمانہ میں ان علوم کے ماہرین کا ایک گروہ پایا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان کو اسی لیے وظائف، جاگیر وغیرہ دے کر بٹھا دیتی تھی کہ ملک میں نصابی علوم کی تعلیم کے بعد کسی خاص فن کا اگر کسی کو ذوق ہو تو اپنی اس علمی پیاس کو ان لوگوں سے بجھا سکتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز دہلوی

فیروز تغلق کے زمانہ میں مولانا عبدالعزیز دہلوی ایک مشہور عالم تھے جن کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے ''**احد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیة**'' یعنی فلسفیانہ علوم میں اپنے وقت کے سربرآوردہ لوگوں میں تھے، صاحب ''نزہتہ'' نے لکھا ہے کہ ان ہی مولانا عبدالعزیز نے سنسکرت کی ایک کتاب جس کا نام ''باراہی سنگھتا لاپتل بہت بن ماراہ مہر'' بتایا ہے اُس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے، لکھا ہے کہ:

ترجم منها احکام الکسوف والخسوف وکائنات الجو و علامات المفر و علم القیافة والفال وغیرها. (ص68)

''اسی کتاب سے مولانا عبدالعزیز نے چندر گرہن، سورج گرہن اور فضائی حوادث (ابر و باد وغیرہ) بارش کی علامتیں علم قیافیہ اور فال وغیرہ کا ترجمہ کیا۔''

''نزہتہ الخواطر'' سے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی فارسی کتاب کا ایک نسخہ عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولانا جلال الدین کرمانی

فیروز شاہی کے عہد میں مولانا جلال الدین کرمانی ایک عالم تھے۔ لکھا ہے کہ:

کان عالماً بارعاً فی المعقول والمنقول. (ص24)

''عقلی اور نقلی علوم میں ماہر تھے۔''

میں صرف چند نظائر پیش کرنا چاہتا ہوں، استیعاب مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ جس زمانہ میں ہندوستان کا عام تعلیمی نصاب معقولات میں صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، ان ہی دنوں میں عقلی علوم کے ان ماہرین کی ایک بڑی جماعت اس ملک میں درس وتدریس میں مصروف تھی۔ جن لوگوں کو ان علوم کا شوق ہوتا تھا، وہ بطور اختیاری مضامین کے عام نصاب کی تکمیل کے بعد ان علوم کو پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں کو معلوم نہیں ہے ورنہ جب کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ منطق وفلسفہ کے مشہور امام علامہ قطب الدین الرازی (1) التحتانی کے براہ راست شاگرد بھی ہندوستان پہنچ کر فنونِ عقلیہ کی تعلیم دے رہے تھے، تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ان علوم کے متعلق کون کون سی کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں گی۔

ایک معقولی عالم کے لیے شاہی اہتمام

میرا مطلب یہ ہے کہ فیروز تغلق نے علاؤ الدین خلجی کے بنائے ہوئے تالاب کے بند پر جو ایک خوبصورت عمارت تیار کی تھی جس کے متعلق برنی کے حوالے سے صاحب ''نزہتہ'' نے نقل کیا ہے۔

کان بنائها طویل العماد متسع الساحة کثیر القباب والصحون لم یعم مثلها قبلها ولا بعدها. (نزہتہ الخواطر۔ ص22)

''اس کی عمارت لمبے لمبے اونچے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور ایک وسیع میدان میں تھی، عمارت پر بکثرت قبے بنے ہوئے تھے، نیز بکثرت درمیان درمیان میں صحن تھے، ایسی عمارت مدرسہ کی نہ اس سے پہلے بنی نہ بعد۔''

البرنی نے تو یہاں تک اس عمارت کے متعلق مبالغہ کیا ہے کہ:

انها من عجائب الدنیا فی ضخامتها وسعة ممرها وطیب مائها وهوائها ابتغی من دخلها عنها حولا. (ص22)

''اپنی جسامت اور عظمت نیز وسیع گذرگاہوں پاکیزہ آب وہوا کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونا چاہیے۔ جو اس میں داخل ہو جاتا ہے پھر اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔''

علامہ دوّانی ہندوستان میں

عمارت جب تیار ہو گئی تو اس دانش پژوہ معارف پرور بادشاہ نے اس کا مصرف یہ لیا کہ علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذ رشید مولانا جلال الدین دوانی جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا اور مولانا نے اس عمارت کو اپنا مدرسہ بنالیا۔ ''نزہۃ الخواطر'' میں ان ہی مولانا جلال الدین کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

احد العلماء المشهور بالدرس ولا فادة قرء العلم علی الشیخ قطب الدین الرازی شارح الشمیسة و قدم الهند. (ص22)

''درس وافادہ میں جو علماء مشہور ہیں ان میں یہ ایک سربرآوردہ عالم آپ کی ذات بھی ہے، آپ نے علم، شمسیہ کے شارح شیخ قطب الدین رازی سے حاصل کیا اور ہندوستان تشریف لائے۔''

آگے اسی بالائے بند کی عمارت میں مولانا کے درس وتدریس کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص فن (معقولات) کے سوا مولانا اس مدرسہ میں حدیث وتفسیر کا بھی درست دیتے تھے۔ لکھا ہے:

کان یدرس الفقه والحدیث و التفسیر و غیرها من العلوم النافعة.

''وہ فقہ حدیث وتفسیر اور دوسرے نفع بخش علوم کی وہاں تعلیم دیتے تھے۔''

صاحب ''نزہۃ'' نے اس کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے کہ:

وانتفع به ناس کثیر واخذ واعنه. (ص22)

''ان سے لوگوں کو بہت نفع پہنچا اور بکثرت لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا۔''

مولانا فضل اللہ شاگرد علامہ تفتازانی

اور صرف قطب الدین رازی ہی نہیں بلکہ اہل تاریخ خصوصاً دکن کی تاریخ کے جاننے والوں پر مخفی نہیں کہ بہمنی حکومت کا مشہور علم دوست اور خود عالم تبحر حکیم بادشاہ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے مولانا فضل اللہ انجو سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا غلام علی آزاد نے مولانا انجو کے متعلق لکھا ہے کہ:

''فضل اللہ انجو شاگرد رشید علامہ تفتازانی۔'' (روضۃ الاولیاء۔ص 22)

''یعنی فضل اللہ انجو علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید ہیں۔''

سید شریف جرجانی کے پوتے ہندوستان میں

صرف یہی نہیں بلکہ علامہ تفتازانی کے معاصر وہم چشم علامہ سید شریف جرجانیؒ کے براہِ راست پوتے میر مرتضیٰ شریفی نے بھی ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا، مُلا عبدالقادر نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''نبیرہ میر سید شریف جرجانی ست قدس سرہ در علوم ریاضی و اقسام حکمت و منطق و کلام فائق بر جمیع علمائے ایام بود۔''

''یہ (میر مرتضیٰ) میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں، ریاضی اور فلسفہ کے تمام شعبے منطق اور کلام میں اپنے عہد کے تمام علماء پر ان کو برتری حاصل تھی۔''

اور یہ چیزیں تو خیران کے گھر کی لونڈیاں تھیں، بڑا امتیاز ان کا یہ تھا کہ:

''در مکہ معظمہ رفتہ علم حدیث در ملازمت شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت۔'' (ج 3، ص 320)

''مکہ معظمہ جا کر علم حدیث انہوں نے شیخ ابن حجر سے حاصل کیا اور اس کے پڑھانے کی اجازت حاصل کی۔''

یعنی وہی علم جس کے متعلق باور کرایا گیا ہے کہ اس میں ہندوستان کی بضاعتِ مزجاۃ ہے۔ حرم کے مسند الوقت سے اس کی تعلیم اور سند حاصل کر کے میر صاحب نے ہندوستان میں اپنے فیض کا دریا جاری کیا تھا۔ بداؤنی نے لکھا کہ مکہ معظمہ سے میر صاحب:

''بدکن آمد و از دکن بہ آگرہ بر اکثرے از علماء سابق و لاحق تقدیم یافت و بدرس علوم و حکم اشتغال داشت تا در سنہ اربع وسبعین وتسعمائۃ (974ھ) بروضہ رضواں خرامید۔'' (ص 321)

''پہلے دکن تشریف لائے اور دکن سے آگرہ (اکبر بادشاہ کے زمانہ میں) آئے، یہاں پہنچ کر ان کو اگلے علماء سب پر تقدم حاصل ہوا، میر صاحب کا شغلِ علوم اور حکمت کا پڑھنا پڑھانا تھا۔''

معقولات اور ہندوستان

اب جو قطب رازی یا تفتازانی و جرجانی کے علمی بلند پائیگی سے ناواقف ہیں، ان کو اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن اہل علم کا جو گروہ ان بزرگوں کے کمالات و فضائل سے واقف ہے، خصوصاً عقلی علوم میں جو مقام ان لوگوں کا تھا، وہ کیا ایک لمحہ کے لیے یہ مان سکتا ہے کہ ہندوستان عقلی علوم و فنون جن کا اس زمانہ میں رواج تھا، ان سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ کوئی

مفصل فہرست مجھے ان کتابوں کی نہ مل سکی جو ہندوستان میں منطق وفلسفہ، کلام، ریاضی، ہندسہ وہیئت وغیرہ کی پڑھائی جاتی تھیں۔ یوں بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب ان بزرگوں کے یعنی رازی وتفتازانی کے براہِ راست تلامذہ اور میر سید شریف کے سگے پوتے اس ملک میں اپنے حلقہائے درس قائم کیے ہوئے تھے، تو متداول کتابوں میں کون سی کتاب ہوگی جو نہ پڑھائی جاتی ہوگی۔ آج بھی جن کتابوں پر ہمارے یہاں کے علومِ عقلیہ کی انتہا ہوتی ہے، مثلاً شرح مطالع منطق میں، محاکمات فلسفہ میں، شرح مواقف، شرح مقاصد کلام میں، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ساری کتابیں ان بزرگوں کے رشحاتِ قلم کے نتائج ہیں۔

ہندوستان اور جلیل القدر اطباء

اور کچھ یہ حال صرف منطق وفلسفہ ہی کا نہیں تھا، ہر عہد میں ابتداء سے آپ کو ہندوستان کے عام مرکزی شہروں میں ایسے جلیل القدر اطباء نظر آئیں گے جو علاج ومعالجہ کے ساتھ ساتھ طبی کتابوں کے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ ''نزہۃ الخواطر'' میں علاؤالدین خلجی کے زمانہ کے مشہور طبیب مولانا صدرالدین الحکیم کے ترجمہ میں لکھا ہے:

له يد بيضاء في علوم الاليه والعالية كان يتطيب و يدرس في دار الملك دهلي. (نزہۃ۔ ص61)

''ان کو ان علوم میں جن سے دوسرے فنون کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے یعنی علوم آلیہ اور بلند پایہ علوم (علوم عالیہ) میں زبردست دستگاہ حاصل تھی وہ طبابت بھی کرتے تھے اور پایۂ تخت دہلی میں درس بھی دیتے تھے۔''

خلجی ہی کے عہد میں حکیم بدرالدین بھی تھے، جن کی تشخیص وغیرہ کے قصے عجیب ہیں۔ ''نزہۃ'' ہی میں ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ:

انتهت اليه رئاسة التدريس و صناعة الطب. (ص16)

''ان پر تدریس (یعنی علوم طبیہ کی تدریس) کی رئاست ختم ہوتی ہے، اور فن طب کی۔''

ہندوستان اور علماء ہیئت واقلیدس

اسی طرح آپ کو اس ملک میں ان ہی علماء کے اندر اسٹرانومی (ہیئت) نجوم، اقلیدس وغیرہ کے ماہرین کا ایک گروہ نظر آئے گا جو پڑھنے والوں کو ان علوم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حسن گنگو بہمنی کے دربار میں صدر شریف کا شمار ان لوگوں میں ہے، جو علوم ہندسیہ میں اپنے وقت کے امام تھے۔ ''نزہۃ الخواطر'' میں ہے کہ:

احد العلماء المبرزين في الهئية والهندسة والنجوم. (ص63)

''ہیئت، ہندسہ، نجوم میں سرآمد روزگار لوگوں میں سے تھے۔''

مُلّا طاہر

اسی دکن میں مشہور ہیئت داں مُلّا طاہر تھے، جن کا پہلے تو خواجہ جہاں کے دربار سے تعلق تھا، لیکن بعد کو احمد نگر کے بادشاہ برہان نظام شاہ کے اصرار پر مُلّا طاہر کو خواجہ نے احمد نگر بھیج دیا۔ مُلّا پیر محمد شروانی نے ان ہی سے مجسطی پڑھی تھی اور ان کا یہی پڑھنا احمد نگر کے دربار سے تعلق کا ذریعہ بنا، مُلّا عبدالنبی احمد نگری نے مذکورہ بالا واقعات کو اپنی مشہور کتاب ''دستور العلماء'' میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ برہان نظام شاہ مُلّا طاہر سے خود پڑھتا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''در ہفتہ دو روز بدرس علمائے پایہ تخت دراں مدرسہ (جواب جامع احمد نگر ہے) مشغول می گشت و کتب تحصیلی مذکور می شد، و در آں درس سید جعفر برادر شاہ طاہر و شاہ حسن الجواد، و ملا محمد شیبا پوری، و ملا حیدر استر آبادی، و ملا ولی محمد و ملا رستم جرجانی، و ملا علی مازندرانی، و ابوالبرکۃ، و ملا عزیز اللہ گیلانی و ملا محمد استر آبادی و قاضی زین العابدین و قاضی لشکر، ظفر پیکر، و سید عبدالحق کتابدار (پرگنہ انبر) و شیخ جعفر و مولانا عبدالاوّل و قاضی محمد نور الخاطب بافضل خاں و شیخ عبداللہ قاضی و دیگر فضلاء و طلبہ حاضر می شدند، و برہان نظام شاہ با استاد خود ملا پیر محمد شروانی از شروع درس تا اختتام بدو زانوئے ادب می نشست و خود ہم، دو قدح سوال و جواب می نمودہ۔'' (ضمیمہ دستور العلماء۔ ص 25)

مُلّا پیر محمد شروانی اکبر کے ساتھ دکن آتے ہوئے دریائے نربدا میں ڈوب مرے۔ ملا پیر محمد سے مجسطی پڑھنے کے بعد جس کا موقع ان کو دن کے مشہور قلعہ پرینda میں ملا تھا، مُلّا طاہر کے متعلق برہان شاہ کے پاس یہ رباعی لکھ کر پیش کی تھی۔

در وصف کمالش عقلاء حیرانند
بقراط حکیم و بو علی نادانند
با ایں ہمہ علم و فضل و کمال
در مکتب او الف می خوانند

علمائے ریاضی

اور مُلّا طاہر سے تو خیر دکن کا ایک بادشاہ پڑھتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اسی سرزمین دکن میں ایسے بادشاہ بھی تھے جو دوسرے علوم کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ فنِ ریاضی کا درس دیتے تھے۔ فیروز شاہ بہمنی کے متعلق مولانا آزاد نیز دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ:

''در ہفتہ روز شنبہ و دوشنبہ و چہار شنبہ درس می گفت۔''

''ہفتہ میں شنبہ اور دوشنبہ اور چہار شنبہ کو درس دیا کرتا تھا۔''

جس میں ایک دن یعنی ہفتہ کے پہلے دن شنبہ کو بادشاہ صرف زاہدی شرح تذکرہ در ہیئت و اقلیدس در ہندسہ

(روضۃ الاولیاء۔ص22) پڑھاتا تھا۔(2)

''بدیں تفصیل زاہدی وشرح تذکرہ در ریاضی، وشرح مقاصد در کلام، وتحریر اقلیدس، در ہندسہ ومطول مُلّا سعد الدین در علمِ معانی و بیان و اگر احیاناً بروز فرصت نمی شد، طالب علماں را در شب حاضر ساختہ بدرس وافادہ می پرداخت۔'' (فرشتہ۔ص308)

فیروز شاہ کو علم ہیئت میں اتنا غلو پیدا ہو گیا تھا کہ آخر میں اس نے طے کر لیا تھا کہ ''در دولت آباد رصد بندد'' بادشاہ نے اپنی امداد کے لیے اس فن کے چند ماہرینِ فن کو بیرونِ ہند سے بلایا بھی تھا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے۔

''حکیم حسن گیلانی، وسید محمد گازرونی باتفاق علماء دیگر باین کار مشغول شدند، لیکن بناء بر بعضے امور کہ ازانجملہ فوت حکیم حسن علی بود کار رصد ناتمام ماند۔'' (ص22)

''حکیم حسن گیلانی اور سید محمد گازرونی دوسرے علماء کے اتفاق سے اس کام میں مشغول ہوئے، لیکن بعض امور کی وجہ سے جس میں حکیم حسن کی موت تھی، رصد کا کام ادھورا رہ گیا۔''

دکن میں جب مرہٹہ حکومت کا عروج ہوا تو لکھا ہے کہ: بالاجی پونہ کا راجہ:

''تمام روز اطفال را درس سنسکرت می داد ہر طفل نوخواہ پسر متمول خواہ مفلوک زادہ ہر گاہ دراں مدرسہ وارد می شد خرچ نان و پارچہ و کاغذ وقلم ومداد رش ہمہ از طرف بالاجی بود۔''

(عماد السعادت۔ص85)

شاید دکن کے مسلمان بادشاہوں کی ان ہی روایتوں سے بالاجی متاثر ہوا تھا ورنہ ہندوستان میں مالک تاج و تخت کے متعلق پڑھونی کا مشغلہ ایک عجیب سی بات ہے۔

علمائے موسیقی

انتہا تو یہ ہے کہ انہیں علماء میں ایسے لوگ بھی تھے، جو موسیقی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شیخ ضیاء الدین نخشی جو دراصل بداؤں کے باشندے تھے، عام علوم دینیہ کے سوا طب میں کمال رکھنے کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ:

كانت له يد بيضاء فى الطب و الموسيقى. (ص66)

''ان کو طب اور موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔''

ابن سینا کی طبی کتاب ''کلیات قانون'' کے مقابلہ میں آپ نے ایک کتاب ''الکلیات والجزئیات'' نامی لکھی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانی دواؤں کے ساتھ ساتھ خاص اُن دواؤں کا تذکرہ بھی التزام کے ساتھ کیا گیا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں، ہر جگہ ان دواؤں کے نام کو درج کیا ہے، جس نام سے وہ ہندوستان میں مشہور ہیں، حضرت ضیاء نخشی، سلطان المشائخ کے معاصر ہیں۔ شیخ محدث نے ہی ان کا ترجمہ لکھا ہے، یہ لطیفہ اسی میں ہے کہ:

''درزبان شیخ نظام الدین اولیا سہ ضیاء بودند ضیاء سنامی کہ منکرِ شیخ بود، ضیاء برنی کہ معتقد و مرید او بود و ضیا نخشبی کہ نہ منکر بود نہ مرید۔''(2)

''شیخ نظام الدین اولیاء کے زمانہ میں تین ضیاء تھے ایک ضیاء سنامی جو شیخ کے منکر تھے، دوسرے ضیاء برنی جو آپ کے معتقد اور مرید تھے، اور تیسرے ضیاء نخشبی جو منکر تھے نہ مرید۔''

امیر خسرو

اسی زمانہ میں حضرت امیر خسرو بھی تھے جن کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں، صاحبِ ''نزہتہ الخواطر'' نے لکھا ہے:

اشهر مشاهير الشعراء في الهند لم يكن له نظير في العلم و المعرفته و الشعر والموسيقي و فنون اخر قبله ولا بعده. (ص38)

''ہندی شعراء کی مشہور ترین ہستی جن کی نظیر علم و معرفت شعر اور موسیقی نیز دوسرے فنون میں نہ ان سے پہلے اس ملک میں پائی گئی اور نہ بعد کو۔''

مُلّا بداؤنی

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مُلّا عبدالقادر بداؤنی باوجود مُلّا ہونے اور کیسی ملائیت کہ اکبر کا فتویٰ خود اپنے متعلق مُلّا صاحب نے یہ نقل کیا ہے کہ:

''چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ، ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب او را نتواند برید۔''

(بداؤنی۔ص399)

''ایسے متعصب فقیہ ظاہر ہوئے، کہ کوئی تلوار ان کے تعصب کی گردن کی رگ نہیں کاٹ سکتی تھی۔''

مگر اسی متعصب فقیہ کے متعلق مولانا آزاد نے لکھا ہے:

''بین نوازی ہم بقدرے دانست۔''(3) (مآثر الکرام)

اور اس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، علم کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ان چیزوں کی گنجائش بھی نکل آئی تھی۔

شاہ عبدالعزیز اور علم موسیقی

بلا عبدالقادر تو خیر اکبر کے دربار کے مُلا تھے، اپنی کمزوریوں کا انہیں خود اعتراف ہے، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تک کے متعلق مستند ذرائع سے یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ فنی حیثیت سے آپ کا شمار موسیقی کے ماہرین میں تھا، جس کی تصدیق ''ملفوظاتِ عزیزیہ'' کے مختلف مقام سے بھی ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں موسیقی بھی فلسفہ کی ایک مستقل

شاخ سمجھی جاتی تھی۔ نہ صرف یونانی فلاسفر بلکہ حکماء کا جو گروہ مسلمانوں میں پیدا ہوا عموماً اس فن پر بھی ان کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اشراقی فلسفہ میں چونکہ علوم نیرنجات وطلسمات کو بھی داخل کر دیا گیا تھا۔

مُلّا فتح اللہ شیرازی

اس لیے باہر ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو ان علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مُلّا فتح اللہ شیرازی جو اکبری دربار کے مشہور عالم ہیں جن کا ذکر آگے بھی آ رہا ہے مُلّا عبدالقادر نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''در وادی الٰہیات و ریاضیات وطبیعیات و سائر اقسام علوم عقلی ونقلی وطلسمات و نیرنجات و جراثقال نظری خور در عصر نداشت۔'' (بداؤنی۔ص 315)

''الٰہیات، ریاضیات، طبیعیات اور دوسرے علوم عقلی ونقلی اور طلسمات، نیرنجات اور جراثقال میں اپنی نظیر اپنے زمانہ میں نہیں رکھتے تھے۔''

''طلسمات و نیرنجات'' دراصل اشراقی فلسفہ کی شاخ تھی، فلسفہ میں کمال حاصل کرنے والے ان فنون میں بھی مہارت حاصل کرتے تھے، خود شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی وہ اس قسم کے تماشے بھی لوگوں کو دکھاتے تھے (4)۔ مسلمان حکماء میں یہ چیزیں اشراقی فلسفہ کی راہ سے آئی تھیں اور خواص ہوں یا عام سب جانتے تھے کہ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فتح اللہ شیرازی جن علوم میں مہارت رکھتے تھے اس میں آپ ''علم جراثقال'' کو بھی پا رہے ہیں۔ یہ فن بھی ''حکمت'' کا ایک جز تھا۔ نہ صرف بیرونِ ہند بلکہ ہر زمانہ میں وہی لوگ جو فلسفہ ومنطق میں غلو رکھتے تھے، حکمت کی اس شاخ سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

حکیم علی کا طلسمی تالاب

اسی فن اور علم الحیل کی مدد سے حکیم علی نے وہ مشہور تالاب بنایا تھا جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی کی سیڑھیاں ملتی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے نیچے اُترنے کے بعد فرش وفروش سے سجے سجائے کمرے میں آدمی داخل ہو جاتا تھا۔ جس میں وہ ''دوازدہ'' (دس بارہ) آدمی کے اٹھنے بیٹھنے کی گنجائش تھی، دسترخوان چنا ہوا ہے، طاقوں میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ حکیم علی کے اس طلسمی تالاب میں اکبر بادشاہ بھی گیا تھا اور جہانگیر بھی۔ ''تزک'' میں جہانگیر نے خود اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ پیش کیا ہے۔

حکیم علی کا عجیب چراغ

حکیم علی کا چراغ بھی مشہور ہے، جس سے حمام چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا اور چراغ نہیں بجھتا تھا۔

حکیم علی اور اکبر

''مآثر الامراء'' وغیرہ میں ان ہی حکیم علی کے متعلق لکھا ہے کہ اکبر جب اطلاق بطن کے مرض میں مبتلا ہوا، دست کسی ترکیب سے نہیں رکھتے تھے، تو حکیم علی کو بلا کر بہت غصہ ہوا، حکیم نے کیسہ سے دوا نکالی ''درکوزہ آب انداخت فورأ بستہ شدہ'' (مآثر الامراء۔ ج1، ص 571) یعنی دوا ڈالنے کے ساتھ ہی پانی برف بن کر جمع گیا۔ حکیم نے بادشاہ کو دکھایا کہ دوائیں تو ہمارے پاس ایسی ہیں، لیکن آپ پر اثر نہ کریں تو میں کیا کروں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہی دوا مجھے دی جائے، حکیم نے انکار کیا، لیکن ضدی بادشاہ نے نہ مانا، اسی کو استعمال کیا، دست تو رک گئے لیکن اب ایسا قبض و نفخ ہوا کہ اس کی اذیت بھی نا قابلِ برداشت تھی، پھر اطلاق و اسہال کی دوا دی گئی:

''اطلاق زیادتی کردتا درگذشت۔'' (ص 571)

''دست بڑھ گیا یہاں تک کہ چل بسا۔''

گویا اکبر کا یہی بیجا اصرار جان لیوا ہوا، واللہ اعلم بالصواب۔

میر فتح اللہ کے کمالات

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ تھی کہ اس زمانہ کے اہلِ علم ان علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ فتح اللہ شیرازی کے متعلق خود ان کے دیکھنے والے مُلا عبدالقادر بداؤنی کی شہادت ہے کہ:

''درعلوم عربیت و حدیث و تفسیر و کلام نیز نسبتِ او مساوی ست و تصانیف خوب دارد۔''

(بداؤنی۔ ج3، ص154)

''عربی ادب، حدیث، تفسیر اور کلام میں مساوی درجہ ہے اور عمدہ تصانیف رکھتے ہیں۔''

اور دوسری طرف ''تذکرہ علماء ہند'' میں اسی حدیث و تفسیر و کلام کے عالم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ:

''از مصنوعات او اشیائے بود کہ خود حرکت می کرد و آرد سائیدہ می شد و آئینہ کے از دور و نزدیک اشکال غریبہ درد مرئی می گشت و بندوقے کہ بہ یک گردش دوازدہ آواز می داد۔'' (ص160)

''ان کی مصنوعات میں کچھ ایسی چیزیں تھیں کہ خود بخود حرکت کرتی تھیں، اور اس سے آٹا پیسا جاتا تھا، اور آئینہ جس میں نزدیک اور دور سے مختلف شکلیں نظر پڑتی تھیں اور ایک بندوق تھا جو ایک گردش میں بارہ آواز کرتا تھا۔''

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب ''دربارِ اکبری'' میں بھی میر فتح اللہ کی تفسیر ''خلاصۃ المنہج الصادقین'' کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ میر صاحب نے حسب ذیل چیزیں ایجاد کی تھیں۔

''بادآسیا یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے، آئینہ حیرت نزدیک و دور کے عجائب و غرائب تماشے

دکھا رہا ہے، توپ ہی کے تخت پر چڑھی ہے، قلعہ شکن توپ ہے، پہاڑ سامنے آ جائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ، ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر چڑھ جاؤ۔" (دربارِ اکبری۔ص 681)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد ہی میں کیا کیا چیزیں یہی مدرسے کے مُلّا حاشیہ نویس ایجاد کر چکے تھے، پانی کو روک کر اس کے نیچے مکان بناتے تھے، برف جماتے تھے، ایسی کوئی حرارت پیدا کر سکتے تھے جو بجھ نہیں سکتی تھی، حیوانی قوتوں کی امداد کے بغیر حرکت پیدا کرتے تھے اور ایسی تیز حرکت کہ جس سے آٹا پس جاتا تھا، پورٹ ایبل توپ جس وقت جس بلندی پر چاہیں اسے چڑھا کر وہاں سے فیر کر سکتے تھے، اور سب سے عجیب تر بندوق وہ تھی جس سے ایک گردش میں دس آوازیں ہوتی تھیں گویا ایک قسم کی مشین گن تھی۔

عہد فیروز تغلق میں گھڑی کی ایجاد

اور کچھ اکبر کے زمانہ کی خصوصیت نہ تھی، اس سے پہلے بھی اہل علم کا طبقہ ہندوستان میں اپنے عملی کمالات کی نمائش مختلف شکلوں میں کر چکا تھا۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہندوستان میں ایجاد ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے:

يخرج في كل ساعة منها صوت عجيب يترنم بهذا البيت.

ہر ساعتے کہ بر درِ شاہ طاس می زنند نقصانِ عمر می شود آں یاد می دہند۔ (نزہۃ الخواطر۔ص 12)

"اس گھڑی سے ہر گھنٹہ پر ایک آواز پیدا ہوتی ہے یعنی نغمہ کے ساتھ یہ شعر گھڑی سے سنائی دیتا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے: "بادشاہ کے دروازہ پر ہر گھنٹہ میں جو گھڑیال بجاتے ہیں، یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہو گیا۔"

واللہ اعلم اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ گھڑی ہونے کے سوا گویا ایک قسم کا گراموفون بھی تھا، کوئی ایسی ترکیب کی گئی تھی کہ بجائے بے معنی آواز کے اس سے یہ مسلم شعر پیدا ہوتا تھا۔

عہد مسلمانی کے کارنامے

سچی بات تو یہ ہے کہ اسلامی سلاطین کا کوئی سا زمانہ ہو۔ نہروں، تالابوں، سڑکوں، پل وغیرہ کے ذریعہ سے جو حیرت انگیز کام انجام دیئے گئے۔ تعمیرات کا جو سلسلہ بادشاہوں کے عہد میں نظر آتا ہے، باغبانی اور کاشتکاری کے متعلق جو اصلاحات مسلمانوں نے اپنے قرن میں ہندوستان میں جاری کیے، شاید ان کی نظیر اس زمانہ میں بھی پیش نہیں ہو سکتی۔ (5)

فیروز شاہ تغلق اور رفاہِ عام کارنامے

"نزہۃ الخواطر" میں صرف فیروز شاہ تغلق کے متعلق لکھا ہے کہ:

انه حفر خمسين نهراً و بنى اربعين مسجد او عشرين زاوية ومائه قصر و خمسين مارستانا ومائة مقبرة و عشر حمامات ومائة جسر و مائة و خمسين بئراً. (ص111)

''اس بادشاہ نے پچاس نہریں کھدوائیں، چالیس مسجدیں، بیس خانقاہیں، سو محلات اور پچاس شفاخانے، سو مقبرے، دس حمام، سو پل اور سو کوئیں بنوائے۔''

باغبانی اور نباتات میں علمی مہارت

ظاہر ہے کہ باضابطہ انجینئری (6) کے ماہروں کے بغیر ایسے کام کا انجام پانا ناممکن ہے، اسی کتاب میں ہے:

اما الحدائق فانها اسس الفاوماَئتى حديقة بناحية دهلى و ثمانين حديقة بناحية شاه درا و اربعين حديقة بنا حية چتور كانت فيها سبعة اقسام الغب.

(ص111)

''(فیروز کے زمانہ میں) جو باغات لگے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس شخص نے دو ہزار باغوں کی بنیاد قائم کی، جن میں دو سو باغ تو دلی کے نواح میں تھے اور اسی باغ شاہراہ کے نواح میں اور چالیس باغ چتور کے اطراف میں۔ ان باغوں میں صرف انگور سات قسم کے ہوتے تھے۔''

کیا باغبانی کا یہ عظیم کاروبار نباتات میں علمی مہارت پیدا کیے بغیر جاری ہوسکتا ہے؟ جس ملک میں کھٹے انگور بھی نہ مل سکتے ہوں۔ سات سات قسم کے شیریں انگور کیا محض ہندوستان کے جاہل مالی پیدا کرسکتے تھے۔ واقعہ وہی ہے کہ اس زمانہ کے اختیاری علوم وفنون میں سب ہی طرح کے علم تھے، اپنے اپنے ذوق کے مطابق جس علم میں جو چاہتا تھا کمال پیدا کرتا تھا(7) اور جو حال علوم کا تھا وہی زبانوں کا بھی تھا۔

عربی علوم اور اس کی وسعت

میرا مطلب یہ ہے کہ مثلاً عربی زبان ہی کو لیجیے، عربی زبان کے الفاظ ومحاورات کا ایک ذخیرہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی آسمانی کتاب، پیغمبر کے ملفوظات اور ان کی زندگی یعنی حدیث اور مذہبی علوم مثلاً فقہ، اُصولِ فقہ، کلام وتصوف وغیرہ ہیں، اتنی عربی کا سیکھنا تو ہر اس شخص کے لیے لازمی تھا جو دانشمند یا مُلا مولوی بننا چاہتا تھا۔

باقی عربی زبان کا وہ حصہ جس میں نظم ونثر کا اعلیٰ ادب محفوظ ہے، اور جاہلیت وایامِ جاہلیت کی چیزیں عربی کے جس حصہ میں پائی جاتی ہیں اس حصہ کی تعلیم اگرچہ لازمی تو نہ تھی، بلکہ اختیاری مضامین جیسے بہت سے تھے۔ ان ہی میں ادب عربی کا یہ حصہ بھی تھا۔ جن لوگوں کا میلان اس کی طرف ہوتا تھا وہ اس میں خصوصی کمال پیدا کرتے تھے۔ ہر زمانہ میں آپ کو ایک گروہ اس قسم کے ادیبوں کا نظر آئے گا۔

انگریزی دورِ حکومت اور علوم وفنون

اس زمانہ میں جب سے انگریزی جامعات میں حکومت اپنی حاکمانہ ضرورتوں سے انگریزی ادب ہی کی تحصیل کو اصل قرار دیئے ہوئے ہے، باقی علوم وفنون کی تعلیم بطور نمک چشی کے ہوتی ہے، تھوڑی بہت مشق اگر کرائی جاتی ہے تو حساب وکتاب کی کہ اچھے کلرکوں کے لیے دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ اپنے حکام عالی مقام کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کی تعبیر کر سکیں، اور اپنا مطلب ان کو سمجھا سکیں جس کے لیے انگریزی میں بول چال کی مشق ضروری ہے، اور دوسری ضرورت دفتریوں کے لیے یہ ہے کہ سرکاری حساب وکتاب کو درست رکھیں، ساری یونیورسٹیاں ہندوستان کے کالج سب کا واحد مقصد صرف یہی ہے۔ لیکن سائنس وآرٹس، ان کی مختلف شاخوں کے خوبصورت ناموں کا لبادہ اُڑھا کر مقصد میں کامیابی حاصل کی جارہی ہے جو کلرک بن رہا ہے اور صرف کسی دفتر کا دفتری بنایا جارہا ہے وہ مسکین سمجھ رہا ہے کہ میں مورخ بن رہا ہوں اور حکیم، ادیب بن رہا ہوں اور فلسفی۔

علماء پر اعتراض

خیر مغربی جامعات کی تقلید میں عربی مدارس کے طلبہ سے تقاضا کیا جارہا ہے کہ تم عربی زبان میں بولنے چالنے کی مہارت کیوں حاصل نہیں کرتے، علماء کی قیمت جن فرضی اتہامات کی بنیاد پر گھٹائی جارہی ہے یا ان کی جہالت کے چرچوں سے آسمان کو سر پر اٹھالیا گیا ہے اس کی سب سے قوی تر دلیل یہ ہے کہ مولوی جب عربی میں تقریر وگفتگو پر قادر نہیں ہے تو کیسے سمجھا جائے کہ وہ عربی داں ہے، حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مولویوں کے لیے جس عربی کا جاننا ضروری ہے وہ صرف وہی عربی ہے جس میں ان کا دین ہے، باقی بازار میں خرید وفروخت کی عربی، یا اپنے حاکموں اور سرکاری افسروں سے خطاب کرنے کے لیے جس زبان کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ اس عربی کی ضرورت ان ہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو عرب ممالک کے باشندے ہوں، لیکن جس ملک کی مادری زبان عربی نہیں ہے، وہاں کا حال تو یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کی سیدھی سادی عربی جس کے اسی پچاسی فیصدی الفاظ سے ہندوستان کے مسلمان عموماً واقف ہوتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اسی حلقہ سے جس سے ایک طرف مولویوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے، کہ جب تک عربی زبان میں بات چیت کی مہارت تم حاصل نہ کر لو گے ہم تمہیں مولوی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان ہی کی طرف سے مسلسل اس کا تقاضا بھی پیش ہورہا ہے کہ خطبہ کی زبان بدلی جائے، مسلمانوں کو بھینس بنا کر کب تک یہ مولوی بین سناتے رہیں گے۔

علماء سے جدید مطالبہ

مجھے کہنا یہ ہے کہ عربی زبان میں بات چیت، تقریر وخطابت کا مطالبہ بالکل ایک جدید مطالبہ ہے ورنہ مسلمانوں میں عقل کی کبھی اتنی کمی نہیں ہوئی کہ جس زبان کو وہ خود نہ سمجھتے ہوں اسی زبان میں وعظ وتقریر کرنے پر مولویوں کو انہوں نے

مجبور کیا ہو۔ بلکہ ہر ملک میں علماء نے وہاں کے عوام کو عموماً اسی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کی ہے، جسے وہاں کے باشندے سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ عربی میں تقریر و بیان کے مسئلہ کو علماء نے ان ممالک میں جہاں کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ کبھی اہمیت نہیں دی۔

علماء اور عربیت میں کمال

لیکن اس کا یہ مطلب کبھی نہیں تھا کہ عربی زبان کے اسلامی ذخیرہ کے سوا عربی ادب کی عام نظم و نثر میں کمال پیدا کرنے یا اس زبان میں تقریر و تحریر کی قوت حاصل کرنے کا جنہیں شوق تھا، اس شوق کی تکمیل سے ان کو روکا گیا۔ عربیت کی عموماً کمزور ہونے کی شکایت سب سے زیادہ ہندوستان میں کی گئی ہے۔ لیکن ساتویں صدی سے اس وقت تک بتایا جائے کیا کوئی زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بطور اختیاری مضمون کے اس ملک کے بعض اہل علم نے عربیت میں کمال نہ پیدا کیا ہو۔ آخری صدیوں کو تو جانے دیجیے، جن میں مُلّا محمود جونپوری، مولانا غلام علی آزاد، حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہم جیسے نامی گرامی اور ادباء اس ملک میں پیدا ہوتے رہے۔ میں قدوری اور بزدوی والے دور کو لیتا ہوں، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہاں کے مولوی چند فقہی متون کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔

علماء ہند کے ادبی کارنامے

ابھی کچھ دیر پہلے آپ علامہ رضی الدین حسن صغانی کا ذکر سن چکے جو ہندوستان سے سفیر بن کر بارگاہِ خلافتِ بغداد بھیجے گئے تھے کہ ان ہی کی کتاب ''عباب'' سے فیروز آبادی نے ''قاموس'' تیار کی ہے۔ آپ یہ سن چکے کہ خود سلطان المشائخؒ کو ''حریری'' کے چالیس مقالے زبانی یاد تھے، فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر ''سواطع'' میں جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا، عربی لغت میں اپنی جس دستگاہ اور تبحر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ کیا اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے، خود حضرت سلطان المشائخ کے خلیفۂ ارشد حضرت نصیر چراغ دہلی کی صحبت کی ہم عجیب تاثیر پاتے ہیں۔ آپ کے مریدوں میں ایک نہیں متعدد حضرات مثلاً قاضی عبدالمقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری، مولانا خواجگی وغیرہ کا ادب عربی سے خصوصی تعلق ہے۔ شیخ احمد تھانیسری اور قاضی عبدالمقتدر کے عربی قصائد تو عام کتابوں میں نقل کیے جاتے ہیں، خصوصاً آخرالذکر کا لامیہ جس کا مشہور مطلع ہے:

یاسائق الظعن فی الاسحار والاصل سلم علی وار سلمی و ابک ثم سلی

یا شیخ احمد کا قصیدہ جس کا مطلع ہے:

اطار لبی حنین الطائر المغرد وهاج لوعة قلبی التائه الكمد

میں خود تو ادیب نہیں ہوں، لیکن ارباب علم و معرفت سے سنا ہے کہ دونوں قصیدے ان بزرگوں کی اس مہارت اور قدرت کو ثابت کرتے ہیں جو عربی ادب میں انہیں حاصل تھی۔

علامہ دولت آبادی

مولانا خواجگی کی جلالتِ شان کے لیے یہی کافی ہے کہ علامہ شہاب الدین دولت آبادی ان ہی کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ قصیدہ بانت (8) سعاد کی جو شرح "مصدق الفضل" کے نام سے انہوں نے لکھی ہے اور ہر شعر کے متعلق صرف ونحو، معانی، بیان بدیع، عروض وقوافی ان سات ادبی علوم سے بالالتزام بحث کرتے ہیں، وہی ان کی قابلیت کی کافی شہادت ہو سکتی ہے میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کا یہ عہد یعنی سلطان المشائخؒ اور ان کے خلیفہ خاص حضرت چراغ دہلی کا زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں ان بزرگوں کے ادبی ذوق نے دوسروں پر کافی اثر ڈالا ہے۔ یہ ایک مستقل مقالہ کا مضمون ہے۔ اس وقت میرے لیے صرف یہی اشارہ کافی ہے۔

حافظانِ "قاموس"

کس قدر عجیب بات ہے جس ملک میں "قاموس" کے حافظ ایک نہیں متعدد پائے جاتے ہوں، اسی کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ چند فقہی متون کی عربی سے زیادہ ادبِ عربی کی قابلیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ برہان پور کے بزرگ شیخ عبدالوہاب جو آخر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ براہ راست شیخ محدث ان کے شاگرد ہیں، ان کی شہادت ہے۔ "قاموس لغت بے مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یادداشت" (اخبار۔ ص 272) مولانا غلام علی آزاد نے خود اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، لکھا ہے کہ "قاموس اللغتہ من اولہ الی آخرہ از بر داشتند" (مآثر۔ ص 258) بلگرام کے ایک بزرگ شیخ عبدالکریم کے ترجمہ میں میر صاحب ہی نے لکھا ہے:
"مقامات حریری تمام بر نوک زبان داشت۔"

عربی میں برجستہ تقریریں

اور بات کچھ کتابوں ہی یا نظم ونثر تک محدود نہ تھی، عربی میں تقریر و بیان کا جو مطالبہ آج مولویوں سے کیا جا رہا ہے آپ کو اسی ہندوستان میں ایک سے زائد مثالیں ایسے علماء کی ملیں گی، جنہوں نے ہندوستان ہی میں تعلیم پائی اور یہاں سے ایک دن کے لیے باہر نہیں گئے، لیکن بے محابا عربی میں تقریر کرتے تھے۔ اجمیر شریف کے علماء میں ایک بزرگ شیخ مجد شیبانی ہیں شیخ محدث نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے: "بزبان فارسی و عربی تقریر کردے۔" (ص 184)

باکمال سلاطینِ ہند اور زبان عربی میں قدرت

مالوہ کے اسلامی دار الملک شادی آباد مانڈو کے ایک بزرگ شیخ جلال الدین قریشی ہیں۔ شیخ محدث ہی ان کے متعلق بھی تصریح فرماتے ہیں "بزبان عربی و فارسی و ہندی سخن کردے۔" (ص 249) اور یہ حضرات تو خیر طبقۂ اہل علم سے

تعلق رکھتے ہیں۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ جس ہندوستان کے متعلق ''جاء الحکیم ورای النبض''(9) کا لطیفہ بازاروں میں پھیلایا گیا ہے، اپنی نیک نامی کے لیے بزرگوں کو بدنام کیا جارہا ہے، اسی ملک کے بعض سلاطین ایسے تھے جو عربی زبان کے بہترین مقررین میں شمار ہوتے تھے۔ دکن کے بادشاہ سلطان محمود شاہ بہمنی انار اللہ برہانہ کے ترجمہ میں صاحب ''نزہتہ الخواطر'' لکھتے ہیں:

كان من خيار السلاطين عادلا باذلاً كريماً فاضلا عارفا باللغة العربية والفارسية يتكلم بهما فى غاية اطلاقة. (ص157)

''نیک ترین بادشاہوں میں تھے، عدل والے انصاف والے خیر وخیرات کرنے والے صاحبِ علم وفضل تھے۔ عربی اور فارسی کے ماہر تھے، دونوں زبانوں میں انتہائی فصاحت وزبان آوری کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔''

عربی ادب کا چرچا

اور یہ چند جستہ جستہ مثالیں ہیں اس بات کی کہ ہر صدی میں ایک طبقہ اس ملک میں ایسے لوگوں کا پایا جاتا تھا جس نے عربی کے سواجسے میں خالص اسلامی عربی کہتا ہوں، ادبی عربی کی بھی معیاری قابلیت رکھتا تھا جس کا سیکھنا ہر دانشمند یا مولوی کے لیے اگرچہ غیر ضروری تھا۔ لیکن جن کو ادب کا فطری مذاق تھا ان کے لیے ساز وسامان کی اس ملک میں کبھی کمی نہیں رہی۔

علماءِ ہند اور سنسکرت

اور یہ کیفیت کچھ عربی ہی کی نہیں تھی، ہندی علماء میں مجھے ایسے متعدد افراد نظر آتے ہیں، جنہوں نے عربی کے تعلیمی مروجہ نصاب کو ختم کر کے ہندوستان کی خاص علمی زبان سنسکرت میں بھی کمال پیدا کیا ہے۔ ''نزہتہ الخواطر'' کے مؤلف نے شیخ علی حیدری کے تذکرہ میں لکھا ہے:

الشيخ الفاضل على الحيدرى احدالقادمين الى بلاد الهند دخل الگجرات و سكن بمدينة كهمبائت ولازم احبارالهنود و اخذعنهم علوم اهل الهند و تعلم لغتهم وصحبه مدة من الزمان واظهر عليه حقيقة الاسلام فمن الله تعالى عليه بالملة الحنيفية البيضاء اسلم بسببه خلق كثير من اهل گجرات لمن كانوايعرفون فضله و كماله. (ص86)

''فاضل شیخ حیدری ان علماء میں ہیں جو باہر سے ہندوستان میں آئے۔ وہ گجرات آئے اور کھمبائت میں قیام کیا۔ ہندو پنڈتوں کے گروہ سے انہوں نے اہل ہند کے علوم سیکھے، ان کی زبان

سیکھی اور مدت تک ان ہی میں رہے۔ پھر جو پنڈت ان کا استاد تھا اس پر اسلام پیش کیا، خدا نے پنڈت پر احسان کیا اور وہ مسلمان ہوگیا۔ اس کی وجہ سے گجرات میں لوگ بکثرت اسلام میں داخل ہوئے۔"

شیخ عنایت اللہ اور سنسکرت

اور علی حیدر تو خیر باہر سے آکر ہندوستان میں متوطن ہو گئے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے بلگرام کے ایک عالم شیخ عنایت اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ "در جمیع فنون عربی وفارسی" (کمال حال کرنے کے ساتھ) "ہندی و سنسکرت و بھاکا و موسیقی ہندی اقتدارے بہم رساند۔" (ص 222)

صاحب "شمس بازغہ"

اس وقت کے علماء کے متعلق جو رائے بھی قائم کی جائے، لیکن مسلمانوں کے عہدِ حیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب "شمس بازغہ" ملا محمود جونپوری جیسے فاضل یگانہ کی ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف "شمس بازغہ در حکمت و فرائد درفنِ بلاغت املا کرد" کے سلسلے میں ان کا قلم جولانی دکھا رہا تھا، شاہ جہاں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ سلاطین پیشین نے اپنے اپنے ممالک میں مختلف زمانوں میں رصد خانے تیار کیے ہیں، ہندوستان میں آپ بھی ایک رصد خانہ قائم کیجیے، لکھا ہے کہ ملا صاحب نے رصد خانہ کے لیے مقام کا بھی انتخاب کر لیا تھا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ:

> "زمینے کہ برائے رصد تجویز کردہ بود چندے ظاہر شد کہ یکے از حکماء پیشین آں محل برائے رصد اختیار کردہ بود[10]۔" (مآثر۔ص 203)

> " ایک زمین رصد کے لیے تجویز کی تھی، کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ پہلے حکماء میں سے ایک نے اس جگہ کو رصد کے لیے پسند کیا تھا۔"

صاحب "شمس بازغہ" کے علمی کمالات

جس سے فنِ ہیئت ونجوم میں ان کی دقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جس کا دماغ فلسفہ، ریاضی، بلاغت وادب عربی میں اس طرح کام کر رہا تھا۔ ان ہی ملا محمود کو ہم ہندوستان کے خاص فن "نائکا بھید" کے مطالعہ میں بھی مصروف پاتے ہیں۔ نائکا بھید کس چیز کا نام تھا، مولانا آزاد اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "آں چناں ست کہ ہندیاں معشوقہ را بہ اعتبار ادا و انداز و درجات عمر و مراتب الفت و بے الفتی وغیرہ ذالک چنداں قسم گفتہ اند و ہر قسم را نامے معین ساختہ آبدار در ہر قسم بہ نظم آوردہ۔"

"وہ اس طرح ہے کہ ہندوستانی معشوقہ کو ادا و انداز، درجات عمر اور الفت وغیرہ وغیرہ کے

مراتب کے اعتبار سے بہت سی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کا ایک خاص نام مقرر کیا ہے اور ہر قسم میں آبدار اشعار نظم کیے ہیں۔''

یعنی ''وام مارگیت'' کا ہندوستان میں جب شباب تھا، مذہب تک اس زمانہ میں صرف مردوں اور عورتوں کے باہمی اجتماع میں منحصر ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی زمانہ میں ہندوؤں نے نت نئے قسم کے علوم و فنون ایجاد کیے تھے جن میں اکھاڑہ اور پاتر بازی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ نائکا بھید بھی اسی جنس کا ایک فن تھا، گویا موجودہ اصطلاح میں ہم اسے سکسولوجی (جنسیات) کہہ سکتے ہیں۔ مُلا محمود نے اس فن کا بھی مطالعہ کیا اور اس پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اختیاری مضامین کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

علماء کا ذوق

دانشمندی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی کبھی اس کے ساتھ بھی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون وصناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی۔ ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھتے تھے اور جن کے لیے صرف علمی مشق یا مطالعہ مزاولت یا ممارست کی حاجت تھی، لوگ اس میں مشغول ہو جاتے تھے۔

تصوف اور علماء

حتیٰ کہ جن لوگوں کا میلان تصوف کی طرف ہوتا، تو وہ بھی ایک طرف مجاہدات و ریاضیات، اربعینات ذکر و شغل میں مصروف ہوتے تو دوسری طرف کم از کم زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ اس فن کی کتابیں بھی اپنے شیوخ سے پڑھا کرتے تھے، سلطان المشائخ کے ذکر میں آپ کو ملے گا کہ نصابی علوم کی تکمیل کے بعد جب اس راہ کی طلب آپ میں پیدا ہوئی اور حضرت بابا شیخ فرید الدین شکر گنج فاروقیؒ کی خدمت میں آپ حاضر ہوئے تو بابا صاحب نے اور جن مشاغل میں ان کو لگایا ہو، اس کا ذکر تو کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خاص چیز کے ساتھ جسے میں سلسلۂ چشتیہ کی اہم خصوصیت سمجھتا ہوں، ان شاء اللہ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔ اس کے سوا باضابطہ آپ نے بابا صاحب سے تصوف کی چند کتابیں پڑھیں، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ تصوف کے ساتھ عقائد کی ایک خاص لیکن اہم کتاب ''تمہید ابوالشکور سالمی''(11) بھی اس سلسلہ میں آپ کو پڑھائی گئی۔ ''سیر الاولیاء'' اور ''فوائد الفواد'' دونوں میں آپ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ اپنے شیخ کے سامنے:

> ''سہ کتاب در یکے قاری بودم و سماع داشتم و شش باب از عوارف پیش شیخ شیوخ العالم (حضرت بابا فرید شکر گنج) گذراندم۔ تمہید ابوالشکو و سالمی تمام پیش شخ شیوخ العالم خواندم۔
>
> (سیر الاولیاء۔ ص 106)

''تین کتابوں میں ایک پڑھی اور دو کی سماعت کی، اور عوارف کے چھ باب اور تمہید ابوالشکور سالمی پوری شیوخ العالم حضرت بابا فرید گنج سے پڑھی۔''

ذکر و شغل کے ساتھ تدریس

اور اس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ارباب طریقت عموماً اپنے مریدوں کو عملی مجاہدات کے ساتھ علمی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیریؒ کے ملفوظات میں بھی آپ کو مختلف مقامات میں ایسی عبارتیں مسلسل ملتی چلی جائیں گی کہ:

''مولانا نصیر الدین وقاضی صفی را ملخص احیاء العلوم می گزشت۔'' (ص 45)

کہیں نظر آئے گا:

''قاضی منہاج الدین دردن حصاری راوصیت شیخ الشیوخ می گزشت۔'' (ص 47)

کہیں ملے گا:

بیچارہ (جامع ملفوظات) لوامع قاضی حمیدالدین ناگوری می گزشت۔'' (ص 58)

الغرض یوں ہی آپ کو ان مختلف کتابوں کا ذکر ملے گا جو اس زمانہ میں حضرات صوفیہ اپنے ارادت مندوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

علماء اور وعظ گوئی

ان ہی علماء میں ایک معقول تعداد ایسوں کی بھی ملے گی جنہوں نے فن تذکیر و وعظ کی مشق بہم پہنچائی۔ بظاہر لوگوں کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند میں وعظ گوئی کا رواج کوئی نئی بات ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے اسلامی دور کا کوئی قرن بحمد اللہ ان بزرگوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ جنہوں نے اپنی سحر بیانیوں سے عام مسلمانوں کے ایمانی جذبات کو بیدار رکھنے کی کامیاب کوششیں نہ کی ہوں۔ آج تقریروں کا زور ہے، بیانوں کا طوفان برپا ہے، لیکن کیا اس کی نظیر ہم اس زمانہ میں پیش کر سکتے ہیں۔

علاؤالدین نیلی اور وعظ گوئی

محمد تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ مشہور اندلسی سیاح ہندوستان آیا ہے۔ اپنے سفرنامہ میں سلطان المشائخؒ کے ایک تربیت یافتہ عالم مولانا علاؤالدین اودھی جو عام طور پر نیلی کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، ان کے متعلق ابن بطوطہ کی یہ چشم دید گواہی ہے۔ وہ آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

هو يعظ الناس فى كل جمعة فيتوب كثير منهم بين يديه و يحلقون رؤسهم ويتو اجدون ويغشى علىٰ بعضهم شاهدته وهو يعظ فقرٔ قارى بين يديه

یاایھاالناس اتقوا ربکم ان زلزلة اساعة شئی عظیم الایة ثم کرر هاالفقیه علاء الدین فصاح احد الفقراء بن ناحیة المسجد صیحة عظیمة فاعاد الشیخ الایة فصاح الفقیر ثانیا و وقع ملیتا کنت من صلی علیه و حضر جنازته. (ص121)

''ہر جمعہ کو علاؤالدین نیلی وعظ کہتے ہیں، ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو توبہ نصیب ہوتی ہے، ان کے وعظ میں لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور بیچ بیچ میں سننے والوں پر وجد طاری ہوتا ہے، بعضوں پر تو غشی طاری ہو جاتی ہے۔ ایک دن ایک شخص میرے سامنے بیہوش ہوا جس وقت شیخ وعظ کہہ رہے تھے، قاری نے آیت پڑھی (جس کا ترجمہ ہے) لوگو! ڈرو اپنے رب سے اس گھڑی کی بھونچال سخت ہے (یعنی قیامت کی) مولانا نیلی نے اس آیت کو چند بار دہرایا۔ اتنے میں فقیروں میں سے ایک آدمی چیخ اٹھا، جو مسجد کے کسی حصہ میں تھا، ایک چیخ ماری۔ شیخ نے آیت کو پھر دہرایا۔ اس نے پھر چیخ ماری اور بے جان ہو کر گر پڑا۔ میں بھی اُن لوگوں میں تھا جنھوں نے اس شخص کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اس کے جنازہ میں حاضر ہوئے۔

مولانا ضیاء الدین سنامی اور وعظ گوئی

سلطان المشائخ ہی کے زمانہ میں صاحبِ کتاب ''نصاب الاحتساب'' مولانا ضیاء الدین سنامی تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے، ان کے معاصر ضیاء الدین برنی نے اختلافِ مسلک کے باوجود اپنی تاریخ میں یہ شہادت ادا کی ہے:

للسنامی الید البیضاء فی تفسیر القرآن الکریم و کشف حقائقه یذکر فی کل اسبوع و یحضر مجلسه ثلاثة الاف من الناس من کل صنف ویتاثرون بمواعظ حتیٰ انهم یجدون حلاوتها الیٰ الاسبوع الأخر. (نزہۃ الخواطر۔ ص98)

''قرآن کی تفسیر میں ان کو کمال ہے، وہ ہفتہ میں ایک دفعہ وعظ کہتے ہیں، ان کے وعظ میں تین تین ہزار آدمیوں کا مجمع ہو جاتا ہے، جن میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے وعظ سے متاثر ہوتے ہیں، اتنا اثر لیتے ہیں کہ دوسرے ہفتے تک اس کی حلاوت اپنے اندر پاتے ہیں۔''

مولانا شعیب اور وعظ گوئی

نویں صدی میں مولانا شعیب نامی عالم دلّی میں تھے۔ شیخ محدث نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''درزمانے کہ او وعظ گفتے وقرآن خواندے ہیچ کس را مجال عبور ازاں راہ نبودے، اگرچہ خود بارگراں برسرداشتے۔ (اخبار۔ ص255)

''جس زمانہ میں وہ وعظ کہا کرتے اور قرآن پڑھا کرتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ بغیر سنے

گذر جائے، خواہ اس کے سر پر بھاری بوجھ ہی کیوں نہ ہوتا۔"

واعظین کا احترام واعزاز

ہندوستان کے اس دور میں اسلامی مذکرین وخطباء کی کتنی قدر ومنزلت کی جاتی تھی اس کا اندازہ ابن بطوطہ کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو محمد تغلق کے متعلق اس نے لکھا ہے:

امران یھیأله منبر من الصندل الابیض القامری وجعلت مسامیره و صفائحه من الذهب والصق باعلاه حجر یاقوت عظیم و خلع علی ناصرالدین خلع، مرصعة بالجوهر و نصب له المنبر فوعظ وذکر فلما نزل قام السلطان الیه و عانقه وارکبه علی فیل و ضربت له سراجة من الحریر الملون وصیوانها من الحریر و خبائها ایضاً کذلک فجلس الواعظ فیها وکان بجانبها اوانی الذهب واعطاه السلطان ایاها وذٰلک تنور کبیر بحیث یسع فی جوفه الرجل القاعد و قدران و صحاف وکل ذٰلک من الذهب وکان اعطاه عند قدومه مائة الف دینار. (نزہۃ الخواطر۔ص 127)

"تغلق نے واعظ کے متعلق حکم دیا کہ سفید صندل کا منبران کے لیے تیار کیا جائے جس میں کیلیں اور پتر سونے کے لگائے گئے تھے، اور منبر کے اعلیٰ حصہ میں ایک بڑا یاقوت جڑا گیا، واعظ جن کا نام ناصرالدین تھا۔ ان کو ایک مرصع خلعت عطا ہوئی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ وہی منبران کے لیے بچھایا گیا۔ مولانا ناصرالدین اس پر چڑھے وعظ بیان کیا۔ بادشاہ اس کے بعد کھڑا ہوا اور ان سے بغلگیر ہوا اور ہاتھی پر سوار کیا۔ اور ان کے لیے ایک خیمہ جو رنگین حریر کا بنا ہوا تھا نصب کیا گیا۔ اس خیمہ کے اندر کا کمرہ بھی حریر ہی کا تھا، اسی میں واعظ بیٹھے، ان کے اِردگرد سونے کے۔ برتن تھے جو بادشاہ نے سب مولانا کو دے دیا۔ وہ ایک بڑا تنور تھا جس کے اندر ایک بیٹھا ہوا آدمی غائب ہوسکتا تھا۔ دو ہانڈیاں اور پیالے تھے سب سونے کے جس وقت واعظ ہندوستان آئے تھے بادشاہ نے ان کو ایک لاکھ اشرفی دی تھی۔"

مواعظ میں نظم

ہندوستان کو باضابطہ دارالسلام بنا کر مسلمانوں نے ابتداء میں جب اِس ملک کو اپنا وطن بنایا تو گو وہ زبان جس نے آئندہ ترقی پا کر اُردو کی شکل اختیار کی، اس کی آفرینش کی داغ بیل پڑ چکی تھی، لیکن پھر بھی عموماً وعظ وتذکیر کی زبان فارسی ہی تھی، لیکن اس ملک کی مقامی ضروریات کا اندازہ کر کے واعظینِ اسلام میں سے بعض حضرات اپنے مواعظ میں نثر

نہیں تو نظم کی حد تک ہندی زبان کے اشعار بے محابا استعمال کرتے تھے۔ مُلّا عبدالقادر بداؤنی نے حضرتِ مخدوم شیخ تقی الدین ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''چنداین'' نام ہندی مثنوی کہ:

''در بیان عشق ورک وچاندا عاشق، معشوق والحق خیلے حالت بخش است مولانا داؤد (12) وبنام او نظم کردہ۔''

واللہ اعلم یہ کونسی کتاب ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کی نظر اس مثنوی پر پڑی ہے یا نہیں، بداؤنی نے تو لکھا ہے:

''از نہایت شہرت دریں دیار احتیاج بہ تعریف ندارد'' (ص 250)

شیخ تقی الدین اور ہندی مثنوی

بہرحال ایک عالم مسلمان کی یہ ہندی مثنوی اگر کہیں اب بھی مل سکتی ہو تو اُردو زبان کی پہلی باضابطہ بنیادی کتاب شاید یہی قرار پاسکتی ہے۔ خیر یہ الگ مسئلہ ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مخدوم شیخ تقی الدینؒ کے متعلق بداؤنی نے لکھا ہے کہ:

''مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے ابیات تقریبی او را بر منبر می خواند و مرحوم را از استماع آں حالت غریبہ می داد۔''

''مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی دہلی میں بعض اشعار منبر پر پڑھتے، جس کے سننے سے مرحوم پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔''

مثنوی ہندوی

آگے لکھتے ہیں کہ:

''چوں بعض افاضلِ آں عہد شیخ (مخدوم تقی الدین) را پرسیدند کہ سبب اختیار ہندوی چیست۔''

''اس دور کے بعض افاضل نے شیخ سے پوچھا، اس ہندی مثنوی اختیار کرنے کا کیا سبب ہے۔''

مخدوم نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''تمام آں حقائق ومعانی ذوقیست وموافق بوجدان اہل شوق وعشق ومطابق بہ تفسیر بعضے از آیاتِ قرآنی۔'' (ص 250)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معارف وحقائق کو علماء نے اسی زمانہ میں ہندوستان کی مقامی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا، بداؤنی نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ:

''خوش آوازانِ ہند حالا ہم بسواد خانی آں صید دلہا می نمائند۔''

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مثنوی سے میں ذاتی طور پر خود واقف نہیں ہوں اور نہ بداؤنی کے سوا کہیں دوسری جگہ اس کا ذکر ملا ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ جس زبان کو ''ہندی زبان'' سے بداؤنی موسوم کر رہے ہیں، اس کے الفاظ کس نوعیت کے تھے۔ اتنا تو یقینی ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جنہیں فیروز تغلق کے عہد ہی میں مسلمان عام طور پر سمجھ سکتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے سننے سے عام مسلمانوں پر ''حالت غریبہ'' کیسے طاری ہو سکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جب یہ مثنوی اکبر کے عہد تک عام طور سے سنی سنائی جاتی تھی اور ''خوش آوازانِ ہند بسواد خوانی او صید دلہا'' کرتے تھے تو غالب قرینہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں اس کے نسخے ضرور پائے جاتے ہوں گے۔ کاش! اس مثنوی کا ''انجمن ترقی اُردو'' پتہ چلاتی ممکن ہے کہ انجمن نے اس کا نسخہ مہیا کر لیا ہو، لیکن مجھے اس کا علم نہ ہو، اگر ایسا ہے تو یہ مثنوی اس کی مستحق ہے کہ اس پر مستقلاً کام کیا جائے۔

شیخ نظام الدینؒ کا وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ تذکیر و وعظ میں مہارت و مشق پیدا کرنے والوں کا ایک گروہ ہر عہد میں پایا گیا ہے، میں نے بطور نمونے کے یہ چند قدیم مثالیں پیش کی ہیں، سلطان المشائخؒ کے ملفوظات میں متعدد واعظوں کا پتہ چلتا ہے، جن کے مواعظ سلطان جی نے عہد طفولیت میں سنے تھے۔ خصوصاً شیخ نظام الدین ابوالموئد جو بلبنی عہد کے مشہور علماء میں ہیں، ان کے وعظ کا تذکرہ عموماً فرماتے۔ شیخ محدث نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، چونکہ بڑی مؤثر چیز ہے ''اخبار'' ہی سے نقل کرتا ہوں۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

> ''دراں ایام کودک بودم درک معانی چنداں بمرا نبودہ است روزے در تذکیر او آمدم۔''
>
> ''میں ان دنوں بچہ تھا، معانی سمجھنے کا کچھ زیادہ شعور نہ تھا، چنانچہ ایک دن ان کے وعظ میں حاضر ہوا۔''

آگے ان کی دوگانہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ:

> ''بالائے منبر رفت، مقری بود اور را قاسم گفتندے خوش خواں آیتے بخواند بعد ازاں شیخ نظام الدین ابوالموائدؒ آغاز کرد کہ ''بخط بابائے خود نوشتہ دیدہ ام۔''
>
> ''منبر پر تشریف لے گئے، قاری نے خوش الحانی کے ساتھ ایک آیت پڑھی، اس کے بعد شیخ نظام الدین الموائدؒ نے یہاں سے شروع کیا، فرمایا کہ اپنے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا، دیکھا ہے۔''

ایک رباعی

حضرت کا بیان ہے کہ صرف ان الفاظ کا سامعین پر اتنا اثر پڑا کہ ''ہمہ در گریہ شدند'' (تمام لوگوں پر گریہ طاری ہو

گیا) اس کے بعد اس رباعی کا جسے حضرت نظام الدین ابوالمؤید نے اپنے والد کے ہاتھ کا نوشتہ پایا تھا، پہلا یہ شعر پڑھا:

بر عشق تو و برتو نظر خواہم کرد
جاں در غم تو زیر و زبر خواہم کرد

فرماتے ہیں کہ شعر کا پڑھنا تھا کہ "نعرہا از خلق برآمد" بار بار اسی شعر کو دہراتے جاتے تھے اور اہلِ محفل میں شور برپا تھا۔ ایسی حالت طاری ہوئی کہ دوسرا شعر رباعی کا یاد نہیں آتا تھا۔ یہ فرما کر "اے مسلمانان دو مصراع دیگر یاد نمی آید چہ کنم" کہتے ہیں کہ کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات آپ نے فرمائی کہ مجمع اس پر بھی برہم ہو گیا۔ آخر اسی مقری قاسم نے یاد دلایا۔ دوسرا شعر رباعی کا یہ تھا:

پُر درد و لے بخاک در خواہم شد
بر عشق سرے ز گور خواہم کرد

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس دن کا وعظ صرف ان ہی دو مصرعوں پر ختم ہو گیا۔

وعظ میں نظم وشعر کا اہتمام

اس سے اس زمانہ کے وعظ کا جو طریقہ ہندوستان میں جاری تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یعنی کوئی خوش الحان مقری (قاری) پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھتا، واعظ اسی آیت کو عنوان بنا کر تقریر شروع کر دیتا تھا۔ یہی طریقہ اس زمانہ میں، بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک میں بھی مروج تھا، نیز مواعظ میں اثر آفرینی کے لیے اشعار کا استعمال معلوم ہوتا ہے کہ علماء کی قدیم سنت ہے، جب مخدوم شیخ تقی الدین جیسی جلیل القدر ہستی جن کا تذکرہ سلطان المشائخ اور مخدوم شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جیسے اکابر شاندار الفاظ میں فرماتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے آگے بڑھ کر "لورک اور چندا" کی ہندوی مثنوی کے اشعار تک اپنے وعظوں میں استعمال فرماتے تھے۔ تو اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا مل سکتا ہے، لیکن سچی بات یہی ہے کہ گو خطابت بھی ایک قسم کا آرٹ اور مشقی چیز ہے تاہم تاثیر کے لیے کچھ اور باتوں کی بھی ضرورت ہے۔

مولانا کریم الدین کا اندازِ وعظ گوئی

علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں مولانا کریم الدین دلّی کے ایک واعظ تھے، البرنی کے حوالے سے صاحب "نزہۃ الخواطر" نے ان کے متعلق یہ بیان نقل کیا ہے:

> كان ينشد فى مواعظه كثيراً من الاشعار من انشائه وسيجع الكلام ولذاک لم يعجب الناس ولا ياخذ بمجامع القلوب فلا يحضر فى مجلسه الاقيل من الناس. (ص115)

"اپنے وعظوں میں خود تصنیف اشعار پڑھنے کی ان کو عادت تھی اور مقفّیٰ گفتگو کرتے تھے۔

اسی لیے لوگ ان کے وعظ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ دلوں پر اثر ہوتا تھا، ان کی مجلس وعظ میں اسی وجہ سے کم آدمی شریک ہوتے تھے۔''

حالانکہ البرنی ہی کی یہ بھی شہادت ہے کہ:

له انشاء يدل على قدرته على البيان نظماً و نثراً. (ص115)

''ان کی انشاء اچھی ہے، نظم ونثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔''

بہر حال اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ نصابی کتابوں سے لوگوں کو مغالطہ نہ کھانا چاہیے، بلکہ گرد وپیش کے دوسرے واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر رائے قائم کرنی زیادہ قرینِ صواب ہوگا۔

تعلیمی نصاب میں معقولات کا حصہ

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں، یعنی ہمارے تعلیم نصاب میں صدیوں معقولات کا حصہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، تو پھر آئندہ کیا واقعات پیش آئے جن کا آخری نتیجہ وہ ہوا کہ خالص اسلامی علوم کی کتابوں کے مقابلہ میں معقولات کا پلہ اتنا جھک گیا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس میں منطق و فلسفہ وکلام کے سوا گویا دوسرے فنون کی کتابیں پڑھائی ہی نہیں جاتی تھیں۔

نصابِ فضیلت میں دینیات کا حصہ

واقعہ یہ ہے کہ آخر زمانہ میں ہمارا جو نصاب درسِ نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا اس میں حدیث کی ایک کتاب مشکوٰۃ اور تفسیر میں جلالین، بیضاوی کی صرف ایک سورۂ بقرہ کے بعد شرح وقایہ کی اولین اور ہدایہ کی آخرین یعنی معناً وہ فقہ کی ایک ہی کتاب ہوئی، گویا بیضاوی کی ایک سورہ کا اگر نہ لحاظ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ضرورت والے نصاب میں نہیں بلکہ نصابِ فضل میں بھی خالص دینیات کی کل تین کتابیں جلالین، مشکوٰۃ، شرح وقایہ وہدایہ کے سوا کنز وقدوری کے مختصر فقہی متون کے بعد تقریباً چالیس پچاس کتابیں جو پڑھائی جاتی تھیں وہ خالص عقلیات کی کتابیں ہیں یا ایسی کتابیں ہیں جن کا بظاہر تعلق تو کسی دوسرے فن سے ہے لیکن درحقیقت ان کا طرز بیان اول سے آخر تک وہی معقولات کی کتابوں کا سا ہے۔

شرح مُلّا جامی میں عقلیت کا رنگ

انتہا یہ ہے شرح مُلّا جامی بظاہر نحو کی کتاب ہے لیکن جاننے والوں سے مخفی نہیں ہے نحوی مباحث کو بھی اس میں عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے اور جب نحو کی کتاب کا یہ حال ہے تو پھر اصول فقہ یا کلام کی جو کتابیں ہیں ان میں منطقیت اور عقلیت کی جس حد تک گنجائش پیدا ہو سکتی تھی ظاہر ہے، آج ہی نہیں ابتداء سے علماء کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اصولِ فقہ کو فقہ سے وہی نسبت ہے جو منطق کو فلسفہ سے ہے (دیکھیے مسلم الثبوت) باقی علم کلام کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں کہ

مسلمانوں کا وہ ایک فلسفہ ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جب عنصریات و کائنات الجو تک کے مباحث کلامی کتابوں کے اجزاء بنا دیئے گئے ہیں، تو اس کے فلسفہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ یہی حال ان کتابوں کا ہے جو عربیت کے نام سے پڑھائی جاتی ہیں، یعنی معانی، بیان، بدیع کی دونوں نصابی کتابیں ''مختصر المعانی'' اور ''مطول'' پڑھنے والوں کو ان کتابوں میں جتنی ذہنی لذت ملتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اسی حد تک وہ ان علوم کے مسائل کا حقیقی مذاق بھی اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس کا نہایت صفائی کے ساتھ ہمیں اقرار کرنا چاہیے۔ میں اب چاہتا ہوں کہ مندرجہ ذیل دو سوالوں سے بحث کروں۔

معقولات کا حصہ اور اس کی وجہ

(1) مدت تک جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہندوستان کے تعلیمی نصاب میں منطق وکلام کی تعلیم صرف ''قطبی'' اور ''شرح صحائف'' تک محدود تھی۔ پھر کیا صورتیں پیش آئیں کہ ہمارا نصاب عقلیات کی ان لامحدود کتابوں سے معمور ہو گیا؟

(2) اگرچہ اس زمانہ میں سلف کے اس طرزِ عمل کا عموماً مضحکہ اڑایا جاتا ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ خالص دینیات و اسلامیات کی کل تین کتابوں پر قناعت کر کے اس بری طرح اسلامی نصاب کو عقلیات سے پاٹ دینا بہ ظاہر تعجب خیز ہی نہیں، بلکہ شاید ایک مسلمان کے لیے غصہ انگیز بھی ہو اور غیظ وغضب کا یہ جذبہ مضحکہ کی صورت اختیار کر لے، مگر آج میں چاہتا ہوں کہ الفاظ کے ہنگاموں سے الگ ہو کر غور کروں کہ واقعی بزرگوں کا یہ طرزِ عمل کیا اسی درجہ قابل نفرین وملامت ہے، جس کا آج اسے مستحق قرار دیا جا رہا ہے۔

سکندر لودھی کا عہد زرّیں

ظاہر ہے کہ پہلا سوال ایک تاریخی سوال ہے، میں بتا چکا ہوں کہ نویں صدی جب گذر رہی تھی، یعنی سکندر لودھی کی تخت نشینی (894ھ) تک تقریباً دو سو سال تک منطق وکلام کی مقدار ہمارے نصاب میں وہی ''قطبی'' و ''شرح صحائف'' کی حد تک تھی لیکن دلّی کے تخت پر جب سکندر لودھی پہنچا تو گو ہماری عام تاریخوں میں اس کے عہد کا تذکرہ کچھ زیادہ اہمیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا، لیکن یہ تو سیاسی تاریخوں کا حال ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں گیری و جہاں داری کے لحاظ سے سکندری عہد کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن علمی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری مختلف حیثیتوں سے سکندر کا عہد عہد آفریں قرار پانے کا مستحق ہے، شیخ محدث ''اخبار الاخیار'' میں ارقام فرماتے ہیں:

''زمان دولت سکندر زمان صلاح وتقویٰ و دیانت و علم وقار بود۔''

''سکندر کی حکومت کا زمانہ صلاح وتقویٰ، دیانت وامانت اور علم ووقار کا زمانہ تھا۔''

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''او را با علماء و اکابر و اشراف میلے عظیم شد۔''

''اُن کو علماء و صلحاء اور اکابر و اشراف کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔''

ہندوستان میں غیر ملکی علماء کی آمد

ایک مطلق العنان بادشاہ میں جب کسی چیز کا ''میل عظیم'' پیدا ہو جائے تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے شیخ محدث ہی فرماتے ہیں:

''لہٰذا از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقہ استدعاء، وطلب، بعضے بے آں در عہد دولت او تشریف آوردہ توطن ایں دیار اختیار کردند۔'' (ص 227)

''اسی وجہ سے دنیا کے گوشہ گوشہ سے بعض سابقہ دعوت وطلب پر اور بعض بغیر اس کے عرب و عجم سے آئے اور یہاں وطن اختیار کر لیا۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس سے پیشتر کے بادشاہوں کے عہد میں بیرون ہند سے آنے والوں کا ایک سلسلہ اس ملک میں جاری تھا، مگر عموماً انعام واکرام لے کر پھر یہ حضرات اپنے اصلی اوطان کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ سکندر ہی شاید پہلا ہندی بادشاہ ہے جس نے ان بزرگوں کو بھی جنہیں خود دعوت بھیج کر اس نے ہندوستان بلایا، جیسا کہ ''سابقہ استدعا'' سے ظاہر ہے یا جو خود اس کی قدر دانیوں کا حال سن کر اس ملک میں آئے، سب کو باصرار ہندوستان ہی میں رہنے اور اس کو وطن بنانے پر اس نے آمادہ کیا۔ شیخ نے اس کے بعد اس عہد کے بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، لکھا ہے:

''چنانچہ اکثر بزرگان دریں طبقہ کہ مذکور می شوند ازاں قبیل اند۔''

''چنانچہ اکثر بزرگ اس طبقہ میں جن کا ذکر ہوا، اسی قبیل سے ہیں۔''

عہد سکندری کے امتیازات

شیخ محدث پر عہدِ سکندری کے غیر معمولی امتیازات کا جو اثر تھا، اُس کا اظہار آخر میں بایں الفاظ فرماتے ہیں:

''بالحقیقہ محامدِ زماں سلطنت آں سلطان سعادت نشان از حد تقریر وتحریر خارج است۔''

''حقیقت یہ ہے کہ اس بادشاہ سعادت نشاں کی سلطنت کی خوبیاں تقریر وتحریر میں نہیں آ سکتیں۔''

ظاہر ہے کہ یہ کسی شاعر کا مبالغہ آمیز دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک عالم ومحدث کی تاریخی شہادت ہے، آخر میں سعدی کے اس مشہور شعر:

گر ایں جملہ را سعدیؔ املا کند
مگر دفترے دیگر انشا کند

پر عہد سکندری کے محامد وخصوصیات کے ذکر کو حضرت نے ختم فرمایا ہے، کاش! ان کے قلم سے ''دفترِ دیگر'' عہدِ سکندری کے متعلق انشا پذیر ہو جاتا، تو علمی اور دینی تاریخ میں ہندوستان کے ایک اہم اور قیمتی مواد کا اضافہ ہو جاتا۔ اگر چہ مختلف تاریخوں میں جو بکھرے بکھرے واقعات ملتے ہیں، کوئی چاہے تو ان کو سمیٹ کر اس زمانہ کی انقلابی خصوصیتوں اور نئے اقدامات کو اجاگر کرسکتا ہے۔ اس بادشاہ کو حکومت کا وقت بھی کافی ملا ہے۔ یعنی موجودہ زمانہ میں عموماً سرکاری خدمات کی جو انتہائی مدت ہے اس سے زیادہ ہی زمانہ ہے، تقریباً تیس سال اُس نے بادشاہی کی۔ سمجھا جاسکتا ہے کہ اتنی طویل مدت میں کسی بادشاہ کا ''میل عظیم'' کن چیزوں کو پیدا کرسکتا ہے۔

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ

کچھ قدرتی بات یہ بھی ہے کہ جس زمانہ میں جس قسم کے بادشاہ ہوتے ہیں، اسی قسم کا مذاق عوام میں بھی پھیل جاتا ہے۔ علم وفن کی جو قدردانیاں سکندری حکومت کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھیں اُن کے سوا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف عہدِ سکندری کے مشہور امیر کبیر ملک زین الدین اور ان کے بھائی زبرالدین کا حال جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے:

''بعلاقہ صلاح وتقویٰ وخدمتگاری، اکثر علماء ومشائخ وقت را بایشاں محبتے ورجوع آمد۔''

(ص226)

''صلاح وتقویٰ اور خدمتگاری کی وجہ سے اکثر علماء ومشائخ وقت کو اس سے محبت وتعلق تھا۔''

''اخبار'' ہی میں یہ بھی ہے کہ دلّی کے نواح میں عموماً جو سیر حاصل شاداب گاؤں اور مواضع تھے ملک زین الدین نے بادشاہ سے انہیں جاگیر میں حاصل کر لیا تھا، ان کے بھائی زبرالدین جو حکومت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، عموماً ان ہی دیہاتوں اور سیر گاہوں میں ''علماء وصلحاء وصوفیاں ہمہ درصحبت اوخوش می گذرانیدند۔'' (ص226) گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ علماء وصلحاء کے یہ دونوں بھائی اس زمانہ میں شاہی میزبان تھے۔ (15)

علماء نوازی

اسی طرح اسی زمانہ میں ایک خوش باش شیخ جمالی دلّی میں تھے۔ خود بھی صاحب علم وبصیرت تھے۔ لکھا ہے کہ:

''بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ ومولانا عبدالرحمٰن جامی وجلال الدین محمد دوانیؒ را دریافتہ۔'' (اخبار الاخیار۔ ص228)

''حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے، اور مولانا عبدالرحمٰن جامی اور جلال الدین محمد دوانیؒ کو دیکھے ہوئے۔''

ان ہی شیخ جمالی کے صاحبزادے میاں عبدالحیی تھے جنہیں:

''مبلغ کثیر از ترکۂ پدر رسیدہ بود۔''

''باپ کے ترکہ سے بڑی رقم پہنچی تھی۔''

لیکن اُن کا بھی یہی دستور تھا:

''درزمان افغاناں ہر کہ ازجنس طالب علم یا شاعر یا قلندر راز ولایت بایں جانب می افتادو منزل اور بود و بر ہر یک مہربانہا و خدمتہا می کرد۔''(16)

''افغانیوں کے زمانہ میں جو طالب علم، شاعر یا قلندر اس طرف آ جاتا، ان کے گھر مہمان ہوتا اور ہر ایک سے مہربانی سے پیش آتے اور خدمت کرتے۔''

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ باپ کا سارا متروکہ:

''درمدتے از عمر خود صرف اوقات یاراں کرد'' (ص 221)

بہر حال ان چند مثالوں سے اس چہل پہل کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے، جو دلّی میں اس وقت تعلیم وتعلم، علم وفن کے متعلق قائم ہو گئی تھی۔

شیخ عبداللہ وعزیز اللہ

سکندر کے زمانہ میں اور کن کن پہلوؤں سے کیا کیا نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں، کن کن چیزوں میں کیا کیا انقلابات ہوئے، اس وقت ان کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ ''تعلیمی نصاب'' میں جو انقلاب پیدا ہوا صرف اُسی کو ظاہر کرنا ہے۔ اس قصہ کا ذکر مولانا غلام علی آزاد شیخ محدث اور ان سے پہلے مُلا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلّی میں اربابِ علم وفضل کا عہدِ سکندری میں جو غیر معمولی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، ان ہی میں دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بھی تھے۔ دراصل یہ دونوں حضرات ملتان کے علاقہ تلبن نامی کسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ جو شاید اب کوئی غیر معروف گاؤں ہے، ان دونوں حضرات کو فنِ تدریس میں کمال حاصل تھا، شیخ عبداللہ کو تو سکندر نے دلّی ہی میں رکھ لیا، اور مولانا عزیز اللہ سنبھل (مراد آباد) روانہ کر دیئے گئے، جو اس زمانہ میں اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا۔ سلطان سکندر شیخ عبداللہ کے طریقۂ درس وتعلیم کا گویا عاشق تھا۔

سلطان وقت درسگاہ میں

بداؤنی نے لکھا ہے کہ:

''می گویند کہ سلطان سکندر در وقت درس شیخ عبداللہ مذکور می آمد۔'' (ص 341)

''لوگوں کا بیان ہے کہ سلطان سکندر، شیخ عبداللہ کے درس میں شریک ہوتا تھا۔''

اور آ کر کیا کرتا تھا، لکھتے ہیں کہ:

''در گوشۂ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ با یک دگر صحبت می

داشتند۔''(بداؤنی۔ج1،ص324)

''مجلس کے ایک کنارے آہستہ سے بیٹھ جاتا، جب درس ختم ہوتا، سلام کرتا، پھر دونوں مل کر بیٹھتے اور گفتگو کرتے۔''

ایک مطلق العنان بادشاہ کا حلقۂ درس میں یوں دبے پاؤں آنا اور درس کا سننا، اس وقت تک سنتے رہنا جب تک کہ درس ختم نہ ہولے۔ بظاہر شاید معمولی بات معلوم ہو، لیکن شاہی رعب ودبدبہ کا حال جنہیں معلوم ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، خود تاریخ میں اس کا نقل ہونا اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔

مولانا عبداللہ کے فیوض وبرکات

مولانا عبداللہ ایک بہترین مدرس ہونے کے سوابلا کے پڑھانے والے تھے، بداؤنی نے لکھا ہے کہ:

''از استادان شنیدہ شد کہ زیادہ از چہل عالم تحریر متجر از پائے دامن شیخ عبداللہ مثل میاں لادن و جمال خاں دہلوی (17) ومیاں شیخ گوالیاری ومیراں سید جلال بداؤنی ودیگراں برخاستہ اند۔''(ص324)

''اساتذہ سے سنا گیا ہے کہ چالیس متجر عالم سے زیادہ شیخ عبداللہ کے دامن سے وابستہ رہے اور نکلے، جیسے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری، اور میران سید جلال بداؤنی۔''

چالیس سے زیادہ معمولی نہیں ''تحریر ومتجر'' علماء جس کے حلقہ درس سے اٹھے ہوں، اندازکیا جاسکتا ہے کہ اُس نے کتنوں کو پڑھایا ہوگا۔ آج بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور کلیات وجوامع سے بھی سالہاسال گذر جانے کے بعد بمشکل چند ہی آدمی ایسے نکلتے ہیں جن کا علم وفضل قابلِ ذکر ہو، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ عبداللہ کے درس کی کیا نوعیت تھی۔

مولانا عزیزاللہ کی درسگاہ

اُن کے بھائی مولانا عزیزاللہ کے متعلق بھی بداؤنی ہی نے لکھا ہے کہ:

''استحضارے عجیب داشتند کہ متعلمان متفطن ہر طور کتابے مشکل منتہیانہ رامی خواندو بے مطالعہ درس می گفتند۔''

''یاد اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ ذہین وفطین طلبہ جس طرح چاہتے مشکل سے مشکل اور اونچی سے اونچی کتاب پڑھتے اور وہ بغیر مطالعہ درس دیتے۔''

اسلامی علوم کی کتابوں کے درس وتدریس کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا استحضار یعنی درس کی انتہائی کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر پڑھانے والے ہزاروں میں کوئی ایک دو ہی عالم ہوتے ہیں، خاکسار خود اپنے تیس

چالیس سالہ تعلیمی تجربات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ گو اس عرصہ میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے علماء سے پڑھنے پڑھانے کا موقع ملتا رہا جن میں بعض اپنے عصر کے امام اور شیخ الکل تھے لیکن ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے سوا اس قسم کے استحضار کا تجربہ کسی کے متعلق نہیں ہوا۔ مُلا عبدالقادر ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا عزیز اللہ کے علم کی پختگی اور ذہن کی تیزی کا یہ حال تھا کہ طلبہ:

''بارہا بامتحاں پیش آمدہ اسولہ لا مدفع لہامی آوردند شیخ مشارالیہ در وقت افادہ معاحل ساختہ۔''

''بسا اوقات بطور جانچ کے طلبہ شیخ عزیز اللہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کرتے جن کا جواب نہ ہوتا، لیکن شیخ عین درس وافادہ کے وقت ان کو اسی وقت حل کر دیتے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ سکندری کے انہی دونوں بزرگوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے درس وتدریس کا سلسلہ ختم ہوتا تھا، مولانا آزاد نے عبداللہ تلنبی کے ذکر میں لکھا ہے:

''بر چار بالش افادہ نشست وشش جہت را بہ نشر لوامع علوم منور ساخت۔'' (ص 191)

مولانا حاتم سنبھلی

''ہدایہ'' کے ہندوستانی شارحین میں مولانا الہداد جونپوری کی خاص شہرت ہے، مولانا آزاد کا بیان (18) ہے کہ وہ:

''تلمیذ مولانا عبداللہ تلنبی نور اللہ ضریحہ است۔'' (ص 192)

''مولانا عبداللہ تلنبی کے شاگرد ہیں۔''

اسی طرح شیخ عزیز اللہ نے جن شاگردوں کو پیدا کیا، ان میں مشہور ومعروف صاحب درس عالم مولانا حاتم سنبھلی بھی ہیں۔ یہ استاد ہی کا رنگ تھا کہ ان کے درس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے:

''در مدت عمری گویند کہ از سی بار متجاوز شرح مفتاح را واز چہل مرتبہ بیش تر مطول را از بائے بسم اللہ تا تائے تمت درس گفتہ۔'' (ص 324)

''کہا جاتا ہے کہ اپنی عمر میں تیس مرتبہ سے زیادہ شرح مفتاح اور چالیس بار سے زیادہ مطول اول سے آخر تک پڑھا چکے تھے۔''

مُلا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ میاں حاتم سنبھلی کی قدم بوسی سے سرفراز ہوا تھا۔ ان کی خانقاہ میں قصیدۂ بردہ زبانی یاد کیا اور ''کنز'' کے ابتدائی اوراق ''تبرکاً'' اس سے پڑھے تھے۔ میاں صاحب نے ملا کو کلاہ و شجرہ بھی دیا تھا۔ درس وتدریس کے بعد جب درویشی رنگ میاں حاتم پر چڑھا تو:

''دہ سال در صحرائے نواحی سنبھل وامروہہ سر وپا برہنہ می گشت دریں مدت سر او بابالین وبستر نہ رسید۔'' (منتخب۔ ج 3، ص 2)

''دس سال سنبھل وامروہہ کے اطراف میں ننگے سر ننگے پاؤں پھرتے رہے۔اس عرصہ میں نہ کبھی تکیہ سر کے نیچے رکھا اور نہ بستر۔''

معقولات کا رواج

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے ان دونوں ملتانی مدرسوں (شیخ عبداللہ وشیخ عزیز اللہ) کی اس حیثیت اور مقام کا اندازہ ہوسکتا ہے جو ہندوستان کے تدریسی وتعلیمی حلقوں میں ان کا قائم ہوگیا تھا۔اب سنیے بالاتفاق ہمارے تعلیمی مورخین کا یہ بیان ہے کہ:

''ایں ہر دو عزیز (شیخ عبداللہ وعزیز اللہ) ہنگام خرابی ملتان در ہندوستان آمدہ علم معقول را دریں دیار رواج دادند'' (بداؤنی۔ص 323)

''یہ دونوں عزیز (عبداللہ وعزیز اللہ) ملتان کی ویرانی کے زمانہ میں ہندوستان آئے، اور علم معقول کو یہاں رواج دیا۔''

مولانا غلام علی آزاد نے بھی اسی کی تصدیق کی ہے، فرماتے ہیں:

''از خرابی ملتان اور شیخ عزیز اللہ تلبنی رخت بدار الخلافہ دہلی کشیدند وعلم معقول را دریں دیار مروج ساختند۔'' (مآثر۔ص 191)

''ملتان کی ویرانی کے بعد وہ اور شیخ عبداللہ نے دہلی کا سفر کیا، اور علم معقول کو اس ملک میں مرّوج کیا۔''

ورنہ اس سے پیشتر جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں ان ہی مورخین کی یہ اتفاقی شہادت ہے۔ (19)

''قبل ازیں (یعنی ملتان کے ان دو کہنہ مشق عہدِ سکندری کے مدرسوں سے پہلے) بغیر از شرح شمسیہ (یعنی قطبی) وشرح صحائف از علم منطق وکلام در ہند شائع نہ بود۔'' (بداؤنی۔ ص 324۔ مآثر۔ص 191)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ ''علم معقول'' کی کتابوں کی زیادتی کا دَور دَورہ اسی زمانہ کے بعد شروع ہوا۔ رہا یہ سوال کہ عہد سکندری کے تعلیمی نصاب میں معقولات کی کن کن کتابوں کا اضافہ ہوا۔کوئی مفصل فہرست تو اس کی اب تک نہیں مل سکی ہے۔ لیکن جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اسی قرن میں ملتان کے اندر ہم ایک مشہور معقولی عالم کو پاتے ہیں، جن کا نام مولانا سماء الدین تھا۔

مولانا سماء الدین

شیخ محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے کہ یہ مولانا سماء الدین:

''جامع بود میانِ علوم رسمی وحقیقی...... وگویند پیش مولانا سناء الدین کہ از شاگردان میر سید

شریف جرجانی بود تلمذ کردہ۔'' (ص 211)

''علوم رسمی و حقیقی کے جامع تھے، اور لوگوں کا بیان ہے کہ مولانا سناء الدین سے انہیں شرف تلمذ حاصل تھا جو میر سید شریف کے شاگردوں میں تھے۔''

شیخ ہی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملتان ہی کے رہنے والے تھے اور وہیں زمانہ دراز تک افادہ و استفادہ کی مجلسیں ان کے دم سے گرم تھیں۔ مگر ملتان کی بربادی کے بعد یہ بھی اس شہر کو چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

''از ملتان بہ سبب بعضے وقایع کہ دراں دیار واقع شد بر آمد۔'' (ص 211)

''ملتان سے ان واقعات کی وجہ جو وہاں واقع ہوئے، نکل آئے۔''

مولانا عبداللہ و عزیز اللہ کے متعلق بھی جیسا کہ گزر چکا یہی لکھا جاتا ہے کہ ملتان کی تباہی نے ان کو ہندوستان کی طرف رُخ کرنے پر مجبور کیا اور یہی قصہ مولانا سماء الدین کا بھی بیان کیا جاتا ہے، بجائے دلّی کے یہ رن تھنبور ا(20) اور بیانہ کی طرف چلے گئے تھے گو آخری عمر دلّی ہی میں گذری۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ''سن کبیر داشت۔'' 901ھ میں وفات ہوئی، یعنی سکندری دورِ حکومت میں ان کا انتقال بھی ہوا۔

''شرح مطالع'' اور ''شرح مواقف'' درس میں

کوئی خاص تصریح تو نہ ملی، لیکن غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ نے ممکن ہے معقولات کا علم ان ہی مولانا سماء الدین سے حاصل کیا ہو، جب وہ یعنی مولانا سماء الدین بہ یک واسطہ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان عقلی فنون کا ان پر جتنا غلبہ ہو کم ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ شرح مطالع، شرح حکمۃ اربعین، شرح مواقف جیسی کتابیں جن میں آخر الذکر دو کتابیں خود میر سید شریف اور اول الذکر ان کے اُستاد قطب الدین رازی کی کتابیں ہیں، یہاں کے نصاب میں شریک ہوئی ہوں گی۔ خصوصاً شرح مطالع پر جب میر صاحب کا معرکۃ الآرا حاشیہ بھی موجود ہے، بلکہ میر جرجانی کے ساتھ ساتھ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانہ میں شریک درس ہوئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ تفتازانی کی کتاب ''مطول'' کا نام سب سے پہلے مجھے شیخ عزیز اللہ کے شاگرد رشید میاں حاتم سنبھلی کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ بداؤنی کے حوالہ سے گذر چکا کہ چالیس مرتبہ سے زیادہ اس کتاب کو اول سے آخر تک انہوں نے پڑھایا تھا۔ خیر معقولاتی کتابوں کے اضافہ کا یہ تو پہلا دور تھا۔ اس کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

مغل حکومت اور نصاب تعلیم

بابر مغل حکومت قائم کرتے ہیں، اتنا تو ہر اسکول کا بچہ بھی جانتا ہے کہ بابر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہمایوں عقلی علوم کا حد سے زیادہ دلدادہ تھا(21)۔ مشہور ہی ہے کہ اس کی موت ہی یوں واقع ہوئی کہ اپنے کتب خانہ کی سیڑھیوں سے وہ اس وقت گرا، جب سیارۂ زہرہ کے طلوع مسائی کا افق پر انتظار کر رہا تھا۔ تاہم تعلیمی حلقوں میں کسی خاص انقلاب کا اثر

اس کے زمانہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ہمایوں کے بعد دورِ اکبری شروع ہوا۔ مختلف دینی اور عقلی قلابازیوں سے گذرتے ہوئے اکبر کا دربار صرف فلسفہ اور حکمت کا دربار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شیراز کے ایک معقولی عالم غیاث منصور کے تفلسف اور تمنطق کا شہرہ ایران سے گذر کر ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ اکبر تک یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ آج کل ایران میں ایک فلسفی ہے جو:

''بہ نماز وعبادات دیگر چندانے مقید نیست۔'' (بداونی۔ ص 315)

''جونماز اور دوسری عبادتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔''

مُلّا فتح اللہ شیرازی اکبر کی نظر میں

جس خبط میں اکبر اس زمانہ میں مبتلا ہو چکا تھا، اُس کا اقتضاء تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، اسی قسم کے لوگ دربار میں جمع کیے جائیں۔ مُلّا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش اکبر کو اس لیے رہتی تھی: ''مگر در سخناں مذہب ودین باایں شال مماشاہ خواہد گرد۔'' اتفاقاً اکبر کو خبر ملی کہ غیاث منصور کا ایک ''شاگرد بے واسطہ'' ان دنوں بیجاپور آیا ہوا ہے۔ یہ وہی مُلّا فتح اللہ شیرازی ہیں جن کا کچھ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ:

''در وادی الٰہیات وریاضیات وطبعیات وسائر اقسام علوم عقلی ونقلی......نظیر خود نداشت۔''

''الٰہیات، ریاضیات، طبعیات اور دوسرے علوم عقلی ونقلی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ہے۔''

مُلّا عبدالقادر نے لکھا ہے: ''برحسب فرمان طلب از پیش عادل خاں دکھنی (دوالی بیجاپور) بفتح پور رسید۔'' (ص 315)

اگر چہ دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ میر فتح اللہ کے متعلق اکبر کے جو توقعات تھے وہ غلط ثابت ہوئے۔ میر امامیہ مشرب کے پیرو تھے، مُلّا بداوُنی کا بیان ہے کہ فلسفہ وحکمت میں اس استغراق کے باوجود:

''در وادی مذہب خود استقامت تمام ورزیدہ...... ودقیقہ از دقائق تعصب در دین فرد نگذاشت۔''

''اپنے مذہب میں بالکل پختہ، اور اپنے مذہبی تعصب میں ڈوبا ہوا۔''

انتہا یہ ہے کہ:

درعین دیوانخانہ کہ ہیچ کس یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند نماز بفراغ بال و جمعیت خاطر بمذہب امامیہ میگذارد۔''

''عین اس دیوان خانے میں وہ بڑے اطمینان وسکونِ خاطر کے ساتھ امامیہ مذہب کے مطابق نماز ادا کرتا تھا، جہاں کسی اور کو اس کی مجال نہ تھی۔''

لکھا ہے کہ ''انچہ ماپنداشتیم'' کی اس غلطی پر اکبر:

''مطلع شد'' اور ''از مرۂ باب تقلید شمردہ ازاں وادی اغماض فرمودہ۔''

''مطلع ہوا، اسے ارباب تقلید میں سے سمجھا اور چشم پوشی سے کام لیا۔''

اور

''بجہت رعایت علم وحکمت وتدبیر و مصلحت در تربیت او ردقیقہ فروگذاشت نرفت۔''

''علم وحکمت کی رعایت اور تدبیر و مصلحت کے تقاضہ کی وجہ سے اس کی تربیت میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔''

مُلّا فتح اللہ کی ترقی

مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

''بہ کمتر فرصت بدولت مصاحبت فائز و قامت امتیاز بخلعت صدارت کل آراست''

(ص 227)

''تھوڑے دنوں میں مصاحبت کی دولت سے فائز ہوا، اور صدارت کی امتیاز خلعت سے آراستہ ہوا۔''

یعنی ''صدر جہانی'' کے عہدہ پر میر فتح اللہ سرفراز ہوئے۔ اکبری دربار کے امیر مظفر خاں تربتی کو حکم دیا گیا کہ ان کی چھوٹی لڑکی میر فتح اللہ کے ازدواج میں دی جائے۔ بتدریج میر کا اقتدار بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچا کہ ''گویند بر منصب سہ ہزاری رسیدہ بود'' (مآثر) اور آخر میں تو راجہ ٹوڈرمل وزیر اعظم میں بھی میر فتح اللہ کو شریک کر دیا گیا بلکہ مُلّا عبدالقادر کا بیان تو یہ ہے کہ:

''در منصب وزارت باراجر ٹوڈرمل شریک ساختند اما دلیرانہ کاروبار باراجہ درآمدہ دارو مدارے می نمود۔'' (ص 316)

''منصبِ وزارت میں راجہ ٹوڈرمل کا شریک بنادیا، دلیرانہ راجہ کے کاروبار میں دخل انداز ہوگیا اور دارومدار بن گیا۔''

میر کو اکبر کے دربار سے امین الملک عضد الدولہ کے خطابات بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔

میر فتح اللہ کا اکبر پر اثر

اکبر پر میر اور ان کے مختلف الجہات قابلیتوں کا کتنا اثر تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ سفرِ کشمیر سے واپسی کے موقع پر شہر ماندوجان میں جب میر فتح اللہ چندروزہ بیمار کے بعد راہی ملک عدم ہوئے تو اکبر روتا جاتا تھا اور یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر جاری تھے:

''میر وکیل وحکیم وطبیب، منجم مابود اندازہ سوگواری کو تواند شناخت اگر بدست فرنگ

افتادے وسائر محاصل حکومت وخزائن در برابر خواستے دریں سودا فراواں سودے کردمے۔"

(مآثر۔ص 238)

"ہمارا میر وکیل، حکیم وطبیب اور ہمارا منجم تھا۔ سوگواری کا اندازہ کون لگا سکتا ہے اگر یہ انگریزوں کے ہاتھ پڑ جاتا، اور وہ حکومت کے تمام محاصل وخزانے اس کے برابر طلب کرتے، تو میں اس سودا سے بھی نہیں چوکتا۔"

فیضی نے اکبر کی اسی سوگواری کی طرف اپنے مرثیہ میر میں اشارہ کیا ہے۔

شہنشاہِ جہاں را در و فاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطون عالم شد

بہرحال گزشتہ بالا معلومات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر فتح اللہ کی ہستی اکبری عہد میں کتنی وزن دار و موثر ہستی تھی۔

تصانیف ایران وخراسان ہندوستان میں

اب اس کے بعد تعلیمی مورخین کا یہ بیان سنیے۔ مولانا غلام علی آزاد فرماتے ہیں:

"تصانیف علماء متاخرین ولایت (ایران وخراسان وغیرہ) مثل محقق دوانی ومیر صدرالدین ومیر غیاث منصور ومرزا جان میر (فتح اللہ شیرازی) در ہندوستان آورد۔"

"ایران وخراسان وغیرہ کے متاخرین کی تصانیف ہندوستان لائے، جیسے محقق دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث منصور، مرزا جان میر (فتح اللہ شیرازی) کی کتابیں۔"

صرف یہی نہیں کہ ان ولایتی مشہور معقولیوں کی کتابیں وہ ہندوستان لائے کہ کتابوں کے لانے اور لے جانے کا کاروبار تو برابر ہی جاری تھا، اصل چیز جو قابلِ غور ہے وہ مولانا آزاد کا یہ فقرہ ہے کہ ان ہی میر فتح اللہ نے ان مصنفین کی کتابوں کو:

"در حلقۂ درس انداخت۔"

"نصاب میں داخل کیا۔"

علم کے ساتھ امورِ سلطنت

شاید اس زمانہ میں اس کا سمجھنا دشوار ہو کہ ایک طرف تو میر فتح اللہ وزارتِ عظمٰی کے کاروبار میں دار و مداری کرتے تھے۔ اکبر کے عظیم المرتبت ہندوستان کا بجٹ (موازنہ) تیار کرتے تھے، مولانا آزاد نے لکھا ہے:

"میر فصلے چند متضمن کفایت سرکار، ورفاہ رعایا از نظر گذرانید درجۂ استحسان یافت۔"

(مآثر۔ص 237)

بلکہ اکبری عہد میں فینانس (مالیات) کی تنظیم کا مسئلہ خاص شہرت رکھتا ہے گو بظاہر اس کارنامہ کو ٹوڈرمل کی طرف منسوب کیا

جاتا ہے، لیکن کتابوں میں ہم جب ٹوڈرمل کے متعلق یہ پڑھتے ہیں کہ:

''پیش از دور ممالک ہند متصدیاں بقانوں ہنوز دفتری نوشتن در راجہ (22) ٹوڈرمل از نویسندگان ایران اخذ صوابط نمودہ دفتر رابطور ولایت (ایران) درست کرد۔'' (سیر المتاخرین، ص 200)

''اس سے پہلے ہندوستان میں ہندوؤں کے دستور کے مطابق دفتر لکھتے تھے، راجہ ٹوڈرمل نے ایرانی نویسندگان سے ضوابط اخذ کیا، اور ایرانی دستور کے مطابق دفتر مرتب کیا۔''

تو یہ باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی کہ جن ایرانی نویسندگان سے ٹوڈرمل نے دفتر کے ان ضوابط کو اخذ کیا تھا، ان میں سب سے بڑا ہاتھ ٹوڈرمل کے شریکِ وزارتِ عظمیٰ میر فتح اللہ شیرازی ہی کا ہوگا۔

فوجی ٹھاٹھ

خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب ایک طرف تو مہماتِ سلطنت میں مصروف نظر آتے ہیں، اور قلم ہی کی حد تک نہیں، مُلّا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ فوجی کوچوں میں میر کی ٹھاٹھ یہ ہوتی تھی۔

''تفنگ بردوش وکیسہ وارد بر میان بستہ قاصداں بصحرا در رکاب (اکبر) دوید۔'' (ص 316)

''بندوق کندھے پر ہوتی، اور بارود کا تھیلا یعنی کارتوس کی پیٹی کمر پر باندھے ہوتے اور قاصدوں کی طرح اکبر کی رکاب میں دوڑتے ہوتے۔''

جب ٹوٹ جانے والی توپ اور ایک گردش میں گیارہ فیر والی بندوق کے موجد میر صاحب ہی تھے تو ان کی اس ٹھاٹھ پر تعجب کیوں کیجیے۔ مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں سے جو فوجی مقابلہ پیش آیا اس کی کمان میر فتح اللہ ہی کرتے تھے۔

حاشیہ نگاری

ایک طرف ان کی کشوری اور فوجی مشغولیتوں کا یہ حال ہے لیکن دوسری طرف ہم ان ہی کو مدرسی کتابوں کی حاشیہ نگاری میں بھی مصروف پاتے ہیں۔ مولانا آزاد کا بیان ہے:

''از مصنفات او تکملہ حاشیہ علامہ دوانی وملا جلال بر تہذیب المنطق وحاشیہ بر حاشیہ مذکور متداول ست۔'' (ص 238)

''ان کی تصانیف میں سے تکملہ حاشیہ علامہ دوانی، اور ملا جلال تہذیب المنطق پر اور حاشیہ، حاشیہ مذکور پر رائج ہے۔''

درس وتدریس

اور یہی نہیں کہ فرصت کے اوقات میں اکبر کے دربار کا یہ وزیر با تدبیر کبھی کبھی اپنی مدرسی زندگی کو ان علمی مشغلوں

سے تازہ کیا کرتا تھا، بلکہ علم کا زہر اس علم گزیدہ شخص پر کچھ اس بُری طرح چڑھا ہوا تھا کہ کبھی کبھی فکاہی طور پر نہیں بلکہ باضابطہ جیسا کہ بداؤنی کا چشم دید مشاہدہ ہے کہ:

''بہ تعلیم اطفال امراء مقید بود۔'' (ص316)

''امراء کے بچوں کی تعلیم میں پھنسے ہوئے تھے۔''

خدا ہی جانتا ہے کہ ان کو فرصت کیسے میسر آتی تھی کہ:

''ہر روز بمنازل مقربان رفتہ۔''

''روزانہ مقربوں کے گھر جاتے۔''

درس و تدریس کے مشغلہ کو جاری کیے ہوئے تھے، صرف اعلیٰ درجوں کی انتہائی کتابوں ہی تک ان کا درس محدود نہ تھا بلکہ مُلّا بداؤنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ اور لوگوں کے:

''امراء زادہائے دیگر ہفت و ہشت سالہ بلکہ خوردتر آں را معلم صبیانی کرد۔'' (ص316)

''سات آٹھ سال بلکہ ان سے بھی خرد سال امیر زادوں کو پڑھاتے تھے۔''

مجموعۂ کمالات

ایک طرف یہ تو آپ سُن ہی چکے کہ دوانی، صدر شیرازی، مرزا جان کی کتابوں کو وہ ہندوستان میں پھیلا رہے تھے، شرح مُلّا جلال پر حاشیہ لکھتے تھے، قرآن کی تفسیر میں کتابیں تصنیف کر رہے تھے، اور دوسری طرف ان کے تدریسی اور تعلیمی ذوق کی یہ انتہا تھی کہ ان سات آٹھ بلکہ ان سے بھی خرد سال امیر زادوں کو وہ بقول بداؤنی:

''تعلیم نقط و خط و دائرہ بلکہ ابجد ہم می داد۔'' (ص316)

''نقطہ، خط اور دائرہ بلکہ ابجد تک کی تعلیم دیا کرتے تھے۔''

اور یہی چیز تھی کہ جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ میں اس کا باور کرنا دشوار ہے۔[23] اب خیال کیجیے کہ ملتان سے شیخ عبداللہ و عزیز اللہ معقولات کا جو ذخیرہ لائے تھے، گو سکندری حکومت کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی اور اسی لیے جس حد تک ان علوم کو ان دونوں نے رواج دینا چاہا اس حد تک وہ مروج بھی ہو گئے، لیکن ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ ہندوستان لائے۔ اسے تو سلطنت کی پشتیبانی ہی نہیں حاصل تھی، بلکہ حکومت کے اساطین و اراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچہ کو میر صاحب یہ شیرازی شراب پورے انہماک و توجہ سے پلا رہے تھے۔

معقولات کی اشاعت

سوچنے کی بات ہے ملک کے تعلیمی ماحول پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا تھا، یقیناً یہی اس کا نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہی ہو کر رہا، جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

''ازاں عہد (از عہدِ فتح اللہ شیرازی) معقولات رارواجے دیگر پیدا شد۔'' (ص 238)

''ان (فتح اللہ شیرازی) کے عہد کے معقولات کا ایک دوسرا رواج ہوا۔''

مولانا غلام علی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس ''رواجِ دیگر'' کا بڑا موثر سبب یہی تھا کہ میر صاحب نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کر دیئے:

''جمِ غفیر از حاشیہ محفل میر ااستفادہ کردند۔''

''میر کے درس سے جمِ غفیر نے استفادہ کیا۔''

خصوصاً جب میر کی محفل کے حاشیہ والوں میں عوام ہی نہیں، امراءزادگانِ حکومت ہوں۔

تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور

اور یہ تھا ہمارے تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور، یقیناً اسی زمانہ میں شرح تجرید قوشجی کے حواشی قدیمہ وجدیدہ کا رواج اس ملک کے اربابِ تعلیم میں ہوا اور اسی زمانہ میں مرزا جان کے حواشی، محاکمات وعضدیہ وقدیمہ وغیرہ نے یہاں مقبولیت حاصل کی (24)، دوانی کی دونوں درسی کتابیں حال تک نصاب میں شریک تھیں اور پرانے مدرسوں میں اب بھی ہیں۔ یعنی مُلاّ جلال اور عقائد جلالی اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں، مُلاّ فتح اللہ شیرازی کے بعد ہندوستان میں معقولات کی جو کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں، عجیب بات ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ ہمیں ایک ایسے شخص کے ذکر میں ملتا ہے جو مسلمان تو نہیں تھا، لیکن اس زمانہ کی درسی کتابیں آگرہ میں پڑھایا کرتا تھا۔ اس کا نام کامراں تھا اور حکیم کامراں کے نام سے مشہور تھا۔

حکیم کامراں

''دبستان المذاہب (25)'' میں اس شخص کا تذکرہ تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ حکیم کامراں شیرازی کو علوم عقلی ونقلی خوب مستظہر تھے:

''حکیم کامراں شیرازی اور نزرہ سپر، کیش مشائین ست علوم عقلی ونقلی رانیکو مستظہر بود۔''

مختلف علوم وفنون کی تحصیل

یعنی بجائے کسی دین کے فلسفہ مشائیہ ہی کو اُس نے اپنا کیش اور مذہب بنالیا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''بعد از کسب کمال بگووہ کہ از بنادر فرنگ است افتاد وبہ مجالستِ ایشاں رغبت نمود بہ کیش نصاریٰ جلوہ گرامد، لاجرم انجیل رانیکو آموخت واز علوم ایشاں مایہا اندوخت وبعد ازیں بہ ہند آمد وبار اجہا آشنا شد وبہ کیش ایشاں گام زود شاستر ہندوی یعنی علوم ایشاں نزد براہمہ فاضل بخواندو (26)

دراں نیز سرآمد دانایانِ ہند شد۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کے مروجہ علوم وفنون کے علاوہ حکیم کامراں نے یورپین پادریوں اور ہندی پنڈتوں سے بھی ان کے علوم سیکھے تھے، اسی کتاب میں لکھا ہے:

"در ہزار پنجاہ در سرائے فرخ نزدیک بہ اکبرآباد سپہر بنیاد تجرد گزید۔"

"1050ھ میں آگرہ کے نزدیک سرائے فرخ نامی میں انتقال کیا۔"

یعنی ایک ہزار پچاس ہجری میں آگرہ کے نزدیک سرائے فرخ نامی مقام میں اس کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ "عمراو از صد سال گذشتہ بود" (اس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی) اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں اس نے اکبر و جہانگیر کے زمانہ کے سوا شاہجہاں کا عہد بھی کچھ پایا تھا۔ صاحبِ "دبستان" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ تو اس کا تجارت تھا، جیسا کہ عموماً پارسیوں کا مذاق ہے، لیکن اس کے ساتھ درس بھی دیتا تھا۔ منجملہ بہت سے شاگردوں کے کامراں کا ایک شاگرد کوئی عبدالرسول نامی شخص بھی تھا۔

نصاب میں معقولات کی کتابیں

"دبستان" میں ہے کہ کامراں نے اسی عبدالرسول کو خود پڑھایا تھا، چونکہ اس بیان سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مُلاّ فتح اللہ کے بعد ہندوستان میں معقولات کی کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے بجنسہٖ صاحب "دبستان" کے الفاظ میں ان کتابوں کے نام اور ان کے درس کی جو ترتیب تھی نقل کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ:

"بعد از صرف نحو شرح شمسیہ (قطبی) آں گاہ طبعیات شرح ہدایت حکمت حسین بن معین الدین میبذی و پس امور عامہ شرح حکمۃ العین و بعد ازاں شرح تجرید با حواشی و بعد ازاں طبعیات شرح اشارات و پس الٰہیات شفا تعلیم کرد۔"

"صرف ونحو کے بعد شرح شمسیہ (قطبی) میبذی، امور عامہ، شرح حکمۃ العین، اس کے بعد شرح تجرید با حواشی اور اس کے بعد شرح اشارات اور شفا الٰہیات پڑھاتے تھے۔"

شرح تجرید با حواشی کا مطلب وہی ہے کہ صدر معاصر اور دوانی کے مناظرانہ حواشی جو قدیمہ، جدیدہ، اجد کے نام سے مشہور ہیں۔ نیز مرزا جان کے جو حواشی ان پر ہیں، ان کی تعلیم بھی اس زمانہ میں مروج تھی۔

علمِ ریاضی کی تعلیم

حکیم کامراں علاوہ فلسفہ کے ریاضی کی کتابیں بھی پڑھاتا تھا۔ "دبستان" ہی میں ہے کہ:

"ملا یعقوب (27) نزد او تحریر اقلیدس و شرح تذکرہ خواند۔"

"ملا یعقوب نے ان کے پاس تحریر اقلیدس اور شرح تذکرہ پڑھی۔"

دوسرے فنون کی کتابیں

واللہ اعلم بالصواب ''دبستان'' کی یہ روایت کہاں تک درست ہے کہ:

''میر شریف مطول وتفسیر بیضاوی خواندہ۔''

''میر شریف مطول اور تفسیر بیضاوی پڑھی۔''

یہ میر سید شریف جرجانی نہیں بلکہ دوسرے میر شریف ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ:

''مُلا عصام پیش او تفسیر بیضاوی خواندہ...... و توضیح وتلویح کہ در اصول فقہ حنفی ست خواند۔''

(ص310)

''ملا عصام نے ان سے تفسیر بیضاوی پڑھی اور توضیح وتلویح، جو اصول فقہ حنفی میں ہے۔''

خدا جانے یہ مُلا عصام کون ہیں اور حکیم کامراں سے پڑھنے کا موقع ان کو ہندوستان میں ملا یا ہندوستان سے باہر کیونکہ مُلا عصام جو مشہور ہیں وہ تو غالباً ہندوستان نہیں آئے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، اس سے ایک طرف اس زمانہ کی درسی کتابوں (28) کا حال اگر معلوم ہوتا ہے، تو اسی کے ساتھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں بھی تھے، لیکن چونکہ پڑھتے پڑھاتے تھے ان ہی علوم وفنون کو جو مسلمانوں کے یہاں مروّج تھے، اس لیے علاوہ معقولات کے دینیات یا نیم دینیات کی کتابوں کا بھی وہ درس دیتے تھے اور مسلمان طلبہ ان سے پڑھتے تھے۔ آپ کو حکیم کامراں کے قصہ سے اس کا بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ عقلی علوم کے کیسے کیسے ماہرین اس ملک میں آ آ کر اکٹھے ہو رہے تھے۔

معقولات کی تحصیل کا جذبہ غیر مسلموں میں

اسی قسم کے مشرب ومسلک کا ایک آدمی دستور نامی بھی تھا، جو بلخ میں پیدا ہوا تھا اور ''در سال ہزار و پنجاہ و چہار'' یعنی حکیم کامراں کے مرنے کے چار سال بعد ''بلاہور آمد۔'' صاحب ''دبستان'' نے لکھا ہے کہ:

''در خدمت شاگرد ملا میرزا جان تحصیل حکمت نمود پیش با یران خرامیدہ و با میر محمد باقر داماد و شیخ بہاؤ الدین محمد و ابو القاسم فندرسکی و فضلائے دیگر و علمائے شیراز صحبت داشتہ مائہا اندوخت۔''

(دبستان۔ ص206)

''مُلا میرزا جان کے شاگرد کی خدمت میں حکمت حاصل کی، پھر ایران جا کر میر باقر داماد، شیخ بہاؤ الدین محمد، ابو القاسم فندرسکی اور دوسرے فضلاء اور علماء شیراز کی صحبت میں رہ کر بڑا سرمایہ جمع کر لیا۔''

ایک اور پارسی عالم ہیربد کو بھی صاحب ''دبستان'' نے بایں الفاظ روشناس کیا ہے:

''حکیم الٰہی ہیربد کہ درلاہور نامہ نگار (مصنف کتاب) بدورسید۔''

اس کے بعد لکھتا ہے:

''اومردے بوداز نژاد زردشت وخشور یزداں دردانش پارسی رسا۔''

جس سے معلوم ہوا کہ وہ پارسیوں کا کوئی موبد تھا، لیکن اس زمانہ میں ان لوگوں کا کیا حال تھا، لکھا ہے کہ:

''تحصیلِ عربیت وحکمیات در شیراز نمودہ با فرہنگیاں فرنگ صحبت داشتہ انجام بہند پیوست۔''

''عربیت وحکمیات شیراز میں حاصل کر کے انگریزی دانوں کی صحبت اٹھائی اور انجام کار ہندوستان آیا۔''

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی علوم وفنون سے پارسیوں کی دلچسپی بہت قدیم ہے، اور یہ تو خیر غیر مسلم لوگ ہیں(29)، جنہوں نے مسلمانوں سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فتح اللہ شیرازی کے بعد اکبر اور اکبر کے بعد بھی مسلمان معقولیوں کا ہندوستان میں تانتا بندھ گیا تھا۔ فارغی شیرازی جس کا میں نے کہیں پہلے بھی ذکر کیا ہے، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ ''برادر شاہ فتح اللہ ست'' (شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے) اسی فارغی شیرازی کے صاحبزادے میر تقی کے متعلق مُلا عبدالقادر کی شہادت ہے کہ

''درعلم ہیئت ونجوم قائم مقام شاہ فتح اللہ بود۔''

''علم ہیئت ونجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔''

مُلا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''کہ فقیر پارۂ از بست باب...... پیش او گذرانید۔''

''فقیر نے بست باب کا ایک حصہ ان سے پڑھا ہے۔''

میر فتح اللہ کا حال اور ان علوم میں جو پایہ تھا، خصوصاً ریاضیات کے متعلق مُلا عبدالقادر نے لکھا ہے:

''دریں فن آں قدر حالت داشت کہ اگر بادشاہ متوجہ می شد ندر صدمی توانست۔''

(ج3،ص154)

''اس فن میں ایسی استعداد کا مالک تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتا، رصد بنا سکتا تھا۔''

جو رصد بندی کی قدرت رکھتا ہو، اس کی قائم مقامی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

عین الملک ہندوستان میں

اکبر ہی کے زمانہ میں علامہ جلال الدین دوانی کے گھرانے کے ایک عالم عین الملک جن کا خطاب تھا، ہندوستان آئے۔ اگرچہ ملازم تو وہ شعبہ طبابت میں تھے خصوصاً امراض چشم اور کحالی، قدح زنی میں کمال تھا، لیکن جب یہ

معلوم ہے کہ:

''از جانب والدہ از فرزندان علامہ جلال الدین دوانی۔'' (ص230)

''والدہ کی جانب سے علامہ جلال الدین دوانی کے خاندان سے تھا۔''

توان کی معقولیت جس پیمانہ پر ہوگی ظاہر ہے۔ اکبر ہی کے زمانہ میں ملا نوراللہ شستری بھی ایران سے آئے اور لاہور کے قاضی ہوئے۔ قاضی نوراللہ کا مذہب جو کچھ بھی ہو لیکن علوم عقلیہ بلکہ شاید نقلیہ (30) میں بھی جو دستگاہ ان کو حاصل تھی، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شرح تجرید کے الٰہیات پر، شرح چغمنی پر، قدیمہ پر، ان کے حواشی ان علوم کے ماہرین کے حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

کتب معقولات عہد اکبری میں

عہدِ اکبری میں عقلیات کی جو کتابیں عام طور پر درس وتدریس میں زیرِ استعمال تھیں، ان کا کچھ پتہ ملا عالم کابلی کے اس طرزِ عمل سے بھی ہوتا ہے جس کا تذکرہ ملا عبدالقادر نے بایں الفاظ کیا ہے:

''در بیاضِ تقریرے در بحث شرح مقاصد نوشتہ واشعارے کردہ کہ ایں عبارت از کتاب قصد است کہ از جملہ مصنفات کاتب است وہم چنیں تجدید در مقابل شرح تجرید ویک دو حاشیہ بر مطول نوشتہ وگفتہ کہ ایں تقریر نقل از کتاب طول است کہ در برابر مطول واطول ست۔'' (ج3، ص270)

''اپنی بیاض میں ایک تقریر شرح مقاصد کی بحث میں لکھا ہے اور کچھ اشعار، کہ یہ عبارت ''قصد'' کی ہے جو کاتب کی مصنفات میں سے ہے۔ اسی طرح ''تجدید''، ''شرح تجرید'' کے مقابلہ میں، اور ایک دو حاشیہ مطول پر ہے، اور اسے بھی ظاہر کیا ہے، کہ یہ تقریر کتاب ''طول'' کی نقل ہے، جو مطول اور اطول کے برابر ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ ملا عالم کے مزاج میں ظرافت وخوش طبعی کا فطری مادہ تھا۔ واقعہ میں ان کی کوئی تصنیف تو تھی لیکن قصد اور تجدید، طول یہ اپنی فرضی کتابوں کا نام رکھ دیا تھا۔ ملا صاحب نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن میں اپنی ان فرضی کتابوں کا نام بھی لیا ہے اور اس زمانہ کی مشہور کتابوں مثلاً شرح مواقف، شرح حکمۃ العین وغیرہ سے مقابلہ کیا ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں:

دیدہ بودی نسخۂ تجدید
کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندرو صد مواقف است نہاں
و زبیانش مقاصد ست عیاں
متن تجرید پیشِ اولنگ است

گلشن از قحط آب بیرنگ است
لمعہ اش بے تکلف و اغراق
حکمت عین و حکمت اشراق

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح مواقف، شرح مقاصد، شرح تجرید، شرح حکمت العین، حکمۃ الاشراق وغیرہ کتابوں کا اس زمانہ میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں عام چرچا تھا۔

مضامین میں عقلی رنگ کا غلبہ

لیکن باوجود اس کے پھر بھی جہاں تک واقعات سے اندازہ ہوتا ہے، ملک کے عام تعلیمی نصاب میں معقولات کی ان کتابوں کی حیثیت لازمی اجزاء وعناصر کی نہ تھی کیونکہ اکبر اور اکبر کے بعد ہم جہاں تک مستقبل کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں، ہندوستان کے عام اہل علم پر معقول کا رنگ نظر آتا ہے کہ زیادہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور تو اور سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے عقلیت کے اسی رنگ کو پھاڑنے کے لیے لکھا ہے، لیکن عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں۔ سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی حال حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسمؒ جیسے بزرگوں کا ہے کہ نشانہ سب کا وہی غلط عقلیت ہے۔ جس میں لوگ مذہب کے باب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن عقلیت کی تردید جب تک خود اسی عقلیت کی راہ سے نہیں کی گئی ہو، ایسی تردیدوں کو اپنے زمانہ میں کبھی پذیرائی میسر نہیں آئی۔ مجدد صاحب کی تجدید کا گر ہی یہ ہے کہ قرآنی اصول: **ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه.** (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان میں) کے زیر اثر انہوں نے کام کیا۔

نصابِ تعلیم جہانگیر کے عہد میں

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ منطق وفلسفہ کے اس دور دورے کے باوجود جہاں تک واقعات کا اقتضاء ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی مضامین کی حیثیت مدت تک اختیاری مضامین کی رہی۔ جہانگیری عہد کے عالم حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ ''اخبار الاخیار'' کے آخر میں اپنے حالات شیخ نے خود لکھے ہیں، جن میں اپنی تعلیم کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کتابیں آپ نے پڑھی ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سیزدہ سالہ بودم کہ شرح شمسیہ وشرح عقائد می خواندم۔''

شرح شمسیہ سے تو وہی قطبی مراد ہے اور شرح عقائد سے شاید شرح عقائد نسفی مقصود ہو۔ شرح صحائف کی جگہ غالباً شیخ نے یہی کتاب عقائد میں پڑھی تھی جو اب تک درسِ نظامیہ کے نصاب میں شریک ہے۔ آگے لکھا ہے کہ:

''در پانزدہ وشانزدہ مختصر ومطول را گذرانیدم۔''

''پندرہ سولہ مختصر ومطول کتابیں پڑھ ڈالیں۔''

گذر چکا کہ علامہ تفتازانی کی ان دونوں کتابوں کا اضافہ شیخ عبداللہ و عزیز اللہ کے ذریعہ سے سکندر لودھی کے زمانہ سے ہوا۔

شیخ عبدالحق کی تعلیم

اس کے بعد شیخ محدث فرماتے ہیں:

''پیش تریا پس تر بہ یک سال از عددے کہ ظرفا در شمار عمر از ذکر آں ملاحظہ کنند از علومِ عقلی ونقلی انچہ در افادہ واستفادہ از صورت و مادہ کافی ووافی باشد تمام کردم۔''

عبارت میں کچھ اغلاق ہے، یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے، حاصل یہی ہے کہ وہی پندرہ سولہ کی عمر کے ایک سال آگے یا پیچھے عقلی ونقلی علوم سے شیخ فارغ ہو گئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے معقولات میں مذکورہ بالا کتابوں سے آگے شیخ نے شاید اس فن کے ساتھ زیادہ اشتغال نہیں رکھا۔ اپنے والد سے خود اپنے متعلق یہ مشورہ بھی شیخ نے نقل کیا ہے کہ:

''تو یک مختصر از ہر علم بخواں ترا بسندہ ست۔'' (ص 311)

ایسی صورت میں والد کی رائے سے اختلاف کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے، خود ان کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقلیات سے شیخ کا تعلق بہت معمولی ہے۔ شیخ نے ایک موقع پر اگر چہ یہ بھی لکھا ہے کہ فاتحہ فراغ کے بعد۔

''ملازمت درس بعضے از دانشمندان ماوراء النہر بطورے نمودہ شد۔''

''ماوراء النہر کے بعض فضلاء کے درس میں بیٹھا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر (31) کے بعض تازہ وارد علماء سے بعد کو بھی شیخ نے کچھ پڑھا تھا لیکن ان علماء کا ماوراء النہری ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ شیخ نے ان سے فقہ یا اصول فقہ جیسے علوم کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی۔ ہاں ایران کے کسی عالم کا ذکر کرتے تو اس وقت یہ سمجھنا شاید بعید نہ ہوتا کہ منطق یا فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی۔

معقولات اختیاری مضامین کی حیثیت سے

بہر حال اسی قسم کے مختلف قرائن و اسباب سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دانشمندی کی سند کے لیے معقولات کی ان کتابوں کا پڑھنا ہر اس شخص کے لیے ضروری نہیں تھا جن کا رواج فتح اللہ شیرازی کے بعد اس ملک میں ہوا۔ بلکہ بات وہی تھی جس کا جی چاہتا تھا پڑھتا تھا اور اس حد تک پڑھتا تھا، جس کا ذکر میں نے حکیم کامراں کے تذکرہ میں کیا ہے۔

معقولات کی اہمیت نصاب میں

لیکن اس دور کے بعد جو مدت تک قائم رہا ہے، ملک کے تعلیمی حلقوں پر ایک اور افتاد نازل ہوئی اور اسی افتاد کا یہ اثر ہے کہ بتدریج معقولات کی کتابوں نے وہ اہمیت حاصل کی جس کا نظارہ درس نظامیہ کے مدارس میں حال حال تک کیا جا رہا تھا بلکہ کہیں کہیں ابھی وہی حالت باقی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کہاں اسی ہندوستان کا وہ حال تھا کہ پوری

تعلیمی زندگی میں طلبہ کے لیے معقولات کے سلسلے میں صرف شمسیہ اور صحائف کی تعلیم کافی سمجھی جاتی تھی اور کہاں اب یہ صورت پیدا ہوگئی کہ معقولی رنگ کی کتابوں کی تعداد چالیس پچاس سے بھی زیادہ متجاوز ہوگئی، نصاب میں لزوم کی وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ سب کچھ پڑھ جائیے، لیکن ان تمام مقررہ کتابوں، کتابوں کے منہیات، حواشی شروح وتعلیقات کا ایک ورق پڑھنے سے رہ گیا ہے تو اہل علم کے گروہ میں ایسے آدمی کا علم علم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اساتذہ سند دینے سے گریز کرتے تھے۔ عذر یہی پیش کیا جاتا تھا کہ گو تم نے حدیث وتفسیر فقہ وغیرہ دینی علوم کی سب کتابیں پڑھ لی ہیں لیکن معقولات کی فلاں فلاں کتاب تمہاری باقی رہ گئی ہے۔ ان کے پڑھے بغیر مولوی ہونے کی سند تمہیں کیسے دی جاسکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مولویت کے دائرہ میں امتیاز کا معیار یہ واقعہ ہے کہ اسی ہندوستان میں تقریباً دو سو سال تک یہ رہا ہے کہ معقولات کی ان نصابی کتابوں پر اس مولوی نے کوئی حاشیہ یا شرح لکھ کر ملک میں پیش کیا ہے۔

دو سو سال کا تصنیفی ذخیرہ

اس دو سال کا جو تصنیفی ذخیرہ عام علماء ہند کا ہے بجز چند استثنائی صورتوں کے، زیادہ تر اس کا تعلق زواہد ثلاثہ سلم اور شروح سلم، صدرا، شمس بازغہ کی حاشیہ نگاری سے ہے۔ ایک ایک مولوی بعض اوقات ایک ہی کتاب پر تین تین قسم کے حاشیے لکھ کر فضیلت کی داد لیتا تھا۔ مولوی عالم علی سندیلی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ''سہ حاشیہ بر صدرا صغیر و کبیر و اکبر دارد۔'' (ص 180) دور کیوں جائیے علمائے فرنگی محل کے حالات اُٹھا کر پڑھیے۔ مشکل ہی سے کوئی عالم اس علمی خانوادہ میں ایسا مل سکتا ہے۔ جس کے قلم نے معقولات کی مندرجہ بالا کتابوں میں سے سب پر یا چند پر کوئی حاشیہ یا شرح نہ لکھی ہو۔(32)

پورب میں منطق وفلسفہ کا زور

بلکہ اس مسئلہ پر ذرا اور توجہ وتعمق سے نظر ڈالی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ گو نصاب میں معقولات کا اضافہ سکندری دور میں ہو یا اکبری میں، ظاہر ہے کہ دِلّی میں ہوا۔ لیکن معقولاتی علوم کہیے یا حاشیہ نگاری کا جتنا زور ہم ان علاقوں میں پاتے ہیں جن کی تعبیر مولانا آزاد کی اصطلاح میں ''الفورب'' ہے اور جہاں کے علماء ان کی زبان میں ''الفواربہ'' کے نام سے موسوم ہیں۔ یعنی اودھ، الہ آباد، بہار، اتنا زور، اتنی ہماہمی ان علوم کی خود دلی اور دلی کے نواح واطراف میں محسوس نہیں ہوتی، حتیٰ کہ پنجاب میں بھی نہیں اور تقریباً یہی حال جنوبی ہند کا ہے۔

معقولات ولی اللّٰہی نصاب میں

مثلاً ہم دِلّی کے اس سربرآوردہ علمی خاندان کو پیش کرسکتے ہیں، جو پچھلے دنوں یعنی فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ کے زمانہ میں علم کا سب سے بڑا خانوادہ تھا۔ میری مراد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان سے ہے۔ شاہ صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم حالانکہ براہِ راست خود میر زاہد کے شاگرد ہیں لیکن الفورابہ میں مرزا زاہد کے جن زواہد ثلاثہ

نے وہ اہمیت حاصل کی تھی کہ کسی مولوی کو اپنے اقران میں امتیاز اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہوسکتا تھا، جب تک کہ تبرکا ہی سہی، اعلم ان العلم المتجدد کے دولفظوں ہی پر سہی، اس نے چند حروف بنام حاشیہ منقوش نہ کردیئے ہوں، لیکن ہمارے سامنے خود حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اپنا ذاتی تعلیمی نصاب ہے جس کی تقریباً کل کتابیں آپ نے اپنے والد یعنی میرزاہد کے شاگرد ہی سے پڑھی ہیں۔ لیکن معقولات کا جتنا حصہ اس ولی اللٰہی نصاب میں ہے لے دے کر وہ حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے، خود ''انفاس العارفین'' کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ازمنطق شرح شمسیہ (قطبی) وطرفے از شرح مطالع ......وازحکمت شرح ہدایت الحکمۃ و ازحساب وہندسہ بعض رسائل مختصرہ۔'' (ص195)

''منطق میں قطبی، اور کچھ شرح مطالع کا، اور حکمت میں شرح ہدایت الحکمت، اور حساب و ہندسہ میں بعض مختصر رسالے۔''

کہاں الفوار بہ کے نصاب کی وہ تیس چالیس معقولاتی کتابوں کا انبار، اور کہاں گنتی کی یہ چند کتابیں جن میں چھوٹی بڑی ملا کر بہ مشکل پانچ کتابیں ہوسکتی ہیں۔

اختیاری مضامین

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دلّی میں معقولات کی ان عام نصابی کتابوں کا سرے سے رواج ہی نہ تھا۔ آخر شاہ صاحب کے صاحبزادوں یعنی شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدینؒ نے زواہد پر نیز صدرا پر اور دوسری معقولی کتابوں پر حواشی کیوں لکھے۔ اگر دلّی کے درس میں یہ کتابیں داخل نہ تھیں، بلکہ وہی مطلب ہے کہ دلّی اور اُس کے اطراف واکناف بلکہ پنجاب تک میں ان معقولی کتابوں نے لزوم کی وہ شکل نہیں اختیار کی تھی، جو حیثیت ان کی الفوار بہ میں ہوگئی تھی۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا یہ دلچسپ لیکن مستحق توجہ مسئلہ ہے۔ مدت تک میری سمجھ میں اس کی کوئی صحیح توجیہہ نہیں آئی تھی، تا آنکہ اس راز کو بھی خدا جزاء خیر دے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے کھولا۔ آپ نے اپنی ''ماثر الکرام'' میں جہاں مذکورہ بالا دو تعلیمی انقلابوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہیں آپ کے قلم نے ایسے مواد فراہم کیے ہیں کہ ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد شاید بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پہلے کہ میں اسے درج کروں ایک فاجعہ کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ واقعات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملے گی۔

سعادت علی خاں ایرانی اور نادر شاہی قتل عام

قصہ یہ ہے کہ محمد شاہ جو رنگیلے کے نام سے مشہور ہیں، ان کے دربار میں نیشاپور کا ایک سپاہی پیشہ آدمی سعادت خاں نامی داخل ہوا۔ ترقی پاتے ہوئے یہی سعادت خاں نیشاپوری برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ ارباب تاریخ کے لیے اگرچہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے، لیکن عام پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضرور ہے کہ دلّی کے قتل عام والا نادر شاہ جب

ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور بانی سلطنت آصفیہ جاہ اوّل قدس سرہ وانار اللہ برہانہ کے ساتھ محمد شاہ دلّی سے باہر نکل کر نادر شاہ کو روکنے کے لیے آگے بڑھے۔ دونوں طرف فوجیں صف آرا تھیں لیکن حملہ کس وقت کیا جائے۔ حضرت آصف جاہ کی رائے تھی کہ آج اس مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے۔ اس وقت یہی سعادت خاں برہان الملک تھے جنہوں نے آصف جاہ کے مشورہ کی قصداً خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی تیاری کے بغیر نادر شاہی فوج کی طرف اقدام کر دیا اور اچانک کسی معمولی مقابلہ کے بغیر جیسا کہ ان کے سب سے بڑے طرفدار ہم مذہب مورخ طباطبائی صاحب ''سیر المتاخرین'' کی شہادت ہے کہ برہان الملک اپنے ہاتھ پر نادر شاہ کی فوجی کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے (33)۔ کہ ان کے وطن نیشاپور کا ایک نادر شاہی فوجی کہ:

''یکے از نو خاستہ اتراک نیشاپور بود۔''

''اتراک نیشاپور کے تازہ واردوں میں تھا۔''

وہ برہان الملک کے سامنے گھوڑا بڑھا کر آتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہی ''نو خاستہ ترک نیشاپوری'' پکارتا ہے:

''محمد امین (34)! دیوانہ شدۂ با کہ می جنگی و بکدام فوج اعتماد داری۔''

''محمد امین تو پاگل ہو گیا ہے، تو کس کے ساتھ جنگ کر رہا ہے اور کون سی فوج پر اعتماد رکھتا ہے۔''

یہ کہتا ہے اور گھوڑے کی پشت سے اُچک کر برہان الملک کے ہاتھ کی عماری میں داخل ہو جاتا ہے۔ طباطبائی صاحب اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

''برہان الملک کہ از ضابطہ ایران واقف بود (35) موافق آداب انجا اطاعت نمودہ اسیر پنجۂ تقدیر گردید ہمراہ قزلباش (یعنی نو خاستہ نیشاپوری) بحضور نادر شاہ رسید، عفو تقصیرات او فرمودہ مورد الطاف و عنایات ساخت (سیر المتاخرین۔ ص 483)

''برہان الملک جو ایرانی ضابطہ سے واقف تھا، قاعدہ کے مطابق حکم بجالایا اور تقدیر کے پنجہ میں گرفتار ہو گیا۔ فوجی کے ساتھ نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے اس کے گناہ معاف کر دیے اور الطاف و عنایات سے نوازا۔''

نادری قتل عام دلّی میں

اب اس کے بعد دلّی اور دلّی کے باشندوں پر، مسلمانوں پر، محمد رسول اللہ کی اُمت مرحومہ پر جو کچھ گذری، تاریخوں میں پڑھیے۔ بلکہ اس کے لیے تو تاریخ پڑھنے کی بھی ضرورت کیا ہے۔ ہندوستان کے حافظہ سے نادری قتل عام کا ہولناک نظارہ کیا کبھی نکل سکتا ہے؟

شیعوں کے مظالم

بہر حال یہی محمد امین نیشاپوری پھر سعادت خاں پھر برہان الملک کے متعلق مولانا آزاد دوسروں کی نہیں اپنی

آنکھوں دیکھی شہادت قلم بند فرماتے ہیں کہ:

''چوں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہٗ اودھ شد، و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد و نیز دار الخیور جون پور و بنارس و غازی پور وکٹرہ مانک پور وکوڑہ جہاں آباد وغیر ہا ضمیمہٗ حکومت گردید۔''

''جب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری محمد شاہ کے عہد میں صوبہ اودھ کا حاکم ہوا، زیادہ عمدہ شہر جیسے صوبہ الہ آباد، جونپور، بنارس، غازی پور، کٹرہ مانک اور کوڑہ جہاں آباد وغیرہ حکومت کا حصہ بن گئے۔''

دلّی اور دلّی کے اطراف وجوانب کے باشندے تو نادر شاہ کے ہاتھوں وہ سب کچھ بھگت چکے تھے، جو ان کے مقدر میں تھا، دلّی سے جو دور تھے۔ غالبًا یہ بھی ''ضابطہ ایران'' و ''آداب اینجا'' کی ایک شکل تھی کہ مولانا فرماتے ہیں، فرماتے کیا ہیں گواہی دیتے ہیں کہ جن پر مصیبت ٹوٹی تھی ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھے۔ یعنی برہان الملک نے ان علاقوں کے گورنر ہونے کے ساتھ ہی یہ کیا کہ:

''وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد و کار شرفاء نجباء بہ پریشانی کشید۔''

''قدیم وجدید خانوادوں کے وظائف انعامات ومراتب سب ضبط ہو گئے اور شریفوں کا کام پریشانی میں پڑ گیا۔''

سعادت خاں کے بعد ابو المنصور کے مظالم

اور ابھی بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ ''ادب ایران'' کے ضوابط کی تکمیل باقی تھی۔ مطلب یہ کہ ان برہان الملک سعادت خاں کے ایک بھانجے بھی ساتھ تھے۔

جن کی شادی بھی برہان الملک کی لڑکی سے ہوئی تھی، یعنی خواہر زادہ و داماد دونوں تھے۔ محمد شاہی دربار سے ان کو بھی ابو المنصور صفدر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

''بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ او ابو المنصور صفدر جنگ رسید وظائف واقطاعات بدستور زیر ضبط ماند، ودر اواخر عہد محمد شاہ 1159ھ صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمہ وظائف آں صوبہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط آمد۔''

''برہان الملک کے کوچ کر جانے کے بعد حکومت ان کے خواہر زادہ ابو المنصور صفدر جنگ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی وظائف اور جاگیریں بدستور سابق ضبط رہیں، محمد شاہ کے آخری عہد 1159ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کے قبضہ میں چلی گئی، اس طرح اس صوبہ کے

بچے کھچے وظائف جواب تک ضبطی سے محفوظ تھے، وہ بھی ضبط ہو گئے۔''

شیعوں کا تسلط

مولانا نے مختصر الفاظ میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے اور تفصیل ہے بھی بہت طویل۔ تاہم اتنا تو ہر شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں بادشاہوں کا اقتدار جوں جوں گھٹ رہا تھا، یہ عجیب بات ہے کہ ارباب حل وعقد میں ان عناصر کا اضافہ ہو رہا تھا، جنہیں اس زمانہ کی اصطلاح میں ''ایرانیت'' سے تعبیر کرتے تھے۔ ایرانیت کے مقابلہ میں ایک دوسرا عنصر بھی تھا، جس کی تعبیر ''تورانیت'' سے کی جاتی تھی اور سچ پوچھیے تو ان دونوں لفظوں کے پیچھے ''شیعیت'' اور ''سنیت'' کی حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ مرحوم ہی کے زمانہ میں اکثر صوبہ داریوں پر ایرانی عناصر کا قبضہ ہو چکا تھا۔ تورانیوں کے تنہا نمائندہ لیکن شوکت وابہت، جلال وجاہ، تدبیر وسیاست، شجاعت ودلیری میں سب پر تفوق رکھنے والے امیر مغل حکومت میں صرف آصف جاہ اوّل بانی دولت آصفیہ انار اللہ برہانہ تھے۔ محمد شاہ کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو اس وقت باوجودیکہ حضرت آصف جاہ دکن میں تھے اور صفدر جنگ ابوالمنصو روالی اودھ احمد شاہ کے ساتھ دلّی پہنچے۔ طباطبائی صاحب ''سیر المتاخرین'' اپنے والد کے ساتھ دلّی جا رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ راستہ میں محمد شاہ بادشاہ کی موت کے ساتھ:

> ''آمدن صفدر جنگ ہمعنان احمد شاہ وجلوس او بر تخت سلطنت در باغ شالامار باغ دہلی مسموع شد۔'' (ج3، ص868)
>
> ''صفدر جنگ کی احمد شاہ کے ساتھ آمد اور ان کا جلوس تخت سلطنت پر شالامار باغ دہلی میں سنا گیا۔''

ظاہر ہے کہ دلّی کا میدان اس وقت خالی تھا۔ صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا مغتنم موقعہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا لیکن طباطبائی ہی کا بیان ہے کہ:

> ''تجویز وتعیین وزارت بنام صفدر جنگ باوجود اقتدار ولیاقت او بپاس رضا واندیشۂ آصف جاہ درحیز تعویق وتاخیر افتادہ۔'' (ص869)
>
> ''اقتدار ولیاقت کے باوجود آصف جاہ کے اندیشہ کی وجہ سے وزارت کی تجویز صفدر جنگ کے نام نہ ہوئی اور مسئلہ التواء میں پڑ گیا۔''

اہل سنت کا آفتاب اقبال گہن میں

اور اس سے حضرت آصف جاہ اوّل کے اس خداداد رعب ودبدبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی نہ بادشاہ ہی کو ہمت ہوتی تھی کہ صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کی سند عطا کر دیں اور نہ خود صفدر جنگ آصف جاہ کے مقابلہ میں قلمدانِ وزارت کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مگر اہل سنت کا آفتاب گہن میں آ چکا تھا۔ دکن

مراسلات روانہ کیے گئے۔ حضرت آصف جاہ کی دلجوئی کے لیے بادشاہ نے بھی متعدد فرامین ان کی طلبی کے روانہ کیے، لیکن جواب میں ''عذر پیری واظہار عدم رجوع خود بدار الخلافت نگاشت۔'' (ص 869) اور تقدیر بھی یونہی ظاہر ہوئی کہ اس معذرت نامہ کے چند ہی دن بعد حضرت آصف جاہ مسلمانوں کی اکثریت کواس ملک میں بے یارو مددگار چھوڑ کر راہی باغ جناں ہوئے۔

صفدر جنگ شیعہ وزارت کی کرسی پر

دلّی جب یہ خبر پہنچی ہے صفدر جنگ ابوالمنصو ر اچھل پڑا۔ طباطبائی جوان کے ہم مشرب وہم مذہب آدمی ہیں، ان ہی کا بیان ہے:

''خبر رسید کہ چہارم جمادی الاخرئ سال مرقوم الصدر آصف جاہ درسواد برہان پور وداع عالمِ عنصری نمودہ راہ سفر آخرت نمود...... آں زماں صفدر جنگ بہ خاطر جمع قامت خودرا بخلعت وزارت بیارست (36)۔''

''خبر پہنچی کہ چوتھی جمادی الاخری سال مرقوم الصدر میں آصف جاہ نے برہان پور کے علاقہ میں وفات پائی۔ اسی زمانہ میں صفدر جنگ نے اپنے آپ کووزارت کی خلعت سے آراستہ کیا۔''

ورنہ اس سے پہلے معذرت نامہ کے وصول ہوجانے کے بعد بھی:

''صفدر جنگ جرأت بہ پوشیدن خلعت وزارت نہ نمود۔'' (ج 3، ص 869)

احمد شاہ کی طرف سے صفدر جنگ

''روز دوشنبہ چہارم رجب بعنایت خلعت ہفت پارچہ مع چارقب وزارت وجواہر سرفراز و بخطاب جملۃ الملک، مدار المہام وزیر الممالک، برہان الملک ابوالمنصو رخاں صفدر جنگ سپہ سالار مخاطب گشت۔'' (ج 3، ص 869)

''چوتھی رجب دوشنبہ کے دن ہفت پارچہ خلعت ووزارت سے سرفراز ہوئے، اور جملۃ الملک، مدار المہام، وزیر الممالک برہان الملک ابوالمنصو رخاں صفدر جنگ، سپہ سالار کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔''

دباؤ اُٹھ چکا تھا، جس کا خوف تھا وہ سواد برہان پور میں جان جاں آفرین کوسپرد کر چکا تھا۔ اب تک تو صرف اودھ اور الہ آباد کی صوبہ داری کا زور تھا۔ اب توجملۃ الملک وزیر الممالک کی قوت کے ساتھ ابوالمنصو رخاں سریر آرائے مسند وزارت تھے۔

مولانا غلام علی آزاد اس وقت زندہ ہیں۔ جو کچھ گذر رہا تھا دیکھ رہے تھے۔ مختلف الفاظ کے ساتھ اس فاجعہ کا ذکر اپنی مختلف کتابوں میں فرمایا ہے۔ میں ''مآثر الکرام'' سے ان شہادتوں کونقل کر رہا ہوں۔ اس ''داہیۃ کبریٰ'' یعنی صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: ''نائب صوبہ کار برار باب وظائف تنگ گرفت'' کہ ہندی مثل

''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔'' اسی موقع پر کہنے والے نے کہا تھا۔(37)

یالک قنبرۃ بمعمر خلالک الجو فبیضی واصفری

''یعنی فضا ہر دیکھنے والی آنکھ سے خالی ہو چکی تھی، آزادی سے جس چڑیا کا جی چاہے، اب انڈے بچے دے، گائے چہچائے۔''

مغلیہ حکومت کا وہ باز اشہب اُڑ چکا تھا پیرانہ سالی میں بھی جس کی قہرمانی نگاہیں یہ اثر رکھتی تھیں کہ وہ دکن میں تھا اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ دلّی میں بھی قبائے وزارت کو اس وقت تک چھو بھی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس کی جانب سے کلی اطمینان نہ حاصل ہوگیا۔

شیعہ اربابِ حکومت کے ہاتھوں اہلِ علم کی بے قدری

حکومت سے جن لوگوں کی امداد صرف اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ علم اور دین کی خدمت میں مصروف تھے۔ ایک ایک کر کے سب کو ان امدادوں سے محروم کر دیا گیا۔ جو کل تک جاگیر والے تھے، اب اُن کے لیے رہنے کی جگہ کا ملنا بھی دشوار تھا۔ آسمان پر تھے زمین پر پٹک دیئے گئے۔ مولانا آزاد درد کی اس داستان کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

''تاحین تحریر ایں کتاب (مآثر الکرام) ایں دیار (پورب) پامال حوادث روزگارست و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا'' (مآثر۔ص 223)

''اس کتاب کی تحریر کے وقت یہ پورب کا علاقہ حوادث روزگار سے پامال ہو چکا ہے۔ شاید اللہ اب کوئی صورت پیدا کرے۔''

حواشی

(1) صاحب ''مفتاح السعادت'' نے لکھا ہے کہ قطب الدین رازی مصنف قطبی اور قطب الدین شیرازی شارح ''حکمۃ الاشراق'' و مصنف ''درۃ التاج'' وغیرہ یہ دونوں ہم نام و ہم عصر ایک ہی زمانہ میں شیراز کے ایک مدرسہ میں استاد مقرر ہوئے۔ بالائی منزل پر شیرازی پڑھاتے تھے اسی لیے ان کو قطب الدین فوقانی اور نچلی منزل میں قطب الدین رازی درس دیتے تھے اس لیے ان کو قطب الدین تحتانی کہتے تھے۔

(2) مولانا ضیاء الدین سنامی اور سلطان المشائخ میں جو تعلق تھا اس کا ذکر شیخ محدث نے ''اخبار'' میں ان الفاظ میں کیا ہے: ''معاصر شیخ نظام الاولیاء بود دائم بشیخ الدیت سماع اجتناب کردے'' لیکن شیخ المشائخ نے اس اجتناب کے متعلق جو آپ کرتے تھے لکھا ہے: ''شیخ جز

معذرت وانقیاد پیش نیامدے و در تعلیم مولانا دقیقہ نامرعی نہ گذاشتے۔"

یہ قصہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ مولانا سامی جب مرض الموت میں بیمار تھے، سلطان المشائخ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ وہی جو عمر بھر شیخ سے اجتناب کرتے تھے۔ سنتے ہیں آج کیا کر رہی ہیں: "مولانا دستارچہ خود را پائے انداز شیخ انداخت" اپنی پگڑی حضرت کے قدموں کے نیچے بچھوائی تا کہ اسی پر چل کر بستر علالت تک آئیں، لیکن سلطان المشائخ نے کیا کیا: "شیخ دستارچہ پر چید بر چشم نہاد" حضرت نے مولانا کی پگڑی اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ یہ تھے اس زمانہ میں بزرگوں کے تعلقات۔ قصہ اسی نقطے پر ختم نہیں ہوا۔ سلطان مشائخ جب سامنے آ کر بیٹھے تو مولانا نے آنکھیں حضرت سے برابر نہ کیں۔ جوں ہی اٹھ کر مکان سے باہر ہوئے آواز آئی "مولانا برخاست" مولانا ختم ہو گئے۔ سلطان المشائخ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "یک ذات حامی شریعت بود حیف آں نیز نماند" (ص 109)

یہ تھیں محمدؐ کے غلاموں کے قلوب کی لگاوٹیں۔ آنکھیں الگ ہیں لیکن دل ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، آج آنکھیں ملی ہوئی ہیں، اور دل ٹوٹے ہوئے۔

(3) جہاں تک مُلّا صاحب ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ان کا یہ ذوق دراصل "درعہد جوانی چنانکہ افتد دانی" ہی کے زیر اثر تھا۔ اپنی تاریخ میں ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے "دریں سال فقیر را تتابع قوارع مصائب وتازیانہائے مصائب گوش زد حق تعالی از بعضے ملاہی ومناہی کہ باں مبتلا بود توبہ کرامت فرمودہ آ گاہی برزشتی اعمال وقبائح افعال بخشید۔ ع آہ "اگر من چنیں بمانم آہ۔" مُلّا صاحب نے اس کے بعد چند شعر اور بھی لکھے ہیں جن کا ایک مصرع ہے۔ ع "بشد از خاطرم آواز بربط وطنبور" جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس فعل کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایک کمزوری تھی جس میں مبتلا تھے۔

(4) مثلاً لکھتے ہیں کہ دمشق سے نکلتے ہوئے راستہ میں شیخ الاشراق کا جھگڑا ایک گڈریے سے ہو گیا، گڈریے نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، ایسا معلوم ہوا کہ مونڈھے سے شیخ کا ہاتھ اکھڑ کر گڈریے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس حال کو دیکھتے ہی بیچارہ گڈریا تو ہاتھ پھینک کر بھاگ گیا، شیخ نے بڑھ کر اُسے اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں سے آ کر مل گئے، بجائے ہاتھ کے دیکھا گیا تو رومال تھا۔ امام اوزاعی سے ایک یہودی اشراقی کا قصہ اسی قسم کا منقول ہے کہ یہودی نے ایک مینڈک پکڑا، امام اوزاعی بھی سفر میں ساتھ تھے، عیسائیوں کے ایک گاؤں میں اس مینڈک کو جب بیچنے لگا تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سور ہے، کسی غریب عیسائی نے سور سمجھ کر خرید لیا، جب یہودی دام لے کر گاؤں سے باہر ہوا تو پھر مینڈک اصلی صورت پر واپس آ گیا، گاؤں والوں نے یہودی کا پیچھا کیا، امام اوزاعی کہتے ہیں کہ جونہی وہ لوگ قریب ہوئے یہودی کی گردن سے ایسا معلوم ہوا کہ سر الگ ہو کر زمین پر لوٹنے لگا، گاؤں والے یہ تماشا دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگے اور وہی سر جو دھڑ سے الگ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا اوزاعی سے پوچھ رہا تھا: "یا ابا عمر ھل ذھبوا" (ابو عمر کیا گاؤں والے بھاگے) انہوں نے کہا ہاں! تو اچھل کر پھر گردن پر قائم ہو گیا۔ "اتحاف" میں ان اشراقی تماشوں کا ذکر طاش کبری زادہ نے کیا ہے۔ مشہور مصنف علامہ سکاکی کے متعلق یہی لکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ "مفتاح العلوم" جیسی کتاب لکھتے تھے اور دوسری طرف اسی قسم کے علوم کے ذریعے سے عجب تماشے دکھاتے تھے، "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے کہ وزیر بغداد سے ان کا ایک دفعہ جھگڑا ہو گیا۔ سکاکی نے عمل کے زور سے سارے بغداد کی آگ باندھ دی، کسی کے گھر کا چولہا روشن نہیں ہوتا تھا۔ تین دن کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ سکاکی کی یہ شرارت ہے، لجاجت سے کہلا بھیجا کہ مخلوق مصیبت میں ہے اب اپنے عمل کو اٹھا لیں، سکاکی نے کہلا بھیجا کہ "تا وزیر بر کون سگ من بوسہ ندہد چناں نہ کنم۔" واللہ اعلم پھر کیا ہوا، یہ قصے میں نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ اس زمانہ کے علماء کا جو مذاق تھا اس پر ان سے روشنی

پڑتی ہے۔ سکاکی کے متعلق ''روضۃ الصفا'' میں اور بھی قصے نقل کیے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایسے مولوی پائے جاتے تھے، شیخ علاؤ الدین کنتوری کا قصہ مشہور ہے، شیخ احمد شرقی کی تسبیح کا قصہ بھی ''اخبارالاخیار'' میں پڑھیے، عارف حسینی کے قصے بداؤنی نے لکھے ہیں۔

(5) اگرچہ نہ کسی اور کتاب میں لکھا گیا ہے اور نہ روایۃً اس کا ذکر کسی سے سننے میں آیا ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی مختصر سی تاریخ ہند فارسی میں ہے، جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس کتاب میں بنگال کے بادشاہ غیاث الدین جسے حافظ کی غزل نے شہرتِ دوام بخشی ہے اس بادشاہ کے تذکرہ میں شیخ محدث لکھتے ہیں۔ ''درانجا (بنگال میں کسی جگہ) پلے بستہ است بقدر دہ روزہ راہ'' (ص 89) اتنا بڑا پل جس پر دس دن تک لوگ مسلسل چلتے رہیں، میں نہیں جانتا کہ بنگال میں کہاں تھا یا کہاں ہے؟ یا واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے۔

(6) یہ خیال کہ انجینئرنگ کے تعمیری شعبہ نے علمی قالب یورپ کی جدید علمی نشأت میں اختیار کیا صحیح نہیں ہے۔ ''صبح الاعشیٰ'' میں لکھا ہے کہ:

مهندس العمائر وهوالذى يتولى ترتيب العمائر و تقدير ها ويحكم على ارباب مناعاتها والهندسة علم معروف فيه كتب مفروة بالتصنيف (ج 5، ص 467)

''مہندس العمائر (عمارتوں کا انجینئر) اس شخص کو کہتے ہیں جو عمارتوں کی ترتیب اور ان کے خاکوں کے درست کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ نیز عمارت سازی کے کاریگروں کی نگرانی بھی وہی کرتا ہے اور الہندسہ ایک مشہور علم ہے جس میں مستقل تصنیفیں پائی جاتی ہیں۔''

جس سے معلوم ہوا کہ انجینئروں کے جو فرائض آج ہیں یہی فرائض اسلامی عہد میں بھی ان سے متعلق تھے اور اس فن میں مستقل کتابیں لکھی گئی تھیں۔ درس وتدریس کا البتہ پتہ نہیں چلتا۔

(7) مُلّا نورالدین ہمایوں کے دربار کے مُلّا تھے۔ ''درعلوم ریاضی و ہندسہ ونجوم وحکمت ممتاز۔'' (ص 197) بداؤنی سرہند کے قریب سفیدون کا پرگنہ جاگیر میں ملا تھا، مُلّا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ ''از آب جون (دریائے جمنا) جوئے کندہ تا پنجاہ کروہ راہ، بجانب کرنال واز آنجا پیش تر براہ کہ می رود از اں آب زراعت بسیار کردہ باعث ترفیہ رعایا گردید۔'' (ص 198) یہ تھے اُس زمانہ کے ملاؤں کے کارنامے۔

(8) کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشہور عربی قصائد جیسے یہی کعب بن زہیر والا قصیدہ ''بانت سعاد'' قصیدہ تائیہ ابن فارض، قصیدہ بردہ وغیرہ کو عموماً لوگ زبانی یاد کرتے تھے۔ مُلّا عبدالقادر نے لکھا ہے: ''قصیدہ فارضیہ تائیہ کہ ہفت صد بیت وقصیدہ بردہ وقصیدہ کعب بن زہیر و دیگر قصائد محفوظ۔'' (ص 76)

(9) واللہ اعلم۔ واقعہ سے اس کا کس حد تک تعلق ہے کہ ایک ہندی مولوی کو ضرورت ہوئی۔ اُردو کے اس جملہ کی عربی بنانے کی یعنی حکیم آیا اور اُس نے نبض دیکھی تو اس اُردو فقرہ کا مذکورہ بالا الفاظ میں اس نے جو ترجمہ کیا جو ظاہر ہے کہ کایستھوں کی فارسی یا اس زمانہ کے عام ہندوستانیوں کی سنتے ہیں کہ انگریزی ہے جس پر انگریز عموماً قہقہے لگاتے ہیں۔

(10) باوجود شاہی منظوری کے ہندوستان کا یہ رصد خانہ نہ بن سکا۔ لکھا ہے کہ بلخ کی مہم پیش آگئی۔ وزیر نے ایسے وقت میں رصد خانہ کے مصارف کو غیر ضروری قرار دے کر تجویز کو ملتوی کروادیا۔

(11) اس کتاب سے پہلے ناواقف تھا۔ مولوی امداد امام اثر نے اپنی کتاب ''روضۃ الحکماء'' جس میں جدید مغربی فلاسفر اور ان کے نظریات کا تذکرہ اُردو زبان میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں تمہید کی تعریف پڑھی، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں اس کا ایک قدیم

مطبوعہ نسخہ ہاتھ آیا۔ پڑھنا شروع کیا تو اتنی دلچسپ سلجھی ہوئی کتاب معلوم ہوئی کہ ختم ہی کرنا پڑا۔ اب تک اس کا پتہ نہ چلا کہ اس کتاب کے مصنف ابوالشکور کہاں کے تھے۔ حصار کے ایک مولوی صاحب نے ان کا وطن حصار کے اطراف میں بتایا تھا۔

(12) بداؤنی نے لکھا ہے، فیروز تغلق کے وزیر خان جہاں کے بیٹے جونا شہ باپ کے مرنے کے بعد خاں جہان کے لقب سے ملقب ہوئے، اسی جونا شہ کے نام مولانا داؤد نے یہ مثنوی معنون کی تھی جس کے معنی یہی ہوئے کہ فیروز تغلق کے عہد کی یہ کتاب ہے۔

(13) بعد کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو سے اس مثنوی کا ذکر آیا تو اس سے وہ واقف نہ تھے، خدا کرے پڑھنے والوں میں کسی صاحب کو اس مثنوی کا علم ہو، تو انجمن ترقی اُردو کو چاہیے کہ وہ مطلع فرمادیں۔

(14) درس نظامیہ کے نصاب فضل یا انتہائی کتابوں کے نصاب میں دینیات کی صحیح معنوں میں کل تین کتابیں ہیں، ان کے سوا جو کچھ ہے وہ خالص عقلیات یا نیم عقلیات ہی کی کتابیں ہیں جن کی تعداد پچاس چالیس سے متجاوز ہے۔ ممکن ہے کہ جنہوں نے غور نہیں کیا ہو، انہیں کچھ اچنبھا سا ہو، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی ایک اجمالی فہرست ہی دے دی جائے۔ جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ مع شرح وقایہ۔ معلوم ہو چکا کہ درحقیقت اس کورس میں حقیقی دینیات کی یہی تین کتابیں ہیں۔ اب سنیے اول سے آخر تک اس نصاب میں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، بدیع المیزان، مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، بعض مقامات میں شرح سلم بحرالعلوم، شرح مطالع خالص منطق میں۔ ہدایہ سعیدیہ، میبذی، صدرا، شمس بازغہ، بعض مقامات میں شرح ہدایۃ الحکمۃ خیرآبادی، شرح اشارات، شفا، فلسفہ میں توضیحہ، تصریح، شرح چغمنی۔ بعض مقامات میں تذکرہ، بست باب، ہیئت میں، اقلیدس، مبادی الحساب (ریاضی میں) ان کے سوا میر زاہد رسالہ، میر زاہد مُلا جلال، میر زاہد امور عامہ اکثر مقامات میں میر زاہد رسالہ وملا جلال کے ساتھ بحرالعلوم۔ یہ کتابیں کچھ خاص طریقہ کی ہیں جنہیں بجز معقولات کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب اصول فقہ میں اصول شاشی، حسامی، نورالانوار، توضیح معہ تلویح، مسلم کلام میں۔ شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی۔ اور بعض مقامات میں شرح تجرید توشجی، شرح تجرید کے حواشی قدیمہ وجدیدہ، میر باقر کی ''الافق المبین'' جس کا شمار امورِ عامہ کے مباحث ہی میں ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا تھا، مختصر المعانی اور مطول کا شمار بھی اسی سلسلہ میں ہونا چاہیے اور شرح جامی کو بھی میں اسی قبیلہ کی کتاب قرار دیتا ہوں، یاد رکھنا چاہیے کہ میں نے اس سلسلہ میں عموماً ان ہی کتابوں کا شمار کرایا ہے جو درس نظامیہ پڑھانے والی تعلیم گاہوں میں آج سے چالیس پچاس برس پیشتر تقریباً دوامی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھیں، ان کے سوا بھی مرزا جان خوانساری، میر باقر، صدرا شیرازی، شریف جرجانی کے حواشی، عبدالحکیم سیالکوٹی کے حواشی، خیرآبادیوں میں مولانا فضل حق، مولوی عبدالحق کے حواشی، ہیئت وہندسہ میں کرہ وغیرہ کی کتابیں مزید براں تھیں۔ اگر ان کو بھی شمار کرلیا جائے تو شاید تعداد پچاس سے آگے بڑھ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کتابوں کا نام مستحضرہ نہ رہا ہو۔

(15) دراصل یہ لوگ بذات خود تو خاص کسی دولت وثروت کے مالک نہیں تھے بلکہ شاہی خاندان کے ایک رُکن رکین خانجہاں نامی کی طرف سے شاہی دربار میں وکیل تھے اور خانجہاں اُس وقت دہ ہزاری منصب پر سرفراز تھے، سکندر کو کچھ خانجہاں سے سوء مزاجی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اپنی ناراضی کو وہ خان جہاں پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، کہتے ہیں اس نے دَرپردہ خانجہاں کی ساری جاگیر کے متعلق ملک زین الدین کو یہ خفیہ فرمان لکھ دیا تھا۔ ''ہرچہ از اموال واملاک خاں باشد تصرف نماید وہر نوع کے داند خرچ کند بنوعے کہ خانجہاں را بریں معنی اطلاع بناشد۔'' آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ از زین الدین حساب گرفتہ شد ہیچ کس را باو کارے نیست''

(اخبار الاخیار۔ ص 226)

گویا در پردہ ملک زین الدین ہی کو خانجہاں کو جاگیر سلطان نے حوالے کردی تھی اور خانجہاں نام نہاد مالک تھے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ملک زین الدین نے اس دولت سے ناجائز نفع نہیں اُٹھایا بلکہ "ہمہ را بمصارف خیر ومحال ثواب رسانید۔"

(16) قریب قریب ان کا حال وہی تھا جوان دنوں سرکار آصفیہ کے پایۂ تخت (حیدرآباد دکن) میں مخدوم ومحترم جناب مولوی فیض الدین صاحب وکیل کی حالت ہے۔ تقریباً بیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ممالک اسلامیہ خصوصاً عرب کے باشندے اس ملک میں جب آتے ہیں تو بغیر کسی اجازت وطلب کے مطلقاً وکیل صاحب کے وہ مہمان ہوجاتے ہیں۔ علماء کا قیام بھی زیادہ تر وکیل صاحب ہی کے یہاں رہتا ہے۔

(17) ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ میاں لادن اور جمال خاں حقیقی بھائی ہیں۔ جمال خاں کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں: "اعلم علمائے زمان خود بود در علوم عقلیہ ونقلیہ خصوصاً فقہ وکلام وعربیت وتفسیر بے نظیر بود بر شرحین مفتاح محاکمہ کرد وعضدی را کہ کتاب منتہیانہ ست می گویند چہار بار از اول تا آخر درس گفتہ" (بداؤنی۔ ص 77) نوے سال عمر پائی۔ 984ھ میں انتقال ہوا۔

(18) مگر بداؤنی کے بیان سے کچھ اور ہی بات ثابت ہوتی ہے، عہدِ سکندری کے علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "صاحب تصنیفات لائقہ وکتب فائقہ شیخ الہدیہ جونپوری است کہ بر ہدایہ فقہ شرحے مشتمل بر چند جلد نوشتہ۔" اگرچہ بجائے الہداد کے مطبوعہ نسخہ میں الہدیہ کا لفظ چھپا ہوا ہے لیکن یہ وہی الہداد ہیں جنہیں مولانا آزاد تلنبی کا شاگرد بتاتے ہیں، مگر بداؤنی نے اس کے بعد جو یہ لکھا کہ "سکندر لودھی علماء دیار خود جمع کردہ بہ یک جانب شیخ عبداللہ وشیخ عزیز اللہ وجانب دیگر شیخ الہدیہ وپسراو در بحث محاصن ساخت" (ص 325) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہدیہ یا الہداد کو تلنبی سے تلمذ کا تعلق نہ تھا کیونکہ استاد کے مقابلہ میں شاگرد کا میدان میں اترنا کم ازکم اس زمانہ کے اصول کے خلاف تھا۔ واللہ اعلم۔

(19) ان عبارتوں پر نظر پڑنے کے بعد مجھے خوشی ہوئی جب مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب "ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی ہند کے سب سے بڑے مورخ خصوصاً علمی تاریخ کے یعنی مولانا عبدالحیٔ مرحوم سابق نظام ندوہ بھی معقولات کے متعلق پہلے انقلابی اقدام کا زمانہ سکندری عہد ہی کو خیال کرتے تھے اور انہیں دونوں ملتانی عالموں کو اس انقلاب کا بانی تصور کرتے تھے۔

(20) یہ رنتھنبور ہندوستان کے ان مشہور قلعوں میں تھا جو استحکام ومضبوطی کے سوا اپنی مقامی خصوصیت میں بے نظیر تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ رن پہاڑ کو کہتے ہیں اور رنتھنبور کے معنی "جوشن پوش۔" جہانگیر نے "تزک" میں لکھا ہے کہ دراصل دو پہاڑ رن اور رنتھنبور برابر چلے گئے ہیں، قلعہ رنتھنبور پر ہے، علاؤ الدین خلجی نے رائے پتمبر دیو سے اس قلعہ کو فتح کیا۔ اکبر کے زمانہ میں اس پر راجہ سرجن کا قبضہ پھر ہوگیا تھا۔ اکبری اقبال نے ایک مہینہ بارہ دن میں اس کی قلعہ کشائی کی۔ لکھا ہے کہ ساٹھ ساٹھ سو کہاروں نے کھینچا۔ ایک ایک توپ سات سات من کا گولہ منہ سے اگلتی تھی، چند ہی فیر کے بعد راجہ نے اطاعت قبول کرلی۔ قلعہ اکبر کے حوالہ کردیا۔ مولانا محمود حسن ٹونکی جنہوں نے ابتداء اسلام سے اس وقت تک کے ان مصنفین اسلام کی جنہوں نے عربی زبان میں کتابیں لکھی ہیں ایک ضخیم تاریخ عربی میں "معجم المصنفین" نامی لکھی ہے اور حکومت آصفیہ نے اس عجیب وغریب کتاب کی تدوین وترتیب پر ہزار ہا ہزار روپے خرچ کیے ہیں، اسی کتاب میں ایک موقع پر یہ عجیب اطلاع دی ہے کہ سوائی مادھو پور جو ریاست جے پور میں ایک مشہور جگہ ہے۔ رن تھمبور اسی مادھو پور کے قلعہ کا قدیم نام تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(21) شیخ محدث نے اپنی اس فارسی تاریخ میں جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، ہمایوں کے متعلق لکھا ہے: "با علوم ریاضی واقسام فلسفہ

از ہیئت و ہندسہ و نجوم میلے تمام داشت۔" (تاریخ حقی۔ص 72)

(22) اگر کوئی بیچارہ مسلمان ہندوؤں کے قدیم طریقہ کو ناقص ٹھہرا کر جدید ضابطہ کو نافذ کرتا تو بے محابا اس پر تعصب کا تیر چلا دیا جاتا، لیکن شکر ہے کہ یہ انقلاب ایک ہندو وزیر کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اُردو) سچ کہتے ہیں کہ اُردو ہندوؤں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انہیں نے اپنی دیسی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ ملا کر ایک نئی بولی کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ موجودہ شکل تک پہنچ گئی، اور فارسی چھوڑ کر ہندوؤں کی اس بولی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا۔ آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ انگریز اپنی زبان میں ہندوستانی الفاظ نہیں ملاتے لیکن ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی جس زبان کو آج بول رہا ہے، انگریزی الفاظ کی اس میں کتنی بھرمار ہوتی ہے۔

(23) ابن خلدون کے مقدمہ کا مشہور فقرہ "العلماء ابعد الناس عن السیاسته" (یعنی علماء سیاسیات میں کورے ہوتے ہیں) اگرچہ یہاں علماء سے وہ اصطلاحی علماء مراد نہیں ہیں جنہیں اس زمانہ میں مولوی ملا وغیرہ کہتے ہیں، بلکہ عام علمی طبقہ مراد ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے جہانگیری کی حد تک ابن خلدون کا یہ نظریہ صحیح ہو کہ علمی افکار والے میدانِ جنگ میں عموماً صرف احتمال آفرینیوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں، بازی وہی لے جاتا ہے جو "نہ آری جانتا ہو نہ فارسی" جس کا کچھ تجربہ اس زمانہ میں بھی ہو رہا ہے۔ لیکن سیاست کا دوسرا حصہ جسے ہم "جہاں داری" کہہ سکتے ہیں، کم از کم ہندوستان میں تو ابن خلدون کا نظریہ غلط ثابت ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلامی بادشاہانِ ہند میں بہترین شاداب عہد شاہجہاں کا ہے، کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ شاہجہانی دور کے اس امتیاز میں شاہجہاں کے مُلا وزیر اعظم ملا سعد اللہ کی دماغی صلاحیتوں کو دخل نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ملا سعد اللہ کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی، ورنہ نظام الملک طوسی جیسے وزراء میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندی بادشاہوں میں کچھ بھی ہو، ماسے حکومت کی کتنی ہی قلیل مدت ملی ہو، لیکن شیر شاہ بادشاہ کے جہانگیرانہ اور جہاندارانہ دونوں کارنامے قطعاً غیر معمولی ہیں۔

ارباب خبرت و بصیرت جانتے ہیں کہ اکبری عہد کے اصلاحات کا بڑا حصہ آئینِ شیر شاہی سے ماخوذ ہے۔ شیر شاہی قدیم سڑکیں اب بھی ہندوستان کے طول و عرض میں اس بادشہ کی بیداری و اولوالعزمی کا گیت گا رہی ہیں، لیکن ان شیر شاہی کارناموں میں اگر مجھے جونپور کے مدرسوں کی وہ تعلیم نظر آتی ہے جو "رغبتے بہ تحصیل عربیت نمود۔" (سیر المتاخرین۔ص 158) مزید "آں جا (یعنی در جونپور) از ہر علمے دقوفے بہم رسانید۔" (تاریخ سلاطین افاغنہ۔ص 173) کے بعد شیر شاہ کو حاصل ہوئی تو اس خیال سے مجھے کیوں ہٹایا جا سکتا ہے۔ والتفصیل یتجزای التطویل۔

الفنسٹن اور برنیر نے ملا سعد اللہ شاہجہانی وزیر کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں: "سرزمین ہند میں سعد اللہ خاں سے بڑھ کر کوئی مدبر، کوئی قابل، کوئی راستباز وزیر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ذات پر ہندوستان جتنا ناز کرے بجا ہے۔" (حیات جلیل۔ص 28) اور میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کی تعلیم کا ملایانہ نظام جتنا چاہے مُلا پر فخر کر سکتا ہے۔

(24) یہ دوان نامی قریہ کی طرف نسبت ہے، ہمارے مدارس میں عموماً اس لفظ کا تلفظ دال کی تشدید کے ساتھ کیا جاتا ہے، لیکن خود ایک ایرانی مورخ اس کے متعلق لکھتا ہے: دوان علی وزن ہوان۔ دوسری کتابوں میں بھی ضبط اعراب کرتے ہوئے یہی لکھا گیا ہے، اسی کتاب میں ہے کہ گازرون کا یہ ایک قریہ ہے۔ اسی میں ہے کہ علامہ دوانی نے ایک پہاڑی کی چوٹی پر منزل عالی بنوائی تھی جو دشت ارژن کی طرف مشرف تھی۔ یہ دشت ارژن وہی ہے، جس کی قدیم ایرانی جغرافیہ نویسوں نے بڑی تعریف بیان کی ہے، سرسبز وسیع مرغزار موسم برسات میں ایک جھیل تیس میل لمبی پیدا ہو جاتی تھی جس میں مچھلیاں بھی بکثرت ہوتی تھیں۔ وارژن تلخ بادام کو کہتے ہیں۔ غالباً اس کا جنگل کبھی وہاں تھا۔ اس کتاب سے یہ مضمون لیا گیا ہے اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ "ہوالی الان باق یری من بعید" (ص 42) یعنی

علامہ کی یہ پہاڑی کی کوٹھی اب بھی موجود ہے۔ دور سے نظر آتی ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ وسعت و استحکام دونوں لحاظ سے یہ عمارت غیر معمولی ہوگی۔ اس سلسلہ میں اس کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ مدارس والے تو واقف ہیں لیکن عوام نہ جانتے ہوں اور عوام کیا اب تو خواص بھی مشکل سے واقف ہوں گے کہ قدیمہ، جدیدہ، اجد کیا چیز ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے۔ محقق طوسی نے علم کلام میں تجرید نامی متن لکھا تھا۔ علامہ علی قوشجی نے اس کی شرح لکھی، شرح پر دوانی نے حاشیہ لکھا، ان کے معاصر امیر صدرالدین الاشتکی نے بھی شرح تجرید پر حاشیہ لکھا جس سے دوانی پر چوٹیں کی گئی تھی۔ دوانی نے اس کا جواب لکھا الاشتکی نے پھر اس کا جواب لکھا، دوانی نے جواب الجواب تحریر کیا، یوں دوانی کے تین حاشیے قدیمہ، جدیدہ، اجد ہو گئے۔ صدرالدین مر گئے تھے، ان کے بیٹے امیر غیاث منصور نے جو غیاث الحکماء کے نام سے مشہور ہیں والد کی طرف سے جواب لکھا۔ اب اُدھر بھی وہی تین قدیمہ جدیدہ اجد ہو گئے — ذہنی زور آزمائیوں کا ان کتابوں میں طوفان اُبلتا تھا، علماء نے درس میں داخل کیا، ان پر حواشی مرزا جان آقا حسین خوانساری نے لکھے اور اب ''عفت الدیار محلها و مقامها'' خاکسار کے خاندانی کتب خانہ میں یہ سارے حواشی قلمی موجود تھے جن کا کچھ حصہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی کتب حبیبیہ میں محفوظ کرا دیا گیا کہ اب نہ ان کا کوئی پڑھنے والا ہے نہ پڑھانے والا۔ مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ ایک گاؤں میں علم کا سرمایہ کتنا محفوظ تھا۔

(25) ''دبستان المذاہب'' میں ایک دلچسپ کتاب ہے، اس کا مصنف کون ہے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا۔ بعض لوگ اس کو دارا شکوہ کی کتاب بناتے ہیں۔ بعضے ملا محسن فانی کشمیری کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن ''مآثر الامرا'' میں ہے: ''ذوالفقار اردستانی موبد تخلص در دبستان خود کہ حاوی اکثر اعتقادات اہل ہنود و مجوس و مذاہب مرجبہ اہل اسلام است۔'' (ج 2، ص 392) جس سے معلوم ہوا کہ اس کا مصنف یہی ذوالفقار اردستانی ہے، لیکن خود کتاب کی اندرونی شہادتوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف کوئی مسلمان نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ ذوالفقار کسی مسلمان ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

(26) لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکیم کامراں کسی مذہب کا پابند نہ تھا، بظاہر پارسی النسل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی علماء سے عربی و فارسی کی تحصیل کی تھی، فلسفہ میں غلو تھا اور فلسفہ ہی کو اس احمق نے اپنا مذہب بنا لیا تھا، ''دبستان المذاہب'' والے نے لکھا ہے کہ ''موسیٰ را جادوگر دانستے و ربی موسیٰ خواندے، وعیسیٰ راطبیب شمردے وحکیم عیسیٰ بن یوسف نجار گفتے'' العیاذ باللہ۔ یوں ہی سرور کائنات کی ذات گرامی کی شان میں وہی پرانا قول ''شاعر او مجنوں'' کو ان الفاظ میں دہراتا۔ ''محمد رسول اللہ ملک الشعرائے عرب نامیدے'' اور اس حد تک تو غنیمت ہے، بیچارے کرشن جی مہراج کو کہتا ''وکشن اوتار را چھنال یعنی شہوت پرست وزانی خواندے'' اگرچہ اس میں کامراں کی شرارت کے سوا خود ان بیہودہ روایتوں کو بھی دخل ہے جنہیں ہندو کرشن جی کے بارے میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اشارہ وہی گوپیوں کے قصہ کی طرف کر رہا ہے، کامراں نے اپنا مذہب فلسفہ قرار دیا تھا۔ جب مر رہا تھا تو صاحب ''دبستان'' نے لکھا ہے ''پیوست بقرأت الٰہیات شفا و ترجمہ اثولوجیا مشغول وشاداں می سرود'' یہ بھی کہتا ہے کہ ''بہ نجات فلاسفہ ایمان دارم واز ادیان و مذاہب بے زارم، و در ہنگام گذشتن (جب دم نکل رہا تھا) نام واجب الوجود عقول ونفوس و کواکب می گفت۔'' وصیت کی تھی کہ دفن کرنے کی میرے یہ صورت ہو ''مرا سر بہ مشرق و پا بہ مغرب دفن کنید کہ جمیع بزرگان چوں ارسطو و افلاطوں چنیں خوابیدہ اند۔''

اس کا ایک غلام یا نوکر ہوشیار تھا حسب وصیت ''بر سر قبرش تا یک ہفتہ ہر روز شب بخوران کواکب کہ آں روز و شب بدو تعلق دارد بیفر وخت واں خورد پوش کہ منسوب بداں کواکب است بہ براہمہ و مستحقاں رساند۔'' کامراں کے مزاج میں ظرافت بھی تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ ''خلاصہ عقیدہ سنی و شیعہ بیان کن جواب داد کہ عقیدہ سنی این ست بعد حمد اللہ تعالیٰ و نعت رسول محلی جمیع الفاسقین و

الفاسقات والفاجرین والفاجرات، وعقیدہ شیعہ این ست بعد حمد اللہ تعالیٰ ونعت رسول صلوٰۃ اللہ لعنۃ اللہ علی جمیع المومنین والمومنات و المسلمین المسلمات۔'' عجیب مسخرہ تھا۔

(27) غالباً یہ وہی ملا یعقوب ہیں جو ملا یعقوب کشمیر کے نام سے مشہور ہیں، صرف تخلص کرتے تھے۔ بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے کہ ''بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ وسند حدیث از شیخ ابن حجر داشتہ۔'' مُلّا صاحب کے ملنے والوں میں تھے، ان کے نام خطوط بھی ہیں جو اسی تاریخ میں منقول ہیں۔ مُلّا یعقوب کے متعلق بداؤنی کی شہادت ہے۔'' در جمیع علوم عربیت از تفسیر وحدیث وتصوف مشارٌ الیہ ومعتمد علیہ وسند امام ست'' (ص 142) مُلّا عبدالقادر نے یہ بھی لکھا ہے: ''تفسیرے در آخر عمر چوں تفسیر کبیر می خواست کہ بنویسد و پارہ مسودہ کردہ ناگاہ سرنوشتِ ازل پیش آمد۔'' یعنی مر گئے۔ یہ بھی اسی میں ہے کہ ''بادشاہ مغفرت پناہ (ہمایوں) وہم شاہنشاہی (اکبر) را نسبت بوے اعتقاد غریب بود، شرف صحبت اختصاص یافتہ و منظور نظر شفقت اثر گشتہ ومعزز ومکرم ومحترم بود۔'' آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں علمِ حدیث کے جاننے والے کیسے کیسے لوگ ہیں لیکن بعض صفائی پر قصہ ختم کر دیتے ہیں، صرف ''منتخب التواریخ'' سے بیسیوں آدمیوں کے نام منتخب کیے جاسکتے ہیں۔

(28) حکیم کامراں کے تذکرے سے جہاں درسی کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہیں اس کا ہندوستان میں شفاء اشارات، حکمۃ العین، شرح تجرید، شرح تذکرہ وغیرہ کتابیں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ اثولوجیا جو مسلمانوں میں ارسطو کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کی نہیں بلکہ افلاطن اسکندرانی کی اشراقی کتاب ہے۔ لیکن بہر حال فلسفہ کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ آپ سُن چکے وہ بھی، موجود تھی۔ ''دبستان'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صد سالہ بڈھے کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔

''کتابہائے حکماء را بہ ہشیار نامی سپرد ہشیار در آگرہ کتابہائے او را بخش کرد بہ یاراق فرستاد۔'' (ص 307)

(29) پارسیوں کا خیال ہے کہ ہم مسلمان لوگ رسول اور نبی کے لفظ سے جو مراد لیتے ہیں وہی معنی پارسی میں ''وخشور'' کے ہیں۔ حکیم کامراں سے اسی ''دبستان'' میں مختلف اقوام کے ہداۃ اور ان زبانوں میں ان کے جو نام ہیں نقل کیا ہے۔ بعض چیزیں اس میں بالکل نئی ہیں۔
''پیغمبران فارس کہ اباد وزردشت وامثال آئند وایشانرا وخشور گویند ورسولاں یونان وروم کے اغا ثاد یموی، وہرمس وامثال ایشانند وایشانرا صاحب ناموس خوانند وانبیاء ہند کہ رام وکشن و مانند ایشا، او تار نامند وپیغمبران اتراک اغپر برت واغور خاں وایشانرا، بولماس سرائند و پیغمبران اسلامیہ کہ از آدم صفی تا محمد ایشاں را مرسل گویند۔'' (ص 308)

(30) میں نے تقلیہ اس لیے لکھا کہ شیعی دینیات کے سوا ہم تاریخوں میں پاتے ہیں کہ ابن حزم کی محلی کا خلاصہ بھی انہوں نے لکھا ہے: جس کے یہ معنی ہیں کہ محلی جیسی ضخیم کتاب تیس جلدوں میں ہندوستان آ چکی تھی۔ اس کتاب کے خلاصہ کرنے کی وجہ باوجود شیعی ہونے کے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکبر کے سامنے لاہور میں جب وہاں کے قاضی ضعف پیری کی وجہ سے گر پڑے تو اکبر نے حکم دیا ان کی جگہ دوسرے عالم کا تقرر کیا جائے، اب ان بڑے میاں سے کام نہ چلے گا، حکیم ابوالفتح نے نور اللہ شوستری کو پیش کر دیا۔ بظاہر انہوں نے تقیہ سے کام لیا اور اپنا مذہب ظاہر نہ کیا۔ صرف بادشاہ سے یہ اجازت چاہی کہ اہل سنت کے مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے مطابق اگر فیصلہ کروں تو مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ اکبر نے اجازت دے دی۔ قاضی صاحب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہر مسئلہ میں کوئی ایسی صورت نکالتے جو امامیہ مذہب کے مطابق ہو جاتا اور کہہ دیتے کہ فلاں امام کے یہاں بھی یہ روایت ہے، غالباً اسی غرض سے محلی کا مطالعہ کرتے ہوں گے اور اپنے کاروبار کے لیے اس کا خلاصہ کیا ہوگا، لیکن بات چھپی نہ رہی۔ جہانگیر کے زمانہ میں ان کی ایک کتاب ''مجالس المومنین'' پکڑی گئی جو تبرا سے بھری ہوئی تھی۔ جہانگیر نے خاردار دُرّے سے حد لگانے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں جو

جہانگیر کی پشت پر ہاتھ رکھے پیچھے بیٹھی رہتی تھی لاکھ دباتی رہی کہ ایسا نہ کرو، لیکن اس وقت اس کا حال اور تھا۔ جاناں بہ تو جان دادہ ام ایمان نہ دادہ ام، کہتا جاتا تھا۔ قاضی نور اللہ درہ کی مار سے مرگئے۔ شیعوں میں اسی لیے شہید ثالث کے نام سے موسوم ہیں۔ دیکھیے نجوم السماء تاریخ علماء شیعہ۔

(31) عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جنہیں بخارا اور سمرقند یعنی جس کی دوسری تعبیر ماوراء النہر سے کرتے ہیں، چونکہ ان شہروں کے علمی ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہے اس لیے ہندوستان کی معقولیت کا الزام ان ہی بیچارے علماء پر ڈال دیتے ہیں جو ماوراء النہر سے ہندوستان آئے حالانکہ تاتاری فتنہ کے بعد جب اس ملک میں پھر علم کا رواج ہوا تو اس میں زیادہ تر فقہ واصول فقہ جیسے علوم تھے۔ منطق وفلسفہ سے ان کا تعلق بہت معمولی تھا۔ عبداللہ ازبک کے عہد میں جو اس زمانہ میں بادشاہ توران کہلاتا تھا، ملا عصام اسفرائنی کے ذریعہ سے اس علاقہ میں جب منطق کا کچھ زور بندھا تو جیسا کہ ملا عبدالقادر بداؤنی نے قاضی ابوالمعالی کے ذکر میں یہ لکھ کر کہ ''در فقاہت چناں بود کہ اگر بالفرض والتقدیر جمیع کتب فقہ حنفی از عالم برافتادے اومی توانست کہ از سرنوشت۔'' یہ لکھا ہے کہ ان ہی قاضی ابوالمعالی نے ''ملا عصام اسفرائنی مع خبائث طلبہ از ماوراء النہر خارج نمودہ''، وجہ یہ لکھی ہے کہ ''چوں ایں علم (منطق وفلسفہ) در بخارا وسمرقند شایع شد خبائث و شریر ہر جا صالحے سلیم اہلے رامی دیدندمی گفتند کہ ایں حمارست (یعنی گدھا ہے) چرا کہ لاحیوان از ومسلوب است وچوں انتفائے عام مستلزم انتفائے خاص است سلب انسانیت نیز لازم می آید۔'' گویا اس طریقہ سے ہر اچھے بھلے مانس آدمی کو ثابت کر دیا جاتا تھا کہ وہ گدھا ہے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اس حال کو دیکھ کر ''عبداللہ خاں شاہ توران را تحریص وترغیب اخراج ایں جماعت نمود و نامشروعیت تعلیم وتعلم منطق وفلسفہ بدلائل ثابت کرد'' صرف یہی نہیں بلکہ ''روایتے نمود کہ اگر بکاغذے کہ منطق دراں نوشتہ باشند استنجا نمائند باکے نیست'' یہ عبارت فقہ کی کتاب ''جامع الرموز'' کی ہے کہ ''یجوز الاستنجاء باوراق المنطق'' (منطق کے اوراق سے استنجاء جائز ہے) عبداللہ ازبک نے قاضی ابوالمعالی کے مشورہ کو مان لیا اور ملا عصام نیز ان کے طلبہ کو اسی جرم میں ملک سے بدر کر دیا، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ماوراء النہر، بخارا، سمرقند پر ہندوستان کی معقولیت کا الزام جو قائم کیا جاتا ہے صحیح نہیں ہے، قاضی ابوالمعالی کا فتاویٰ حال میں کتب خانہ آصفیہ نے خریدا ہے۔

(32) ایک دلچسپ بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ پچھلے دنوں ارباب مطابع نے فرنگی محل کے ان مولویوں سے جو آج کل موجود ہیں یا جن کا حال میں انتقال ہوا، معقولات کی نصابی کتابوں پر اگر کوئی حاشیہ لکھوایا تو مولوی صاحب نے عموماً اپنے خاندان کے بزرگوں کا کوئی حاشیہ اٹھا کر کتاب پر چڑھا دیا ہے اور ہر حاشیہ کی ابتداء عموماً ان الفاظ سے ہوتی ہے: قال جد جد جد جدی (یعنی میرے دادا کے دادا نے یوں فرمایا) یا کبھی قال جد جد جد امی (میرے دادا کے دادا کی والدہ کے بیٹے نے یوں فرمایا) یا قال جد جد جد عمی الی غیر ذلک من الصلات النسلیہ والصہر یہ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علماء فرنگی محل کا کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جس نے حاشیہ نگاری کی اس مہم میں اپنا حصہ نہ ادا کیا ہو۔ مشہور ہے کہ مولانا محمد حسن کانپوری میر زاہد کے تیس تیس حاشیوں کو سامنے رکھ کر پڑھایا کرتے تھے۔ زواہد ثلثہ سے مراد میر زاہد کی تینوں کتابیں میر زاہد رسالہ، ملا جلال، امور عامہ کے حواشی ہیں۔

(33) ''عماد السعادت'' میں لطیفہ کو زیادہ دلچسپ کر کے بیان کیا ہے۔ یعنی ''از بزرگان باخبر بہ ثبوت پیوستہ کہ آں روز در عین جنگ نواب شیر جنگ بر سر شرارت آمدہ بر فیل نواب برہان الملک دویدوزدہ زدہ اورا بہ لشکرگاہ نادری رسانید جماعہ قزلباش از چہار طرف دودیہ ہر دو فیل را وایشان گرفتند وبا وازتفنگ ونیزہائے آبدار ترسانیدہ ہر دو را بہ یسمانہا گندہ بستند ونواب والا قدر را با برادر وازادہ عالی مرتبت در او قاتے نشانیدہ بعرض قہرمان ایران رسانیدند۔'' (ص 25) پھر ہاتھیوں کے دھکہ پیل کا قصہ عجیب وغریب ہے۔

(34) برہان الملک کا اپنے وطن میں اصلی نام محمد امین تھا۔ ہندوستان پہنچ کر سعادت خاں نام رکھا۔ آخر میں برہان الملک ہو گیا۔ اتفاق تو دیکھیے کہ ان کے ہم وطن نو خاستہ ترک سپاہی کا نام بھی امین ہی تھا۔

(35) ''موافق آداب ایران'' اپنے آپ کو قید کرا دیا گیا عمدہ توجیہ ہے، تیاری کے بغیر حضرت آصف جاہ کی رائے کے خلاف طے کر دینا یہ بھی ایران ہی کا کوئی ضابطہ ہوگا۔

(36) ''ثمادالسعادت'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ صاحب خزانہ عامرہ گوید کہ نواب صفدر جنگ پاس نواب آصف جاہ ملحوظ داشتہ چندروز خلعت وزارت نہ پوشیدہ۔'' (الخ) پھر اعتراض کیا ہے ''معلوم نیست کہ صاحب خزانہ عامرہ را ایں خبر در اورنگ آباد از کجا رسید'' لیکن ''سیر المتاخرین'' کے مصنف تو دہلی ہی میں تھے۔ وہ بھی تو اس خبر کی توثیق کرتے ہیں۔

(37) کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہی شعر عبداللہ بن زبیر کو سنایا گیا۔ طبری میں تفصیل دیکھیے۔ قبرہ ایک خاص چڑیا کا نام ہے۔

معاشی انقلاب کا نتیجہ

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی تعلیمی اور دینی تاریخ کے ایوان نے بحمد اللہ حکومت کی پشتیبانیوں کو صرف قیام وبقا ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی رفعت وبلندی کے لیے بھی ہمیشہ غیر ضروری ٹھہرایا ہے۔ ہماری پست ہمتیاں آج جن حیلہ تراشیوں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈھیں، اپنی تن آسانی وکاہلی کی توجیہہ ہم جن سیاسی کمزوریوں کے ذریعے سے کریں، لیکن اسی زمانہ میں جب سب کچھ ہمارا تھا۔ لندن و برلن نہیں بلکہ دمشق و بغداد عالم سیاست کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ ابوحنیفہ امام الائمہ نے زہر کا پیالہ پی کر، دارالہجرت کے امام نے مونڈھوں سے اپنے ہاتھ اتروا کر، احمد بن حنبل نے لہو میں نہا کر، بویطی الامام تلمیذ الشافعی نے جیل میں جان دے کر، خرتنگ جیسے کوردہ گاؤں کی نظر بندی میں، امام بخاریؒ نے اپنی آخری سانس پوری کر کے، بتایا جائے کہ اس کے سوا اور کس چیز کا ثبوت پیش کیا تھا کہ اسلامی علوم کا قصر رفیع اونچا ہوگا، اونچا ہوتا چلا جائے گا۔ خواہ حکومتیں اس کی تعمیر میں کوئی حصہ لیں یا نہ لیں، نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ اسلام کی تیرہ صدیوں میں شاید ہی کوئی صدی اس تجربہ اور مشاہدہ سے تہی دامن ہوگی۔ خود ہندوستان میں بلند نظریوں کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ مختلف ابواب کے ذیل میں تھوڑا بہت ان کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اور آئندہ بھی موقعہ موقعہ سے اپنے اپنے مقام پر ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ الحرب کے لیے سب پیدا نہیں کیے جاتے، بڑے گروہ کو تو القصہ (پیالہ) ہی کی تلاش میں سرگرداں پایا گیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر سب ہی ''الحرب'' والے بن جاتے تو بڑوں کی بڑائیاں بے معنی ہو جاتیں۔

بار مسیحا نہ کشد ہر خرے

جام وسنداں کی بازیگری ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے۔

ایک دلچسپ مذاکرہ

بہرحال اکثریت کے اعمال وافعال کے متعلق یہ کلیہ تو غلط ہے کہ معاشی محرکات کے سوا ان کی تہ میں اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشی اسباب کو بھی ان میں بہت کچھ داخل ہوتا ہے۔ شیخ محدثؒ نے ''اخبار الاخیار'' میں اپنے بچپن کے ایک مذاکرہ کا ذکر فرمایا ہے جو ان کے ساتھ طلبہ کے درمیان ہوا تھا جس میں وہ خود بھی شریک

تھے، فرماتے ہیں:

''یکبار طالب العلمان نشستہ از احوال یک دیگر تفحص می نمودند کہ نیت در تحصیل علم چیست، بعضے طریق تکلف وتصنع بیہودہ می گفتند کہ مقصود ما طالب معرفت الٰہی ست، بعضے براہ سادگی وراستی رفتہ می نمودند کہ غرض تحصیل حطام دنیاویست۔'' (اخبار۔ص 312)

''ایک مرتبہ طالب العلم آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے حالات کا اندازہ لگا رہے تھے، کہ علم کے حاصل کرنے کا مقصد کیا بیان کرتے ہیں۔ بعض بطور نے تصنع وتکلف کہہ دیا تھا کہ ہمارا مقصود طلب علم سے معرفت الٰہی ہے اور بعض سادگی سے سچ بول رہے تھے کہ طلب علم سے ہمارا مقصد دنیا کی پونجی ہے۔''

شیخ دہلوی کا بچپن میں مقصد تعلیم

جن لوگوں نے اپنی تعلیم کا نصب العین ''معرفت الٰہی'' قرار دیا تھا۔ شیخ کی ان پر یہ تنقید کہ ان کا یہ دعویٰ صرف تکلف وتصنع پر مبنی تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی وہی بات تھی جس کا براہِ سادگی وراستی دوسروں نے اظہار کر دیا تھا۔ صرف اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''پرسیدند بارے تو بگو کہ در تحصیل علم چہ نیت داری ونظر ہمت وقصد برچہ می گماری۔''

''لڑکوں نے پوچھا، تم بتاؤ کہ تحصیل علم میں تمہاری کیا نیت ہے اور کیا مقصد رکھتے ہو۔''

شیخ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بھی جو بات تھی، میں نے بھی صاف صاف وہی کہہ دیا یعنی

''من اصلا ندانم کہ بر تحصیل علم معرفت الٰہی مترتب شود یا اسباب ملاہی، مرا بالفعل خود شوق این است کہ بارے بدانم کہ چندیں عقلاء وعلماء گزشتہ اند چہ گفتہ اند ودر کشف حقیقت معلومات و مسائل چہ در سفتہ اند۔''

''میں بالکل نہیں جانتا کہ تحصیل علم سے معرفت الٰہی مترتب ہوتا ہے، یا کھیل تماشے کے اسباب، مجھے اس وقت صرف شوق یہ ہے کہ معلوم کروں اتنے علماء اور عقلاء جو گذر چکے ہیں کیا بیان کر گئے اور معلومات ومسائل اور حقیقت کے کھولنے میں انہوں نے کیا موتی پروے ہیں۔''

طلبہ کا مقصد تحصیل علم سے

گویا طلبہ کی اس ساری جماعت میں صرف شیخ کا نفس عالی تھا جس کے سامنے علم کی تحصیل کا مقصد صرف علم تھا، ورنہ ان کے بیان سے جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سب ہی کے سامنے وہی ''حطام دنیا'' المعروف بہ ''روٹی'' ہی کا مسئلہ تھا۔ سادہ دلوں نے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لیا اور جنہوں نے اس اقرار سے گریز کیا اُن کے متعلق

شیخ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ان کی گفتگو صرف گفتگو تھی ''اکل'' ہی کی وہ بھی ایک ''شکل'' تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ آج ہی نہیں بلکہ عموماً بڑا طبقہ ان ہی لوگوں کا رہا ہے، جن کی تعلیمی جدوجہد کے محرکات میں ''معاشی وجہ'' کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے اور دنیا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ ندی کے کنارے جانے والے جاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ پانی لائیں گے، لیکن کبھی کبھی ''آب جو آمد وغلام بہ برد'' کا قصہ پیش آجاتا ہے۔ یہی حال علم کا ہے۔ جس نے ابھی کچھ نہیں پڑھا ہے اُس بیچارے سے کسی بلند نظری کی آپ توقع ہی کیوں قائم کرتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد بلاشبہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نے اپنے علم کو ''تن'' پر مارا اور کس نے ''علم'' کی ''زد'' جان پر لگائی۔ مولانا روم کا شعر:

علم را ''برتن'' زنی مارے شود
علم را ''برجاں'' زنی یارے شود

الحاکم الصدر الشہید کا مقولہ

ظاہر ہے کہ علم کے استعمال کی ان دونوں غلط اور صحیح صورتوں کا موقع تو حصول علم کے بعد ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ الحاکم الصدر الشہید (1) کا جب حکومت سے کسی مسئلہ میں مقابلہ ہوگیا۔ بادشاہ وقت نے ان کو قتل کرنے کا اور انہوں نے قتل ہوجانے کا فیصلہ فرمایا تو اس وقت ان کی زبان پر یہ جاری تھا:

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا للہ۔ (مفتاح السعادت۔ ص 14)

''یعنی ہم نے علم کو خدا کے لیے نہیں سیکھا تھا، لیکن خود علم نے انکار کیا اور وہ خدا ہی کے لیے ہوکر رہا۔''

پس یہ ہوسکتا ہے کہ کسی کا ''علم'' غیر خدا کے لیے ہونے سے انکار کر جائے، لیکن پہلے علم حاصل تو ہولے۔

معقولات کے زور کی وجہ

بہر حال قصہ یہ ہو رہا تھا کہ معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہمارے نصاب میں جو ہوئی خصوصاً ان علاقوں میں جنہیں پورب کہتے ہیں، اس کے اسباب کیا تھے؟ اسی کے جواب میں آپ کے سامنے اس تاریخی حادثہ کو پیش کیا گیا جس کے شکار مشرقی ہند کے ارباب فضل وکمال ہوئے۔ ابوالمنصور صفدر جنگ والی اودھ کی وزارت کے بعد جہاں کہیں وظائف وجاگیروں کا تسمہ بھی لگا ہوا تھا، اُسے بھی کاٹ دیا گیا۔ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان بیچاروں پر کیا گذری ہوگی۔

لارڈ میکالے اور نصاب تعلیم

اور ان کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں جب مشرق اور مشرق کے سارے علمی مجاہدات کو یورپ کی کتابوں کی الماری کے برابر ماننے سے بھی انکار کیا گیا، اسی بنیاد پر قدیم تعلیم کا سارا نظام اچانک بدل

دیا گیا—اور جاہلوں کو تہذیب وتمدن کی روشنی میں لانے کے لیے کلیات وجوامع کے جال ملک کے طول وعرض میں پھیلا دیئے گئے، اس کے بعد:

واذارأو اتجارة اولهوا انفضوا اليها و تركوك قائماً

''اور جب دیکھا انہوں نے تجارت یا کھیل کود کو تو پل پڑے اسی کی طرف اور چھوڑ دیا تجھے (اے پیغمبر) کھڑا کا کھڑا۔''

کا جو تماشا ہمارے سامنے ہونے لگا اور ہو رہا ہے اس کے دیکھنے والوں کے لیے ان گذرے ہوئے بزرگوں کے حال کا اندازہ لگانا کیا دشوار ہے۔ اِدھر تعلیم کا نظام بدلا اور معمولی کشمکش کے بعد بڑے بڑے علماء، فضلاء، مشائخ اور صوفیاء کے گھرانوں کی اولاد کالجوں میں جا کر بھر گئی۔ محمد رسول اللہؐ کے قرآن اور ان کی حدیث کو علم وفضل کے ان ہی خانوادوں نے صرف اس لیے تنہا چھوڑ دیا کہ مسلمانوں کے پس ماندہ غریب خاندان کے بچے ان کو پڑھ پڑھا لیں گے اور یہ تو میں کہتا ہوں ورنہ سادات کرام وشیوخ عظام کے ان تعلیم یافتہ صاحبزادوں کے سامنے تو یہ بھی نہیں ہے۔ عموماً قوم کی ایک بڑی تعداد ان کے نزدیک عربی مدارس کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر قومی توانائیوں کے عظیم ذخیرہ کو برباد کر رہی ہے۔

معقولات کے فروغ میں معاشی تنگی کا دخل

پس جو کچھ آج دیکھا جا رہا ہے اگر مولانا غلام علی آزادؒ کے سامنے دو سو سال پہلے بھی یہی صورت پیش آ گئی کہ:

''کار شرفا دنجابہ پریشانی کشید واضطرار معاش مردم آنجارا از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپہ گری انداخت ورواج تدریس وتحصیل باں درجہ نہ ماند ومدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم وفضل بود یک قلم خراب افتاد وانجمنہاے ارباب کمال بیشتر برہم خورد انا للہ وانا الیہ راجعون.'' (ص222)

''شریفوں کا کام پریشانی کے نذر ہو گیا، اور معاش کی پریشانی نے ان لوگوں کو کسب علم سے محروم رکھا، اور سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ درس تدریس اور طلب علم کا رواج پہلے جیسا نہ رہا، اور مدارس جو پرانے زمانہ سے علم وفضل کے گہوارے تھے، ویران ہو گئے، اور ارباب کمال کی مجلسیں تباہ وبرباد ہو گئیں۔''

تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ''معاش کا اضطرار'' خواص کے لیے نہ سہی لیکن عوام کے لیے یقیناً اضطرار کی بدترین صورت ہے، خصوصاً کھاتے پیتے، خوشحال خوش باش گھرانوں کے لیے یہ مصیبت دوہری مصیبت بن جاتی ہے۔ جس زندگی کے پشتہا پشت سے آبائی رسم ورواج کے زیر اثر وہ عادی ہوتے ہیں۔ اچانک اس سے جدا ہو جانا ان کے لیے گویا موت ہوتی ہے۔ انگریزی تعلیم کے رواج کے بعد بجائے غرباء کے مسلمانوں کے متوسط طبقات کا رجحان جو اس تعلیم کی طرف زیادہ بڑھا اس کی یہی وجہ تھی۔ عربی مدارس کی تعلیم اس زندگی کو واپس نہیں دے سکتی تھی جس کے وہ متلاشی تھے۔

ملی یا نہیں ملی، لیکن اسی زندگی کی توقع میں مسلمانوں کا یہ طبقہ کالجوں میں پل پڑا۔ اس وقت امت کے وہ غرباء کام آ گئے، جن کے لیے عربی مدارس کی تعلیم آج معاشی اور جاہی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ کم از کم موجودہ معاشی سطح سے تو یہ تعلیم ان کو اوپر کھینچ لیتی ہے۔

عوام و خواص کی حکومت سے وابستگی

خیر میں اس انقلاب کا ذکر کر رہا تھا، جو مولانا غلام علی کے سامنے ''تعلیمی حلقہ'' میں رونما ہوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اضطرار نے لوگوں کو فوج کی طرف دھکیل دیا کہ اس زمانہ میں خصوصاً ملک کے چپہ چپہ پر مرکزی حکومت کی کمزوری سے نفع اٹھا کر حکومت کے دعویداروں کا ایک غول اُبل پڑا تھا اور ہر ایک دوسرے کو مغلوب کر کے چاہتا تھا کہ ملک پر وہی قابض و متصرف ہو جائے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ان مدعیوں کے فوجی مراکز قائم تھے۔ لوگ اسی میں جا جا کر اسی طرح بھرتی ہونے لگے جس طرح آج اسکولوں اور کالجوں میں بھرے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اُس زمانہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خواہ کسی طبقہ کا آدمی ہو، لیکن فن سپاہ گری اور اس کے لوازم سے گونہ واقفیت تقریباً ہر ایک کے لیے ضروری تھا۔ آج علم و عرفان کے لیے جسمانی ضعف اور کمزوری سرمایۂ افتخار ہے، لیکن یہ عہد مرگ کا قصہ ہے ورنہ ہم میں جب جان باقی تھی، عالم ہو یا صوفی قلم کے ساتھ تلوار کا دھنی ہونا بھی قریب قریب اس کے لیے ضروری تھا۔(2)

ایک مکالمہ

''امیر الروایات'' میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور اس زمانہ کے یک شخص کا مکالمہ درج ہے۔ شاہ صاحب نے اُس سے پوچھا: ''آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے؟'' اُس نے کہا ہاں، شاہ صاحب نے پوچھا کہ کچھ فارسی بھی پڑھی ہے، بولا ہاں، پوچھا گیا کچھ عربی بھی پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ ''جی ہاں میر قطبی تک پڑھی ہے۔''

میر قطبی تک پڑھنے والے طالب العلم سے آگے دریافت کیا جاتا ہے۔ گھوڑے کی سواری بھی سیکھی ہے؟ اُس نے کہا۔ ہاں، پھر پوچھا کہ فنون سپہ گری بھی سیکھے ہیں، اس نے کہا: جی ہاں پھکیتی بکیتی اور تیر اندازی وغیرہ سب سیکھے ہیں۔ (امیر الروایات)

یہی وجہ ہے کہ جب علم و فضل کی راہوں سے معاش کے جو ذرائع مہیا ہوتے تھے وہ مسدود ہو گئے تو لوگوں کے لیے پیشہ سپہ گری کا اختیار کرنا نسبتاً آسان معلوم ہوا۔

علم و فن کا انحطاط

لیکن ظاہر ہے کہ جن کے یہاں پشتہا پشت سے پڑھنے پڑھانے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہے۔ ان سارے

خاندانوں کا بالکلیہ علم سے ٹوٹ کر ایک ایسے پیشہ کو اختیار کر لینا علم سے جس کا دور کا بھی تعلق نہیں، آسان نہ تھا۔ مولانا غلام علی کے الفاظ ''رواج تدریس وتحصیل باں درجہ نہ ماند'' سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ تدریس وتحصیل کی گرم بازاری جس رنگ میں پہلے تھی، وہ باقی نہ رہی، بلکہ آج بھی جو حال ہے کہ گو اکثریت انگریزی تعلیم کی طرف جھک پڑی ہے۔ لیکن غرباءِ مسلمین کے عام طبقہ کے سوا اب بھی پرانے خاندانوں کے علماء ومشائخ کسی نہ کسی طرح پرانی تعلیم کی گاڑی گھسیٹے لیے جارہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی تھی خود مولانا آزاد نے بھی غم کی اس روئداد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

''باوجود ایں خرابیہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجاست (یعنی در پورب است) در قلمروئے ہندوستان ہیچ جا نیست۔'' (ص 223)

''ان ساری تباہیوں کے باوجود علم کا رواج بالخصوص معقولات کا جس طرح وہاں پورب میں ہے، پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ گو بڑی تعداد تو اس حادثہ کے بعد ''پیشہ سپہ گری'' میں مبتلا ہو گئی، لیکن پھر بھی ایک طبقہ علم والوں کا موجود تھا جو معقولات ہی کے رنگ میں سہی، لیکن اپنے آبائی شیوۂ تعلیم وتعلم درس وتدریس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

واقعات جو بکھرے ہوئے تھے ایک خاص سلسلہ کے ساتھ وہ آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ غالباً نتیجہ تک پہنچنا اس کے بعد دشوار نہ ہوگا۔ بہر حال میں نتیجہ تک جن مقدمات کی راہنمائی میں پہنچا ہوں۔ گذشتہ بالا تاریخی مواد سے ان مقدمات کو مرتب کر کے خود ہی پیش کیے دیتا ہوں۔ یاد ہوگا کہ تلبن (ملتان) کے مولویوں شیخ عبداللہ وعزیزاللہ کے بعد معقولات اور اس فن کی کتابوں کی دوسری کھیپ ہمارے ملک میں میر فتح اللہ شیرازی کے ہاتھوں پہنچی۔ مولانا غلام علی کا بیان میں نے نقل کیا تھا کہ میر فتح اللہ کے بعد ہندوستان میں ''معقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔''

معقولی رنگ

اس وقت میں صرف اس اجمالی بیان کا ذکر کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر اب بتانا چاہتا ہوں کہ ''رواج دیگر'' کے تفصیلی اسباب کیا تھے؟ اگرچہ فتح اللہ شیرازی کے متعلق ملا عبدالقادر نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں یہ عجیب خصوصیت لکھی ہے۔ یعنی ایک طرف تو ان کا یہ حال تھا کہ امیروں کے گھروں میں خود جا جا کر بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، لیکن دوسری طرف:

''میر موصوف اگرچہ در مجالس بغایت خلیق ومتواضع نیک نفس بود لیکن نعوذ باللہ از اں ساعت کہ بدرس اشتغال داشتے بشاگرداں غیر از فحش والفاظ رکیکہ وہجو بر زبانش نہ رفتے۔'' (ص 55)

''میر موصوف اگرچہ مجلسوں میں نہایت خلیق متواضع اور نیک نفس ہوتے مگر خدا کی پناہ جونہی درس تدریس کے لیے بیٹھتے، شاگردوں سے سوائے فحش کلامی اور گرے ہوئے الفاظ اور ہجو

کے کوئی بات نہ کرتے۔"

خیر یہاں تک تو شاید ان لوگوں کو تعجب نہ ہو، جو پرانی طرز تعلیم کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں۔ بعض اہل کمال سے کمال کے نشہ میں اس قسم کی باتیں سرزد ہو جاتی تھیں۔ خصوصاً معقولات وغیرہ جیسے علوم کی کتابوں کے پڑھانے والوں میں یہ بات کبھی کبھی پائی گئی ہے کہ جو کتاب پڑھا رہے ہیں۔ کچھ اس کے مصنف کے نام کچھ شارح اور محشی کے نام اور کچھ اپنے ہمعصر اساتذہ کے نام جن کا نام اس فن میں مشہور ہو، صلوٰتیں سنایا کرتے تھے۔ مقصود اس سے خود اپنے فضل وکمال کا اظہار ہوتا تھا(3)۔ ملا عبدالقادر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ میر فتح اللہ کی اس عادت بد کا نتیجہ یہ ہوا کہ "ازیں جہت کم مردم بدرس اومی رفتند" مگر اس کے بعد ملا صاحب کا یہ بیان کہ "شاگردے رشید ہم از و برنخاستہ" یہ میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ جس کی وجہ میں آئندہ بیان کروں گا، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میر کے پاس عام طلبہ اس لیے کم جاتے ہوں کہ ان کی صلواتوں میں اضاعت وقت کا ان کو اندیشہ ہوتا ہوگا۔(4)

بہر حال اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ "کم مردم بدرس اومی رفتند" تو پھر مولانا آزاد کا یہ بیان کہ ہندوستان میں معقولات کا رواج دیگر میر فتح اللہ کی توجہ وتعلیم کا رہین منت ہے، قابل غور ہو جاتا ہے۔

مہمات حکومت کی ذمہ داری کے ساتھ درس وتدریس

واقعہ یہ ہے کہ میر فتح اللہ سے حکومت کے جن مہمات کا تعلق تھا۔ یوں بھی عام درس کی توقع ان سے مشکل ہے۔ وہ تو کہیے زمانہ ہی دوسرا تھا کہ لوگ ججی بھی کرتے تھے اور درس بھی دیتے تھے۔ وزارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور بچوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ ورنہ اس زمانہ میں کہہ چکا ہوں کہ میر فتح اللہ تو خیر بڑے آدمی تھے۔ حکومت کے کسی معمولی اور ادنیٰ عہدہ داروں سے تدریسی وتعلیمی مشاغل کی بھلا کوئی امید کرسکتا ہے۔ اس لیے اب خواہ ان کی بدزبانیوں کا نتیجہ ہو یا سرکاری مہمات میں انہماک ہو یا کوئی اور سبب ہو جس کی وجہ سے عام لوگوں نے اگر ان سے کم نفع اٹھایا ہو تو یہ محل تعجب نہیں ہے۔

امیر زادوں کی تعلیم کا اہتمام

لیکن میر صاحب کو اپنے علمی مذاق کے عام کرنے میں جس راہ سے کامیابیاں ہوئیں، اس کا سب سے بڑا اہم راز ان کی وہ خاص ترکیب ہے جس کا تذکرہ ملا عبدالقادر بداؤنی ہی کے حوالہ سے گذر چکا۔ یاد ہوگا ملا صاحب نے خود اپنی چشم دید گواہی میر فتح اللہ کے متعلق یہ دی تھی "بہ تعلیم اطفال امراء مقید بود و ہر روز بمنازل رفتہ۔" دربار کے امیروں کے بچوں کو وہ پابندی کے ساتھ باضابطہ شکل میں پڑھایا کرتے تھے اور اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو بجائے عوام کے اس ملک کے خواص اور امیر زادوں میں انہوں نے پھیلا دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات پر جہاں تک میرے معلومات کا تعلق ہے، فارسی ادب کی نظم ونثر کا زیادہ اثر تھا۔ ان کا علمی مذاق دواوین وکلیات اور فارسی کے محاضرات وقصص وحکایات تاریخی روایات کے مطالعہ تک محدود تھا۔ ان کے درباروں میں علمی حیثیت سے اب تک اسی کا چرچا تھا۔ لیکن میر فتح اللہ نے ادبی

مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی ان امیروں کو لگا دیا اور قاعدہ ہے کہ کسی طبقہ میں ہو۔ جب کسی چیز کا رواج ہو جاتا ہے تو پھر قانون توارث کے زیر اثر ایک قرن سے دوسرے قرن، دوسرے سے تیسرے قرن تک الا ماشاء اللہ وہ بات منتقل ہوتی چلی آتی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کو معقولات کا چاشنی گیر تو میر فتح اللہ نے اکبر کے عہد میں بنایا، لیکن بات وہاں سے منتقل ہوئی، چلی، چلتی آتی، تا آنکہ یہ واقعہ ہے کہ حال حال میں قدیم امیروں کا دور جب منقرض ہوا ہے، اس وقت تک یہ مذاق ان میں پایا جاتا ہے۔

ایک علمی مناظرہ ایک نواب کے اہتمام میں

رامپور کے موجودہ فرماں روا کے والد نواب حامد علی خاں بہادر اپنے اندر بہت سی قدیم امیرانہ خصوصیتوں کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ شاید بیس بائیس سال کی مدت گذری ہوگی۔ انگریزیت کے اس عالم شباب میں حامد علی خاں کے دربار میں مناظرہ کی ایک مجلس گرم ہوئی اور بحث کا موضوع کیا تھا؟ سن کر تعجب ہوگا ''جسم کے اتصال جوہری'' کا مسئلہ جس سے عوام تو خیر اس زمانہ کے شاید اکثر مولوی بھی ناواقف ہوں گے کہ یہ آخر ہے کیا بلا، لیکن ہندی امیروں میں جو بات نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی، اسی کا اثر تھا کہ نواب مرحوم نے باضابطہ اپنے سامنے اس مسئلہ پر مولویوں کی دو متخالف جماعتوں میں مناظرہ کرایا۔ ایک طرف بہار کے مشہور منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری تھے اور فریق ثانی کے سرگروہ ہمارے الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکیؒ تھے۔ بحث کا نتیجہ کیا ہوا اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ مہینوں دونوں طرف سے اشتہارات اور پوسٹروں کا سلسلہ شائع ہوتا رہا، جس میں ہر فریق اپنے غلبہ کا اعلان کرتا تھا۔ مولانا برکات احمد کے متعدد تلامذہ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالے لکھے۔

منطقی مولویوں کا قیام نواب کے دربار میں

اسی معقولی مذاق کا اثر تھا کہ حامد علی خاں ہمیشہ کسی منطقی مولوی کو اپنے یہاں اس لیے ملازم رکھتے تھے کہ جب کبھی معقولاتی ذوق کا غلبہ ہو تو اس مولوی کی باتوں سے وہ تسکین حاصل کریں۔ مدت تک امبیٹھے کے منطقی عالم مولوی عبدالعزیز صاحب مرحوم کو غالباً دو سو روپے ماہوار صرف اسی کام کے لیے وہ دیتے رہے۔ گویا دربار کے لوازم میں جہاں شاعروں کا وجود ضروری تھا، جہاں تک میرا خیال ہے، میر فتح اللہ کی اس ترکیب کے بعد ایک اور عنصر (یعنی معقولیوں) کا بھی متوسل دربار ہونا امارت کی ایک شان بن گئی۔ کلب علی خاں مرحوم نے بھی ہمیشہ اسی نقطۂ نظر کے پیش نظر مولانا عبدالحق خیر آبادی کو بڑے اعزاز و احترام سے رکھا۔

غیر مسلم راجاؤں کے یہاں منطقی مولوی

اور یہ تو پچھلے زمانہ کی باتیں ہیں اُس وقت تک کی جب رسی جل چکی تھی۔ صرف اس کی اینٹھن باقی تھی۔ ورنہ

کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے مشکل ہی سے کسی مسلمان امیر ہی نہیں اس زمانہ کے ہندو راجہ کا دربار بھی معقولی مولویوں سے خالی نہ نظر آئے گا۔ مہاراجہ الور، پٹیالہ، جے پور، کشمیر سب ہی کے یہاں شعراء وغیرہ کے ساتھ ایک مدان مولویوں کی بھی تھی، اور جب خالص ہندی امیروں پر یہ اثر مرتب ہوا تو امیروں کا جو خاندان نسلاً ایران سے تعلق رکھتا تھا مثلاً یہی برہان الملک اور صفدر جنگ بانیانِ حکومت اودھ کہ یہ ایران سے ہندوستان اس وقت آئے ہیں جب ایران میں مُلا باقر داماد، صدرائے شیراز، غیاث الحکماء، غیاث منصور وغیرہ کی عقلیت کا آفتاب سمت الراس پر چمک رہا تھا۔ سارا ایران بلکہ ایران کے ساتھ ہندوستان بھی اس زمانہ میں ان لوگوں کی علمی عظمت کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔

صفدر جنگ شیعی کے ہاتھوں علمی خانوادوں کی تباہی

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب صفدر جنگ کے عہد اقتدار میں علم وفضل کے پرانے خانوادوں کو اچانک آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا۔ رزق و معاش کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے تو ان میں جو سپہ گری سے مناسبت رکھتے تھے وہ تو خیر بقول مولانا آزاد فوجوں میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن جو کسی وجہ سے بھی علم وفضل کے دامن سے لپٹے رہے۔ ان کے لیے معاشی مشکلات کے حل کی راہ اس کے سوا اور کیا باقی رہ گئی تھی کہ اہلِ ثروت و نعمت کا قرب ان ذرائع سے تلاش کیا جائے جن سے وہ خوش ہوتے تھے۔ نظائر و اشباہ مثالیں اور نمونے ان کے سامنے تھے۔ یہی ابوالمنصور صفدر جنگ جن کے گردش قلم نے اودھ، الہ آباد اور اس کے متعلقات کے علمی گھرانوں کو اجاڑ دیا۔ ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہدایہ اور بیضاوی وغیرہ پڑھنے پڑھانے والے مولویوں پر رزق کا دروازہ تیزی سے بند کر رہے ہیں اور دوسری طرف مشہور معقولی مولوی حمد اللہ سندیلوی جن کی شرح سلم تصدیقات، اس وقت تک ہمارے نصاب میں ''حمد اللہ'' ہی کے نام سے شریک ہے۔ ان کے ساتھ صفدر جنگ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی صاحب ''تذکرہ علماء ہند'' اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''نواب ابوالمنصور خاں صوبہ دار اودھ بودے دستار بدل برادرانہ داشت۔''

''نواب ابوالمنصور خاں جو صوبہ اودھ کے صوبہ دار تھے ''دستار بدل برادرانہ'' کا تعلق رکھتے تھے۔''

معقولی مولوی کی قدر افزائی

آپ سمجھے اس کا مطلب، دستور تھا کہ جو واقع میں بھائی نہ ہوتا تھا، اس کو کوئی بھائی بنانا چاہتا تو اپنی پگڑی یا ٹوپی اس کے سر پر اور اس کی پگڑی یا ٹوپی اپنے سر پر رکھتا۔ اس کا نام ''دستار بدل برادرانہ'' تھا۔ اخوت کا جو تعلق اس رسم کے بعد قائم ہوتا تھا، وہ رشتہ کے تعلقات سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ آخر دم تک لوگوں کو اس کا لحاظ و پاس کرنا پڑتا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے، کہ کہاں علم و کمال کی وہ بے قدری کی کہ بیک گردش قلم خاندان تباہ و برباد کر دیئے گئے اور پھر وہی علم جب

''معقولیت'' کے رنگ میں پیش ہوا تو اس کی یہ قدردانی کہ جملۃ الملک وزیر الملک المغلیہ اپنی دستار ایک معمولی قصباتی مولوی کے سر پر رکھ کر ان کو اپنا بھائی بناتا ہے۔ واللہ اعلم صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولوی حمد اللہ کس اعتقاد کے آدمی تھے۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے زیادہ تر اپنے اسی خاص فن معقولات ہی کے متعلق لکھا ہے۔ حمد اللہ شرح تصدیقات سلم کے علاوہ ''حاشیہ بر شمس بازغہ و حاشیہ بر صدرا'' (تذکرہ۔ ص 56) ان کی مشہور تصنیفات ہیں، اس لیے مذہبی اعتقاد کا پتہ چلنا آسان نہیں ہے۔ نسلاً تو یہ صدیقی ہیں اور شاگرد بھی یہ ایک سُنی عالم ملا نظام الدین سہالی کے ہیں۔

ملا حمد اللہ کا مذہب

لیکن حمد اللہ میں میر باقر داماد کے متعلق عموماً ''خیر اللحقہ بالمبرۃ'' کا خطاب التزاماً چونکہ استعمال کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فرقہ امامیہ کے عالم بہاؤالدین عاملی کی ''کتاب زبدۃ لاصول'' (جو غالباً شیعی اصول فقہ کی کتاب ہے) اس کی بھی شرح لکھی ہے۔ اس لیے لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس خیال میں کچھ واقعہ بھی ہو۔ لیکن سچ پوچھیے تو صفدر جنگ کی نگاہ میں ان کی جو غیر معمولی وقعت تھی۔ وہ دراصل ان کی معقولیت ہی تھی۔ لکھا ہے کہ اسی نواب نے دلّی دربار سے ''فضل اللہ خاں'' کا خطاب بھی دلوا دیا تھا اور اسی میں یہ بھی ہے ''چند دیہ از پیشگاہ بادشاہ وقت معاف یافتہ۔'' (ص 56)

معقولات کا اثر مزاجوں پر

اور مان بھی لیا جائے کہ ملا حمد اللہ سے صفدر جنگ کے غیر معمولی تعلقات کی وجہ سے ان کا تشیع اور تبدیلی مذہب ہو، لیکن جن علماء کا ضمیر محض معاشی فراغبالی کے لیے تبدیل مذہب پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ خود ہی سوچیے کہ حکومت اودھ کی ان دراز دستیوں کے بعد ان کے لیے چارہ کار ہی کیا رہ گیا تھا۔ خود ان کے مذہب کی فقہ، ان کی حدیث ان کی تفسیر کی کوئی قیمت صفدر جنگ کی شیعی دربار میں نہ تھی۔ اب اس سے یا اس کے شیعی امراء سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ان مولویوں کے پاس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ جس چیز کو امیروں کا یہ گروہ علم سمجھتا تھا اسی میں کمال پیدا کر کے اپنے آپ کو نمایاں کریں۔ تجربہ بتا رہا تھا کہ جن لوگوں نے اپنا مذہب نہیں بھی بدلا تھا لیکن معقولات میں دستگاہ پیدا کر کے شہرت حاصل کی تھی۔ اودھ کے اس دربار میں ان کی قدردانی ہوتی تھی۔

مذہبی علوم کی طرف سے بے توجہی

فرنگی محل کے قریب قریب دو ہمنام مولوی جن میں ایک تو مولوی ظہور الحق اور دوسرے مولوی ظہور اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں آخر الذکر صاحب کے تصنیفات کی فہرست حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے۔

''تعلیقات حاشیہ زاہدیہ بہ شرح تہذیب المنطق و حاشیہ بر دوحہ شمس بازغہ۔''

یعنی کل کی کل معقولاتی کتابوں سے ان کے حواشی کا تعلق ہے۔ صاحب ''تذکرہ'' نے لکھا ہے کہ ''درعصر خود نامے برآورد'' لیکن ظاہر ہے کہ یہ نام ان کا ان ہی عقلی فنون میں روشن ہوا ہوگا۔ لکھا ہے کہ ''درعہد یمین الملک سعادت علی خاں لکھنؤ بہ عہدہ افتا مباہی گشت۔'' (ص100) مگر ان کے دوسرے ہمعصر مولوی ظہور الحق بیچارے بھی اسی فرنگی محل کے علماء میں ہیں لیکن:

''قرآن مجید حفظ کردہ اشتغال بقرأت آں وتفسیر بینی ومطالعہ کتب حدیث داشت وتوجہ بہ معقولات ہرگز نمی کرد۔''

''قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد قرأت اور تفسیر بینی اور مطالعہ کتب حدیث میں لگ گئے، معقولات پر کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔''

اس جرم کی سزا ان کو یہ ملی ''تمام عمر بہ تنگی بسر کرد(5)۔'' (ص99)

اس سلسلہ میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی کا ایک دلچسپ قصہ ہے جنہوں نے علماء فرنگی کے حالات پر ایک مختصر سا رسالہ ''اغصان اربعہ'' نامی لکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اودھ کے شیعی دربار میں مولوی سدّن جو امامیہ فرقہ کے عالم تھے ان کا بڑا رسوخ تھا اور ان کے بڑے بھائی کلکتہ میں شاہان اودھ کی طرف سے سفیر تھے۔ لارڈ ولزلی جب کلکتہ سے لکھنؤ آیا تو اپنے ساتھ ان سفیر صاحب کو بھی لایا۔ مُلا ولی اللہ لکھتے ہیں کہ میں اس شخص کے علم کی شہرت سن کر ملنے گیا۔ اندر خیمے کے خبر پاتے ہی مجھے بلا لیا۔ میں نے دیکھا کہ کھڑے کھڑے استنجا خشک کر رہے ہیں اور اسی ہاتھ جس میں استنجے کا ڈھیلہ تھا مصافحہ کے لیے بڑھایا۔ اس کی اس بدتہذیبی کو دیکھ کر میں نے مصافحہ سے انکار کر دیا۔ بہرحال اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ پہلا فقرہ اس زبان سے جو نکلا وہ یہ تھا کہ کیوں مولوی صاحب آپ لوگوں کے استاذ الاساتذہ ملا حسن نے تصدیق کو ادراک کے ذیل میں کیسے داخل کیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت تصدیق تو ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو ادراک کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مُلا ولی اللہ نے پھر اس کا جواب دیا۔ اس نے پھر اعتراض کیا۔ یوں یہ سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ میری غرض اس قصہ کے نقل سے یہ دکھانا ہے کہ اس زمانہ کے امراء مولویوں سے سوال بھی کرتے تھے تو اسی قسم کے جس کی مثال سفیر دربار اودھ کا یہ سوال ہے۔ (اغصان۔ ص65)

منطق وفلسفہ کے عروج کی وجہ

بہرحال علماء اہلِ سنت کی ان خانہ بربادیوں میں خواہ کسی چیز کو بھی دخل ہو، لیکن یہ واقعہ خواہ کسی وجہ سے جب ہو ہی چکا تو ان لوگوں کے لیے جو بہرحال اپنے خاندانی علمی وقار کو باقی رکھنا چاہتے تھے، ان کے لیے چارہ کار ہی اس کے سوا کیا تھا کہ ان علوم میں کمال پیدا کریں۔ جن کی موجودہ حکومت قدر دان تھی اور اسی کو میں ایک بڑا مؤثر سبب اس نصابی انقلاب کا قرار دیتا ہوں جو ہندوستان میں عموماً اور پورب میں خصوصاً پیش آیا۔ ماسوا اس کے ایک چیز اور بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر اور مستحق توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے درباری امراء کے بچوں میں اپنے علمی مذاق کو عام کر کے جہاں ''معقولیت'' کے غلبہ کی راہ کھولی تھی، وہیں ایک واقعہ اور ہے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے تو لکھا ہے کہ میر فتح اللہ اپنی

زبان کی کرختگی کی وجہ سے کسی شاگرد رشید کے پیدا کرنے میں ناکام ہوئے۔ مگر میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ کلیتہً ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ ''تذکرۂ علماء ہند'' میں اپنے عہد کے مشہور مرکزی مدرس مولانا عبدالسلام لاہوری کو'' شاگرد میر فتح اللہ شیرازی'' کے الفاظ سے روشناس کرایا گیا۔ مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا عبدالسلام کے متعلق '' معدن عقلیات ونقلیات بود'' لکھ کر ان کے اساتذہ میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالسلام کے ممتاز استادوں میں میر فتح اللہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے اور یہ کہ وہ براہِ راست میر فتح اللہ ہی کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ مُلا عبدالسلام کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:

> ''قریب شصت سال درس گفت و جمع کثیر را بہ پایۂ فضیلت رسانید ..... نود سال عمر یافت۔'' (مآثر۔ص236)
>
> ''تقریباً ساٹھ سال درس وتدریس کا کام کیا اور بہتوں کو فاضل بنایا۔ نوے سال عمر پائی۔''

مُلا عبدالسلام

میرے نزدیک تو میر فتح اللہ کے صرف یہی ایک شاگرد دوسروں کے بیسیوں شاگردوں کے مقابلہ میں بالکل کافی ہیں۔ ساٹھ ساٹھ سال تک مسلسل درس دینا آسان نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ''جمع کثیر'' ان کے علم سے مستفید ہوا۔ اب سنیے کہ اس جمع کثیر میں جس شخص نے ملا عبدالسلام کے شاگردوں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان کا نام بھی عبدالسلام ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ استاد عبدالسلام لاہوری ہیں اور شاگرد عبدالسلام اودھ کے مشہور مردم قصبہ دیوہ کے تھے۔ گو آخر عمر ان کی بھی لاہور ہی میں گذری۔ اب تو خیر ان بیچاروں کا کون تذکرہ کرتا ہے۔ لیکن درس کے قدیم حلقوں میں مُلا عبدالسلام دیوی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ توضیح وتلویح اور بیضاوی پر ان کے معرکتہ الآرا حواشی ہیں۔ خصوصاً تلویح کا حاشیہ تو سمجھا جاتا ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شاہجہاں بادشاہ کی طرف سے عساکر قاہرہ شاہی کے یہ مدتوں مفتی کے عہدے پر سرفراز رہے۔ بادشاہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔

درس نظامیہ کے بانی کا استاذی سلسلہ

''تذکرۂ علماء ہند'' کے مصنف نے ''درس نظامیہ'' کے بانی اوّل مُلا نظام الدین (فرنگی محل) کے والد ملا قطب الدین سہالی(6) کے ترجمہ میں ان الفاظ سے ان کا تعارف کراتے ہوئے۔

> ''ملا قطب الدین سہالی صاحب ترجمہ امام الاساتذہ ومقدم الجہانذہ معدن علوم عقلیہ و مخزن فنون نقلیہ بود۔''
>
> ''مُلا قطب الدین سہالی (صاحب ترجمہ) اساتذہ کے امام، اور علوم عقلیہ کے کان اور فنون نقیلہ کے مخزن تھے۔''

آگے یہ لکھا ہے کہ:

''اخذ علوم از مُلا دانیال چوراسی شاگرد ملا عبدالسلام ساکن دیوہ۔'' (ص 168)

''انہوں نے مُلا دانیال چوراسی سے علم حاصل کیا، جو مُلا عبدالسلام ساکن دیوہ کے شاگرد تھے۔''

یہی بیان مولانا غلام علی آزاد کا بھی ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ آج جس نصاب کا نام نصاب نظامیہ ہے اور اسی کے متعلق معقولاتی کتابوں کی کثرت کی عام شکایت ہے۔ اس نصاب کے بانی کا تعلیمی سلسلہ دراصل مُلا فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔ کیونکہ مُلا نظام الدین صاحب نصاب نظامیہ کو خود اپنے والد مُلا قطب الدین سہالی سے استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہیے تھا نہ مل سکا۔

''تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت والدِ ماجد خود از حافظ امان اللہ بناری و مولوی قطب الدین شمس آبادی نمودہ۔'' (ص 241)

''والدِ ماجد کی شہادت کے بعد علوم متعارفہ کی تحصیل حافظ امان اللہ بناری اور مولوی قطب الدین شمس آبادی سے کی۔''

اور بناری و شمس آبادی یہ دونوں حضرات ان کے والد مُلا قطب الدین سہالی کے فیض یافتوں اور شاگردوں میں ہیں۔ گویا ''علمی شجرہ'' اگر بنایا جائے تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے:

میر فتح اللہ شیرازی

مُلا عبدالسلام لاہوری

عبدالسلام دیوی

مُلا دانیال چوراسی

قطب الدین سہالی

ملا قطب الدین شمس آبادی　　　　امان اللہ بناری

ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ

جس کا یہی مطلب ہوا کہ میر فتح اللہ کا تعلیمی اثر صرف امیر زادوں تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ ہندوستان کے عام علمی خانوادے بھی ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے۔ خصوصاً درس نظامیہ کے نصاب کی ترتیب جس ذات گرامی کی طرف منسوب ہے چند واسطوں سے میر فتح اللہ شیرازی پر ان کی تعلیم کا سر رشتہ بھی منتہی ہوتا ہے۔

درس نظامیہ میں معقولی کتابوں کی اہمیت کی وجہ

اب اس زمانہ میں اودھ کی حکومت کا نجباء و شرفاء کے ساتھ جو برتاؤ ہوا۔ اس کو اور ہندی امیر زادوں کو میر فتح اللہ

کی تعلیم نے عقلیت کا جو چسکا لگا دیا۔ اس کو پھر خود ہندوستان کا نظامیہ نصاب جس نے مرتب کیا۔ میر فتح اللہ سے ان کا جو تعلیمی رشتہ اور تعلق ہے۔ اس کو ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا جواب بآسانی مل جاتا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے تعلیمی نصاب پر معقولی کتابوں کا وزن زیادہ کیوں پڑ گیا۔ اس واقعہ کی تاریخی تحلیل وتجزیہ کے بعد جو صورت پیدا ہوتی تھی وہ تو یہ ہے۔ آگے اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جن وجوہ سے متاثر ہو کر اپنے نصاب میں اس تغیر کو جو قبول کر لیا، یہ کہاں تک درست تھا۔

تعلیم دو حصوں میں

بات یہ ہے کہ واقعہ کی جو نوعیت تھی، تاریخی شہادتوں کی روشنی میں وہ آپ کے سامنے گذر چکی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت نصاب کی جو کچھ بھی ہو گئی تھی۔ وہ زمانہ کے انقلاب کا نتیجہ تھا جس سے ملک گذر رہا تھا۔ قریب قریب وہی صورت اس وقت بھی پیش آ گئی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آج تو تعلیم کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام دینی تعلیم اور دوسرے کا دنیاوی علوم نام رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں۔ دونوں کا نصاب جدا جدا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصاب کے پڑھنے والے اس نصاب اور اس کے آثار ونتائج سے قطعاً بیگانہ ہیں۔ جسے انہوں نے نہیں پڑھا ہے، ملک میں پڑھے لکھے طبقہ کی دو مستقل جماعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ امتیاز کے لیے ایک کا نام "علماء" دوسرے کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا استحقاق ان ہی کو حاصل ہے اور ہے بھی یہ بات کہ جہل کی پناہ گاہ ہمیشہ علم ہی بنا رہا ہے۔ چونکہ دونوں کے پاس علم ہے، علم نے دونوں کے دل ودماغ کو منور کیا ہے۔ اس لیے عوام بیچارے جو علم سے تعلق نہیں رکھتے محتاج ہیں کہ جاننے والوں کے مشوروں اور آراء پر چلیں۔ مسئلہ یہاں تک تو درست ہے۔ لیکن سوال آگے پیدا ہوتا ہے کہ اب علم کے نمائندے بجائے ایک کے دو طبقے ہیں۔ عوام پریشان ہیں کہ کس کے پیچھے جائیں، کس کی سنیں اور کس کی نہ سنیں۔ حالت تو یہ ہے کہ ان دونوں علمی گروہ میں سے جو بھی میدان خالی پاتا ہے۔ ہر ایک کو بجائے ایک کام کے مسلسل دو کام کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی عوام کو اپنے سوا علم کے دوسرے طبقہ سے متنفر کرنا ایک مستقل کام ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے سامنے اپنی تجویزوں کو رکھنا۔ وقت کی زیادہ مقدار عموماً پہلے کام میں خرچ ہو جاتی ہے۔ مسٹر اور مولانا، یا لیڈر اور علماء، تعلیم یافتہ یا مولوی، بتدریج ان دونوں الفاظ میں کشمکش بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے وجود سے بیزار ہے۔ فسق، الحاد، بے دینی کا الزام علماء تعلیم یافتوں پر عائد کر رہے ہیں۔ تاریک خیالی، ابلہی، ناواقفیت کی تہمتیں علماء پر تعلیم یافتوں کی طرف سے جوڑی جا رہی ہیں اور جو کچھ بھی اس کشمکش میں ایک کا رویہ دوسرے کے ساتھ آج چالیس پچاس سال سے ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے، دن بدن یہ کشمکش بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

مسٹر اور مولانا کی کشمکش

میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج جس حال میں اس ملک کے بلکہ سارے جہان کے مسلمان تعلیمی نصاب کی

اس دوعملی کی وجہ سے گرفتار ہیں کیا یہ کوئی خوشگوار صورت ہے اور اس کی مستحق ہے کہ اس کو باقی رکھا جائے۔ کیا عوام کو علماء اور تعلیم یافتوں یا لیڈروں اور ملانوں کے قدموں کی ٹھوکر میں اسی طرح ڈالے رکھنا کسی اچھے انجام کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کشمکش کی یہ ناگوار صورت اگر اس قابل ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو ختم کیا جائے۔ تو پھر لوگوں نے ان بزرگوں کی کیوں قیمت نہیں پہچانی، جنہوں نے تیرہ سوسال کی اس طویل مدت میں علم کی اس دوعملی اور تقسیم کو شدت کے ساتھ روکے رکھا۔ لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ میں مسلمانوں کے چند اہم کارناموں میں ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی وحدت کو بھی سمجھتا ہوں۔ تیرہ سوسال کی تاریخ ان کی گواہ ہے کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ بھی تھے جو علماء کہلاتے تھے اور وہی علماء تھے جنہیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے۔ فلسفی بھی پیدا ہورہے تھے اور ریاضی داں بھی، حکیم بھی، مہندس بھی، محدث بھی، مفسر بھی، طبیب بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، صوفی بھی۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ تعلیم کا ایک ہی نظام تھا، جس سے یہ ساری مختلف پیداواریں نکل رہی تھیں۔

ابن سینا تاریخ کی روشنی میں

مسلمانوں کے سب سے بڑے فیلسوف ابن سینا ہی کے حالات اٹھا کر پڑھیے۔ ابن خلکان سے نقل کر رہا ہوں:

> اشتعل بالعلوم و حصل الفنون ولما بلغ عشر سنين من عمره كان اتقن علم القرآن العزيز و الادب و حفظ اشياء من اصول الدين و حساب الهند و الجبر و المقابلة. (ج1، ص152)

> ”تحصیل علم میں مشغول ہوا اور فنون حاصل کیے اور جب دس سال کی عمر تھی تو اس شخص نے قرآن عزیز کے علم کو پختہ کیا اور ادب کا علم حاصل کیا، نیز دین کے اصولی مسائل (عقائد وغیرہ) کو یاد کیا اور اسی کے ساتھ حساب الہند و جبر ومقابلہ کے فن کو بھی سیکھا۔“

یہ ابن سینا کی عام تعلیم کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد جب اختصاص کا ارادہ ہوا تو ابوعبداللہ ناتلی الحکیم کا ذکر کرنے کے بعد قاضی ابن خلکان راوی ہیں:

> فابتدء ابو علی يقرٔ ايسا غوجی واحكم عليه علم المنطق و اقليدس والمجسطی ...... وكان مع ذلک يختلف فی الفقة الی اسماعيل الزاهد يقرء ويبحث و يناظر. (ص156)

> ”تب ابوعلی نے ابوعبداللہ ناتلی سے ایسا غوجی پڑھی اور منطق کے علم کو مستحکم کیا، نیز اقلیدس اور مجسطی بھی ان ہی سے پڑھی، لیکن ان فلسفیانہ علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسی زمانہ میں وہ اسماعیل زاہد کے پاس علم فقہ کی تحصیل کے لیے آمدورفت رکھتے تھے، فقہ ان سے پڑھتے تھے اور اس فن پر بحث ومناظرہ کرتے۔“

یہ ہے اسلامی عہد کے سب سے بڑے تعلیم یافتہ کی تعلیمی رپورٹ۔ یہی بات سوچنے کی تھی جسے کسی نے نہیں سوچا، حالانکہ اس کے سوا جو کچھ تھا سب کچھ سوچا گیا۔

قدیم نصاب

ہندوستان کے قدیم نصاب پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں حدیث کی تعلیم کے لیے صرف ایک کتاب تھی۔ تفسیر میں صرف جلالین پڑھائی جاتی تھی اور مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ فقہ میں اگرچہ چند کتابوں (قدوری، کنز، شرح وقایہ، ہدایہ) کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ضروری نصاب میں فقہ صرف قدوری تک اور اعلیٰ تکمیل نصاب میں ''کنز'' چند ورقی متن (7) کے علاوہ معناً صرف ایک ہی کتاب فقہ کی پڑھائی جاتی تھی۔ یعنی شرح وقایہ کے عبادات، اور ہدایہ کے معاملات جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ دو کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ مسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فقہ کی ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی تھی۔

لیکن کیا ان چندگنی چنی کتابوں کا درس ان علوم میں تبحر اور وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے کافی نہ تھا؟ گو کہ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے لیکن ع کب تک روکوں دل میں آہ۔ میرا اس باب میں جو ذاتی خیال ہے اس کا اظہار اپنا ایک ایمانی فرض سمجھتا ہوں۔ فیصلہ کرنے والے اس کے بعد جو چاہیں فیصلہ کریں۔ پس

چل مرے خامے بسم اللہ

حواشی

(1) یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور حنفی امام ہیں۔ پہلے بخارا کے قاضی ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کے سامانی امیر الحمید نے وزارت کے منصب پر سرفراز کیا۔ کچھ دن کے بعد کسی مسئلہ میں امیر نے ایسے فیصلہ پر مجبور کرنا چاہا جس میں دین اور علم کی صراحۃً خلاف ورزی لازم آتی تھی۔ انہوں نے انکار کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دو درختوں کی شاخوں میں باندھ کر شاخوں کو پھر اس طرح کھولا جائے کہ ان کی لاش کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ الحاکم کو اس کی خبر ملی، غسل کیا، اور عطر ملا، کفن گلے میں ڈالا اور مذکورۂ بالا فقرہ کہتے ہوئے، اپنے آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا۔ لاش اسی شکل کے ساتھ چیر دی گئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

(2) عہد نبوت و صحابہ کو تو جانے دیجیے کہ اس زمانہ کا تو رسول بھی زرہ اور خود اور تلوار و تیر و ترکش کے ساتھ میدان میں اترتا تھا۔ اس کے بعد آپ کو ہر زمانہ کے ائمہ محدثین و فقہا میں اس خصوصیت کی جھلک نظر آئے گی اور بعضوں کو تو اس میں اتنا کمال حاصل تھا کہ پیشہ وروں کو بھی ان کی استادی تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ امام المحدثین حضرت امام بخاری کی تیراندازی، شیخ الصوفیہ امام ابوالقاسم کی نیزہ بازی کے تذکرے خصوصیت کے ساتھ کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ خود ہمارے ہندوستان کے علماء و صوفیہ کا بھی یہ حال تھا۔ مولانا غلام علی

آزادی کے متعلق کسی جگہ میں ذکر کروں گا کہ موقعہ آیا تو قلم پھینک کر مرہٹوں کے مقابلہ میں ذوالفقار حیدری کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔ شیخ محدث نے مولانا احمد شرعی کے حالات میں لکھا ہے۔ ''ایشاں در تیراندازی نظیر نداشتند''' ان ہی ''جامع العلوم نقلیہ وعقلیہ ورسمیہ و حقیقیہ'' کی تیراندازی کے کمال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے شاگرد شیخ عبدالغنی سونی پتی بیان کرتے تھے کہ عمر جب 96 سال کی تھی ایک ''تیری انداختند تیرے بہ نشانہ رسیدہ بود گفتند کہ تیرہا ضایع می رود واسراف می شود وگرنہ تیر بیک دگر بند کنم۔'' (اخبار۔ص 220)

اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت شیخ الہندؒ بندوق کا بہترین نشانہ لگاتے تھے اور یہی حال تقریباً اپنے اپنے عہد میں عام علماء کا تھا۔ عربی مدارس میں ورزش اور جسمانی ریاضت کی طرف سے غفلت جو برتی جارہی ہے جو بالکل نئی بات ہے۔ شکر ہے کہ اب پھر لوگوں کو ادھر توجہ ہونے لگی ہے۔ مگر خدا کرے کہ وہ مسرفانہ مغربی ملاعب ہمارے مدارس میں داخل نہ ہوں۔ جن کے ایک ایک ریکٹ کی قیمت ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ شیخ احمد شرعی ایسے قدر انداز ہونے کے باوجود اسراف کو اس شکل میں بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مطلع الانوار جو مولانا انوار اللہ خاں کا معمول تھا کہ نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت کرتے اور اس کے بعد ورزش۔ ورزش کا سلسلہ مرض الموت تک رہا۔ (ص 12)

(3) عظیم آباد پٹنہ کے مشہور طبیب حکیم عبدالمجید مرحوم جو مشہور علمی خانوادے صادق پور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ پڑھانے کے وقت ان پر بھی یہی حال طاری ہو جاتا تھا۔ میرے عم مرحوم مولانا حکیم ابوالنصرؒ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ کتاب قانون شیخ میں نے بھی حکیم صاحب سے شروع کی تھی۔ لیکن پہلا سبق ہوا، کتاب کے مطلب سے پہلے حکیم صاحب نے ابن سینا کے نام وہ بے نقط کی شروع کی میں پریشان ہو گیا۔ دو تین دن تک صبر کیا آخر میں پڑھنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ حکیم المجید طبی قابلیت کے لحاظ سے بھی اپنے وقت کے ممتاز طبیبوں میں تھے۔ متعدد مواقع ایسے پیش آئے جن میں بڑے بڑے سول سرجنوں کو اُن کے سامنے زک اٹھانی پڑی۔ فارسی میں ان کا قصیدہ ''حسن البیان'' نامی کتاب کے دیباچہ میں چھپا ہوا ہے، جو مولوی شبلی کے اس قصیدہ کے جواب میں ہے جسے اپنی کتاب ''سیرۃ النعمان'' کا انہوں نے دیباچہ بنایا تھا۔ حکیم صاحب کی قابلیت کے ثبوت کے لیے یہی قصیدہ کافی ہو سکتا ہے۔

(4) اس موقع پر ایک مشہور واقعہ کا بار بار خیال آرہا ہے۔ اگرچہ خاک کے سامنے عالم پاک کا تذکرہ خلاف ادب ہے۔ لیکن قدیم علماء کی بعض خاص خصوصیتوں کا اس سے پتہ چلتا ہے۔ اس لیے دل عدم ذکر پر راضی نہیں ہے۔ مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ جس خداداد ذکاوت کے مالک تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ مولوی عبدالعلیؒ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی۔ مولوی عبدالعلی صاحب نے سبق کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو۔ میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو پھر ان کو سمجھنا۔ مولوی عبدالعلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد دبے پاؤں گھر روانہ ہو گئے۔ مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا۔ شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا۔ لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں۔ مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ کتاب ہی پڑھاؤں گا، تب پھر واپس ہوئے۔

(5) آخر یہ کیسے کہہ سکتا ہوں برہان الملک نے جس شان کے ساتھ نادر شاہ کے حوالہ اپنے آپ کو پانی پت کے میدان میں کیا۔ جس کی

توجیہہ طباطبائی نے آداب ایران سے کی۔ خود یہی واقعہ جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس گہری سازش کا پتہ دے رہا ہے اور اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہے کہ نادر شاہ اچانک ایران کی سرزمین سے اچک کر کابل وقندھار کے علاقوں کو پامال کرتا ہوا ہندوستان کیسے پہنچا۔ اس وقت حکومت کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جنہوں نے اس پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں کیا تھا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ایک تورانی سردار حضرت آصف جاہ اولؒ موجود تھے کہ مغلیٔ حکومت موت کے پنجہ سے اس وقت نکل گئی۔ ورنہ جو بعد کو ہوا وہ شاید ہی اسی دن ہو جاتا۔ محمد شاہ کے بعد جس مغل بادشاہ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کے جلیل عہدہ سے سرفراز کیا۔ تاریخ اٹھا کر پڑھیے اسی کے ساتھ صفدر جنگ نے کیا برتاؤ کیا۔ سب جانتے ہیں کہ صفدر جنگ کھلم کھلا باغی ہو کر علانیہ بادشاہ سے جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اس وقت دلی کے مسلمانوں کا جو احساس تھا طباطبائی نے جو غالباً دلی ہی میں تھے، اس احساس کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے چونکہ صفدر جنگ کے ہم عقیدہ، ہم مذہب مورخ کا بیان ہے اس لیے شاید زیادہ قابل وزن ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''کشا مرہ و پنجابیان علم محمدی بر پا کردند ندا دادند کہ صفدر جنگ رافضی است جنگ با او کہ بر خلیفہ زماں خروج نمودہ جہاد ست ہزاروں نفراز عوام زیر علم جمع گردیدہ شور و ہنگامہ دم چار یار گرم داشتند۔'' (ج 3، ص 892)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفدر جنگ کا مذہبی تعصب کچھ پوشیدہ نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اودھ ہی کی حکومت پہلی حکومت ہے۔ جس نے ہندوستان میں جمعہ اور جماعات کا رواج فرقہ امامیہ میں کرایا۔ دیکھیے تذکرہ مولوی دلدار علی و ملا محمد علی کشمیری در کتاب ''نجوم السماء تذکرہ علماء شیعہ''۔ ایسی صورت میں اس حکومت اور اس کے حکمرانوں کے متعلق عدم تعصب کا دعویٰ ظاہر ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

(6) واقعہ ملا صاحب کی شہادت کا مشہور ہے کہ سہالی گاؤں میں عثمانی شیوخ بھی رہتے تھے۔ آب پاشی میں جھگڑا ہوا۔ عثمانیوں نے رات کے وقت بیچارے انصاری ملا کو شہید کر دیا۔ مُلا صاحب نے چار صاحبزادے اپنے بعد چھوڑے۔ عثمانیوں نے مُلا صاحب کے گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ سلطان اورنگ زیبؒ نے اسی صلہ میں لکھنؤ کے خالی مکان کو جس میں کبھی فرنگی تاجر رہتے تھے، مُلا شہید کے پس ماندوں کے حوالے کر دیا۔ ہندوستان کا تنہا یہی علمی خاندان ہے۔ جس میں تقریباً دو صدی تک علم موروثی طریقہ سے منتقل ہوتا رہا۔ بلا مبالغہ سینکڑوں علماء اس خاندان سے اٹھے اور تعلیمی طور پر تو ہندوستان کے ہر صوبہ میں اس خاندان کے فیض یافتوں کی کثیر تعداد ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ شمس آباد قنوج کے پاس ایک قصبہ کا نام ہے۔ قطب الدین شمس آبادی نے نصف صدی تک وہاں درس دیا۔ ملا محب اللہ بہاری شمس آبادی کا تلامذہ میں سے ہیں۔

(7) اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، بظاہر ''کنز'' وغیرہ متون کی کتابیں موٹے موٹے حروف اور طویل الذیل حواشی کے ساتھ جس طرح چھاپی جا رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی بڑی کتاب ہے۔ لیکن جن حروف میں آج کل اخبارات وجرائد یومیہ وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان ہی حروف میں مثلاً ''کنز'' کو اگر لکھا جائے تو بلا مبالغہ کسی معمولی سی نوٹ بک میں پوری کتاب سما سکتی ہے۔ ان متون کی نوعیت میرے خیال میں ان یادداشتوں کی ہے جو لیکچر وغیرہ دینے کے لیے لوگ نوٹ کر لیتے ہیں، اور ان ہی کو دیکھ کر تقریر کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے اس کی عجیب مشق بہم پہنچائی تھی۔ دس دس صفحات میں جس کی تفصیل آ سکتی ہے اسی مضمون کو وہ سطر دو سطر میں اس طرح بند کر سکتے تھے کہ سارے مفصل مضمون پر وہ عبارت حاوی ہو سکتی تھی۔ یہ ایک کمال تھا جسے اب نقص ٹھہرایا گیا ہے۔ قضاء افتاء کے کام کرنے والے حضرات ان یادداشتوں کو زبانی یاد کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ فقہ کے سارے ابواب اور مضمون کے عنوان انہیں محفوظ رہتے تھے۔

درسِ حدیث کی اصلاح

آج نصاب کے اصلاحی دائروں کا ایک بڑا کارنامہ جس کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر پہلوں کو مطعون اور ملام بنایا جا رہا ہے، وہ حدیث کا درس ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ایک بڑا نقص تھا پرانے نصاب یا یوں کہیے کہ مشارق و مصابیح یا مشکوٰۃ والے نصاب کا جس کی اصلاح جدید نصاب میں صحاح ستہ کی کتابوں کے اضافہ سے کی گئی۔ کسی دوسرے کو نہیں بلکہ ایسی ہستی کو میں اس باب میں شہادت کے پیش کرتا ہوں، جن کی طرف درس حدیث کے اس اصلاحی کارنامے کو منسوب کیا جا رہا ہے۔ میری مراد حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہے۔ اپنی کتاب ''انفاس العارفین'' میں درسِ حدیث کے ان طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے جو حرمین میں مروج تھے۔

درسِ حدیث کے تین طریقے

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''باید دانست کہ درس حدیث را نزدیک علماء حرمین سہ طریق است یکے طریق سرد کہ شیخ یا قاری وے تلاوت کتاب کند، بے تعرض مباحثِ لغویہ وفقہیہ و اسماء رجال وغیر آن و دیگر طریق بحث وحل کہ بعد تلاوت یک حدیث بر حفظ غریب وترکیب عویص، ورسم قلیل الوقوع از اسماء اسناد و سوال ظاہر الورود مسئلہ منصوص علیہا توقف کند وآں را بہ کلام متوسط حل نماید وآنگاہ پیش رود وعلیٰ ہذا القیاس، سویم طریقہ امعان وتعمق کہ بر ہر کلمہ مالہا وعلیہا وما یتعلق بہا بسیار ذکر کند، مثلاً در کلمہ غریبہ و ترکیب عویص، شواہد آں از کلام شعراء واخوات کلمہ در اشتقاق ومحال استعمال وے ذکر کند ودر اسماء الرجال احوال ایں قوم وسیرت ایشیاں بیان نماید ومسائل فقہیہ را بر ان مسئلہ منصوص علیہا تخریج نماید وبادنیٰ مناسبت قصص عجیبہ وحکایات غریبہ بگوئید۔'' (ص 187)

''معلوم ہونا چاہیے کہ علماء حرمین میں حدیث کے پڑھانے کے تین طریقے ہیں۔ ایک طریقہ کا نام سرد (رواروی) ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اُستاد یا پڑھنے والا کتاب کو پڑھتا چلا

جائے، اس طور پر لغوی مباحث اور فقہی جھگڑوں یا اسماء الرجال وغیرہ کی باتوں سے تعرض نہ کرے، اور دوسرے طریقے کا نام بحث وحل کا طریقہ ہے۔ یعنی کسی حدیث کے پڑھنے کے بعد اس کے اجنبی اور نادر الفاظ یا کوئی ترکیبی دشواری ہو، اس پر یا ایسے اسماء سند کے جو غیر معروف ہوں اور ان کا ذکر کم آتا ہو، اسی طرح ایسے اعتراضات جو کھلے کھلے طریقے سے وارد ہوتے ہیں۔ یا جن مسائل کا اس حدیث میں صراحۃً تذکرہ کیا گیا ہو۔ اُن پر استاد ٹھہرے اور متوسط طریقہ کی گفتگو ان پر کرے، ان کو حل کرے، اس کے بعد آگے بڑھتا چلا جائے۔ تیسرا طریقہ درس کا وہ ہے جس کا نام امعان و تعمق کا طریقہ ہوسکتا ہے کہ حدیث کے ہر ہر لفظ اس کے سارے متعلقات مالہا و ماعلیہا پر بحث کی جائے اور خوب خوب بحث کی جائے مثلاً جہاں کوئی ذرا اجنبی لفظ آ گیا، یا کوئی مشکل ترکیب سامنے آئی اس کے حل میں شعراء کے کلام سے شہادت پیش کرنا شروع کردے اور اُس کے مماثل کلمات ان کے مواد اشتقاق اور استعمال کے مقامات کو واضح کیا جائے۔ اسی طرح رجال کے اسماء جہاں جہاں آئیں، ان پر بحث کرنا شروع کردے۔ ان کے حالات ان کی سیرت بیان کی جائے اور جس مسئلہ کا اس حدیث میں صراحۃً ذکر آیا ہو، اُس پر قیاس کر کے جو مسائل غیر منصوصہ پیدا ہوتے ہوں، فقہ کی کتابوں کے ان مسائل کا تذکرہ کیا جائے۔ اسی طرح ذرا ذرا سی مناسبت اور حیلہ سے عجیب وغریب قصے اور نادر حکایات کا دریا بہایا جائے۔''

طریقہ سوم امعان وتعمق اور شاہ ولی اللہ کی رائے

حضرت شاہ صاحب نے درسِ حدیث کے ان تین طریقوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد ہر طریقہ کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے۔ تیسرا طریقہ یعنی جس میں ہر غریب اجنبی لغت کے آنے کے ساتھ ہی استاذ شعراء کے اشعار سنانا شروع کردے اور اس کے ہم معنی ہم شبیہ الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے، ہر لفظ کی سوانح عمری یعنی ابتداً یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا۔ پھر بتدریج عہد بعہد مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہوئے اب کس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہر استعمال کے محل کو ظاہر کرتے ہوئے کلام عرب سے اس کی شہادت پیش کی جائے۔ یوں یہ سند کے ہر راوی کے متعلق رجال کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کا مسلسل ذکر کرنا فقہی مسائل اور ان کے تمام جزئیات قریبہ وبعیدہ جن کا اس حدیث سے خواہ دور ہی کا تعلق کیوں نہ ہو ان کو بھی بیان کرتا چلا جائے۔ ساتھ ہی معمولی معمولی مناسبتوں کو آڑ بنا کر اپنے معلومات جن کا کسی فن سے بھی تعلق ہو، اظہار کیا جائے درس حدیث کے اس طریقہ کے متعلق شاہ صاحب کی رائے ہے کہ یہ طریقہ:

''طریقۂ قصاص است کہ قصد ازاں اظہار فضیلت وعلم است یا غیر آں واللہ اعلم نہ روایت وتحصیل علم۔''

''یہ واعظوں اور قصہ خوانوں کا طریقہ ہے اور مقصود اس قسم کے پڑھانے والوں کا محض اپنی

فضیلت کا اظہار ہوتا ہے یا اس کے سوا کوئی اور غرض واللہ اعلم، (بہر حال) یہ نہ روایت حدیث کا طریقہ ہے، اور نہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ۔"

حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث پر نقد وتبصرہ

صرف یہی نہیں بلکہ درس حدیث کے متعلق آج مختلف دائروں میں جن امور پر لوگوں کو ناز ہے، سنیے شاہ صاحب ہی سے سنیے، فرماتے ہیں:

"باید دانست کہ اشتغال محدث باحوال رجال سند بعد تصحیح اسماء، آنہا ومعرفت وثوق شاں خصوصاً در صحیحین وغیر آں۔"

"معلوم ہونا چاہیے کہ محدث کا سند کے رجال سے ان لوگوں کے نام کی تصحیح کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ ان کا شمار ثقات میں ہے، خصوصاً صحیحین کے رجال ہوں یا ان کے سوا (صحاح) کی کتابوں کے رجال۔"

یعنی صحاح کی موجودہ کتابوں کے متعلق رجالی مباحث:

"یا اشتغال بفروع فقیہ و بیان اختلاف مذاہب فقہاء وتوفیق در اختلاف روایات وترجیح بعض احادیث بر بعض۔"

"فقہی جزئیات کے ساتھ مشغول ہونا، اور فقہا کے مذاہب کو بیان کرنا اور ان روایتوں میں تطبیق دینا، روایتوں کے اختلاف کو بیان کرنا، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینا۔"

دونوں ہی کے متعلق استاذ الکل فی الکل مجدد درس حدیث فی الہند کا فیصلہ ہے کہ یہ ساری باتیں:

"از امعان وتعمق ست واوائل اُمت مرحومہ بدیں امور مشغول نہ بودند۔"

"یہ سب (لاحاصل) فکر وغور اور جزرسی ہے۔ اُمت کے ابتدائی طبقات کے لوگ ان امور میں مشغول نہ تھے۔"

طریقہ بحث وحل

لیجیے جب یہ ساری باتیں "امعان وتعمق" ہیں تو پھر جن لوگوں نے اپنے تعلیمی نصاب میں مشارق ومصابیح یا مشکوٰۃ ہی کو درس حدیث کے لیے کافی قرار دیا تھا، ان پر اعتراض کرنے کا حق کیا ان لوگوں کو باقی رہ جاتا ہے جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ اور ان کے طریقہ تعلیم کا وارث سمجھتے ہیں۔ درسِ حدیث کے دو اور طریقوں یعنی سرد والا طریقہ اور بحث وحل والا طریقہ ان دونوں کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ بحث وحل کا طریقہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے، جنہوں نے حدیث شروع کی ہو۔ مثلاً مشکوٰۃ یا مشارق ان کو شروع کرائی گئی ہو، فرماتے ہیں۔

''بہ نسبت مبتدین واہل توسط طریقہ بحث وحال۔''

''مبتدیوں اور متوسط استعداد والوں کے لیے بحث وحل کا طریقہ مفید ہے۔''

اور یہی کیا بھی جاتا تھا کہ مشکوۃ وغیرہ جیسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں کو حدیث کے ان لغوی الفاظ جن میں غرابت وندرت ہوتی تھی۔ان کے معانی بتادیے جاتے تھے۔جہاں کہیں کوئی نحوی ترکیب کے لحاظ سے کوئی دقت ہوئی اسے سلجھادیا گیا۔

طریقۂ سرد حدیث میں

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مبتدیوں اور اہل توسط کو پڑھا دینے کے بعد ان کے مشائخ حرمین میں سے شیخ ابوطاہر جو گویا ان کے سب سے بڑے شیخ فی الحدیث ہیں، ان کا طریقہ وہی سرد کا تھا۔یعنی صحاح بطور تلاوت کے ان کے سامنے گذار دی جاتی تھیں، فائدہ اس کا یہ بتایا ہے۔

''تا زود سماع حدیث وسلسلہ روایت درست کنند۔''

''تا کہ حدیث کے سننے کا قصہ جلد ختم ہو اور روایت کا سلسلہ لوگ درست کرلیں۔''

باقی تفصیلی بحث کے لیے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''باقی مباحث بر شروح حوالہ می کردند زیرا کہ ضبط حدیث امروز مدار آں بر تتبع شروح است۔''

''باقی مباحث جو حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں (ان کے اُستاد) ان مباحث کے لیے کہہ دیتے تھے کہ حدیث کی شرحوں کی طرف رجوع کیا جائے۔''

کیونکہ اس زمانہ میں اب حدیثوں کے معانی ومطالب کو ضبط گرفت میں لانا اس کا دارومدار شروح ہی پر رہ گیا ہے۔

درسِ حدیث میں اسناد

جس کا یہی مطلب ہوا کہ مشکوۃ جیسی کسی حدیث کی کتاب کو حل و بحث کے طریقے سے پڑھ لینے کے بعد آگے صحاح کی کتابوں کے پڑھانے کا مطلب بطور تبرک سمجھیے یا سلسلہ روایت کی درستگی سمجھیے، اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا تھا، جو یوں بھی منادلہ (1) وغیرہ کے طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔کیونکہ کتابوں کی تدوین کے بعد ''اسناد کی درستگی'' کا مسئلہ بھی تبرک کے سوا اور کیا رہ گیا ہے۔امام بخاری تک مثلاً ان کی کتاب اب تواتر کے ساتھ منسوب ہے۔کسی متواتر چیز کے اسناد کی حاجت ہی کیا باقی رہتی ہے۔سند کی اہمیت جو کچھ تھی تدوین کتب سے پہلے تھی۔یہی چیز ہمارے قدیم علماء اور پرانے نصاب والوں کے پیش نظر تھی، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان پر نکتہ چینیوں کا جو سلسلہ آج پچاس سال سے جاری ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔دیدہ دلیری یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا نام لے لے کر ان نکتہ چینیوں میں زور پہنچایا جاتا ہے، مگر آپ دیکھ چکے ہیں کہ خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ذاتی خیال اس معاملہ میں کیا ہے۔

کتب حدیث میں درساً پڑھنے کی ضرورت

حدیث میں درساً جس چیز کو پڑھانے کی حاجت ہے۔ وہ مشارق ہو یا مصابیح و مشکوٰۃ وغیرہ کتابوں میں سے کسی ایک کتاب سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سرداً یا مناولۃً صحاح ستہ وغیرہ کی اجازت سو پہلے بھی لوگ یہی کرتے تھے کہ ہندوستان ہی کے کسی صاحبِ سند محدث سے اجازت لے لیتے تھے، یا حج وغیرہ کی تقریب سے جب حرمین جاتے تھے تو وہاں سے سند لے آتے تھے۔ علماء کے تذکرے پڑھیے۔ عموماً آپ پائیں گے کہ اس قسم کی سند کے حاصل کرنے کا رواج ان میں بھی تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اوروں کا تو میں نہیں کہتا۔ دارالعلوم دیوبند، یا اس کے سلسلہ کے جو مدارس یا علماء میں عموماً صحاح ستہ کے درس بطریقہ سرد ہی کا ان میں رواج ہے۔

درس حدیث کے سلسلہ میں دارالعلوم پر اعتراض اور اس کی حقیقت

پچھلے دنوں اخباروں میں ناواقفوں کی طرف سے جب یہ شائع کرایا گیا کہ دیوبند میں بخاری کے چالیس چالیس پچاس پچاس ورق ایک دن میں ہو جاتے ہیں۔ حضرت مولانا حسین احمد متع اللہ المسلمین بطول بقائہ پر الزام لگایا گیا کہ سال بھر تک وہ سیاسی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں اور ختم سال پر اسی طریقہ سے کتابوں کا عبور کرا دیتے ہیں، تو درس حدیث کے راز سے جو نا آشنا ہیں۔ انہوں نے تعجب کے ساتھ ان خبروں کو پڑھا۔ حالانکہ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حدیث کے پڑھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے ورنہ اس راہ کو چھوڑ کر جو لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ آپ سن چکے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ اسے "طریقہ قصاص" قرار دیتے ہیں اور بجز ایک بیجا طریقہ اظہار فضل و علم کے اس کا حاصل ان کے نزدیک عام حالات میں اور کچھ نہیں ہے۔ جو چیز مطالعہ اور مزاولہ سے اُستاد کی تعلیم کے بغیر آ سکتی ہے سچی بات تو یہی ہے کہ اس کو پڑھانے کی حاجت کیا ہے۔ ما

علم حدیث میں کمال

نصف صدی گزشتہ میں غیر مقلدیت کا طوفان جب ہندوستان میں اُمڈا تو اس طوفان کے مقابلہ کے لیے احناف کی طرف سے جو لوگ کھڑے ہوئے ظاہر ہے کہ ان بیچاروں نے حدیث وہی مشارقی و مشکوٰتی طریقے سے پڑھی تھی۔ لیکن آستینیں چڑھا کر جب یہی لوگ میدان میں اترے تو کون نہیں جانتا کہ ان ہی میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ جیسے لوگ تھے اور ان بزرگوں کے متعلق تو شاید کچھ کہا بھی جا سکتا ہے لیکن بالکلیہ جنہوں نے درس نظامیہ والی حدیث سے زیادہ اور کوئی چیز اس فن میں استادوں سے نہیں پڑھی تھی مثلاً صاحب آثار السنن مولانا شوق نیموی وغیرہ ان بزرگوں نے فن رجال، تنقید احادیث میں جن دقیقہ سنجیوں کی عملی شہادتیں پیش کی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ یہ چیز درس کی نہیں بلکہ مطالعہ و مزاولت سے تعلق رکھتی ہے۔

قدیم نظامی نصاب پر اعتراض

قدیم نظامی نصاب میں اصلاح کا دوسرا دعویٰ ان علمی دائروں کی طرف سے پیش ہوا یا ہو رہا ہے، جن میں ادب عربی کو اہمیت دی گئی۔ شور برپا کیا گیا کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب عربی میں ہے۔ پیغمبر کے ملفوظات اور پیغمبر کی سیرت عربی میں ہے، مسلمانوں کا قانون اور ان کا اعتقادی و عملی دستور حیات عربی میں ہے۔ ان کی تاریخ، ان کے سارے علمی کارنامے عربی میں ہیں۔ لیکن قدیم نصاب میں اس کی اہمیت گھٹا دی گئی۔ باور کرایا گیا کہ جدید ادبی نصاب میں جو کتابیں نظم و نثر یا متعلقہ فنون ادبیہ کی رکھی گئی ہیں۔ ان کی تعلیم حاصل کیے بغیر نہ کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے نہ حدیث، نہ فقہ، نہ تصوف، نہ کلام وعقائد۔ تقریباً پچاس ساٹھ سال سے اس کا بھی ہنگامہ برپا ہے لیکن کیا یہی واقعہ ہے؟

اسلامی عربیت اور مسلمان

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر اپنے اس دعوے کو دہراتا ہوں کہ عربی زبان اسلام کے بعد دو مستقل حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک حصہ اس کا وہ ہے جس میں قرآن، حدیث اور اسلامی ادبیات محفوظ ہیں اور دوسرا وہ ہے جس میں جاہلی شعراء، یا عہد اسلامی کے انشا پردازوں یا شعر کہنے والوں کا کلام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کے سابق الذکر سرمایہ کی یہ حالت ہے کہ عموماً مسلمانوں کی وہی مادری زبان ہے، اور جہاں یہ ممکن نہ ہو سکا وہاں کی مقامی زبانوں میں عربی زبان کے اس حصہ کا ایک بڑا ذخیرہ کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ تھوڑی بہت عربیت سے مناسبت پیدا کر لینے کے بعد لوگ قرآن وحدیث یا اسلامی ادبیات والی عربی کو سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے مشق و مزاولت بڑھتی ہے، عربی زبان کے اس حصہ پر ان کو پورا قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس پر باضابطہ قابو یافتہ ہونے کے بعد بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ عربی زبان کا وہ دوسرا حصہ یعنی وہی جاہلیت کے کلام یا دواوین، محاضرات و مسامرات کی انشائی کتابوں والی عربی سے بھی ان کی پوری مناسبت پیدا ہو۔ کیونکہ عموماً اس حصہ میں ایسے الفاظ ایسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں جو اسلامی ادبیات والی عربی کے مقابلہ میں کچھ اجنبی سی محسوس ہوتی ہے۔ محض قرآن وحدیث، فقہ وکلام وتصوف والی عربی سے اس جاہلی عربی کو قابو میں لانا تقریباً ناممکن ہے۔ قریب قریب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ فارسی زبان سیکھ کر جیسے پشتو زبان کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ یہ دونوں دو مستقل جداگانہ چیزیں ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کے سیکھنے سے دوسری کا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور یوں بھی ان میں سے کسی ایک کی عربی دوسری کی عربی پر موقوف نہیں ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جاہلیت کے اشعار میں سے کسی ایک شعر کا مطلب بھی آپ سے نہ بیان کر سکے۔ لیکن اسی پر قرآن کی جس آیت، حدیث کے جس ٹکڑے، فقہ کی جس عبارت کو آپ پیش کریں گے بغیر کسی دقت کے اس کے معانی و مطالب کو آپ نے سامنے بیان کرتا چلا جائے گا۔ واقعہ تو یہی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری حیثیت سے یہی بات بزرگوں کے پیش نظر تھی۔ اس لیے لازمی نصاب میں انہوں نے جاہلی عربی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی، جتنی کہ اس زمانہ میں دی گئی، یا دی جارہی ہے لیکن واقعہ بہر حال واقعہ تھا۔

اسلامی عربی اور ادبی عربی

اس غیر اسلامی عربی کی ضرورت جب قرآن وحدیث فقہ وغیرہ کی عبارتوں کے حل کرنے میں بظاہر لوگوں کو محسوس نہیں ہوتی تو دیکھا جاتا ہے کہ زبردستی وہی بات جو شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ:

''در کلمہ غریبہ وترکیب عویص شواہد آں از کلام شعراء واخوت کلمہ در اشتقاق ومحال استعمال وے۔''

''کسی اجنبی لفظ مشکل ترکیب کے متعلق شہادت میں شعراء کا کلام اشتقاق کے مواد اور طریقہ استعمال کے مواقع۔''

بغیر کسی ضرورت کے درسوں میں یا کتابوں میں ٹھونستے چلے جاتے ہیں اور اتفاق سے ہزار ہا ہزار الفاظ کے بعد کہیں کسی ایک آدھ لفظ کے ترجمہ میں یا کسی ترکیب کے سلجھانے میں اپنی اس عربی سے ان کو کوئی ایسی بات ہاتھ آجاتی ہے جو نسبتاً اس مقام کے لیے زیادہ موزوں ہو تو پھر کیا ہے۔ اپنی عربیت وادبیت کی شان میں قصیدہ خوانی کا وہی اسٹیشن قرار پاتا ہے۔ اُمت کے پچھلوں کی لعنتیں اگلوں پر موسلا دھار بارش بن کر برسنے لگتی ہیں۔ حالانکہ صاف بات یہ تھی کہ عربی زبان کا یہ حصہ بجائے خود ایک قیمتی اور قابل قدر چیز ہے۔ لیکن نصاب میں اس کی حیثیت سے اگر کوئی اس عربی کو پڑھنا چاہتا تھا، تو اس کے لیے درس ومطالعہ دونوں ہی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن بلاوجہ لفظی مغالطوں سے لوگوں کو متاثر کر کے سارے قرآن وحدیث، فقہ وکلام کو اسی عربی دانی پر موقوف کر دینا اور نصاب میں سب سے زیادہ اسی کو اہمیت دے کر لازمی مضامین سے بھی زیادہ اس پر زور دینا۔ کسی کو اس سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن ہر طالب العلم پر اس کے پڑھنے پڑھانے اور مشق ومزاولت کو فرض عین قرار دینا غالباً صرف ایک زبردستی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طبقہ کی یہ زبردستی کب ختم ہوگی۔

قدیم نصاب پر تفسیر کے سلسلہ میں اعتراض اور اس کی حقیقت

جہاں تک میں سمجھتا ہوں قدیم نظامی نصاب کے متعلق اس زمانہ میں جو اصلاحی قدم اٹھایا گیا ہے۔ زیادہ تر اس کا تعلق ان ہی دو چیزوں سے ہے۔ تیسری بات جس کا مطالبہ تو مدتوں سے جاری ہے لیکن عملی حیثیت سے اب تک لوگوں کی توجہ اس کی طرف جیسی کہ چاہیے نہیں ہوئی ہے۔

وہ جلالین بیچاری کا لطیفہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن کے متعلق اس نصاب میں صرف یہی ایک کتاب داخل ہے، جس کے الفاظ قریب قریب قرآنی الفاظ کے ہم عدد ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی اور جملوں کا سادہ مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ تو اس کے لیے جلالین کیا میرے نزدیک تو صرف قرآن کا سادہ ترجمہ بھی کافی ہے بلکہ جلالین دراصل قرآن کے عربی ترجمہ کی ایک شکل ہے۔ مشکل الفاظ مشکل ترکیبوں کو اس میں حل کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کوئی قصہ طلب بات ہوتی ہے تو اجمالاً اس کا بھی ذکر کر دیا

جاتا ہے۔اس حد تک یقیناً جلالین کافی ہے۔

قرآن فہمی

لیکن اگر قرآن فہمی سے مقصود قرآنی حقائق ومعارف تک رسائی ہے تو یوں کہنے کے لیے جس کے جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کی نہ حد ہے نہ انتہا۔تیرہ سو سال سے قرآن پڑھا جا رہا ہے،کوشش اس کے سمجھنے کی جاری ہے۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اب تک کتابوں میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے،جو ابھی نہیں بیان کیا گیا ہے۔وہ ایک بے تھاہ کتاب ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور۔ایسی صورت میں مناسب تو یہی ہے کہ سیدھے سادے معانی اور قرآن کا جو ظاہر مطلب ہو سکتا ہے۔بس طلبہ کو درساً یہ پڑھا دیا جائے۔اس کے بعد چھوڑ دیا جائے بندے کو اور اس کے خدا کو اپنے ظرف کے لحاظ سے جس کے لیے جتنا مقدر ہے وہ علم کے اس سرچشمہ سے قیامت تک پیتا چلا جائے گا۔حضرت علیؓ کی قرآن کے متعلق مشہور روایت کے الفاظ:

لایخلق علی کثرۃ الردو لاتنقضی عجائبہ۔ (ترمذی وغیرہ)

''قرآن بار بار دہرانے سے پُرانا نہیں ہوتا اس کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے۔''

ایک ایسا تجربہ ہے جس کی توثیق تجربہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان قرآن فہمی کے سلسلہ میں

آج کیا عہد صحابہ ہی سے یہ بات چلی آتی ہے بخاری ہی میں ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ یہ فرماتے تھے۔

کان عمر یدخلنی مع اشیاخ بدر فکان بعضھم وجد فی نفسہٖ فقال لم تدخل ھذا معنا ولنا ابنائنا مثلہ فقال عمرانہ من علمتم فدعاہ ذات یوم فادخلہ معھم فمارئت انہ دعانی یومئذ الالنریھم فقال ماتقولون فی قول اللہ تعالیٰ اذاجاء نصراللہ والفتح، فقال بعضھم امرنا ان نحمداللہ ونستغفرہ اذانصرنا وفتح علینا وسکۃ بعضھم فلم یقل شیئاً فقال لی کذٰلک تقول یا ابن عباس فقلت لاقال فما تقول قلت ھواجل رسول اللہ علیہ وسلم اعلمہ لہ قال اذاجاء نصراللہ والفتح فذلک علامۃ اجلک فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا فقال عمر ما اعلم منھا الا تقول.

''حضرت عمرؓ مجھے بدر کے کہنہ سال صحابیوں کے ساتھ اپنی مجلس میں جگہ دیتے تھے،ان کے اس طرزِ عمل کا بعضوں کو احساس ہوا اور بولے کہ لڑکا ہم لوگوں کے ساتھ کیوں شریک مجلس کیا جاتا ہے حالانکہ اس عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ابنِ عباسؓ کے

متعلق تم جانتے ہو کہ وہ کن میں سے ہے۔ بہر حال ایک دن ابن عباسؓ کو خاص کر حضرت عمرؓ نے بلوایا اور ان ہی بزرگ صحابیوں کی مجلس میں ان کو شریک کیا (ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت مجھے اس طریقہ سے بلایا ہے) تا کہ میں ان لوگوں کو کچھ دکھلاؤں (ابن عباسؓ حسب الحکم حاضر ہوئے حضرت عمرؓ نے مجلس کو مخاطب کر کے پوچھا) خدا کا قول ''اذا جاء نصر الله والفتح'' جو قرآن میں ہے۔ اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ جواب میں بعضوں نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہم حمد کریں اور اپنے گناہوں کی مغفرت اس سے چاہیں۔ جب خدا کی مدد آ گئی اور ہمارے منشاء کے مطابق (مکہ) فتح ہو گیا۔ یہ تو بعضوں نے کہا اور بعضوں نے سکوت اختیار کیا، کچھ نہ بولے۔ اب حضرت عمرؓ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم بھی ابن عباس یہی کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر تم کیا کہتے ہو، میں نے عرض کیا۔ اس آیت میں رسول اللہ کی وفات کی خبر دی گئی ہے، خدا نے حضورؐ کو اس سے مطلع کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی مدد آ گئی اور مکہ فتح ہو گیا تو یہ تمہاری وفات کی نشانی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریفوں کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت چاہو، کیونکہ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ تب حضرت عمرؓ نے کہا میں بھی اس آیت کے متعلق نہیں جانتا لیکن وہی بات جو تم نے کہی۔''

حالانکہ جن بزرگوں نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ کہا، یا جنہوں نے جو سیدھا سادہ مطلب تھا وہ بیان کیا، یہ سب کے سب ''اشیاخ بدر'' ہی معلوم ہوتے ہیں، ابن عباسؓ ان سے چھوٹے ہیں مگر جہاں:

مثل امتی کالمطر لایدری اوله خیر ام اخره. (صحاح)

''میری اُمت کی حالت بارش کی ہے، کچھ نہیں بتایا جا سکتا کہ مفید بارش کا پہلا حصہ ہو گیا یا آخر کا۔''

کا قانون ہو، وہاں اس میں کیا حرج ہے کہ کسی چھوٹے کی نگاہ وہاں پہنچ جائے، جہاں بڑے کی نہ پہنچی ہو اور یوں بھی قرب ہو یا بلندی کے مدارج ان کا مدار تو اخلاص وصداقت پر ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کا مطلب ایک مولوی خوب طرارے سے بیان کرتا ہو۔ لیکن خدا کے پاس اس کی کوئی وقعت نہ ہو اور ایک جاہل ناخواندہ مخلص مومن حق تعالیٰ کی نگاہ میں باطنی اخلاص کی بنیاد پر مدارج عالیہ کا مستحق ہو۔ آخر جن بزرگوں کی نظر سورہ اذا جاء کے اس پہلو پر نہ تھی۔ جس کی طرف ابن عباسؓ نے اشارہ کیا اور حضرت عمرؓ نے جس کی تصدیق فرمائی۔ کیا محض اس وجہ سے ان کا جو مقام بدری صحابی ہونے کی وجہ سے تھا، اس میں کوئی کمی پیدا ہو جائے گی۔ دراصل ابن عباسؓ کے اس اثر سے جو بخاری میں ہے، بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ جو قرآن فہمی کی مختلف صورتوں میں عام لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرآن کے بینات سے ایک بات ایک شخص کی سمجھ میں آ رہی ہے مگر اس کو روکا جاتا ہے کہ جو بات پہلوں نے اس آیت سے نہیں سمجھی تمہاری سمجھ میں اگر وہ آ بھی رہی ہو تو نہ سمجھو۔

قرآن پر عبور کامل

خیر یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن فہمی کی جو یہ دوسری صورت ہے درس کے ذریعہ سے اس کا احاطہ ناممکن ہے اور سیدھے سادے مطلب کے لیے کوئی چھوٹی موٹی تفسیر جلالین، مدارک، بیضاوی کافی ہے۔ سو آپ سن چکے ہیں کہ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی عہد میں تو یہاں ''کشاف'' ہی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب معقولات کی کتابوں کا بوجھ زیادہ بڑھ گیا، تو بجائے ''کشاف'' کے ''جلالین'' رکھ دی گئی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے ''بیضاوی'' کے سورۂ بقرہ کو کافی خیال کیا گیا۔ اس لحاظ سے جہاں تک میرا خیال ہے۔ ہے بھی یہ کافی رہا تفسیروں کا وہ سلسلہ جس میں قصص و حکایات یا اسرائیلیات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کے لیے ان روایتوں کا سمجھنا ظاہر ہے کہ کچھ دشوار نہیں۔ علاوہ اس کے یہ تیس تیس، چالیس چالیس جلدوں والی تفسیروں کا درس یوں بھی کب ممکن ہے۔ تجربہ بھی بتا رہا ہے کہ جلالین و بیضاوی پڑھنے والوں کو ان تفسیروں کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ پھر جو چیزیں یوں ہی استاد کی اعانت کے بغیر لوگوں کی سمجھ میں آ ہی رہی ہو، اس کو خواہ مخواہ استادوں سے پڑھنے کی کیا حاجت ہے۔

قدیم نصاب میں دینی کتابیں

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک پچیس تیس سال کے غور و فکر سے میں نصاب کے مسئلہ میں جس نتیجہ تک پہنچا ہوں، وہ یہی ہے کہ تبحر و احاطہ مطالعہ و وسعت معلومات کے لیے نہیں بلکہ اُستاد سے پڑھنے اور درس کی حد تک چند مختصر فقہی متون کے سوا بزرگوں نے دینیات (یعنی حدیث، تفسیر، فقہ) کے لیے اگر ان تین کتابوں (جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ و شرح وقایہ) کو کافی خیال فرمایا تھا، تو اس میں انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ بلکہ اس ذریعہ سے انہوں نے تعلیمی نظام کی وحدت کو قائم رکھنے کی جو راہ نکالی وہ ایسی عجیب و غریب بات ہے کہ ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ لعنت جس میں مختلف تعلیمی نظامات کے نفاذ میں کوئی قوم مبتلا ہو جاتی ہے اس سے جب چاہا جائے نجات حاصل کرنے والے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک علوم دینیہ کا اقتدار باقی تھا۔ اس وقت تو دینیات کی جتنی کتابیں چاہیں ہم پڑھا سکتے تھے۔ لیکن جب زمانہ نے رنگ بدلا، مثلاً وہی حادثہ جو برہان الملک اور صفدر جنگ وغیرہ کے زمانہ میں پیش آیا یا اس سے بھی زیادہ بدترین حالت میں ہم جو اس وقت گرفتار ہیں۔

علم دینی اور دنیاوی کی تقسیم ہندوستان میں

حکومت اور سوسائٹی دونوں میں صرف ان علوم و فنون کی وقعت ہے، جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسی حالت میں بآسانی بجائے اس علمی فتنے کے جس کا تماشا دور حاضر میں ہم کر رہے ہیں کہ تعلیم کے دو مستقل سلسلے ایک

ساتھ ملک میں جاری ہیں۔ایک طرف جوامع وکلیات یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس ومکاتب اور ان کے پڑھے ہوئے علماء وفضلاء ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے علم دوسرے کے نقطۂ نظر سے ناواقف ہے اور ان کو ناواقف بنا کر رکھا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ علم کا دعویٰ دونوں کو ہے۔عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہیں۔ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش ہے جو جاری ہے۔ایک صماء بکماء عمیاء فتنہ ہے، جس کے مفاسد دن بدن بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ان ہی خانہ جنگیوں میں مسلمانوں کا دین بھی برباد ہو رہا ہے اور دنیا بھی۔عوام پریشان ہیں کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں۔مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں، دینی بے باکیوں، غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں۔ان کی مُنڈی ہوئی ڈاڑھیوں، بود وباش کے یوروپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کر کے محمد رسول اللہ کی اُمت کے دلوں میں ان کی نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، بھری مجلسوں میں انہیں منبر ومحراب سے رسوا کرتے ہیں۔

اور یہی حال تعلیم یافتوں کا ہے کہ مولویوں کی قدامت پرستیوں، تنگ نظریوں، غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں۔ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں۔مسلمانوں کو معمولی معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر لڑانے کا انہیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

ایک طبقہ عوام کی گردنیں پکڑ کر آگے کی طرف دھکیل رہا ہے، دوسرا ان ہی بیچاروں کا دامن پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ علم کے دونوں نمائندے گھر کی اس منحوس لڑائی میں ذلیل ورسوا ہو رہے ہیں، نہ ان کا اثر قائم ہوتا ہے، نہ ان کی بات چلتی ہے۔مسلمانوں کو نہ دین پر عمل کرنے کا موقعہ ملتا ہے، نہ دنیا میں آگے بڑھنے کی توفیق میسر آتی ہے۔

دین کی اہمیت اور اس کی وجہ

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر مسلمانوں کی برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو ان کا باقی ہے، لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظام کے مختلف نتائج نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اُس کا آخری انجام یہ دیکھا جارہا ہے کہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر العیاذ باللہ دین کی نفرت پرورش پارہی ہے۔سوچنے کی بات ہے کہ جن لوگوں کی رسائی خود بھی دین کے اصلی سرچشموں تک نہیں ہے اور جن کی رسائی ہے جب ان ہی کا اقتدار عوام کے قلوب سے مٹ رہا ہے، تو کیا بات صرف ان ہی لوگوں تک محدود ہو کر رہے گی۔دین کے عالموں کی رسوائی یقین مانیے کہ خدانخواستہ اگر اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو لا **فعلہ اللہ** ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو۔خاکم بہ دہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا، اور جو حالات ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کیا کہا جاسکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، تو اس کا الزام کیا صرف کسی ایک ہی طبقہ پر ہوگا۔

معمولی تبدیلی کا کچھ حاصل نہیں

مصیبت کا احساس سب کو ہے، لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا اسکولوں اور کالجوں کے نام نہاد (3) دینیات کے کورس کے اضافہ سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا یا پھر عربی تعلیم گاہوں میں انگریزی کی چند ریڈریں یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے۔ اس مولویانہ سائنس کی تعلیم کا دینی مدارس میں اجراء اس مرض کا علاج ہے۔ میں اس کے متعلق "و فی (4) الشمس مایغنیک عن زحل" کے سوا اور کیا پڑھ سکتا ہوں، عیاں راچہ بیاں، جس سوراخ میں بار بار ہاتھ دینے کے بعد بچھوؤں کے ڈنک کے سوا اور کسی چیز کا تجربہ نہ ہوا اسی سوراخ میں بار بار مسلسل ہاتھ دیئے چلا جانا اور تب نہیں تو اب کی جھوٹی امیدوں میں تسلی ڈھونڈنا، کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہو سکتی ہے "من (5) جرب المجرب حلت به الندامة" کے سوا آزمائی ہوئی تدبیروں کے آزمانے کا آخری نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اور اسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے، اہلِ بصیرت اس تماشے کو تقریباً پون صدی سے دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں پڑھ رہے ہیں۔

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

(لسان العصر مرحوم)

میرے نزدیک تو اس ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے۔ ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بزرگوں کے سینکڑوں بلکہ اب تو ہزار سال بھی کہا جا سکتا ہے۔ الغرض اپنے طویل تجربوں کے بعد تعلیم کی جو راہ انہوں نے بنادی تھی اگر اسی راہ پر پھر غور کیا جاتا تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی راہ اسی سے پیدا ہو سکتی تھی۔

موجودہ دور میں نصاب تعلیم کیسا ہو؟

یہی بات قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن، حدیث، فقہ) کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر درس کے لیے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس جامع، حاوی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لیے پورے نصاب میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا، جس میں جب ضرورت تھی تو فارسی کے نظم ونثر کی بیسیوں کتابوں کی مکتبی زندگی میں منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصولِ کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ ستر کتابوں کی اعلیٰ عربی تعلیم میں کافی گنجائش نکل آئی۔ پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی اور جیسے جیسے زمانہ کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی۔ انہیں لازم قرار دیا گیا اور یوں ہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی مُلا، فلسفی مُلا

مہندس مُلا، ادیب مُلا، شاعر مُلا، الغرض باوجود مُلا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی، وہی بن بن کر نکلتے رہے۔

دینی اور دنیاوی تعلیمی نصاب کی یکجائی اور اس کا فائدہ

کیا بہ سہولت تمام آج بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی ان ہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان تھی اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی، بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لیے مطالبہ کر رہی ہے۔ ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر، اپنے نصاب میں ان جدید مضامین و شریک کر کے بجائے فلسفی مُلا کے سائنٹسٹ ملا اور بجائے منطقی مُلا کے سائیکالوجسٹ ملا وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے۔

ملائیت کہیے یا دینی علوم، ان کے لیے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لیے یا ایک دینی عالم ہونے کے لیے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔

وحدت نصاب کا مسئلہ

میں نہیں سمجھتا کہ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی جو مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی اے ہونے کے لیے کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے۔ اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوٰۃ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی؟

اور بالفرض ضروری غیر ضروری مضامین کی اسکولوں اور کالجوں میں جو کثرت ہے۔ یعنی وہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو اُستاد کے بغیر طلبہ کو نہیں آسکتے اور ان مضمون کو بھی پڑھایا جاتا ہے جنہیں اُستادوں کے بغیر یوں ہی ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہے اور پڑھتا ہے۔ اگر بدتمیزی کے اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں اور اپنا نصاب خود بنائیں۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے۔ یعنی دینیات کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کے نصاب کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا جو محسوس ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ اُسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر بآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لیے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں۔

ابن سینا کا تعلیمی نصاب

مثلاً میں نے آپ کے سامنے ابن سینا کے تعلیمی نصاب کا ایک حصہ ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ اگر اسی نمونہ کو

سامنے رکھ لیا جائے اور ابتدائی تعلیم کی بنیاد اسی نمونہ پر رکھی جائے۔ ابن خلکان نے لکھا تھا کہ:

''دس سال کی عمر تک ابن سینا نے قرآن عزیز اور ادب پڑھا، کچھ عقائد کے مسائل یاد کیے اور حساب الہند و جبر و مقابلہ سیکھا۔''

حساب الہند سے وہی ہندوستان کے حساب کا قدیم طریقہ مُراد ہے۔ جس میں پہاڑے وغیرہ یاد کرا کے آئندہ جمع، تفریق، تقسیم اور اس کی مختلف قسمیں سکھائی جاتی ہیں۔ آج کل جس کا نام ''میتھمیٹکس'' ہے۔ ممکن ہے ان سارے مضامین کے لیے دس سال کی عمر آج ناکافی ہو، اور ہے بھی یہی بات کہ ابن سینا پر ہر بچہ کو قیاس کرنا بھی غلط ہے۔ اب بجائے اس کے وہی سولہ سال کی عمر رکھ لیجیے، جو آج میٹرک پاس کرنے کی ابتدائی عمر ہے۔ یعنی اس عمر سے کم سن والے بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔

حواشی

(1) یہ محدثین کا ایک طریقہ تھا کہ جس کی قابلیت پر اعتماد ہوتا ہے۔ پڑھائے بغیر کتابوں کی روایت کرنے کی اجازت عطا فرماتے تھے جس کے مختلف طریقے تھے۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھیے۔

(2) آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوق تھا۔ حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ان کی دقتِ نظر کے مداحوں میں تھے۔ آپ نیمی (بہار) میں پیدا ہوئے اور مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی سے درس نظامیہ کی تکمیل کر کے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا کاروبار شروع کیا۔ ''آثار السنن'' کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جز قرار دیا ہے۔ یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ علامہ تھانوی نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے۔ مولانا شوق اردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے۔ جلال لکھنوی سے زبان کے مسئلہ میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی۔ ایک بڑی دردناک مثنوی اُردو میں لکھی ہے اور بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ سنا ہے ان کے صاحبزادے چاہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کو پھر شائع کریں۔

(3) نام نہاد ہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں زبردستی دینیات کے نام سے کچھ دنوں سے جو مضمون پڑھایا جاتا ہے اس کا اتنا نفع تو ضرور ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں میں مولویوں کے لیے کچھ نئی جائیدادیں قائم ہو گئی ہیں۔ لیکن طلبہ پر اس کا کیا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ یہ افسانہ خود اس مضمون کے پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں سے سنا جا سکتا ہے۔ عموماً ان اسکولوں اور کالجوں کے دینیات کے گھنٹے لڑکوں کی تفریح کے گھنٹے بنے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کے اُستادوں کا استعمال ان جدید تعلیم گاہوں میں مفرحات کی حیثیت سے

کیا جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی اور مرکزی مضامین کے ساتھ دینیات کی یہ طفیلی جبری تعلیم بچوں میں عموماً اُلٹا اثر پیدا کر رہی ہے۔ بجائے اعزاز و اکرام کے دین کی اہانت و تحقیر کا ذریعہ دینیات کی یہ تعلیم بنی ہوئی ہے۔ رہی انگریزی اور مولویانہ سائنس جن عربی مدارس میں داخل ہوئی ہے اس کے تجربات بھی آپ کے سامنے ہیں۔ اصلاح نصاب کے سب سے بڑے علم بردار مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے متعلق مختلف ذرائع سے مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ زمانہ اور ماحول کا یہ اثر ہے کہ طلبہ میں توازن باقی نہیں رہتا۔ انگریزی کی شُد بُد کے بعد دینیات کے طلبہ میں خود اپنے مضامین اپنی مولویت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہبی علماء کے مشاغل مثلاً امامت، خطابت وغیرہ کے کام کو مولویوں کا یہ گروہ باوجود مولوی ہونے کے اپنی شان سے گری ہوئی بات تصور کرتا ہے۔ میرے خیال میں تو لعنت کی یہ آخری شکل ہے کہ خود اپنے آپ پر آدمی لعنت بھیجنے لگے۔ وہ خود جو کچھ ہے وہی اُسے ملعونیت کا مظہر دکھائی دے۔

(4) یعنی آفتاب کے ہوتے ہوئے زحل ستارے کی روشنی سے آدمی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(5) تجربہ کی ہوئی بات کا جو تجربہ کرے گا، اسے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ

سولہ سال کی اس مدت میں ابتدائی تین سالوں تک بچوں کو ناظرہ قرآن، اُردو اور حساب و تختی نویسی میں لائے رکھا جائے اور اس کے بعد اُردو کی جگہ فارسی کی چند کتابیں اُردو ہی کو قوی کرنے کے لیے سال دو سال پڑھائی جائیں، اور اس کے بعد بجائے فارسی کے عربی زبان کی تعلیم قرآنی پاروں اور حدیث کے مختصر متن (مثلاً منبہات عسقلانی، بلوغ المرام وغیرہ) کسی فقہی متن (مثلاً قدوری) کے ساتھ دی جائے اور اس کو ایک سلسلہ فرض کیا جائے۔ اگر سات سال سے بھی فرض کیا جائے کہ بچے نے ابجد شروع کی ہے، تو سولہ سال تک پہنچنے کے لیے نو سال کی مدت ملتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ اس کافی طویل مدت میں حساب اور انگریزی کی قابلیت میٹرک والوں کے برابر نہ پیدا ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ قرآن ناظرہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں کی یکے بعد دیگرے تعلیم ہوگی اور تجربہ شاہد ہے کہ اُردو میں مسلسل اُردو ہی کی کتابوں کے پڑھتے چلے جانے سے چنداں کوئی نفع نہیں ہوتا۔ پانی میں گویا پانی کو ملانا ہے، جس سے کسی نئے مزے اور رنگ کی توقع نہیں ہوسکتی، لیکن اُردو ہی میں قوت پہنچانے کے لیے اُردو کی چند ریڈروں کے بعد بجائے اُردو کی کتابوں کے فارسی کے چند ریڈروں کی تعلیم دیجیے اور فارسی کو قوی کرنے کے لیے اسی کے بعد فوراً عربی شروع کرا دیجیے۔ عربی بھی بلی چوہے کے قصوں کی جگہ مسلمانوں کے دینی معلومات والی کتابیں یعنی قرآنی پارے فقہی متون، حدیث کے مجموعوں میں سے کوئی مختصر مجموعہ ان ہی کو عربی ادب سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال کی اس طویل مدت میں ان کاموں کی گنجائش کیوں نہ نکل آئے گی۔

اسلامی عربی کے صرف و نحو

یہ صحیح ہے کہ اسلامی عربی (یعنی جس میں مسلمانوں کے دینی علوم ہیں) اس کے لیے بھی نحو و صرف کے قواعد و مسائل کا جاننا ضرور ہے، لیکن کسی معمولی مختصر رسالے سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ (حال میں معلم عربی کے نام سے ایک اچھی جامع کتاب اُردو میں شائع ہو چکی ہے) جو کافی ہے، اس کے لیے شرح جامی و عبدالغفور تحریر سنبٹ والی منطقی نحو اور اشتقاق کبیر یا فیلالوجی والے وہ طویل صرفی مباحث جو بچوں کو اس وقت سکھائے جاتے ہیں، جب صغیر صرف کا بھی سمجھنا اور اس

کے قاعدوں پر حاوی ہونا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ قطعاً غیر ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں اگر حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔

(1) صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو استادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتیں۔

(2) اُردو میں ترقی کرنے کے لیے اُردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھائے چلا جانا کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرتا، بلکہ اُردو میں قوت پیدا کرنے کے لیے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لیے عربی کا سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

عربی زبان میں دینی معلومات

(3) عربی زبان کے صرف اسی حصّہ کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کے دینی معلومات ہیں۔ باقی عربی کے دوسرے حصّہ کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا جائے تو رکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے اختصاصی علماء بھی اس کے اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کیے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے، لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات ہی والی عربی ہے۔

(4) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی وحدیثی متون کے ذریعہ سے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے کہ یہ یک کرشمہ دو کار ہے۔

(5) اسلامی ادبیات والی عربی کے لیے نحوی وصرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی حاجت نہیں، جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحید کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔

انگریزی نصاب میں دینی کتابوں کی گنجائش

ان پنجگانہ اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اگر نصاب بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال میں میٹرک تک کی انگریزی و حساب کے ساتھ بچوں کے اندر اس کی صلاحیت کیوں نہ پیدا کی جائے گی کہ آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن و حدیث وفقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری ومتناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائے گا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے متناسب علوم کا کوئی گروپ (طائفہ) درس نظامیہ کے ان تین دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع کر سکتے ہیں۔ پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ بی اے کے بعد ایم اے کے اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں، پیدا کر سکتے ہیں۔ ان خصوصی فنون میں جہاں جدید علوم والسنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے اور سب سے اہم اصولی نفع نظامِ تعلیم کی اس وحدت کا وہی ہے کہ مُلّا ومسٹر، علماء ولیڈر کی باہمی کشمکش کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحب علم وفضل ہوگا۔ وہ پہلے مُلّا ہو

گا۔اس کے بعد پھر جس مضمون کو اس نے اختیار کیا ہوگا اُس کا ماہر قرار پائے گا۔ان شاء اللہ اس کے بعد مُلاّ ہی مسٹر ہوں گے، علماء ہی لیڈر ہوں گے اور لیڈر ہی علماء ہوں گے۔ جیسا کہ بارہ ساڑھے بارہ سو سال تک یعنی نظام تعلیم کی ثنویت (دوئی) سے پہلے مسلمانوں میں عموماً یہی ہوتا رہا۔

ابن رشد میں دینی اور دنیاوی علوم کا اجتماع

ابن رشد ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کرتا تھا اور اسی کے قلم کی علم فقہ میں وہ قیمتی یادگار ہے جس کا نام ''بدائۃ المجتہد'' ہے، فقہ کے ہر باب میں ائمۂ امصار و مجتہدین امام ابوحنیفہ شافعی، مالک، احمد وغیرہم کے مسالک پر قرآن و حدیث و آثار صحابہ کی روشنی میں اتنی اچھی بحثیں اس کتاب میں کی گئی ہیں کہ مشکل سے اس جوڑ کی کوئی کتاب فقہ جامع میں مل سکتی ہے۔

امام رازی اور دوسرے علماء

امام رازی ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے اور وہی قرآن کی اس معرکۃ الآراء تفسیر کے بھی مصنف ہیں جو ''تفسیر کبیر'' کے نام سے امت میں مشہور ہے۔ نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ شیعی علماء کا بھی یہی حال ہے۔ میر باقر داماد فلسفہ کے میدان کا یکہ تاز سمجھا جاتا ہے، لیکن کوئی باور کرسکتا ہے کہ جس نے ''الافق المبین'' جیسی پیچیدہ الٰہیاتی کتاب لکھی ہو، وہی ''شارع النجاۃ'' نامی کتاب فقہ شیعی کی بھی لکھ سکتا ہے۔ وہی شیعوں کی حدیث کی مشہور کتاب ''الکافی'' پر حاشیہ نگاری کا کام کرسکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں دینی اور دنیوی علم کے مرکب نصاب کو جاری کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کردی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گذرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔ اس سے پیشتر حکیم کامراں، دستور ہر بد وغیرہ کا ذکر گذر چکا ہے، جنہوں نے اسلامی علماء سے درسی کتابیں پڑھی تھیں۔ حکیم کامراں ان کتابوں کا درس بھی دیتا تھا۔ ان کے سوا اس ملک کے ہندو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عربی نصاب کو ختم کرتے تھے۔ بداؤنی نے عہد سکندری کے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے:

> ''یکے از شعراء عہد سکندر لودھی برہمن بود می گویند کہ باوجود کفر کتب علوم رسمی را درس می گفت۔'' (ج 1، ص 323)

> ''عہد سکندری کے شعراء میں ایک صاحب برہمن تھے، لوگوں کا بیان ہے کہ کفر کے باوجود علوم رسمی کا درس دیا کرتے تھے۔''

حالانکہ گزر چکا کہ سکندری عہد میں گو دینیاتی کتابوں کے ساتھ معقولاتی عناصر کا اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اتنا اضافہ تو قطعاً نہ ہوا تھا جتنا کہ فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ہوا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں ''علوم رسمی'' کی کتابیں جو پڑھاتا ہوگا۔ کیا وہ بزودی اور ہدایہ وغیرہ نہ پڑھاتا ہوگا۔ آخر جب حکیم کامراں سے مسلمان طلبہ تفسیر بیضاوی

پڑھتے تھے تو کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کے علوم رسمیہ کا یہ پڑھانے والا برہمن ان کتابوں کو نہ پڑھاتا ہو۔

قدیم دینیاتی کورس

خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں سے دینیات کا جو کورس بطور متروکہ کے ہم تک پہنچا ہے وہ اتنا مختصر اور چند گنی چنی کتابوں پر مشتمل ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے تعلیمی نظام میں اس عہد کے مروجہ علوم و فنون کی کتابوں کو ہم ان کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک ہم نے ان کو غیر دینی علوم کے ساتھ جوڑے رکھا۔ اسی بنیاد پر میرے نزدیک دین کی تعلیم کے لیے کسی مستقل جداگانہ نظام کو قائم کر کے مسلمانوں میں علمی انتشار اور دو عملی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دینیات کے اسی نصاب کے ساتھ جب مغلیٔ عہد کے درباری علوم و فنون منطق و فلسفہ، ریاضی، فارسی ادب کے نثر و نظم وغیرہ کی کتابوں کو جوڑ کر ہم نے تعلیمی نظام کی وحدت کو پوری قوت کے ساتھ جب باقی رکھا تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آج دینیات کے اسی مختصر کورس کو محور بنا کر عہد حاضر کے ٹکسالی علوم و فنون یا زبانوں کی تعلیم کو اس کے گرد ہم گردش نہیں دے سکتے۔ جوں ہی کہ زمانہ بدلا تھا، بزرگوں کے اسی نمونے کو پیش نظر رکھ کر دینیات کے محور کو قائم رکھتے ہوئے ذیلی مضامین کو اگر بدل دیا جاتا یا یہ نہ بھی کیا جاتا، تو مغلیات کو بھی اختیاری مضامین کا ایک گروپ قرار دے کر عصر یائی علوم کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا۔ کاش ایسا ہو جاتا تو آج بدتمیزی کے جس طوفان میں مسلمان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، غالباً یہ صورت نہ پیش آتی۔ ولکن ماقدر اللہ فسوف یکون۔

توحیدی نظامِ تعلیم کی ضرورت

لیکن وقت اب بھی اصلاح کا باقی ہے۔ تعلیم کی اس (ثنویت) اور دو عملی کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے۔ توحیدی نظام کو اب بھی اس کی جگہ جاری کیا جا سکتا ہے[1]۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ صرف اسلامی فرقے[2] مثلاً شیعہ وغیرہ ہی نہیں بلکہ غیر مذہب کے لوگوں سے اس معاملہ میں مصالحت کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف دینیات کی حدت تک شیعہ اپنی کتابیں پڑھیں اور دنیوی علوم والسنہ میں ہمارے ان کے اشتراک ہو۔ جیسا کہ قدیم نصاب میں یہی تھا بھی، جس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ بآسانی چل سکتا ہے، پھر کیا یہی طریقہ ہندو بھی نہیں اختیار کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا ایک مختصر سا مذہبی کورس بنا لیں۔ اس میں ہم سے الگ رہیں، لیکن دوسرے علوم والسنہ میں ہمارے ساتھ پڑھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہندو اگر ہٹ دھرمی ہی سے کام لیں گے تو مکتبی اور اسکولی تعلیم میں بجائے اُردو، فارسی کے بھاشا، اور بجائے عربی کے سنسکرت کو لے سکتے ہیں، لیکن یہ سارا نظم صرف ایک ہی نظام کے تحت یقیناً بغیر کسی دشواری کے چل سکتا ہے۔ خود ہندوؤں میں پنڈتوں اور تعلیم یافتوں میں بھی وہی جنگ برپا ہے۔ اس جنگ کے مٹانے کے لیے خود ان کو بھی ضرورت ہے کہ اس دو عملی کے ختم کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔

دینیات کا مختصر نصاب تجربہ کی روشنی میں

اب رہا یہ سوال کہ محض یہ بات کہ دینیات کا یہ مختصر کورس (یعنی ہدایہ، وقایہ، جلالین و مشکوٰۃ) والا نصاب چونکہ بزرگوں کا متروکہ ہے اور صدیوں کم از کم ہندوستان کی حد تک دینیات کے نصاب میں ان ہی کتابوں یا ان جیسی دوسری کتابوں کو دینیات کے درجہ ضروری کے لیے نہیں بلکہ درجہ فضل کے لیے کافی سمجھا گیا۔ کیا اس کی دلیل ہو سکتی ہے کہ صرف ان چند کتابوں کو پڑھا دینا اور پڑھ لینا آئندہ دینیاتی علوم میں مہارت و تبحر پیدا کرنے کے لیے کافی ہے؟ بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے جواب میں دو باتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ نتائج سے کفایت و عدم کفایت کا فیصلہ کیا جائے، یا یوں کہیے کہ پھل سے درخت کو پہچانا جائے قطع نظر اس سے کہ ہندوستان میں سوڈیڑھ سو سال نہیں بلکہ تقریباً سات سو سال تک دین کا سارا کاروبار دینیات کے اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں نے انجام دیا ہے۔ قضاء و افتاء، صدارت جیسی تمام مذہبی خدمات کو یہی لوگ قطب الدین ایبک کے زمانہ سے بہادر شاہ کے زمانہ تک بلکہ جب تک انگریزی حکومت کے محکمے مسلمان قاضیوں اور صدور کے ہاتھوں میں رہے، اس وقت تک یہی لوگ انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں حدیث کا، تفسیر کا، فقہ کا جتنا کام ہوا، اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں کے ہاتھوں ہوا، جس کی تھوڑی بہت تفصیل گذر چکی ہے، لیکن ان گذرے ہوئے ہندی علماء کے متعلق تو شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں جب ان علماء کے مقابلہ میں کوئی دوسرا تھا ہی نہیں تو کیا کہا جاتا۔ اپنے وقت کے رازی اور غزالی ان ہی کو سمجھا گیا۔ اس لیے اس بحث میں پڑنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا کہ اسی مختصر دینی نصاب کے پڑھنے والوں نے ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک جہاں کا سنا جاتا ہے کہ دینی نصاب عریض بھی ہے، اور طویل بھی ہے۔ ان ہی ممالک میں ان ہندی علماء نے مختلف قرون اور صدیوں میں اپنے آپ کو جو کچھ ثابت کیا ہے اس کی چند تاریخی شہادتیں پیش کر دوں۔

یہاں میں پھر یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندی نظامِ تعلیم میں نصاب کی حد تک رد و بدل جو کچھ ہوا اور ہوتا رہا ہے اس کا زیادہ تر تعلق غیر دینی علوم سے ہے، ورنہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے کہ دینیات پڑھانے کی حد تک کتابوں کا معیار تقریباً ہر زمانہ میں مساوی رہا ہے۔

قدیم نصاب میں تغیر

نصاب کے اس حصہ میں کچھ تغیر اگر ہوا ہے تو صرف کتابوں کی حد تک محدود ہے مثلاً فقہ میں پہلے ابن الساعاتی کی ''مجمع البحرین'' تھی۔ بعد کو بجائے ''مجمع البحرین'' کی ''شرح وقایہ'' شریک ہوئی۔ اسی طرح حدیث میں پہلے مشارق و مصابیح تھی ان کی جگہ مشکوٰۃ نے لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مضامین کی حد تک معیار پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑا، البتہ تفسیر میں پہلے درجہ فضل کی کتاب ''کشاف'' تھی۔ بعد کو ''کشاف'' عمومی نصاب سے خارج ہو گئی اور اس کی جگہ جلالین کامل و بیضاوی سورۂ بقرہ نے لے لی، جس کے یہ معنی ہوئے کہ پچھلے زمانہ کے اعتبار سے تفسیر کا معیار کچھ گھٹ گیا، لیکن نتائج

کا جہاں تک تعلق ہے، قرآن کے باب میں ہندوستان کی پچھلی صدیوں کا کام اگلی صدیوں سے یقیناً بہتر ہے۔ رہا ''ہدایہ'' سو اوّل سے آخر تک آج چھ ساڑھے چھ سو سال سے ایک حال میں قائم ہے۔

قدیم نصاب کے فارغین کی خدمات

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دینیاتی حصہ میں نصاب کا یہ تغیر کتنا معمولی تغیر ہے۔ قریب قریب کتابوں کی تعداد بھی دینیات میں برابر برابر رہی اور معیار بھی برابر ہی رہا ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ کے سامنے ان چند ہندوستانی مولویوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان سے باہر نکل کر اسلامی ممالک میں پہنچے ہیں۔ جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دینیات کے اسی مختصر نصاب کے نتائج کتنے عجیب اور حیرت انگیز بلکہ شاید مدہش ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس موقع پر ان لوگوں کا تذکرہ تو بے محل ہی ہوگا، جو نسلاً یا وطناً ہندوستانی تھے لیکن ان کی تعلیم بیرونی ممالک میں ہوئی۔ بلکہ ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہ کروں گا، جن کی تعلیم کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تکمیل کہاں ہوئی۔ ہندوستان سے باہر (3)؟ بلکہ اس موقعہ پر صرف ان ہی بزرگوں کو شہادت میں پیش کروں گا، جن کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا، ہندوستان ہی میں پڑھا۔ آیئے، اور تاریخ اس باب میں جو کچھ کہتی ہے اُس کا تماشہ دیکھئے۔

مصر میں سراج ہندی کے علم کا اعتراف

ساتویں صدی کا زمانہ ہے۔ یہ مصر ہے، یہاں اسلام کی عمر چھ سات سو سال سے زیادہ گذر چکی ہے۔ کابر اعن کابر نامی گرامی علماء اس ملک میں مسلسل پیدا ہوتے رہے ہیں۔ خصوصاً جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ وقت ہے کہ سارے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں مصر کے متعلق مشہور مورخ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

ولا اوفر الیوم فی الحضارۃ من مصر فھی اما العام و ایوان الاسلام و ینبوع العلم و الصنائع. (مقدمہ، مطبوعہ مصر۔ ص 479)

''آج (یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیانی زمانہ میں) مصر سے زیادہ حضارت (اسلامی کلچر) کا سرمایہ دار کوئی نہیں ہے۔ مصر ہی اس زمانہ میں مادر جہاں ہے، وہی اسلام کا ایوان ہے، علم اور صنائع کا آج وہی سرچشمہ ہے۔''

اور آخری بات یہ ہے کہ یہیں ازہر کا مشہور بین العالمی اسلامی جامعہ ہے۔ اسی قدیم اسلامی ملک میں ہندوستان کا ایک عالم پہنچتا ہے۔ اس کا نام سراج ہندی ہے، جس کی تعلیم اسی نو مسلم ملک ہندوستان میں پوری ہوئی ہے۔ علامہ طاش کبریٰ زادہ ''مفتاح السعادۃ'' میں لکھتے ہیں:

تفقه ببلادہ علی الوجیه الرازی و السراج الثقفی والرکن البدایونی

وغیرهم من علماء الهند. (مفتاح۔ ص59)

''سراج ہندی نے خود اپنے وطن ہندوستان میں علم وجیہ رازی اور سراج ثقفی رکن بداؤنی وغیرہ ہندی علماء سے حاصل کیا۔''

حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے:

كان قدومه بالقاهره قبل الاربعين [4] وهومتا هل للعلم.

(دُرر کامنہ۔ ج3، ص154)

''قاہرہ میں ان کی تشریف آوری چالیس سے پہلے اس وقت ہوئی جب وہ علم والے ہو چکے تھے۔''

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ''اہل علم'' بن کر مصر پہنچے تھے۔

عہدۂ قضا کی پیشکش

اب سنیے ہندوستان کے اس مختصر دینی نصاب کو پڑھ کر مصر پہنچنے والا ہندی عالم اپنے علمی کمال کی بدولت کہاں پہنچتا ہے۔ حافظ ابن حجر ان کے عام عالمی مناصب کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

ولى قضاء العسكر وناب فى القضاء عن جمال الدين ابن التركمانى مدة طويلة.

''عسکر کے قاضی ہوئے اور جمال الدین بن ترکمانی کی طرف سے نائب قاضی کا کام ایک زمانہ تک انجام دیا۔''

مگر بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ:

ثم ولى القضاء استقلالا فى شعبان سنه 769 بعد موت ابن التركمانى.

''پھر 769ھ شعبان میں قضاء کے اس عہدہ پر مستقل طریقہ سے مقرر کیے گئے، جب ترکمانی کا انتقال ہوگیا۔''

یعنی حنفیوں کے مستقل قاضی القضاۃ ہوگئے اور کیسے قاضی القضاۃ؟ مصر پر امام شافعیؒ کے زمانے سے شافعی علماء کا اقتدار قائم رہا اور بتدریج یہ اقتدار بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ایک خاص قسم کا امتیازی نشان جس کا 'الطرحہ' (غالباً ٹوپی یا دستار میں کوئی پھندنا ہوتا تھا) نام تھا، صرف شافعی قاضی کے لیے مختص تھا۔ اسی کے ساتھ یہ اختصاص بھی شافعیوں نے حاصل کرلیا تھا کہ پایۂ تخت قاہرہ تک تو حنفی قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوتا تھا۔ لیکن اضلاع اور مفصلات میں قاضی القضاۃ کی طرف سے قاضیوں کا تقرر صرف شافعی قاضی القضاۃ شافعی علماء کو کرسکتا تھا۔ حنفیوں کو اضلاع میں قاضیوں کے تقرر کرنے کا حق نہ تھا۔ نیز یتیموں کے مال کی نگرانی کا حق بھی صرف ان ہی شافعی قاضیوں کو حاصل تھا۔ خواہ وہ یتیم حنفی خاندان سے ہی،

تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ صدیوں کا یہ قائم شدہ رواج ایسا تھا کہ شافعی قضاۃ کے اس مسلمہ حقوق میں دست اندازی کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی تھی۔

سراج ہندی کے علم و عمل کے اثرات

لیکن پہلا حنفی عالم جس نے ان سارے ناواجب حقوق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے حنفی علماء کو ان کے چھینے ہوئے حق تک پہنچایا۔ وہ ہندوستان کا یہی عالم تھا جس کے علمی رعب داب کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا اور ملک کے اتنے قدیم رواج کو توڑنا پڑا۔ حافظ ابن حجر جو خود بھی شافعی اور اچھے خاصے متعصب شافعی ہیں، اپنی کتاب ''دُرر کامنہ'' میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

> وکان قدتکلم اهل الدولة واستنجز توقيعًا ان يلبس الطرحة (5)نظيراً لقاضی الشافعی وان يستنيب فی البلاد المصرية و يجعل له مود عالايتام الحنفية. (درر۔ ج3، ص155)
>
> ''سراج ہندی نے ارباب حکومت کو توجہ دلائی اور فرمان حاصل کیا کہ شافعی قاضی کی طرح وہ بھی الطرحہ پہن سکتے ہیں اور مصری بلاد میں اپنے نائب کا تقرر کر سکتے ہیں اور حنفی خاندان کے یتیموں کی جائیداد کی نگرانی بھی ان کے سپرد ہوئی۔''

سراج ہندی کی جدوجہد

واقعہ یہ ہے کہ اس حنفی عالم نے مصر میں ایک زلزلہ برپا کر دیا۔ حافظ نے لکھا ہے کہ اس شخص نے صرف ان باتوں پر قناعت نہ کی بلکہ:

> وتکلم فی نظر؟ جامع ابن طولون و استعاد الوقف الطرحی من نقيب الاشراف. (ج3، ص155)
>
> ''ابن طولون کی جامع کی نگرانی کے متعلق بھی حکام سے انہوں نے گفتگو کی، اور نقیب الاشراف سے وقف طرحی کی تولیت واپس کرائی۔''

اسی قسم کے کتنے معرکۃ الآراء اقدامات سراج ہندی کی طرف سے عمل میں آئے ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ حافظ نے ان کی علمی جلالتِ شان کا تذکرہ کرتے ہوئے باوجود اس دل گرفتگی کے جو طبعاً ہونی چاہیے، اقرار کیا ہے۔

ہندی عالم کا مصر میں درس قرآن

کان مستحضراً لفروع مذهبه اپنے مذہب کے جزئیات ان کو مستحضر تھے۔ یہ حال تو خیر اپنی فقہ حنفی کے

متعلق تھا۔ مصر جیسے ینبوع العلوم اور ایوان اسلام میں اسی مختصر دینیاتی نصاب کے تعلیم یافتہ عالم نے مصر کی مرکزی مسجد جامع ابن طولون میں مدتوں قرآن کا درس دیا۔ حافظ نے بھی تصریح کی ہے کہ:

اضیف الیه تدریس التفسیر بالجامع الطولونی لمامات البسطامی فی سنة 771۔

''یعنی بسطامی کا جب 771ھ میں انتقال ہوگیا تو جامع طولونی کے درس تفسیر کا بھی حکومت نے ان ہی سے تعلق کر دیا۔''

باوجود ہندی ہونے کے عربی زبان کی بول چال پر ایسی قدرت تھی کہ اس کا تذکرہ امتیازاً کیا گیا۔ حافظ نے سراج ہندی کی اخلاقی جرأت جو علمی کمال کا عموماً نتیجہ ہوتا ہے، ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

کان شهما مقداماً فصیحاله خطوة عندالامراء.

''وہ بڑے جری آگے آگے رہنے والے فصیح بلیغ آدمی تھے۔ امراء دولت کی نگاہوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں کوئی زبردست حویلی یا کوٹھی بھی انہوں نے بنوائی تھی۔ کوئی معمولی مکان ہوتا تو اس کے ذکر کی کیا حاجت ہے ''دُرر'' میں ہے۔

وعمر داره التی برحبة العید.

''عیدگاہ کے میدان میں دار (محل) تیار کیا۔''

سراج ہندی کی تصنیفات

سراج ہندی کے متعلق یہ شہادتیں تو خیر تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن ان کے سوا بھی ان کی علمی رفعت، شان، خصوصاً اسلامی علوم میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا۔ اس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوسکتا ہے جن کے متعلق حافظ ہی نے لکھا ہے:

صنف الصانیف المبسوطه.

''بڑی بڑی طویل کتابوں کے مصنف ہیں۔''

خصوصاً ''ہدایہ'' کی شرح توشیخ نامی ان کی طویل کتاب ہے۔ حافظ اس شرح کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

وهو مطول ولم یکمل.

''یہ بڑی طویل شرح اگرچہ مکمل نہ ہوسکی۔''

طاش کبریٰ زادہ نے اس شرح کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ:

وهو علی طریق الجدل.

''اس میں جدل (بحث) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی استدلالی شرح ہے۔ اس کے سوا بھی ان کی بیسیوں کتابیں فقہ واصول فقہ، خلافیات، جدلیات میں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام محمد بن حسن الشیبانی کی زیادات نیز جامع ''صغیر وکبیر'' کی بھی انہوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ حالانکہ قدماء کی ان کتابوں سے عام علماء کا کم تعلق رہ گیا ہے۔ ایک مستقل کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں بھی انہوں نے لکھی ہے، جس کا نام ''الغرة المنیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ'' ہے۔

مصری علماء میں انقلاب

بظاہر میرا تو خیال ہے کہ آٹھویں صدی کا زمانہ مصر میں وہ زمانہ ہے۔ جس میں ہم حنفی علماء میں ایک خاص انقلاب پاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں وہاں سے ''الجواہر النقی'' کے مصنف علاؤ الدین الترکمانی اُٹھتے ہیں اور اسی زمانہ سے بالکل متصل مصر ہی میں ابن ہمام پیدا ہوتے ہیں، جنہوں نے حنفیوں میں حدیث کا مذاق پیدا کیا۔ آج علماء احناف کا بڑا سرمایہ ابن ہمام کی شرح ہدایہ ہے۔ کاش! اس پر کام کرنے والے کام کرتے تو شاید اس کی سراغیابی میں دشواری نہ ہوتی کہ مذاق کے اس انقلاب کے پیچھے کیا اسی ہندی عالم کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ صاحب ''الجواہر النقی'' اور ان کے خاندان سے تو ان کا تعلق بالکل بدیہی ہے۔

تصوف کا تحفہ

اسی کے ساتھ ہندوستان سے جو خاص تحفہ مصر سراج ہندی لے گئے ہیں، وہ تصوف کا مذاق خصوصاً وحدت الوجود کے نظریہ کی تشریح ہے۔ تصوف کے متعلق ان کی مستقل کتاب یہی ہے۔ طاش کبریٰ زادہ نے سراج ہندی کے متعلق یہ لکھ کر:

كان واسع العلم كثير الاقدام والمهابة.

''ان کا علم بہت وسیع تھا، پیش قدمی میں جری تھے، جلال وہیبت والے تھے۔''

ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

كان يتعصب للصوفيه الموحدة.

''وحدت الوجود والے صوفیوں کی بڑی سخت حمایت کرتے تھے۔''

بلکہ یہ لکھا ہے کہ ابن حجلہ کوئی مصری عالم تھا، سراج ہندی نے

عزّره لكلامه فى ابن الفارض.

''اس کی سزا اس لیے دی کہ ابن الفارض کے کلام پر اس نے اعتراض کیا تھا۔''

غالباً ابن فارض کے قصیدہ تائیہ کی شرح کا تعلق کچھ اسی واقعہ سے ہے۔ ملا علی قاری نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے

جس کا نام ''لوائح الانوار'' ہے۔اس کتاب میں ان لوگوں کی شدت کے ساتھ تردید ہے جو صوفیہ پر منہ آتے ہیں۔773ھ میں مصر ہی میں وفات پائی، وہیں مدفون ہیں۔بہر حال ہندوستانی نصاب میں دینیات کے جس حصہ کو قامت میں کہتر خیال کیا گیا ہے، اس کی قیمت کی ان بہتریوں کو آپ دیکھ رہے ہیں۔یہ امتحان تو اس نصاب کا ایوان الاسلام اور ینبوع العلم والصنایع میں ہوا۔

دمشق میں ہندی عالم کی دھاک

آیئے۔اب چلیے، اسلامی علوم وفنون کا دوسرا گہوارہ ان ہی صدیوں میں دمشق ہے۔تاتاریوں کے فتنہ سے ماوراء النہر، توران، ایران، عراق کے علمی مراکز برباد ہو چکے ہیں۔جن ممالک تک تاتاریوں کا اثر نہ پہنچا ہے۔ان میں شام اور مصر بھی ہیں۔اس زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ تقی الدین سبکی، شمس الدین الذہبی، ابن قیم جیسے کبار جہابذہ سے دمشق کا دار العلوم معمور ہے۔ہر طرف علم ہی علم کا چرچا ہے۔اسی دمشق میں دینیات کی وہی تین کتابوں کے نصاب کا پڑھنے والا ایک غریب الوطن ہندی داخل ہوتا ہے۔ان کا نام شیخ صفی الدین ہے۔644ھ میں پیدا ہوئے۔بالاتفاق علماء کا بیان ہے کہ ہندوستان ہی میں:

اخذ عن جده لامه.

''اپنے نانا صاحب سے انہوں نے تعلیم پائی۔''

23 سال کی عمر تھی جب ہندوستان سے باہر نکلے، اور یمن پہنچے، اس وقت یمن میں الملک المظفر کی حکومت تھی، لیکن اس تئیس سالہ ہندی نوجوان عالم کے دل ودماغ، علم واستعداد سے اتنا متاثر ہوا کہ:

اکرمه واعطامه تسع مائة دینار. (درر کامنہ۔ج1 ص11)

''اس نے ان کا بڑا اکرام کیا، اور نوسو اشرفیاں پیش کیں۔''

طبیعت میں سیروسیاحت کا شوق تھا۔یمن سے مکہ پہنچے، مکہ میں کچھ دن قیام کر کے قاہرہ، قاہرہ سے اناطولیہ کے شہروں مثلاً قونیہ، سیواس، قیصریہ وغیرہ میں گھومتے رہے۔بالآخر اس طویل سیاحت اور ہر ملک کے علماء سے ملنے جلنے کے بعد جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

وقدم دمشق فاستوطنها.

''دمشق آئے اور اسی کو وطن بنالیا۔''

دمشق میں درس کا حلقہ

دمشق جن علماء سے اس وقت بھرا ہوا تھا۔اس کا ذکر آپ سن چکے، ان ہی علماء کے سامنے اسی مختصر دینیاتی نصاب کا عالم بیٹھتا ہے، اور

عقد حلقة الاشتغال بالجامع و درس بالرّواجيه والاتابكيه و الظاهريه الجوانيه وغيرها. (درر)وغیرہ

''بنی امیہ کی جامع میں درس کا حلقہ قائم کیا۔ اس کے سوا رواجیہ، اتابکیہ، ظاہریہ، جوانیہ وغیرہ مدارس میں بھی درس دیتے رہے۔''

یعنی دمشق کی مشہور جامع اموی میں درس کا حلقہ قائم کر دیا، جو اس زمانہ کے لحاظ سے معمولی بات نہیں ہے اور جامع اموی ہی نہیں، اور بھی دمشق کے متعدد مدارس میں پڑھاتے رہے۔ تاج الدین سبکی نے ''طبقات'' میں ان کے متعلق یہ لکھ کر:

اعلم الناس بمذهب ابى الحسن و ادراهم باسراره متصلعاً بالاصلين.

''امام ابوالحسن اشعری کے مذہب کے (اس زمانہ میں) سب سے بڑے عالم تھے، اور دونوں اصول یعنی فقہ وکلام سے سیراب تھے۔''

یہ سبکی کی اپنی چشم دید گواہی ہے۔ بہر حال اس کے بعد لکھا ہے کہ دمشق میں اس شخص نے:

شغل الناس بالعلم.

''لوگوں کو علم میں مشغول کر دیا۔''

ہندی عالم کی دمشق میں تصنیفات

تدریس کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سبکی ہی کا بیان ہے کہ

ومن تصانيفه فى علم الكلام الزبده وفى اصول الفقه النهايه والفائق والرسالة السبعية وكل مصنفاته حسنة جامعة لاسيما النهاية.

''ان کی تالیفات میں سے ایک کتاب زبدہ نامی علم کلام میں ہے، اور النہایہ وفائق اصول فقہ میں ہے۔ رسالہ سبعیہ بھی ان کی ایک کتاب ہے۔ بہر حال ان کی ساری کتابیں بہت اچھی اور جامع ہیں، خصوصاً النہایہ۔''

دمشق کے علماء اس ہندی کے علم کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اولاً تو اس کے لیے یہی بات کافی ہو سکتی ہے جیسا کہ سبکی نے لکھا ہے:

روى عنه شيخنا الذهبى.

''ہمارے استاد الذہبی ان سے روایت کرتے ہیں۔''

یعنی ذہبی جیسے امام علامہ ان کے شاگرد ہیں، مگر میں نے جس مقصد کے لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، یعنی ہندی نظام تعلیم کے نتائج کو دکھانا چاہتا ہوں کہ گھر کی مرغی خواہ جس نظر سے دیکھی جاتی ہو، دال اور دال سے بھی بدتر۔ لیکن

اسی دمشق میں اسلامی تاریخ کا ایک اہم علمی واقعہ پیش آیا۔اس وقت پتہ چلا کہ ہندوستان کے نصاب میں کیا کرامات پوشیدہ ہے۔اس واقعہ کا ذکر تقریباً عام تاریخوں میں ہے۔

ہندی عالم کا حافظ ابن تیمیہ سے مناظرہ

قصہ یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں جب یہ ہندی عالم دمشق میں مقیم تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنے تبحراور علم کے غیر معمولی بحران میں ایک خاص قسم کا طوفان اٹھائے ہوئے تھے۔گویا سمجھنا چاہیے کہ ان کے علمی ہنگاموں سے سارا عالم اسلام متزلزل تھا۔ بلکہ ایک حد تک تو اب تک ہے۔ان کی چومکھی بے پناہ تلوار اس طرح چل رہی تھی کہ معاصر علماء چیخ اُٹھے۔ بیسیوں نئے نئے مسائل(6) پیدا کر کے اہل علم کی محفلوں میں وہ ہلچل ڈالتے رہتے تھے۔ان ہی مسائل میں ایک مسئلہ ہے جو مسئلہ حمویہ کے نام سے مشہور ہے۔تنگ آ کر دمشق کے علماء نے آخر حکومت کو دست اندازی پر مجبور کیا،لیکن کسی معمولی شخصیت کا سوال نہ تھا۔ابن تیمیہ بہر حال ابن تیمیہ ہی تھے۔ مسلمانوں کے شیخ الاسلام تھے، اسلامی علوم وفنون خصوصاً حدیث ورجال وقرآن میں یہ واقعہ ہے کہ اسی زمانہ میں نہیں، ان کے بعد بھی مشکل ہی سے کسی کو ان کا حریف قرار دیا جا سکتا ہے۔دمشق کا امیر اس زمانہ میں امیر تنکر تھا۔خاص دار الحکومت میں جس کا نام دار السعادت تھا۔اس نے اپنے سامنے شیخ الاسلام سے مناظرہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس طلب کی۔ابن تیمیہ بھی بلائے گئے۔السبکی نے لکھا ہے کہ:

جمعت العلماء و اشار و ابان الشيخ الهندی یحضر فحضر

''علماء نے جمع ہو کر بالاتفاق فیصلہ کیا کہ شیخ ہندی کو بلایا جائے۔''

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ابن تیمیہ کے مقابلہ میں دمشق کے جو علماء بلائے گئے تھے، کسی نے اپنے اندر ان سے گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں محسوس کی فیصلہ کیا گیا کہ ''شیخ ہندی'' کو بلایا جائے۔امیر نے اسی بنیاد پر ان کو طلب کیا۔سبکی نے یہ بھی لکھا ہے:

و كان الامير تنكر يعظم الهندی ویعتقده.

''امیر تنکر ہندی کی بڑی عزت کرتا تھا اور ان کا بڑا معتقد تھا۔''

ہندی عالم کا وقارِ علمی

بہر حال ''شیخ ہندی'' بھی مجلس میں آ کر شریک ہوئے۔لکھا ہے کہ مناظرہ کی اس تاریخی مجلس میں

كان الهندی شیخ الحاضرين كلهم. (طبقات کبریٰ)

''ہندی ہی ان تمام علماء شام کا شیخ اور سردار تھا، جو اس مجلس میں موجود تھے۔''

جس سے کلام کی جرأت کسی کو نہیں ہو رہی تھی۔شیخ ہندی نے بے محابا، ان ہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو مخاطب کیا۔غالباً السبکی بھی اس مجلس میں موجود تھے۔بہر حال ان کا بیان ہے۔اس وقت شیخ ہندی کی جو حالت تھی گویا اس کی تصویر یہ ہے۔

کان الھندی طویل النفس فی التقریر اذا شرع فی وجہ یقررہ لایدع شبھۃ ولا اعتراضاً الا اشار الیہ فی التقریر بحیث لایتم التقریر الا وقد بعد علی المعترض مقاومتہ.

''تقریر میں ہندی بہت دراز نفس واقع ہوئے تھے، کسی پہلو پر جب تقریر شروع کرتے تو کچھ اس طرح اس کو بیان کرتے تھے کہ جتنے شبہات یا اعتراضات کا امکان ہو سکتا تھا اپنی تقریر ہی میں اس کی طرف اشارہ کر جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب تقریر ختم ہوتی تھی تو اعتراض کرنے والے کے لیے اس کا جواب سخت دشوار ہو جاتا تھا۔''

ہندی عالم کے سامنے ابن تیمیہ

یہ تو شیخ ہندی کا حال تھا، اس کے مقابلہ میں شیخ الاسلام پر شیخ ہندی کے اس طرزِ تقریر کا کیا اثر مرتب ہوا۔ السبکی ہی سے وہ بھی سن لیجیے:

اخذ ابن تیمیہ یعجل علیہ علیٰ عادتہ وقد یخرج من شئی الی شئی.

''ابن تیمیہ نے حسب دستور جلد بازی سے کام لینا شروع کیا، اور ایک بات کو چھوڑ کر دوسری کی طرف نکلنے لگے۔'' (یہ کیفیت ان پر طاری ہوگئی)

گویا اپنی معلومات کی وسعت اور ذہنی انتقال کی قوت سے ہندی کو وہ مرعوب کرنا چاہتے تھے اور کوئی شبہ نہیں ہے کہ ابن تیمیہ کے معلومات جو درحقیقت بحرِ زخار ہیں، جن کو آج بھی ان کی کتابوں میں پڑھ کر آدمی کچھ مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ بات میں بات ان کو یاد آتی چلی جاتی ہے۔ دماغ معلومات کا خزانہ ہے۔ ایک کے بعد ایک چیز گویا اُبلتی چلی جاتی ہے۔ مگر ہندی شیخ بھی ہندی تھا۔ ہندوستان کے اس درس کو تجربہ تھا، جس میں سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا ہے کہ اصل حقیقت لفظوں کے گورکھ دھندوں میں نگاہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ابن تیمیہ کے اس انداز کو دیکھ کر شیخ صفی الدین سے نہ رہا گیا اور باوجود ان کی جلالتِ شان کے شیخ کو کہنا پڑا۔

ماارٰک یا ابن تیمیہ الا کالعصفور تفط من ھنا الیٰ ھنا.

''ابن تیمیہ میں تمہیں نہیں پا رہا ہوں لیکن اس چڑیا کی طرح جو اِدھر سے پھدک کر اُدھر جاتی ہے اور اُدھر سے اِدھر۔''

ابن حجر نے ''دُرر'' میں، شوکانی نے ''بدر'' میں، شیخ ہندی کی طرف ان ہی الفاظ کو منسوب کیا ہے۔ لیکن السبکی جن کا بیان سب سے زیادہ قابل وثوق ہے، انہوں نے لکھا کہ شیخ نے کہا:

ما اراک یا ابن تیمیہ الا کالعصفور حیث اردت ان اقبضہ من مکان خرالی مکان آخر.

''ابن تیمیہ میں تمہیں چڑیا کے مانند پاتا ہوں، جہاں چاہتا ہوں کہ پکڑوں، تو وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہو۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام پر پھدکنے والی چڑیا کی کیفیت جو طاری ہوگئی تھی، وہ شیخ ہندی کی ان گرفتوں کا نتیجہ تھا، جن سے تڑپ کر وہ دوسری شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شیخ وہاں بھی ان کو چین نہیں لینے دیتے۔ یوں ہی ''کود'' ''پھاند''، ''اچھل'' اور ''پھدک'' کا ایک سلسلہ تھا، جو جاری تھا۔

شیخ ہندی سے مناظرہ اور اس کا نتیجہ

واللہ اعلم حاصل کیا نکلا، شیخ الاسلام شیخ ہندی کے پنجوں میں گرفتار بھی ہوئے یا یوں ہی پھدکتے ہی رہے تاہم امیر تنکر نے جو یہ فیصلہ کیا، جیسا کہ السبکی نے لکھا ہے۔

نودی علیه فی البلادو علیٰ اصحابه و عزلوا عن وظائفهم.

''حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کے متعلق سارے ملک میں اعلان کرا دیا گیا اور حکومت کے عہدوں سے سب معزول کر دیئے گئے۔''

یہ بھی لکھا ہے کہ

وحبس ابن تیمیه بسبب تلک المسئلة.

''اس مسئلہ کی وجہ سے ابن تیمیہ کو جیل بھیج دیا گیا۔''

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ہندی نے آخر مضبوط پنجہ ڈالا، جس سے کم از کم امیر تنکر اور مجلس والوں کا یہی فیصلہ ہوا کہ اس سے وہ نکل سکے۔ واللہ اعلم۔ (7)

درس نظامی کی برکات

مجھے اس سے بحث نہیں کہ واقعی اس مسئلہ میں جس میں مناظرہ ہوا تھا، حق پر کون تھا اور نہ اس غلط فہمی میں کسی کو مبتلا ہونا چاہیے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی علمی عظمت و جلالت سے مجھے انکار ہے، بلکہ اس وقت تو صرف یہ دکھانا تھا کہ ہمارے ملک کے اس چھوٹے موٹے نصاب نے اپنے نتائج کی قیمت کہاں جا کر حاصل کی۔ اتنا تو کم از کم سب کو ماننا پڑے گا کہ اس مسئلہ یا بحث کی حد تک دمشق کے سارے علماء نے اس ہندوستانی عالم کے سامنے اپنی اپنی سپر ڈال دی۔

حالانکہ لطف یہ ہے کہ سراج ہندی میں جو طلاقت لسانی تھی، بیچارے شیخ صفی الدین اس صفت سے محروم تھے، ابن حجر وغیرہ سبھوں نے لکھا ہے کہ:

کانت فی لسانه عجمة الهنود باقیة الی ان مات. (ص 15، ج 4)

''صفی ہندی کی زبان میں ہندوستانی زبان کی خصوصیت آخر وقت تک باقی تھی حتی کہ وہ مر گئے۔''

یعنی بیچارے کچھ بولنے سے سراج الہندی کے مانند طرار وفرار بھی نہ تھے، لیکن وہی بات جیسا کہ ان شاء اللہ آئندہ معلوم ہو گی۔ ہندی طریقۂ درس کی جو خصوصیت ہے، گرفت کا ملکہ ان میں غیر معمولی تھا۔ دماغ اتنا مانجھا اور تیز کیا ہوا تھا کہ نازک سی نازک بات بھی ان سے بچ کر نکل نہیں سکتی تھی۔ جیسا کہ سبکی کی زبانی آپ سُن چکے، ایوان اسلام مصر، اور خطیرۃ الابدال شام میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنے جن نتائج کا اظہار کیا۔

ہندی فضل وکمال کا اعتراف حرمین میں

اس کا تماشا آپ دیکھ چکے۔ اب آیئے قبلۃ الاسلام وکعبۃ الایمان تشریف لایئے۔ یہ سرزمین عرب ہے اور یہ اس کے دونوں مقدس شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں۔ مختلف قرون واعصار میں مسلمانوں کے ان مرکزی شہروں میں ہندی فضل وکمال کو جو سراہا گیا ہے اس کی پوری تفصیل کے لیے یہ مبالغہ نہیں کہ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب المتقی، ان دونوں حضرات کا ذکر تو شاید اپنے موقعوں پر آ بھی چکا ہے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ جن کے حوالہ سے علی المتقیؒ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے اُس قرآن کا ذکر گذر چکا ہے، جو صرف ایک ورق پر لکھا ہوا تھا۔ یہی عبدالوہاب شعرانی اپنی مشہور کتاب ''طبقات الصوفیہ الکبریٰ'' میں اپنا یہ بیان شیخ علی متقی کے متعلق درج کرتے ہیں۔

هو الشيخ الهندى نزيل مكة الشرفة اجتمعت به فى سنة سبع واربعين و تسعمائة وترددت اليه و تردد الى.

''شیخ ہندی جن کا مقام مکہ معظمہ میں ہے، 947ھ میں ان سے مَیں مکہ ہی میں ملا۔ میں بھی شیخ کے پاس آتا جاتا تھا اور وہ بھی میرے پاس آتے جاتے تھے۔''

علی متقی ہندی شعرانی کی نظر میں

شعرانی نے اس کے بعد شیخ علی متقی کے علم وتقویٰ اور ان کے اصحاب ورفقاء مریدوں کی عجیب وغریب کیفیتیں درج کی ہیں۔ آخر میں دسویں صدی ہجری کا یہ مصری امام جو علوم ظاہری اور مقاماتِ باطنی کا جامع ہے، اپنی یہ شہادت ایک ہندوستانی عالم کے متعلق قلمبند کرتا ہے۔

ما اعجبنى فى مكة مثله.

''مکہ معظمہ اُن جیسا کوئی آدمی میری نگاہوں میں نہیں جچا۔''

دوسرے ہندی علماء

شیخ عبداللہ بن ملا سعد اللہ، شیخ محمد بن الہندی، شیخ محمد بن محمد الدمراجی اور ازیں قبیل پچھلی صدیوں یعنی آٹھویں نویں صدی میں ہندوستانی علماء کا ایک سلسلہ ہے، جو ان شہروں میں ہجرت کر کے قیام پذیر ہوا اور اپنے علم وعمل کے گہرے

نقوش وہاں کے باشندوں کے قلوب پر قائم کیے۔ آخر زمانہ میں شیخ ابوالحسن سندھی، شیخ حیات سندھی نے مدینہ منورہ میں درس حدیث کا جو حلقہ قائم کیا، خصوصاً شیخ حیات سندھی، جن سے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے حدیث کی سند حاصل کی، ان کے متعلق تو مولانا آزاد نے یہ ارقام فرما کر کہ:

''تمام عمر در خدمت حدیث شریف صرف ساخت، و تجرے عظیم دریں فن شریف انداخت۔''

''پوری عمر علم حدیث شریف کی خدمت میں گزاری اور اس فن میں عظیم الشان تبحر حاصل کیا۔''

لکھا ہے اور لکھا گیا اسی حال میں خود دیکھا ہے کہ:

''خواص حرمین مکرمین در مصر و شام و روم اعتقاد و اخلاص واشتند و از ذات ہمایوں کسب برکات می نمودند۔'' (مآثر۔ ص164)

''حرمین ومکرمین کے خواص، مصر، شام اور روم میں بہت اعتقاد و اخلاص رکھتے تھے اور آپ کی مبارک ذات سے فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔''

عابد سندھی

سندھ ہی کے دوسرے مدنی حضرت شیخ عابد سندھی ہندوستان سے یمن پہنچے۔ وہاں کے وزیر کی لڑکی سے شادی کی۔ حکومت صنعاء نے ان کو سفیر بنا کر مصر بھیجا۔ ''الیانع الجنی'' میں علامہ محسن البہاری لکھتے ہیں:

وکان ھو سبب المعرفة بینه و بین والیٰ مصرو وقوفه علی بعض فضله واشرافه علی شئی من عظم شانه. (ص70)

''یہی سفارت وجہ ہوگئی اس تعارف کی جو مولانا عابد سندھی اور خدیو مصر میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسی ذریعہ سے خدیو کو مولانا کے علم و فضل کے جاننے کا موقعہ ملا اور ان کی جلالت قدر کا وہ کچھ اندازہ کر سکا۔''

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدیو مصر ان کے علم و فضل تقویٰ و ورع سے اتنا متاثر ہوا کہ شاید مصر میں ایک دوسرا سراج ہندی کھڑا ہو جاتا، اگر وہ مصر میں قیام فرما لیتے، لیکن جیسا کہ مُلا محسن ہی نے لکھا ہے:

وکان الشیخ شدید التحنن الی ربوع طابه عظیم التشوق الی شذا ھا کثیر التساوال من ربه لمحیاہ فیھا و مماته بھا والا ستظلال بذرا رسول اللہ والانحیاز الی حماہ. (الیانع۔ ص70)

''شیخ عابد سندھی کو مدینہ منورہ کی سرزمین سے شدید عشقی تعلق تھا اور مدینہ پاک کی نیم روح پرور کے لیے انتہائی اشتیاق رکھتے تھے۔ خدا سے بکثرت اس کی التجا کرتے رہتے تھے کہ اسی پاک

سرزمین میں زندہ رہیں اور اسی میں مریں۔ اور چاہتے تھے کہ رسول اللہؐ کے سایہ میں جئیں اور آپ ہی کے احاطہ میں مقیم رہیں۔

اسی لیے بجائے مصر کے وہ مدینہ منورہ ہی چلے آئے، اور

واقام بها فی غاية مايكون من العزوولی رياسته علمائها من قبل والی مصر ..... وكان احسن الناس سمتا فی زمانه كثرثناء الناس عليه فی حياته وسمرهم بمافخره بعد وفاته. (ص72)

''انتہائی عزت کے ساتھ مدینہ میں ان کا قیام رہا۔ بالآخر مدینہ کے علماء کی ریاست کے بھی مالک والی مصر کی طرف سے مقرر ہو گئے۔ چال وچلن، طور وطریقہ میں بہترین آدمی تھے۔ لوگ ان کے مداح تھے اور وفات کے بعد لوگ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔''

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حرمین شریفین میں وقتاً فوقتاً ہندی علماء کو امتیاز حاصل ہوتا رہا ہے۔ اس کی فہرست بحمداللہ بہت طویل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں کچھ حضرات تو ایسے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں پڑھا اور یہاں سے نکلنے کے بعد بھی دوسرے اسلامی ممالک کے علماء سے استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ عابد سندھی کا جو حال ہے کہ اپنے خاندان خصوصاً چچا سے پڑھنے کے بعد یمن کے مشہور تعلیمی شہر زبید کے علماء سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ لیکن اکثریت زیادہ تر ان ہی لوگوں کی ہے، جنہوں نے جو کچھ پڑھا ہندوستان ہی میں پڑھا، جو کچھ سیکھا اپنے وطن ہی میں سیکھا۔ حرمین پہنچ کر افادہ نہیں بلکہ استفادہ کی مجلسیں گرم کیں۔

1857ء کے بعد بعض علماء حرمین میں

خصوصاً اس مشہور فتنہ ہندیہ کے بعد علامہ محسن بہاری نے جس کی عجب تعبیر کی ہے۔ لکھا ہے:

وقعت الفتنة الهائلة فی الهند عام القرطاس وتسلط العلوج علی دهلی و تحكموا فی اهلها.

''واقع ہوا ہندوستان میں وہ ہائل فتنہ ''القرطاس(8)'' والے سال میں اور گنواروں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے باشندوں پر زبردستی حکومت قائم کر لی۔''

بہر حال اس فتنہ کے بعد جو ہندوستان سے ایک قافلہ ہجرت کر کے حجاز چلا گیا، جن میں علماء بھی تھے اور مشائخ بھی۔ ان مشائخ میں حضرت شیخ الشیوخ حاجی امداد اللہؒ نے جو عزت حاصل کی، وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مدینہ منورہ میں

علماء میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ نے دلّی سے اپنے حلقۂ درس حدیث کو اسی فتنہ کے بعد جب مدینہ منورہ منتقل

فرمایا تو ان کے تلمیذ رشید صاحب کتاب ''الیانع الجنی'' یعنی وہی علامہ محسن بہار فرماتے ہیں اور یہ شہادت شاہ صاحب کی زندگی ہی میں مدینہ میں بیٹھ میں قلمبند فرماتے ہیں، یہ لکھ کر کہ

فهو على ماعوده من الخير جاد فيه لايفتر عما كان عليه ليلا ونهاراً مشتغل بالحديث مشغوف بروايۃ.

''جس چیز کا التزام انہوں نے فرمالیا تھا، اس کی نفع رسانیوں میں وہ مصروف ہیں۔ شب و روز بغیر کسی انقطاع اور ماندگی کے اسی میں مشغول ہیں۔ حدیث اور اس کی روایت میں انہماک اسی حال میں ہے۔''

آخر وہی ہندوستان جس کا سرمایہ مشارق ومصابیح ومشکوۃ سے زیادہ حدیث میں نہیں ہے۔ اپنے ایک فرزند کو مادی الاسلام میں اسی حدیث کی تدریس میں اس مقام پر پاتا ہے کہ علامہ محسن فرماتے ہیں:

فهو اليوم غديقها المرجب والمحدث بين البتيها. [9] (ص59)

''آج مدینہ کا سب سے باردار نخل آپ ہی کا وجود باجود ہے اور وہی مدینہ کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان کا ''المحدث'' ہے۔''

اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ''المحدث بين لابتيها'' (مدینہ کے دولابتیوں کے درمیان سب سے بڑا محدث وہی ہے) یہ الفاظ اس شخص کے متعلق لکھے گئے ہیں جس نے ہندوستان کے سوا کسی بیرونی ملک میں کچھ نہیں پڑھا ہے۔

علم حدیث اور دوسرے علوم میں ہندوستان کا مقام

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر اس قصہ کو چھیڑا جائے گا تو یہ مستقل داستان اختیار کرلے گا۔ اب میں بر سرِ مطلب آتا ہوں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں بدنام ہندوستان جسے خود اس کے کپوت فرزندوں نے خود بدنام کیا ہے۔ غیروں سے زیادہ اس رسوائی میں اپنوں کا ہاتھ افسوس کہ زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔ اسی ہندوستان کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کچھ نہ تھا اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق جو مقالہ خاکسار نے ''الفرقان'' کے لیے لکھا ہے، اس میں مَیں نے بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہے، لیکن اسی مضمون میں یہ بھی ظاہر کردیا گیا تھا کہ لفظی حد تک یا سند کے لحاظ سے صحیح ہے کہ حجاز سے حدیث کی سند لانے والوں میں شاہ صاحب اُن لوگوں میں ہیں جن کی وجہ سے اس علم کا بوجوہِ مختلفہ ہندوستان میں بہت چرچا پھیل گیا، لیکن لوگوں نے شاید اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ اسی کے ساتھ مَیں نے اسی خاندان کے فیض یافتہ اور ولی اللہی خانوادہ کے عاشق شیفتہ مولانا محسن بہاری کے حوالہ سے یہ فقرہ ان کی مشہور اور مستند کتاب ''الیانع الجنی'' سے نقل کیا تھا کہ شاہ صاحب کے سب سے بڑے اُستاد فی الحدیث جن کے متعلق علامہ بہاری نے لکھا ہے:

وهو عمدة ابى عبدالعزيز من بيت مسائخه واكثرله نفعا. (ص81)

''ابوعبدالعزیز (یعنی شاہ ولی اللہ) کے اُستادوں میں وہ (یعنی شیخ ابوطاہر بن ابراہیم الکردی

المدنی) ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، اوران ہی سے شاہ صاحب کوسب سے زیادہ نفع پہنچا۔"

شاہ ولی اللہ شیخ کردی کی نظر میں

لیکن اسی مدنی اُستاد نے اپنے ہندی شاگرد کو کیا کہا تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں بھی نقل کیا ہے، یعنی:

انه كان يسند عنى اللفظ و كنت صحيح منه المعنى (ص81)

"لفظ کی سند مجھ سے وہ (شاہ ولی اللہ) حاصل کرتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ سے حدیثوں کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔"

علامہ بہاری نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے:

و كتبهما فيما كتب.

"شاہ صاحب کو جو سند لکھ کر (شیخ طاہر) نے دی اس میں بھی یہ لکھا۔"

جس کا یہی مطلب ہوا کہ شاہ صاحب کی سند میں بھی ان کے ان اُستاد نے اس عجیب وغریب اعتراف کو درج کیا تھا۔(10)

حجاز کی خوشحالی

میرے عرض کرنے کی غرض یہ ہے کہ اگر یہ اعتراف شیخ طاہر کا صحیح ہے اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو پھر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس درس کے نتائج مصر وشام میں میدان جیتا تھا۔ کیا حرمین میں اس نے اس اعتراف کے ذریعہ جو امتیاز حاصل کیا ہے کیا کم ہے۔ یادرکھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں ہندی علماء کی سرزمین حجاز میں یہ قدر افزائیاں ہوئی ہیں۔ اس وقت حجاز وہ حجاز نہیں تھا، جواب ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سلطنت ترکی اور حکومت مصر دونوں طرف سے کروڑہا کروڑ روپیہ ان دونوں شہروں پر صرف اس لیے خرچ ہوتے تھے کہ دنیائے اسلام کے جس گوشہ سے بھی لوگ ان شہروں میں پناہ گیر ہوتے تھے ان کے معاش کا سامان کردیا جاتا تھا۔ قسطنطنیہ کا شہر، اس شہر کے تمام بازار دکانیں ایک ایک کر کے مدینۃ النبیؐ پر اسی دن سے وقف تھیں جس دن حضرت سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے فرمایا تھا۔

وقفت مدينة قيصر على مدينة النبیؐ.

"میں نے قیصر کے شہر کو پیغمبر کے شہر پر وقف کردیا۔"

اس وقف پر کمالی دور سے پہلے بغیر کسی انقطاع کے عمل ہوتا رہا۔ یہی حال مصر کا تھا کہ جس سرزمین کی پیداوار کو دیکھ کر دماغوں میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا پانچواں حصہ حرمین پر وقف تھا اور اس کے سوا بھی ان دونوں حکومتوں کی جانب سے ساکنین حرمین کی جو خدمتیں ہوتی تھیں، ان سے کون ناواقف ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیائے اسلام کے اہل فضل وکمال کا ان دونوں شہروں میں اجتماع رہتا تھا۔ گویا حجاز میں صرف حجاز کے علماء کے سامنے نہیں بلکہ سارے اسلامی ممالک کے علماء کے سامنے یہ انتخابات ہوئے ہیں، جن میں ہندی علماء نے تقریباً ہر زمانہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ

جس اصول پر ان کی تعلیم ہوتی ہے اور اس تعلیم سے جس قسم کی ذہنی تمرین وتشمید ہوتی ہے، دوسرے علاقوں کے تعلیمی طریقے ایسے نتائج نہیں پیدا کر سکتے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم

شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نصاب کا کچھ ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا اپنے والد مرحوم سے پڑھا تھا۔ جو مشہور معقولی عالم میرزا زاہد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ حدیث کا سرمایہ جو ہندوستان سے پڑھ کر گئے تھے، وہ کل یہ تھا۔

''از علم حدیث مشکوٰۃ تمام آں خواندہ شد الا فوتے یسیر از کتاب البیع تا کتاب الادب......
طرفے از صحیح بخاری تا کتاب الطہارت۔'' (ص 194)

''حدیث میں پوری مشکوٰۃ بجز چند ابواب یعنی ''کتاب البیع'' سے ''کتاب الآداب'' تک میں نے پڑھی تھی اور بخاری شریف کا ایک حصہ یعنی صرف کتاب الطہارت تک۔''

بخاری کا نام اس میں ضرور ہے لیکن ''تا کتاب الطہارت'' کے الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تبرک سے زیادہ اسے پڑھنے کی اور کوئی حیثیت نہ تھی۔ اگر اس ''تا'' میں کتاب الطہارت کو داخل بھی سمجھا جائے تو گن لیجیے۔ ابتداء سے یہاں تک چند اوراق سے کیا وہ زیادہ ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ پڑھنے کی حد تک واقعتہً انہوں نے بھی وہی مشکوٰۃ ہی پڑھی تھی لیکن باوجود اس کے جن کی عمریں درس حدیث ہی میں گزری تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے معانی وہی بتاتے تھے، میں تو صرف لفظ بتاتا تھا، اور ہے بھی یہی بات کہ شاہ صاحب نے حجاز میں اُستادوں سے حدیث جو پڑھی تھی۔ زیادہ تر وہ بطریقہ سرد ہی پڑھی تھی۔ اپنے اساتذہ حدیث کے طریقہ درس کا ذکر فرماتے ہوئے ''انفاس'' میں لکھتے ہیں:

''مختار شیخ حسن عجمی، واحمد قطان، وشیخ ابوطاہر وغیر ایشاں طریقہ سرد بود۔''

''شیخ حسن عجمی، احمد قطان اور شیخ ابوطاہر وغیرہ کا پسندیدہ طریقہ سرد (رواداری) ہی تھا۔''

اور گذر چکا کہ سرد کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ

''شیخ یا قاری دے تلاوت کند بے تعرض مباحث لغویہ وفقہیہ واسماء رجال وغیر آں۔''
(ص 187)

''شیخ یا پڑھنے والا کتاب پڑھتا جاتا اور مباحث لغویہ، فقہیہ اور اسماء رجال وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔''

اس کے بعد کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں (حجۃ اللہ، مسوّیٰ، ازالۃ الخفا وغیرہ) میں حدیثوں کے جو معانی بیان کیے ہیں۔ جن پہلوؤں کی طرف ان کا دماغ گیا ہے، وہ طریقہ سرد کی اس تعلیم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ الفاظ اور سند کی حد تک حدیث وہ حجاز سے ضرور لائے، لیکن معانی کا انکشاف ان پر جو کچھ ہوا ظاہر ہے کہ اس میں

زیادہ تر دخل تو ان کے خداداد دل ودماغ ہی کو ہے۔ لیکن تعلیم تو نام ہی اس کا ہے کہ جس میں جتنی صلاحیت بالقوہ ہو، اسے بالفعل کردے اور اسی لیے ہندوستانی نظام تعلیم کا حق ہے کہ شاہ ولی اللہ کی دماغی تربیت کے سلسلہ میں اس کا جو حصہ ہے، اس سے اس کو محروم نہ کیا جائے۔

قسطنطنیہ میں ہندی علماء

مصر وشام وحجاز کو ختم کر کے اب آیئے اس آخری شہر میں جہاں سب سے آخر میں ہماری تعلیم وتہذیب دفن ہوئی ہے۔ میری مراد اسلامبول یا مسلمانوں کے آخری دارالحکومت قسطنطنیہ سے ہے۔ کوئی کتابی شہادت تو اس وقت پیش نہیں کرسکتا۔ لیکن جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ کتابی واقعات سے بھی زیادہ بحمداللہ اس میں قوت ہے۔ قصہ تو طویل ہے، میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔ میں نے براہ راست اس قصہ کو حضرت مولانا محمد علی قبلہ" مونگیری خلیفہ ارشد حضرت مولانا فضل رحمٰن قدس سرہ وبانی ندوۃ العلماء سے سنا ہے۔ عام لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو، لیکن خواص جانتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت کا اقتدار جب قائم ہوا تو اس کے زیر سایہ شروع میں عیسائی مذہب پھیلانے کی پوری کوشش کی گئی۔ اگرچہ بظاہر حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی سلسلہ میں فنڈر نامی ایک عیسائی پادری یورپ سے ہندوستان پہنچا، جسے عربی وفارسی اور اسلامی علوم میں باضابطہ ماہر بنایا گیا تھا۔ اس نے اسلام پر اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائیت اور عیسائی مذہب سے ظاہر ہے کہ دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ علماء بھی اس مذہب کے تفصیلات سے ناواقف تھے۔ شروع میں تھوڑی بہت پریشانی علماء میں ضرور پیدا ہوئی، لیکن انا لہ لحافظون کے وعدہ کی تکمیل جیسا کہ ہمیشہ ہوتی رہی ہے، اس کا ظہور بایں شکل ہوا کہ بہار کے ایک ڈاکٹر وزیرخاں نامی مرشد آباد سے یورپ چلے گئے تھے۔ وہاں انگریزی زبان تو خیر انہوں نے سیکھی ہی تھی۔ عیسائی مذہب کی کتابیں، شروح وتفاسیر کا ایک طومار اپنے ساتھ یورپ سے لائے تھے۔ غالباً آگرہ یا کسی شہر میں وہ سرکاری طور پر ڈاکٹر بھی تھے۔ ان ہی ڈاکٹر وزیر صاحب اور کیرانہ کے ایک عالم مولانا رحمت اللہ صاحب سے تعلقات ہوگئے۔ اب یہ ہندی نظام تعلیم کا اثر تھا کہ باوجود انگریزی نہ جاننے کے مولانا رحمت اللہ صاحب ڈاکٹر وزیرخاں کی چند صحبتوں میں اتنے تیار ہوگئے کہ فنڈر سے ان کا مناظرہ غالباً کسی حاکم کی ثالثی میں بمقام آگرہ جو ہوا تو فنڈر کو فاش شکست اٹھانی پڑی (11)۔ اسی عرصہ میں وہی فتنہ "عام قرطاس" کے ہنگامہ میں جہاں سینکڑوں علماء مشائخ اِدھر اُدھر بکھرے ان میں مولانا رحمت اللہ بھی تھے۔ یہ بھی حجاز ہجرت کر کے چلے گئے اور اب تک ان کی یادگار مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ وہاں موجود ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی قسطنطنیہ میں

فنڈر ہندوستان سے رسوا وذلیل ہو کر قسطنطنیہ پہنچا اور وہاں بھی علماء استنبول کو چیلنج پر چیلنج دینا شروع کیا۔ غالباً سلطان عبدالمجید مرحوم کا وقت تھا۔ خلیفہ تک خبر پہنچی اور یہ بھی قسطنطنیہ کے علماء میں کوئی اس پادری سے پنجہ آزمائی پر تیار نہیں

ہے۔ سلطان نے فوراً حجاز کے گورنر کو لکھا کہ حرمین میں اگر کوئی عالم عیسائیوں سے مقابلہ و مناظرہ کی مشق رکھتا ہو تو اسے بھیج دیا جائے۔ حرم مکہ کے شیخ اس زمانہ میں زینی وحلان مشہور محدث تھے۔ والی مکہ نے سلطان کے اس فرمان سے شیخ وحلان کو مطلع کیا۔ انہوں نے درس حدیث کے حلقہ میں اس کا ذکر کیا۔ مولانا رحمت اللہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں فنڈر ہی نے فتنہ برپا کیا ہے، بلکہ انہوں نے خیال کیا کہ کوئی پادری آ گیا ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ حسب منشاء سلطان قسطنطنیہ روانہ کیے گئے۔ مولانا رحمت اللہ کا قسطنطنیہ پہنچنا تھا اور فنڈر کو خبر ملی کہ وہی آگرہ والا ہندی عالم یہاں بھی سر پر مسلط ہو گیا ہے۔ بغیر کسی اطلاع کے وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گیا۔ پھر اس کا کیا انجام ہوا معلوم نہیں۔ لیکن مولانا کے اس اثر کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو ظاہر ہے مولانا کی وقعت ان کے دل میں کتنی پیدا ہو سکتی تھی۔ کہاں یہ حال تھا کہ ''علماء دولت عثمانیہ'' ششدر و حیران تھے اور کہاں صورت پیش آئی کہ ہندی عالم آیا اور مناظرہ کی ہمت تو کیا ہوتی، چیلنج دینے والا خود ہی لاپتہ ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب کے پاس مولانا رحمت اللہ کا گرامی نامہ محفوظ تھا جس میں انہوں نے سلطانی قدر افزائیوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ یہاں تک لکھا تھا کہ خلیفہ کی مجلس سے جب اٹھتا ہوں تو میری جوتیاں سیدھی کر کے مجھے پہنچاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں مولانا رحمت اللہ کی مشہور کتاب ردِ عیسائیت میں ''اظہار الحق'' نامی جو فارسی میں تھی، عربی میں ترجمہ ہوئی اور آج تک اسلامی ممالک کے بعض مدارس حتیٰ کہ ازہر کے نصاب میں بھی ایک مدت تک شریک تھی (اب ادھر کا حال معلوم نہیں) کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے قیام پر سلطان نے بہت اصرار کیا۔ لیکن مولانا نے ہجرت کی نیت کا عذر کر کے پھر اپنے حجاز پہنچایا۔ حکومت سے وظیفہ ماہوار جس کی تعداد اس وقت محفوظ نہیں رہی، مولانا کے نام جاری ہوا جو مکہ معظمہ میں ان کو ملتا رہا۔ رحمۃ اللہ علیہ

میری غرض واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ گو مناظرہ کا مواد انگریزی زبان سے ڈاکٹر وزیر نے مولانا کے لیے مہیا کیا، لیکن مولانا کا دماغ تربیت یافتہ نہ ہوتا، تو کیا اس آسانی سے وہ اس مسئلہ پر اتنا قابو پا سکتے تھے اور یہی میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کے جس ''شجرہ طیبہ'' نے ایسے پھل مسلسل پیدا کیے۔ کیا وہی تعلیم کا طریقہ ملامت و نفرت ہو سکتا ہے؟

علماءِ دیوبند، علماءِ غیر ممالک کی نظر میں

آج بھی ہندوستان میں قریب قریب اکثر تعلیم گاہوں میں وہی قدیم نصاب جاری ہے۔ اضافہ جو کچھ ہوا ہے، وہ صرف بطریقہ سرد حدیث کے درس کا، لیکن بحمد اللہ اس وقت بھی ہندوستان کے اسی قدیم نصاب سے جو لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان کے باہر بھی، اسی علم میں جس میں ہندوستان کی بضاعت سب سے زیادہ ''مزجاۃ'' سمجھی جاتی ہے یعنی فن حدیث (12)، اسی کے متعلق قسطنطنیہ کے فاضل جلیل جو کمالی عہد سے پہلے غالباً کسی ممتاز دینی منصب سے سرفراز تھے اور انقلاب حکومت کے بعد ان دنوں نزیل مصر ہیں۔ ان کا نام علامہ زاہد بن الحسن الکوثری ہے۔ خاکسار نے ان کے چند رسائل مختصرہ دیکھے ہیں، جن سے ان کے تبحر اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کا شمار اسلامی ممالک خصوصاً حنفی دائرہ کے ممتاز ترین علماء میں ہے۔ اس استنبولی اور مصری فاضل نے حضرت استاذ العلامۃ الامام مولانا

شبیر احمد صاحب صدر دائرۃ الاہتمام (دار العلوم دیوبند) کی ''شرح مسلم'' جب دیکھی تو مولانا کو ایک خط لکھا جو ''شرح مسلم'' کی جلد ثالث کے آخر میں چھاپ بھی دیا گیا ہے۔ اس خط میں علامہ کوثر مولانا کو خطاب کر کے اعتراف کرتے ہیں۔

فانتم یا مولنا فخر الحنفیہ فی ھذہ العصر حقا. (ص519)

''مولانا آپ کی ذات اس عصر میں تمام دنیا کے حنفیوں کے لیے فخر ہے۔''

چودہویں صدی میں سارے حنفی ممالک کا فخر ایک ہندی عالم کو بیرون ہند کا ایک جلیل وسلم الثبوت فاضل قرار دیتا ہے لیکن خود ہند کے باشندوں کی نگاہ میں ہندی علماء کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ع **والدھر آت بالاعاجیب**

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ رشید رضا مصری کی نظر میں

یہ تو ایک تحریری اعتراف ہے۔ مصر ہی کے مشہور صاحب قلم وکمال علامہ رشید رضا مصری مرحوم جب ہندوستان تشریف لائے اور ان کے سامنے ہندی نظام تعلیم کا ایک نمونہ پیش ہوا تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مرحوم رشید رضا کرسی سے اُٹھ اُٹھ جاتے تھے اور جب ہندوستانی عالم اپنی تقریر جو عربی میں ہو رہی تھی، ختم کر چکا۔ علامہ رشید رضا اٹھے، خدا جانے کیا کیا کہا مگر یہ جملہ بار بار ان کی زبان پر بے ساختہ آتا تھا۔

مارائت مثل ھذا الاستاد الجلیل قط.

''اتنا بڑا اُستاد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

یہ حضرت الامام الاستاد سید انور شاہ کشمیریؒ کی ذات بابرکات تھی اور اسی ٹوٹے پھوٹے بوریائی طریقہ تعلیم کے ادارہ کو دیکھ کر ان کو اعلان کرنا پڑا۔

لو لا رائتھالرجعت من الھند حزینا.

''اگر دیوبند کے دار العلوم کو میں نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس ہوتا۔''

ہندوستانی نظام تعلیم کی خوبی کا اعتراف غیروں کی طرف سے

اور یہ شہادتیں تو اپنوں کی ہیں، عام اسلامی ممالک میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنی جو قیمت پائی ہے اس کے چند نمونے تھے۔ لیکن غیروں نے جب کبھی انصاف سے کام لیا تو ان کے اعترافات بھی اس سلسلہ میں کیا کچھ کم اہم ہیں۔ میکالے صاحب کی تعلیمی رپورٹ اور برنیر کے خود تراشیدہ افسانہ کا تو سب ذکر کرتے ہیں، مگر ہمیں اس قسم کی گواہیوں کو بھی تو نہ بھلانا چاہیے:

''دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔''

یہ جنرل سلیمن کی رائے ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب جن کی کتاب ''غالب نامہ'' کے دیباچہ سے میں نے مذکورہ

بالا فقرہ نقل کیا ہے۔ وہ جنرل موصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں کہ وہ:

''ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یوروپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا ہے۔''

اسی ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا یہ اثر ہے کہ تعلیمی ذوق میں بیس روپیہ ماہوار پانے والا ہندوستانی مسلمان ان کو انگلستان کے وزیرِاعظم کا ہم رتبہ نظر آتا ہے۔ جنرل مذکور نے اس کے بعد لکھا ہے:

''جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے) عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔''

علماء کے علم وفضل کی تعریف

بیان ان ہی الفاظ پر ختم نہیں ہوجاتا ہے، آگے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، مَیں نہیں جانتا کہ ایک انگریز مصر کے ان الفاظ کو سُن کر ان بیچاروں کا کیا حال ہوگا، جنہوں نے ہزار ہا ہزار روپے، خرچ کر کے اپنے ناموں کے پیچھے آج ہندوستان میں آکسن اور کینٹب کے لاحقوں کے استعمال کا حق حاصل ہے، جنرل سلیمن لکھتے ہیں:

''سات سال کے درس (یعنی درجہ فضل) کے بعد ایک (ہندوستانی) طالب العلم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے، دستار فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا پر گفتگو کرسکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب العلم۔'' (دیباچہ غالب نامہ۔ ص14)

شیخ صاحب نے اسی جنرل کی کتاب کی دوسری جگہ سے یہ فقرے بھی نقل کیے ہیں:

''ایک تعلیم یافتہ مسلمان (یعنی وہی جس کا نام اب ملا مولوی وغیرہ ہے) فلسفہ اور ادبیات اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کرسکتا ہے۔''

آخر میں بالکل صحیح حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

''اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے۔''

دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم میں تفریق

یہ واقعہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی کے اداروں سے الگ نہ کردیا جاتا، تعلیم کی دنیا میں یہ ثنویت نہ پیدا ہوتی، بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ، حدیث وتفسیر کی تین کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا تھا جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے، تو کوئی وجہ نہیں

تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کر لیتا۔ جنرل موصوف نے بالکل تجربہ کی بات لکھی ہے کہ:

''موجودہ زمانہ میں جوان تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے۔''

قدیم نصاب تعلیم اور مہارت فنون

لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مغرب کے جدید نظریات سے ہندوستان جب شروع شروع میں روشناس ہوا ہے، اس وقت کے چرچوں سے مسلمانوں کے مدارس جس طرح گونج رہے تھے، شاید یہ کیفیت ان تعلیم گاہوں میں بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے، جہاں ان کی مستقل تعلیم دی جاتی ہے (14)۔ زمین کی گردش، آسمانوں کے جرمی وجود سے انکار، بطلیموسی نظام کی جگہ شمسی نظام پر علم ہیئت کی بنیاد، آج تو ان کے تذکرے کبھی کبھی سننے میں آتے ہیں۔ لیکن پُرانے مدرسوں میں بحث ومباحثوں کے جو سلسلے ان مسائل کے متعلق جاری تھے، اس کا اندازہ کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، جنہوں نے اس زمانہ کو دیکھا تھا۔ مختلف کتابیں ریاضی کی جو اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جن میں سب سے ضخیم کتاب فارسی زبان میں ''جامع بہادر خانی'' ہے، جو تین فنون (ہیئت، حساب، علما المرایا والمناظر) پر مشتمل ہے۔ آپ کو جگہ جگہ اس کتاب میں ان جدید نظریات کا ذکر تفصل سے ملے گا جو اس وقت تک یورپ میں مختلف مسائل کے متعلق پیدا ہو چکے تھے۔ عربی زبان میں علامہ تفضل حسین خاں نے مختلف کتابیں علوم ہندسیہ کے متعلق لکھیں جن میں حکماء یورپ کے خیالات کا تذکرہ تائید کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان ہی پرانے طرز کے مولویوں کو دلّی کے عربی کالج کے زیر اثر جدید علوم وفنون سے روشناسی کے جو مواقع ملے تھے، کاش ان میں تھوڑی سی وسعت برتی جاتی، تو ہندوستان کے علم کی دُنیا اور ہوتی۔ حیدر آباد میں جس شاندار طریقہ سے علوم جدیدہ کا استقبال قدیم مذاق کے امراء اور علماء نے کیا تھا، اس کا اندازہ آپ کو شمس الامراء بہادر کی دارالاشاعت کی کتابوں اور ان کے مدرسہ فخریہ کے نصاب سے ہو سکتا ہے۔ ایک صدی پہلے طبیعیات وریاضیات میں شمس الامراء مرحوم اول وثانی نے اُردو زبان میں مختلف کتابیں تصنیف کرائیں۔ خود پریس قائم کر کے ان کو شایع کیا۔ بہرحال ہندوستان میں کام کی ابتداء ہو چکی تھی کہ بعض فاسد اغراض کے تحت حکومت کو غلط مشورہ دیا گیا اور اس کے بعد جو ہونا تھا سو ہوا؟

علماء پر غلط الزام

غریب مولویوں کے بدنام کیا گیا۔ ان پر چھوٹے الزام تراشے گئے، جن میں سب سے بڑا افترائی الزام انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کا فتویٰ تھا (15) اور لطف یہ ہے کہ پھیلانے والوں نے ایک بات پھیلا دی۔ تقریباً ایک صدی سے وہی رٹایا ہوا سبق رٹا جارہا ہے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بغیر کسی شرم وحیا کے علانیہ کوچہ وبازار میں اسی سبق کو دہراتے چلے جارہے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر یہ فتویٰ کس کتاب میں ہے۔ کس مولوی نے کب کہاں کس بنیاد پر

کس کو یہ فتویٰ دیا تھا۔ انیسویں صدی کے علماء کے فتووں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں ان میں ڈھونڈھا جاتا، لیکن اتنی فرصت کس کو ہے" دیوانہ گفت وابلہ باور کرد" کی مثال اس سے زیادہ شاید ہی کسی چیز پر کبھی صادق آئی ہو۔ مولویوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہماری تعلیم کے نظام کو نہ توڑا جائے۔ اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے، لیکن جو چیز دین نہیں تھی، اس میں بھی وہ کسی ترمیم کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے یہ کس نے کہا؟ جس قوم نے اسی یورپ کے ایک حصہ یونان کے سارے علوم پر قبضہ اور ایسا قبضہ کرلیا کہ آئندہ دنیا کو یونانیوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا، مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا۔

علماء نے انگریزی سے نہیں روکا

کیا اسی یورپ کے علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے سے وہ محض اس لیے انکار کرسکتے تھے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون ہیں، لیکن اپنے آپ کو فانی کرکے محض دوسروں کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا۔ خود ہی سوچا جاسکتا ہے کہ یہ انکاران کا کس حد تک بیجا تھا۔

آج لوگوں کو کیسے باور کرائیے کہ شاہ عبدالعزیز جیسی ہستی جن پر آج ہندوستان کے علم حدیث کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، اپنے وقت میں ان ہی کا فعل سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے خواص وعوام کے لیے نمونہ تھا۔ "ملفوظات عزیزیہ" میں حضرت کی زبانی منقول ہے کہ:

"سکندر (الگزینڈر) وفریزراز جملہ انگریزاں بامن صحبت داشتہ اند۔"

"سکندر الیگزینڈر اور فریزر جو انگریزوں میں ہیں مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔"

ان میں سے فریزر کے متعلق شاہ صاحب کا ارشاد تھا کہ:

"قابل وقابلیت درست است ازمن چیزے خواندہ" (ص 117)

"قابلیت درست ہے، انہوں نے خاکسار سے کچھ پڑھا ہے۔"

اور سکندر جو بظاہر کوئی فوجی افسر معلوم ہوتا ہے وہ تو شاہ صاحب کا اتنا گرویدہ تھا کہ شاہ صاحب سے اس نے تعویذ لیا تھا۔ اس کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ "ملفوظات" میں شاہ صاحب کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

"ازجہت مردن پنج کودکان گوکہ ایشان راچنداں اعتقاد ازتعویذ وطومار نیست لیکن باضطرار رجوع کرد ایں چنیں اتفاق افتاد کہ چہار فرزنداں ہستند۔" (ص 117)

"گو اسے تعویذ وغیرہ سے کچھ زیادہ اعتقاد نہیں ہے، مگر پانچ بچوں کے مرجانے کی وجہ سے اس نے پریشانی میں رجوع کیا اور اتفاق ایسا کہ اس وقت اس کے چار لڑکے ہیں۔"

سیٹھن نامی ایک انگریز کا بھی ذکر اسی کتاب میں ہے، وہ اتنا معتقد تھا کہ پرانی دلی میں حضرت شاہ صاحب جہاں پیدا ہوئے تھے بطور یادگار کے:

''بنائے (مکانے) تیار کند چنانچہ بنا کردہ بود مگر درست نہ شد۔''

''ایک مکان تیار کیا، جیسا کہ اس نے بنیاد ڈالی تھی، مگر درست نہ ہوا۔''

بہرحال میری غرض یہ ہے کہ بیچارے مولویوں کو بدنام کرنا کہ انہوں نے تنگ نظری سے کام لے کر مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے سے روکا۔ اس حیثیت سے قطعاً غلط ہے کہ وہ انگریزی پڑھنے کو حرام سمجھتے تھے۔ ہاں انہوں نے مقاومت ضرور کی، لیکن صرف اس کی کہ دین سے جاہل رکھ کر محض ذہنی علوم وفنون سے مسلمانوں کے عقول کو بیدار کرنا، غلط نتائج پیدا کرے گا۔ ان کا تو فقط یہ اندازہ تھا اور ہم تو اسی اندازہ کو واقعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں اور اب بھی علاج وہی اور صرف وہی ہے جو ان علماء نے سوچا تھا۔

غیروں کا اعتراف حق

خیر میں گفتگو اس پر کر رہا تھا کہ ہمارے ہندی نظام تعلیم اور اس کے نتائج کو اپنوں کے سوا غیروں نے بھی کس نظر سے دیکھا تھا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہے جس کی شہادت جنرل سلیمن نے ادا کی۔ شیخ محمد اکرام صاحب (مد اللہ عمرہ وبارک فیہ) نے سچ لکھا ہے کہ:

''ان سطور (یعنی سلیمن کے گزشتہ بالا بیانات) سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اس زمانہ میں انگریزی نظام تعلیم سے یا آکسفورڈ کے موجود کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہ تھا۔'' (ص 15)

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ساتھ جن انگریزوں کو علمی اور دینی عقیدت تھی۔ آخر یہ ان کے فضل وکمال کا اعتراف نہ تھا تو اور کیا تھا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شاہ صاحب سے دینی یا مشرقی زبانوں ہی کے متعلق استفادہ ان کے یہ انگریز شاگرد اور معتقد کرتے تھے۔ اسی ''ملفوظات عزیزیہ'' میں ہے کہ ان ہی انگریزوں میں سے ایک انگریز نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ شہر کے بعض کھاری کنوؤں کا پانی میٹھا کیوں ہو جاتا ہے؟ شاہ صاحب نے اس کا علمی جواب دیا، جو ذرا مبسوط ہے، اس لیے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

مسٹر کول بروک کی تاریخی یادداشت

اسی سلسلہ میں ان غریب ہندی ملانوں کے متعلق مسٹر کول بروک کی وہ یادداشت بھی قابل ذکر ہے، جس میں حکومت کو ان بے کسوں کی صحیح قدر وقیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کول بروک صاحب نے لکھا تھا:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے علم وادب کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا تھا۔ نہ صرف علماء کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے، بلکہ وہ جماعت بھی جس میں جوہر قابل پیدا ہوتا تھا، محدود ہوتی جاتی ہے۔ علوم نظری کا مطالعہ لوگ چھوڑتے جاتے ہیں...... اگر گورنمنٹ نے سرپرستی نہ کی تو اندیشہ ہے

کہ صرف کتابیں ہی نہ مفقود ہو جائیں گی، بلکہ ان کے پڑھانے والے بھی مفقود ہو جائیں گے۔''

آخر میں بیچارے نے بڑے دردناک لہجہ میں لکھا ہے:

''ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے۔
آج وہ علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔'' (منقول از رسالہ ''اُردو'' ۔ اپریل 1923ء)

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ جنرل سلیمن نے مسلمانوں کی جن خصوصیات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے، یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں:

''جو کوئی بیس روپے کا متصدی ہوتا ہے، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دلاتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔''

مسلمانوں میں علمی شغف اور اس میں کمی کی صحیح وجہ

افسوس ہے کہ ہماری جن خصوصیتوں پر غیروں کی نظر پڑتی ہے، قرب ونزدیک کی وجہ سے خود ہماری نگاہوں سے وہ کبھی کبھی اوجھل ہو جاتی ہیں۔ آج ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جہالت کا ایک عام رونا ہے، لیکن جن قوموں کو بتا بتا کر عار دلایا جاتا ہے ایک تو ان کی تعداد، نیز اس پر بھی نظر نہیں کی جاتی کہ اب تک ان میں تعلیم جو کچھ بھی پھیلی ہے وہ اس مخصوص طبقہ تک محدود ہے جس کا کام ہی لکھنا پڑھنا ہے مثلاً برہمن اور کائستھ لیکن عوام کا جو حال ہے اس کو لوگ نہیں دیکھتے۔ اس کے سوا مسلمان موجود نظام تعلیم سے جو دل برداشتہ ہیں۔ اس کی اصلی وجہ وہی تعلیم کی ثنویت ہے، جہاں دین کی تعلیم ہوتی ہے وہاں دنیا نہیں ملتی اور جہاں دُنیا ملتی ہے وہاں کھلم کھلا دیکھا جا رہا ہے کہ دین کو کھو کر لوگ دنیا حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ایسی سخت کشمکش ہے جس نے مسلمانوں کے عام طبقات سے اس تعلیمی جوش کو دھیما کر دیا ہے، جس کا نظارہ مسٹر سلیمن نے اس وقت کیا تھا جب مسلمانوں کا جوش باوجود حکومت کھو دینے کے کم نہیں ہوا تھا۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ

قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے والد کا نو عمری میں انتقال ہو گیا۔ سرپرست صرف والدہ صاحبہ رہ گئی تھیں۔ قدرتاً ایسی حالت میں بچوں میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ قاری صاحب پر سیر وشکار کا شوق غالب آ گیا۔ پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھے، اب سنیے ان ہی کی زبانی ان کی سوانح عمری میں یہ قصہ نقل کیا گیا ہے:

''ان کی والدہ بیچاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئیں، فرط محبت سے بار بار سمجھاتیں مگر آپ ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے...... ایک روز والدہ نے پاس بلایا اور نہایت درد ومحبت کے ساتھ سمجھانے لگیں۔ سمجھاتے سمجھاتے ان کی طبیعت بھر آئی۔ رونے لگیں، انہیں روتا دیکھ کر آپ رونے لگے۔ اس واقعہ کا دل پر اتنا اثر ہوا کہ اسی وقت تمام نکمے مشغلوں سے طبیعت کو نفرت ہو گئی

اور تحصیل علم کا شوق موجزن ہو گیا۔"

عورتوں میں تعلیم کا جذبہ (سلطان المشائخ)

یہ تیرہویں صدی کی ایک بیوہ مسلمان خاتون کی کیفیت ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کے حل میں بھی لکھا ہے کہ آپ کو بھی بچپن ہی میں داغِ یتیمی اُٹھانا پڑا۔ آپ کی تعلیم بھی والدہ ہی کے شوق تعلیم کی رہینِ منت ہے کسی پر ذکر آئے گا کہ بسا اوقات گھر میں فاقہ ہوتا تھا لیکن تعلیم بہرحال جاری تھی۔ جب متوسطات آپ کی ختم ہوئی ہے اور اُستاد نے بداؤں میں چاہا کہ دستار باندھیں تو کرمانی نے لکھا ہے:

"ایں حکایت پیش والدہ خود گفت آں مخدومہ جہاں...... خود ریسمانے برشت و دستارے
ازاں بافانیدہ چوں سلطان المشائخ آں کتاب تمام کرد والدہ بزرگوار بتقریب طعامے کرد۔"

(سیر الاولیاء۔ ص95)

بہرحال تعلیم کا جو نظام ہندوستانی بزرگوں نے قائم کیا تھا، اس کی نفع بخشی کے متعلق یہ تو وہ بات تھی جسے آپ چاہے تو منطق کی اصطلاح میں برہان انی قرار دے سکتے ہیں۔ میں نے نمونے کے چند پھل پیش کر دیئے ہیں، اس کے بعد بھی درخت کی بے ثمری کا کسی کو شکوہ باقی رہ جائے تو ایسوں کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

النجم تستصغر الابصار صورته   والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر
تارے نگاہوں کو چھوٹے نظر آتے ہیں   اس میں گناہ نگاہ کا ہے نہ کہ تارے کا

حواشی

(1) لوگ مصارف کے سوال کو درمیان میں لاتے ہیں۔ حالانکہ اولاً یہ حکومت ہی کا فرض تھا، جہاں دنیوی علوم و فنون پر وہ کروڑہا کروڑ صرف کر رہی ہے۔ ہر صوبہ میں تھوڑی رقم دینی علوم کے معلمین کی تنخواہوں کے لیے بھی منظور کر سکتی ہے اور اب تو تقریباً تمام صوبوں میں مشرقی علوم کی تعلیم و امتحان کے نام سے سرکاری مصارف سے ادارے جاری ہو چکے ہیں اور فرض کیجیے کہ حکومت اگر اس پر نہ بھی راضی ہو تو مسلمان اسی رقم کو حکومت کے جامعات و یونیورسٹیوں کے حوالہ کر کے اپنی تعلیم میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ہر صوبہ میں مسلمانوں کے جو اوقاف ہیں، حکومت اگر چاہے یا مسلمان حکومت پر زور دے کر اس چاہنے پر اس کو مجبور کریں کہ اوقاف کی اسی مد سے وہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے قدیم نصاب کو جاری کر کے ثنویت کی اس لعنت سے مسلمانوں کو نجات دے تو کیا یہ مطالبہ اس مطالبہ سے بھی زیادہ ناقابل سماعت ہے جو آج اسی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ملک کی حکومت کا چارج ملک

والوں کو سپرد کر کے خود بہ یک بینی و دو گوش جہاں سے آئی تھی، وہیں چلی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کبھی تو اس مطالبہ کی تکمیل کی بھی امیدیں قائم کی جاتی ہیں اور کبھی اتنی ناامیدی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ تعلیمی نظام کی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی۔

(2) چند عامۃ الورود مغالطوں میں ایک بڑا مغالطہ مسلمانوں کی فرقہ بندی کا بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چالیس کروڑ مسلمانوں میں اہل السنت والجماعت کی اکثریت کبریٰ کے بعد بہ مشکل صرف ایک فرقہ شیعوں کا ایسا اسلام میں پایا جاتا ہے، جس پر الگ فرقہ ہونے کا اطلاق صحیح ہوسکتا ہے۔ ورنہ اہل السنت عقائد و خیالات مسلمات میں باہم متفق ہیں۔ حنفی، شافعی مکاتب خیال فقہی مکاتب ہیں، جن کی بنیاد پر فرقہ بندی پیدا نہیں ہوتی۔ حنفی و شافعی، مالکی و حنبلی مسلمانوں کا سب سے بڑا روحانی پیشوا یعنی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جب حنبلی ہیں اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان اختلافات کی کیا نوعیت ہے۔ واقعہ خود حنفی مسلک میں ابو یوسف، امام محمد و غیرہم ائمہ کے اختلافات سے الگ فرقے پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح مالکیت شافعیت سے بھی الگ فرقے نہیں بنتے۔

اسلام کا میرے خیال میں یہ معجزہ ہے کہ پچاس ساٹھ کروڑ انسانوں کی برادری میں اس نے ایسی ہمرنگی پیدا کی ہے کہ شیعوں کو الگ کرنے کے بعد سب ایک ہو جاتے ہیں اور شیعوں کی تعداد بمشکل سو میں ایک ہوگی۔ ایسی اقلیت کس حد تک قابل توجہ ہوسکتی ہے۔ فرقے اسلام میں ابتدائی صدیوں میں ضرور پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً معتزلہ، خوارج، کرامیہ وغیرہ لیکن اب ان کا کہاں پتہ ہے، قرآن نے سب کو ختم کر دیا۔

(3) مثلاً سندھ کے علماء شیخ حیات سندھی، شیخ عابدی سندھی، یا ہندوستان کے علماء جیسے علامہ مرتضیٰ زبیدی شارح ''قاموس'' وغیرہم۔ اسی قسم کے حضرات میں علی الخصوص علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی جو عموماً زبیدی کی طرف غلطی سے منسوب ہیں۔ گو ان کے متعلق عام کتابوں میں بھی لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باہر پڑھا جو کچھ پڑھا لیکن بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرتضیٰ الہ آباد کے مشہور عالم مولانا فاخر اور حضرت شاہ ولی اللہؒ سے پڑھنے کے بعد یمن وغیرہ گئے۔ مدت ہوئی ایک مستقل مقالہ مولانا کے متعلق ''معارف'' اعظم گڑھ میں فقیر نے لکھا تھا۔ مولانا کو جو علمی امتیاز آخر زمانہ میں ممالک اسلامیہ خصوصاً حجاز، یمن اور بالآخر مصر میں حاصل ہوا، خود ان ممالک کے علماء میں اس کی نظیر مشکل سے پیش ہوسکتی ہے۔ بڑے بڑے سلاطین حتیٰ کہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں انار اللہ برہانہ اور ان کے وزیر صدر اعظم محمد پاشا نے تبرکاً ان سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کی کتابوں کے نقول بڑے بڑے بادشاہوں نے منگوائے۔ مصر میں حدیث کا حلقہ ان کا جتنا بڑا ہوتا تھا اور جس شان کے ساتھ ہوتا تھا، کہتے ہیں کہ چشمِ فلک نے اس تماشے کو مصر میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

(4) اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ آٹھویں صدی کے چالیسویں سال سے پہلے آئے، لیکن طاش کبریٰ زادہ نے مصر میں ان کے داخلہ کا سنہ 740ھ لکھا ہے۔ اسی لیے میں حافظ کے کلام کا یہ مطلب لیتا ہوں کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے وہ مصر پہنچے۔ سراج ہندی کی ولادت 704ھ میں ہوئی جس کا حاصل یہ نکلا کہ چھتیس سال کی عمر ہوگی جب وہ مصر میں داخل ہوئے۔

(5) الطرحہ غالباً ایک قسم کی چادر کا نام تھا جو عالمانہ لباس کا ایک جز تھا یا ٹوپی و دستار کا پُھندنا۔

(6) مثلاً طلاق ثلاثہ یعنی تین طلاق تین ہے۔ آئمہ اربعہ کے اس مسلک کے خلاف تین ایک ہے کا نظریہ قائم کیا۔ مدینہ منورہ اس نیت سے جانا کہ رسول اللہؐ کے روضۂ اقدس کی زیارت کریں گے، حرام ہے۔ اسی طرح مسئلہ صفات میں بھی قریب قریب مجسمہ کی سی باتیں کرتے تھے۔ یوں بھی ان کے متفردات کی ایک طویل فہرست ہے۔

(7) اسی کے ساتھ اس دلچسپ لطیفہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ابن تیمیہ کے خلیفہ ارشد حافظ ابن قیم کے عقلی معلومات کا سرچشمہ بھی یہی بیچارا ہندوستانی عالم ہے۔ ابن حجر نے ''درر'' میں ابن قیم کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا کہ ''قرو فی الاصول علیٰ الصفی

الھندی'' (ج 3، ص 401) الاصول سے دونوں عقلی اسلامی علوم مراد ہیں، یعنی اصول فقہ اور علم کلام۔ مشہور فلسفی مورخ ابن خلدون جب تیونس سے پہلی دفعہ مصر پہنچا ہے تو قاہرہ کی شان وشوکت علماء، فضلاء کو دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں اس نے قاہرہ کے چند خاص مرکزی مشاہیر کا بھی نام لیا ہے، جن میں ایک ہم ''الصفی الہندی'' کو بھی پاتے ہیں (ج 7) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صفی الہندی دمشق کے سوا کچھ دن مصر میں بھی رہے ہیں۔

(8) غالبًا القرطاس سے مراد کارتج یا کارتوس ہے کیونکہ 1857ھ کا فتنہ جیسا کہ مشہور ہے کارتوس ہی کے دانت کے کاٹنے کے مسئلہ سے شروع ہوا۔ ''العلوج'' سے واللہ اعلم کیا مراد ہے، کیا کالی پلٹن کے فوجیوں کو ''العلوج'' کے نام سے موسوم کیا ہے یا کیا ارادہ ہے۔ میں نے اس لیے اس کو نقل کر دیا کہ ''عام قرطاس'' غدر کے مشہور لفظ کے مقابلہ میں نیا اور اچھا ہے۔ سال قرطاس اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔

(9) میں نے لابیتھا کا ترجمہ وہی کر دیا ہے، جو عام طور پر بتایا جاتا ہے لیکن مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مدینہ کے دونوں طرف دو سنگستان پتھروں کا جو سلسلہ ہے جسے حرہ بھی کہتے ہیں۔ لابتین سے ان دو سنگستانوں کی طرف اشارہ ہے۔ کیا یہ لایہ لاوہ کی معرب شکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے اسی رنگ کے ہوتے ہیں۔

(10) اسلامی علوم کی تاریخ میں اسی قسم کا ایک فقرہ امام بخاری کا امام ترمذی کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ امام بخاری نے ترمذی سے فرمایا ''**ماانتفعت بک اکثر مما انتفعت بی**'' (میں نے تم سے جتنا نفع اٹھایا وہ اس سے زیادہ ہے جو تم نے مجھ سے حاصل کیا) بلاشبہ کسی شاگرد کے فخر کے لیے یہ انتہائی الفاظ ہوسکتے ہیں جو اپنے اُستاد سے اسے ملے ہوں۔

(11) حضرت مولانا رحمت اللہ الہندی اور پادری فنڈر کے اس تاریخی مناظرہ کی کیفیت اب تو خود ہندوستان کے مسلمان عمومًا بھلا چکے ہیں۔ حالانکہ جس زمانہ میں یہ مناظرہ آگرہ میں ہوا تھا فارسی اور اُردو میں اس کے متعلق اس زمانہ کے اخباروں کے سوا مختلف رسالے خود ان لوگوں نے تصنیف کر کر کے شایع کیے تھے جو اس مجلس میں موجود تھے۔ باوجود تلاش کے مجھے نہ فارسی کے یہ رسالے مل سکے نہ اُردو کے۔ خدا کی شان ہے کہ عربی زبان میں ایک اُردو اور ایک فارسی رسالہ کا ترجمہ مصر کا مطبوعہ مل گیا۔ مترجم کا نام الشیخ علی الطیبی الشافعی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قسطنطنیہ میں بعض امراء الدولہ کے کتب خانہ میں یہ رسالے مجھے ملے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ **قد سمعت فی مکۃ المعظمۃ حال ھذہ المناظرۃ من افواہ رجال غیر المحصورین الذین جاواللحج بعدھا.** (ص 5) (یعنی مکہ معظمہ میں بے شمار آدمیوں سے اس مناظرہ کا حال معلوم ہوا جو ہندوستان سے حج کے لیے مناظرہ کے بعد آئے تھے) اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا حج ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ سے مختلف مسلمانوں کا حال ایک دوسرے تک پہنچتا تھا۔ بہرحال اصل رسالہ اُردو کے مصنف سید عبداللہ الہندی ہیں جو آگرہ میں برٹش حکومت کے ملازم تھے۔ پہلے تو ان تمام خطوط کو مصنف نے نقل کیا ہے جو مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر میں مناظرہ کے متعلق لکھے گئے۔ 1854ء مطابق 1272ھ ماہ رجب میں مناظرہ کی یہ مجلس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کے ارباب عزت وجاہ وعلم وفضل کے سوا لکھا ہے کہ آگرہ کے بڑے بڑے یورپین افسر بھی جلسہ میں شریک رہے، جن میں مسٹر اسمٹ حاکم صدر دیوانی غالبًا کمشنر اور مسٹر کرسٹن سکریٹری ریونیو بورڈ، مسٹر ولیم حاکم علاقہ فوجی، مسٹر لیڈلی مترجم اول برٹش گورنمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عیسائیوں کی طرف سے لکھا ہے کہ القسیس فنڈر مناظر اول وفینس فرنچ مناظر دوم کی حیثیت سے تھے اور اسلام کی طرف سے مولانا رحمت اللہ الہندی مناظر اول اور ان کے معاون ڈاکٹر وزیر خاں تھے لکھا ہے۔ کہ جلسہ جو کئی دن ہوا۔ ہزاروں ہندو مسلمان تماش بینوں کی حیثیت سے شریک تھے۔ پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی وہ انجیل وتورات کی تحریف کا تھا۔ علانیہ سب کے سامنے فنڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں محرف ہوچکی ہیں۔ لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو

حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے۔ اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ الغرض فاش شکست کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا۔ تفصیل مقصود ہو تو عربی کے ان رسالوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ان ہی رسالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں نے بھی فارسی میں ایک کتاب ردمسیحیت میں لکھی تھی اور بہادر شاہ مرحوم بادشاہ کے ولی عہد مرزا فخرو نے اپنے خرچ سے چھپوا کر اسے شائع کیا تھا۔ اس مناظرہ کے کل تین سال بعد غدر کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا۔

(12) ہندوستان کی علمی منزلت خصوصاً فن حدیث میں جس وجہ سے پچھلے دنوں میں کم کی گئی اور باور کرایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام آیا وہ اسلامی احکام سے ناواقف تھے۔ میں نے دیباچہ میں مثلاً چند فقرے بھی نقل کیے ہیں۔ سچ پوچھیے تو غریب ہندوستان کی شش صد سالہ علمی تاریخ محض ایک صاحب کو بڑھانے کے لیے گھٹائی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جن کا تعلق تنگ نظر مسجد کے ملانوں سے نہیں بلکہ مغربی جامعات کے طلسانیوں اور اُردو زبان کے مشہور انشاء پردازوں سے ہے۔ اسی کے ساتھ اسلامیات میں بھی ان کا علمی سرمایہ اچھے خاصے مولویوں سے کم نہیں ہے۔ اپنے سفرنامہ حجاز میں ''جدہ'' کے ایک عالم رئیس شیخ نصیف کا تذکرہ درج کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے مکان میں ایک صاحب سے یہ کہہ کر ملایا گیا کہ وہ شخص محمد بن عبدالوہاب (نجدی) کے پوتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ نجد کے مشاہیر علماء میں ہیں۔ اس کے بعد مولانا عبدالماجد نے اسی ہندوستان کے ایک غریب مولوی کا ذکر کیا ہے جو خود اور جس کے اسلاف اسلام کے احکام و تعلیمات سے ناآشنا اور عربی زبان سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اسی ہندی ملانے مولانا فرماتے ہیں کہ ان سے (یعنی محمد بن عبدالوہاب صاحب کے عالم و فاضل یکے از مشاہیر نجد) سے کچھ سوالات کیے۔ جوابات اس معیار پر نہ ملے جس کی توقع ایک صاحب نظر عالم سے ہو سکتی ہے۔'' (سفر حجاز۔ ص 73)

(13) میرا اشارہ اس مشہور تعلیمی رپورٹ کی طرف ہے جو مسٹر میکالے نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی، جس کے بعد قدیم نظام تعلیم کی جگہ جدید جامعاتی طریقہ تعلیم کا ہند میں رواج ہوا۔ اسی رپورٹ کے چند خاص فقروں میں ایک فقرہ یہ بھی ہے۔ ''یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سارے علم و ادب کے برابر ہیں۔'' اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا ''ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لیے (ہندوستانی علم طب) موجب ننگ و عار ہیں۔'' ہیئت و نجوم کے متعلق فرمایا گیا تھا ''جسے پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسہ کی لڑکیوں کی ہنسی رُک نہیں سکتی۔'' (ماخوذ از ترجمہ ہاشمی فرید آبادی مندرجہ رسالہ ''اُردو'') مگر ظاہر ہے کہ ''خود مجھے عربی سنسکرت نہیں آتی'' کے چراغ کو ہاتھ میں لے کر اس قسم کی دلاوریوں کا جواب خاموشی کے سوا اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ دنیائے سوفسطائیت میں مسٹر میکالے کی یہ ایک مثالی رپورٹ ہے۔ اسی طرح برنیر ایک فرانسیسی تھا جو مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ واپسی پر اس نے اپنا ایک سفرنامہ مرتب کیا، جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ اسی سفرنامہ میں اس نے حضرت عالمگیرؒ کی طرف ایک عجیب و غریب تقریر منسوب کی ہے جسے اپنے ایک حریص الطبع لئیم الفطرت استاد کو مخاطب کر کے بادشاہ نے کی تھی۔ قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے عموماً برنیر کے اس افسانہ کو دہرایا جاتا ہے۔ مجھے تعجب شیخ محمد اکرام صاحب سے ہے، جنہوں نے حال میں علاوہ ''غالب نامہ'' کے دو دلچسپ کتابیں لکھی ہیں۔ باوجودیکہ شیخ صاحب نوعمر نوجوانوں میں ہیں اور بالکلیہ ان کی تعلیم جہاں تک میں خیال کرتا ہوں جدید تعلیمی مرکزوں میں ہوئی ہے۔ وہیں سے انہوں نے انگریزی میں ایم اے کامیاب کیا ہے اور آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر برطانوی حکومت میں کسی معزز عہدہ پر ممتاز ہیں۔ بہر حال باوجود ان امور کے میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اتفاق سے ان کی ان دو کتابوں (آب کوثر) اور (موج کوثر) کو دیکھنے کا موقع ملا۔ خلاف دستور ابناء عصر کی روش سے ہٹ کر ان میں وہ جستجو پیدا ہوئی، جس کا پیدا ہونا ہر انسان میں تو ضروری ہے۔ لیکن جدید تعلیم کے فیض یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں اس

فطری جستجو کا جذبہ مختلف ترکیبوں سے بجھا دیا گیا ہے۔ یہ سوالات کہ ہم کون ہیں؟ کن لوگوں سے گزر کر ہم نے دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ ہم سے نکلنے والی آئندہ نسلوں کا انجام کیا ہوگیا، یا اس کو کیا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے جانوروں ہی کا دماغ ان سوالوں سے خالی ہوسکتا ہے۔ لیکن شیخ اکرام صاحب ان صالح نوجوانوں میں ہیں جن کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ اپنے بزرگوں اور پچھلی نسلوں کے متعلق معلومات فراہم کریں اور اس سلسلہ میں حقیقت یہ ہے کہ ابتداء سے اس وقت تک ہندوستان میں علم و دین کے لحاظ سے بزرگوں کے جو طبقات گزرے ہیں مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ شیخ صاحب نے ان بزرگوں کے مقامات وخصوصیات کے جاننے میں اتنی کامیابی حاصل کی ہے کہ اس زمانہ کے مولویوں کی اکثریت بھی اس سے قطعاً ناواقف ہے۔ بہرحال باوجود اس کے شیخ صاحب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ قصہ تراشیوں اور دروغ بافیوں میں یورپ کے یہ پرانے سیاح اپنی آپ نظیر ہیں، خود ان ہی نے اسی کتاب کے حصہ ''آب کوثر'' کے صفحہ 67 پر محمود بیگرہ گجرات کے مشہور مسلمان بادشاہ و فاتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے جو لوگ مغربی سیاحوں کی قصہ تراشیوں اور دروغ بافتوں کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں وہ سلطان بیگرہ کے متعلق ان روایات کو پڑھیں۔ اس کے بعد خود فرماتے ہیں، یہ معتبر راوی کہتے ہیں کہ سلطان کی مونچھیں اتنی لمبی تھیں کہ وہ انہیں سر کے اوپر لپیٹ کر گرہ دیتا تھا اور زہر کھانے کا اتنا عادی تھا کہ جو مکھی اس کے جسم پر بیٹھتی تھی وہ مرجاتی۔ شیخ صاحب نے اس واقفیت کے باوجود جو برنیر کے قصہ کو اس طریقہ سے نقل کیا ہے کہ گویا واقعی وہ کوئی حقیقت ہے۔ ابن تیمیہ بعض حدیثوں کے متعلق لکھتے ہیں: تلوح علیه امارات الوضع یعنی جعلی ہونے کی علامات خود اس کے اندر چمک رہے ہیں۔ یہی حال اس قصہ کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر ہندوستان کا مغل اعظم بادشاہ نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کا کوئی اسکولی لڑکا ہے جو شہر کے اسکول میں کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد اپنے گاؤں کے میانجی سے باتیں کررہا ہے کہ واہ واہ میاں صاحب آپ نے تو مجھے جغرافیہ پڑھایا، نہ تاریخ، آپ نے کچھ نہیں بتایا کہ دنیا کے مختلف ملکوں کی کیا کیا پیداواریں ہیں اور نہ بتایا کہ دنیا کے مختلف حصوں کے بادشاہوں کے نام کیا ہیں۔ الخ

میرے نزدیک تو نہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ عالمگیر جیسے بادشاہ کی تقریر ہوسکتی ہے اور نہ تاریخوں سے عالمگیر کے کسی ایسے اُستاد کا پتہ چلا ہے جو پیٹ پکڑے بادشاہ کے سامنے بار بار نوکری کے لیے دوڑے پھرتے تھے۔

(14) جدید وقدیم نسلوں میں علمی مذاق کے اعتبار سے کتنا فرق پیدا ہوچکا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس ایک واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کے حوالہ سے سید سلیمان صاحب نے ''معارف'' کے شذرات میں لکھا تھا کہ مولانا بیان کرتے تھے میری کتاب ''المامون'' جس وقت پریس سے نکلی تو کل تین مہینوں میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ لیکن آخر عمر میں جب انہوں نے ''شعرالعجم'' لکھی تو یہ خیال کرکے کہ بہ نسبت تاریخ کے ہندوستانی مسلمانوں کو فارسی ادب کا مذاق چونکہ زیادہ ہے اس لیے یہ کتاب اس سے بھی زیادہ جلد ہاتھوں ہاتھ نکل جائے گی۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پانچ سال کی طویل مدت میں ''شعرالعجم'' کے پانسو نسخے ختم ہوئے۔ صرف بیس تیس سال میں ملک کا علمی مذاق کس سطح سے اُتر کر کہاں پہنچ گیا۔ لیکن جزرہی کا نام مد رکھا دیا گیا ہے اور لوگ ترقی تعلیم کے الفاظ پر خوش ہیں۔

(15) حالانکہ معاملہ بالعکس ہے، شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق تو خیر سرسید احمد خاں وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں ایسا کوئی فتویٰ نفیاً یا اثباتاً نہیں (1) ہے مگر شاہ صاحب کے سوا دوسرے علماء مثلاً حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے فتاویٰ میں دیکھیے ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں آپ کو جواز کا فتویٰ ملے گا، ایک موقع پر ارقام فرماتے ہیں:

''فی الواقع نفس تعلیم انگریزی کا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے زید بن ثابتؓ کو زبان یہودی سیکھنے کا حکم کیا۔ جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔ ملا علی قاری مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہے ''**لایعرف الشرع تحریم علم لغة من اللغات سریانیة کانت او عبرانیة،هندیة کانت او ترکیة اوفارسیة کانت او غیرها** ''یعنی شریعت میں کسی لغت کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو، ایسی بات کسی دلیل سے معلوم نہیں ہوتی خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی وغیرہ کوئی ہو۔'' (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی مرحوم۔ ج1، ص80)

بعد کو شاہ صاحب کا ایک رسالہ ملا، جس میں شاہ بخارا کے سوالوں کے جوابات آپ نے دیئے ہیں ان ہی سوالوں میں ایک سوال انگریزی خوانی کا بھی ہے۔ جواب میں شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ ''تعلیم انگریزی یعنی آئین خط وکتابت ولغت واصطلاح اینہا را دانستن باکے ندارد۔'' (ضمیمہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز۔ ص195 مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی) شاہ صاحب نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ والی روایت سے استدلال فرمایا ہے۔ اسی سلسلہ میں منطق کے متعلقہ سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کی حیثیت آلہ کی ہے اور آلہ کا حکم ہمیشہ اس چیز کا تابع ہوتا ہے جس کا آلہ اسے بنایا جائے، پھر آپ نے توپ و بندوق کی مثال دے کر فرمایا ہے اگر ''حرب عبادت ست مثل جہاد یا و نیز از قبیل عبادت خواہد شد۔''

(16) اپنی تاریخ سے جو قوم جاہل کر دی گئی ہو اسے سب ہی طرح کا دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں حضرت امام شافعیؒ کے متعلق حافظ ابن حجر نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہے کہ طب ونجوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بقراط کی کتاب غیر اقوام کے لوگ امام شافعی سے پڑھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ایک امام یعنی امام شافعی ہی سے یہ روایت حافظ ہی نے درج کی ہے کہ ان کے شاگرد حرملہ کہتے تھے ''**كان الشافعي يتاسف ماضيع المسلمون من الطب و يقول صنيعو اثلث العلم و كلوه الى اليهود و النصارىٰ** ''یعنی حضرت امام شافعی اس پر بہت افسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں نے علم طب کو کھو دیا۔ فرماتے کہ علم کا ثلث حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انہوں نے اس فن کو یہود ونصاریٰ کے سپرد کر دیا۔ (دیکھو توالی التاسیس۔ ص66) امام شافعی دوسری صدی کے فقہ وحدیث علوم قرآنیہ کے امام ہیں۔ یہود ونصاریٰ سے آپ کا اشارہ عباسی دربار کے عیسائی اور یہودی اطباء کی طرف تھا۔ مسلمانوں کی رواداری کی انتہا ہے کہ یونانی طب میں انہوں نے خدا جانے کتنا اضافہ کیا، لیکن نام تک نہ بدلا اور آج تک یونانی طب کے نام سے مسلمانوں کی طب موسوم ہے۔

قدیم نصاب کی خصوصیات اور اُس کے نتائج

چاہیے تو یہ تھا کہ ان نتائج کو دیکھ کر ہم ٹھنڈے دل سے تمام عصری مشاغبوں سے جدا ہو کر سوچتے کہ جس نصاب میں ''دینیات'' کا حصہ اتنا قلیل ہے، اسی سے ایسے عظیم نتائج کیوں پیدا ہوتے رہے۔ اگرچہ ضمناً اس کی طرف اشارہ کرتا چلا آیا ہوں، لیکن شاید میرے یہ اشارے کافی نہ ہوں۔ نیز میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ خود اس نصاب کی خصوصیتوں کی طرف بھی آخر میں توجہ دلاؤں گا۔ گویا ''انی برہان'' کے مقابلہ میں اب جو کچھ کہا جائے گا، اس کی حیثیت برہان لمی کی ہوگی۔

نوع انسانی کی بنیاد ارتقاء

بات یہ ہے کہ تعلیم ہی پر نوع انسانی کے ارتقاء کی بنیاد قائم ہے۔ یہ ایسا مسلمہ مسئلہ ہے، جس میں شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ آخری پیغام میں صل (نماز پڑھ) صم (روزہ رکھ) وغیرہ احکام کی جگہ پہلا خطاب جس سے نوع انسانی کو اس کے آخری پیغام بر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا، وہ اقراء (پڑھ) کا لفظ تھا۔ جس رب نے قلم سے سکھایا، اس کی یاد دلاتے ہوئے۔

علم الانسان مالم یعلم

''سکھایا اس رب نے ''الانسان'' کو جسے وہ نہیں جانتا۔''

پر اپنے اس ''خطاب اوّل'' کو ختم فرمایا گیا ہے، خود یہ دلیل ہے کہ اپنی آخری نشأت اور اُٹھان میں انسانیت کا بنیادی کام ''تعلیم'' ہی ہے۔

انسانی علم میں اضافہ

اور یہ بھی یہی واقعہ کہ جیتے جی آخر وقت تک جس کسی کو جو کچھ کرنا ہے، الانسان کے سوا سب ہی اس کا علم لے کر پیدا ہوتے ہیں جو نہیں معلوم تھا۔ اس کا علم نہیں حاصل کرتے، بلکہ جو کچھ معلوم تھا صرف اسی پر عمل کر کے اپنی آخری

سانس پوری کرتے ہیں۔ شناوری کا علم بط کا بچہ انڈے کے اندر سے لاتا ہے، لیکن بوڑھا ہو کر یہی بچہ مرتا ہے تو جو علم لے کر پیدا ہوا تھا، مرنے کے وقت بھی اس علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ سب کا یہی حال ہے، لیکن ان میں صرف ایک آدمی زادہ ہے کہ پیدا ہوتا ہے ہوش و تمیز عقل و خرد سے خالی ہو کر، لیکن مرتا ہے حکیم و علامہ فاضل وطبیب مہندس بن کر۔ **مالم یعلم** (جو کچھ نہیں جانتا) یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ زندگی بھر اسی کو جاتا رہے۔ اس کے رب نے اس کی فطرت یوں ہی بنائی ہے۔ ان لوگوں کا جو پہلی وحی کے خطاب اول کے آخری الفاظ **الانسان مالم یعلم** (سکھائی انسان کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا) کی تاویل میں کہتے ہیں کہ **الانسان** ایک تعلیمی حقیقت ہے یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت صرف اسی میں ہے، ورنہ اس کے سوا دل و دماغ لے کر جتنے پیدا ہونے والے پیدا ہوئے ہیں، وہی جانتے ہیں، جس کا جبلّی اور فطری علم لے کر وہ پیدا ہوئے۔ اس کے سوا وہ اور کچھ جان ہی نہیں سکتے خواہ جینے کا موقعہ اس دنیا میں ان کو جتنا بھی دیا جائے ان کی عمر گدھ ہی کی عمر کیوں نہ ہو، الانسان کی یہی صلاحیت ہے، جس کا ظہور قراۃ (خواندگی) اور تعلیم بالقلم (نوشت) سے ہوتا ہے۔ اسی کی طرف خطاب اول میں ایما فرمایا گیا ہے۔ (1)

تعلیم و تربیت کا انسانی مقصد

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ **علم الانسان مالم یعلم** (الانسان جو نہیں جانتا ہے، اسے جانے) کی انسانی فطرت میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اسی کو جہاں تک ممکن ہو بروئے کار لانے کے لیے چمکایا جائے، مانجھا جائے، دھویا جائے، صاف کیا جائے اور قدیم تعلیم ہو یا جدید، سب کا حقیقی نصب العین یہی رہا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جدید تعلیم آدمی میں ریل و موٹر بنانے گراموفون اور ریڈیو کے ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور غریب عوام اس سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی دنیا کی عصری جامعات تعلیمی ادارے نہیں، بلکہ دستکاریوں کے کرگہ (کارگاہ) یا کارخانے ہیں، لیکن ان کو پھر تعجب ہوتا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ معاشیات و نفسیات، السنہ و لنگویجز ہی کے اساتذہ نہیں، جو فنون کے معلم ہیں، بلکہ کیمیا اور طبعیات (سائنس و حکمت) کے معلمین کی بھی موٹر جب خراب ہوتی ہے تو بنانا تو بڑی بات ہے، معمولی کل پرزوں کی اصلاح بھی نہیں کر سکتے۔ عالم پروفیسر کھڑا تاکتا رہتا ہے اور جاہل شوفر اپنی فنی مہارت کا اظہار کرتا ہے۔ بجلی کا کوئی تار ٹوٹا اور برقیات ہی کا اُستاد کیوں نہ ہو، مستری مستری کی چیخ سے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مغالطہ اصل حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم گاہوں میں جو کچھ بھی تعلیم دی جاتی ہے، اس کا بالکلیہ تعلق علمی نظریات اور کلیات سے ہوتا ہے، ایسے نظریات اور کلیات جن کی روشنی میں فطرت کے نوامیس و قوانین واضح ہوتے ہیں۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی قوانین و نوامیس کے علم سے آدمی کسی ایسی چیز کو ایجاد کر لے، جس کا علم پہلے سے اسے حاصل نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جامعاتی تعلیم ایجادات و اختراعات کے لیے مقدمہ کا کام دے سکتی ہے (2)۔ لیکن یہ باور کرنا کہ ان جامعات میں بھی چیزوں کے بنانے اور ڈھالنے کا کام طلبہ سے کرایا جاتا ہے۔ نہ یہ واقعہ ہے اور نہ مدارس کے قیام کی غرض ہے۔ تعلیم کی غرض جو ہمیشہ سے تھی۔ وہی مقصد اب بھی ہے۔ پہلے بھی وہی **مالم یعلم** (جسے نہیں جانتا) کے متعلق

یعلم (انہیں جانے) کی صلاحیتوں کی نشو ونما میں کوشش کی جاتی تھی اور اب بھی جبلت بشری کی اسی عجیب وغریب قدرتی ودیعت کو ابھارنے اور اُجاگر کرنے میں سارا زور صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ فنون کا شعبہ ہو یا سائنس (حکمت) کا۔

اسلامی علوم کے حصول کا طریقہ

میرے سامنے اس وقت دوسرے علوم وفنون اور ان کی تعلیم وتعلم کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ بحث کا دائرہ صرف اسلامی علوم کی حد تک محدود ہے، یعنی قرآن وحدیث وفقہ عقائد کی تعلیم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یا کیا ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اگر ان علوم کی تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری ہو، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے نصاب قدیم میں دینیات اور خالص اسلامی علوم کی تعلیم میں غفلت بلکہ مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ ظاہر ہے کہ پورے نصاب میں چند مختصر فقہی متون کے علاوہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، جلالین جیسی تفسیر اور مشکوٰۃ جیسے مجموعہ حدیث اور ہدایہ وشرح وقایہ جیسی کتابوں سے ان علوم کے متعلق کیا معلومات فراہم ہو سکتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان علوم میں سے ہر علم کی حالت یہ ہے کہ بیس بیس، تیس تیس جلدوں میں اس کی ایک ایک کتاب پائی جاتی ہے۔ تفسیر کا فن جس میں جریر طبری، درمنثور، روح المعانی، تفسیر کبیر جیسی ضخیم کتابیں ہوں۔ اسی فن میں صرف بیچاری جلالین طلبہ کو کیا معلومات عطا کر سکتی ہے۔ جس کے الفاظ کہا جاتا ہے کہ قرآنی الفاظ کے مساوی ہیں اور حدیث ومتعلقات حدیث ورجال، علل، سیر اصول حدیث ومتعلقات حدیث کی کتابوں سے بھر دیئے جا سکتے ہیں۔ یہی حال فقہ کا ہے۔ خود ہدایہ ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے:

شرحها شرحاً نحو ثمانين مجلدات و سماه كفاية المنتهي.

(مفتاح۔ ص126)

''اتنی جلدوں میں شرح لکھی ہے اور اس کا نام کفایۃ المنتہی ہے۔''

اور اسی کا خلاصہ ہدایہ ہے اور اس علم کے فتاویٰ محیطوں اور حاویات (انسائکلو پیڈیاز) اور وہ بھی ہر ہر مذہب کی کتابیں حصر و شمار میں آ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی حدیث وفقہ میں مشکوٰۃ اور ہدایہ ووقایہ کی معلومات کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے؟

تعلیم کا مقصد

پس اگر تعلیم معلومات کی گرداوری کا نام ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ان فنون میں سے کسی ایک فن کے لیے بھی طالب علم کی پوری عمر وفا کر سکتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک فن کی دو تین کتابوں کو درساً درساً پڑھتے ہوئے لحد تک پہنچ جائے گا۔ بشرطیکہ مہد ہی سے اُس نے پڑھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اگر تعلیم کا وہی مقصد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا۔ یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے اس صلاحیت کو ابھارا جائے۔ طلبہ میں ایک ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا کیا جائے کہ تعلیمی زندگی سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق ومسائل تک اُستاد کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے۔ خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی خواہ وہ

کسی قسم کی پیچیدہ اور دقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں۔ تنقید یا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیتوں کو مدرسہ سے لے کر باہر نکلے۔ اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ چیزوں کو دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو، بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے، جہاں تک بڑھ سکتی ہو، تعلیم صرف اس کا نام ہو اور دیکھنے، سیر کرنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی، اس سے بہتر راہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

تعلیم کے درجے

واقعہ یہ ہے کہ جیسا آپ سُن چکے کہ عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی۔ ایک ضرورت کا درجہ تھا دوسرا فضل کا۔ ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصی زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئیں گی، ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے۔ گذر چکا کہ اس کے لیے صرف و نحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھا دی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو اسے چھ مہینوں میں ختم کر سکتے تھے۔ حضرت سراج عثمانؒ کے ذکر میں مولانا فخر الدین زراوی کا وہ قول نقل کر چکا ہوں کہ انہوں نے ذمہ داری لی تھی کہ چھ مہینہ میں قدر ضروری والے علم تک پہنچا دوں گا اور جو کچھ انہوں نے وعدہ کیا تھا پورا کیا۔

بقدرِ ضرورت تعلیم

سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے لیے مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی۔ خدا جانے اس زمانہ میں لوگ کس طرح سوچتے ہیں۔ میں بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں، جن زبانوں کو مسلمان بولتے ہیں، عربی کے سوا اور جتنی اسلامی زبانیں ہیں، سب میں قرآن و حدیث کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، جسے مادری زبان کے الفاظ کی حیثیت سے لوگ یونہی جانتے ہیں۔ آئندہ غیر عربی زبان والوں کو جو دشواری رہ جاتی ہے وہ کچھ عربی صیغوں کے مختلف اشکال کی اور کچھ عربی جملوں کی ترکیبوں کی۔ صرف و نحو کی معمولی تعلیم کے بعد خواہ قرآن سبقاً سبقاً پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے بجز معدودے چند الفاظ کے جنہیں لغت کی معمولی کتابوں یا کسی فارسی اُردو کے ترجمہ یا تفسیر سے بآسانی حل کر لیا جا سکتا ہے۔ اپنے سادہ سیدھے معنی کے حساب سے یقیناً یہ سہولت تمام سمجھا جا سکتا ہے اور ہمیشہ یونہی وہ سمجھا گیا ہے۔ قرآن کے بعد اب رہ گئی قرآن کی علمی تشکیل، بلا شبہ اس کا ذخیرہ دراصل حدیث ہی کی کتابوں میں ہے۔ لیکن اس ذخیرے سے صحیح نتیجہ نکالنا، کیا ہر معمولی آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ فقہ آخر ہے نام کس چیز کا؟

مباحث فقہ و حدیث کی کثرت

احادیث و آثار کا وہی ذخیرہ جس سے ہر معمولی آدمی استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی خام مواد سے بحث و تنقیح، توفیق و

ترجیح، جرح و تعدیل کے بعد آئمہ مجتہدین نے جن پختہ نتائج کو پیدا کر کے امت کے حوالہ کیا ہے۔ کیا فقہ اس کے سوا بھی کچھ اور ہے؟ وہ امام ابوحنیفہ کی فقہ ہو یا امام شافعی کی، حال تو یہ ہے کہ فقہ کے سینکڑوں ابواب کے بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار مسائل اور ان کے متعلقہ مباحث کو عوام کیا طے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں پچھلے دنوں کل چار مسئلوں کو لے کر یعنی رفع الیدین، قراۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر والخفاء، تین تو یہ ہوئے اور ایک شاید سینے پر ہاتھ نماز میں باندھا جائے یا زیر ناف، نماز کے ان چار مسئلوں پر پچاس برس سے حدیث کی کتابیں اُلٹی پلٹی جارہی ہیں۔ رسالوں پر رسالے نکل رہے ہیں، لیکن قطعی فیصلہ ہنوز روز اول کی حالت میں ہے۔ خیال تو کیجیے کہ الزکوٰۃ، الصوم، الحج، البیوع، الاجارات، الوصایا، الوقف وغیرہ وغیرہ بیسیوں ابواب میں سے صرف تین چار مسئلوں میں جب لوگوں کا یہ حال ہے تو کیا ان ہی لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حدیث و آثار کی کتابوں سے یہ اپنے لیے صحیح نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ مختلف آثار و روایات میں سنداً و متناً جو دقیق علمی مباحث پیدا ہوتے ہیں، کیا اس خام ذخیرے سے پختہ نتائج کا پیدا کرنا ہر شخص کا کام ہو سکتا ہے اور بالفرض کوئی اس کی ہمت کر بھی گزرے تو دوسروں سے نہیں خود اسی کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ جو وزن امام ابوحنیفہ، مالک و شافعیؒ وغیرہ آئمہ کے فیصلوں کا ہے، وہی وزن وثوق و اعتماد کی وہی کیفیت کیا وہ اپنے فیصلوں میں پا سکتا ہے؟

کتب فقہ کی اہمیت

کچھ بھی ہو قدوری اور ''کنز'' کا لفظ بولنے میں تو نہایت سبک اور ہلکا سا معلوم ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ کتابیں اسلام کی بہترین دل و دماغ کی انتہائی عرق ریزیوں کے آخری منقح نتائج ہیں۔ خدا جزاء خیر دے ان بزرگوں کو جنہوں نے دین کی دشواریوں کو حل کر کے مذہبی زندگی گزارنے والوں کے لیے راہ آسان کر دی۔

بزرگوں نے انتہائی احتیاط سے کام لے کر سینکڑوں تصنیفات سے ان چند متون کا انتخاب اس لیے کر دیا ہے کہ ان کے مصنفین کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بیان پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ یہی قدوری ہے، عوام کو شاید معلوم نہ ہو لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ تقریباً ایک ہزار سال کا یہ قدیم مستند متن متین ہے۔ مشہور امام ابوالحسین بن ابی بکر القدوری البغدادی المتوفی 362ھ نے بیسیوں کتابوں سے کہا جاتا ہے کہ بارہ ہزار ضروری مسائل کا انتخاب فرمایا(3)۔ عہد تصنیف سے آج تک یہ کتاب پڑھائی جارہی ہے۔ قطع نظر دوسری باتوں کے اس قسم کی کتابوں کا ایک بڑا نفع یہ بھی تھا کہ ایک ایک کتاب سے تین تین چار چار نسلیں درسی فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

جدید اسکولی نصاب اور اس کے مشکلات

آج جدید مدارس و کلیات میں نصابی کتابوں کی تبدیلی کا جو ایک عارضہ ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہو رہا ہے کہ جن کتابوں کو پڑھ کر بڑے بھائی نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ چند ہی سال کے بعد چھوٹا بھائی جب اسکول میں آتا ہے

تو ان ساری کتابوں کو بیکار پاتا ہے جن سے اس کا گھر بھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کا نصاب بدل چکا ہے، بڑے بھائی کی پڑھی ہوئی کتابیں سب بے قیمت ہو چکی ہیں اور لطف یہ ہے کہ جن کتابوں کو نکال کر ان کی جگہ دوسری کتابیں رکھی جاتی ہیں۔ مضامین و مسائل کا طریقۂ بیان کسی لحاظ سے بھی عموماً وہ گزشتہ کتابوں سے بہتر نہیں ہوتا، اور اب تو حال یہ ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے اِدھر اُدھر سے چند انتخابات کا مجموعہ مرتب کر کے نصاب کی کمیٹیوں میں پیش کر دیتا ہے۔ پھر اندرونی اور بیرونی کوششوں سے نصاب میں شریک کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ سے کتاب بیچنے والے تو لاکھوں لاکھ کا سرمایہ سمیٹ لیتے ہیں اور بدقسمتی سے جن غریبوں کو چند بچوں کے باپ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ہر سال ہر بچہ کی نئی کتابوں کے لیے ایک کافی رقم خرچ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

قدیم نصاب کی برکتیں

خیر جس زمانہ میں تعلیم گاہوں کو بھی تجارت گاہوں سے بدل دیا گیا ہو۔ اس زمانہ میں جو کچھ بھی نہ کیا جائے کم ہے لیکن ہمارا جو نظام تعلیم تھا، ہمیشہ اس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی کہ جب تک کوئی بہتر کتاب ظہور میں نہ آ جائے، نصاب کی مروجہ کتابوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ آپ سن چکے کہ ہزار سال تک کی کتاب (قدوری) ہمارے درس میں اب تک موجود ہے۔ یہی حال مثلاً ہدایہ کا ہے۔ علامہ مرغینانی صاحب [4] ہدایہ کی وفات پر ساڑھے سات سو سے زیادہ زمانہ گذر چکا۔ جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب نصاب میں شریک کی گئی ہے۔ چونکہ فقہ حنفی کی کوئی دوسری کتاب اب تک ایسی تصنیف نہیں ہوئی کہ اس کی قائم مقامی کر سکے [5]۔ بزرگوں نے اسی کو اب تک باقی رکھا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں کے اس طرزِ عمل پر عہد حاضر کے تجارتی کاروبار کو کس بنیاد پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

خیر میں کس مسئلہ میں الجھ گیا۔ برساتی کیڑوں کی طرح نصابی کتابوں کی پیدائش کا مسئلہ نہ صرف اپنی بے حاصلی کی وجہ سے قابل بحث ہے۔ بلکہ غریب ہندوستان کے غریب باشندوں کے لیے ایک مستقل معاشی اور اقتصادی سوال بنا ہوا ہے۔ کاش جہاں اور مسائل پر توجہ مبذول ہو رہی ہے۔ ملک کے بہی خواہوں کی نگاہ اس علانیہ لوٹ پر بھی پڑتی، جو علم کے طلبہ پر تاجران کتب کی طرف سے مسلسل جاری ہے۔ محکمۂ تعلیمات ان کا پشتیبان ہے اور محکمہ کو زور حکومت کی بندوق اور توپ سے حاصل ہے۔ ان کتابوں کا نہ خریدنے والا یا روزی سے محروم ہو، یا بغاوت کا مجرم ٹھہرایا جائے۔

ضروری نصاب

بالفعل ان چند ضمنی اشاروں پر بحث کو ختم کر کے پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ضروری نصاب کا تو یہ حال تھا، مذہب کی تعلیم ذاتی ضرورت کے لیے اس حد تک کافی ہے۔ مدت تک ضرورت کے اس نصاب میں فارسی کے سوا تھوڑی بہت عربی یعنی وہی معمولی صرف و نحو اور کچھ فقہی مسائل کی تعلیم مذہب کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی۔ آج جس طرح میٹرک تک انگریزی زبان اور معمولی حساب و کتاب کی واقفیت کے بعد لوگ سرکاری محکموں میں

داخل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی حکومت کی زبان جو بجائے انگریزی کے فارسی تھی اور نوشت وخواند حساب وکتاب و سیاق وتحریر کے ڈھنگ سے واقف ہو جانے کے بعد دفتری ملازمتوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج کل مذہب کی تعلیم بحث سے خارج ہے اور اس وقت لکھے پڑھے لوگوں کے لیے مذہب اور مذہب کے لیے وہی تھوڑی سی بقدر ضرورت عربی بھی ضروری تھی۔ انتہا یہ ہے کہ انگریزی عہد تک میں پرانے علمی خاندانوں کے بچے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود گھر میں فارسی اور ابتدائی عربی ضرور سیکھ لیتے تھے۔ مسٹر ہمایوں مرزا جو پٹنہ کے ایک عالم رئیس کے لڑکے تھے۔ ان کے والد مرشد آباد کی نوابی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے۔ حالانکہ ہمایوں مرزا کی تعلیم بالکلیہ انگریزی ہے۔ ہندوستان ہی نہیں، بلکہ یورپ تک اسی تعلیم کی تکمیل کے لیے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں بچپن کے حالات میں اپنے مکتبی مولوی صاحب کا ذکر کرتے (6) ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی کے ساتھ ساتھ:

''انہوں نے میزان الصرف ختم کرائی اور منشعب وتصریف وغیرہ پڑھائی۔'' (ص 33)

قدیم فارسی خوانوں کی کتابوں اور خطوط ومکاتیب میں اشعار، عربی زبان کے فقرے، قرآنی آیتیں وغیرہ جو پائی جاتی ہیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ شاید آخر زمانہ میں جب دلّی کی حکومت کمزور ہوئی۔ عربی کا لزوم جاتا رہا اور جہاں تک میرا خیال ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فارسی میں اپنی فقہی کتاب ''مالابدمنہ'' اسی رنگ کو دیکھ کر لکھی، فارسی مکاتیب میں بجائے قدوری کے پچھلے دنوں قاضی صاحب کی ''مالابدمنہ'' نصاب کی جز تھی۔

درجہ فضیلت

خیر یہ تو ضروری تعلیم کا نصاب تھا، لیکن فضل کے درجہ کی تعلیم میں جو بات قدیم بزرگوں کے سامنے تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، معلومات کی فراہمی نہ تھی، بلکہ اس ملکہ اور صلاحیت کا پیدا کرنا مقصود تھا، جس کے ذریعہ سے آدمی عمر بھر اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتا تھا۔ اسی نقطۂ نظر کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اتفاقاً نہیں بلکہ قصداً درجۂ فضل کی تعلیم کی بنیاد ان چند اساسی امور پر قائم کی گئی تھی۔ ہر ایک پر میں الگ الگ مختصر الفاظ میں بحث کرتا ہوں:

(1) مقصود بالذات علوم سے پہلے اور نسبتاً زیادہ وقت ان علوم پر طلبہ کا صرف کرایا جاتا تھا، جنہیں ہم چاہیں تو ورزشی علوم کہہ سکتے ہیں۔ اپنی اصطلاح میں ان لوگوں نے اس کا نام علوم آلیہ رکھا تھا۔ یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی واضح اور صاف نہ ہوں۔ بلکہ ان میں ابہام، لچک، پیچیدگی زیادہ ہو، جس کا ہر دعویٰ آسانی سے ثابت نہ ہوسکتا ہو، بلکہ جو کلیہ بھی بنایا جائے وہ ٹوٹ سکتا ہو، اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجائش رکھتا ہو، مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں خود سوچنے اور تنقید کرنے، مسائل کے دقیق پہلوؤں تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو۔

(2) اسی طرح تلاش کر کر کے ایسی کتابیں ان فنون کی رکھی جاتی تھیں جو نسبتاً بجائے تفصیل کے مجمل زیادہ ہوں۔ عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھ میں آجائے۔ جس طرح پہلی بات سے یہ غرض تھی کہ طلبہ میں خودفکری اور خود سوچنے کی صلاحیت کی پرورش کی جائے اسی طرح ان مشکل اور پیچیدہ کتابوں کے رکھنے کی غرض یہ تھی کہ دوسروں کی

سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو۔

اصول فقہ اور اس کی اہمیت

اور غور کیا جائے تو تعلیم کی غرض یہی دو باتیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی آدمی خود سوچنے لگے اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے لگے۔ میں جیسا کہ پہلے بیان کر آیا ہوں کہ ابتدائی صدیوں میں ہمارے نصاب میں مذکورہ بالا دو مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے اگرچہ منطق کا بھی عنصر شریک تھا، لیکن زیادہ تر اس زمانہ میں علم کی حیثیت سے جس علم سے یہ کام لیا جاتا تھا وہ خود مسلمانوں کا ایجاد کیا ہوا علم اصول فقہ تھا اور کتابوں کے لحاظ سے خود اصول فقہ کی مشہور کتاب بزدوی تھی۔ نیز فقہ کی کتاب ہدایہ اور تفسیر کی کشاف درس میں ان ہی دونوں اغراض کے لیے رکھی گئی تھیں۔ بزدوی کی یہ کتاب ''اصول فخر الاسلام'' کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے مصنف پانچویں صدی کے مشہور اصولی عالم فخر الاسلام علامہ علی ابوالحسن البز دوی ہیں۔

اصول فقہ بزدوی

جہاں تک میرا خیال ہے، اصول فقہ کا ایک ایسا متن قصداً انہوں نے تیار کیا تھا جس کی عبارتوں کا سمجھنا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے، لیکن اگر اس لوہے کے چبانے کی قدرت کسی میں پیدا ہوگئی تو پھر اس کے لیے واقعی جو چبانے کی چیزیں ہیں وہ کچھ بھی باقی نہیں رہتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے لیے تو فخر الاسلام نے یہ کتاب لکھی لیکن واقعی اصول فقہ کے مسائل کے سمجھنے اور ان پر حاوی ہونے کے لیے شاید ان ہی کے مشورے سے نہایت سلیس صاف و واضح عبارت میں ان کے حقیقی بھائی، جن کا نام محمد تھا، اس فن اور اس کے علاوہ دوسرے فنون میں ایسی کتابیں لکھیں کہ ایک طرف فخر الاسلام کو لوگوں نے ابوالعسر (مشکل عبارتوں کا باپ) اور ان کے بھائی کا نام ابوالیسر (یعنی آسانی و سہولت کا باپ) رکھ دیا۔

''مفتاح السعادت'' میں طاش کبریٰ زادہ نے لکھا ہے:

> **وللامام فخر الاسلام البزدوی اخ مشهور بابی الیسر لیسر تصنیفاته كما ان فخر الاسلام مشهور بابی العسر لعسر تغنیفاته.** (ج2،ص55)

> ''فخر الاسلام بزدوی کے ایک بھائی مشہور ہیں جن کا نام ابوالیسر تھا۔ یہ نام ان کی کتابوں کی آسانی و سہولت کے مدنظر رکھا گیا تھا۔ جس طرح فخر الاسلام ابوالعسر کے نام سے موسوم ہیں کہ ان کی تصنیفات عسیر اور دشوار ہیں۔''

بزدوی کے متن کی کیا کیفیت ہے حضرت مولانا عبدالعلی بحرالعلوم ''شرح مسلم الثبوت'' کے دیباچہ میں فخر الاسلام اور ان کی اسی کتاب کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

وتلک للعبارات کانها ضحوم کوزة فیها الجواهر و اوراق مستورة فیها الزواهر تحیرت اصحاب الاذهان اشماقبه فی اخذ معاینهاوقنع الغائصون فی بحارها بالاصداف عن لالیها ولااستحی من الحق واقول قول الصدق ان جل کلامه العظیم لاقدر علی حله الامن نال فضله تعالیٰ الجسم واتی الله وله قلب سلیم. (مطبوعہ مصر، ص 5)

''فخر الاسلام کی عبارتوں کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چٹانوں میں کسی نے جواہر جڑ دیے ہوں یا ایسے پتے ہیں جن میں پھول چھپے ہوئے ہیں۔ ذہن و ذکاوت والے ان عبارتوں سے معانی حاصل کرنے میں متحیر ہیں اور ان عبارتوں کے دریاؤں میں غوطے لگانے والے بجائے موتی کے صرف سیپوں پر قناعت کر رہے ہیں۔ میں حق کے اظہار میں شرماتا نہیں اور سچی بات کہتا ہوں کہ ان کی باتیں جو عظیم اور بڑی ہیں ان کو وہی حل کر سکتا ہے جس نے خدا کے فضل عظیم سے حصہ پایا ہو اور خدا کے پاس قلب سلیم لے کر دنیا میں آیا ہو۔''

''ہدایہ''

یہی حال اس زمانہ کے درجہ فضل کی دوسری کتابیں ''ہدایہ'' اور ''کشاف'' کا ہے۔ ''ہدایہ'' کے متعلق کہہ چکا ہوں کہ سات ساڑھے سات سو کا زمانہ گزر چکا ہے، لیکن اس شعر کو شاعرانہ اغراق اگر قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور ہے:

ان الهدایة کالقران قد نسخت ماصنفوا قبلها فی الشرع من کتب

''ہدایہ گویا اس باب میں قرآن سے مشابہ ہے جس نے گزشتہ شرائع کی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔''

لیکن اسی قطعہ کا دوسرا شعر:

فاحفظ قراتها والزم تلاوتها یسلم من زیغ و من کذب

''پس اس کتاب کو پڑھتے رہو اور اس کی خواندگی لازم کر لو تم اگر ایسا کرو گے تو تمہاری گفتگو کجی اور غلطیوں سے پاک ہو جائے گی۔''

کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کتاب کی یہ خوبی نہیں ہے کہ اس میں فقہ کے تمام مسائل آ گئے ہیں اور ان مختصر جلدوں میں فقہ جیسے بحر زخار علم کا سمانا مشکل کیا ناممکن ہے، لیکن دماغ کی جتنی ورزش اس کی عجیب وغریب سہل ممتنع عبارتوں سے ہو جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس مقصد کے لیے ہدایہ سے بہتر کتاب مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ اسی لیے شاعر کا بیان مبالغہ نہیں ہے کہ ''ہدایہ'' کے پڑھنے والے کجراہی اور غلط روی کے شکار نہیں ہو سکتے۔ خود صحیح سوچنے اور دوسرے کے کلام کے صحیح مطلب کے سمجھنے کا جتنا اچھا سلیقہ یہ کتاب پیدا کر سکتی ہے، عام کتابوں میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

"تفسیر کشاف"

رہی قدیم ہندی نصاب فضل کی تیسری معرکۃ الآرا تمرینی کتاب "کشاف"، سو اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مصنف کتاب جار اللہ "زمخشری" مسلمانوں اور علماء کی جماعت میں صرف اعتزالی ہی نہیں بلکہ ان عقائد میں شدت اور غلو کی وجہ سے سخت بدنام ہیں۔ لوگوں کی سوءظنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ گویا شکر میں لپیٹ کو کونین کھلانے کی مہارت سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص کو خاص طور پر حاصل ہے، اپنی کتاب میں چھپا چھپا کر اپنے عقائد خاص کی سمیت جذب کرتے چلے گئے ہیں۔ زین الدین بن المنیر الاسکندرانی العلامہ نے اس راز کو فاش بھی کیا ہے۔ بیرون ہند ہی میں نہیں، بلکہ ابتداء سے ہندوستان میں بھی ان کی بدنامی اچھے خاصے پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ شاید کسی موقعہ پر حضرت سلطان المشائخ کے حوالے سے اس خواب کا ذکر گزر چکا ہے۔ جس میں شیخ الاسلام زکریا ملتانی ؒ کے صاحبزادے کو دکھایا گیا کہ جار اللہ صاحب مفصل کو فرشتے پابزنجیر جہنم کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے ہیں۔ کول (علی گڑھ) کے مولانا صدر الدین کا بیان بھی بحوالہ سلطان المشائخ غالباً اسی موقع پر گذرا ہے جو مولانا نجم الدین سنامی سے انہوں نے اسی کشاف کے متعلق نقل کیا تھا۔

لیکن ان بدنامیوں اور برسر بازار رسوائیوں کے باوجود اس مقصد کے لیے یعنی ایک ایک فقرہ کے مختلف پہلوؤں پر ادبی نقطۂ نظر سے ذہن کو منتقل کرانے کی مشق اگر کوئی بہم پہنچانا چاہے تو "کشاف" سے بہتر اس مشق کے لیے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی ادبیات کے ذخیرہ میں بمشکل کوئی دوسری کتاب مل سکتی تھی، خصوصاً اس وقت تک جب تک کہ قاضی بیضاوی نے رازی اور کشاف کا خلاصہ (7) تیار نہ کیا تھا۔ صاحب "مفتاح السعادۃ" نے بھی "کشاف" کے متعلق لکھا ہے:

لم یصنف مثلہ قبلہ. (ج 1، ص 432)

"اس جیسی کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی۔"

نصاب معقولات کا اضافہ

مگر جوں جوں ہمارے نصاب میں معقولات کی کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا، ان تمرینی کتابوں کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ بزدوی تو بالکلیہ خارج ہوگئی، "کشاف" کی جگہ کچھ دن "بیضاوی" کی گرم بازاری رہی۔ شاہجہاں و عالمگیر ؒ کے عہد تک تو یہ حال رہا کہ قرآن کے ساتھ بعض لوگ پوری "بیضاوی" کو بھی زبانی یاد کر لیتے تھے۔ مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کا "بیضاوی" پر مشہور حاشیہ ہے، قسطنطنیہ میں بھی طبع ہوگیا ہے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا محمد معظم ساکن بنہ تھے۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی حفظ گرفتہ (8)۔" (ص 213)

"تفسیر بیضاوی کے ساتھ قرآن مجید زبانی یاد کیا۔"

مگر جب عقلی اور ذہنی کتابوں کا بوجھ جیسا کہ گزر چکا، پچھلے زمانہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا، تو "بیضاوی" کے عام مدارس میں

صرف ڈھائی پارے رہ گئے حتیٰ کہ معقولی درس کا مشہور خانوادہ جو علمی حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے مشہور ہے، اس میں تو "بیضاوی" کے صرف سوا پارے ہی کو کافی سمجھا گیا اور یہی میں بھی کہتا ہوں کہ درس نظامیہ کی معقولاتی کتابیں جن کا مقصود ہی دماغی تمرین اور ذہنی تشمید تھا، یہ ورزشی نصب العین اس زمانہ میں بآسانی ان علوم وفنون سے حاصل ہوسکتا ہے اور ہو جاتا ہے، جو عصری جامعات میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بآسانی خالص دینیات کی ان تین کتابوں کو لازمی جزبنا کر ہم تعلیمی نظام کی ثنویت کو توڑ سکتے ہیں۔

جدید نصاب کے بعض فنون

اس میں شک نہیں کہ مغربی طرز کی یونیورسٹیوں میں بعض ایسے فنون کی بھی تعلیم ہوتی ہے جن کے متعلق بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے طلبہ کی دماغی تربیت میں زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ مثلاً تاریخ ہی کا مضمون ہے کہ اس کی نوعیت قریب قریب افسانے کی ہے۔ لیکن ہمیں انصاف سے ہٹنا نہ چاہیے۔ تاریخ کسی زمانہ میں افسانہ کی حیثیت رکھتی ہو تو رکھتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب سے یورپ نے اس کو درسی فن بنا دیا ہے، اس وقت سے اب اس کی حالت دوسری ہوگئی ہے۔ اصل حقیقت کا پتہ چلے یا نہ چلے، لیکن تاریخ کے اساتذہ حقیقت کی سراغ رسانی میں جن دقیقہ سنجیوں، موشگافیوں سے اس زمانہ میں کام لے رہے ہیں اور طلبہ کو تحقیقات کے اس خاص طریقہ کا عادی بناتے ہیں۔ غلط بیانی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ اس کا تمرینی اثر طلبہ کے دل و دماغ پر نہیں پڑتا۔ یقیناً کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ اب صرف افسانہ یا گزرے ہوئے واقعات کا فقط دہرانا نہیں ہے، بلکہ باضابطہ اب وہ ایک عقلی فن ہے اور جب تاریخ جیسے سادہ سبجکٹ کو مدرسہ میں پہنچا کر قال اقول کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا گیا ہے تو یقیناً اب اس کے مباحث سے بھی وہی کام لیا جاسکتا ہے، جو کسی زمانہ میں میرزاہد رسالہ اور حمداللہ قاضی مبارک وشرح مواقف کے امور عامہ سے لیا جاتا تھا، اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر جو فنون (آرٹس) واقعی عقلی فنون ہیں مثلاً منطق، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات وسیاسیات وغیرہ یا حکمیات (سائنز) سے دماغی صلاحیتوں کے نشوونما میں جتنی امداد مل سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

قدیم وجدید نصاب پر یکساں اعتراض

بیوقوفوں کا ایک گروہ ہمارے اسلامی نصاب پر بھی معترض تھا کہ سارے عقلی علوم وفنون جو اس میں پڑھائے جاتے تھے، ان کا کوئی حاصل نہیں تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کسی فیصلہ کن آخری بات کا پتہ ان علوم میں نہیں چلتا، معمولی معمولی باتیں مثلاً یہی کہ علم یا جاننے کی عام صفت ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ آدمی جاننا ضرور ہے لیکن یہ جاننا کیا چیز ہے اور اس صفت کا حصول ہم میں کیسے ہوتا ہے۔ مباحث کا ایک طومار سوال وجواب کا ایک طوفان ہے، جو کتابوں میں موج مار رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اس وقت تک یہ طے نہ ہوسکا کہ علم ہے کیا چیز؟ یہی حال وجود کا ہے، وحدت و کثرت کا ہے، بلکہ ہر اس مسئلہ کا ہے، جو معقولات کے نام سے پڑھائے جاتے ہیں۔ بجنسہ یہی اعتراض ان علوم وفنون پر

کیا جارہا ہے، جو عصری جامعات کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معیار پر قدیم ہوں یا جدید، ہماری اکثر و بیشتر عقلی پیداواروں کا یہی حال ہے۔ عقلی نہ پچھلے زمانہ میں کسی مسئلہ کے متعلق آخری فیصلہ تک پہنچ سکی ہے اور نہ اس زمانہ میں اس بیچاری کو کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

شکوک وشبہات میں اضافہ

بلکہ جیسے جیسے یہ مباحث بڑھتے جاتے ہیں، اسی نسبت سے شکوک وشبہات کے میدان بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور تو اور یہ بیچاری تاریخ جب سے مدرسی مباحث کے چکروں میں پھنسی ہے، حال یہ ہو رہا ہے کہ بدیہی مسلمات بھی اب نظری بنتے چلے جارہے ہیں۔ ایسے مسائل کہ شیکسپیئر نامی شاعر واقع میں کوئی شاعر تھا بھی یا نہیں۔ حضرت اورنگ زیب جیسے عادل بادشاہ واقع میں عادل تھے یا نہیں۔ اکبر کا الحاد کوئی واقعہ تھا یا صرف افسانہ ہے۔ محمد تغلق کے جنون کے قصے واقعی جنون کے قصے ہیں یا بیان کرنے والوں ہی کا یہ جنون ہے۔ جو باتیں آنکھوں کے سامنے گذر چکی ہیں، جب درسی سوال وجواب انہیں شک کی تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں، تو جن امور کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ صرف تخمینوں سے جن کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔ مثلاً معاشیات، نفسیات اور الٰہیات و مابعد الطبیعیات کے مسائل کا جو حال ہے۔ ان علوم میں کسی آخری فیصلہ کن بات کا پتہ چلانا، کیا آسان ہے؟ حتیٰ کہ سائنس اور کیمیا جیسے علوم جن کا تعلق صرف محسوسات اور تجربیات سے ہے۔ لیکن جن مسلمات کو تسلیم کر کے ان علوم میں دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ آنے والے آتے ہیں اور شک وارتیاب کی کلہاڑیوں سے ایسی ضرب ان کی جڑوں پر لگاتے ہیں کہ اچانک سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے ابجد شروع ہوتی ہے۔ علم ہیئت کا تعلق تو ریاضیات جیسے یقینی علم سے تھا، لیکن مدت تک اس کے مسائل کی تشریح زمین کی مرکزیت کو مان کر لوگ کر رہے تھے۔ آنے والے آئے اور زمین سے اٹھا کر اسے آفتاب کے کرّہ پر لے گئے۔ بطلیموسی نظام قائم کیا گیا۔ اب کچھ دنوں سے جھانکنے والے جھانک رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سے بھی مرکزیت کا یہ فخر چھننے والا ہے۔ سائنس کے تجربات سب مادہ پر مبنی تھے، لیکن خود یہ مادہ سرے سے کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں۔ اب کیا انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مدرسوں میں اس پر تنقید شروع ہوگئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی علوم وفنون کی ان ہی درماندگیوں کو دیکھ کر سطحیوں کا ایک گروہ ہمیشہ غل مچاتا رہا ہے کہ جب کسی چیز کا تم لوگوں کو اپنی ان ناکام کوششوں میں پتہ نہیں چلتا۔ تمہارے فیصلے کسی زمانہ میں بھی آخری فیصلوں کی صورت اختیار نہیں کرتے تو پھر ان لایعنی ہرزہ درائیوں اور بادہ خوانیوں کا نفع ہی کیا ہے، بظاہر ان کی بات دل کو لگتی بھی ہے۔

نظر میں گہرائی پیدا کیسے کی جائے؟

لیکن اوروں سے تو مجھے بحث نہیں، اسلام کے خالص علوم قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم میں اگر اس کی ضرورت ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر میں گہرائی پیدا کی جائے۔ دماغی صلاحیتوں کو کافی طور پر ابھار کر ان علوم کے مطالعہ کا موقع طلبہ

کے لیے فراہم کیا جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ دماغوں کو ان ورزشی علوم کے اکھاڑوں میں کچھ دن خوب اچھی طرح کھیلنے کا موقع دیا جائے۔ یہ سوال کہ ان علوم کی تعلیم سے طلبہ کو کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی۔ یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ اکھاڑے کی کشتیوں اور مشقی کرتبوں کی قیمت خود اکھاڑے میں تلاش کی جائے۔ چاند ماری میں ہزار ہا ہزار روپیہ کی گولہ بارود کے ذخیرہ میں آگ لگادی جاتی ہے۔ یہ پوچھنے والا کہ ان گولیوں اور دوسری چیزوں کو کیوں برباد کیا گیا، اگر دیوانہ ہے تو پھر جن ورزشوں سے دماغی صلاحیتوں کو اُبھارا جاتا ہے۔ تحقیق وتدقیق، تنقید وتنقیر کی قوتوں کی بیداری کا کام جن ذہنی مشقوں سے لیا جاتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ پوچھنا کہ ورزش کرنے والوں کو ان ورزش گاہوں میں کیا ملتا ہے۔ خود ہی سوچیے کہ یہ کتنا بے معنی مطالبہ ہے۔

چاند ماری میں بلاشبہ بندوقوں سے جو گولیاں چھوڑی جاتی ہیں، وہ کسی مصنوعی دیوار یا فرضی نشانہ میں گم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان ہی گمشدہ گولیوں سے نشانہ بازی کی جو صحیح مشق ہمارے اندر واپس آتی ہے، اس کی قیمت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔

بحث وتحقیق کا ملکہ

بجنسہٖ یہی حال ان علوم کا ہے جن کے مسائل خواہ بذات خود جتنے بھی مشکوک، بے معنی، مبہم اور لایعنی ہوں، لیکن ان مسائل کی بحث وتحقیق سے غور وفکر کا جو ملکہ پڑھنے والوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یقین کیجیے کہ صرف معلومات دینے والی کتاب کے پڑھانے سے یہ بات کبھی نہیں حاصل ہو سکتی، خواہ وہ معلومات جتنے بھی قیمتی اور یقینی ہوں، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان معلومات کی صحیح قیمت اور ان کی یقین آفرینیوں کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید ہو بھی نہیں سکتا، جنہوں نے کسی ذہنی تربیت سے پہلے ان کا مطالعہ شروع کر دیا ہو۔ **الا ماشاء اللہ وقلیل ما ھم.**

قدیم کی جگہ جدید علوم کی ضرورت

اور یہی وہ راز ہے کہ اسلامی علوم کی تعلیم کا جب سے باضابطہ نظام ہمارے بزرگوں نے قائم کیا۔ جن فنون کو وہ فنون دانش مندی کہتے تھے۔ علوم مقصودہ سے پہلے اور ان کے ساتھ ساتھ ان فنون کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں دیتے چلے آئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلے یہ کام اصول فقہ اور بعض خاص کتابوں مثلاً ''کشاف'' و''ہدایہ'' سے لیا جاتا تھا، پھر یہی ضرورت معقولات کی کتابوں سے پوری ہوتی رہی اور آج ہم جن حالات میں گرفتار ہیں۔ تعلیمی نظام کی ثنویت نے گوناگوں فتنوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے ہیں۔ ہر دن نت نئے فتنے ان ہی دو مستقل تعلیمی اداروں کی بدولت پیدا ہو کر سر اُٹھا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں بآسانی عقلیات کے پرانے ورزشی علوم کی جگہ ہم جدید علوم وفنون کی مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے اپنے نصاب میں اس طریقہ سے شریک کر سکتے ہیں کہ دینیات کی حد تک وہی درس نظامیہ کی تین کتابوں کو نصاب کا لازمی جز رکھا جائے اور ذہنی ودماغی تربیت کے لیے جدید علوم وفنون کے کسی گروپ کو کافی سمجھا جائے۔

البتہ ایک نقص جامعاتی تعلیم کے نصاب میں باقی رہ جاتا ہے یعنی جوعلوم وفنون اس نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے تو دماغی تربیت پر اچھا اثر پڑتا ہے اور خودفکری کی استعداد طلبہ میں اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کافی طور پر بڑھ جاتی ہے، بلکہ شاید پُرانے عقلیات سے کچھ زیادہ ہی، اس لیے گو نتیجہ کے لحاظ سے کسی واقعی حقیقت کی یافت میں تو دونوں ہی عموماً ناکام ہیں، لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ قدیم عقلیات کا تعلق زیادہ تر ذہنی امور سے تھا اور جدید عقلیات میں چونکہ بحث کرنے کے لیے زیادہ تر واقعی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے اس لیے عقلی پرواز ان علوم میں اتنی بے لگام نہیں ہوتی، جتنی کہ پرانے عقلیات میں ہو جاتی تھی اور یہی مطلق العنانی قدیم عقلیات کے پڑھنے والوں میں گونہ ایک قسم کی کج بحثی کی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ ان کے تدقیقات حدود سے کچھ اتنا زیادہ تجاوز کر جاتے ہیں کہ بعض دفعہ اس پر ہنسی آ جاتی ہے بخلاف جدید عقلیات کے کہ ان کا موضوع بحث خود ان کو روکے تھامے چلتا ہے، اس لیے وہ زیادہ بھٹکنے نہیں پاتے۔

قدیم نصاب میں غیر واضح کتابیں اور اس کی وجہ

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا خودفکری کی صلاحیتوں کی نشوونما کی حد تک جدید علوم وفنون کی تعلیم کافی بلکہ قدیم علوم سے بہتر ہے، لیکن تعلیم کا مقصد کہہ چکا ہوں کہ صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے اور اس کو ہونا چاہیے کہ ہم سے پہلے سوچنے والے جو کچھ سوچ چکے ہیں، ان کی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہم میں پیدا ہو۔ اسی ضرورت کے لیے ہمارے قدیم نصاب میں ایسی کتابیں قصداً رکھی جاتی تھیں جن کی عبارت نسبتاً زیادہ سلیس وواضح نہ ہوتی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اس مشق کے بعد گزرے ہوئے مصنفوں کی کتاب خواہ کتنی ہی اُلجھی ہوئی کیوں نہ ہو، ان کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل کر کے ان کے افکار تک بآسانی رسائی حاصل ہو سکے۔

مگر خدا جانے اس زمانے میں درسی کتابوں کی اس خصوصیت کو زیادہ اہمیت کیوں نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج سے پہلے لوگوں نے جو کچھ سوچا ہے۔ اگر کسی سلیس شستہ عبارت والی کتاب سے ان تک رسائی حاصل ہو سکتی ہو، تو لوگ اس کو پڑھ لیتے ہیں، لیکن کسی مصنف کے بیان میں کچھ تھوڑی بہت الجھن اور ژولیدگی وتعقید ہوئی۔ اس زمانہ کا تعلیم یافتہ آدمی اس کے مطالعہ سے گھبراتا ہے۔ وہ علم میں بھی ادب کی چاشنی ڈھونڈنے کا عادی ہو گیا ہے، حالانکہ تعلیم کے دوسرے مقصد یعنی دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس میں اس طریقہ کار سے بڑی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ تاہم یہ تو کتابوں کا مسئلہ ہے اور اس زمانہ میں جب ہر سال چھ مہینے پر نصاب کی کتابیں بدل جاتی ہیں، تو بآسانی اس نقص کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

درجہ فضل کی خصوصیات

میں درجہ فضل کی ان خصوصیتوں پر بحث کر رہا تھا جنہیں ان غیر معمولی صلاحیتوں کے پیدا کرنے میں دخل تھا جو ہندوستان کے پچھلے زمانہ کے علماء میں پائی جاتی تھیں، حقیقی اسباب وموثرات تو اس کے نصابی علوم اور نصابی کتابوں کی یہی

خصوصیتیں تھیں، جن کا میں نے ذکر کیا لیکن اسی کے ساتھ بعض اور ضمنی باتیں بھی تھیں۔ اب کچھ تھوڑی بہت گفتگو ان پر بھی کرنا چاہتا ہوں۔

(3) چونکہ گزشتہ بالا دو خصوصیتوں کے حساب سے یہ تیسری بات ہے اس لیے نمبر میں بھی میں نے اس کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ شاید بیچ بیچ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرانے زمانہ میں اس مفہوم کو ادا کرتے ہوئے کہ میں نے فلاں شخص سے پڑھا، عموماً ایسے موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ "فلاں کتاب رانزد فلاں بحث کردم تحقیق کردم۔" میں نے شاید سلطان المشائخ کے متعلق یہ الفاظ کہیں "سیر الاولیاء" سے نقل کیے ہیں کہ انہوں نے شمس الملک صدر جہاں (عہد بلبن) سے "ادب عربی بحث کردو جہل مقالہ حریری یاد گرفت۔" (ص 101) اور آپ کو بکثرت اس زمانہ میں یہ محاورہ ملے گا، اس بحث کی نوعیت کیا ہوتی تھی۔ "سیر الاولیاء" میں مشہور استاذ جن کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے یعنی شمس الدین بن یحییٰؒ سے ایک موقعہ پر ان کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس میں اپنے پڑھنے کے طریقہ کو حضرت نے ظاہر فرماتے ہوئے ان علوم کا نام لے کر جو ان کے زمانہ میں مروج تھے، بیان کیا ہے:

"انچہ لوازم آں سبقہا بودے از شبہات و قیود متحضر کردیم۔" (ص 226)

"ان اسباق کے متعلق، جن شبہات اور قیود کو سامنے لانے کی ضرورت ہوتی تھی، ہم ان کو متحضر کرتے تھے۔"

فرماتے ہیں کہ ان ہی "شبہات و قیود" کو "تحقیق می کردیم" اگرچہ یہ چند الفاظ کا مختصر فقرہ ہے لیکن درس کا جو "طریقہ بحث" تھا اس کی گویا پوری تفصیل اس میں مندرج ہوگئی ہے۔

گونگا درس

جامعاتی طریقہ تعلیم جس کا نام میں نے "گونگا درس" رکھا ہے، اس نظام کے تحت تعلیم پانے والوں کو تو اب شاید سمجھایا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ "شبہات و قیود" کیا چیزیں ہیں اور ان کے استحضار کی کیا صورت ہوتی تھی، پھر ان کی تحقیق استاد سے کیسے کی جاتی تھی؟ لیکن ہمارے درس قدیم کی یہ ناگزیر صورت تھی، طالب العلم اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہوئے بغیر طالب العلم بن ہی نہیں سکتا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

پڑھی ہوئی کتابوں کا امتحان

اس زمانہ میں عام طور سے اگرچہ یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ "امتحان" کا طریقہ اس ملک میں بالکل جدید چیز ہے، ورنہ ہمارا تعلیمی نظام امتحان سے ناآشنا تھا۔ اس لحاظ سے کہ آج کل "امتحان" کا جو مطلب ہے اور جن خاص ضوابط و اصول کے تحت لیا جاتا ہے، کوئی شبہ نہیں، اس کا رواج اس ملک میں نہیں تھا۔ (9) لیکن پڑھانے کے بعد یہ جانچنے کے لیے کہ پڑھنے والوں کو کچھ آیا بھی یا نہیں، کیا ہماری پرانی تعلیم میں اس کا پتہ چلانے کا کوئی صحیح ذریعہ نہ تھا؟

بچوں کا مکتبی امتحان یا آموختہ

ابھی تو مکتب خانوں کے اس قدیم طریقہ کے دیکھنے والے دنیا میں موجود ہوں گے کہ چھوٹے بچوں کو مکتب خانوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا' روزانہ استاداُن سے پڑھی چیزوں کا آموختہ بالالتزام سنتا تھا اور جوں جوں بچے تعلیم میں آگے بڑھتے جاتے تھے، بجائے روزانہ کے ہفتہ میں دوبار اور آخر میں ہفتہ میں ایک دن صرف آموختہ پڑھنے اور سننے کے لیے مقرر تھا۔ عموماً یہ دن یوم تعطیل (جمعہ) سے پہلے کا ہوتا تھا۔ لوگوں نے غور نہیں کیا کہ آخر یہ کیا چیز تھی؟ اس میں شک نہیں کہ ایک طرف اس ''آموختہ'' کے اصول کا ایک فائدہ اگر یہ تھا کہ جو کچھ بچوں نے پڑھا ہے، وہ دن بہ دن پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اسی کے ساتھ استادوں کو اس کا بھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ کس بچہ نے کس حد تک اپنے اسباق اور بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھا ہے۔ خود ہی بتائیے کہ امتحان کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے۔ یہ آموختہ کے ذریعہ سے ''جانچ'' کا طریقہ تو اس وقت تک اختیار کیا جاتا تھا جب تک بچوں میں سمجھنے کی پوری قوت شگفتہ نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ تر کام ان کے حافظہ سے لیا جاتا تھا۔

قدیم طرزِ امتحان

لیکن مکتبی تعلیم سے آگے بڑھ کر جب اعلیٰ تعلیم (درجہ فضل) میں طلبہ قدم رکھتے تھے' اس وقت بجائے حافظہ کے مقصود اس چیز کا دیکھنا ہوتا تھا کہ طالب العلم میں خود سوچنے کی اور دوسرے مفکرین کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت کس حد تک بڑھ رہی ہے' ظاہر ہے کہ اس کے لیے ''آموختہ'' والا قاعدہ قطعاً غیر مفید تھا' یہی ضرورت تھی جس کے لیے ہمارے یہاں ایک دوسرا قاعدہ مقرر تھا' جس کا رواج افسوس ہے کہ نئے نظامِ تعلیم کے گونگے درس سے تقریباً اٹھ چکا ہے۔ امتحان کے نام سے طلبہ کے جانچنے کا جو طریقہ اب جاری کیا گیا ہے' مکتب خانے والے ''آموختہ'' سے زیادہ وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ امتحان کے مسرفانہ مصارف جن پر ہر سال ہزارہا ہزار روپے حکومت صرف کرتی ہے اور تعلیم پانے والوں کے لیے دماغی کوفت کے سوا ہر سال امتحان کا مسئلہ ایک مستقل مالی سوال بنا ہوا ہے' اور ملکوں کا تو میں نہیں کہتا۔

جدید طرزِ امتحان

لیکن ہندوستان جیسے غریب ملک میں یہ واقعہ ہے کہ امتحان کی اس فیس کے لیے طلبہ ہر سال باضابطہ دست سوال دراز کرنے پر عموماً مجبور ہوتے ہیں یا پھر باپ کو مقروض ہونا پڑتا ہے یا ماں بہن کے زیوروں کو گروی رکھ کر امتحان کی فیسیں یونیورسٹیوں میں جمع کی جاتی ہیں اور اس کے بعد بھی اس امتحان سے اگر کسی چیز کا کچھ اندازہ ہوتا ہے' تو صرف اس کا کہ جواب دینے والوں کے دماغ میں اپنی پڑھی چیزوں کا کتنا حصہ محفوظ ہے' دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ''آموختہ'' کتنا یاد ہے اس سے زیادہ امتحان کے اس طریقہ سے طلبہ کے متعلق نہ کچھ معلوم ہوتا ہے' نہ معلوم ہو سکتا ہے، دس سوالوں

میں سے پانچ سوالوں کے متعلق اگر (33 فیصدی) چیزیں بھی امتحان دینے والے کے دماغ میں کسی طرح محفوظ رہ گئی ہیں' پاس کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے' لیکن خود سوچنے یا دوسروں کی باتوں کے سمجھنے کی قابلیت میں اس نے کس حد تک ترقی کی ہے' عام طور پر امتحان کے اس مسرفانہ غریبوں کو تباہ کرنے والے طریقوں سے اس کا پتہ چلنا سخت دشوار ہے۔

امتحان کے سوالات وجوابات اوران کا حاصل

اوراسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اختیاری سوالات میں سے 33 فیصدی نمبروں سے پاس ہونے کے بھروسہ پر طلبہ کی اکثریت اپنے اسباق سے درس کے کمروں سے باہر کوئی تعلق اس وقت تک پیدا کرنا نہیں چاہتی' جب تک کہ امتحان کا موسم سر پر نہ آ جائے' استاد کے لیکچروں میں وہ ایک ایسا دماغ لے کر آتے ہیں جس میں ہونے والے سبق کے متعلق قطعاً کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی' جب تک استاد کچھ کہتا رہتا ہے' برے بھلے طریقہ سے اس کو یادداشت کی کاپیوں پر نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ سبق ختم ہوا اوران کا تعلق بھی اس سبق سے اس وقت تک کے لیے ختم ہو گیا' جب تک کہ امتحان کی مصیبت ان کو آ کر نہ جھنجھوڑے۔ تیاری امتحان کے نام سے ان کو جو فرصت دی جاتی ہے' فرصت کے ان ہی چند دنوں میں کسی نہ کسی طرح کچے پکے لقمہ کی طرح حافظہ میں اپنے متعلقہ مضامین کے متعلق معلومات بھرتے چلے جاتے ہیں اور ٹھیک اسی طریقے سے جیسے کسی کو قے ہوتی ہو' جوابی کاپیوں پر جلدی جلدی یہ نگلے ہوئے لقمے اگل دیئے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اگلنے کے اس عمل کے ساتھ پھر وہ ان مضامین سے اس طرح کورے اور خالی ہو جاتے ہیں' جس طرح پہلے تھے' دماغ میں اس کے بعد اگر کوئی چیز رہ جاتی ہے تو وہ صرف اس نتیجہ کا انتظار جس کی توقع اندھیرے میں چلائے ہوئے اس تیر کے بعد ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔

قدیم طرزِ امتحان کی نوعیت

آج ملک میں جس امتحان پر مجموعی حیثیت سے اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں روپے جو خرچ ہو رہے ہیں' لے دے کر اس کی کل حقیقت عام حالات میں صرف اسی قدر ہے۔ اب سنیئے تعلیم کے جس نظام کو آج بدنام کیا جا رہا ہے کہ امتحان کا کوئی طریقہ اس میں اختیار نہیں کیا جاتا تھا' اس میں کیا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دماغوں کو بوکھلا دینے والے لفظ امتحان کے نام سے تو کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں مروج تھی' اس قدر بوکھلا دینے والا لفظ کہ کمزور اعصاب والے کتنے بچے ایسے ہیں' جو ہر سال اسی لفظ کے دباؤ سے مضطرب ہو کر اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ مدقوقوں اور مسلولوں کے گروہ میں ایک بڑی تعداد ان بدقسمت طالب العلموں کی بھی ہوتی ہے جن کے لیے امتحان اور اس میں ناکامی کی دہشت بسا اوقات کسی عویص مرض کا مقدمہ بن جاتی ہے۔

مگر درس کے جس طریقہ کی تعبیر بحث وتحقیق کے لفظ سے کی جاتی تھی' آپ نے سمجھا اس کا کیا مطلب تھا' شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بجائے خود بیان کرنے کے ایک تاریخی واقعہ کو پیش کر دیتا ہوں' یہی واقعہ آپ کو بتائے گا کہ جس

عہد کے متعلق باور کروایا جارہا ہے کہ کچھ نہ ہوتا تھا' اس وقت کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ عہد شاہجہاں کے مشہور عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے درس کا واقعہ ہے۔ مولانا آزاد نے ''مآثر الکرام'' میں اسے نقل فرمایا ہے۔

قدیم درس وتدریس کا ایک دلچسپ واقعہ

قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بلگرام کے رہنے والے ایک سید میر اسماعیل مختلف حلقہائے درس سے استفادہ کرنے کے بعد آخر میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حلقہ میں پہنچے۔ ملا صاحب سے میر صاحب نے عرض کیا کہ مجھے کوئی وقت دیا جائے تاکہ جو کتابیں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں' پڑھ سکوں۔ ملا عبدالحکیم نے اپنے وقت نامہ کو دیکھ کر کہا کہ:

''از ہجوم طلبہ گنجائش وقت علیحدہ نیست مگر آں کہ ساعت سبق فلاں شخص اختیار افتد۔''

''طلبہ کے ہجوم کی وجہ سے علیحدہ وقت کی گنجائش نہیں ہے مگر اس وقت کہ فلاں شخص سبق پڑھتا ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ علیحدہ سبق پڑھانا تو تنگی وقت کی وجہ سے دشوار ہے۔ البتہ فلاں طالب العلم کی جماعت میں شریک ہو کر تم سن سکتے ہو۔ میر صاحب آ چکے تھے' اسی پر راضی ہو گئے' سننے کی بات اب یہیں سے شروع ہوتی ہے' اس زمانہ کے لیے تو شاید یہ کوئی نئی بات نہ ہو لیکن اس وقت یہ بات بڑی بات تھی کہ چند ہفتے گذر گئے اور میر اسماعیل نے کسی قسم کی پوچھ گچھ' اعتراض وسوال ملا صاحب سے اس عرصہ میں نہیں کیا۔ وہ عصر حاضر کا گونگا درس تو تھا نہیں کہ سالہا سال گذر جاتے ہیں اور شاگردوں کی زبان سے استاد کے کان میں کوئی لفظ نہیں پہنچتا۔ استاد ڈائس پر' تلامذہ کرسیوں پر کھڑے ہو کر استاد نے تقریر کی' بیٹھے بیٹھے چپ چاپ شاگردوں نے ان کی تقریر سن لی' کم از کم سننے والوں کی صورت بنائی' درس ختم ہو گیا' حاضری دے کر طلبہ درس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

شاگرد کے سوال نہ کرنے پر اعتراض

یہ تو اس وقت ہو رہا ہے' لیکن جس عہد کے متعلق کہا جارہا ہے کہ شاگردوں کی قابلیت کے جانچنے کا کوئی طریقہ اساتذہ کے پاس نہ تھا' یہ اسی زمانہ کی بات ہے کہ کسی قدیم نہیں' بلکہ ایک نووارد طالب علم کا یہ رویہ کہ اس نے کوئی بات نہیں پوچھی استاد کے لیے ناقابل برداشت بن گیا' حالانکہ احتمال تھا کہ ابھی نئے ہیں' آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے' ابھی پوچھنے میں ہوسکتا ہے کہ حجاب مانع ہو' لیکن ملا عبدالحکیم سے نہ رہا گیا۔ میر صاحب کو مخاطب کر کے دریافت کیا۔

''مدتہا گزشت گاہے حرفے از شما سر برنہ زد۔''

''زمانہ گزر گیا' کبھی کوئی حرف تم کو نہ کھٹکا۔''

اب میر صاحب کی یہ طالب العلمانہ ادا تھی' ملا صاحب نے مستقل وقت دینے سے انکار کرتے ہوئے یہ جو کہا تھا کہ ''فلاں کا سبق سن سکتے ہو۔'' اس ''سن سکنے'' کے لفظ کو انہوں نے گویا پکڑا تھا' جو ملا صاحب کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں

بولے کہ مجھے تو صرف سننے (سماعت) کی اجازت ہے اس لیے بولنا اپنے لیے مناسب نہ خیال کیا۔

بولتے درس کا ایک واقعہ

ملا صاحب کی تازہ توجہ کو دیکھ کر میر صاحب نے پھر عرض کیا کہ اگر فقیر کے لیے کوئی مستقل وقت دیا جاتا تو میری بڑی آرزو پوری ہوتی۔ بلگرام سے ایک شخص صرف علم کی خاطر سیالکوٹ آیا تھا۔ ملا صاحب کو ان کی غریب الوطنی اور طلب صادق کے جذبہ پر رحم آ گیا۔ اور بولے کہ

''دریں ایام بین العصر والمغرب فرصتے ست برائے سبق شما مقرر کردیم۔''

''ان دنوں عصر و مغرب کے درمیان تھوڑی سی فرصت رہتی ہے' وہ تمہارے سبق کے لیے ہم نے مقرر کیا۔''

اس زمانہ کے اساتذہ جو سنتے ہیں کہ ہفتہ میں دس گھنٹے اور پندرہ گھنٹے پڑھانا بھی اپنے لیے بار سمجھتے ہیں' کیا وہ سن رہے ہیں' وقت عصر اور مغرب کے درمیان دیا گیا۔ طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا یہ وقت اتفاق سے اس زمانہ میں خالی ہو گیا تھا۔ ورنہ عموماً اس میں بھی کچھ نہ کچھ مشغلہ پڑھنے پڑھانے کا جاری رہتا تھا۔ خیر یہی وقت سہی میر صاحب کے لیے مقرر ہو گیا۔ سبق شروع ہوا اور وہی ''بحث'' کے طریقہ سے شروع ہوا۔ مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ

''سید روز دیگر درس مستقل شروع کرد و بحث و گفتگو را بجائے رسانید کہ وقت نماز شام رسانید۔''

''دوسرے دن سید نے سبق شروع کر دیا اور بحث و گفتگو نے اتنا طول کھینچا کہ شام کی نماز کا وقت ہو گیا۔''

مطلب یہ ہے کہ سید صاحب سے اپنے کسی شبہ کا اظہار کیا۔ ملا صاحب نے جواب دیا' سید نے اس پر پھر کوئی سوال کیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا' نماز کے لیے درس ملتوی ہوا۔

''مولوی (عبدالحکیم) نماز ادا کردہ باز متوجہ درس شد۔''

''مولوی عبدالحکیم صاحب نماز پڑھ کر پھر سبق کی طرف متوجہ ہوئے۔''

بحث پھر چھڑی' اور جاری رہی تا آنکہ:

''تا نماز عشا گفتگو بحال بود۔''

''بحث نماز عشاء تک جاری رہی۔''

عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء کی نوبت آئی' ملا صاحب نے اپنے عزیز اور ہونہار شاگرد سے اب معذرت کی اور فرمایا کہ:

''فردا اول روز باید آمد درس ہائے دیگر را موقوف کردہ اول تحقیق ایں مبحث می پردازیم۔''

''کل سویرے آنا چاہیے' دوسرے اسباق بند کر کے پہلے اس مبحث کی تحقیق ہو گی۔''

یعنی کل پر بات رہی اور یہ میر صاحب کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ کل دوسروں کے اسباق کو ملتوی کر کے تمہاری اس بحث کو طے کروں گا۔ حسب وعدہ دوسرے دن پھر بحث کا بازار گرم ہوا:

''سید حاضر شد وطلباء دیگر نیز حاضر شدند واز چاشت تا استواء (دوپہر) بحث قائم بود۔''

''سید اور دوسرے طلبہ حاضر ہوئے' چاشت سے لے کر دوپہر تک بحث چلتی رہی۔''

مگر بات ختم نہ ہوئی' مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ:

''سہ روز متواتر بریں منوال گزشت وسلسلہ بحث انقطاع نہ پذیرفت۔'' (ص234)

''مسلسل تین دن اسی طرح گذر گئے اور بحث کا سلسلہ منقطع نہ ہوا۔''

تھک کر مُلّا صاحب نے سید سے کہا کہ آخر اس مسئلہ میں تمہاری بھی کوئی خاص رائے ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ سید صاحب ایک مضمون اٹھا کر لائے' جوان ہی کا لکھا ہوا تھا' لیکن انہوں نے اپنے نام کا اظہار نہیں کیا' استاد کے سامنے وہ تحریر پیش کی کہ اس میں تو اس مقام کی تحقیق یوں کی گئی ہے۔ ملا صاحب نے دیکھا اور پسند کیا' البتہ اتنا نقص بتایا کہ ''عبارت از اطناب (طوالت بیجا) خالی نیست۔'' (مآثر۔ص234) ظاہر ہے کہ بحث وتحقیق کا یہ ایک خصوصی واقعہ ہے۔ اسی لیے تاریخوں میں اس کا تذکرہ بھی کیا گیا۔ میری غرض اس کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ قدیم طریقہ تعلیم میں ''بحث وتحقیق'' سے جو چیز مراد تھی' اس کا ایک مثالی نمونہ لوگوں کے سامنے آجائے۔

امتحان کا قدیم طریقہ اور اس کا باہمی فرق

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس امتحان کی لوگوں کو تلاش ہے' اس زمانہ میں اس کا طریقہ یہی تھا۔ طلبہ کو کتابوں سے الگ کر کے امتحان گاہوں میں سادہ کاپی دے کر اس لیے بٹھایا تو نہیں جاتا تھا کہ خام ونیم پختہ غیر منہضم معلومات کا جو ذخیرہ کسی نہ کسی طرح دماغوں میں بھر لیا گیا ہے' اسی کو اگلوا لیا جائے۔

مطالعہ میں تحقیق

بلکہ طلبہ کا فرض تھا کہ سبق پڑھنے سے پہلے ہر سبق کے متعلق وہی طریقہ اختیار کریں' جس کی طرف حضرت شمس الدین یحییٰ بن یحییٰ کے بیان میں اشارہ کیا گیا ہے' یعنی:

''شبہات تحقیق می کردیم' وآنچہ لوازم ان سبق بود ے از شبہات وقیود متحضر می کردیم۔''

(ص226)

''شبہات کی ہم تحقیق کرتے تھے اور اس سبق سے متعلق جس قدر شبہات وقیود ہوتے سب متحضر کر لیتے تھے۔''

اسی کا نام ''مطالعہ'' تھا۔ مسئلہ کے بیان کرنے میں مصنف کتاب نے جو طریقہ بیان اختیار کیا ہے' اس کے ایک ایک لفظ پر

غور کرنا' اس پر جو اعتراضات ہو سکتے ہوں ان کو پیدا کرنا اسی کا نام ''شبہات'' تھا۔ بیان میں کس حد تک جامعیت اور مانعیت ہے' اس کو جانچنا' اس کے لیے جن قیود اور شرائط کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ان کو پرکھنا' کتاب کی عبارت کے سوا خود مسئلہ میں پیچیدگیاں ہوں' ان کو خود سلجھانا، جو نہ سلجھ سکتی ہوں تو ان کو استاد پر پیش کرنا۔ الغرض خود مسئلہ پر اور جس عبارت کے ذریعہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے' اس پر اپنی اپنی حد تک حاوی ہونے کی کوشش کرنا' اس کوشش میں جو نقص رہ جائے استاد سے روزانہ اس کے متعلق دریافت کرنا' یہ کام تھا' جو پرانے طریقہ درس کا ایک لازمی جز تھا۔

مطالعہ کا طریقہ

کتاب ''مطلع الانوار'' جو استاذ السلطان حضرت مولانا انوار اللہ خاں حیدر آبادیؒ کی ایک مختصر سی سوانح عمری ہے۔ اسی میں مولانا کے حقیقی بھانجے مفتی رکن الدین مرحوم نے یہ لکھتے ہوئے کہ ہنگام طالب العلمی میں مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے مطالعہ کا کیا طریقہ تھا۔ بجنسہ ان کے الفاظ میں یہ نقل کیا ہے:

> ''ہم کوشش کرتے تھے کہ مضمون کسی صورت میں حل ہو جائے۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت و ترجمہ کی جانب توجہ کی جاتی تھی۔ جو نئے الفاظ آتے تھے ان کو لغت کی مدد سے حل کیا جاتا۔ پھر مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر ایک دفعہ مضمون حل نہ ہوتا تو دوبارہ سہ بارہ سعی کی جاتی۔ اگر کوئی اتنا ہی مشکل مضمون ہوتا جو سعی پیہم کے باوجود سمجھ میں نہ آتا تو دل میں ایک خلش رہتی۔ جب استاذ (مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ) کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز شبہات کے جو مطالعہ میں حل نہ ہو سکے ہوں، اور کوئی بات دریافت مطلب نہ رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کئی صفحہ درس ہوتا تھا۔''
>
> (مطلع الانوار۔ ص10)

اسی کے بعد لکھا ہے کہ:

> ''استاذ کی قدر و منزلت معلوم ہوتی تھی کہ جو مضمون گھنٹوں میں حل نہ ہو سکتا تھا استاذ نے ذرا سی دیر میں حل کر دیا۔''

یہ بھی مولانا انوار اللہ خاں ہی کا بیان ہے اور اس سے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ درس کے اس طریقہ میں استاذ کا بھی امتحان ہوتا رہتا تھا۔ آخر میں مولانا کے الفاظ اس فقرہ پر ختم ہوئے ہیں کہ

> ''جب استاذ سے مطلب معلوم ہوتا تو فرطِ مسرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے بیش قیمت خزانہ مل گیا۔''(11)

اور یہ تھا وہ علمی ذوق جو طلبہ میں درس کا یہ عجیب و غریب ماحول قدرتاً پیدا کر دیتا تھا۔ اس طریقہ سے پڑھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ خاکسار مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے اس حلقہ میں بطور استفادہ کے جب کچھ دن کے لیے شریک ہوا جس میں مولانا مرحوم ''فتوحات مکیہ'' جیسی سخت و کرخت کتاب کے مشکلات کو باتوں باتوں میں وہ پانی بنا کر سمجھا دیتے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ و تغمد و بغفرنہ۔

طلبہ کے مطالعہ کی نگرانی

بہر حال طلبہ مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں اور اس کا پتہ ''طریقہ بحث'' سے چل جاتا تھا۔ یعنی سوال و جواب جو استادوں سے اور شاگردوں سے ہوتا تھا۔ اسی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون طالب العلم تیار ہو کر آتے ہیں اور کون بغیر کسی تیاری کے بیٹھ گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ میر اسماعیل نے جب کوئی بات نہیں پوچھی تو فوراً ملا صاحب نے ٹوکا اور کوئی خاص بات نہ تھی۔ طالب العلم اگر چند دن چپ رہا فوراً اساتذہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور مجبور کرتے کہ رد و قدح سوال و جواب میں وہ حصہ لے۔ اس کا ایک فائدہ وہی تھا کہ خود فکری کے ساتھ ساتھ دوسرے مصنفین و مفکرین کی باتوں کے سمجھنے کا سلیقہ دن بہ دن بہتر ہوتا جاتا تھا۔ اسی لیے طلبہ پر سخت تاکید کی جاتی تھی کہ مطالعہ کے وقت وہ کسی تشریحی نوٹ یا حواشی وغیرہ سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ کسی طالب العلم کے متعلق اگر اُستادوں کو محسوس ہو جاتا کہ یہ مطالعہ کے وقت حاشیہ وغیرہ دیکھنے کا عادی ہے۔ تو اس سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا۔ بقیۃ السلف حضرت قاری عبدالرحمٰنؒ پانی پتی جو مولانا حالی کے اُستاد تھے۔ ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اپنا قصہ خود یہ بیان فرماتے تھے۔

> ''بچپن کا زمانہ تھا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں والدین سے پڑھتے تھے۔ ایک دن مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا تھا۔ اس پر والد صاحب نے سبق نہیں پڑھایا۔ مجھے اتنا غم ہوا کہ رات کو کھانا نہیں کھایا۔'' (تذکرہ رحمانیہ، ص29)

بچوں کی اتنی نگرانی مطالعہ میں کی جاتی تھی اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بڑوں کے ساتھ اساتذہ کا کیا رنگ ہو سکتا ہے۔

درسی بحث و تحقیق کا نتیجہ

اور دوسرا اہم فائدہ ''بحث و تحقیق'' کے اس طریقۂ درس کا یہ تھا کہ اُستادوں کو اپنے شاگردوں کی قابلیت کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ سوالات میں گہرائی شکوک وشبہات میں قوت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی تھی، سمجھا جاتا تھا کہ اسی حد تک وہ علم میں ترقی کر رہا ہے۔ میرے نزدیک طلبہ کا اس ذریعہ سے امتحان بھی ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ ایسا امتحان تھا جس میں طلبہ کو علم کے امتحان گاہوں میں اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جس نظر سے چوروں اور ڈاکوؤں کو پولیس والے دیکھتے ہیں۔ اس امتحان کے لیے قطعاً کارڈ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ نہ اس میں سوالات کے فاش ہو جانے کا خطرہ ارباب جامعہ کو لگا رہتا تھا، نہ اس امتحان میں سالانہ لاکھوں روپیہ کے وہ مصارف عائد ہوتے تھے، گویا نتیجہ کا دن نتیجہ نہیں بلکہ طالب العلم اور اس کے ماں باپ بلکہ شاید سارے خاندان کے لیے وہ قیامت کا دن ہوتا ہے۔ نہ ہی طالب العلموں سے کتابیں چھینی جاتی تھیں، نہ ان کو اس پر مجبور کیا جاتا تھا کہ جیسے بندر جلدی جلدی دماغوں میں کسی طرح ٹھونس لیں اور امتحان گاہوں میں جا کر اُگل دیں اور اس کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہی ہے کہ اکثر نا قابل اور جاہل لڑکے جنہوں نے معلومات کے نگلنے کے اس خاص طریقے میں مہارت حاصل کی ہے، وہ تو کامیاب اور عموماً اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن اچھے اچھے ذہین

طباع سوچنے والے جو انتخابی کرتبوں اور اس کی خاص تدبیروں سے ناواقف ہیں، باوجود قابل ولائق ہونے کے بسا اوقات بُری طرح ناکامیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ بہتوں کی صحت دل ودماغ پر اپنی اس غیر متوقع ناکامی کا نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً جب ان کی آنکھوں کے سامنے:

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب وقندست
قوت دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

کا نظارہ پیش ہوتا ہے اور یہ ساری خرابی امتحان کے اس ''آموختائی'' طریقہ کا نتیجہ ہے، جو زیادہ سے زیادہ ان بچوں کی حد تک مفید ہوسکتا ہے۔ جن کا دماغ بجائے سوچنے اور سمجھنے کے صرف یاد کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ امتحان لیا جاتا ہے، قابلیت کا، ذہنی لچک اور فکری گہرائیوں کا اور پوچھا جاتا ہے کہ تم کو اپنی آموختہ اور سیکھی ہوئی باتوں سے کتنی باتیں یاد ہیں۔ بہر حال اب تو جو کچھ ہو، حکومت جب تک اپنے رویّہ کو نہ بدلے گی، مجبوراً ملک میں ''فضلیت'' اور بلندی کا معیار امتحان کا یہی آموختائی طریقہ رہے گا۔ اس کی وجہ سے خونِ جگر کو قوت بنانے پر اگر کوئی مجبور ہو اور ''پالان'' کے نیچے تازی گھوڑوں کو مجروح ہونا پڑے تو ہونے دیجیے۔

شیخ محدث دہلوی کا مطالعہ سے شغف

جس زمانہ کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُستاد کے سامنے ''بحث وتحقیق'' کی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لیے طلبہ کو مطالعہ میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی، کہ اپنی جماعت میں امتیاز کا سارا دار ومدار ہی اسی پر تھا۔ شیخ محدث اپنی طالب علمی کا حال درج کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ:

''دراثنائے مطالعہ کہ وقت از نیم شب درمی گزشت والدم قدس سرہ مرا فریاد میزدہ بابا چہ می کنی۔''

''مطالعہ میں جب آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تو میرے والد قدس سرہ پکارتے بابا کیا کر رہے ہو۔''

یعنی آپ کے والد کو رحم آجاتا اور کہتے کہ کب تک جاگو گے۔ شیخ فرماتے کہ والد کی آواز سُن کر فی الحال ''درازی کشیدم'' یعنی لیٹ جاتے لیکن کل کیا ہوگا اس کی فکر سونے کب دیتی تھی، فرماتے ہیں کہ:

''تادروغ نہ شود می گفتم خفتہ ام چہ می فرمایند۔''

''تاکہ جھوٹ نہ ہو، میں کہا کرتا تھا، سویا ہوا ہوں کیا فرماتے ہیں۔''

مگر پھر:

''باز برمی نشستم ومشغول می شدم''

''پھر اُٹھ بیٹھتا تھا اور مطالعہ میں مشغول ہو جاتا تھا۔''

شیخ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''چند بار دستار د موی سر آتش چراغ در گرفتہ باشد و مرا تا رسیدن حرارت آں بجھرہ دماغ خبر نہ۔''

''بارہا چراغ کو آگ مری دستار اور بال میں لگ گئی اور مجھے اس کی خبر نہ ہوئی۔''

بلاشبہ یہ انہماک شیخ کا غیر معمولی تھا، اگرچہ اس زمانہ میں یہ مثالیں چنداں غیر معمولی نہ تھیں۔

میر طفیل محمد کا مطالعہ

لیکن محنت کا یہ بار صرف امتحان ہی کے چند دنوں میں اکٹھا ہو کر نہیں پڑتا تھا بلکہ سال کی ساری راتوں پر یہ بار بنا ہوا رہتا تھا۔ کیونکہ امتحان کا یہ سلسلہ تو روزانہ جاری تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر اچانک امتحان کا بوجھ چند محدود دنوں میں جو پڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے صحت و تندرستی کو جو نقصان پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے یقیناً اس سے وہ محفوظ رہتے تھے۔ اب آپ ''بحث و تحقیق'' کے اس طریقہ کو چاہیں امتحان تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی قابلیتوں میں باہمی تفاوت کا اندازہ اسی سے ہوتا تھا۔ مولانا غلام علی آزاد نے اپنے اُستاد میر طفیل محمد کے تذکرہ میں لکھا ہے:

''در طلبہ علم بہ جودت طبع وقوت مطالعہ ومباحثہ اشتہار داشتند۔''

''طلبہ میں طبیعت کی تیزی، قوت مطالعہ اور مباحثہ سے شغف ہوتا تھا۔''

''مباحثہ'' سے وہی ''بحث و تحقیق'' کی طرف اشارہ ہے، جس میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے ''مطالعہ'' ایک ناگزیر ضرورت تھی۔

سلطان المشائخ کا لقب طالب العلمی میں

حضرت سلطان المشائخ کے تذکرہ میں عموماً یہ لکھا جاتا ہے کہ طالب العلمی کے زمانہ میں:

''بخطاب بحاث ومحفل شکن مخاطب گشت'' (تذکرۃ الاولیاء۔ص 101)

''بحاث اور محفل شکن کے خطاب سے مخاطب ہوا۔''

یعنی اُستادوں سے رد و قدح، سوال و جواب کرنے اور شبہات و خدشات پیش کرنے میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ اسی لیے آپ کا نام ہی طالب العلموں میں مولوی نظام الدین ''بحاث'' ہو گیا تھا۔ ''محفل شکن'' سے شاید مراد یہ ہے کہ درس کی محفل میں اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ فرما لیتے تھے۔ لکھا ہے کہ ان ہی وجوہ سے:

''میان حعلمان (طلبہ) تیز طبع و دانش مندان کامل مشہور گشت۔''

''طلبہ میں تیز طبع اور دانش مندوں میں کامل مشہور ہو گیا۔''

گویا اسی ''بحاثی اور محفل شکنی'' کے ان امتیازات نے آپ کو نہ صرف طلبا و رفقاء درس ہی میں بلکہ ''دانش مندان کامل''، یعنی اس زمانہ کے اساتذہ اور اہل علم میں مشہور کر دیا تھا کہ امتحان اور طلبہ کی اندرونی لیاقت و قابلیت کے جانچنے کا اس وقت یہی طریقہ تھا اور اب بھی اگر سوچا جائے تو اس سے بہتر طریقہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے امتحان کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اساتذہ کی جانچ

اور سچ پوچھیے تو اُستادوں کی قابلیت کے جانچنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ ہوسکتا ہے۔ طلبہ چپ چاپ رد و قدح کے بغیر سنتے رہیں اور اُستاد کے جو جی میں آئے ان کے سامنے تقریراً کچھ بول یا تحریراً کچھ لکھوا کر چلا جائے، یہ خود ہی سوچیے کہ اس سے کیا اندازہ ہوسکتا ہے کہ پڑھانے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ اس فن کے اندر جسے وہ پڑھا رہا ہے کتنی حذاقت استاذ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کے گونگے درس میں بسا اوقات اساتذہ کوشش و پیروی کر کے تعلیم گاہوں میں گھس جاتے ہیں۔ چونکہ عمر بھر ایسے شاگردوں سے معاملہ پڑتا ہے جن کا فرض صرف سننا ہے، اس لیے ان کی اصل حقیقت چھپی رہتی ہے۔ بخلاف اس زمانہ کے جس میں ''مطالعہ اور مباحثہ'' طالب علم کا ضروری جز تھا۔ خام اور کچے اُستادوں کا زیادہ دن تک تعلیمی عہدہ پر باقی رہنا مشکل ہوتا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد جتنے پانی میں وہ ہوتے اس کا لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا۔ مُلا عبدالقادر بداوُنی نے شیخ عزیز اللہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ طلبہ:

> ''بارہا امتحان پیش آمدہ اسولۂ لا مدنع لہامی آوردند شیخ مشارٌ الیہ در وقت افادہ معاحل ساختہ۔'' (بداوُنی۔ ص 324)
>
> ''شیخ کا امتحان لینے کے لیے ایسے سوالات کرتے جن کا (اپنے نزدیک سمجھتے کہ) جواب نہیں ہوسکتا لیکن شیخ موصوف درس کے وقت ہی ان سوالوں کو اسی وقت حل فرما دیتے۔''

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جس طریقۂ درس میں سوال و جواب کا حق طلبہ کو اتنی فیاضی سے دیا جا سکتا ہو کہ تین تین دن تک ایک ہی مسئلہ میں اُستاد و شاگرد اُلجھے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ملا عبدالحکیم اور میر اسمٰعیل کے قصہ میں آپ سن چکے۔ اگرچہ ایسا ہوتا تو بہت کم تھا، لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''مباحثہ'' کے اس طریقے کو ہمارے نظامِ تعلیم میں کتنی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانہ میں خام کاروں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ مجازی ڈگریوں یا اسناد کو لے کر تنخواہ کی لالچ میں تعلیم جیسے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ بالفرض تہور سے کام لے کر کوئی ہمت کر ہی لیتا تھا تو طلبہ اس کو زیادہ دن تک ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔

تعلیمی انحطاط اور اس کی بنیاد

خلاصہ یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کے امتحان کا بھی اور علمی جد و جہد کو تیز سے تیز تر کرنے کا بھی یہ واحد طریقہ تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلام کے مغربی ممالک (یعنی اُندلس، مراکش وغیرہ) میں تعلیمی انحطاط کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

فتجد طالب العلم منهم بعد ذهاب الكثير من اعمارهم فی ملازمة المجالس العلمية سكوتا لاينقطون، ولا يفاوضون وعناً تهم بالحفظ اكثر من الحاجة فلا يحصلون علىٰ طائل من ملكة التصرف فی العلم والتعليم.

(مقدمہ۔ص360)

''تم (اس ملک کے) طالب علم کو پاؤ گے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ مجلسوں (یعنی تعلیمی مجلسوں) میں صرف سکوت اور خاموشی کے ساتھ گذر گیا۔ اس طور پر کہ وہ ان مجلسوں میں کچھ نہیں بولتے۔ مفاوضہ یعنی سوال وجواب نہیں کرتے، ان کی توجہ زیادہ تر غیر ضروری طور پر یاد کرنے اور حفظ میں صرف ہوتی ہے۔ اس سے کوئی نفع ان کو حاصل نہیں ہوتا یعنی علم اور تعلیم میں خود سوچنے سمجھنے اور تصرف کی قابلیت اور ملکہ ان میں پیدا نہیں ہوتا۔''

اسی بنیاد پر اس نے اپنی رائے یہ قلم بند کی ہے کہ:

واليسر طرق هذه الملكة فتق اللسان بالمحاورة والمناظر فی المسائل العلمية يقرب شانها ويحصل مرامها. (ص360)

''اس ملکہ اور قابلیت کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ زبان سوال وجواب اور مناظرہ کے لیے علمی مسائل میں کھولی جائے اور یہی چیز اس ملکہ اور قابلیت سے آدمی کو قریب کرتی ہے اور جو مقصد ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔''

یہ وہی زمانہ ہے جب عام مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کی تعلیم میں ''مفاوضہ اور محاورہ'' یعنی وہی ''مباحثہ'' کا طریقہ درسوں میں جاری تھا۔

علمی ملکات میں مشرق کو مغرب پر تفوق

ابن خلدون کی شہادت ہے کہ مشرقی ممالک کے اہل علم کی اعلیٰ قابلیتوں اور علمی ملکات کو دیکھ کر:

فيظن كثير من رحالة اهل المغرب الى المشرق فی طلب العلم ان عقولهم على الجملة اكمل من عقول اهل المغرب وانهم اشد نباهة واعظم كيسالفطر الاولى وان نفوسهم الناطقة اكمل بفطرتها من نفوس اهل المغرب ويعتقدون التفاوت بيننا وبينهم فی حقيقة الانسانية. (ص361)

''طلب علم کے لیے جو لوگ مغرب سے مشرقی ممالک کی طرف جاتے ہیں ان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مشرق کے باشندوں کے عقول مغرب والوں کے عقلوں سے زیادہ کامل ہیں اور یہ ہے کہ وہ لوگ عظمت ودانش میں مغرب والوں سے زیادہ بہتر ہیں، سمجھتے ہیں کہ مشرق والوں کے

نفوس ناطقہ ہی مغرب والوں سے زیادہ کامل ہیں اوران دونوں میں نقص وکمال کا تفاوت اس پر مبنی ہے کہ دونوں کی حقیقت میں کمال ونقص کا اختلاف ہے۔''

جیسا کہ چاہیے تھا ابن خلدون نے اس خوش اعتقادی کی تو تغلیط کی ہے اور وجہ وہی بتائی ہے کہ مشرق والوں کی تعلیم کا طریقہ بہتر ہے (طلبہ وہاں گونگے بنا کرنہیں رکھے جاتے) اسی لیے علمی ملکہ ان میں زیادہ راسخ اور استعداد ان کی زیادہ بالغ ہو جاتی ہے اور مغرب والوں میں اس کی کمی ہے۔

عہد نبوی میں ذہن رسا کی قدر افزائی

واقعہ یہ ہے کہ تعلیم کا یہ نکتہ مسلمانوں کے سامنے شروع سے تھا۔'' طبقات ابن سعد'' میں ہے۔

عن عتبة من يقهان قال كنا عند لحسن حلو و عنده فتيان لايسالونه عن شئى فجعل بعضهم ينظر الى بعض فقال مالهم حيارى مالهم تفاقدوا. (ج7،ص123)

حضرت عمرؓ اور ابن عباس کے قرب کا تذکرہ کسی موقعہ پر کیا گیا تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ابن عباس کو دوسرے صحابہ کو دوسرے صحابہ کی نوجوان اولاد پر حضرت عمر پر ترجیح دیتے تھے اس کی ایک وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی تھی، جیسا کہ بخاری کے حاشیہ مصنف عبدالرزاق سے یہ اضافہ نقل کیا گیا ہے:

ان له لسانا مسئولا وقلبا عقولا. (ص747)

''(ابن عباسؓ میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے) کہ ان کے پاس ایک پوچھنے والی زبان اور سوچنے والا دل ہے۔''

تاریخ کے متعلق کہتے ہیں کہ واقعات کو دہراتی ہے۔ ابن عباسؓ اور حضرت عمرؓ کا یہ قصہ تو خیر مشہور ہے، بجنسہٖ اسی ہندوستان میں بھی قریب قریب اسی نوعیت کے ایک واقعہ کا تذکرہ تاریخوں میں کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کا ریحان شباب تھا، اگرچہ تحصیل علوم سے فارغ تو وہ سترہ سال کی عمر ہی میں ہو گئے تھے، لیکن اپنے والد کے تلمیذ رشید ملا کمال الدین سہالی سے استفادہ کا سلسلہ پھر بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ملا کمال بوڑھے تھے مولانا بحرالعلوم کی عمر ابھی بیس کے اندر ہی تھی، لیکن دونوں میں بحث ومباحثہ کا سلسلہ جب شروع ہوتا تو لکھا ہے کہ مولانا بحرالعلوم گفتگو میں ذرا تیز ہو جاتے۔ یہ بات مُلا کمال کے شاگردوں کو ناگوار ہوتی تھی۔ آخر ایک دن لوگوں نے کہا کہ:

''ایں طفل ایں قدر بحث وتکرار بخدمت نمائد وبے ادبانہ کلام می کند شما پاس داری ودل جوئی اوفرمائند وگاہے رنجہ خاطر نمی شوند وبملائمت با اوسخن می گوئند ایں معنی طبع تلامذہ ودیگر عزیزاں ودوستاں نیست بزرگاں راتادیب خورداں باتعلیم وتفہیم مناسب ست نہ کہ ایں ہارا ہم سر خود گردانند۔''

کہتے ہیں کہ شاگردوں سے مُلا کمال نے یہ شکایت سن کر پہلے تو کہا کہ بھائی وہ میرے استاد ملا نظام الدین کے صاحبزادے ہیں،

ان کے والد کے مجھ پر بڑے بڑے احسانات ہیں اور آخر میں جو اصل بات تھی، اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''دوم آں کہ ایں طفل دریں عمر آنچہ بہ محنت ومشقت خود حاصل کردہ است یقین می دانم کہ والدش رادریں سن حاصل نہ بود ہر چند درآخر وقت علامہ زمان بودہ است سوم آں کہ دریں عرصہ قلیل مطالعہ کتب قدماء ونظر برتصانیف متاخریں انچہ کہ ایں کس رامیسر گشت بعلماء درتمام حاصل نمی شود...''

پھر کچھ ملا نظام الدین کی توجہ ودعا کا حوالہ دینے کے بعد ملا کمال نے کہا کہ:

''دریں صورت بحسب ظاہر اگر چہ صغرسن دارد لاکن در مقام بحث وتکرار رتبہ علامہ صدر الدین شیرازی ومحقق جلال الدین دوانی دارد۔'' (اعضان اربعہ۔ص 122)

یقیناً اس رواج کا فقدان عصر حاضر کی جامعاتی تعلیم کا بڑا نقص ہے' اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی نقص کے احساس کا یہ نتیجہ ہے کہ کچھ دنوں سے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ٹیوٹوریل کلاسوں کو مروج کیا گیا ہے' لیکن اس میں جو طریقہ عمل اختیار کیا گیا ہے' میں نہیں سمجھتا کہ اس سے ''مباحثہ اور مطالعہ'' کے فوائد کی تلافی ہو سکتی ہے۔

حواشی

(1) اصل یہ ہے کہ جن لوگوں سے پیغمبر کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ جن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، پیغام کی زبان تو پیغمبر کی وہی ہوتی ہے لیکن وہ بھیجا بھی جاتا ہے ان ہی لوگوں کی طرف جن میں وہ پیدا ہوتا ہے یا جن سے اس کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضروری ہے۔ ایسا پیغمبر جو صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہو۔ اس کے ساتھ تو اتفاقاً یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے۔ ان ہی لوگوں کی زبان اس کے پیغام کی زبان ہوتی ہے لیکن جو ''الناس جمیعا'' اور ''کافة للناس'' کی طرف مبعوث ہو۔ دنیا کی ساری قومیں ساری امتیں اس کی مخاطب ہوں۔ ایسے پیغمبر کے لیے کیا کیا جاتا۔ کیا دنیا کی ساری قوموں کی ہر ہر زبان میں اس کو پیغام دیا جاتا۔ عملی دشواریوں کے ساتھ ساتھ لاکھ لاکھ زبانوں میں، اس پیغام کی تعبیر اس کی کیا حالت بنا دیتی، جب ایک ہی زبان والے پیغام کی تاویلوں اور تفسیروں میں لوگوں نے اتنے اختلافات پیدا کر دیئے۔ آسان صورت یہی تھی اور یہی کیا بھی گیا کہ جن لوگوں میں وہ پیدا ہوا تھا ان ہی کی زبان رکھی گئی۔ وہ کلیہ بھی باقی رہا کہ پیغمبر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا گیا — یعنی ''ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه.'' (ابراہیم) لیکن جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا، ان میں سے خود اس کی زبان سے واقفیت ہی تھی۔ ان کے سوا دنیا کی دوسری قوموں کے لیے ابتدائی خطاب ہی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ سب کے سب انسان ہیں۔ بیل اور گھوڑے نہیں ہیں اور الانسان کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز کو نہیں جانتا ہے اس کے جاننے کی، جس زبان سے ناواقف ہے اس

کے سیکھنے کی اس میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے، یہی صلاحیت پیغام کو عام بنانے کے لیے کافی ہے۔

(2) میں نے سکنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عصر حاضر کے محیر العقول درحقیقت محیر العقول ایجادات کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عموماً ان کے ایجاد کرنے والے زیادہ تر ایسے افراد ہیں جو جامعاتی تعلیم سے محروم تھے۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ مثلاً بیسویں صدی کے سب سے بڑے موجد ایڈیسن صاحب گراموفون وغیرہ کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ ان کی تعلیم اسکول کے ابتدائی درجوں سے زیادہ نہ تھی۔ حالانکہ اس صدی کی بیش تر ایجادات اسی شخص کی فکر ونظر کی مرہون منت ہیں اور ایک ایڈیسن کیا آپ کو موجدین کے گروہ میں زیادہ تر وہی لوگ نظر آئیں گے جنھوں نے نہ سائنس پڑھی نہ کیمیا سیکھا تھا۔ القصہ بطولہا۔

(3) قدرت نے اس کتاب کی عظمت حنفی مسلمانوں میں اتنی بڑھادی ہے کہ طاش کبریٰ زادہ نے لکھا ہے۔ ''ان هذا المختصر تبرک به العلماء حتی جربوا قراته اوقات الشدائد و ايام الطاعون'' (علماء اس کتاب سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ مصائب اور طاعون میں اس کو آزمایا گیا ہے) ''کشف الظنون'' وغیرہ میں اور چیزیں اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہیں۔ کم از کم اتنا تو ہمیں بھی ماننا چاہیے کہ مصنف کے تقویٰ اور تقدس کا اثر پڑھنے والوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

(4) عام طور پر کتابوں میں صاحب ہدایہ کا وطن مرغینان ہی بتایا جاتا ہے۔ جو مرانغہ کا ایک قصبہ ہے لیکن صاحب ''ہدایہ'' کے ہم وطن بادشاہ بابر نے ''تزک'' میں صاحب ہدایہ کے گاؤں کا نام ''رشدان'' بتایا ہے جو مرغینان کے تعلقہ میں تھا۔

(5) مصر سے زیلعی کی کتاب ''نصب الرایہ'' مجلسِ علمی ڈابھیل کے مصارف سے چھپ کر آئی ہے۔ اس کے شروع میں مولانا یوسف بنوری کا ایک مختصر سا پیش نامہ بھی ہے۔ مولانا نے حضرت علامہ کشمیریؒ کا قول براہ راست ان ہی سے سن کر نقل کیا ہے کہ ''فتح القدیر'' ابن ہمام کی جیسی کتاب لکھنے کے لیے اگر مجھ سے کہا جائے تو اس کام کو میں کرسکتا ہوں لیکن ''ہدایہ'' جیسی کتاب لکھنے کا مطالبہ کیا جائے تو ہرگز نہیں کے سوا اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ علامہ کشمیری کی جلالت شان سے جو واقف ہیں اور ان کے اس قول کے وزن کو محسوس کرسکتے ہیں۔ غالباً خاکسار سے بھی حضرت شاہ صاحب نے یہ فرمایا تھا۔

(6) آہ یہ مکتبی مولوی جس کی تنخواہ بمشکل دس پندرہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی، محلہ یا گاؤں کے رئیس اپنے بچوں کے لیے ان کو رکھتے تھے لیکن محلہ اور گاؤں کے بچے ان ہی مولوی صاحب سے مفت یا دو آنے چار دے کر اس سے زیادہ فارسی سیکھ لیتے تھے جتنی اسکول میں انگریزی بھی سکھائی نہیں جاتی اور فارسی تو ان ہی مکتب خانوں میں وہی دو دو آنے چار چار آنے دے کر اتنی پڑھ لی جاتی تھی کہ کالجوں میں بھی اتنی فارسی طلبہ کو نہیں آتی حالانکہ پڑھانے والے اساتذہ پانچ اور دس نہیں پانچ سو اور دس سو اسی فارسی کے پڑھانے کے لیے پاتے ہیں۔

(7) پچھلے زمانہ میں قاضی بیضاوی کی یہ کتاب ''تفسیر بیضاوی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ ورنہ عموماً کتابوں میں قاضی بیضاوی کے تصنیفات کی فہرست میں ہم اس کتاب کا نام ''مختصر الکشاف'' ہی پاتے ہیں۔ الاسنوی کی ''طبقات'' سے طاش کبریٰ زادہ نے ''تفسیر بیضاوی'' کا نام نقل کیا ہے۔ (مفتاح۔ ج1، ص436) لیکن صحیح یہ ہے کہ ''کشاف'' کے سوا بیضاوی نے رازی کی تفسیر سے بھی چیزیں چنی ہیں اسی لیے ان کی کتاب کو رازی وکشاف کا خلاصہ قرار دیا ہے۔ پچھلے زمانہ میں ''کشاف'' کو چھوڑ کر لوگوں نے بیضاوی ہی کو نصاب میں شریک کرلیا۔

(8) مولانا محمد معظم نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی، لیکن ''تذکرہ علماء ہند'' ہی میں ہے کہ

''از تصانیف او تفسیر قرآن بود کہ در استیلائے سکھاں سوختہ شد۔''

مولانا کی عمر کافی ہوئی تھی، طالب علمی کا زمانہ تو عالمگیری عہد میں گذرا، بہادر شاہ کے زمانہ میں بنہ کی قضا کا عہدہ بھی ان کو ملا تھا۔ اسی

زمانہ میں سکھوں نے سر اٹھایا۔ بنہ جو پنجاب کا کوئی قصبہ ہے۔ مسلمانوں کے گھروں کو جلایا گیا۔ اسی میں ان کی تفسیر بھی سوخت ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(9) مخدومی نواب ضیاء یار جنگ بہادر سے میں نے روایت سنی کہ سالار جنگ کے عہد میں جب دارالعلوم کا مدرسہ قائم ہوا اور بر طریقہ نو امتحان کی بنیاد اس میں قائم کی گئی تو پہلے امتحان میں سوالات کے مطبوعہ پرچوں کی تقسیم کرنے کے لیے امتحان گاہ میں خود سر سالار جنگ تشریف لائے۔ سونے کے طشت میں زرد اطلس کے خوان پوش کے نیچے سوالات کے پرچے تھے اور سالار جنگ اپنے ہاتھ سے طلبہ کو تقسیم کررہے تھے۔ چونکہ ایک نئی چیز تھی اس ذریعہ سے عوام کو مانوس بنانا مقصود تھا۔

(10) اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے' کچھ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں' خود اپنے استاد حضرت مولانا برکات احمد بہاری وطنا ٹونکی ترپلا کو مدتوں دیکھتا رہا اور میرے رفقاء درس جو ہندوستان کے طول وعرض میں موجود ہوں گے، وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ حضرت علاوہ مقررہ اوقات (یعنی آٹھ سے بارہ تک اور دو سے چار تک) عصر کے بعد بھی عموماً ایسی کتابیں مثلاً مثنوی مولانا روم، مکتوبات مجدد الف ثانی یا طب کی کسی کتاب کا درس یا کرتے تھے اور یہ تو اس زمانہ کی بات ہے' جب حضرت کی عمر زیادہ ہوگئی تھی' ورنہ اپنے ایام شباب میں سنا ہے کہ رات کے دس دس گیارہ گیارہ بجے تک سبق پڑھانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آج بھی حضرت مولانا حسین احمد مدنی کبھی کبھی رات کے گیارہ بارہ تک بخاری پڑھاتے ہیں۔

(11) ابن جوزی نے اپنی تاریخ ''المنتظم'' میں ایک حنفی عالم محمد بن احمد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تنگی معاش میں عموماً مبتلا رہتے تھے۔ اتفاقاً رات میں ایک مسئلہ حنفی فقہ کا ان کی سمجھ میں آیا تو اچھل کر رقص کرنے لگے اور کہے جاتے تھے کہ کہاں ہیں دنیا کے بادشاہ اور شہزادے' بیوی نے پوچھا کہ قصہ کیا ہے' تب بولے کہ ایک بڑا گہرا مسئلہ سمجھ میں آیا۔ بے چاری ہنسنے لگی۔ (ج 8، ص 15)

قدیم علماء تاریخ کی روشنی میں

''مطالعہ'' اور ''مباحثہ'' کے سوا تیسری خصوصیت ہمارے قدیم درس کی وہ چیز تھی جس کی تعبیر پچھلے زمانہ میں ''اعادہ'' کے لفظ سے کرتے تھے' اِدھر کچھ دنوں سے اب اس کا نام ''تکرار'' ہوگیا ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے اپنے تعلیمی مشاغل کا ذکر فرماتے ہوئے جو یہ لکھا ہے:

''احاطہ اوقات' وشمول ساعات بہ مطالعہ وتذ کار و بحث وتکرار ہر چہ از کتب خواندہ باشد۔''

(اخبار۔ص313)

اس میں ''بحث وتکرار'' سے ان کا اشارہ درس کی اسی خصوصیت کی طرف ہے مولانا شبلی نعمانی اپنی ''کتاب الغزالی'' میں درس قدیم کے اس طریقہ عمل کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس زمانہ میں نامور علماء کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکے تھے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا۔ یہ منصب جن کو حاصل ہوتا تھا اس کو معید کہتے تھے۔'' (الغزالی۔ص12)

مدرسہ مستنصریہ بغداد

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفر نامہ میں بغداد کے ایک مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد

المدرسة المستنصريه و نسبتها الى اميرالمومنين المستنصر بالله الى جعفر بن اميرالمومنين الظاهر بن اميرالمومنين الناصر وبها المذاهب الاربعة لكل مذهب ايوان فى المسجد و موضع التدريس و جلوس الدرس فى قبة خشب على كرسى عليه البسط و يقعدالدرس عليه بالسكينة والو قارلا بساثياب السواد معما.

''مدرسہ مستنصریہ کی نسبت امیرالمومنین المستنصر باللہ ابوجعفر بن امیرالمومنین الظاہرین

امیر المومنین کی طرف ہے' اس مدرسہ میں چاروں فقہی مکاتب کی تعلیم ہوتی تھی' ہر مذہب کے درس کے لیے ایک خاص ایوان مسجد میں ہے۔ جو درس کی جگہ مدرس کی جگہ ہے' جو لکڑی کے ایک قبہ میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہیں' جس پر فرش بچھا رہتا ہے' اسی پر سکون و وقار سے بیٹھتا ہے' سیاہ کپڑے اور عمامہ باندھ کر مدرس جلوس فرما ہوتا ہے۔''

دور اور تکرار کا دستور

اعادہ اور تکرار کے اس دستور کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

وعلى يمينه ويساره معيدان يعيد ان كل ما يملى عليه.

''اور اس کے دائیں اور بائیں جانب دو معید بیٹھتے ہیں جو ان لکچروں کو دہراتے ہیں جسے استاد شاگردوں کو دیتا ہے۔'' (رحلہ ابن بطوطہ۔ ج 1، ص 167)

تکرار اور میر شریف جرجانی

میر سید شریف جرجانی کے متعلق اسی اعادہ و تکرار کے سلسلہ میں ایک قصہ مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اعادہ اسباق کی کیا صورت تھی۔ کہتے ہیں کہ میر صاحب پڑھنے کے لیے قطبی کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ پیر فرتوت ہو چکے تھے۔ علامہ نے بڑھاپے کا عذر کیا اور اپنے ایک شاگرد مبارک شاہ کے پاس مصر بھیج دیا۔

انه كان له عبد رباه من صغره علمة حتى كان مدرسا وفا ضلافى كل العلوم و كان يداعى بمبارك شاه المنطقى. (مفتاح۔ ج 1، ص 242)

''یہ مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے' بچپن سے انہوں نے مبارک شاہ کو پالا پوسا اور پڑھایا، تا ایں کہ مبارک شاہ مدرس ہو گئے اور ہر علم میں فاضل' عام طور سے ان کو لوگ مبارک شاہ منطقی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔''

ایک طالب علم کے علمی تکرار سے استاد پر وجد

لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ مبارک شاہ نے میر صاحب کو اپنے حلقہ درس میں صرف بیٹھنے اور سننے کی اجازت دی۔ پوچھنے اور قراۃ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن مبارک شاہ رات کو یہ دیکھنے کے لیے کہ طلباء کیا کر رہے ہیں، چپ چاپ نکلے، میر صاحب کہہ رہے تھے، کتاب کے مصنف نے تو اس مسئلہ کی یہ تقریر کی اور استاد نے اسی کو یوں بیان کیا اور میں اس مسئلہ کی تقریر یوں کرتا ہوں۔ مبارک شاہ ٹھہر گئے اور کان لگا کر غور سے سننے لگے۔ میر صاحب کی تقریر کا

انداز اتنا دلچسپ تھا کہ لکھا ہے۔

لحقه البهجة والسرور بحيث رقص فی القناء المدرسة.

''ایسی مسرت اور خوشی ان کو ہوئی کہ مدرسہ کے صحن میں ناچنے لگے۔''

(مفتاح۔ ج1، ص247)

طالب العلمی کے زمانہ میں درس وتدریس کا مشغلہ

ہمارے نظامِ تعلیم کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو بہ ظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر سوچا جائے تو کتنے دوررس منافع کی وہ حامل تھی۔ مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور دستوروں کے ایک دستور اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ عموماً بڑی جماعت کے طلبہ یعنی اوپر کی کتابیں پڑھنے والے فارغ ہونے سے پہلے طالب العلمی ہی کے دنوں میں اس کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے رہیں، خصوصاً جو لوگ آگے چل کر مدرسی اور پڑھنے پڑھانے میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے رہتے۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی طالب العلمی

حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے:

وكلما فرغت من تحصيل كتاب شرعت فی تدريسه.

(نفع المفتی والسائل۔ ص25)

''جس کتاب کے پڑھنے سے میں فارغ ہوتا، اسی کو پڑھانا بھی شروع کردیتا۔''

'کلما' کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی صورت ایک دو کتابوں کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، بلکہ ہر کتاب کے ساتھ آپ کا یہی دستور تھا جس کا پہلا فائدہ تو یہی تھا جیسا کہ مولانا ہی فرماتے ہیں

فحصل لی الاستعداد التام فی جميع العلوم بعون الله الحی القيوم.

''تمام علوم میں میری لیاقت پختہ ہوتی چلی گئی، اللہ حی وقیوم کی اعانت سے۔''

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ علم کو جو یوں مسلسل تازہ بتازہ تو بنو حالت میں رکھنے کی کوشش کرے گا، اس کی قابلیت جتنی بھی بڑھتی چلی جائے کم ہے، خصوصاً تجربہ کی بات ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں آدمی پڑھنے کے وقت اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا جتنی ذمہ داری پڑھانے کے وقت خود بخود اس پر عائد ہوجاتی ہے۔

مولانا موصوف کی استعداد

خود سمجھ لینا اور سمجھ کر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس طریقہ

کار کا یہ نتیجہ تھا کہ:

لم يبق تعسر في اى كتاب كان من اى فن كان حتى انى درست مالم اقره حضرة الاستاذ كشرح الاشارات للطوسى والافق المبين و قانون الطب ورسائل العروض.

''مجھے کسی کتاب کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی' خواہ کونسی بھی کتاب ہو اور کسی فن کی ہو' حتیٰ کہ اس مشق کی بنیاد پر ایسی کتابوں کو میں نے پڑھا دیا جنہیں استاد کے سامنے میں نے نہیں پڑھا تھا' مثلاً طوسی کی شرح اشارات اور افق المبین طب میں قانون شیخ' عروض کا رسالہ۔''

مولانا مرحوم نے بے پڑھے جن کتابوں کے پڑھانے کا ذکر کیا ہے' جو ان کتابوں کی خصوصیتوں سے ناواقف ہیں' وہ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ''الافق المبین'' میر باقر کے ادبی اور ذہنی زور کا شہ کار ہے' پڑھانے والے کو آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے پڑتے ہیں' یا طوسی کی ''شرح اشارات'' توازن دماغی کا جتنا اچھا نمونہ ہے، ابن سینا اور امام رازی کی بحثوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چکانے میں یہ شخص جتنا کامیاب ہوا ہے' اسی لیے اس کتاب کے پڑھانے میں پڑھانے والوں کو بھی ضرورت پڑتی ہے کہ اپنے احساسات کو جادہ اعتدال سے ہٹنے نہ دیں' ورنہ بات ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے' اسی طرح قانون گو طب کی کتاب ہے۔ نسبتاً اسے زیادہ مشکل نہ ہونا چاہیے' لیکن قلم تو ابن سینا کا ہے' جن حقائق ونکات کی طرف مختصر لفظوں میں اشارہ کرتا ہے' ان کا انہی الفاظ سے اخذ کرنا طلبہ کو سمجھانا' یہ ساری باتیں آسان نہیں ہیں' لیکن یہ اس زمانہ کے طرزِ تعلیم کا ثمرہ تھا کہ معلومات کی گرداوری کے لحاظ سے خواہ آپ اس طریقہ پر جس قدر چاہے اعتراض کیجیے' لیکن جس قوت کے ذریعہ سے معلومات فراہم کیے جاتے ہیں' اس قوت کی پرورش و پرداخت نشوونما کے لیے درس وتدریس کا یہ طریقہ جتنا مفید تھا۔ مشکل ہی سے یہ فوائد کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

زمانہ طالب العلمی میں درس وتدریس

غور تو کیجیے مطالعہ' مباحثہ' اعادہ اور فراغت سے پہلے مدارسہ یعنی پڑھنے کے ساتھ ہی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھاتے چلے جانے' ان تمام ذرائع سے دماغوں کو جب مانجھا جائے' ان میں جلا پیدا کی جائے تو ایسے دماغوں کی صلاحیتوں میں جتنا بھی اضافہ ہو' غور وفکر کا مادہ جتنا بھی بڑھتا چلا جائے' احساسات میں نزاکت' شعور کی بیداری میں جتنا بھی اضافہ ہوتا چلا جائے وہ غیر متوقع نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ جن لوگوں کا آئندہ بھی ارادہ ہوتا کہ ہم زندگی تعلیم و تدریس میں بسر کریں گے۔ وہ اس چوتھی بات کی خاص طور پر کوشش کرتے تھے۔ چند ٹکوں کے لیے ٹیوشن کے نام سے دربدر اس زمانہ میں سائکلوں پر عصری جامعات کے طلبا جو مارے مارے پھرتے ہیں ان کے سامنے یہ دلی جذبہ نہ تھا بلکہ نچلی جماعت کے طلبہ کی خوشامد کر کے کچھ اپنی طرف سے پڑھنے والوں کی امداد کر کے پڑھانے کے اس مغتنم موقعہ کو پیدا کرنا

چاہتے تھے۔ چونکہ خود شوق سے پڑھاتے تھے، اس لیے ان کا حال ٹیوشن والے پیشہ ور طلبہ کا نہ تھا کہ صرف تنخواہ واجب کرنے کے لیے وقت پر حاضری دے دی، کچھ اِدھر اُدھر سے بچوں کو الٹ پلٹ کر بتا دیا' وقت گذر گیا' سائیکل لی اور اس دروازہ سے اٹھ کر دوسری ڈیوڑھی پر پہنچے۔ علم کی خاطر نہ سہی پیسوں ہی کی خاطر، رضانہ سہی جبراً ہی سہی مگر یہ واقعہ ہے کہ جن طلبہ کو ان غیر ذمہ دارانہ ٹیوشنوں کا موقعہ طالب العلمی کی زندگی میں مل جاتا ہے۔ بایں ہمہ لاپروائی ان کی قابلیت اور علمی مشق ان طلبہ سے عموماً بہتر ہوتی ہے' جو اس قسم کی ٹیوشن پر مجبور نہیں ہوتے ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس زمانہ میں اوپر کی جماعت والے طلبہ خود اپنے شوق سے نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے اس طرزِ عمل سے ان کی لیاقتوں میں کتنا اضافہ ہوتا۔

پڑھانے کا ذوق طالب العلمی میں

طالب العلمی ہی کے زمانہ سے درس دینے کا ذوق بعضوں پر تو اتنا غالب ہوتا تھا کہ بعض اوقات اسی کتاب کو جسے وہ ابھی پڑھ ہی رہے ہیں' لیکن اس کی جو جلد یا جو حصہ ختم ہو چکا ہے' دوسرے طلبہ کو وہی پڑھی ہوئی جلد یا پڑھا ہوا حصہ پڑھانا بھی شروع کر دیتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد نے اپنے استاد میر طفیل محمد کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

''اکثر اں بود کہ ہر کتابے کہ خود می خواندند بہ تلامذہ خود درس می گفتند۔''

(مآثر الکرام۔ص150)

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کتاب کو ابھی ایک شخص پڑھ ہی رہا ہے' اسی کو اس نے پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ جو تعلیم اس استعداد کو طلبہ میں پیدا کرتی تھی' آج اسی کو موردِ صد طعن اور محلِ ہزار شناعت ٹھہرایا جا رہا ہے' مولانا آزاد نے اسی واقعہ کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

''قوتِ طبعِ اقدس از یں جا فہم تواں کرد۔''

بلاشبہ یہ معمولی استعداد کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ نچلی جماعت ہی کے طلبہ سہی' لیکن اس زمانہ کا جیسا کہ دستور تھا، مطالعہ اور مباحثہ کے بغیر تو کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ یقیناً خود پڑھنے والے طلبہ سے جو لوگ پڑھا کرتے تھے' وہ ان سے رد و قدح میں کمی کیا کرتے ہوں گے، لیکن ان کو راضی رکھتے ہوئے پڑھاتے چلا جانا کوئی آسان بات نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبدالحئی مرحوم نے تو اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس طریقہ سے جس زمانہ میں طلبہ کو میں پڑھایا کرتا تھا:

رضیت بدرسی طلبتہ العلوم۔ (نفع المفتی۔ص25)

''اپنے درس سے میں طلبہ کو خوش رکھتا تھا۔''

مولانا عبدالحئی مرحوم کے مشہور شاگرد رشید مولانا محمد حسین الہ آبادی جن کا ذکر ابتداء کتاب میں بھی کہیں آچکا ہے، ان کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ مولانا عبدالحئی صاحب نے تمام اسباق آپ کے سپرد کر دیئے تھے سوا آخری کتابوں کے باقی سب آپ (یعنی شاگرد) پڑھاتے تھے۔ (ص11)

تلامذہ سے پڑھانے کا کام اور اس کا فائدہ

اس عجیب وغریب دستور سے طلبہ کی استعداد کے بڑھانے اور چمکانے میں جو مدد ملتی تھی' وہ تو خیر بجائے خود تھی' اگر غور کیا جائے تو اس ذریعہ سے تعلیمی مصارف کا بار کتنا ہلکا ہوتا تھا۔ خواہ اس بار کو حکومت اٹھاتی ہو' یا عام پبلک' میرا مطلب یہ ہے کہ کسی شہر اور قصبہ میں دس بیس مدرسین مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع ہوجاتے تھے اور درس دینا شروع کردیتے تھے۔ ان مدرسین کی امداد مختلف صورتوں سے کرتے تھے لیکن بسا اوقات ان تعلیمی شہروں اور قصبوں میں طلبہ کی تعداد حد سے زیادہ متجاوز ہوجاتی تھی۔ بسا اوقات رام پور، لکھنؤ، دلی، مراد آباد وغیرہ میں ہزار ہزار دو دو ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کے لیے گنتی کے یہ دس بیس مدرسین کافی ہوسکتے تھے؟ اسی پر غور نہیں کیا گیا۔ واقعہ وہی تھا کہ علاوہ ان مدرسین کے کاروبار کا ایک بڑا حصہ ان طلبہ پر تقسیم ہوجاتا تھا جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے' گویا ہر فن اور ہر علم کے سلسلہ میں ایک یا دو استادوں کی حیثیت تو صدر کی ہوتی تھی' حکومت یا پبلک کی جانب سے ان کی معاشی سہولتیں خواہ بہ شکل تنخواہ ووظائف یا بہ شکل جاگیر بہم پہنچادی جاتی تھیں (2) لیکن ہر مضمون کے صدر کے ساتھ بیسیوں مددگار یا اسسٹنٹ مدرسین ان ہی طلبہ کے گروہ سے مفت پڑھانے والے پیدا ہوجاتے تھے۔

ہمارے زمانہ میں تعلیم کا جو نظم اسکولوں اور کالجوں کی شکل میں قائم کیا گیا ہے جن میں اوپر سے نیچے تک ہر جماعت کے پڑھانے والے تنخواہ دار مدرسین ہیں' عموماً بیس بیس پچیس پچیس روپیہ سے کم جن کی تنخواہیں نہیں ہوتیں۔ اگر اس کو پیش نظر رکھ کر اس بچت کا حساب لگایا جائے' جو مذکورہ بالا طریقہ کار اور سسٹم سے قدرتاً پیدا ہوتی تھی' تو یہ مبالغہ نہیں ہے کہ اس بچت کا تخمینہ لاکھوں لاکھ تک پہنچ سکتا ہے۔

پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ہی پڑھاتے چلے جانے سے جو تعلیمی منافع پڑھانے والے طلبہ کو پہنچتے تھے، مزید برآں ایک بڑا عظیم معاشی فائدہ اس دستور کا یہ بھی تھا۔

ہندوستان میں مدارس کی کثرت

پرانی تاریخوں میں ہندوستان کے متعلق مشرقی اور مغربی مولفین کی جو اس قسم کی رپورٹیں پائی جاتی ہیں مثلاً ''صبح الاعشیٰ'' میں قلقشندی نے دلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

فيها الف مدرسة واحدة للشافعية وباقيها للحنفية. (مصر۔ ج5، ص69)

''ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدرسے تھے۔ جن میں شافعیوں کا ایک اور باقی سب حنفیوں کے تھے۔''

یا اورنگ زیب کے زمانہ کے مشہور مغربی سیاح ہملٹن کا بیان ہے کہ:

''شہر ٹھٹھ میں مختلف علم وفن کے چار سو مدرسے تھے۔'' (ہندوستان عالمگیر کے عہد میں۔ نواب مرزا یار جنگ)

میں نہیں سمجھتا کہ لوگ ان عبارتوں کو پڑھ کر اپنے ذہن میں کیا نقشہ قائم کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ غلط بیانی اور شاید دوسروں کو دھوکہ دینا ہوگا اگر ''مدارس'' کے لفظ کو پاکر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اسلامی عہد میں بھی ان مدارس کی نوعیت وہی تھی جو آج عصری جامعات وکلیات، مدارس اور اسکولوں کی ہے جن کے لیے الگ الگ چھوٹی بڑی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، میل دو دو میل کے رقبے گھیرے جاتے ہیں اور ان میں درسگاہوں اور قیامگاہوں، بازی گاہوں وغیرہ کے نام سے ہال (قاعات) کمرے، حجرات اور میدان کورٹس وغیرہ لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کے مصارف سے تیار کیے جاتے ہیں۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہر چھوٹی بڑی کتابوں کے پڑھانے کے لیے باضابطہ سرکاری تنخواہ پانے والے مدرسین نوکر ہیں اور تدریس ہی نہیں، امتحان، امتحان کے سوالات، امتحانات کی نگرانی، جوابی بیاضوں کی جانچ، سوالی پرچوں کے تبصرے، تصحیح، الغرض جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے، روپیہ کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ حکومت بھی تعلیم کی مد پر کروڑوں روپے صرف کرتی ہے، لیکن اس کے بعد بھی جب تک بیس پچیس روپے ماہوار خرچ کرنے کی صلاحیت کسی میں نہ ہو، عام حالات میں وہ عصری تعلیم سے نفع نہیں اٹھا سکتا ہے۔

تعلیم پر عہد تغلق میں اخراجات

جیسا کہ میں نے عرض کیا لفظ ''مدرسہ'' کا ناجائز نفع ہوگا اگر ان پچھلے دنوں میں بھی تعلیم کا یہی نقشہ بنا کر پیش کیا جائے۔ علم ودین کی خدمت پر حکومتیں اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں بھی اپنے خزانوں سے بیش قرار رقم صرف کرتی تھیں، فیروز تغلق کے عہد میں لکھا ہے کہ:

و كانت الوظائف فى عهده للعلماء والشمائخ ثلثه ملاطعن و ستمائة الف تنكه.

(نزہۃ الخواطر۔ ص 111)

''فیروز کے زمانہ میں علماء ومشائخ کی تنخواہوں اور وظائف پر تین ملین اور چھ لاکھ یعنی چھتیس لاکھ تنکے خرچ ہوتے تھے۔''

فیروز تغلق کا زمانہ اور (چھتیس لاکھ تنکہ) روپے کی گرانی اور چیزوں کی ارزانی کے اس زمانہ میں خیال تو کیجیے کہ موجودہ زمانہ کے حساب سے یہ رقم کتنی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم وفن کی قدردانیاں جو مغلوں کے زمانہ میں بہت نمایاں معلوم ہوتی ہیں، یہ کچھ مغلوں ہی کے عہد کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ابتداء سے اسلامی سلاطین کو علم ومعرفت کے ساتھ یہی شغف رہا ہے اور آخر وقت تک یہ ذوق ان کا باقی رہا۔

حکومت آصفیہ کی علم نوازی

حکومت آصفیہ کا وہ زمانہ جب اورنگ آصفی پر نواب ناصر الدولہ بہادر مرحوم ومغفور جلوہ فرما تھے، چندو لعل جیسے وزراء کی وزارت تھی۔ ہر طرف ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی خزانہ خالی تھا، لیکن اسی زمانہ کے مؤرخ صاحب ''گلزار

آصفیہ'' راوی ہیں:

''در بلدہ حیدرآباد از قدردانی حضور پرُنور (نواب ناصرالدولہ مرحوم) قریب یکصد علماء و فضلاء وارباب علوم عقلی ونقلی بدر ماہائے بیش قرار بقدر تقدیر ملازم ہستند۔''

(گلزار آصفیہ۔ص 425)

''شہر حیدرآباد میں حضور پرُنور نواب صاحب کی قدردانی کا نتیجہ ہے کہ تقریباً ایک سو علماء و فضلاء اور ارباب علوم عقلی ونقلی بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم ہیں۔''

اول وآخر کی یہ دو مثالیں میں نے صرف اس لیے پیش کردیں تاکہ معلوم ہو کہ علم کی سرپرستی شاہان اسلام کا ہندوستان میں ایک قدیم وطیرہ تھا۔ تفصیل اگر دیکھنا منظور ہو تو ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوالحسنات ندوی بہاری کی کتاب ''ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں'' نامی میں دیکھ سکتے ہیں، جس میں انہوں نے دارالخلافہ دہلی کے سوا ہر ہر صوبہ کے مدارس اور تعلیم گاہوں کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ اضافہ کی اس میں بہت کچھ گنجائش ہے۔ ڈھونڈھنے سے تو یہاں تک سراغ ملتا ہے کہ ہندوستان میں ایسے مدرسے بھی قائم کیے گئے تھے جن میں طلبہ کے قیام وطعام کا بھی نظم تھا، باضابطہ سرکاری امتحانات بھی ہوتے تھے اور ان ہی مدارس کے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں بھی دی جاتی تھیں۔

بیجاپور میں تعلیم کا نظم اور طلبہ پر خرچ

بیجاپور کی مشہور تاریخ ''بستان السلاطین'' میں محمد عادل شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

''درآثار شریف دو مدرس تعیین نمودہ کہ درس حدیث وفقہ وعلم ایمان بریاد آرند۔''

''آثار شریف میں دو مدرس مقرر کیے کہ وہ حدیث وفقہ اور ایمان کا درس دیا کریں۔''

اسی کے بعد اس مدرسہ کے ''طعام خانہ'' کا ذکر صاحب کتاب ابراہیم زبیری نے جو کیا ہے اس کے سننے کے بعد تو شاید اس زمانہ کے فردوسی اقامت خانوں کے وارڈنس کے منہ میں بھی پانی بھر آئے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاگرداں را از سفرہ آثار آش و نان بوقت صبح بریانی ومزعفر و بوقت شام نان گندم و کھچڑی۔''

''شاگردوں کو آثار کے دسترخوان سے صبح کے وقت آش ونان اور بریانی ومزعفر اور شام کے وقت گیہوں کی چپاتی اور کھچڑی۔''

کبھی کبھی نہیں روزانہ دن کے کھانے میں طلبہ کو بریانی ومزعفر کی پلیٹیں بغیر کسی معاوضہ کے آج بھی دنیا کے کسی بورڈنگ ہاؤس میں میسر آتی ہیں، اور کھانے پینے ہی کی حد تک نہیں۔ مزید یہ تھا۔

''وفی اسم یک ہون دبدوں ایں (ماسوا اس کے) کتابہائے فارسی وعربی مددی نمائند۔''

فی طالب العلم ایک ہون (3) (سکہ) اور اس کے ماسوا عربی فارسی کی کتابوں سے مدد ہوتی تھی۔''

کھانے اور کتابوں کے سوا ایک ہون (جو تقریباً ساڑھے چار روپیہ انگریزی کے مساوی تھا) بھی غالباً کپڑوں جوتوں و دیگر ضروریات کے لیے طلبہ کو ملتا تھا اور یہ تو صرف ایک آثار شریف کے مدرسہ کا ذکر تھا۔ غالباً کوئی عمارت تھی، جس میں تبرکات رکھے جاتے ہوں گے اسی عمارت میں یہ مدرسہ تھا۔

مدارس میں کھانے کا انتظام

زبیری نے لکھا ہے کہ جامع مسجد میں بھی چند مکاتب قائم تھے ان کے الفاظ یہ ہیں:

"در مسجد جامع دو ملا مکتب دار اطفال، و دو مکتب تحصیل علوم عربی و یک مکتب علم فارسی مقرر داشتہ۔"

ان سب مدارس و مکاتب میں بھی ان کا بیان ہے کہ طلبہ کو بریانی و مزعفر کھچڑی و نان گندم اور ہون ملا کرتے تھے اور غالباً ہندوستان میں بیجاپور ہی کے مدارس ایسے تھے جن کے متعلق الزبیری نے لکھا ہے کہ:

"امتحان بتاریخ سلخ ذیحج می شد۔"

"ختم ذی الحجہ پر امتحان ہوتا تھا۔"

یعنی ہجری سال کے اختتام پر سالانہ امتحان بھی طلبہ کا ہوتا تھا' دوسری جگہ تصریح بھی کی ہے۔

"ہر سال امتحان می شد۔"

"ہر سال امتحان ہوا کرتا تھا۔"

امتحان کے تذکرہ میں اس کی تفصیل نہیں بتائی ہے کہ تحریری ہوتا تھا یا تقریری لیکن یہ لکھتے ہیں کہ

"واز انعام ہون سرفرازی فرمودند۔"

"اور ہون نامی سکہ سے لڑکے بطور انعام سرفراز کیے جاتے تھے۔"

غالباً پاس کرنے والے طلبہ کو انعام دیا جاتا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ:

"وکسے کہ دراں (طلبہ) ہوشیار از علم می شد بعہدہ عمدہ و بہتر نوکر و ملازم می داشتند۔"

(بستان السلاطین۔ص 351)

"ان طلبہ میں سے جو علم و فن میں کامل ہوتا تھا' بہتر عہدہ سے نوازا جاتا تھا۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الزبیری صاحب "بستان السلاطین" کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو تعلیم کے عصری نظام کی گونہ جھلک اس میں ضرور محسوس ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جزئیات سے کلیات کے پیدا کرنے کا جو تحقیقاتی قاعدہ ہے چاہنے والا چاہے' تو اس کو بنیاد بنا کر ایک بڑی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں لاجنگ بورڈنگ' امتحان کا باضابطہ نظم حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا اور موجودہ زمانہ کے تعلیمی اداروں کو حکومتوں نے آج "نوکر سازی" یا "کلرک بافی" کی جو مشین بنا رکھا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ (4)

حکومت کی طرف سے تعلیم اور طعام وقیام کا نظم

لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ آثار شریف کے مدرسہ میں کل دو مدرس تھے۔ اسی طرح جامع مسجد کے مدرسوں میں بھی ایک دو استادوں سے زیادہ ایسے آدمی نظر نہیں آتے ہیں جو حکومت سے تنخواہ پاتے ہوں، نیز طعام وقیام کا نظام ان مدرسوں میں بھی حکومت کی جانب سے تھا۔ پڑھنے والوں پر فیس کا وہ بار نہیں ڈالا جاتا تھا، جس کے بوجھ سے آج ہندوستان کی کمر ٹوٹی چلی جارہی ہے، تعلیمی حلقوں میں چیخ پکار برپا ہے امتحان اگر لیا بھی جاتا تھا، تو اس کی فیس نہیں لی جاتی تھی، بلکہ اگر الزبیری کے بیان میں اپنی طرف سے یہ الفاظ بڑھائے جائیں کہ کامیاب ہونے والوں کو انعام ملتا تھا تو جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ صرف یہ ہے:

''از انعام ہون سرفرازمی فرمودند۔''

''ہون نامی سکہ کے ذریعہ انعام سے سرفراز کرتے تھے۔''

جو ایک عام بیان ہے' کامیاب اور ناکام پر امتحان دینے والے کی طرف اس انعام کو منسوب کیا گیا ہے' خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے مدارس بھی ہندوستان میں ضرور تھے' لیکن ان ہی چند سرکاری مدرسوں پر تعلیم کا دارومدار تھا' یہ قطعاً غلط ہے۔

مدرسہ کی عمارتوں کا حال

اور میرا ذاتی خیال تو ہے کہ ہندوستان میں بعض بادشاہوں یا امیروں کی طرف مدرسہ کی تعمیر کا انتساب جو تاریخوں میں کیا جاتا ہے عموماً ان مدارس کی زیادہ تر غرض تعمیری ذوق کی تسکین تھی۔ جہاں اس ذوق کے تقاضے کو لوگ محل سراؤں، کوشکوں، قلعوں وغیرہ کی تعمیر سے مطمئن کرتے تھے، وہیں کسی مقام کی دلکشی چاہتی تھی کہ یہاں عمارت ہو، عمارت بنادی جاتی تھی، بن جانے کے بعد اگر تعلیم وتدریس کے لیے کسی کو اس میں بٹھا دیا گیا، تو وہی عمارت ''مدرسہ'' کے نام سے مشہور ہوجاتی تھی۔ مثلاً دلی میں ہم دیکھتے ہیں سیری کے بنداب پر یا حوض (تالاب) علائی پر جو مدارس تھے، ان کے متعلق میرا بھی گمان ہے، کسی ندی کو روک کر بند بنانے کا عام رواج ہندوستان میں تھا۔ سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر چھلک رہا ہے، عہد عثمانی کے عثمان ساگر اور حمایت ساگر اور نظام ساگر کا جن لوگوں نے معائنہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بند (کٹہ) پر بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ کوئی عمارت ہوتی۔ دل کی اسی خواہش کی تکمیل کی جاتی تھی، جو اس تکمیل کی قدرت رکھتے تھے، ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جن مدرسوں میں ایک دو مدرس سے زیادہ کسی زمانہ میں نہ ہوں۔ کیا موجودہ زمانہ کے لحاظ سے مدرسہ کہلانے کے مستحق ہوسکتے ہیں اور دلی کے ان مدرسوں کا یہی حال تھا۔

عظیم الشان مدرسہ

''ہندوستان کے اسلامی مدارس'' کے مصنف جو اس میں شک نہیں ہے، اس موضوع کے محقق ہیں وہ اسلامی عہد

کے ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ عظیم الشان اور وسیع سلسلہ عمارت درسگاہ کے لیے کبھی کسی دور میں نہیں بنا۔'' (کتاب مذکور۔ص 61)

ذرا عظیم الشان وسیع کبھی اور کسی کے الفاظ کو پیش نظر رکھیے اور سنیے، جس مدرسہ سے زیادہ عظیم الشان وسیع کبھی کسی زمانہ میں اس ملک میں مدرسہ نہیں بنا، اس کا طول و عرض کتنا تھا، یہ الفاظ انہوں نے بیدر کی اسلامی حکومت کے مشہور وزیر خواجہ عمادالدین محمود گیلانی المعروف بہ ''محمود گاواں'' کے متعلق لکھے ہیں، گو اس مدرسہ کی عمارت کا ایک حصہ منہدم ہو چکا ہے، خصوصاً ایک بڑا مینار اس کا گر چکا ہے، لیکن باوجود اس کے دوسرا مینار اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، اور مدرسہ کی عام حالت بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ ہوگئی ہے۔ خاکسار جب اس مشہور مدرسہ میں تماشائی کی حیثیت سے داخل ہوا، تو دیر تک متحیر تھا کہ کیا یہی ہندوستان کا سب سے بڑا وسیع مدرسہ تھا۔ خیال گذرا، اور شاید اپنے ساتھیوں سے بولا بھی کہ غالباً مدرسہ کا صرف دروازہ اور دروازہ کی عمارت رہ گئی ہے، لیکن غالباً جو اصل مدرسہ تھا، وہ ویران ہو کر شہر کے دوسرے مکانوں میں شریک ہوگیا۔

لیکن بعد کو تاریخوں میں جب پڑھا کہ شرقاً غرباً پچھتر اور شمالاً جنوباً پچپن گز میں اصل عمارت ہی تیار ہوئی تھی، تب مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا اور یہی توجیہ سمجھ میں آئی کہ اصل مقصود تو خواجہ جہان کا ایرانی طرز کے ان دو میناروں کا بنانا تھا، جو اس میں شک نہیں اپنے حسن و خوبی بلندی و رنگ (5) ہر اعتبار سے ہندوستان کے میناروں میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ میلوں دور سے بیدر کی طرف آنے والوں کی جب ان میناروں پر نظر پڑتی ہوگی، اس کوہستانی صحرا میں اچانک اس کے سامنے آ جانا یقیناً عجب کیف و سرور کو پیدا کرتا ہوگا اور اسی زمانہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں تعلیمی اغراض سے زیادہ وہی ذوق تعمیر کی تسکین بخشی متصور تھی۔ ورنہ انصاف کی بات یہی ہے کہ اس زمانہ کے بڑے سے بڑے مدرسہ کی عمارت طول و عرض میں شاید عہد حاضر کے معمولی اسکولوں کی عمارتوں کے بھی برابر نہ تھی۔ اگر ان بیچاروں کی غرض بھی مدرسہ کی تعمیر سے کسی تعلیم گاہ کی تعمیر مقصود ہوتی تو ان کے پاس کیا زمین کی کمی تھی یا سامان تعمیر کی قلت تھی مگر سچ وہی ہے کہ علم کو جس زمانہ میں سنگ و خشت کی چار دیواریوں میں مقید کر دیا گیا ہے، پرائمری اور الف باء کی تعلیم بھی اس وقت تک ناقابل تصور ہے جب تک کہ ایک مستقل عمارت کے ذریعہ اس کی تعلیم گاہ کو ظاہر نہ کیا جائے۔ اس زمانہ کو ان گزرے دنوں پر قیاس ہی کرنا غلط ہے، جب علم آزاد تھا۔ اس انمیل بے جوڑ ضرورت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں نہ ڈالی گئی تھیں۔

مدرسہ گیلانی بہار

خود مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں ''مدرسہ'' کا لفظ جس معنی میں استعمال کیا ہے وہ اس معنی سے بالکل جدا ہے جس کی طرف ہمارا عادی ذہن مدرسہ کے لفظ کے سننے کے ساتھ ہی منتقل ہو جاتا ہے جس کی ایک اچھی مثال ان کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صوبہ بہار کے مدارس کے عنوان کے نیچے منجملہ دیگر مقامات کے ایک تعلیم گاہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''گیلانی مولوی احسن صاحب منطقی کا مولد و مسکن۔''(کتاب ''اسلامی درسگاہیں'')

یہ گیلانی وہی گیلانی ہے، جس کی طرف خاکسار اپنے نام کی اضافت کرتا ہے۔ فقیر کا مولد ومنشاء بہار کا یہی گاؤں ہے، جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ سو سے زیادہ ہوگی۔ ممتاز آبادی واسطی زیدی سادات کی ہے جو چند صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہیں۔ مولانا محمد احسن گیلانیؒ خاکسار کے جدامجد ہیں۔ چونکہ یہ میرے گھر کی بات ہے اس لیے ''صاحب البیت ادری بمافیہ'' کے روسے میں بتاسکتا ہوں کہ اس کی اصل حقیقت کیا تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً تیس چالیس سال تک درس وتدریس کا بازار گرم رکھا۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد وکابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لیے اس گاؤں میں آئی۔

مدرسہ گیلانی کے فارغین

ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ (6) پنجابی وطناً، گیلانی نزیلاً تو پڑھنے کے لیے آئے اور اسی گاؤں میں متوطن ہوکر اپنے وعظ وتلقین، ارشاد وہدایت، درس وتدریس، افتاء وتصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا۔ وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک وہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین (7) مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبدالغفور رمضان پوری، مولانا حکیم عبدالسلام (8) بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی (9) ٹونکی، مولانا اسماعیل رمضان پوری وغیرہم بیسیوں مشاہیر گیلانی کی اس درسگاہ سے اٹھے۔

مدرسہ گیلانی کا کل اثاثہ

لیکن تعلیم وتدریس کا یہ سارا کاروبار جہاں انجام دیا گیا، وہ صرف برگد کا ایک طویل وعریض درخت تھا جس کی ایک طرف متوسط درجہ کی ایک مسجد اور ایک طرف مولانا مرحوم کا ایک خام چھوٹا سا چند حجروں کا مکان تھا۔ اسی مکان کے سامنے کویلو کا ایک چھپر اینٹ کے دو پایوں پر پڑا ہوا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے چند تخت وہ بھی کھلے ہوئے بغیر کسی فرش وفروش کے پڑے رہتے تھے۔ مولانا درخت کی چھاؤں میں طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ برسات یا سردی کے موسم میں یہ مدرسہ کویلو کے اسی سائبان میں منتقل ہوجاتا تھا، جس کا کل فرنیچر لے دے کر دو چوکیاں تھیں۔ طلبہ کچھ تو اسی خام مکان کے حجروں میں رہتے یا مسجد میں اور زیادہ تر گاؤں کے ارباب ثروت کے مکانوں میں ان کو جگہ بھی مل جاتی تھی اور کھانے کا نظم بھی ہوجاتا تھا۔ بس اس مدرسہ کی کل کائنات برگد کی چھاؤں اور مولانا کا وہی خام مکان تھا۔ اسی کو مدرسہ خیال کیجیے، یا مولانا کا مطب اس کو قرار دیجیے، یا دیوان خانہ یا طلبہ کا اقامت خانہ کیونکہ وہی سب (10) کچھ تھا۔

مدرسہ گیلانی کے فیوض وبرکات

سنگ وحشت سے آپ نے دیکھا اس لفظ ''مدرسہ'' کو کوئی تعلق ہے؟ لیکن اس سے ہٹ کر اگر دیکھیے تو کوئی شبہ

نہیں کہ اس زمانہ میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، برگد ہی کی چھاؤں میں ان سب کی گنجائش تھی۔ اسی کے نیچے شمس بازغہ، شرح چغمنی حتیٰ کہ الافق المبین، شفاء، اشارات کے اسباق بھی ہوتے تھے اور ہدایہ، بیضاوی، تلویح، مسلم کے لیے بھی گاؤں کی اتنی زمین کافی تھی اور برگد کے اسی درخت کے سایہ میں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مرچا کے اسلامی اسٹیٹ صغریٰ وقف (11) اسٹیٹ اس کے مدرسہ عزیزیہ اور شکرانواں کے اس قیمتی کتب خانہ کو بھی دیکھ سکتا ہے جس کی بعض نادر کتابوں کی نظیر شاید اس وقت بھی سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ خدا بخش خاں کی مشہور عالم مشرقی لائبریری کی ترتیب میں بھی دیکھنے والوں کو اس دماغ کی رہنمائی محسوس ہوسکتی ہے جو بڑ کے اسی درخت کے نیچے سنوارا گیا تھا۔ فٹ نوٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو ان نتائج کا کیا انکار کیا جاسکتا ہے جو یقیناً اسی تعلیم گاہ کے نتائج تھے جس کے لیے نہ کبھی اینٹ پر اینٹ رکھی گئی اور نہ اس کی بلڈنگ کے لیے بھیک کا ہاتھ پبلک کے سامنے دراز کیا گیا۔

مولانا برکات احمد ٹونکی کی درسگاہ

مولوی ابوالحسنات مرحوم نے گیلانی کی جس درسگاہ کا تذکرہ کیا ہے اس میں تو براہ راست تعلیم پانے کا موقع مجھے نہ مل سکا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی حاضری سے پہلے سات آٹھ سال تک خود اس فقیر کو جس مدرسہ میں پڑھنے کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے، علم حدیث کے سوا شد بد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا سید برکات احمد ٹونکی نزیلاً وبہاری وطناً کی تعلیم گاہ سے ہے، جس سے صرف ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں پنجاب، یوپی، بہار، بنگال، دکن وغیرہ ہی کے طلبہ کی ایک معقول تعداد فارغ ہوکر ملک کے مختلف گوشوں میں علم ودین کی خدمت میں مصروف نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں بیرون ہند مثلاً افغانستان، بخارا، تاشقند، خوقند، سمرقند، ہرات، ترمذ کے طلباء بھی تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے اور فاتحہ فراغ پڑھ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوتے، کم وبیش چالیس سال تک تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ جاری رہا، مگر مکانی حیثیت سے اس تعلیم گاہ کی نوعیت کیا تھی؟

مولانا موصوف کے حالات

مولانا برکات احمد مرحوم کا شمار یوں تو ٹونک کے امراء میں تھا، والی ملک کے طبیب خاص تھے، معقول تنخواہ کے علاوہ گاؤں بھی جاگیر میں تھا، فیس اور دوا کی بھی آمدنیاں تھیں۔ بڑے صاحب ثروت باپ حکیم دائم علی خاں کے صاحبزادے تھے، اس لیے ان کا ذاتی مکان، مکان کیا ایک محلہ تھا جس میں ان کے کنبے کے لوگ بھرے ہوئے تھے لیکن بایں ہمہ اللہ کا یہ بندہ علم کے اس دریا کو جس جگہ بیٹھ کر ہند وبیرون ہند میں جاری کیے ہوئے تھا، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ وہ صرف خام دیواروں اور کویلو کے چھپر کا ایک سہ درہ دالان تھا جس کا طول شاید بارہ ہاتھ اور عرض غالباً پانچ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا۔ جاجم کا ایک فرش بچھا رہتا' چھوٹے چھوٹے پائے کی ایک میز استاذ مرحوم کے سامنے رہتی، جس پر طالب علم کتاب رکھ کر ان کے سامنے پڑھتے اور طلبہ کے لیے بھی معمولی لکڑی کی دستی تپائیاں تھیں جن پر وہ اپنی کتابیں رکھ کر سبق سنا

کرتے تھے۔ یہ حیثیت تھی اس دار العلوم کی اور اس کے فرنیچر وساز وسامان کی جہاں سے پڑھ پڑھ کر ایک طرف لوگ ہندوستان کے شہروں میں پھیل رہے تھے اور دوسری طرف بخارا، کابل، سمرقند اپنے اپنے اوطان کی طرف جا رہے تھے۔

مولانا ٹونکی کی درسگاہ کا علمی معیار

مٹی کے اسی دالان میں بخاری، ترمذی، ہدایہ، تاریخ کے اسباق بھی ہوتے تھے اور حمد اللہ قاضی مبارک، شمس بازغہ، صدرا جیسی معقولات کی عام درسی کتابوں کے سوا شرح تجرید قوشجی مع حواشی دوانی وصدر معاصر شفاء واشارات، الافق المبین جیسی کتابیں جنہیں وہاں کی اصطلاح میں قدماء کی کتابیں کہتے تھے ان کا درس بھی اس خصوصیت کے ساتھ جاری تھا کہ اب دنیا کے طول وعرض میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا اور کہیں پڑھ نہیں سکتے تھے، بلکہ بسا اوقات اسی دالان میں نفیسی وشرح اسباب قانون شیخ طب کی کتابوں کا درس دن کو ہوتا تھا اور رات کو حضرت استاذ اسی میں بیٹھ کر طبی طلبہ کو مطب کے نسخے بھی لکھواتے تھے، کبھی کبھی اس میں تصوف کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں اور جب درس کا کام ختم ہو جاتا تھا، تو چند طلبہ کی خواب گاہ کا بھی کام اسی دالان سے لیا جاتا تھا۔ یہ کانوں کی سنی ہوئی نہیں، برسوں آنکھوں کی دیکھی ہوئی بات ہے۔

میں شاید دور نکل گیا، یہ کہنا چاہتا تھا کہ ''مدرسہ'' کا لفظ جب ہماری کتابوں میں بولا جاتا ہے تو خواہ مخواہ اس کے متعلق یہی فرض کر لینا کہ وہ کوئی عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی مانند اینٹوں اور پتھروں کا مجموعہ ہوگا، خود بھی دھوکا کھانا ہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینا ہے۔ اب وہ غلط تعلیمی نظریہ تھا یا صحیح، لیکن تعلیم وتعلم کے لیے بجائے قید وبند کے حتی الوسع ہمارے بزرگوں کے سامنے تعلیم جیسی اہم ضرورت کے لیے اطلاق اور عمومیت ہی کے اصول کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ صاحب ''ہدایہ'' نے مسئلہ ربوا پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جن چیزوں میں منافع کے وجوہ اور پہلو زیادہ ہوں گے، یہ اسلام کا اصول ہے کہ:

> **السبیل فی مثلها الاطلاق بابلغ ابو جوه لشدة الاحتیاج الیه دون التضنیق فیه.**
>
> ''ایسی چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو اطلاق اور عمومیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ آدمی ان کا شدت سے محتاج ہے نہ کہ ان میں تنگی پیدا کی جائے۔''

جدید تعلیم اور اخراجات کی کثرت

یہ اپنا اپنا مذاق ہے کہ ضرورت بھی کسی چیز کی شدت سے محسوس کی جائے اور کرائی جائے لیکن باوجود اس کے کوئی اس میں ''تضیق'' اور تنگی کے اصول کو پسند کرتا ہے اور کوئی اطلاق کو۔ جب تک ڈائریکٹر کا محکمہ قائم نہ ہولے، جب تک اس محکمہ کے مصارف کے لیے سالانہ لاکھوں روپے کی منظوری نہ صادر ہولے، جب تک عمارت نہ تیار ہولے، جب تک اتنی رقم کا نہ بندوبست ہولے کہ باضابطہ معقول تنخواہوں کے مدرسین کے تقرر کا امکان پیدا

ہو جائے، جب تک پڑھنے والے بچوں کے باپ کی اتنی آمدنی نہ ہو لے جس سے ہر سال بدل جانے والی نصابی کتابوں، قیمتی کاپیوں، کھیل کود کے قیمتی آلات (بیٹ، ریکٹ، فٹ بال) قیمتی یونیفارم، نیز ماہوار قیام وطعام کے مصارف اور اسکول وکالج کے مطالبات وغیرہ وغیرہ کی تکمیل کے لیے کافی نہ ہو، اس وقت تک ''تعلیم'' کا لفظ کوئی زبان پر نہیں لا سکتا۔

قدیم مدارس پر اخراجات

اشاعت تعلیم کے حامیوں کا ایک اصول یہ ہے اور اسی کے مقابلہ میں تعلیم ہی کا ایک دستور وہ بھی تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی کسی گھنے درخت کی چھاؤں اور مٹی کی کچی دیواروں کا احاطہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ مدرسے بھی بنتے تھے تو جہاں ہم محمود گاواں کے رنگین میناروں والے اور بالائے بند سیری اور حوض علائی کی شاہانہ عمارتوں کو دیکھتے ہیں، اسی کے ساتھ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ:

''ملا علاء الدین لاری بہ آگرہ آمدہ بدرش مشغول شدند مدرسہ از خس ساختند۔''

(بداؤنی، ج2، ص212)

''ملا علاء الدین لاری آگرہ آ کر درس تدریس میں مشغول ہو گئے اور چھپر کا مدرسہ بنایا۔''

یہ ملا علاء الدین لاری وہی ہیں جن کا شرح عقائد نسفی پر مشہور حاشیہ ہے۔ آگرہ میں ان کا مدرسہ ''مدرسہ خس'' کے نام سے مشہور تھا، لیکن خس سے کیا وہ خس مراد ہے جس سے ''خس خانہ وبرفاب'' والی لذت گرمیوں میں حاصل کی جاتی ہے، اور غالبؔ جس کے بغیر روزہ رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ خس کو آج جس معنی میں ہم استعمال کر رہے ہیں، یہ ہندوستان کی ایک جدید اصطلاح ہے، جس کی ابتداء اکبری (12) عہد سے ہوئی، ورنہ خس کے وہی عام مشہور معنی گھاس پھوس کے ہیں۔ ''فروغ شعلہ خس یک نفس ہے'' کے مصرعہ میں غالبؔ ہی نے جس معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ ''مدرسہ خس'' یعنی گھاس پھوس کا مدرسہ آگرہ میں مولانا نے بنایا تھا، الغرض وہی اصول کہ جس چیز کی ضرورت جتنی زیادہ ہوگی، اسی حد تک اس کو قیود وشرائط کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیے۔ (13) اصل کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے غیر ضروری لوازم کی پابندیوں کو مسلمانوں نے اپنے لیے کبھی ضروری قرار نہیں دیا۔ ایک ایک شہر میں ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو سات سات سو مدرسوں کی گنجائش کیا ان پابندیوں سے نکلے بغیر پیدا ہو سکتی ہے؟

جدید تعلیم اور ساہوکارہ کارخانہ

آج جب تعلیم وتعلم کی دنیا کو بھی ساہکارہ کا بازار بنا دیا گیا ہے، نئی نئی شکلوں کے قلم بیچنے والوں، بھانت بھانت، طرح طرح کی دواتوں کے بنانے والوں، کتابوں کے فروخت کرنے والوں، الغرض انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو مختلف بھیسوں میں علم کے طالبوں اور علم کے خادموں کو نشانہ بنا کر ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ حکومت کی پشت پناہی میں لوٹ مچی

ہوئی ہے۔ کچھ فریب سے کچھ بچوں کی خام عقلی اور کچھ حکومتی جبر سے کام لے کر طالب علموں سے روپے وصول کرنے کی نت نئی پے چیدہ ترکیبیں بنائی گئی ہیں۔ علم کے دائرہ میں قدم رکھنا شرط ہے کہ ڈاکوؤں کا جو گروہ بھیس بدلے مختلف موڑوں پر بیٹھا ہوا ہے کہ کچھ اس طرح لپٹ پڑتا ہے کہ ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ صبح ہوئی اور سائیکلوں کے پیچھے کتابوں، کاپیوں، سلیٹوں اور خدا جانے کن کن چیزوں کا پشتارہ باندھے غریب طالب العلم اسکول کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہ نقشہ ہے جو اس نظام تعلیم نے پیش کیا ہے جو آپ کے سامنے ہے، لیکن یہی ہندوستان تھا' یہی ملک اس کا یہی آسمان، یہی زمین تھی جس میں تعلیمی فرائض کو مفت انجام دینے والے جہاں اوپر کی جماعتوں کے وہ طلبہ نظر آتے تھے جو آج ٹیوشن زدگی کے عارضہ میں مبتلا ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کہ علم ان سے روپیہ مانگتا ہے، اتنا روپیہ مانگتا ہے جو ماں باپ فراہم نہیں کر سکتے اور ساری رسوائیاں وہ اسی مطالبہ کے ہاتھوں آج برداشت کر رہے ہیں۔

مفت پڑھانے والے علماء

لیکن خیر اگر طلبہ مفت پڑھاتے تھے تو یہ تعلیم وتعلم کی دنیا کے آدمی ہی تھے۔ نیز پڑھانے کی اس مشق سے ان کا علم تازہ ہوتا تھا۔ اسی ذریعہ سے بتدریج ان کی شہرت وعظمت کا آوازہ بلندی حاصل کرتا تھا مگر تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ اتفاقاً اکے دوکے نہیں تقریباً ہر معتد بہ آبادی والے شہر اور قصبات بلکہ دیہاتوں میں مفت پڑھانے والوں کا ایک بڑا طبقہ آخر وقت تک اس ملک میں ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کا معاشی مشغلہ درس وتدریس نہ تھا۔ وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، یا تجارت کرتے تھے، زراعت کرتے تھے، لیکن سب کچھ کرنے کے ساتھ روزانہ بالالتزام پڑھانے کا کام بھی آخر دم تک انجام دیتے رہتے تھے۔ عہد بلبن کے مستوفی الممالک اور صدر کل شمس الملک جن کے متعلق تاج ریزہ کے قصیدہ کا مشہور مطلع ہے۔

صدرا! کنوں بہ کام ول دوستاں شدی　　　مستوفی ممالک ہندوستاں شدی

لیکن سنتے ہیں کہ مستوفی ممالک ہندوستان کے منصب عالی پر جو سرفراز تھا' اس کا سب سے بڑا امتیازی وصف کیا تھا۔

''اکثر علمائے شہر شاگرد او بودہ'' (اخبار الاخیار۔ ص 78)

''شہر کے زیادہ تر علماء ان کے شاگرد تھے۔''

جن میں ایک حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء قدس سرہ العزیز بھی ہیں۔ حریری کے چالیس مقالے جو سلطان جی نے زبانی یاد کیے تھے، یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب شمس الملک سے آپ پڑھتے تھے۔

دربار اکبری کے حکیم وعالم ملا فتح اللہ شیرازی کے متعلق تو پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ایک طرف وہ مغل امپائر کا بجٹ (موازنہ) تیار کر کے بادشاہ سے خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ ٹوڈرمل کی وزارت کے شریک غالب تھے اور اسی کے ساتھ صرف اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو نہیں بلکہ ملا بداؤنی کا بیان گذر چکا ہے کہ پانچ پانچ چھ چھ برس تک کے بچوں کو قاعدہ اور

ہجا نویسی بھی سکھاتے تھے اور تعلیم و تدریس کے مشغلہ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کر رکھا تھا۔

مفت پڑھانے کا ذوق

ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ خواہ بہ ظاہر معاشی پیشہ کسی کا کچھ بھی ہو، لیکن اپنے پاس جو بھی کسی قسم کا علمی کمال رکھتا تھا، عموماً بغیر کسی معاوضہ کے اس علم کو دوسروں تک پہنچانا گویا اپنا ایک انسانی بلکہ اگر دینی علم ہو تو مذہبی فرض خیال کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے قاضی (جج) و مفتی صدر الصدور وغیرہ کے عہدوں پر جو لوگ سرفراز رہتے تھے، چونکہ علماء ہی کے ساتھ یہ عہدے مخصوص تھے، اس لیے علاوہ اپنے سرکاری فرائض کے عموماً سرکاری حکام کے اس طبقہ کا مکان یا دیوان خانہ یا محلّے کی مسجد وغیرہ ایک مستقل درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتی تھی، بلکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تاریخوں کے پڑھنے سے بھی اثر دل پر پڑتا ہے کہ کوئی قاضی ہو، مفتی ہو، صدر الصدور یا صدر جہاں ہو اور تعلیمی کا کام نہ کرتا ہو، قریب قریب یہ بات ناقابل فہم تھی، اسی طرح ناقابل فہم جیسے اس زمانہ میں کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ضلع کا کوئی جج بھی ہو اور بچوں کو اپنے مکان پر مفت پڑھاتا بھی ہو۔ سرکاری اوقات میں ہائیکورٹ کی ججی کا کام بھی انجام دیتا ہو اور گھر پہنچ کر طلبہ کے حلقہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھاتا ہو۔ دراصل ایک رواج تھا جو قرنہا قرن سے مسلمانوں میں جاری تھا اور یہ رواج اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں پر بجائے بی اے، ایم اے، ایل ایل بی اور سول سروس وغیرہ کی ڈگری داروں کے بے چارے مولویوں کا قبضہ تھا اور میکالے کی تعلیمی رپورٹ کے انقلابی نتائج سے پہلے سب جانتے ہیں ہندوستان میں اسلامی حکومت کا چراغ اگرچہ بجھ چکا تھا، لیکن سرکاری عہدوں پر مولویوں ہی کا تقرر ہوتا تھا۔

چیف جسٹس اور شوق تدریس

موروثی روایات ہی کا یہ اثر تھا کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی ان غریب مولویوں نے سلف کے اس طریقہ کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کی۔ کلکتہ کو دارالسلطنت بنا کر انگریزوں نے کاکوری سے مولانا نجم الدین کاکوروی کو طلب کیا اور ''اقضی القضاۃ'' کا عہدہ یعنی چیف جسٹس کلکتہ کا عہدہ آپ کو دیا گیا مگر باوجود اس کے ان کے حالات میں لکھتے ہیں۔

> ''بمنصب اقضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود معہذا بہ تدریس وافادہ طلبہ علوم بغایت می کوشید۔''
>
> (تذکرہ علماء ہند۔ ص 233)
>
> ''چیف جسٹس کے عہدہ پر ممتاز تھے، اس کے باوجود درس و تدریس اور طلبہ کو پڑھانا لکھانا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔''

اسی کلکتہ میں اودھ کی آنجہانی حکومت کی طرف سے مشہور شیعی فاضل خان علامہ تفضل حسین خاں (14) انگریزی دربار میں سفیر تھے لیکن اس سفارت خانہ کے ساتھ ساتھ۔

''بہ مطالعہ کتب وافادہ طلبہ علوم می گذرانید۔''

''کتابوں کے مطالعہ اور طلبہ کی علمی خدمت میں گذارتے۔''

نائب السلطنت کو درس سے شغف

حکومت مرشد آباد کے سفیر اور نائب السلطنت کلکتہ میں شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ ''نظامت'' (حکومت مرشد آباد) کے پولیٹیکل امور کا تصفیہ گورنر جنرل کلکتہ سے کرائیں۔ تین گورنر جنرلوں لارڈ اللنبیر، لارڈ ہارڈنگ اول، لارڈ منٹو اول کے زمانہ تک مسلسل اس عہدہ پر ممتاز رہے۔ تنخواہ کئی ہزار ماہوار ملتی تھی۔ نوابوں کی شان وشوکت، تزک واحتشام سے کلکتہ میں زندگی گذارتے تھے۔ ان کے بیٹے مسٹر ہمایوں مرزا مرحوم اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔ اس زمانہ کے امراء کی جو تعلیمی شان تھی چونکہ اس کی یہ ایک چشم دید تصویر ہے میں انہی الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

''آفتاب ادھر نکلا گاڑی پر سوار ہو جاتے، پھر گاڑی تیز گھر تک آتی، گاڑی سے اتر کر پلنگ کے کمرے میں جا کر پوشاک بدلتے اور نشست کے کمرہ میں آ کر اپنی مسند پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے' آدمی پیچواں حقہ لا کر لگاتا۔ اتنے میں لوگ آنا شروع ہوتے۔''

یہ لوگ کون ہیں' کیا مصاحبوں اور احباب کا مجمع مراد ہے؟ ہمایوں مرزا لکھتے ہیں:

''والد مرحوم کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اور لوگ بہت اصرار سے ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے ...... دس بجے تک دو ڈھائی گھنٹے درس و تدریس کی صحبت رہتی، اس کے بعد برخاست کا حکم ہوتا۔ طلبہ سب سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔ (ص 25)

یہ جلی ہوئی رسی کی آخری اینٹھن تھی جو ابتدائے عہد انگریزی تک باقی تھی۔

منصب جلیل کے ساتھ درس وتدریس

''تذکرہ علماء ہند'' کے مصنف رحمان علی **(15)** نے اپنے استاد مولانا عبدالشکور مچھلی شہری کے حال میں لکھا ہے کہ:

''ہموارہ بہ مناصب جلیلہ از سرکار انگریزی عز وامتیاز داشتند۔''

لیکن اسی کے ساتھ:

''تمام عمر بدرس علوم صرف فرمودند۔'' (ص 192)

جہاں جہاں تبادلہ ہوتا، طلبہ کا مجمع بھی ان کے ساتھ جاتا۔ مولوی رحمان علی بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ فتح پور ہسوہ، غازی پور اور خدا جانے کہاں کہاں رہے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات

اپنی وسعت وگنجائش کی حد تک طلبہ کے قیام وطعام کا نظم بھی ان کی ذاتی آمدنی سے کیا جاتا تھا۔ مفتی صدرالدین دہلوی جو اپنے تخلص آزردہ کی وجہ سے مفتی آزردہ کے نام سے مشہور ہیں، ان کے متعلق لکھا ہے:

''از سرکار انگریزی بعہد وصدر الصدوری وافتاء دہلی سربلندی داشت۔''

''سرکار انگریزی کی طرف سے دہلی میں صدر الصدوری اور افتاء کے عہدہ سے سرفراز ہیں۔''

مگر باوجود اس جلیل عہدہ کے:

''مردم از بلاد وامصاء بعیدہ از و مستفید می شدند بوجہ کثرت درس بہ تصانیف کم توجہ داشت۔''

''دور دور شہروں سے آ کر لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور درس تدریس کی کثرت کی وجہ سے تصانیف کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔''

اس ''کثرت درس'' کے ساتھ حال یہ تھا کہ:

''اکثر طلبہ مدرسہ دار البقاء کہ زیر جامع مسجد دہلی بود طعام ولباس می داد۔'' (ص 93)

''دار البقاء کے اکثر طلبہ کو کھانا کپڑا دیتے تھے، یہ مدرسہ جامع مسجد کے نیچے تھا۔''

مولانا برکات احمد ٹونکی اور طلبہ کی امداد

میں دوسروں کی کیا کہوں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، خود ہمارے استاذ حضرت مولانا سید برکات احمدؒ والی ملک کے طبیب خاص تھے، دولت وثروت عزت وعظمت کے لحاظ سے آپ کا شمار امیروں میں تھا، لیکن ساری عمر ان کی طلبہ کے پڑھنے پڑھانے میں گزری، جس کا صلہ تو کسی سے کیا لیتے، شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گذرتا تھا کہ آپ کے یہاں سے پندرہ بیس طالب العلموں کو کھانا نہیں ملتا تھا۔ جب ان سے پڑھا کرتا تھا کم سنی کا زمانہ تھا۔ اس وقت اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

موجودہ اساتذہ کا حالِ زار

لیکن جب عملی زندگی میں قدم رکھا اور اب ان کی ان عجیب وغریب مخلصانہ قربانیوں کا خیال آتا ہے تو گھنٹوں سوچتا ہوں کہ یاالٰہی وہ کیا تماشا تھا۔ آج یہ کیا حال ہے کہ اساتذہ کو تنخواہیں دی جاتی ہیں، الاؤنس ملتے ہیں، امتحانی آمدنیاں ہوتی ہیں، سب کچھ ہو رہا ہے لیکن عموماً اس کے بعد بھی اجیر معلموں کا عام طبقہ صبح وشام اسی فکر میں رہتا ہے کہ جہاں تک علم سے دور رہ سکتے ہیں، دور رہیں۔ پڑھانے سے جتنا بھاگ سکتے ہوں، بھاگیں۔ عربی مدارس کے قلیل المعاش اساتذہ کو تو شاید ایک حد تک معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی قلیل تنخواہوں میں عصر حاضر کی گراں زندگی کے اندر اس کی توقع بیجا ہوگی کہ طلبہ کی وہ امداد کیوں نہیں کرتے جیسے ان کے اسلاف کا حال تھا، لیکن مغربی طرز کی درسگاہوں کے معلموں کو تو معقول مشاہرے ملتے ہیں۔ ہزار ہزار، بارہ بارہ سو ماہوار تک یہ کالجوں سے اٹھا رہے ہیں، لیکن ان کے دسترخوانوں یا میزوں پر بھی کبھی کسی طالب العلم کو دیکھا گیا ہے؟

تعلیم کا پیشہ ہے، معاش کا وہی واحد ذریعہ ہے لیکن اس پر بھی امکانی حد تک علم سے گریز، فرصت کے اوقات زیادہ تر کلبوں اور نزہت گاہوں کی گل چینیوں میں گذرتے ہیں۔ یہ ہے عام حال اس دور میں ان لوگوں کا جن کا کاروبار ہی پڑھنا پڑھانا ہے۔

مولانا فضل الحق خیرآبادی

بلاشبہ چوبیس گھنٹوں میں ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ کچھ تفریحی مشغلوں میں وقت گذاریں۔ جسمانی صحت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے اور دماغی سکون کے لیے بھی۔ ہم جن بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں ان کی زندگی بھی تفریحی و انبساطی مشاغل سے خالی نہ تھی، لیکن کس شان کے ساتھ۔ حضرت مولانا فضل الحق خیرآبادی مرحوم فتنۃ الہند کے ہنگامہ میں انگریزوں نے بالزام غدر جنہیں عبور دریائے شور کی سزا دی اور اسی اسیر وقید کی حالت میں آپ کا انتقال جزیرۂ انڈمان میں ہوا۔ ابتداء میں انگریزی حکومت کے ملازم بھی تھے، لیکن جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا ملازمت کے ساتھ بھی درس تدریس کا قصہ جاری رہتا تھا۔ مولانا بھی اپنے وقت کے مشاہیر ارباب درس میں سے تھے' بلکہ عربی تعلیم کے حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے جو تعلیمی اسکول موسوم ہے۔ سچ پوچھئے تو اس اسکول کو فروغ دے کر ایک خاص طرز تعلیم کا اس کو نمائندہ بنا دینا اس میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ آپ ہی کا ہے۔ گو آپ کے پدر بزرگوار مولانا فضل امام صاحب ''مرقاۃ المنطق'' جو دلی میں صدر الصدور تھے اور حسب دستور درس بھی دیتے تھے، اسی طرح مولانا فضل الحق کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی ان حضرات کو بھی خیرآبادی طریقہ تعلیم کی ترویج میں خصوصی دخل ہے' لیکن اس سلسلہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ''واسطۃ العقد'' اور ''درۃ التاج'' کا مقام مولانا فضل الحق ہی کو حاصل ہے۔ معقولات کی تعلیم اپنے والد مولانا فضل امام سے پائی تھی اور حدیث کی سند حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حاصل کی تھی۔

تفریح کے اوقات میں درس کا طریقہ

اسیری فرنگ سے پہلے باوجود امارت و دولت کے زندگی بھر درس دیتے رہے۔ چونکہ امیر آدمی تھے، ایک وقت خاص تفریح کا بھی مقرر تھا۔ مولانا کو شطرنج کا شوق تھا۔ (16) بساط بچھتی تھی اور شطرنج کی بازی ہوتی تھی، لیکن تفریح کے اس وقت میں بھی سنتے ہیں اور سنتے کیا ہیں، دیکھئے ''تذکرہ علماء ہند'' کے مصنف مولوی رحمان علی خود اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی شطرنج کی اس مجلس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> ''بسال دوازدہ صد وشصت وچہار ہجری مولف ہیچداں بہ مقام لکھنؤ بہ خدمتش رسیدہ' دید کہ درعین حقہ کشی وشطرنج بازی تلمیذے را سبق ''افق المبین'' میداد و مطالب کتب را باحسن بیانے دل نشیں می نمود۔'' (تذکرہ علماء ہند۔ ص 165)
>
> ''خاکسار 1264ھ میں لکھنؤ ان کی خدمت میں حاضر ہوا' دیکھا کہ حقہ کشی اور شطرنج بازی

کے ساتھ ساتھ اسی مجلس میں ایک شاگرد کو ''افق المبین'' کا سبق پڑھا رہے ہیں اور عمدہ پیرایہ میں مطالب بیان فرما رہے ہیں۔''

دیکھ رہے ہیں تفریح بھی ہوتی ہے تو کس شان کے ساتھ ہو رہی ہے، واہی تباہی ہفوات وخرافات کی جگہ اس وقت بھی کچھ نہیں تو ''افق المبین'' کا درس ہی جاری ہے، قطع نظر اس سے کہ ''افق المبین'' جیسی صبر آزما ژولیدہ وپیچیدہ کتاب کا حسن بیان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھانا مولانا کے اس غیر معمولی کمال کی دلیل ہے جو فن معقولات میں آپ کو حاصل تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی تفریح کا سامان بھی پڑھنا پڑھانا ہی بن گیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کی تفریح اور درس وتدریس

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کو چوبیس گھنٹوں میں تھوڑی دیر کے لیے اختلاج کا دورہ آخر میں ہونے لگا تھا اور بینائی تو مدت سے جا چکی تھی کہ اختلاج کا دورہ جوں ہی شروع ہوتا تھا شاہ صاحب قبلہ مکان سے باہر نکل کر جامع مسجد تک ٹہلتے تھے، لیکن اس ٹہلنے کے زمانہ میں بھی ثقاۃ سے سنا گیا ہے کہ ادب کی مشہور کتاب ''مقامات حریری'' کا درس بحالت مشی جاری رہتا تھا۔ ''حریری'' کے پڑھنے کا وقت ہی یہ مقرر تھا۔ خم خانوں کو جن پینے والوں نے خالی کیا یہ وہ لوگ تھے' آہ!

اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

واقعات کہاں تک بیان کروں۔ نظائر واشباہ کی حد بھی ہو، میں یہ بیان کر رہا تھا کہ علاوہ ان لوگوں کے جن کا کام ہی تعلیم وتدریس تھا اور جن کی امداد حکومت یا پبلک کی طرف سے ہوتی تھی، تعلیمی کاروبار کے ان چلانے والوں کے سوا جو ایک حد تک معاوضہ کے ساتھ کام کرتے تھے، ملک میں ایک بڑا گروہ ان لوگوں کا تھا جو لے کر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنی طرف سے کچھ دے کر لوگوں کو پڑھایا کرتے تھا اور یہ طبقہ طلبہ کے سوا تھا' جو خود تو بڑی کتابیں اپنے استادوں سے پڑھا کرتے تھے اور چھوٹی پڑھی ہوئی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے اور یوں تعلیم کا ایک بڑا حصہ بغیر کسی خرچ اور معاوضہ کے مفت انجام پاتا رہتا تھا، لیکن آج جب پیسے کے بغیر کوئی ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں کیا، اس نقشے کو پھر کوئی قائم کر سکتا ہے؟ ایک بات تھی جو چل پڑی تھی' ورنہ زرطلبی کا جذبہ انسان میں کب نہیں رہا ہے' یہ زمین ہی کا تو قصہ تھا جس نے پہلی صدی ہجری میں واقعہ حرہ اور دشت کربلا کے فاجعات کو تاریخ کے اوراق پر خونیں حرفوں میں ثبت کیا ہے۔ خود درس و تدریس، تعلیم وتعلم کے دائروں میں بھی ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو اسی ذریعہ سے دولت پیدا کر رہا تھا۔ مگر تعجب تو اسی پر ہوتا ہے کہ جن علوم وفنون کی قیمت اس زمانہ میں بایں شکل مل رہی تھی۔

شیخ ابوالمعالی شاہ جہاں کے دربار میں

مولانا آزاد بلگرامی نے شیخ ابوالمعالی نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ خوش الحان قاری تھے۔ دلی پہنچے، شاہجہاں

کا عہد تھا۔ امراء دربار سے کسی نے قاری صاحب کا ذکر کیا، طلبی کا حکم ہوا' حاضر ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا، شاہجہاں نے فرمائش کی کہ رمضان کے متعلق جو آیتیں ہیں ان ہی کی تلاوت کیجیے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالمعالی نے:

''شهر رمضان الذی انزل فیه'' القرآن شروع کرد نوعے بآواز دل فریب خواند کہ بادشاہ را وقتے دست داد، استدعا اعادہ نمود نوبت ثانی در قرأت دیگر خواند (یعنی دوسری قرأت میں وہی آیتیں سنائیں) بادشاہ خیلے محظوظ گشت۔''

آیت ''شهر رمضان الذی'' سے پڑھنا شروع کیا' اتنی دل فریب آواز میں پڑھا کہ بادشاہ پر رقت طاری ہوگئی' دوبارہ اسی آیت سے دوسری قرأت میں سنایا' بادشاہ بہت ہی محظوظ ہوا۔''

پھر کیا ہوا، صرف شمس القراء کا خطاب دے کر بادشاہ نے قاری صاحب کو گھر روانہ کر دیا' یا کوئی چھڑی یا سگریٹ کی ڈبیہ میں دے کر قصہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ اللہ کیا دن تھے' چند آیتیں پڑھ کر سنانے والے نے سنائی ہیں' اسی ہندوستان کا واقعہ ہے جہاں آپ ہم بھی موجود ہیں کہ:

''قریہ سیر حاصل از توابع بلگرام کردی نام حسب الاستدعا شیخ بہ طریق مدد معاش مرحمت فرمود۔'' (مآثر الکرام۔ ص 67)

''بلگرام کے علاقہ سے کردی نامی سیر حاصل گاؤں جاگیر کے طور پر عطا فرمایا۔''

علماء و مصنفین کی قدر افزائی

اودھ کا ایک سیر حاصل گاؤں جاگیر میں مل گیا' چند آیتوں کے سنانے کا یہ صلہ تھا۔ آج قطبی و میر مختصر المعانی و مطول کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کا جو حال بھی ہو' لیکن اس سرزمین میں ان ہی کتابوں کے مدرسین کے متعلق کوئی باور کر سکتا ہے کہ:

''بزر سنجیدہ شد۔''

''سونے میں تولے گئے۔''

یہ فقرہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ دتی شاہ جہاں کی دتی تھی، مولانا ارقام فرماتے ہیں کہ:

''ہرگاہ وارد حضور (شاہ جہاں) می گردید بہ رعایت نقود نامعدود مخصوص گشت و دربار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت۔''

''جب کبھی شاہجہاں کے حضور میں جاتے' ان گنت رقم سے نوازے جاتے' دو مرتبہ سونے میں تولے گئے اور یہ رقم گھر لے گئے۔''

ایک دفعہ نہیں دو دو دفعہ ملا صاحب زر کے ساتھ تولے گئے اور اپنے ہموزن رقم لے کر گھر روانہ ہوئے' یہی نہیں بلکہ:

''چند قریہ برسم سیورغال (جاگیر) انعام (16) شد۔'' (ص 1205)

''چند گاؤں جاگیر میں بطور انعام ملے۔''

جمع کیا جائے تو اس قسم کے واقعات سے دفتر تیار کیا جاسکتا ہے۔

مخصوص علماء وفضلاء کا معیار

لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ علماء فضلاء وطلباء کا اسی ہندوستان میں ان ہی زرخیز زربار زرریز دنوں میں تھا جس کے استغنا اور تعفف کا کنگرہ اتنا بلند تھا کہ مغل امپائر کے سلاطین کی بھی وہاں رسائی نہ تھی۔ مناظرہ کی مشہور کتاب ''رشیدیہ'' کے مصنف شیخ عبدالرشید جونپوریؒ ہیں، ملا محمود صاحب ''شمس بازغہ'' کے رفیق درس ہیں، زمانہ ان کا بھی وہی ہے، جب تخت تیموری پر شاہجہاں جیسا دین پرور معارف پژوہ بادشاہ جلوہ فرما ہے، قدر دانیوں کا شہرہ سن کر اقطار ارض سے علماء وفضلاء شاہی دربار کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے' پنجاب سے ملا عبدالحکیم آتے ہیں اور بزرسنجیدہ ہوکر روانہ ہوتے ہیں، پورب سے ملا محمود جونپوری آتے ہیں اور بادشاہ کے مقربین خاص میں داخل ہوجاتے ہیں۔ انہی مولویوں میں ایک مولوی ملا سعداللہ نامی جو چنیوٹ پنجاب کے رہنے والے تھے، بالآخر اسی زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اسی بادشاہ تک شیخ عبدالرشید جونپوری کے علم وفضل' تقویٰ وزہد کا چرچا پہنچتا ہے مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں:

''صاحب قران شاہ جہاں بہ استماع اوصاف قدسیہ خواہش ملاقات کرد۔''

''صاحب قران شاہ جہاں نے اوصاف قدسیہ سنتے ہی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔''

خود نہیں جاتے ہیں بلکہ بادشاہ خود خواہش ملاقات کرتا ہے' بلا بھیجتا ہے کس شان کے ساتھ؟

''منشور طلب مصحوب یکے از ملازمان ادب داں فرستاد۔''

''طلبی کا فرمان لے کر ایک باادب ملازم کو خدمت میں روانہ کیا۔''

''ادب داں ملازم'' جو علم دین کی قدر وقیمت کا جوہری تھا' فرمان شاہی اسی کے حوالہ ہوتا ہے مگر سنتے ہیں کہ شیخ عبدالرشید نے کیا کہا۔

''شیخ ابا کرد (انکار کیا) وقدم از کنج عزلت بیروں نہ گذاشت۔'' (ص 240)

''شیخ نے انکار کردیا اور گوشہ تنہائی سے قدم آگے نہ رکھا۔''

جس دربار میں ایک ایک آیت کی تلاوت کے صلہ میں مسلّم مسلّم سیر حاصل گاؤں جاگیریں مل رہی تھیں' جب وہ خود بلا رہا تھا، کیا کیا توقعات اس کی ذات سے قائم کیے جاسکتے تھے لیکن ''کنج عزلت'' کی حلاوت سے جس کا ایمانی ذوق چاشنی گیر ہوچکا تھا اس نے دکھادیا کہ شاہجہاں جیسے دراز کمند والے بادشاہوں کی رسائی بھی ان بلند آشیانوں تک نہیں ہے، جنہوں نے ہر قسم کی غیر الٰہی شاخوں کو کاٹ کر الا اللہ کی بلند ترین شاخ پر اپنا ٹھکانہ بنالیا ہے۔

علماء کی خودداری

حالانکہ اسی ہندوستان میں علم اور دین کی خدمت کو باشندوں کی ایک بڑی اکثریت دان، پُن، بھکشا کے استحقاق کا ایک قدرتی ذریعہ یقین کر رہی تھی۔ اس ملک میں جیسا کہ کہا جاتا ہے' صحرائی اور جنگلی آشرموں(18) یا دوسرے الفاظ میں تعلیم گاہوں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی گذر بسر کا ذریعہ صرف بھیک اور لقمہ گدائی بنا ہوا تھا۔ اگر واقعی ہندی اسلام نے ہندی تمدن وتہذیب کے عناصر جذب کیے تھے، جیسا کہ کہنے والوں کا ایک گروہ کہہ رہا ہے، تو جس چیز کو ہزار ہا سال سے اس ملک میں بجائے ذلت واہانت کے عزوشرف کا ذریعہ ٹھہرایا جاچکا تھا، اسی کے اختیار کرنے میں ان بزرگوں کو کونسی چیز روک سکتی تھی' لیکن کسی موقع پر شیخ مبارک محدثؒ کا ذکر گذر چکا ہے، فاقہ کی شدت نے چکرا کر زمین پر گرادیا ہے، شاگرد حال سے مطلع ہوتا ہے' گھر سے مرغوب کھانا تیار کر کے لاتا ہے، لیکن بھوک کی شدت سے جو زمین پر گرا ہوا تھا، وہ یہ کہہ کر کھانے کو سامنے سے اٹھوا دیتا ہے کہ اشراف نفس والے کھانے کا کھانا اوروں کے لیے جائز ہو تو ہو، لیکن دین اور علم کے خادموں کے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہوسکتا۔

استاذ کا استغناء

استاذ کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب میر مبارک کے یہی شاگرد یعنی میر طفیل محمد بلگرامی نے مسند درس وتدریس' افادہ واستفادہ پر قدم رکھا تو مولانا غلام علی آزاد کو جو میر طفیل محمد کے شاگردوں میں ہیں، ان کے تعفف واستغناء کے جو تجربات ہوئے تھے، ان میں سے ایک تجربے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ جن دنوں میں میر طفیل محمد بلگرام کے سناروں نے میر صاحب تک مختلف طور پر یہ اطلاعیں پہنچائیں کہ آپ کا فلاں طالب العلم ہمارے یہاں عموماً چاندی فروخت کرنے کے لیے لایا کرتا ہے، میر صاحب کا بیان ہے کہ یہ خبریں گو مجھے ملتی رہتی تھیں، لیکن میں نے اس طالب العلم سے کبھی نہیں پوچھا کہ قصہ کیا ہے' کچھ دن بعد جب وہ طالب العلم رخصت ہونے لگا تو دست بستہ مجھ سے کہنے لگا۔

> ''من کیمیا سازم استاذ من در کوہ سوالک می باشد عمل قمری (چاندی بنانے کا طریقہ) مرا تعلیم کردہ است وفرمود کہ بعد ہفت سال دیگر عمل شمسی (سونا بنانے کا طریقہ) ہم تعلیم می کنم۔''

> ''میں کیمیا بناتا ہوں' میرا استاذ سوالک پہاڑ میں رہتا ہے' اسی نے چاندی بنانے کا طریقہ مجھے سکھایا ہے اور فرمایا ہے کہ سات سال بعد سونا بنانے کا طریقہ بھی سکھاتا ہوں۔''

طالب العلم نے کہا یہ سات سال کی مدت میں نے آپ کی خدمت میں گذاری اور اب میں پھر اپنے استاذ کے پاس عمل شمسی سیکھنے کے لیے جا رہا ہوں' اس نے کہا:

> ''حق استاذی شما خیلے ثابت شدہ خدمت من ہمیں کہ این عمل را یادمی دہم۔''

> ''استاذی کا حق بہت ہے' میری یہی خدمت ہے کہ یہ عمل آپ کو بخش دوں۔''

یعنی تعلیم کے صلہ میں اس نے خواہش ظاہر کی کہ چاندی بنانے کا یہ طریقہ مجھ سے سیکھ لیجیے' میر صاحب کہتے ہیں:

''ہر چند مراتب مبالغہ طے کردہ آستیں افشاندم''

''اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے انکار کر دیا۔''

اس نے شدید اصرار کے ساتھ چاہا کہ میر صاحب یہ چیز اس سے سیکھ لیں، لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ میر صاحب کا بیان ہے کہ اس کو شاید شبہ ہوا کہ اس کے قول پر مجھے اعتماد نہیں ہے، اسی لیے انکار کر رہا ہوں۔ یہ خیال کر کے ''خاکسترے از کاغذ پیچیدہ برآوردہ'' خاک کی ایک چٹکی اس نے پگھلی ہوئی رانگ پر میر صاحب کے سامنے ڈالی ''فی الفور نقرہ بربست'' مگر جو ''آستین جھاڑی جا چکی تھی'' وہ پھر اس نسخہ کے لینے کے لیے نہیں چڑھائی گئی' مایوس ہوا اور:

''رخصت شد باز نیامد'' (ص 154)

''روانہ ہو گیا' اور پھر واپس نہ آیا۔''

علماء کا علمی وقار

اور دوسروں کو کیوں دیکھیے خود مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا کیا حال تھا۔ میر طفیل محمد نے میر مبارک محدث سے اگر اس اثر کو اپنے اندر منتقل کیا تھا' تو کوئی وجہ تھی کہ میر طفیل محمد سے یہ ''جوہر نایاب'' ان کے شاگردوں تک منتقل نہ ہوتا؟ مولانا غلام علی ''مآثر الکرام'' میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''ازاں روزے کہ ناصیہ اخلاص بآستان بیت اللہ آشنا شد بے گانگی از رسوم ابنائے روزگار بہم رسید۔''

''اسی دن جس دن اخلاص کی پیشانی بیت اللہ کی چوکھٹ سے آشنا ہوئی' دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔''

حج سے لوٹنے کے بعد کہتے ہیں کہ جو چیز اندر چھپی ہوئی تھی حجر اسود کے مس نے اس کو باہر کر دیا۔ حجاز سے واپسی کے بعد اورنگ آباد دکن میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہ آصف جاہ اول کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ شہید کا عہد تھا۔ الحمدللہ سلطنت آصفیہ یوں تو اس وقت بھی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے' لیکن ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں تو آصفی پرچم کے نیچے جنوبی ہند کا اکثر حصہ ساحل سمندر تک محروسہ آصفیہ میں داخل تھا۔ مولانا غلام علی ہی نے حضرت آصف جاہ اول کے تذکرہ میں ان کے مقبوضات کے متعلق لکھا ہے۔

''از کنار دریائے نربدا قصائے بندر امیشر در قبضہ تصرف داشت۔''

(روضۃ الاولیاء۔ ص 44)

''دریائے نربدا کے کنارے سے لیکر بندر امیشر کی انتہائی سرحد تک قبضہ وتصرف میں رکھتے تھے۔''

جس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ موجودہ وسعت کے لحاظ سے حکومت آصفیہ کا رقبہ تقریباً دونا تھا' اتنی عظیم حکومت کے مطلق العنان بادشاہ نواب ناصر جنگ شہید اپنے والد مرحوم کے بعد ہوئے تھے' مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ:

''بانواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید خلف آصف جاہ (بانی سلطنت آصفیہ) ربط عجیبے اتفاق افتاد۔''

''نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید خلف آصف جاہ سے عجب تعلق پیدا ہوگیا۔''

اس ''عجیب ربط'' کی نوعیت کیا تھی خود ان کا محتاط قلم اس کی تفسیر کرتا ہے۔

''موافقتے کہ بالاتر ازاں متصور نہ باشد دست بہم داد۔''

''ایسا ملاپ کہ اس سے بڑھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

ایک مستقل والی ملک کبیر سے ایسی موافقت میسر آتی ہے جس سے زیادہ موافقت ناقابل تصور ہے، لیکن اس موافقت سے ہندوستان کے اس مولوی نے کیا نفع اٹھایا۔ خود ہی لکھتے ہیں:

''چوں نواب نظام الدولہ (ناصر جنگ) بعد پدر (آصف جاہ اول) بر مسند ایالت دکن نشست بعض یاران دلالت کروند کہ حالا ہر مرتبہ کہ خواہید میسر است اختیار باید کرد وقت راغنیمت باید شمرد۔''

''جب نواب نظام الدولہ اپنے باپ کے بعد دکن کی حکومت کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے بعض دوستوں نے کہا' اس وقت تم جونسا منصب چاہو گے' مل سکتا ہے' لہٰذا وقت کو غنیمت جاننا چاہیے اور جو کرنا ہے کرلینا چاہیے۔''

دنیا سے استغناء

ہر مرتبہ میں یقیناً وزارت عظمیٰ بھی داخل ہے۔ چاہتے تو ممالک آصفیہ کی مدار المہامی مل سکتی تھی اور جن گونا گوں قابلیتوں کے سرمایہ دار تھے بحسن وخوبی وہ اس منصب جلیل کے فرائض بھی انجام دے سکتے تھے' مگر دلالت کرنے والوں کو اپنی دلالت اور رہنمائی میں سخت مایوسی ہوئی' جب وہی مولوی جو آج دنیا کی حقیر ترین ہستی ہے' اسی کی زبان سے سن رہے تھے۔

''آزاد شدہ ام' بندہ مخلوق نمی توانم شد۔''

''میں آزاد ہو چکا ہوں' مخلوق کا غلام نہیں بن سکتا۔''

حالانکہ موروثی جائیداد جو بلگرام میں تھی جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت اس سے دوسرے ارباب استحقاق کے ساتھ ان کے خاندان کو بھی محروم کر چکی تھی، جس کا مفصل قصہ گزر چکا، تلافی مافات کی بہترین صورت سامنے آگئی تھی، عمر بھی ساری ناز ونعمت میں گذری تھی، عالمگیری امیر میر عبدالجلیل نے (جو ان کے حقیقی نانا تھے) ان ہی کے آغوش میں

پرورش پائی تھی، لیکن بایں ہمہ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے کہا:

''دنیا نہر طالوت (19) می نمائد غرفہ ازاں حلال ست زیادہ حرام وایں شعر فرمودہ خود خواند ۔

دراں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند
غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند''

''دنیا کی حالت طالوت کی نہر جیسی ہے کہ چلو تو اس کا حلال ہے' اس سے زیادہ حرام اور اپنا کہا ہوا شعر سنایا (جس کا مطلب یہ ہے کہ) جس دنیا میں ہر بھک منگے کو بادشاہی تک عطا ہو رہی ہے اس میں یہی غنیمت ہے کہ میں اپنے آپ کو دے دیے جا رہا ہوں۔''

اللہ اللہ سوچنے کی بات ہے کہ امیر گھرانے کے آدمی ہیں' نانا کے ساتھ بھکر سندھ میں وقائع نگاری جیسی اہم خدمت خود بھی انجام دے چکے تھے' دولت و ثروت سب لٹ چکی ہے اور اسی لیے بجائے بلگرام (وطن اصلی) کے حجاز سے لوٹ کر بندر سورت سے سیدھے اورنگ آباد چلے آئے۔ خود فرماتے ہیں:

''ازانجا (سورت بندر سے) بہ دیار دکن کشید دارد خجستہ بنیاد اورنگ آباد گردیذ و در مکتبہ شاہ (20) بابا مسافر نقشبندی قدس سرہ گوشہ انزوا گرفت (مآثر۔ص 163)

''وہاں سے سیدھا دکن آیا' خجستہ بنیاد اورنگ آباد میں داخل ہوا۔ شاہ بابا مسافر قدس سرہ کی خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔''

جہاں تک مجھے علم ہے اسی خانقاہ کے ''گوشہ انزوا'' سے آپ کا جنازہ خلد آباد کی پہاڑی تک پہنچایا گیا' جہاں اس وقت تک آسودہ ہیں۔

علماء کی بے غرضی و بے نفسی

اور ان قصوں کو کوئی کہاں تک بیان کر سکتا ہے' حضرت مولانا برکات احمدؒ کے ساتھ ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ نواب مرحوم کی چہیتی بیگم اور ان میں ان بن ہو گئی۔ بیگم نے جواہرات کا ایک صندوقچہ مولانا کے حوالہ کیا کہ آپ اس کو لے کر اپنے وطن بہار چلے جایئے اور اس سے چند گاؤں خرید لیجیے۔ میں اپنی زندگی آپ ہی کے ساتھ گذار کر مر جاؤں گی۔ بیگم اس وقت جلال میں تھیں' مولانا نے شدید اصرار کے بعد صندوقچہ لینے کو تو لے لیا، لیکن بیگم کا غصہ جب کچھ دھیما ہوا تو سمجھا بجھا کر ان کو ہجرت کے عزم سے باز رکھا اور صندوقچہ جس حال میں دیا گیا تھا واپس کر دیا گیا، حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے پانچ چھ لاکھ روپے سے کم کا وہ سرمایہ نہ تھا، چاہتے تو اس کو لے کر بہار کے رئیسوں میں جا کر شریک ہو جاتے۔ لیکن

''غنیمت است کہ مارا ہمیں بما بخشند۔''

کو جو لوگ غنیمت بار دہ یقین کر چکے تھے ان کے لیے تو اس قسم کے خطرات کا بھی احتمال نہیں۔ (21)

اساتذہ اور علماء کی بے نفسی و بے غرضی کا سلسلہ

اس میں عجمیت اور تاتاریت نظر آتی ہے، کوئی اس میں ہندویت اور بودھیت کے جراثیم پاتا ہے لیکن اپنا خیال تو یہی ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کے متعلق خواہ کچھ ہی کہا جائے کہ اس وقت ان سے بحث نہیں، لیکن علم و دین کی خدمت کے ایک استوار و محکم نظام کا جو خاکہ کھجور کے تنوں پر کھڑی مسجد بنایا گیا تھا اس وقت تک جب تم مسلمان سیاسی طور پر دنیا میں مغلوب نہیں ہوئے تھے کسی نہ کسی شکل میں اسی خاکہ کی رہنمائی میں مسلمان چلتے رہے، حتیٰ کہ ہندوستان کے بھی یہ سارے قصے اگر غور کیا جائے تو ان میں بھی اسی خاکہ کی جھلک کے سوا آپ کو ان شاء اللہ اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

طالب العلموں کے متعلق ارشاد نبویؐ

میرا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ حکم دیا تھا کہ:

ان رجالا یاتون من اقطار الارض یتفقهون فی الدین فاستوصوا بهم خیرا.
(مشکوٰۃ)

''زمین کے اقطار سے لوگ تمہارے پاس دین سیکھنے کے لیے آئیں گے، تو ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیجیو۔''

علم کے طلبہ کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں یہ عقیدہ بٹھایا گیا تھا۔

ان الملائکه لتضع اجنحتها رضی لطالب العلم. (مشکوٰۃ)

''فرشتے علم کے طلب کرنے والوں کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں تاکہ ان کو راضی رکھا جائے۔''

اور اس بنیاد پر مسجد نبوی میں جو صفہ (چبوترہ) چھپروں کے نیچے اس لیے قائم کیا تھا کہ باہر سے جو لوگ طلب علم کے لیے آئیں انہیں اسی میں ٹھہرایا جائے اور تعلیم دی جائے۔

اہل صفہ کا انتظام

اس صفہ کے رہنے والوں کی خبر گیری مسلمانوں کے سپرد تھی، کم و بیش اسلام کی اس پہلی تعلیم گاہ میں مختلف اوقات کے اندر طلبہ کی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی تھی، کچھ تو لکڑیاں جنگل سے لاکر اور ان کو بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ دن کو صفہ والے لکڑیاں چنتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے، لیکن اصحاب ثروت و وسعت کی طرف سے باشارۂ نبوت ان کی امداد بھی ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ان لوگوں کے کھانے پینے کے مسئلہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ کوئی خراب چیز اگر ان لوگوں کے لیے بھیجتا تو حضور اس پر تنغض کا اظہار فرماتے۔ مدرسہ کے بعض ممتاز

طلبہ مثلاً معاذ بن جبلؓ کو مقرر کیا گیا تھا کہ جو امداد ان طلبہ کے لیے کہیں سے آئے اس کی حفاظت بھی کریں اور طلبہ میں تقسیم بھی کریں۔ یہ ساری باتیں صحاح کی کتابوں میں آپ کو مل جائیں گی۔ ایک طرف عام مسلمانوں کو تو ان طلبہ کے ساتھ استیصاء خیر کا یہ حکم تھا۔

طلبہ دین کے فرائض

مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صفہ کے ایک طالب العلم کا انتقال ہوتا ہے۔ غسل کے وقت کمر سے ایک اشرفی نکلتی ہے۔ پیغمبرؐ کی زبان سے کیة من النار (آگ میں داغنے کا ایک آلہ) کی آواز سن کر مجمع تھرا اٹھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوسری دفعہ ایک طالب العلم کی کمر سے دو اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ کیتان من النار (آگ میں داغنے کے دو آلے) کی آواز لسانِ نبوت سے پھر سنی گئی' جس کا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کو تو یہی چاہیے کہ علم کے ان پیاسوں کے ساتھ اپنی اپنی استطاعت کی حد تک نیکی کا برتاؤ کریں' لیکن خود طلبہ کو چاہیے کہ اپنی نگاہ بلند رکھیں۔ طلب علم کو زر طلبی کا ذریعہ نہ بنالیں اور جو ایسا کرے گا۔ اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی یہ آمدنی آخرت میں کیة من النار بن جائے گی یعنی اسی روپے سے جہنم میں وہ داغا جائے گا۔ اسلام کے اس قسم کے احکام کا ایک سلسلہ ہے۔ توانا تندرست آدمی، کہا گیا ہے، کہ بھیک اس کے لیے حرام ہے، لیکن مسلمانوں کو کہا گیا کہ مانگنے والوں کو جھڑکنا نہ چاہیے۔ مردوں کو کہا گیا کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکیں، لیکن عورتوں سے کہا گیا کہ مسلمانوں کو تو چاہیے کہ ان کی امداد جس حد تک کر سکتے ہوں کریں، لیکن طلبہ کو چاہیے کہ حتی الوسع منت پذیری سے بچ سکتے ہوں تو بچیں اور سچ پوچھیے تو قرآن کی اس آیت کی ہی یہ تفسیر ہے:

> **للفقراء الذين احصروا فى سبيل الله لايستطعون ضربا فى الارض يحسبهم الجاهل لاغنياء مين التعفف تعرفهم بسيماهم لايسالون الناس الحافا.**
>
> ''(صدقہ و خیرات کا استحقاق) ان فقیروں کو ہے جو اللہ کی راہ میں گھیر لیے گئے ہیں۔ زمین میں چل پھر کر (معاش مہیا نہیں کر سکتے) جو نہیں جانتا وہ تو ان کو تونگر سمجھتا ہے کیونکہ وہ سوال کرنے سے بچتے ہیں، تم انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان سکتے ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

جیسا کہ معلوم ہے کہ اس آیت کا تعلق مسجد نبویؐ کی اسی تعلیم گاہ (صفہ) کے طلبہ سے بھی ہے۔ آیت بالا میں ایک طرف تو مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ ان کے سلوک کے مستحق طلبہ بھی ہیں جو علم کے مشغلہ کی وجہ سے گھر گئے ہیں۔ اوروں کی طرح تلاش معاش میں گھوم پھر نہیں سکتے، لیکن دوسری طرف ان طلبہ کے جو صفات بیان کیے گئے ہیں کہ تعفف و استغناء کا اظہار ان سے ایسا ہو کہ جو حال سے ناواقف ہے سمجھے کہ یہ لوگ تو خوش حال، تونگر، غنی ہیں اور اگر کسی سے کچھ کہنے کی بھی ضرورت ہو تو نچے جھاڑ کر ان کے پیچھے نہ پڑ جائیں کہ گویا اس کو کمبل اڑھا رہے ہیں یا لحاف بن کر چھا جانا چاہتے ہیں، جیسے عام بازاری بھک منگوں گداگروں کا حال ہے۔

مسلمانوں کا حسن سلوک طلبہ دین کے ساتھ

قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم کے وہ نتائج ہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک کے مسلمانوں اور وہاں کی حکومتوں کو ہم پاتے ہیں کہ طلبہ علم کے ساتھ استیصاء خیر اور حسن سلوک کو اپنا ایک مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں، مبالغہ نہیں ہے کہ لاکھوں لاکھ روپیہ سالانہ حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام مسلمانوں کی طرف سے بھی تعلیمی مد میں خرچ ہوتے تھے مگر باوجود اس کے ایک گروہ ان میں ایسا ہوتا تھا، جو باوجود ضرورت و حاجت کے اسی تعفف اور استغناء کو اپنا شعار بنائے ہوئے رہتا تھا اور جو ایسا نہیں کرتے تھے سوسائٹی میں بری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

سلطان المشائخ سے ایک طالب العلم کی گفتگو

''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ'' کی مجلس کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت والا سے ملنے کے لیے ایک طالب العلم حاضر ہوا۔ حضرت نے دریافت فرمایا' ان دنوں کس فکر میں ہو۔ بولا:

''بدر سرائے آمدو شدمی کنم تا مرا نانے و فراغتے حاصل آید۔''

یہ سن کر سلطان جی خاموش ہو گئے' متعلم بھی اٹھ کر چلا گیا۔ حضرت والا تب اہل مجلس کی طرف مخاطب ہوئے اور یہ شعر پڑھا:

در وصف حال بس سرہ ایست چوں بخواہش رسید مسخرہ ایست

مطلب یہ ہے کہ حال اپنا بیان کرتے ہیں تو لوگ اپنے کو کھرے سکہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، لیکن جب نفسانی خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی آدمی صرف ایک ''مسخرہ'' بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ:

''شعر چیزے لطیف ست اما چوں مدح می کنند و بر ہر کسے می برند سخت بے ذوق است۔''

''شعر ایک پاکیزہ ذوق ہے لیکن جب لوگوں کی تعریف کے پیچھے لگ جائے' تو یہ پھر کیسی بدذوقی ہے۔''

مقصد مبارک یہ تھا کہ شاعری ایک بڑا کمال ہے، لیکن اس کمال کو امیروں اور بادشاہوں کی تعریف میں جب استعمال کیا جائے تو اس سے شاعر کی کتنی بے ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی حال علم کا ہے، طالب علم کے کیا کہنے، لیکن جب اس کو ''نانے و فراغتے حاصل آید'' کا ذریعہ بنانے کے لیے در بدر آدمی مارا پھرے تو اس کی کور ذوقی میں بھی کیا شبہ ہے۔

حضرت نے خود اپنے منشاء کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:

''علم ہمچنیں بہ نفس خویش بس شریف چیزے ست اماں چوں آنزا کسب سازند بدر ہا می روند عزت آں می رود۔'' (ص 182)

''ایسی ہی علم بہ نفس نفیس بہت ہی مبارک چیز ہے' لیکن جب اسے کمانے کا ذریعہ بنالیں اور در بدر مارے پھریں، تو پھر علم کی عزت رخصت ہو چکی۔''

پنڈت اور برہمن ہونا جس ملک میں ہر قسم کی خیرات کا آدمی مستحق بنا رہتا تھا، اسی ملک میں اب یہ خیال پھیلایا جارہا تھا، لیکن ان کہنے والوں کو کیا کہیے کہ جنھوں نے اس ملک میں اسلامی اصول کی اشاعت کی ان پر الزام دھرا جاتا ہے کہ اسلام میں ہندی خصوصیات کو انہوں نے بھر دیا۔ مگر ہم کہنے والوں کی سنیں یا جو واقعات اس ملک میں پیش آرہے تھے انہیں دیکھیں، خیال تو کیجیے کہ بلبن کا زمانہ ہے، مسلمانوں کے عروج واقبال کا آفتاب اس ملک میں نصف النہار پر ہے، بادشاہ کی یہ حالت ہے کہ علماء کا وعظ سنتا ہے اور روتے روتے اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہے۔ علم وطلبہ علم کی ہر طرف عزت ہو رہی ہے، عظمت ہو رہی ہے لیکن انہی دنوں میں اسی علم ودین کے کچھ مخلص ایسے بھی تھے، ''فوائد الفواد'' میں ہی سلطان المشائخ کے حوالے سے یہ قصہ منقول ہے۔

کوتوال شہر کے دستر خوان پر ایک طالب العلم

حاصل یہ ہے کہ مولانا عزیز زاہد نے سلطان جی سے یہ واقعہ نقل کیا کہ مولانا برہان الدین کابلی نے ان سے اپنے طالب العلمی کے دنوں کا یہ ماجرا ایک دن بیان کیا کہ کسی ضرورت سے:

''برسپہ سالار جمال الدین نیشاپوری کہ کوتوال حضرت دہلی بود رفتہ بودم۔''

''سپہ سالار جمال الدین نیشاپوری جو دہلی کا کوتوال تھا، اس کے پاس گیا تھا۔''

کوتوال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دسترخواں چنا گیا۔ مولانا برہان سے کوتوال نے شرکت کی درخواست کی۔ اصرار جب حد سے زیادہ بڑھا تو بیٹھ گئے۔ کھانے میں کہتے ہیں کہ:

''حلوائے گذر نیز بود۔''

''یعنی گاجر کا حلوہ بھی تھا۔''

''کوتال آں حلوہ آنرا پیش مولانا برہان الدین نہاد وگفت ایں چلوہ چگونہ است۔''

''کوتوال نے وہ حلوہ مولانا برہان الدین کے سامنے پیش کیا' اور کہا یہ حلوہ کیسا ہے؟''

دتی کے پولیس کمشنر نے ایک غریب طالب العلم کے سامنے حلوہ کی تشتری خود پیش کی ہے۔ اس سے ایک طرف اگر اس کا پتہ چلتا ہے کہ اسی دتی میں کبھی ان ہی طالب العلموں کا کیا عروج تھا۔

ایک طالب العلم کا کوتوال شہر کو جواب

لیکن اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ کوتوال کے اس سوال پر ''کہیے حلوہ کیسا ہے؟'' مولانا برہان الدین نے جواب دیا:

''متعلمان نان خشک رابچناں خورند کہ حلوہ گذرتواں دانست پس حلوائے گزرچہ گونہ خورند۔''

''طلبہ علم تو خشک روٹی کو اس طور پر کھاتے ہیں جیسے گاجر کا حلوہ کھاتے ہوں، بھلا ان

بیچاروں کو گاجر کا حلوہ کہاں سے مل سکتا ہے۔"

مطلب یہ تھا کہ "ایں حلوہ چہ گونہ است" کا جواب تو وہی دے سکتا ہے جس نے گاجر کا حلوہ، پہلے چکھا بھی ہو، وہ البتہ بتا سکتا ہے کہ آپ کا حلوہ اچھا تیار ہوا ہے یا نہیں اور جن کے لیے خشک روٹی ہی حلوائے گذر کی قائم مقام ہو، ان سے آپ یہ کیا سوال کرتے ہیں اور یہ کوئی اپنا ذاتی حال نہیں بیان کر رہے ہیں، عام متعلمین وطلبہ کی یہ حالت اس وقت بھی تھی جب دتی کا کوتوال لندن اور مانچسٹر، گلاسگو کے باشندے نہیں، نیشاپور اور کابل کے باشندے ہوتے تھے، دتی التمش اور بلبن کی دتی تھی "آب اندر" کے باوجود اپنے آپ کو لب تشنگی کے اصول پر قائم رکھنا، یہ تھی اس زمانہ کی خصوصیت، سب کچھ بٹ رہا ہے، لینے والے سب کچھ لے رہے ہیں، لیکن کچھ لوگ ہیں، مذہب نے ان کو تعفف کا حکم دیا ہے، ایسے تعفف کا کہ دوسروں کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کس حال میں ہیں۔

علاءالدین خلجی کے دور میں علماء کی قدر افزائی

علاءالدین خلجی کا زمانہ وہ زمانہ ہے کہ برنی کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ علم اور دین کی قدر افزائیوں میں اس وقت ہندوستان کا ہمسر کوئی دوسرا اسلامی ملک نہ تھا۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں:

"در تمامی عصر علائی دار الملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامہ وقت بود در بخارا و در سمرقند بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و ربع مسکوں نباشند ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات تفسیر و فقہ، اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بیان و بدیع و کلام و منطق موے می شگافند و ہر سالے چندیں طالبان ازاں استاداں سر آمد درجہ افادت می رسیدند و استحقاق دادن جواب فتویٰ می شدند و بعضے ازاں در فنون علم و کمالات علمی درجہ غزالی و رازی می رسیدند۔" (فیروز شاہی۔ص 352 تا 353)

"علائی دور حکومت میں ایسے باکمال اساتذہ تھے جو سب کے سب اپنے وقت کے علامہ تھے اور ان کے نکر کے عالم بخارا، سمرقند، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے، روم اور ربع مسکوں (پوری دنیا) میں بھی نہ ہوں گے، جونسا علم وفن آپ فرض کریں خواہ منقولات ہو یا معقولات، اصول دین ہو، یا متعلقات، جیسے نحو، لغت، معانی، بیان، بدیع یا منطق سب میں بال کی کھال نکالنے والے تھے اور ہر سال ان اساتذہ سے پڑھ کر بہت سے طلبہ نکلتے تھے اور اپنے افادات سے لوگوں کو متمتع کرتے تھے اور مفتی بنتے تھے اور ان میں سے بعض طلبہ اپنے وقت کے غزالی و رازی ہوتے تھے۔"

یہ شنیدہ نہیں بلکہ مورخ کی "دیدہ" گواہی ہے اور مورخ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں، "فیروز شاہی" کا مصنف ہے جس سے اس کی قابلیت و ذہانت، وسعت نظر سب ہی کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا شمس الدین یحییٰ کی طالب العلمی

مگر اسی عہد میں اودھ کے دو شریف لڑکے پڑھنے کے لیے آتے ہیں انہی پڑھنے والوں میں ایک ہندوستان کے وہ تاریخی عالم تھے جن کے متعلق حضرت چراغ دہلوی کا مشہور شعر ہے:

سالت العلم من احیاک حقا   فقال العلم شمس الدین یحییٰ

''میں نے علم سے پوچھا تجھے واقعتہً کس نے جلایا تو علم بولا کہ شمس الدین یحییٰ نے۔''

شیخ محدث نے انہی کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں

''از مشاہیر علماء شہر (دہلی) بود بیشتر مردم شہر تلمیذ بانتساب اومی کردند۔''

''مشاہیر علماء دہلی میں سے تھے اور ان میں کے بیشتر ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔''

اور میر خورد نے تو خود ان کے عروج علمی کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ ''سیر الاولیاء'' میں لکھتے ہیں:

''بیشتر علمائے شہر منسوب بہ شاگردی ایں بزرگ اند و سند علم ہائے ظاہری و تحقیق علوم دینی نسبت بداں بزرگ می کنند و فخر و مباہات بمجلس رفیع آں بزرگ می دانند کسے کہ بہ شاگردی آں منسوب است میان علما مبجل و مکرم است۔'' (سیر الاولیاء۔ ص 226)

''اکثر علماء شہر اس بزرگ کی شاگردی کا فخر رکھتے ہیں اور اپنے ظاہری علوم کی تحقیق اور دینی نسبت ان سے کرتے تھے اور اس میں فخر محسوس کرتے تھے، جنہیں ان سے تلمذ کی نسبت ہے، علماء محترم و مکرم میں شمار ہوتے ہیں۔''

بہر حال یہی مولانا شمس الدین یحییٰ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا صدر الدین ناؤلی کے ساتھ دلّی میں پڑھنے کے لیے آئے تھے، مگر جانتے ہو علاء الدین خلجی والی علم دوست دلّی میں علم ہی کے ان طالب علموں کے تعفف کا کیا حال تھا، سفید پوشی نباہنا چاہتے تھے، لیکن اتنے پیسے بھی پاس نہ تھے کہ دھوبی کو اجرت دے کر کپڑے دھلوالیا کریں۔ دستور تھا دونوں بھائیوں کا کہ:

''در آوان تعلم در ایام تعطیل (جمعہ کے دن) برائے جامہ شستن حوالی غیاث پور برلب آب جون (جمنا) آمدند۔ (سیر الاولیاء۔ ص 223)

''طالب العلمی کے زمانہ میں چھٹی کے دنوں میں کپڑا دھونے کے لیے غیاث پور کے آس پاس جمنا کے کنارے آتے تھے۔''

سلطان المشائخ کی طالب العلمی

اور ان کے پاس تو شاید صابن بھی ہوگا، لیکن ہم آج جس بزرگ کے نام نامی سے برکت حاصل کرتے ہیں، یعنی خود سلطان جی نظام الدین اولیاءؒ کا حال اپنی طالب العلمی کے زمانہ میں کیا تھا؟ میر خورد ہی نے اپنی سگی دادی کی زبانی یہ

روایت لکھی ہے کہ حضرت والا جب اجودھن میں اپنے پیر طریقت بابا فرید شکر گنج ؒ سے ''تمہید ابوالشکور'' اور ''عوارف'' پڑھتے تھے، عمر بیس سال سے زائد نہ تھی، جوانی کا شوق مگر میر خورد کی دادی جو اجودھن ہی میں مقیم تھیں، کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

''جامہائے سلطان المشائخ بغایت ریمگین (چکٹ) شدہ بود سبب آں کہ صابون نہ بود کہ سپید کنند۔''

''میں نے دیکھا کہ سلطان المشائخ کے کپڑے بالکل گندے ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صابون نہیں تھا کہ صاف کرتے۔''

میر خورد لکھتے ہیں کہ میری دادی صاحبہ سے ان کا حال دیکھا نہ گیا اور بولیں:

''اے برادر جامہائے تو بغایت ریمگیں شدہ و پارہ ہم گشتہ اگر بدہی من بشویم و پیوندان برزنم۔''

''اے بھائی! آپ کے کپڑے انتہائی گندے چکٹ ہیں اور بوسیدہ بھی، اگر آپ دیں تو میں ان کو دھوڈالوں اور پیوند لگادوں۔''

بڑے ردوکد کے بعد سلطان جی اس منت پذیری پر راضی ہوئے اور:

''جدہ رحمتہ اللہ علیہا...... چادر خود داد کہ ایں را بپوشند تا ایں غایت کہ جامہارا بشویم۔''

''دادی مرحومہ نے اپنی چادر دیدی کہ اسے پہنیں، تاکہ اتنی دیر میں ان کپڑوں کو دھودوں۔''

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر جو جوڑا تھا' سلطان جی کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری چادر وغیرہ بھی نہ تھی۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی' کپڑے اتار کر بوڑھی بی بی کے حوالے کیے گئے اور ان کی چادر لپیٹ کر خود سلطان المشائخ:

''کتابے در دست داشت وگوشہ گرفت و بمطالعہ آن مشغول گشت۔''

''ایک کتاب ہاتھ میں اٹھائی اور ایک گوشہ میں چلے گئے اور اس کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے۔''

بڑی بی بے چاری نے کپڑے بھی دھودیئے جہاں جہاں سے پھٹ گیا تھا ان پر پیوند زنی کر کے سلطان جی کے حوالہ کیا۔

''بصد معذرت آں جامہا پوشید۔'' (سیر الاولیاء۔ص 318)

''سینکڑوں معذرتوں کے بعد ان کپڑوں کو پہنا۔''

کہیں کسی کے دل میں اس کا خیال نہ گذرے کہ اس زمانہ میں کپڑوں کی قلت تھی اور اس لیے یہ حال تھا، اسی ''سیر الاولیاء'' میں میر خورد نے ہی اپنے حقیقی چچا کا حال یہ لکھا ہے کہ:

''بیش تر کسوت ایں سید پاک صوفیانہ صوفہائے رنگارنگ کتاب وچینی ومقطاع وبہین بود۔''

''اس سید پاک کے زیادہ تر کپڑے صوفیانہ انداز کے رنگارنگ کتاب چینی اور مقطاع کے باریک تھے۔''

اور پہننے کی کیا حالت تھی:

''از جنس جامہا چیزے پوشیدے آں را کرت دیگر نہ پوشیدے و بہر کہ خاطر مبارک او اقتضا' کردے عطا فرمودے۔'' (سیر الاولیاء۔ ص 218)

''کپڑوں میں جو چیز بھی پہنتے تو پھر دوبارہ ان کا استعمال نہیں کرتے جسے جی چاہتا دے ڈالتے۔''

کپڑوں کی اس ارزانی اور فراوانی کے باوجود کہ چالیس چالیس گز ایک ایک تنکے میں مل سکتے تھے(22) اس وقت بھی علم و دین کے طلبہ کی مستی وسرشاری کا یہ حال تھا' صفہ کی تعلیم گاہ ہی سے اس تعفف کی ابتداء ہوئی تھی' وہی روایتیں تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئی چلی آ رہی تھیں' جن میں صلاحیت تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے۔

سلطان المشائخ کا ظاہری حال

اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں تربیت کا حال یہ ہو' جیسا کہ چراغ دہلویؒ کے حوالے سے میر خورد نے سلطان المشائخ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جن دنوں اجودھن میں تھے۔

''دانشمندے کہ یار دہم سبق من بود و بخشبا یک جا کردہ پیش آمد۔''

''یعنی دلی کے زمانہ تعلیم کا ایک ساتھی اجودھن پہنچا۔ پڑھ لکھ کر وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو چکا تھا، سلطان المشائخ اپنے پھٹے پرانے حال میں اس سے ملنے گئے۔''

''چوں مرا با جامہائے ریمگیں و پارہ دید پرسید کہ مولانا نظام الدین ترا چہ روز پیش آمد۔''

تم پر کیا وقت پڑا کہ اس حال میں ہو' اس بے چارے کو جو اس راہ کی لذتوں سے ناآشنا تھا، کیا جواب دیتے مگر وہ کہتا جاتا تھا:

''اگر در شہر تعلیم می کردے مجتہد زمانہ شدے و اسبابے و روزگارے بہتر شدے۔''

''اگر شہر میں درس تدریس کا کام کرتے مجتہد زمانہ ہوتے اور زمانہ کے اسباب فراخی مہیا ہوتے۔''

خاموشی کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا تھا۔ خود فرماتے ہیں:

''ازاں یار ایں سخن شنیدم و ہیچ نہ گفتم۔''

''اس دوست سے یہ بات سنی' اور کچھ نہ کہا۔''

بابا فریدؒ کی خدمت میں

مل کر بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں' اب آپ اسے کشف سمجھیں یا ایمانی فراست کہ بابا صاحب سلطان جی کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں:

''نظام اگر کسے از یاراں تو پیش آید و بگوید کہ ایں چہ روز ست کہ ترا پیش آمدہ۔''

سلطان جی چپ رہے' ایک طالب العلم کو سلطان الہند بنانے کا کام جس کے سپرد تھا اس نے کہا، بابا صاحب نے فرمایا کہ:

''بگوے نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برد　　　ترا سعادت باد امرا نگونساری۔'' (سیر۔ص 239)

ساری کدورت دھل گئی اور جامہ رنگیں ہی میں وہ مسرت ہاتھ آئی جو خلعت شاہانہ والوں کو عمر بھر میسر نہیں آسکتی، اور بابا صاحب کی اس تربیت کے متعلق تو شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت پیر ہونے کے مرید کی تربیت ان طریقوں سے فرماتے تھے۔ مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کی مائیں بھی اپنے بچوں میں چاہتی تھیں کہ اسی جذبہ کی پرورش ہو۔

سلطان المشائخ کی تعلیم والدہ کی خدمت میں

خود سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ والدہ صاحبہ کے زیر تربیت بچپن کا سارا زمانہ گذرا، لیکن کس طریقے سے؟ خود ان ہی کا بیان ہے:

''والدہ مرا با من چناں معہود بود (یعنی دستور مقرر تھا) کہ روزے کہ در خانہ ما غلہ نہ بودے مرا گفتے۔''

یعنی گھر میں جس دن کھانے کو نہ ہوتا تو اپنے یتیم بچے کی اسلام کی وہ خاتون نظر میں بلندی کن الفاظ سے پیدا کرتی تھیں' کہتیں ''امروز ما مہمان خدائیم'' اس لہجہ میں یہ فقرہ ماں کی زبان سے بچہ کے کان میں پہنچتا تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں مسلسل کھانا ملنے لگتا تو میں دل میں کہتا۔

''من تنگ آمدم (روز روز کھانے سے تنگ آ گیا) والدہ کہ خواہند گفت من مہمان خدائم۔''

حضرت فرماتے ہیں کہ پھر یہ صورت جب پیش آ جاتی اور ''من مہمان خدائم'' والدہ فرماتیں:

''یک ذوقے وراحتے در من پیدا شد'' (سیر۔ص 113)

''ایک خاص ذوق اور راحت مجھ میں پیدا ہوتی۔''

یہ تھے وہ عقاب کے بچے جن کی فلک پیما نگاہوں میں قوت ان راہوں سے پیدا کی جاتی تھی، اس طالب العلم پر جس نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ:

''بر در سرائے آمد و رفت می کنم تا نانے فراغتے دست آید۔''

''میں سرائے کے دروازے پر آمد و رفت رکھتا ہوں تا کہ فراغت کے ساتھ روٹی میسر ہو۔''

مولانا جمال الدین اودھی

حضرت نے ناراضگی کا جو اظہار کیا تھا' یہ موروثی تربیت و تعلیم کا نتیجہ تھا' ورنہ آج یہ بات کیا قابل شناعت قرار پا سکتی ہے۔ ''سیر الاولیاء'' میں اسی کے بالمقابل ایک اور واقعہ کا ذکر ہے' اودھ کے ایک عالم مولانا جمال الدین اودھی کمسنی

میں فاتحہ فراغ اور تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تھے، نوجوان ہی تھے کہ اودھ سے دلّی سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسی زمانہ میں ایک خراسانی مولوی دلی آیا ہوا تھا، بہ ظاہر جھگڑے اور مناظرہ ومجادلہ میں شہرت حاصل کی تھی، لوگوں میں ''مولانا بحاث'' کے نام سے مشہور ہوگیا تھا، کبھی حضرت والا کی خانقاہ میں بھی آتا جاتا رہتا تھا' مولانا جمال الدین جب خانقاہ میں موجود تھے کہ یہ خراسانی بحاث بھی کہیں سے آ گیا اور خانقاہ کے علماء سے مختلف مسائل پر الجھنے لگا۔ مولانا جمال الدین نے اس رنگ کو دیکھ کر خراسانی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور چند ایسی گرفتیں کیں کہ:

''اورا ملزم گردانید۔''

ایک خراسانی عالم کو شکست

ہندی مولوی کے پنجوں میں یہ خراسانی کچھ ایسا بری طرح پھنسا کہ لاکھ نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفت اتنی سخت تھی کہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔ علماء کا جو مجمع موجود تھا۔ ''جملہ انصافہا کردند و گفتند کہ رحمت بر شما باد و علم شما کہ رعونت از سر ایں عزیز دور گردید۔''

سلطان المشائخ کے خادم خاص ومشہور میاں اقبال بھی موجود تھے۔ ان کو تو اتنی مسرت ہوئی کہ بھاگتے ہوئے حضرت والا کے پاس اوپر پہنچے اور ہانپتے ہوئے عرض کیا کہ:

''جوان (مولانا جمال الدین) دانش منداست، با مولانا بحاث بحث کردو در بزودی بحاث را الزام داد، چنانکہ مولانا وجیہ الدین پائلی دیاران دیگر ہمہ انصافہا دادند۔''

اس خبر سے حضرت کو بھی خاص مسرت ہوئی' آپ واقف نہ تھے کہ مولانا جمال الدین فارغ التحصیل عالم ہیں' میاں اقبال سے ارشاد ہوا

''لالا(23) جوان (مولانا جمال الدین) را بایاراں طلب کن''

میاں اقبال سب کو بلا کر اوپر لے گئے، اس وقت سلطان المشائخ نے مولانا جمال الدین کو خطاب کرتے ہوئے جو بات فرمائی اس کا پیش کرنا یہاں مقصود ہے۔ فرمایا:

''رحمت بر آمدن تو کہ علم خود را نفروختی۔'' (سیر۔ ص 419)

''تمہاری آمد پر رحمت کہ تم نے اپنا علم فروخت نہیں کیا۔''

مطلب یہ تھا کہ اس علم وفضل کے ساتھ تم دلّی (پایہ تخت خلافت) پہنچے لیکن بجائے اس کے کہ اپنے علم کا ڈنکا پیٹتے اور حکومت میں کوئی عہدہ اس ذریعے سے حاصل کرتے، تم ایک عامی آدمی کی شکل میں میرے پاس آئے۔ اتفاق سے تمہارے علم کا اظہار ہوگیا، دیر تک ان کی ہمت افزائی مختلف الفاظ میں فرماتے رہے۔

علماء کا دوسرا گروہ

لیکن اسی کے ساتھ میں اس کو صرف مبالغہ اور غلو ہی نہیں بلکہ غلط بیانی قرار دوں گا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ علم

اور دین کے دائرہ میں جو لوگ زندگی بسر کرتے تھے سب کا یہی حال تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور ایک گروہ ان ہی ملاؤں اور مولویوں میں ان کا بھی تھا' جو علم ہو یا دین دونوں کو صرف حصول دنیا کا شبکہ یا جال قرار دیئے ہوئے تھا۔ عہد اکبری کے مشہور قاضی نظام بدخشی جن کے متعلق ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:

''برشرح عقائد حاشیہ و در تصوف رسائل متعدد تصنیف نمود۔''

لیکن یہی حضرت ہیں جنہوں نے:

''اول کسے کہ اختراع سجدہ پیش بادشاہ کرد در فتح پور (24) او بود۔'' (ص 153)

فیضی اور ابوالفضل

اور ایک بے چارہ یہ قاضی کیا؟ اکبری فتنہ میں جیسا کہ معلوم ہے زیادہ دخل انہی دنیا ساز عباد الدراہم والدنانیر علماء کا تھا۔ دین اور علم والے جب گرتے ہیں تو کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ دربار میں ایک دن بایں شکل دو صاحب تشریف لائے کہ:

''سر و بروت و ابرو اور حلق موافق ریش ساختند'' (ص 388)

''سر مونچھ' بھوؤں سب کو منڈوا کر منڈی ہوئی ڈاڑھی کے برابر کیے ہوئے تھے۔''

ان میں ایک قرآن کے مفسر جناب مولانا فیضی فیاض ہیں اور دوسرے علامی فہامی جناب مولانا ابوالفضل ہیں۔ آپ کے والد جناب مولانا مبارک محدث ناگوری کا آج انتقال ہوا ہے اس سوگ میں ان علماء دین نے مچھندروں کی یہ صورت بنائی ہے۔

ملا مبارک

اور سچ تو یہ ہے کہ ان بے چاروں کو کیا کہیے۔ ان لڑکوں کے سامنے باپ نے اپنے جس کردار کو پیش کیا تھا اس کا نتیجہ اگر ان شکلوں میں ظاہر ہوا تو غالباً یہ محل تعجب بھی نہیں ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے تو صرف اپنے باپ کو دیکھا تھا' لیکن خود ملا مبارک نے جن بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں' جن کی صحبتوں میں بیٹھے تھے' حتیٰ کہ ابوالفضل کا اگر یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت عبیداللہ احرار سے ملا مبارک کو بیعت کا شرف حاصل ہوا تھا' حافظ ابن حجر کے بدو واسطہ حدیث میں شاگرد تھے لیکن بایں ہمہ جس قسم کی زندگی انہوں نے گزاری اس کا اثر بیٹوں پر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ عبدالقادر، جو ملا مبارک کے براہ راست شاگرد ہیں، وہی ان کے متعلق یہ لکھ کر کہ:

''از علماء کبار روزگار است در صلاح و تقویٰ و توکل ممتاز اہل زماں و خلائق دوران است' در ابتداء حال ریاضت و مجاہد بسیار کرد۔''

''موجودہ دور کے بڑے علماء میں ہیں' صلاح و تقویٰ اور توکل میں موجودہ لوگوں میں امتیازی نشان رکھتے ہیں' ابتداء میں کافی ریاضت اور مجاہدہ کیا ہے۔''

اسی لیے ابتداء میں آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال تھا کہ:

''اگر کسے در مجلس وعظ انگشتری طلاؤ حریر یا موزۂ سرخ پاجامہ سرخ یا زرد پوشیدہ می آید فی الحال می فرمود کہ از تن برآرد و ازارے کہ از پاشنہ گذشتہ بودے حکم بہ پارہ کردن آں میکرد۔''

''مجلس وعظ میں جو شخص سونے کی انگوٹھی یا سرخ موزہ، یا سرخ یا زرد کپڑا پہن کر آتا، دیکھتے ہی فرماتے، اتار پھینکو اور ٹخنے سے نیچے جو تہبند ہوتی، حکم دیتے اسے پھاڑ ڈالا جائے۔''

''سماع'' اور نغمہ سے ایسی نفرت تھی کہ:

''اگر آواز نغمہ دررہ گذرے شنودے جست نمودے۔''

''اگر راستہ میں نغمہ کی آواز سن لیتے' کود کر بھاگتے۔''

یعنی کود کر اس مقام سے دور بھاگتے تھے۔

ملا مبارک کے حالات میں انقلاب

ایک حال تو ملا صاحب کا یہ تھا، اس کے بعد قلابازیاں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''مآثر الامراء'' میں ہے:

''در عہد سلیم شاہ (پسر شیر شاہ سوری) برابطِ شیخ علائی (25) مہدوی بمہدویت شہرت گرفت، و در عہد آغاز اکبر کہ امراء چغتا بیش تر در عرصہ بودند بطریقۂ نقشبندیہ خود را وانمود پس ازاں بسلسلہ مشائخ ہمدانیہ منسوب می کرد، وچوں عراقیہ (شیعہ) دربار را گرفتند برنگ ایشاں سخن راند چنانچہ بہ تشیع اشتہار یافت۔'' (مآثر الامراء۔ ج3، ص585)

اور آخر میں تو دین الٰہی کی تمہید لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا، بادشاہ کو پہلے مجتہد بنایا گیا، آگے بڑھایا گیا تا اینکہ وہاں پہنچایا گیا کہ اگر رحمت الٰہیہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ مجدد الف ثانی کو پیدا کر کے نہ پکڑتی تو اس ملک میں اسلام کا نام لیوا بھی کوئی باقی نہ رہتا (26)۔ میرا تو خیال ہے کہ ملا مبارک کے لڑکوں پر ملا صاحب ہی کی اس عجیب و غریب سیرت کا یہ اثر پڑا تھا۔ پسر نے اسی چیز کی تکمیل کی تھی جسے پدر نامکمل چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک دلچسپ و غریب سیرت کا یہ اثر پڑا تھا۔ پسر نے اسی چیز کی تکمیل کی تھی جسے پدر نامکمل چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک دلچسپ لطیفہ باپ بیٹوں کا وہ ہے جس کا ابو الفضل نے ''آئین اکبری'' میں ذکر کیا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جب ملا مبارک کے نت نئے فتنوں نے مسلمانوں کو پریشان کیا تو علماء نے اکبر تک ان کے حالات پہنچائے۔ اس وقت تک اکبر محمد اکبر تھا، اس نے گرفتاری کا حکم دیا۔ رات کا وقت تھا، فیضی کو سب سے پہلے اس حکم کی خبر ملی، اب تک ان لوگوں کی رسائی دربار تک نہیں ہوئی تھی، بہر حال فیضی نے باپ کو اٹھایا اور مشورہ دیا کہ گھر سے نکل کر کہیں روپوش ہو جانا چاہیے۔ فیضی کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر تجربہ کار بوڑھے باپ نے تسلی دی اور کچھ صبر و توکل وغیرہ کی تلقین کی۔ اس وقت فیضی نے اپنے باپ سے جو بات کہی وہ یہ دلچسپ فقرہ ہے:

''کار معاملہ دیگر است و داستاں تصوف دیگر۔''

''کام کی بات الگ ہے اور تصوف الگ چیز۔''

تفسیر فیضی کس حالت میں لکھی گئی؟

ان لوگوں کے اندر دین کی پرورش جس رنگ میں ہو رہی تھی، اس کا اندازہ اسی فقرہ سے ہو جاتا ہے۔ تصوف کی تعریف انہی لوگوں نے یہ کی کہ ''برائے شعر گفتن خوب است'' اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ملا عبدالقادر کی یہ چشم دید گواہی اگر جھوٹی نہیں ہے کہ فیضی نے جو تفسیر لکھی تھی کہ العیاذ باللہ۔

''درایں حالت مستی و جنابت می نوشت و سگاں (27) آں را از ہر طرف پائمال ساختند۔''

(ج 3، ص 300)

''مستی و جنابت کی حالت میں لکھتا۔ تھا اور کتے ہر طرف سے روندتے ہوتے۔''

ان بدبختوں کا دین ان کا تصوف ان کا علم نہ دین ہوتا ہے نہ تصوف اور نہ علم بلکہ ''اکل'' کی جہاں بیسیوں شکلیں ہیں، کور نصیبوں کا یہ گروہ اسی کی ایک ''شکل'' اپنے علمی و دینی سرمایہ کو بنالیتا ہے۔

علماء کا خدا ترس گروہ

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ فیضی و ابوالفضل، ملا مبارک، قاضی بدخشی جیسے لوگ پرانی تعلیم سے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ واقعات کا بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ابتداء اسلام سے اس وقت تک کا یہ تجربہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں علم و دین کے خدام کا ایک طبقہ ایسا باقی رہا ہے، جس کا دامن اس قسم کے ادنیٰ چھچھورے اغراض سے پاک تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ایک ایسے نظام تعلیم کے مروج کرنے میں کامیاب ہوئے جس میں کام کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت کے سامنے مزد اور صلہ کا سوال کبھی نہیں آیا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ فتویٰ کہ قرآن و حدیث کی تعلیم و تبلیغ پر معاوضہ لینا ناجائز ہے، عملاً مسلمانوں میں امام کا یہ فتویٰ مقبول نہ ہوسکا، مجبوراً جو حنفی علماء کو دوسرے ائمہ کے نقطہ نظر ہی کی پناہ ڈھونڈنی پڑی، لیکن باوجود فتویٰ جواز کے ایک معقول تعداد ہمیشہ ان لوگوں کی پائی گئی، جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ معاشی ضرورتیں جب دوسری راہوں سے پوری ہو رہی ہیں تو تعلیم و تعلم کے کاروبار کو رضا کارانہ طور پر انجام دینے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو تیار کرلیا۔

اس سلسلہ میں موروثی روایات اور ماحولی آثار کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں جب حکومت پر زوال آیا اور دوسری مسلطہ حکومت نے پرانی تعلیم کی سرپرستی کو ترک کر کے ملک میں جدید جامعاتی نظام تعلیم کو مروج کیا، تو باوجودیکہ اس تعلیم کا مسلمانوں کے دینی علوم سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن محض اس لیے کہ اسکول اور کالج میں پڑھنے والے طلبہ بھی طالب العلم ہی کہلاتے تھے، شروع شروع میں مسلمان اپنے پرانے دستور کے مطابق ان طلبہ کے قیام و طعام کا انتظار بغیر کسی

معاوضہ کے اپنے گھروں میں کرتے تھے اور صوبوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن صوبہ بہار کے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں کہ بیس پچیس سال پیشتر تک شہروں اور قصبوں میں شاید ہی کسی مسلمان وکیل (28) یا مختار کا ڈیرہ اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پانے والے غیر مستطیع طلبہ سے خالی رہتا تھا، اگر چہ رفتہ رفتہ بہ تدریج زمانہ نے اس رواج کو مٹانا شروع کیا اور اب اس کی مثالیں کم ہوتی جارہی ہیں۔ پھر بھی مسلمانوں میں ابھی اس کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہے کہ یورپ کے رواج کے مطابق معاوضہ لے کر اپنی فیملی میں طالب العلموں کو رکھنے کی ہمت کریں۔ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ حجاب بھی اٹھ جائے۔ لیکن ابھی لوگوں کو شرم آتی ہے کہ طالب العلم سے معاوضہ لے کر اس کو دو وقت اپنے ساتھ کھانا کھلائیں، حالانکہ سنا جاتا ہے کہ یورپ میں بہت سے خاندانوں کی گزر بسر کا ذریعہ یہی رہ گیا ہے، بہر حال اس بحث کو اب اسی نقطہ پر ختم کرتا ہوں، اس کے بعد دوسرے حصہ میں نظام تعلیم کے دوسرے ابواب سے بحث کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

حواشی

(1) مسلمانوں کا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اس کی مثال یہ واقعہ بھی ہے۔ علامہ قطب الدین کے بیٹوں میں کوئی عالم مشہور نہیں ہوا لیکن غلام کو انہوں نے پڑھایا اور اس توجہ سے پڑھایا کہ اپنے وقت کے فاضلوں میں اسی غلام کا شمار ہوا۔ حضرت سلطان جی کے حوالہ سے میں نے ہندوستان کا قصہ بھی نقل کیا ہے کہ لاہور کے ایک قاری صاحب نے اپنے ہندو (نسلاً) غلام شادی نامی کو قرآن کا ایسا قاری بنادیا کہ وہ شادی مقری کہلاتے تھے۔ سلطان جی نے بھی بچپن میں ان سے پڑھا تھا اور یہ تو معمولی واقعات ہیں۔ ابن عباس کے غلام عکرمہ ابن عمر کے غلام نافع حدیث کے اساطین میں ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے موالی کو جب سلطنت وحکومت تک پہنچایا۔ فقہ وحدیث تفسیر کے آئمہ میں غلاموں کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسی صورت میں ان کے غلاموں کو غلام کون کہہ سکتا ہے بلکہ مسلمانوں میں علماء کو "مولانا" کے لفظ سے خطاب کرنے کا جو عام دستور ہے اس کی ابتداء میرے خیال میں اس وقت ہوئی جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ بجائے خود جواب دینے کے حضرت نے خواجہ حسن بصری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "سلوا مولانا الحسن" (یعنی حسن بصری سے پوچھو) فرمایا۔ اور کون نہیں جانتا کہ حسن بصری کا تعلق بھی موالی سے تھا۔ (دیکھو مناقب ابی حنیفہ للموفق۔ ص 52)

(2) مقصد یہ ہے کہ چندہ کا رواج تو حال سے ہوا ورنہ حکومت کی بربادی کے بعد عموماً قوم کے ارباب ثروت ودولت اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ ان اساتذہ کے مصارف کی پابجائی کا سامان کریں۔ حضرت مولانا لطف اللہؒ (علی گڑھ) جو اپنی کثرت درس سے پچھلے زمانہ میں واقعتہً استاذ العلماء ہوگئے تھے مدت تک جیسا کہ میں نے سنا آپ کی گذر بسر کا دارومدار علی گڑھ ونواح علی گڑھ کے رؤسا کی خدمات پر تھا۔ عموماً ان رئیسوں نے اپنے اپنے اسٹیٹ سے حضرت کے لیے کچھ ماہوار جاری کر دیا۔ مسٹر ناس کول بروک نے مغل حکومت کے زوال کی وجہ سے ہندوستانی نظام تعلیم کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی طرف برطانوی حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے ایک مشہور یادداشت لکھی تھی جس میں انہوں نے بھی اس کی توثیق کی ہے کہ سلطنت کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لاوارث طبقہ اہل علم کی سرپرستی بھی

مسلمان امراء کررہے ہیں لکھا ہے۔ ''اب بھی شاہزادے نواب اور زمیندار جنہیں اپنے باپ دادا سے علم کا شوق پہنچا ہے تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔'' (رسالہ'اردو' سہ ماہی۔اپریل 1932ء)

(3) ہون سلاطین دکن کا ایک مشہور طلائی سکہ تھا جسے اس زمانہ کے انگریزی روپے کے چار ساڑھے چار روپیہ کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ''ہن برستا ہے'' کی ضرب المثل میں اسی ہون کی طرف اشارہ ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ جنوبی ہند کا کوئی لفظ ہے لیکن السیوطی نے اپنی کتاب ''حسن الحاضرۃ'' میں احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ اس نے خلیفہ بغداد معتضد کے پاس جب اپنی لڑکی قطر الندی کو رخصت کیا تو منجملہ اور چیزوں کے 'مائته هن ذهب'' (100 ہن سونا بھی تھا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بھی اس لفظ کا رواج تھا۔ کیا تعجب ہے کہ دکن میں یہ لفظ مصر سے آیا ہو۔ میرے خیال میں تو دکن کے قدیم باشندے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے کوئی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ پانی کو آج تک یہ لوگ نیلو کہتے ہیں۔ سامری قوم کے باشندے بھی یہاں پائے جاتے ہیں' ملا عبدالنبی نے ''دستور العلماء'' میں لکھا ہے کہ وجیانگر کے راجہ رام راج کی کھوپڑی احمد نگر میں سامری قوم نے لے لی تھی' ہر سال اس کا جلوس بھی نکالتی تھی۔ ان کے متعلق السیوطی کی جس عبارت کا میں نے حوالہ دیا ہے وہ پوری عبارت یہ ہے۔ ''وفی سنة اثنتین و مائتین'' (202ھ) **زفت قطر الندی بنت خماردیه بن احمد بن طولون من مصر الی الخلیفة المعتضد و نقل ابوھانی جھاز ھامالم یرمثله کان من جملة الف تکه الجوھر و عشر صنادیق جوھر و مائته ھون ذھب** (حسن الحاضرۃ۔ ج2، ص148) ''یعنی 202ھ میں خمارویہ بن احمد بن طولون نے اپنی لڑکی قطر الندی کو خلیفہ معتضد کے پاس رخصت کیا۔ لڑکی کے باپ نے جہیز میں اتنی چیزیں دی تھیں جس کی نظیر نہیں دیکھی گئی۔ جو چیزیں بھیجی گئی تھیں ان میں ہزار گھنڈیاں جواہرات کی تھیں۔ علاوہ اس کے دس صندوقوں میں بھی جواہرات تھے اور سو ہن سونا بھی تھا'' واللہ اعلم ہن سے یہاں سکہ مراد ہے یا کوئی اور چیز' لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے ساتھ ہن کا تعلق تھا۔ یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ مصری ہن کا وزن کیا ہوتا تھا۔ یہ قصہ تیسری صدی ہجری کا ہے' جس سے معلوم ہوا کہ مصر میں ہن کے لفظ کا رواج بہت قدیم زمانہ سے ہے۔ بظاہر اسلام سے پہلے۔

(4) جیسا کہ میں نے عرض کیا بیجاپور کے ان مدرسوں کو موجودہ زمانہ کے کلیات و جامعات کا قائم مقام قرار دینا' موجودہ زمانہ کی تحقیقات (ریسرچ) والی شاعری تو ہو سکتی ہے' لیکن حقیقت سے یہ بات بہت بعید ہے اگرچہ بیجاپور کی حکومت کا مغربی باشندوں سے جو تعلق ہو گیا تھا' خصوصاً پرتگیز نے گوا بندر پر قبضہ کر کے بیجاپور کی حکومت پر اپنے جو اثرات قائم کر لیے تھے اور اس کی وجہ سے مغربی اقوام سے میل جول کی ایک راہ کھل گئی تھی' اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ یورپ کی سنی سنائی باتوں کو بھی دخل ہوا۔ ابراہیم زبیری ہی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بیجاپوری دربار میں ابراہیم عادل شاہ ہی کے زمانہ سے یورپین ڈاکٹر سرجن ہونے کی حیثیت سے گھس گئے تھے۔ فرلوب نامی ڈاکٹر کا تو ایک دلچسپ لطیفہ بھی نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کو بھگندر والا پھوڑا امبر زمین ہو گیا۔ غالباً جسے فس چولا اور نواسیر کہتے ہیں۔ فرلوب حالانکہ اس زخم کے آپریشن سے واقف نہ تھا لیکن بادشاہ پر عمل جراحی کیا۔ نتیجہ بالعکس نکلا۔ حالت زیادہ خراب ہو گئی' مگر رحم دل ابراہیم نے فرلوب کو بلا کر سمجھایا کہ میرے مرنے سے پہلے بیجاپور چھوڑ دو' ورنہ میرے بعد تجھے لوگ مار ڈالیں گے۔ ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ فرلوب نہ جا سکا۔ خواص خاں نے ناک اور نچلا لب اس کا غصہ میں کاٹ دیا۔ مگر فرلوب نے گھر پہنچ کر اپنے ایک غلام کی ناک اور لب کاٹ کر پھر اپنے چہرہ پر چسپاں کر لیا اور اس کا یہ عمل کامیاب ہوا۔ زبیری نے لکھا ہے کہ ''و بہتر شد'' فرلوب اچھا ہو گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جراحی کے فن میں ان لوگوں کو اسی زمانہ سے کمال حاصل تھا' لکھا ہے کہ ''تا زمانے در شہر بیجاپور بہ حکمت و معالجت گزرانید حکیم بے بدل بود۔'' (ص280)۔ بادشاہ کے قتل کرنے والے عیسائی ڈاکٹر کا زندہ رہ جانا صرف بینی و لب تراشی پر قناعت کرنا اور غلام کے ساتھ اس بے دردی سے فرلوب کا پیش آنا ہو اس پر بھی حکومت بیجاپور کی خاموشی بلا وجہ نہ تھی۔ آپ کو اسی کتاب سے معلوم ہو گا کہ بیجاپور کی حکومت گوا کی مغربی قوت سے ڈرتی تھی' علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹ کر گوا بندر میں قید کیا جاتا تھا اور حکومت منت سماجت کے سوا ان ڈاکوؤں کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت سلطان عالمگیرؒ نے بیجاپور کی حکومت کو کیوں ختم

کیا؟ بلکہ دکن کی ساری کمزور چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں پر حملہ کا کیا مقصد تھا؟ ایک گروہ ہے جو اورنگ زیب پر زبان طعن دراز کر رہا ہے، حالانکہ سچ یہ ہے کہ سمندر کی طرف مغربی لٹیرے اور خشکی میں مرہٹے ان ہی حکومتوں کی کمزوریوں سے نفع اٹھا کر اپنے آپ کو آگے بڑھا رہے تھے۔ بوجہ شیعہ ہونے کے دکن کے عام مسلمانوں کو جو عموماً سنی تھے، حکومت نہیں پوچھتی تھی بلکہ مسلسل ایرانیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، عہدوں پر وہی قابض تھے۔ رفیع الدین شیرازی کے حوالہ سے جو بیجاپور حکومت میں منصب جلیل پر سرفراز تھا نقل کیا ہے:

''بندہ آنچہ می داند از اہل شیراز کہ مولد ومنشاء ماست دہ ہزار اہل استحقاق آمدہ با جمعیت واسباب وتجمل باز گشت۔'' (ص 112)

سوچنے کی بات ہے کہ ایک شیراز شہر ہے۔ دس ہزار اگر رفیع الدین کے زمانہ میں واپس گئے اسی سے خیال کیجیے کہ دکن کی ان حکومتوں کے یہاں ایران کے مختلف شہروں سے کتنے آتے تھے جن میں بڑی تعداد تو نوکر ہو جاتی تھی اور بہت سے لے دے کر واپس ہوتے تھے ایسی صورت میں ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے خود یہاں کے دکنی سنی مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہوگا۔ ظاہر ہے الزبیری نے اورنگ زیب کا وہ فرمان بھی نقل کیا ہے۔ جب بیجاپور کی حکومت نے کہلا بھیجا کہ ہم تو مسلمان ہیں ہم پر حملہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیب نے جواب میں لکھا تھا:

''انچہ گفتند درست و دراست ہست ما را از شہر شاہ و ملک شما سر دکارے نیست و قصد جنگ وقتال نداریم مگر ایں کافر فاجر حربی شقی کہ در شان او صادق است (حرم میں چھپے بھی تو ہے) کشتنی، در بغل شما جا گرفتہ و در پناہ آمدہ فسادات وخرابیہا کند اسلامیان بلاد وغربا ملک و دیار ازیں جا تا از ایذائش رنج کش۔'' ظاہر ہے کہ اس سے سیواجی مراد ہے' آخر میں عالمگیر کے الفاظ میں:

''اماطت (مٹانا) واستیصال بیخ فساد بر ما کہ شعر ملوکیم واجب ومستحکم۔'' مطلب یہ ہے کہ بحیثیت اقتدار اعلیٰ ہند ہونے کے مسلمانوں کو اس کسمپرسی میں چھوڑ دینا میرے لیے کسی حیثیت سے جائز نہیں ہے۔ دلّی سے دکن اورنگ زیب کی روانگی کس نصب العین کے تحت تھی۔ اسی فرمان میں صراحۃً اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''ارسقط الراس (وطن مالوف) آمدن جز ایں نیست کہ آں حربی (سیواجی) را بدست آریم وجہانیاں را از ادتمیش رہانیم چوں کہ اوور پناہ شماست اور اازشما طلبیم۔'' آخر کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

''ہمیں کہ بدست آید ہمیں ساعت بردیم وراہ خویش گیریم'' (بستان السلاطین۔ ص 543)

لیکن اس معمولی شرط کی تکمیل پر بھی جو حکومتیں آمادہ نہ تھیں اگر ان کو اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو اس میں قصور کس کا ہے۔

(5) اب تو مینار کا رنگ بہت کچھ اڑ گیا ہے تاہم جہاں جہاں باقی ہے یہ چمکدار نیلا رنگ ہے' معلوم ہوا کہ بیدر کے اطراف میں لوہے کے ذرات میں ملی ہوئی' مٹی جو پائی جاتی ہے اور لوہے کے زنگ نے مٹی کو سرخ رنگ دے دیا ہے' اسی رنگ کو دوسرے رنگوں سے مرکب کر کے نیلگوں رنگ پیدا کیا جاتا تھا اور سیپ کو کاٹ کاٹ کر اس کے ٹکڑوں کو جو دو دو انچ کے ہوں گے۔ اسی رنگ سے رنگا جاتا تھا اور پھر سیپی کے انہی رنگین ٹکڑوں کو نیچے سے اوپر تک میناروں کے چاروں طرف چسپاں کر دیا گیا تھا' چمک اس میں انہی صدفی ٹکڑوں کی تھی' کیا اولوالعزمیاں تھیں؟ بیدر میں اس قسم کی رنگین عمارتوں کے بنانے کا عام رواج تھا۔ قلعہ میں بھی ''رنگین محل'' اسی صنعت کا نمونہ ہے۔

(6) مولانا عبداللہ نے بہار کے اضلاع پٹنہ و مونگیر خصوصاً ضلع مونگیر میں جو کام انجام دیا وہ یادگار رہے گا۔ خدا جانے کتنے مسلمانوں کے گھر سے بت نکلوائے اور شراب وتاڑی سے لوگوں کو تائب کیا۔ آخر میں تو آپ کے دست حق پرست پر ضلع مونگیر کے ایک راجہ آف مرچا مسلمان بھی ہو گئے' جن کا خاندان جموی سب ڈویژن کے مسلمان رئیسوں میں بحمد اللہ اس وقت امتیاز رکھتا ہے۔ عقیدہ محمد یہ عربی میں آپ کی اچھی کتاب ہے۔ اس کے سوا اردو میں بھی چند رسالے ہیں۔

(7) شکرانواں ضلع پٹنہ کا مشہور گاؤں ہے۔ مولانا ان اطراف کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے لاکھوں روپے کی جائیداد کے مالک تھے' لیکن علم کا نشہ آخر وقت تک سوار رہا۔ نادر مخطوطات کا ایک قیمتی کتب خانہ آپ نے شکرانواں میں مہیا کیا' تفسیر جریر طبری کا کامل نسخہ تیس جلدوں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ اب چھپ جانے کے بعد تو اس کی اہمیت نہ رہی' لیکن طباعت سے پہلے اس کتاب کے کل

تین نسخے ساری دنیا میں پائے جاتے تھے جن میں ایک نسخہ شکرانواں کا تھا۔ ہزار ہا ہزار روپے خرچ کر کے آپ نے اس کی نقل مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے حاصل کی تھی۔ آپ کے کتب خانہ میں حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا جمع ہو گیا ہے شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبدالبر محدث کی کتابیں استذکار اور تمہید آپ کے یہاں موجود ہیں۔ محلی ابن حزم جیسی نایاب کتاب کی چودہ جلدیں آپ کے یہاں میں نے دیکھی تھیں' طباعت سے پہلے ان کا دیکھنا ہی میرے لیے باعث فخر تھا۔ پٹنہ کا مشہور مشرقی کتب خانہ خدا بخش لائبریری کے متعلق مولانا کے صاحبزادے برادر محترم مولانا عبدالمتین نے مجھ سے بیان کیا کہ مولوی خدا بخش خاں اور مولانا رفیع الدین ان کے والد کے درمیان گہرے تعلقات تھے' نادر کتابوں کے ذوق میں اضافہ اور ان کی نشاندہی وغیرہ میں بہت زیادہ مشورہ ان کے والد ہی نے خدا بخش خاں کو دیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خاں صاحب تو ایک وکیل آدمی تھے۔ اس لائبریری کی تاریخ میں اس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہیے کہ اس کے نادر مخطوطات کے پیچھے ایک ملا کا علمی مشورہ بھی چھپا ہوا تھا۔ واللہ اعلم یہ کہاں تک صحیح ہے کہ ''شرح عون المعبود'' جو ''غایۃ المقصود'' کا خلاصہ ہے مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اس کی تالیف میں مولانا رفیع شکرانوی کی شرح ابوداؤد سے بہت نفع اٹھایا' لیکن افسوس کہ خود مولانا شکرانوی کی شرح ضائع کرادی گئی یا ہوگئی۔ مولانا رفیع نے شکرانواں میں ایک عربی پریس بھی قائم کیا تھا اور ابن قتیبہ کی ''تاویل الحدیث'' کے کچھ اجزاء اس میں طبع بھی ہوئے' لیکن یہ پریس چل نہ سکا۔ ایک نو مسلم عالم کو مولانا نے ہبہ کر دیا جو گیلانی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

رمضان پور بہار میں رئیسوں کی مشہور بستی ہے' انہی رئیسوں میں آپ بھی تھے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں مثلاً الامعاف' مفید الاحناف' مرغوب القلوب وغیرہ۔ آخری کتاب طب یونانی کے نقطہ نظر سے اغذیہ یا ماکولات۔ مشروبات کی بہترین کتاب ہے۔ آپ کا تذکرہ ''تذکرہ علماء حال'' کے (ص 49) میں بھی درج ہے۔

(8) حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کے والد ماجد بہار کے رہنے والے تھے' ٹونک میں نواب کے طبیب خاص تھے' بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ستر بہتر سال کی عمر میں وفات ہوئی' آخر عمر تک سو رکعتوں نفلی نمازوں کا یومیہ التزام باقی رہا۔ یہ تہجد' اشراق' چاشت کے سوا تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت بھی ملی تھی۔

(9) بہار کے مشہور مدرسہ عزیزیہ اور صغریٰ وقف اسٹیٹ آپ ہی کی کوششوں کا کارنامہ ہے۔

(10) اب فقیر کا مسکن یہی مکان ہے اگرچہ اس کی صورت بدل گئی ہے' بجائے خام کے پختہ دو منزلہ ہو گیا ہے' ناصیہ پر ''محراب الہدایت والارشاد گیلانی'' اس کا تاریخی نام لکھا ہوا ملے گا۔ کچھ مالی خولیائی تصورات تھے جس کے تحت یہ نام رکھا گیا تھا۔ قرآن میں مسجد، صوامع، بیع کے ساتھ ''محراب'' کا ذکر بھی چند مقامات پر کیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مذہبی عمارتوں کی ایک قسم خاص یہ بھی تھی۔ کیا شیطان اور کفر سے حرب و مقابلہ کی تجویزیں اس میں سوچی جاتی تھیں۔ مادہ کچھ اسی طرف ایما کرتا ہے۔ (ا) ہدایت جن تک نہیں پہنچتی ان کے لیے ہدایت اور ہدایت کے بعد جنہیں ارشاد و رہنمائی کی ضرورت ہے ان کے لیے ارشاد ان ہی تجویزوں کی طرف منسوب کر کے کچھ ارادہ تھا جو شاید ارادہ سے آگے نہ بڑھے کہ وقت گزر گیا قبر جھانک رہی ہے۔ عزرائیل کی پیشانی طلوع ہو رہی ہے۔ غرتکم الامانی (آرزوؤں نے تم کو دھوکے میں ڈال دیا)۔ جس حسرت نصیب کا یہ انجام ہے' اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ شاید دوسروں کو کفرستان ہند کے اس طول و عرض میں ''محاریب'' بنانے کی توفیق ہو کہ اسلام اس ملک میں نرغہ میں ہے۔ ان پادریوں سے عبرت گیر ہونا چاہیے جو نہ اس ملک کی زبان سے' معاشرت سے واقف ہیں نہ یہاں کا موسم ان کے موافق ہے لیکن جس قوم کے بزرگوں نے اس کو اس ملک کے چپہ چپہ پر آباد کر دیا تھا اب اسی قوم کے فرزندوں کا کیا فرض ہے؟ جو ہدایت یافتہ ہیں ان کے ارشاد کی ضرورت بھی یقیناً ضرورت ہے۔ لیکن کروڑوں کی تعداد جو ان لوگوں کی ہے جنہیں ہدایت کی کوئی کرن بھی ہاتھ نہیں آئی ہے' کیا وہ مستحق توجہ نہ تھے۔ لفظ ''محراب'' کاش جذبات میں تلاطم پیدا کرے۔

(11) ایک لاولد مسلمان خاتون بی بی صغریٰ مرحومہ نے بیس سے پچیس لاکھ روپے کی قیمتی جائیداد جو وقف کی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا اسماعیل رمضان پوری مرحوم جو مسماۃ کے اس اسٹیٹ کے منیجر تھے ان ہی کے ایماء سے اس نیک دل خاتون نے اس وقف کے بہت بڑے حصے کو ایک اسلامی تعلیم گاہ کے لیے مختص کر دیا جو اب مدرسہ عزیزیہ کے نام سے بہار میں قائم ہے' بہار کی حکومت نے ''جامعہ عربیہ'' کا ایک نظام اس صوبہ میں جو قائم کیا ہے' جس کے تحت تحتانی' وسطانی فوقانی مکاتب (اسکول) کے سوا کلیات متوسطہ (انٹر میڈیٹ کالج) ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور مدرسہ شمس الہدیٰ و مدرسہ عزیزیہ غالباً یہی دونوں مدرسے کلیہ عالیہ (اعلیٰ کالج) کی حیثیت رکھتے ہیں' عالی جناب سید عبدالعزیز صاحب صدر المہام علالت وامور مذہبی سرکار آصفیہ جب حکومت بہار کے وزیر تعلیم تھے تو ایک کمیٹی سے اس ''جامعہ عربیہ'' کا نصاب بنوایا تھا جس کا ایک رکن یہ خاکسار بھی تھا' مولانا سید سلیمان ندوی اس کمیٹی کے صدر تھے۔

پھر نورالدین محمود شہید غازیؒ کے حالات میں یہ شعر بھی ملا۔

جمع الشجاعة والخشوع لربه ۔۔۔۔۔ ماا حسن المحراب فی المحراب

جس میں ان ہی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (فالحمدللہ)

(12) ''آئین اکبری'' میں ابوالفضل نے ہندوستان کی مداحی کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: ''از کمی آب سرد وافزونی گرمی وکمیابی انگور و خربزہ وگستردنی شترطنزگاہ کار آگاہاں بود'' کار آگاہاں سے غالباً بابر کی طرف اشارہ ہے' جس نے ''تزک'' میں ''خربزہ نے انگور نے برف نے'' کے الفاظ سے ہندوستان کو طنز گاہ بنایا تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس طنز کے ازالہ کے لیے بھی اور ترکستانی امراء کے لیے ہندوستان کی گرمی ناقابل برداشت بنی چلی جارہی تھی'' گیتی خداوند (اکبر) ہمہ راچارہ گر آمد'' ابوالفضل کے گیتی خداوندگی چارہ گری ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ پانی کو ''بشورہ سرد کردن رواج گرفت واز شمالی کوہ (ہمالہ) برف آوردن کہ ومہ دانست'' گویا ہندوستان کے ''کہ ومہ'' چھوٹوں بڑوں کی رسائی عہد اکبری ہی سے برف تک ہونے لگی' اسی کے بعد ''خس'' کا قصہ بھی لکھا ہے کہ ''بیخ بود بویا بس خنک آں راخس گویند بفرمائش گیتی خدیو (اکبر) ازاں نے بست خانہا ساختن رواج یافت وچوں آب افشانند زمستانے بستاں پدید آمد'' جس سے معلوم ہوا ہے کہ خس اور خس کی ٹٹیوں کا رواج اکبر کے زمانہ سے اس ملک میں شروع ہوا۔ کیا شبہ ہے کہ اکبر کی ذہانت اور طباعی میں اور سچ پوچھیے کہ بگاڑنے والوں پر طبیعت اسی لیے تو زیادہ بگڑتی ہے کہ اسلام کے ایسے قیمتی سرمایہ کو چند ذاتی عداوتوں کے بت پر نثار کر دیا گیا اور ہندی اسلام کے جگر پر ایسا کاری زخم لگا یا کہ بایں ہمہ چارہ گری آج تک اس کی کسک محسوس ہو رہی ہے۔ خس کی ایجاد پر خیال آیا کہ حجاج بن یوسف جب بنی امیہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر ہو کر آیا' تو طائف جو حجاج کا وطن تھا اس کے سرد موسم کی عادت نے کوفہ کو حجاج کے لیے جہنم بنا دیا۔ لکھا ہے کہ قریب قریب خس خانہ کے حجاج نے بھی سبز بید کی شاخوں سے ایک چیز بنائی تھی۔ ابن عساکر میں ہے کہ حجاج گرمیوں میں ''فی قبہ من خلاف ای صفصاف'' بید کی شاخوں سے بنائے ہوئے ایک قبہ میں رہتا تھا ان شاخوں کو پھاڑ پھاڑ کر بیچ میں برف سقفھا بالثلج وھو یقطر علی۔ بھری جاتی تھی وہی ٹپک ٹپک کر حجاج پر پڑتی رہتی تھی۔

(13) حضرت مولانا محمد قاسمؒ دارالعلوم دیوبند کا تو دعویٰ تھا کہ تشریعی قوانین ہی کی حد تک نہیں بلکہ تکوینی قوانین میں بھی قدرت کی کارفرمائیاں اسی اصول کے تحت ظاہر ہوتی ہیں' انہوں نے مثال دی ہے کہ ہوا پانی کا چونکہ ہر شخص محتاج ہے' اس لیے ہر جگہ یہ چیزیں میسر آتی ہیں۔ لیکن الماس' یاقوت' لعل وزمرد کی کوئی حقیقی ضرورت آدمی کو نہیں ہے' نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اتنا نایاب کر دیا گیا کہ بادشاہوں اور نوابوں کے سوا عام لوگوں کو ان کا دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

(14) تفضل حسین خاں اس زمانہ کے ان مولویوں میں ہیں جنہوں نے علوم عربیہ کی تکمیل ملاحسن فرنگی محلی' مولوی وجیہہ' مولوی محمد علی مہندس وغیرہ سے کر کے ''زبان انگریزی ویونانی ولاطینی نیکوی دانست'' لکھا ہے کہ کلکتہ میں انہوں نے یورپ کے فاضلوں سے یونانی اور لاطینی زبان سیکھی اور ان زبانوں پر ان کو اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ بے تکلف ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ انہوں نے مغربی زبان کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر متعدد کتابیں فن ہیئت اور جبر ومقابلہ میں لکھی ہیں جو افسوس کہ اب نہیں ملتیں' واللہ اعلم طبع بھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک استاذ مولوی عثمان جعفری بیان کرتے ہیں کہ ان کے وطن مچھلی شہر (ضلع جونپور) میں تفضل حسین خاں کی

کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن جن صاحب کے پاس ہیں وہ دوسروں کو نہیں دکھاتے۔

(15) مولوی رحمان علی کے نام کا عجب لطیفہ ہے۔ اس نام کی وجہ سے ہمیشہ ان کی کتاب ''تذکرۂ علماء ہند'' کے دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔ سمجھتا تھا کہ کسی غیر عالم آدمی کی کتاب ہے، لیکن اتفاقاً ایک دن نظر پڑ گئی، پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آدمی تو عالم ہیں پھر ان کا یہ نام ایسا کیوں تھا، اس کا خطرہ برابر دل میں لگا رہتا، اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام عبدالشکور تھا، لیکن ریوان کی ہندو ریاست میں جب ملازم ہوئے تو ولی عہد ریاست نے کہا کہ عبدالشکور کا لفظ میری زبان پر نہ چڑھے گا، اس نے ان کا نام رحمان علی رکھ دیا' مجبوراً مولوی صاحب نے قبول کر لیا۔

(16) شطرنج بازی کے متعلق اس میں شک نہیں کہ حنفی مذہب کی رو سے اسے جو کچھ بھی آپ چاہے قرار دیجیے۔ لیکن بہر حال اگر امام شافعیؒ جیسے امام متقی نے اس حنفی فتوے سے اختلاف کیا ہے اور یقیناً کیا ہے تو کیا اس کی شناعت وہی باقی رہتی ہے جو متفقہ جرائم کی ہے۔ حنفی عالم کو بھی حکم لگاتے ہوئے امام شافعی جیسے امام کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے اور مولانا کے فعل کی توجیہ کے لیے شاید یہ عذر نا قابل استماع نہیں قرار پا سکتا۔

(17) ملا صاحب کے ایک ہموطن عالم'' حدائق الحنفیہ'' کے مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''جہانگیر' شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں آپ کی بڑی عزت وتوقیر تھی اور آپ شہزادگاں کے استاد تھے چنانچہ شاہ جہاں بادشاہ نے دو دفعہ میزان میں تلوایا اور ہر دفعہ چھ چھ ہزار روپیہ دیا۔ آپ کو سیالکوٹ میں سوا لاکھ روپے کی جاگیر ملی ہوئی تھی جو آپ کی اولاد کے پاس نسلاً بعد نسلٍ موجود رہی۔ آخر میں گھٹتے گھٹتے اب سرکار انگلشیہ کے عہد میں بسبب انقطاع خاندان کے بالکل ضبط ہو گئی۔''
(حدائق۔ ص415)

(18) یہاں اس کا ذکر شاید مناسب نہ ہو کہ ہندوستان کے متعلق عام طریقہ سے جو یہ مشہور ہے کہ رشی منی لوگ جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے تھے اور وہیں تعلیم وتعلم درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا' ان آشرموں کا جو نقشہ کتابوں میں کھینچا جاتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بظاہر بہت دلآویز معلوم ہوتا ہے۔

(19) اس تلمیح سے تو اہل علم واقف ہی ہیں لیکن ناواقفوں کے لیے لکھا جاتا ہے کہ قرآن میں اس قصہ کا ذکر ہے۔ طالوت بادشاہ نے اپنی فوج کو حکم دیا تھا کہ راستہ میں نہر آئے گی اس سے کوئی پانی ایک چلو سے زیادہ نہ پیے۔

(20) آج کل اب یہ خانقاہ پن چکی کے نام سے مشہور ہے، اب اس گدی کا کوئی وارث باقی نہیں رہا۔ حکومت نظام کے محکمہ امور مذہبی کی نگرانی میں ہے، عجب پُر فضا مقام ہے۔ ایک بہتے ہوئے نالے کے اوپر خانقاہ کی عمارت بنی ہوئی ہے، میلوں سے ایک نہر نکال کر خانقاہ تک لائی گئی ہے جو ایک بلند دیوار سے چادر بن کر خانقاہ کے حوض میں مسلسل گرتی رہتی ہے، دیکھنے کا سماں ہوتا ہے۔ اس خانقاہ میں کہتے ہیں کہ ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، لیکن دستبرد زمانہ نے اس کو تباہ کر دیا، کچھ کتابیں باقی رہ گئی ہیں، خانقاہ کے ساتھ ایک جاگیر بھی ہے۔ امور مذہبی کا محکمہ جاگیر کی آمدنی سے تعلیمی سلسلہ کو جاری کرنا چاہتا ہے۔ واللہ یوفقہ لمایحب و یرضی۔ مولانا آزاد مرحوم کا قیام اس خانقاہ میں زیادہ تر ان کتابوں ہی وجہ سے تھا۔ میں نے سنا ہے کہ کتب خانہ کی ایک ایک کتاب جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں، مولانا کی نظر سے گذری ہوئی تھی۔

(21) اپنی خاندانی خودنمائی کا خیال بار بار بعض عجیب وغریب واقعات کے ذکر میں مانع آجاتا ہے۔ مولانا محمد احسن گیلانی جن کے مدرسہ گیلانی کا ذکر کسی موقع پر کیا گیا ہے، ایسے معتبر ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے جس کا انکار مشکل ہے، واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا گیلانی جب لکھنؤ کی ایک مسجد جو دبیر الدولہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے، قیام فرما تھے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں بادشاہ وقت غالباً واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیر الدولہ پر نازل ہوا، قید کر دیئے گئے۔ خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اس موقعہ پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیر الدولہ کے اہل خاندان کے لیے ممکنہ امداد بہم پہنچائی تھی، چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا، دبیر الدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو مولانا کی مواساۃ وہمدردی کی خبر ہوئی۔ بہت متاثر ہوا اور ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی، اس کا حکم لے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا۔ پہلے تو مولانا نے رسمی لیت ولعل سے کام لیا لیکن وہ بضد تھا کہ اس کی حقیر رقم کو قبول کیا جائے، آخر جان

چھڑانے کے لیے مولانا نے فرمایا۔ آج شام ہو گئی ہے، کل صبح لینے دینے کا نظم کروں گا، شب درمیان تھی۔ اسی سے نفع اٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد فرما دیا گیا کہ دبیر الدولہ کے اس روپے سے نجات حاصل ہو، اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا سرمایہ نہ تھا، مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد کو مراد آباد میں متوطن ہو کر وہیں متوفی ہوئے، ان کے حوالے کر کے سیدھے رام پور تشریف لے گئے اور پھر دبیر الدولہ کو اس کا پتہ چلنے نہ دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہو گیا۔ ساری عمر گیلانی جیسے کوردہ گاؤں میں گذار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

(22) دلی میں خصوصاً اور ہند میں عموماً اس زمانہ میں کس کس قسم کے کپڑوں کا رواج تھا، اس کا کچھ تو اندازہ میر خورد کی مذکورۂ بالا عبارت سے ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحئی ناظم ندوہ مرحوم نے ''نزہتہ الخواطر'' میں عہد علائی کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کپڑوں کے متعلق لکھا ہے' فی تھان ان کپڑوں کی اس زمانہ میں کیا قیمتیں تھیں، ترجمہ اس کا یہ ہے:

چیرہ دہلی: 16 تنکہ۔ چیرہ کونکر: 20 تنکہ۔ سری صاف اعلیٰ قسم۔ 5 تنکہ، متوسط 3، اونی دو تنکہ، سلائی اعلیٰ چار تنکے، متوسط 3، اونی 2، الکرباس، الاعلیٰ 20 گز کا تھان ایک تنکہ، کرباس متوسط 30 گز کا تھان دو تنکے، کرباس اونی چالیس گز کا تھان = ایک تنکہ۔ سادہ کرباس دس جیتل۔

اور یہ فہرست تو اس زمانہ کی ہے، جب مسلمانوں نے ہندوستان پہنچ کر یہاں نئے صناعات اور دستکاریوں کو مروج کیا ہے۔ اس کے بعد مغلوں کے عہد تک ان میں جو ترقیاں ہوئی ہیں صرف کپڑوں ہی کے متعلق ان کی فہرست طویل ہے۔ ''آئین اکبری'' میں ابوالفضل نے عہد اکبری کے ریشمین اور سوتی کپڑوں کی جو فہرست دی ہے اسی کو پڑھ جائیے۔ آپ کو ریشمی کپڑوں میں مخمل زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، طاس گجراتی، دارائی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، خارا، اطلس، خطائی، خز، مخمل فرنگی، خانی، سہ رنگ قطنی، کتاں، تافتہ، انبری، مطبق۔ یہ پچاسوں نام تو صرف ان کپڑوں کے ہیں جو ریشم یا ریشم کی ترکیب سے تیار ہوتے تھے، سوتی کی فہرست بھی کچھ چھوٹی نہیں ہے۔ جوتار، ململ، نین سکھ، سری، صاف گنگا جلی، بھرونی، سالور، بہادر شاہی، گریہ سوتی، شیلہ دکن، مہرکل، سہن، جیونہ، اساوئی، محمودی، پنچولیہ، جسولہ، جھنٹ، وغیرہ وغیرہ۔

فائدہ: تنکہ کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ تنخواہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور اب وہی ٹکہ بن گیا۔ ایک تولہ کا سکہ تھا، چاندی کا ایک سولہ چالیس جیتل کے مساوی تھا، جیتل تانبہ کا سکہ ایک تولہ کا تھا، لیکن ''ملفوظات عزیزیہ'' میں جیتل و تنکہ کے متعلق شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے ''جیتل بجائے دمڑی از قسم فلوس خورد مضروب در زمان سابق رائج بود و تنکہ از قسم ہشد ہات چنانچہ ہم و بخارا رائج است۔'' (ملفوظات۔ ص 3)

(23) لالا شاید اس زمانہ میں پیار کا کوئی کلمہ تھا، بڑے چھوٹوں کو اس لفظ سے تعبیر کرتے تھے، غالباً بداؤں کا للا کا لفظ اسی کی یادگار ہے۔ ''یاران'' سلطان المشائخ کی جماعت کی اصطلاح تھی۔ ''مریدان خاص'' جو عموماً صحبت عالی میں رہتے، ان کو آپ ''یاران'' کے لفظ سے موسوم کرتے تھے۔

(24) جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہوں کے سامنے سجدہ گذاری کی رسم اکبری بدعات میں سے ایک بدعت ہے، سلاطین اسلام میں اس کا رواج نہ تھا، اکبر کے زمانہ میں اسی قاضی بدخشی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجددؒ نے اس رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس کی وجہ سے گو کچھ دنوں کے لیے حضرت کو جیل کی سزا بھگتنی پڑی جس کی تفصیلات مجدد نمبر ''الفرقان'' میں ملیں گی۔ بحمد اللہ مجدد صاحب کی کوشش بارآور ہوئی اور شاہجہاں بادشاہ جس وقت تخت نشین ہوئے۔ ''اول حکمے کہ اصدار یافت منع سجدہ بود فرمودہ کہ سزاوار ایں تعظیم ذات معبود حقیقی ست۔'' (سیر المتاخرین۔ ص 255)

(25) شیخ علائی سید محمد جون پوری کے خلفاء میں ہیں' مخدوم الملک سلطان پوری کے اشارہ سے سلیم شاہ نے شیخ علائی کو کوڑے سے پٹوایا، کمزور آدمی تھے، چند کوڑوں کے بعد روح پرواز کر گئی۔ امراء چغتائی سے مراد تیموری اور مغل امراء ہیں، ان تورانی امیروں پر حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کا بہت اثر تھا، اسی لیے ان کے دیکھا دیکھی نقشبندیوں میں شریک ہو گئے، ہمدانیہ درویشوں کا ایک خاص گروہ ہندوستان

میں تھا جن کے سرخیل سید علی ہمدانی تھے، بعض خاص اشغال و اوراد کی وجہ سے ان لوگوں کو ایک امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عراقیہ سے مراد شیعہ ہیں۔ ہمایوں کی آخری کامیابی چونکہ ایران کے قزلباشوں کی امداد سے ہوئی تھی' جس کی وجہ میرے خیال میں ایرانیوں کا وہ خطرہ تھا، جو شیر شاہ سے ان کو پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا رفیع الدین نے صفوی کے حالات میں لکھا ہے کہ شیر شاہ نے ان سے کہا تھا کہ ہندوستان کے چند باغیوں سے فرصت ہو لے تو میں آپ کو سلطان ترکی کے پاس بھیجوں گا کہ وہ ایران پر اس طرف سے حملہ کریں اور میں ہندوستان سے بڑھوں گا۔ یوں قزلباشوں کا جو فتنہ ایران میں اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ زبردستی لوگوں کو شیعہ بنایا جا رہا ہے ختم ہو جائے گا، غالباً اس خطرہ نے ایرانی حکومت کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ لیکن ہندوستان میں شیعوں کے اقتدار حاصل کرنے کا یہ ذریعہ بن گیا۔ ورنہ ہمایوں سے پہلے شمالی ہندوستان ہمیشہ ایک ہی حنفی عقیدہ کے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا رفیع الدین صفویؒ کا تذکرہ شاید کتاب میں کسی اور موقع پر بھی سطور بالا میں جس اہم تاریخی انکشاف کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے' یعنی ہمایوں کی امداد ایرانی حکومت نے دوبارہ ہندوستان کے واپس دلانے میں کیوں کی۔ تاریخ کا یہ کتنا اہم سوال ہے۔ نیز ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں شیعہ مذہب کی تاریخ کا بھی یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ میں نے اسی کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس لیے کہ اسے میرا ذاتی خیال نہ سمجھا جائے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی جو شیر شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے ہیں ان کی بجنسہٖ عبارت درج کرتا ہوں، یہ لکھ کر مولانا رفیع الدین صفوی جنہیں سکندر لودی نے ''الحضرۃ القدسیہ'' کا خطاب دے رکھا تھا، آگرہ میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے۔ شیر شاہی عہد میں انہوں نے بادشاہ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ حجاز میں قیام کرنا چاہتے ہیں جس کی اجازت دی جائے۔ جواب میں شیر شاہ نے کہا ''شما را بہ مصلحتے نگاہ داشتہ ام و آں این است کہ داعیہ (ارادہ) دارم کہ در اندک فرصت بعون ایزد تعالیٰ و تقدس عرصہ دل کشائے ہندوستان را از خار کفر پاک ساختہ و چند قلعہ کہ ماندہ عنقریب باندک توجہے تسخیر کردہ از کنار دریائے شور گذشتہ تا قزلباش (صفویہ ایران) کہ سد راہ جماعت حاج و زوّار بیت الحرام گشتہ بدعتے در دین قویم و ملت مستقیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کردہ محاربہ کنم وشما را از انجا بوکالت در رسالت نزد سلطان روم فرستم تا میان من و او عقد برادر دینی وابستہ خدمتے از درحرم زاد ہا اللہ شرفا از وو التماس برائے من بگیرید آں گاہ من ازیں طرف و خوندگار روم از اں طرف آمدہ قزلباش را از میاں برداریم و ہر گاہ سلطان روم بر سر اومی آید قزاق شدہ رو بایں طرف می نہد و بعد از معاودت رومی باز بہ مکان خویش مراجعت می کند اما اگر از ہر دو جانب بایں لشکر و کثرت جمعیت کہ در ہندوستان ست و با آں شوکت و آتش باری کہ در روم است طاقت مقاومت قزلباش است معلوم ست ہر چند ملاحظہ می کنم برائے ادائے این پیغام غیر از شما کسے را لائق نمی بینم و محض برائے حصول ایں مطلب دل بر رخصت شما نمی توانم نہاد'' (ج 1، ص 371) اور اس سے وہ راز سامنے آجاتا ہے' جس نے قزلباشوں کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ شیر شاہی حکومت ان کی راہ کا کانٹا تھی اور تیمور کی اولاد سے ان کو اطمینان تھا کہ یلدرم کی اولاد یعنی سلاطین ترکی سے یہ ساز باز نہیں کر سکتے' لیکن افسوس فلک حقہ باز نے کالنجر کے قلعہ کے سامنے شیر شاہ کے اس عجیب و غریب پروگرام کو جلا کر خاک کر دیا۔ ورنہ میں نہیں جانتا کہ اگر کچھ بھی فرصت اس بہاری بادشاہ کو مل جاتی تو جس جنگی مہارت کا ثبوت اس نے کل آٹھ دس سال میں پیش کیا تھا ان کو دیکھتے ہوئے دنیا کے نقشہ کو کس حال میں چھوڑ کر وہ جاتا۔ ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون۔

(26) حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متعلق فقیر نے ایک مستقل مقالہ لکھا ہے' جس میں اکبر کے دین الٰہی کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔ اسلام سے نفرت کرنے میں اکبر کو کہاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ حال میں ایک اور چیز اس باب میں ملی جو باعث عبرت ہے۔ راجہ سانبھر کا بیٹا منوہر نامی نے فارسی میں بہت اچھی دستگاہ پیدا کی تھی۔ توسنی تخلص کرتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ اکبر اس کو بہت مانتا تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے: ''صاحب حسن غریب و ذہن عجیب است۔'' محبت کی وجہ سے اکبر شروع میں اس کو ''محمد منوہر'' کے نام سے پکارتا تھا۔ لیکن جب اس کا دوسرا رنگ ہوا تو بجائے محمد منوہر کے مرزا منوہر نام رکھا گیا۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ منوہر کا باپ راجہ سانبھر جس کا مون کرن نام تھا ''باوجود کفر شرف و افتخار و مباہات بہمیں محمد منوہری گفت'' کا فرتو اس پر فخر و مباہات کرتا تھا اور جو ہمایوں کے گھر پیدا ہوا تھا

اس کو اتنا برگشتہ کیا گیا کہ "ہر چند مرضی طبع بادشاہی نہ بود۔" (دیکھو منتخب۔ ج3، ص1-3)

(27) ملا صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ "بادشاہ بہ عیادت او (فیضی) در دم اخیر رفتند بانگ سگ بروے ایشاں کرد" یعنی بحران اور بے ہوشی کی حالت میں کتے کی آواز منہ سے نکال رہا تھا' ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اکبر "ایں معنی را خود بر سر دیوان نقل می فرمودند" یہ بالکل ممکن ہے کہ آخر زندگی کے ان ہی دردناک تجربوں تیز جوان بیٹوں (دانیال ومراد) کا شراب خواری کی لت میں گرفتار ہو کر عین شباب میں یکے بعد دیگرے اکبر کے سامنے مرنا جس میں نہ جوگ کام آیا اور نہ کایاپلٹ کے بلند بانگ دعوے۔ جہانگیر کا بھی شراب میں استغراق اور اس کے ساتھ علانیہ بوڑھے باپ سے سرکشی یہ اور اسی قسم کے بیسیوں ناکامیاں اکبر پر اثر انداز ہوئی ہوں' پنڈتوں کے مواعید کہ آپ کی عمر ہزار سال کی ہوگی۔ ان کا جوتش یہی کہتا تھا۔ ان سب کا راز کھلا ہوگا اور غرور واستکبار جو ابتدائی زندگی کی غیر معمولی فاتحانہ کامیابیوں نے اس میں پیدا کر دیا تھا، اس کا نشہ پھٹا ہوگا، کہنے والے جو کہتے ہیں کہ آخر میں اس کی زندگی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی' کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہوا ہو۔ اس کے قرناء ابوالفضل' بیر برنامرادی کی موت سے مر چکے تھے۔ اب ورغلانے والا بھی تو کوئی باقی نہ رہا تھا۔ کوئی مارا گیا، کوئی گم ہو گیا، کوئی خون تھوک کر دنیا سے روانہ ہوا، اکبر اب تنہا تھا، نورتن کے ایک ایک رتن جدا ہو چکے تھے۔

(28) پٹنہ میں خان بہادر مولوی محمد حسین وکیل مرحوم جو آخر میں بہار گورنمنٹ میں تعلیمات کے وزیر بھی ہو گئے تھے کم از کم تیس پینتیس سال تک میں نے ان کو دیکھا کہ دس بارہ طالب العلموں کو وہ اپنے یہاں سے کھانا بھی دیتے تھے اور رہنے سہنے کا ان کے نظم بھی فرماتے تھے خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے اس بندہ کی خاموش امداد نے کتنے غریبوں کو بی اے اور ایم اے پاس کرنے کا موقع دیا۔ ان کی وجہ سے کتنے غریب مسلمان خوش حال زندگی تعلیم پانے کے بعد گذار رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ واحد مثال نہ تھی بلکہ پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور ہر شہر میں ایسے مسلمان ارباب خیر پائے جاتے تھے اور یہ اسی پرانے دستور کا اثر تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله و كفى والصلاة والسلام على عباده الذين اصطفى

بجائے ایک جلد کے وہی کتاب جو ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں شروع ہوئی تھی' دو جلدوں میں تقسیم ہو گئی۔ پہلی جلد کے بعد دوسری جلد اب آپ کے سامنے ہے۔ جنگ کی افراتفری میں جہاں دنیا کے دوسرے بڑے چھوٹے کام متاثر ہو رہے ہیں' اشاعت وطباعت کتب کا مسئلہ بھی حصہ رسدی کے مطابق مصائب کا شکار ہے۔ کتاب کی اس دوسری جلد کی کاپی دتی میں لکھی گئی۔ چھپنے کے بعد حیدرآباد آئی۔ اس طول عمل کی وجہ سے جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں' ان کی تفصیل

سفینہ اپنا کنارہ جب آلگا غالبؔ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

البتہ اس تگ ودو اور ذمہ داریوں کو مختلف حضرات کے سپرد کرنے کا خمیازہ کہیے یا بحالتِ بے کسی ومسافرت اس غریب کتاب کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ عام طباعی اغلاط کے دو جگہ ایسی ناقابل عفو فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔ پڑھنے سے پہلے ہی ناظرین کو ان سے واقف کر دینا ضروری ہے:

کتاب کے ایک صفحہ میں ایک روایت کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ کس کتاب کی یہ روایت ہے' اس کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن بحمد اللہ بعد کو امام بخاری کی کتاب ''ادب المفرد'' میں وہ روایت مل گئی۔ اس لیے پہلی عبارت کو قلمزد کر کے کتاب کا حوالہ دے دیا گیا لیکن کاتب صاحب کی مہربانی کہ انہوں نے اسے قلمزد نہیں فرمایا۔ گویا روایت کے مل جانے اور نہ ملنے کا ذکر اس میں درج کیا ہے۔

اسی طرح (ایک) صفحہ میں ایک نوٹ جس کا اندراج حاشیہ میں ہونا چاہیے تھا' کاتب صاحب نے اصل کتاب کی عبارت میں اس کو اس طرح شریک کر دیا ہے کہ مضمون ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ اربابِ نظر سے توقع ہے کہ ان غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔

باقی عام غلطیوں کے متعلق کیا لکھا جائے۔ غلط ناموں کا اضافہ عموماً مفید ثابت نہیں ہوا ہے۔ مشکل ہی سے پڑھنے والے ان سے نفع اٹھاتے ہیں' کاغذ کی گرانی کے اس زمانہ میں اس لیے اس کے اضافہ کی ہمت نہ ہوئی۔

کتاب کی پہلی جلد کو پڑھ کر مختلف دوائر اور حلقوں میں اس کا جو اثر لیا گیا' مسکین مصنف کے توقعات سے وہ بہت زیادہ ہے۔ البتہ ترتیب اور مضامین کا عنوانوں سے خالی ہونا ان دونوں باتوں کی بجا شکایت لوگوں نے ضرور کی ہے لیکن کن مجبوریوں سے یہ نقص رہ گئے ہیں' اب اسے کیا بتایا جائے۔ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ اشاعت میں

ان شاء اللہ ان کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ خصوصاً ذیلی عنوانوں کا اندراج اصل کتاب میں اور ان ہی کے اعتبار سے مفصل فہرست کا شروع میں اضافہ بہت ضروری ہے۔ البتہ ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی' اس میں آورد کی بدمزگی کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو' ان کے لیے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آبپاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مدواری کھاتہ ان کو بنا دیا جائے۔ ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں اس کو چھوڑ دیا جائے۔ لاکھوں مرتبہ کتابوں کے ساتھ آخر کیا بگڑے گا اگر ایک غیر مرتب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو۔

منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے' بڑا مقصد ''نظام تعلیم کی وحدت'' کے نظریہ کو پیش کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور ارباب سعی وعمل نے اسے مستحق توجہ قرار دیا ہے بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ ''اس تعلیمی خاکے'' کو مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں۔ سید صاحب موصوف نے ''معارف'' ماہ جولائی 1945ء میں شذرات کے تعارفی نوٹ کے ساتھ اس خلاصے کو شائع بھی کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اس جلد کے ساتھ اس خلاصہ کو بھی اس کا ضمیمہ بنا دیا جائے جو یہ ہے:

ضمیمہ

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت

مسلمانوں کے تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب ''نظام تعلیم وتربیت'' میں پیش کیا گیا ہے جو سالہا سال کے غور وفکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے' اس لیے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سردست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے' وہ کیا ہیں۔

(1) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہو جانے کے بعد حکومت مسلط نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (سکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قائم کیا' مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے

مسلمانوں میں بتدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بعد پیدا ہوتا چلا جارہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے' ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے۔ عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں۔ یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا ساتھا لیکن وہ اپنے پیغمبرؐ کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو' وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں' اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالت میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہو تو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائے گی۔

(2) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کر رہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظورہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے' تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہو کر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں' اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(3) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہنچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے' لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بے چین ہیں۔ خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں' ان سے بحث میں طوالت ہوگی۔ اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب ''تعلیم وتربیت'' میں میں نے کیا ہے' ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومتِ مُسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں' اس کی دوئی اور اثنینیت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے۔ اسی لیے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریہ وحدتِ نظامِ تعلیم'' رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومت مسلطہ سے قبل مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا' عام طور پر ''درسِ نظامیہ'' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے' اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم ونثر وانشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی

کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ابتدا سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق ''جلالین'' (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی ''شرح وقایہ'' اور ''ہدایہ'' لیکن ''ہدایہ'' کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو ''شرح وقایہ'' میں پڑھائے جاتے تھے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حکماً و عملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے ''تفسیر بیضاوی'' کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے۔ خیر آبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ ''بیضاوی'' کا جزو نصاب تھا لیکن اگر مان لیا جائے کہ ''بیضاوی'' بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی تو کیا مطلب ہوا؟ یہی کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا' ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے' فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق' فلسفہ' ہیئت' اقلیدس' ادب عربی اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا یعنی علم الکلام اور علوم اصول فقہ معانی و بیان وغیرہ' ان ہی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صرف منطق وفلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں' کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے۔ ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا' اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے۔ اسی طرح بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی' ہر عالم اس وقت گریجوایٹ ہوگا اور ہر گریجوایٹ عالم' مُلّا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر مُلّا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے ''نظریہ وحدت نظام تعلیم'' کے نام سے اپنی کتاب میں مَیں نے پیش کیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا' بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں' ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اسی کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن وحدیث فقہ وغیرہ محفوظ ہیں۔ اس حصہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسی پچاسی فیصدی الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت وعہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات ومسامرات وانشاء وخالص ادبی نثر ونظم کی کتابیں ہیں' یقیناً دشوار ہیں لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر واختصاص کسی علم میں یہ بالکل جداگانہ مقصد ہے' میری گفتگو صرف عام ولزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت و مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا۔ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت ومناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر واختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے' وہی طرز علم ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں بلکہ طبعاً اختیار کرنا چاہیے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر ونظر نے اب تک جو کچھ سوچا' سمجھا' لکھا' پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو تو کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہوگا۔ علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح وتوضیح کے لیے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ کلام یا بیان ومعانی و بدیع وغیرہ کا جو حال ہے' میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا۔ کچھ لوگوں کا پڑھنا' پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کے لیے کافی ہے بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو وہی اختیاری مضامین میں شریک کر کے زندہ رکھا جائے لیکن ہر مسلمان کو میلان باقی رکھنے کے لیے خصوصاً موجودہ حالت میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے

بعد اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی۔ کیا ان کا جو ماحول ہے' اسی کے برے اثرات کے ازالہ کے لیے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل' زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے' ماحول حکومت کے نقطہ نظر کا تابع ہوتا ہے۔ جب تک حکومت غیر اسلامی ہے' اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر و عزت کی توقع غلط توقع ہے' لیکن پھر کیا کیا جائے۔ کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے۔ خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو' اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے' اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی' مولانا محمد علی مرحوم' ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑتا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ قرآن کی' پیغمبر کی زندگی کی' اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو توان شاء اللہ ضرور متاثر کرے گی اور ان بعض کا اثر ان شاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کیے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے۔ ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا تو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جوامع اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پاسکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں' ان میں جب جدید نصاب کو جاری کر دیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں۔ جدید علوم و فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لیے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کیے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں' بحمد اللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہو چکی ہے۔ تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی لیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم علوم و فنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے' اس کا پیش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجاسے آشنا کیا جائے اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اس وقت کیا جاتا ہے۔ پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے۔ قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق [1] سے بھی ان کو آشنا کیا جائے یعنی اردو

پڑھائی جائے اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے اور آئندہ اردو کو چھوڑ کر فارسی کے آمد نامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کر کے عربی میں طلبہ لگا دیا جائے۔ یہی عربی بڑھتے ہوئے بی۔اے تک پہنچے گی اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلاثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا۔

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے۔ رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا سلسلہ چنداں دشوار نہیں ہے۔ مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں' اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔

(1) تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچانا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کر لیں اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعہ حدیث کی پڑھا دی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینا چاہیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے میں کرتا چلا آ رہا ہوں' ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے۔ مقصود معیار کا تعین کرنا ہے یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے' اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ املا کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقے کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

(2) میرا خیال ہے کہ وحدتِ تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کر لیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارسِ فوقانیہ (ہائی سکول) کی شکل میں بدل دیا جائے جن میں دینیات کی تعلیم صرف قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی۔ البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں کو تو ہائی سکول کی حیثیت دے دی جائے اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی و اسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنا دی جائے جہاں عام یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تفسیر کے لیے ندوہ کو اور حدیث کے لیے دیوبند کو مختص کر دیا جائے اور فقہ کے لیے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے۔ کلام اور تصوف کے لیے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے جہاں اس وقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں جن باتوں کا اجمالاً تذکرہ مقصود تھا' وہ ختم ہو چکیں۔ آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بعضوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے اس تعلیمی مطالبے کو کیا تسلیم کرے گی؟ اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک مطالبوں کے تسلیم کرنے پر اس زمانہ میں جب حکومت کو مجبور کیا جا سکتا ہے تو

مسلمانوں کا صرف اتنا مطالبہ کہ ایسی تعلیم جو بتدریج ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی چلی جارہی ہے' اس تعلیم میں اتنی ترمیم کر دی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے اس سیلاب کا انسداد ممکن ہو جائے تو یقیناً کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے جسے خواہ مخواہ حکومت مسترد کرنے پر ضد کرے گی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کو حیلہ بنا کر پیش کیا جائے لیکن اس حیلہ کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں یہ تحریک جو ہندو لیڈروں نے پیش کی تھی' پاس ہوگئی ہے کہ سنسکرت زبان کی تعلیم ہندو طلبہ کے لیے لازم کردی جائے۔ گو مسلمانوں کی طرف سے کوئی بولنے والا کھڑا نہ ہوا لیکن تعلیمی وزن کو برابر کرنے کے لیے مسلمان طلبہ پر بھی ان کی کلاسیکل زبانوں (عربی و فارسی) میں سے کسی زبان کا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نہ جاننے کی وجہ سے کہیے یا خود مولویوں کی طرف سے عربی کو دشواری کی غلط شہرت' عموماً بجائے عربی کے فارسی ہی کے لینے پر طلبہ کو سنا ہے کہ آمادہ کر رہی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے' اس میں شک کی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تو یوں سمجھیے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں' حکومت اس مطالبہ کو منظور کر چکی ہے۔ کلاسیکل زبانوں کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے۔ جس میں اردو' فارسی و عربی تینوں زبان کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کشمکش کے بآسانی حل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لیے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرنے کی اور فارسی میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے' اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی اور فارسی کے بعد عربی سے طلباء کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس و کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے۔ عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی ناممکن ہے لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں' ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم و فنون کا ہائی سکول مسلمانوں کے لیے بنا لیا جائے اور اسلامی علوم کی تکمیل کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سینکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی سکول موجود ہیں لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی سکول ہی نہیں ہے اور جہاں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ

سکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے' اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کر لیا تو مسلمانوں کے سکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد حکومت کا محکمہ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے' ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی سکولوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ کہنے کو تو یہ ہائی سکول کہلائیں گے لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے' اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گذرے گا۔
باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں مَیں نے کافی بحث کی ہے اور بھی کہہ دینی چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے' روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہو رہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لیے پیدا ہو جائیں کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے' بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے۔ (لافعله الله) میرا خیال ہے کہ مُلاّ اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیے اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔
بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکہ جو دیا جا رہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے' اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔ جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے' ان شاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائے گی۔ یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن وحدیث سے واقف بنانا

دادن تیغے بدستے راہ زن

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے۔ بظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے۔ تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی وصحت کے نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں اور اسی لیے

ہرچہ گیرد علّتی علّت شود

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کرلے لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے ان شاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی ان شاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب اور مذہبی تعلیم عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو برہمنیت ہے' اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اس کی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کردیں۔ اپنے آخری دین کی بہرحال وہ حفاظت فرمائے گا۔ واللہ متم لوزہ ولو کرہ الکافرون۔

حاشیہ

(1) نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لیے نسخ کے حروف کو اردو کے لیے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ طے ہوگیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے۔ انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے' یہی طرزِ عمل ہم بھی اختیار کریں گے' نسخ طباعت کے لیے اور نستعلیق کتابت کے لیے۔

جماعت بندی

قدیم نظام تعلیم پر جو اعتراضات اس زمانہ میں کیے جاتے ہیں' ان میں ایک نمایاں اعتراض یہ بھی ہے کہ جماعت بندی کا جو دستور عصری مدارس وکلیات میں ہے' یہ چیز اس وقت نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے۔ اتنی سخت صف آرائی جس کی پابندی آج کل کی تعلیم گاہوں میں کی جاتی ہے' اتنی سخت کہ صف سے الگ ہو کر اگر کچھ بھی پڑھنا چاہے نہیں پڑھ سکتا بلکہ پڑھنے اور سیکھنے کے لیے ان علمی صفوف میں کسی نہ کسی صف میں اپنے آپ کو شریک کرنا ناگزیر ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس کا رواج اس وقت نہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اس فوجی صف بندی کے اصول کو تعلیم گاہوں میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوئی؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر ایسا نہ کیا جائے اور ہر پڑھنے والے کو آزادی دی جائے کہ جس کتاب کو جس وقت چاہے پڑھے تو تنخواہ دار استادوں کی محدود جماعت سے ظاہر ہے کہ اس کا نباہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اب تو ہر سکول میں چند اساتذہ مقرر ہیں۔ ہر استاد سے چند صفوف اور جماعتوں کا تعلق ہے۔ جسے جو کچھ پڑھنا ہے ان ہی صفوف میں گھس کر پڑھنا ہے۔ انفرادی طور پر ہر طالب العلم کے لیے بلکہ طلبہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے لیے کون نظم کر سکتا ہے۔

بلاشبہ اجر ومزد کے اس عہد میں اس طریقہ کے سوا اور کوئی دوسرا طریقہ تعلیم ممکن بھی نہیں لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک ہی لاٹھی سے آپ نے کل بھینسوں کو ہنکانا شروع کر دیا۔ جو ذہین لڑکے ہیں اگر ان کو غبی لڑکوں کی رفاقت پر مجبور نہ کیا جاتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جتنی مدت میں ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے' وہ چند کتابیں ختم کر لیتے' مگر ان کے دماغ کی ذاتی خصوصیتوں سے تو بحث نہیں ہے۔ مجبوراً جماعت کے غبی کند دماغ لڑکوں کے ساتھ ان کو بھی گھسٹنا پڑتا ہے۔ اور یہی نہیں' دوسری طرف ان کند دماغ بچوں پر بھی ظلم ہو جاتا ہے کہ ان کو تیز رو لڑکوں کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ ذہین بچے جس نصاب کو سال بھر میں پورا کرتے ہیں' اسے یہ بیچارے دو سال میں پورا کرتے لیکن ان کو تو اپنے رفقاء درس کے ساتھ گھسٹنا ہے' عموماً صلاحیت سے زیادہ محنت کا ان پر غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے۔ نیز جن لڑکوں کے ساتھ وہ چل نہیں سکتے تھے ان کے ساتھ ان کو چلانے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ امتحان میں وہ فیل ہو جاتے ہیں جس کا اثر ان کے جذبات اور حوصلوں پر پڑتا ہے۔ کتنے بدبخت لڑکے محض فیل ہونے کی چوٹ کھا کر ایسے زخمی ہوئے کہ ہمیشہ کے

لیے پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ حالانکہ اگر ان کو دوسروں کے ساتھ باندھا نہ جاتا تو اپنی صلاحیت کے مطابق استاد سے روزانہ سبق کی مقدار پڑھ کر آگے بڑھتے رہتے۔ دوسروں نے اگر اسی کتاب کو ایک سال میں ختم کیا تھا تو یہ ڈیڑھ سال میں ختم کرتے لیکن ناکامی اور نامرادی کی اس چوٹ سے تو محفوظ رہتے۔ اسلامی عہد میں چونکہ بلا معاوضہ پڑھانے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی کہ قدرتاً مسلمانوں کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ رسّی لے کر طلبہ کی ایک خاص تعداد کو خواہ ذہناً و حافظۃً ومحنتاً ان میں جتنا بھی تفاوت ہو کمر سے کمر ملا کر باندھ دیں اور یوں آگے بڑھنے والوں کو بڑھنے سے روکا جائے یا پیچھے رہنے والوں کو زبردستی آگے بڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ چھوٹی کتابوں کے پڑھنے والے طلباء کو بڑی کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ میں اساتذہ کی کافی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ تعلیم کے خاص پیشہ ور اساتذہ کے سوا ہر شہر میں حکام وولاۃ بلکہ دیگر خوش باش لوگوں میں ابھی پڑھانے والے مل جاتے تھے۔ طلبہ کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا موقع مل جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اب اس نظام کو واپس لانا تقریباً ناممکن ہے۔ کس قسم کی تعلیم ہو، جماعت بندی کے بغیر تنخواہ یاب اساتذہ کی اس محدود جماعت سے استفادہ کا اب کوئی دوسرا طریقہ باقی نہیں۔ ایک ایک کلاس میں کبھی کبھی سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو طلبہ داخل ہو جاتے ہیں۔ استاد کی نہ آواز ایسی صورت میں سب کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے نہ اس ہنگامہ میں طالب علم ہی استادوں سے کچھ پوچھ سکتا ہے۔ نہ اساتذہ طلبہ کی انفرادی توجہ کی نگرانی کر سکتے ہیں مگر کیا کیا جائے۔ سکولوں اور مدرسوں کے فنڈ اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کم از کم اس جماعت ہی کو چند حصوں میں تقسیم کر کے مختلف اساتذہ کے سپرد کر دیا جائے، چھوڑ دیا جائے کہ جس طرح کام چل رہا ہے، چلنے دو۔ کسی مدرسہ یا کالج میں جب کوئی اجنبی آج داخل ہوتا ہے اور ایک ایک صف میں اسے طلبہ کی فوج در فوج نظر آتی ہے۔ اس حال کا اندازہ جب پچھلے زمانہ کی اس تعلیم سے کرتا ہے جس میں عموماً ایک ایک مدرس یا استاد کے پاس دس پانچ سے زیادہ طلبہ کی جماعت نہیں رہتی تھی بلکہ بسا اوقات تین چار ہی ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے تو عصری تعلیم گاہوں کی یہ سطحی رونق آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ ناواقف سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ بھیڑیا دھسان کی یہ صورت آج طلبہ کی استعداد کو جتنا نقصان پہنچا رہی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں پڑھنے پڑھانے کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہو۔ کتنا دردناک سماں ہے کہ جو پڑھنا چاہتے ہیں، جماعت کی آہنی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے اور جو پڑھ نہیں سکتے ہیں، ان کو زبردستی گھسیٹا جاتا ہے۔ ناکامی اور فیل ہونے کے کچوکوں سے بلاوجہ انہیں مجروح کیا جا رہا ہے اور ایک ہی ترازو میں آپ جب سب کو تولنا چاہیں گے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ آخر ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو جو برابر کرنا چاہے گا وہ مجبور ہے کہ اپنی لانبی انگلیوں کو توڑے یا چھوٹی انگلیوں کی رگوں کو ڈھیلی کر کے اپنے آپ کو دکھ میں مبتلا کرے۔ دماغوں اور ذہنوں کو جب قدرت ہی نے برابر کر کے پیدا نہیں کیا ہے تو تعلیم جس کا بالکلیہ قاطبۃً تعلق دماغ و ذہن ہی سے ہے، سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس قدرتی تفاوت سے آزاد ہو کر جس حد تک لوگ نفع اٹھا سکتے ہوں، نفع اٹھانے کا ان کو موقع دیا جائے۔ آپ نے تو اس کو سوچا نہیں اور جن لوگوں نے اپنے اپنے امکان کی حد تک اس میں آزادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی انہی کو مطعون وملام

ٹھہرایا۔ زیادہ دن کی بات نہیں ہے، مرحوم نواب صدیق حسن خاں [1] بھوپال والے مفتی صدرالدین خان صاحب سے دلّی میں پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ مستقل انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ بیان تقریباً نواب صاحب کے اپنے قلم ہی سے قلمبند کیا ہوا ہے۔

''ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانشمندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ تحصیل کی سند حاصل کی۔ کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا، یہ ہیں:

مختصر معانی، تا آخر عبادات شرح وقایہ۔ معاملات ہدایہ۔ اوائل توضیح وتلویح اصول فقہ میں، سلم مع ملا حسن، وحمد اللہ وقاضی مبارک منطق میں، میبذی تمام وقدرے شمس بازغہ وصدرا ماتعم الاجسام تک، میر زاہد، ملا جلال تا بحث دلالت میر زاہد شرح مواقف تا بحث وجود، میر زاہد رسالہ تا مذہب منصور، صحیح بخاری کے تین جز سماعاً اول تفسیر بیضاوی قراۃ، دیوان متنبی نصف اول، بعض دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، مقالہ اول اقلیدس، قطبی مع میر شرح عقائد نسفی تمام، حاشیہ بحر العلوم بر میر زاہد، مقامات حریری وہندی چند مقالات شرح مطالع سماعاً۔'' (ص 246)

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت خیال کیجیے اور چھبیس کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجیے۔ کوئی باور کر سکتا ہے کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال چند مہینے میں پوری کر لیں۔ بلاشبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات سوچی نہیں جا سکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوتی تھی۔ حضرت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کی زبانی بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ''ہم نے مختلف علوم وفنون کی انتہائی کتابیں قریباً پونے تین سال میں تمام کی تمام پڑھ لی تھیں۔''

کسی موقع پر مولانا انوار اللہ خاں نواب فضیلت جنگ استاذ سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کی ایک روایت طریقۂ مطالعہ کی گزری ہے۔ مولانا نے آخر میں اس کی وجہ کہ کتابیں جلد کیوں ختم ہو جاتی تھیں، یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ طریقہ مطالعہ کی وجہ سے سبق کا زیادہ حصہ چونکہ طلبہ کے لیے سمجھا سمجھایا رہتا تھا بجز چند شکوک وشبہات کے ازالہ کے، استاذ کو کچھ کہنا نہ پڑتا تھا، اس لیے سبق کی مقدار زیادہ ہوتی، روزانہ صفحات کے صفحات ہو جاتے تھے۔

ایک ہی کتاب کا متعدد مقامات سے پڑھنا

جماعت کی قید وبند سے جس زمانہ میں علم وتعلیم آزاد تھا، طلبہ کو اس کا بھی موقع دیا جاتا تھا کہ چاہیں تو ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیں۔ مولانا آزاد ہی نے اپنی تحصیل کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر طفیل محمد سے وہ اور ان کے خالہ زاد بھائی ساتھ پڑھا کرتے:۔

''طریق تحصیل چنیں بود کہ پیوستہ (مسلسل) دو کتاب یا کتابے واحد را از دو مقام بہ ساعت وقرات یک دگری خواندم۔''

گویا کل دو آدمی ایک جماعت میں تھے' باری باری سے سبق ایک دن ایک پڑھتے اور دوسرا سنتا۔ دوسرے دن پڑھنے والا سنتا اور سننے والا پڑھتا۔ یوں استاد کو پورا موقع ان کی خواندگی کی اصلاح کا ملتا تھا۔ خصوصاً عربی زبان میں تو اس کی شدید ضرورت اعراب اور حرکات کی وجہ سے ہے مگر ظاہر ہے کہ اتنی توجہ سے استاد چند ہی طالب العلموں کو پڑھا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا یہ فرمانا کہ ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیتے تھے' اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ کتابوں یا علوم کی دو قسمیں ہیں۔ بعض علوم تو ایسے ہیں کہ جب تک ان کے اول کو نہ پڑھا جائے آخر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ مثلاً اقلیدس کا جو حال ہے' مگر علم کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ اول کو آخر کے بغیر اور آخر کو اول کے بغیر پڑھ سکتے ہیں' مثلاً فقہ کے ابواب کا جو حال ہے' آپ معاملات کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں' خواہ نماز اور صلوٰۃ کے مسائل آپ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں۔ یہی حال نماز یا روزہ کے مسائل کا ہے کہ کسی کو مساقاۃ یا مضاربت کے مسائل نہ معلوم ہوں تو اس سے نماز' روزہ کے مسائل کو سمجھنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے۔ میرے نزدیک تو اس طریقہ سے کامل ایک کتاب کا پڑھنا ان چند کتابوں کے پڑھانے سے بہتر ہے جن کی تھوڑی مقدار تا نصاب پڑھا کر چھوڑ دی جاتی ہے اور اس کا اچھا طریقہ یہی ہے کہ بجائے دو کتابوں کے ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھایا جائے لیکن یہ ساری آزادیاں آزاد درس ہی میں برتی جا سکتی ہیں' جماعت بندی کی گھسیٹ میں نہ تو یہ ممکن ہے نہ وہ بلکہ جو چل رہا ہے' وہی ٹھیک ہے۔

قلیل عرصہ میں زیادہ پڑھنے کا موقع ذہین طالب العلموں کو ایک تو اسی لیے مل جاتا تھا کہ ان کو اونٹ کے گلے میں لٹکا نہیں دیا جاتا تھا۔ ہرن کو اپنی چال سے اونٹ کو اپنی چال سے چلنے کی آزادی تھی' ممکن ہے کہ کچھ اس کو بھی دخل ہو جو مولانا آزاد کے بیان سے ثابت ہوتا ہے یعنی ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھنا۔

اساتذہ وطلبہ کے باہمی تعلقات

اور سب سے بڑی قیمتی بات وہ نسبت تھی جو اس زمانہ میں اساتذہ اور طلبہ میں قائم ہو جاتی تھی' ایسے اساتذہ جو بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے' ان کی طرف سے طلبہ کے قلوب میں ممنونیت کے جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن معاوضہ والے استادوں کی بھی شفقت ومہربانی طلبہ کے حال پر جتنی رہتی تھی' دکھ درد میں جس طرح کام آتے تھے' بتدریج یہی چیزیں تعلقات کو بڑھاتے ہوئے ایک ایسی حد تک پہنچا دیتی تھیں کہ شاگردوں کا تعلق استادوں سے کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ شاید ماں باپ کے ساتھ بچوں کو اتنا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اب آپ خود ہی خیال کیجیے استاد کا جب یہ حال ہو مثلاً اکبری عہد کے ایک عالم جو طبیب بھی تھے' اس لیے حکیم الملک گیلانی کے نام سے مشہور تھے۔ اصلی نام شمس الدین تھا۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ملازم تو دربار کے تھے' اکبر کے خصوصی معالجوں میں یہ بھی داخل تھے لیکن

''پیوستہ طلبہ را درس گفتے وبے ایشاں طعام نخوردے'' (ص 51۔ تذکرۂ علماء ہند)

تنخواہ بہ صیغہ طبابت مل رہی ہے' ایک حرف بھی نہ پڑھاتے تو ان کی تنخواہ میں پیسے کی کمی نہیں ہو سکتی تھی' نہ پڑھانے سے اضافہ لیکن تعلیم کے لیے معاوضہ کی ضرورت اس زمانہ کا سوال ہی نہ تھا اور اسی کے ساتھ طلباء کو اپنے گھر سے

کھانا بھی دینا' ان کا اتنا خیال کہ جب تک سب طالب العلم جمع نہیں ہو لیتے' خود بھی وہ کھانا نہیں کھاتے' سوچا جاسکتا ہے کہ ایسے استادوں کا قدرتاً تلامذہ کے قلوب پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خود ہمارے استاد مولانا برکات احمد ٹونکیؒ کا قریب قریب یہی معاملہ تھا۔ وہ بھی تنخواہ طبابت کی راہ سے پاتے تھے لیکن عمر بھر پڑھاتے رہے اور دس میں طالب العلموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے کہ اس راہ میں وقت کی' مال کی' دل کی' دماغ کی جو قربانیاں حکیم صاحبؒ کو کرنی پڑیں ان سے وہ یا ان کا خدا ہی واقف ہے لیکن اس کا اثر کیا تھا' میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی طالب علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلبلا کر رونہ پڑا ہو۔ دوسروں کا حال کیا بیان کروں خود راقم الحروف کا حال بھی یہ تھا اور اب بھی حضرت والا کی پدرانہ شفقتوں کا جب خیال آتا ہے' دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بیتے ہوئے دن زندگی کے سامنے آجاتے ہیں۔ (2)

کوئی یقین کرسکتا ہے' اس قصہ کا جس کے راوی مولانا آزاد بلگرامی ہیں' استاد و شاگرد کے تعلقات کہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ ملا محمود جونپوری صاحب ''شمس بازغہ'' جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے پہلے ہی گذر چکا ہے' ان کے حالات میں مولانا رقمطراز ہیں کہ ملا محمود کی وفات بالکل جوانی میں ہوئی' ان کے استاد مولانا محمد افضل جنہیں شاہجہاں کے دربار سے استاذ الملک کا خطاب تھا' اس وقت زندہ تھے۔ سنیے استاد کو خبر ملتی ہے کہ شاگرد مر گیا:

''تا چہل روز استاذ را کسے بہ تبسم نہ دید و بعد چہل روز استاد بہ شاگرد ملحق شد شخصے این مصرعہ تاریخ یافت: زمحمود و افضل بگو آہ آہ!''

اور یہ تو خیر دو ڈھائی سو سال کی بات ہے' تیرہویں صدی کے ایک عالم مولانا احمد الدین صاحب بگوی المولود 1217ھ لاہور میں درس دیتے تھے۔ حضرت شاہ اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے' صاحب ''حدائق الحنفیہ'' نے لکھا ہے کہ مولانا احمد الدین اور ان کے بھائی (3) سے جس قدر انتشار علم منقول و معقول پنجاب میں ان ہر دو بھائیوں سے ہوا کسی دوسرے سے نہیں ہوا۔ ہزارہا آدمی صرف بھائی سے لے کر ان سے فارغ التحصیل ہوئے۔ گویا پنجاب میں کوئی صاحب علم ان کی شاگردی سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ کوئی بالذات کوئی بالواسطہ ان کے تلامذہ میں منتسب ہوگا۔ (صفحہ 487)

بہر حال مولانا احمد الدین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

حالت صحت و بیماری میں طالب العلموں کو سبق پڑھاتے رہتے تھے' طالب العلموں میں اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے دیتے۔ (حدائق۔ صفحہ 487)

ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنے ایک ہم وطن عالم استاد مولانا عبداللہ بدایونی کے متعلق یہ لکھ کر

''سالہا در بداؤں درس و افادہ فرمودہ خیلے از دانش منداں نامی کہ بہ مرتبہ اشتہار رسیدہ اند' از دامن او برخاستند و مردم اکناف و اطراف از اقصیٰ ولایات بہ ملازمت شریفش رسیدہ بہ سعادت جاودانی می رسیدند۔''

خود ملا عبدالقادر صاحب نے بھی ''شرح صحائف'' اور ''تحقیق در اصول'' ان ہی سے پڑھی تھی۔ ملا صاحب نے اپنا تجربہ ان کے علم کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ

''جمعے از مسترشدان فیاض ومعلمان صافی قریحہ شریک بودند واشکالات دقیق می آوردند ہرگز ندیدم اورا کہ درافادہ وافاضہ وحل آں ابحاث شریفہ ونکات غامضہ احتیاج بہ مطالعہ افتادہ باشد۔'' (صفحہ 56 جلد 3)

جس سے اس زمانہ کے طریقہ درس کا بھی اندازہ ہوتا ہے' میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ درس کے اس طریقہ سے ایک طرف طلبہ کی استعداد کا امتحان ہوتا رہتا تھا اور دوسری طرف استادوں کی قابلیت کا بھی پتہ چلتا تھا جسے عصری طریقہ تعلیم نے بالکل اندھیرے میں ڈال دیا ہے۔ اس گونگے درس میں عالم وجاہل ہر قسم کے استادوں کی کھپت بآسانی ہو رہی ہے لیکن جس زمانہ میں استادوں سے طلبہ کو ''اشکالات دقیق'' اور ''ابحاث شریفہ'' و''نکات غامضہ'' کے دریافت کرنے اور ان پر استادوں سے بحث کرنے کا حق حاصل تھا' ناکاروں کی گنجائش حلقہ تدریس میں ناممکن تھی۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی اس کے متعلق کافی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے انہی میاں عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملا عبدالقادر کی یہ شہادت پیش کرنی ہے کہ میاں صاحب کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ:

''از پے ابتیاع متاع خانہ خواہ قلیل باشد یا خواہ کثیر وسائر مصالح ضروری مایحتاج الیہ پیادہ بدکان و بازار تشریف می بردو برداشتہ بہ منزل می آورد۔''(4)

اپنے گھر کے لیے سودا خواہ زیادہ ہو یا کم اور تمام دوسری ضروریات کی چیزیں میاں صاحب پیادہ پا دکان اور بازار سے جا کر لاتے اور خود اپنے اوپر لاد کر ان کو گھر پہنچاتے۔

ملا صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

''درمیان راہ جماعہ طلبہ راسبق نیزمی فرمودہ ہرچندمی گویند کہ حاجت تصدیع مخدومی نیست ما ایں خدمت رابجامی آریم قبول ندارد۔'' (صفحہ 56 جلد 3)

اور یہ تھا طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا تعلق' طلبہ اصرار کر رہے ہیں کہ مجھے دیجیے ان چیزوں کو گھر تک پہنچا آتا ہوں لیکن پیٹھ پر گٹھری لدی ہوئی' سبق ہو رہا ہے اور طلبہ کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔

اس سلسلہ کا ایک دلچسپ عبرت آموز واقعہ حضرت جناب مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی کا ہے جن کا ذکر ابھی گذرا ہے۔ قاری صاحب کے سعادت مند حفید رشید جناب قاری عبدالحلیم صاحب معلم حالی ہائی سکول پانی پت نے قاری صاحب کی جو سوانح عمری ''تذکرہ رحمانیہ'' کے نام سے مرتب کی ہے' اسی میں اس قصہ کو شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب کی ایک کتاب منظوم ''درہ مرتشی'' سے بایں الفاظ درج فرمایا ہے:۔

> ''میں (یعنی شیخ محمد ابراہیم) حضرت کے پاس بیٹھا تھا' آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے۔ کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا' لائیے یہ خط میں ڈال آؤں اور بے حد اصرار کیا۔ حضرت نے فرمایا' میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا کیونکہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے' میرا حق استادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالو گے' میرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے۔ اس کے بعد لوجہ اللہ تعلیم کا

خلوص باقی نہ رہے گا' لہٰذا میں تم سے یہ معمولی کام لے کر اپنا ثواب کیوں ضائع کروں۔'' (صفحہ 199)

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے' قاری صاحبؒ کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور مدرسین میں تھا' حضرت شاہ اسحاقؒ محدث دہلوی استاذ الکل کے ارشد تلامذہ میں تھے' علماء کا ایک طبقہ آپ کے حلقہ درس سے اٹھا۔ مولانا حالی صاحب کا ذکر تو گذر ہی چکا' صحاح ستہ کی کل کتابیں مولانا حالی نے قاری صاحب ہی سے پڑھی تھیں' ان کا ایک مستقل معرکتہ الآ را مقالہ بھی قاری صاحب کے خصوصیات و حالات پر چھپ چکا ہے۔ ان کے سوا پیر جماعت علی شاہ' مولانا گل حسن' مولانا مشتاق احمد انبٹھوی اور بیسیوں علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی بلکہ جن لوگوں نے قاری صاحب سے استفادہ کیا ہے' اس فہرست میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اکابر ملت کے اسماء گرامی بھی ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری' اس نے اپنے اس التزام کو کسی شاگرد سے کسی قسم کا کوئی ذاتی کام اپنا نہ لوں گا اور اس کو آخر وقت تک نباہ دینا کیا عزم و ارادہ کی معمولی قوت کی دلیل ہے؟

شاگردوں سے کام لینے کو بھی رشوت قرار دینے کا غالباً مطلب وہی ہے جس کا پتہ ان ہی کے ایک دوسرے طرز عمل سے چلتا ہے۔ اسی کتاب میں قاری عبدالحلیم صاحب نے حضرت کا ایک اور قصہ نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ سے ایک شیعی عالم کسی خاص فن کی کتاب پڑھا کرتے تھے۔ مضمون سے ان کو چونکہ زیادہ دلچسپی تھی' اس لیے چاہا کہ وقت ذرا زیادہ دیا جائے لیکن حضرت قاری صاحب عدم گنجائش کی وجہ سے راضی نہ ہوئے۔ ان شیعہ صاحب کو خیال ہوا کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے غالباً یہ بے اعتنائی برتی گئی۔ یہی خیال کر کے انہوں نے عرض کیا کہ ''اگر میں شیعیت ترک کردوں اور سنی ہو جاؤں تو پھر تو آپ پوری توجہ کے ساتھ وقت دیں گے۔'' حضرت نے ان کی زبان سے یہ سن کر فرمایا ''تم مذہب تبدیل کرو یا نہ کرو میری توجہ علم کے لیے ویسی ہی رہے گی' اس میں بال برابر فرق نہیں آ سکتا۔'' (تذکرۂ رحمانیہ۔ صفحہ 192)

گویا تبدیل مذہب کی رشوت دے کر قاری صاحب کی توجہ کو ذرا زیادتی کے ساتھ اپنی طرف وہ مائل کرانا چاہتے تھے۔ خدمت لینے میں ان کو غالباً یہی خیال ہوتا ہوگا کہ خدمت کی رشوت دے کر بہ نسبت دوسرے طالب العلموں کے بعض لوگ استاد کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں اور وہ شاگردوں میں اس فرق کو روا نہ رکھتے تھے۔

مذکورہ واقعہ سے اس تعلیمی بے تعصبی کا بھی آپ کو اندازہ ہوا ہوگا جو ان بزرگوں میں عموماً پایا جاتا تھا۔ شاگردوں کا مقام اساتذہ کے قلوب میں کہاں پر تھا' ''تذکرہ غوثیہ'' جو حضرت شاہ غوث علی بہاری وطناً و پانی پتی مدفناً کے حالات میں ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں ایک قصہ مولانا فضل امام خیر آبادی کا درج ہے' غالباً شاہ غوث علی صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں' جوان تھے اور اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلّی میں درس دیتے تھے' جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے۔ ایک طالب العلم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا۔ انہوں نے مولوی فضل حق صاحب کے پاس اُس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں ہے تم ہی پڑھا دیا کرو۔ یہ طالب العلم بیچارہ کچھ غبی تھا' مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ چند اسباق کے بعد ان کا جی اکتا

گیا۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ طالب العلم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا اور حال بیان کیا۔ یہی سننے کی بات ہے' مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے۔ مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا' طلبی کا فقرہ تھا "بلاؤ اس خبیث کو۔" جوان عالم بیٹا ہے لیکن ایک طالب العلم کی تحقیر کی ہے' مولوی فضل حق سامنے آتے ہیں۔ لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا۔ پگڑی دور جا پڑی اور فرماتے جاتے تھے تو طلبہ کی قدر کیا جانے۔ بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے' خبردار! میرے طالب العلموں کو اگر کبھی کچھ کہا۔

بہر حال میں تو اساتذہ اور تلامذہ کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ شیخ منصور لاہوری' اکبری دربار کے امراء میں تھے۔ ایک زمانہ تک مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے' پھر پنجاب کے علاقہ بجواڑہ اور حدود دامن کوہ کے ضبط و ربط کی خدمت ان ہی کے سپرد ہوئی' یوں ہی وہ مختلف عہدوں اور مناصب پر سرفراز ہوتے رہے' بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ علاوہ امیر کبیر ہونے کے علم میں بھی ان کا پایہ غیر معمولی تھا' ملا عبدالقادر نے لکھا ہے۔

"در ہمہ علوم عقلی کہ در ہندوستان متعارف ست متحضر و خوش طبع و سلیم الفہم و متصرف و با امراء وملوک صحبت بسیار داشت۔"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے درس و تدریس میں زیادہ حصہ نہ لے سکے مگر ان کے صاحبزادے ملا علاؤ الدین کا رنگ دوسرا تھا۔ ملا عبدالقادر ہی نے لکھا ہے کہ اکبر نے "ہر چند کہ تکلیف سپاہی گری نمودند قبول نہ کردہ بدرس وافادہ مشغولہ شد" چاہتے تو کوئی ہزاری منصب فوج رکھنے کے صلے میں ان کو بھی مل جاتا' لیکن جو موروثی جاگیر والد سے ملی تھی' اسی پر قناعت کر کے ساری عمر پڑھنے پڑھانے ہی میں گذار دی۔ طلبہ کے ساتھ ان کا جو سلوک تھا اور اسی کو مجھے پیش کرنا ہے' ملا عبدالقادر نے لکھا ہے "وہر چہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرف طلبہ بود" (صفحہ 156)

اگر چہ اس زمانہ کا یہ عام دستور تھا کہ ارباب ثروت و دولت میں جو بھی درس تدریس کا کام کرتا تھا' اپنی اپنی حیثیت کے مطابق علاوہ پڑھانے کے طلبہ کی خدمت طعاماً و قیاماً اپنی اپنی استطاعت کی حد تک کیا کرتا تھا لیکن ملا علاؤ الدین کا دستر خوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں غیر معمولی وسیع تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ:

"از جملہ ملایاں در ہند بعد از پیر محمد خاں [5] چوں او (ملا علاء الدین) وملا نور محمد نرخان ہیچکس دلگیر بذل و کرم و نثار ایثار ضرب المثل نہ شد۔"

بانی مدرسہ نظامیہ ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ کے خلف رشید مولانا عبدالعلی المخاطب بہ بحر العلوم کے متعلق لکھا ہے کہ "منشی صدر الدین بہاری وے را برائے تدریس مدرسہ خود کہ در بہار [6] بنا کردہ بود خرچ معتد بہ فرستادہ طلبید۔"

جس وقت مولانا کو طلب کیا گیا ہے' اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ منشی صدر الدین نے چار سو ماہوار تنخواہ آپ کی اور آپ کے ایک فرنگی محلی عزیز مولوی ازہار الحق کی سو مقرر کی تھی' لیکن مولانا نے لکھ بھیجا کہ میرے ساتھ طلبہ بھی ہوں گے جن کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی' اگر ان کے قیام و طعام کا نظم کر سکتے ہو تو میں آ سکتا ہوں۔ "اغصان اربعہ" جو فرنگی

محل کے علماء کی تاریخ ہے اس میں لکھا ہے کہ منشی صدرالدین نے جب تک باضابطہ معاہدہ کی شکل میں ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سرنہ لی مولانا اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ حالانکہ ان دنوں سخت معاشی دشواریوں میں مبتلا تھے۔

اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان تعلقات کی یہ نوعیت روایات موروثی کی شکل میں منتقل ہوتی ہوئی اس وقت تک آئی تھی' آخری آدمی جس کا حال اس باب میں مجھے معلوم ہوا' وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار مرحوم تھے۔ ایک زمانہ تک ان کا قیام الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں رہا۔ بعض واقعات پیش آئے کہ الہ آباد سے منتقل ہوکر آپ اپنے وطن صوبہ بہار چلے آئے اور گیا کو مستقر قرار دیا۔ طلبہ کا بھی ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ چھوڑ کر گیا پہنچ گیا۔ بے سروسامانی کے حال میں آئے تھے' کوئی انتظام معقول شروع میں نہ ہوسکا۔ مولانا عبدالصمد رحمانی جوان ہی طالب العلموں میں تھے' ان کی سوانح عمری میں ہی اپنی عینی شہادت یہ نقل کرتے ہیں۔

"یہاں (گیا) پہنچ کر سب سے اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا۔ اس کو سرخ مرچ کے بھرتے کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک ملا لیا جاتا تھا' مولانا ایک دسترخوان پر بلاتکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھا لیتے تھے اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔" (حیات سجاد)

حالانکہ ذاتی طور پر مولانا کی ایسی گئی گذری حالت نہ تھی' جائیداد وزمین کے مالک تھے۔ اپنی ذات کی حد تک چاہتے تو خواہ مخواہ اس قسم کے کھانے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پاتے لیکن اتنی حیثیت بھی نہ تھی کہ روزانہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع کو اپنی جیب سے کھلا سکتے ہوں' محض طلبہ کی خاطر سے جب تک یہ حال رہا' سب کے ساتھ مولانا کی بھی یہی غذا رہی۔ (7)

اب ایک طرف اساتذہ کے ان عجیب وغریب تعلقات کو پیش نظر رکھیے جو اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ رکھتے تھے اور دوسری طرف اس بے پناہ جذبہ شوق وجستجو کو سامنے رکھیے جو نسلاً بعد نسلٍ بطور موروثی روایات کے اسلامی خاندانوں میں طلب علم کے متعلق منتقل ہوتا چلا آتا تھا کہ آج ان قصوں کو افسانہ سے شاید زیادہ وقعت نہ دی جائے لیکن کیا کیجیے کہ واقعات یہی تھے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بعض واقعات اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں مثلاً مولانا سید محمود اصغر کے حالات میں لکھتے ہیں:

"بہ ارادۂ تحصیل علم قنوج رفت ونزد علماء آنجا کتب درسی گذرانید وکمال استعداد بہم رساند۔"

مگر کس طریقہ سے' مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسافت مابین بلگرام وقنوج پنج کروہ است" کروہ دو میل کے قریب قریب ہوتا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بلگرام اور قنوج میں بمشکل دس میل کا فاصلہ ہوگا لیکن کوئی باور کرسکتا ہے اس قرب مسافت کے باوجود مولانا محمود اختر نے قنوج میں طالب العلمی کے یہ دن کس طریقے سے گذارے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں "درایام تحصیل باوجود قرب مسافت میل بہ وطن نہ کرد۔" خدا ہی جانتا ہے کہ تحصیل کی یہ مدت کتنے زمانہ میں پوری ہوئی۔ سال دو سال تو قطعاً نہ ہوگی مگر دھن کے پکوں کے عزم کی پختگی ملاحظہ فرمائیے کہ جب "تصحیح نسخہ ظاہر وباطن بکمال رساند آں گاہ بہ

جانب وطن عطف عناں نمود'' (صفحہ 55)

اور دوسروں کو جانے دیجیے' خود مولانا آزاد کی عشق علم کی وہ داستان کیا کچھ کم عجیب ہے کہ میں نے مختلف موقعوں پر ظاہر کیا کہ مولانا ایک امیر گھرانے کے آدمی تھے۔ ان کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی عالمگیری امراء میں تھے۔ مختلف جلیل مناصب کا تعلق ان سے فرخ سیر کے زمانہ تک رہا۔ مولانا آزاد نے علاوہ مولوی طفیل محمد صاحب کے خود اپنے نانا مرحوم سے بھی پڑھا تھا۔ خود فرماتے ہیں ''لغت و حدیث و سیر نبوی در خدمت قدسی منزلت جدنا داستاذ نا علامہ مرحوم مرقوم بسند رسانیدم'' اور بھی مختلف لوگوں سے مختلف علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے کے مواقع حالانکہ ہندوستان ہی میں میسر آچکے تھے' عمر بھی چونتیس سال کی ہو چکی تھی۔ بظاہر جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا' غیر متاہل رہنا مشکل تھا مگر ایک ''جنون'' تھا جس کی آگ اندر اندر سلگتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں: ''پیادہ پا تنہا از بلگرام رخت سفر بستم۔'' کیسی تنہائی؟

''احباء و اقرباء اطورے غافل ساختم کہ اگر ایں ہا سراغ می یافتند سد راہ مقصودی شدند۔''

یہ تنہا کس لیے نکلے تھے۔ حدیث کا شوق تھا' حجاز جانا چاہتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ لوگوں پر اس قصد کو اگر ظاہر کروں گا تو مانع ہوں گے۔ چپ چاپ یکہ و تنہا وہی شخص آج تک جو ایک میل بھی کبھی پیدل نہ چلا تھا' گھر سے نکل پڑا۔ گھر میں لوگوں کو خیال گزرا کہ شاید قریب کے کسی گاؤں میں کسی سے ملنے جلنے چلے گئے ہیں لیکن جب تین دن گذر گئے اور کسی طرف سے کوئی خبر نہ ملی تب لوگ چونکے۔ ''اہل بیت ایں فقیر بعد سہ روز آگاہ شدند و انگشت تحیر بدنداں گزیدند'' مگر تین دن کے نکلے ہوئے مسافر کو پکڑنا آسان نہ تھا' خصوصاً ''راہے کہ غیر متعارف بود پیش گرفتم۔''

بلگرام اودھ کا قصبہ ہے اور جو ایک میل بھی کبھی پیادہ پا نہ چلا تھا' جانتے ہو رواروی کرتا ہوا کہاں دم لیتا ہے' مالوہ میں ایک مشہور قصبہ سرونج (8) بھوپال کے پاس ہے' یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ راہ میں کیا گذری اور تو کچھ نہیں لکھا ہے' البتہ اتنا قلم سے نکل گیا۔ ''قدم گاہے بہ پیادہ گردی آشنا نہ بودآ بلہا پار اخوشہ تاک ساخت۔'' پاؤں کیا تھا آبلوں سے انگور کا خوشہ بن گیا تھا اور انہی دانوں میں وہ کیف و مستی بھری ہوئی تھی جو مولانا کو آگے بڑھائے لیے چلی جاتی تھی۔ سرونج میں خبر ملی کہ بانئ سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ کی بارگاہ فلک پناہ دکن جا رہی ہے' قریب ہی میں کہیں فروکش ہیں۔ مولانا آزاد کسی طرح گرتے پڑتے عساکر آصفیہ تک پہنچ کر فوجیوں میں گھل مل گئے۔ پیشانی سے شرافت و نجابت' علم و تقویٰ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ آصف جاہی فوج کا ایک امیر آپ پر مہربان ہو گیا اور مولانا کو اس نے اپنا مہمان بنا لیا۔ ایک مستقل خیمہ اور سفر کے لیے ایک رتھ کا نظم مولانا کے لیے اس امیر نے کر دیا۔ اب عساکر آصفی کے ساتھ منزل بمنزل کوچ کرتے ہوئے بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں آصف جاہی فوجوں کی مڈ بھیڑ مرہٹوں سے ہو گئی' رمضان کا مہینہ تھا۔ لکھتے ہیں کہ

''تمام رمضان در سواد بھوپال آتش حرب اشتعال داشت و زلزلہ ساعت قائم بود۔''

کیا زمانہ تھا' امیر خاندان کے صاحبزادے ہیں۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گذری ہے لیکن اچانک میدان جنگ میں گھر جاتے ہیں۔ پھر کیا وہ صرف تماش بینوں میں تھے' ایک نظم میں اپنے اس حال کو بیان کیا ہے:

فوج اسلام و فکر صف آراست | طرفہ شورے قیامتے برپاست
کرۂ آتشیں توپ و تفنگ | کرۂ نار ساخت عرصۂ جنگ

اور جس کے ہاتھ میں اب تک قلم تھا وہی:

من ہم آں روز در صف اسلام | بایکے ذوالفقار خوں آشام
قدم پر دلانہ افشر دم | حملہ ہا بر مخالفاں بردم

مرہٹوں کو ہزیمت ہوئی۔ آصف جاہی فوج آگے بڑھی' غالباً اسی امیر نے جس کے آپ مہمان تھے' آپ کو ایک دن حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

''باوصف موزونی طبع مدت العمر زبان بمدح امراء و اغنیا' نکشودیم۔''

لیکن آج ضرورت پیش آ گئی تھی۔ جس مقصد کو سامنے رکھ کر گھر سے نکلے تھے' دیکھا کہ اس میں کامیابی کی یہی صورت ہے۔ یہ رباعی فارسی میں لکھ کر حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کی:

اے حامی دیں' محیط جود احساں | حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بدرگاہ سلیماں آورد | تو آل نبی رابہ در کعبہ رساں

حضرت آصف جاہ خود موزوں طبیعت رکھتے تھے' رباعی پسند آئی اور فرمان ہو گیا کہ حجاز کی طرف روانگی کا سامان مولانا کے لیے کر دیا جائے۔ یوں خدا نے ان کو سورت پہنچایا۔ سورت میں جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ اور مکہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حج و زیارت کے سوا ان پاک شہروں کے علماء سے استفادہ کا جو شوق تھا' وہ پورا ہوا۔ مدینہ میں مولانا کا جو مشغلہ تھا' ان الفاظ میں اس کا اظہار فرماتے ہیں:

''شبہا ما بین بیت و منبر والا (روضۃ الجنۃ) نشستم و مطالعہ صحیح بخاری می پرداختم۔''

بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا' خود ہی ان الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے:

''من فدائے جلوۂ احمدی و صید بستہ فتراک محمدی در صغر سن خوابے دیدم کہ در مسجد مکہ معظمہ زادہا اللہ تعظیماً حاضرم و جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم در محرابے از مسجد قائم اند' فقیر شرف ملازمت اقدس دریافتم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات فراوان نمودند لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند۔''

آج کسی کے سامنے بیٹھ کر صحیح بخاری کے ذریعہ سے وہی ''لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند'' کی تعبیر پوری کر رہے تھے۔ مولانا حیات سندھی جو اس زمانہ میں مدینہ منورہ کے سرخیل حلقہ محدثین تھے' ان سے ''صحیح بخاری را..... سند کردم و اجازت صحاح ستہ و سائر مرویات مولانا بر گرفتم۔'' زیادہ وقت مدینہ میں گذار کر جب حج کا موسم قریب آ گیا' مکہ معظمہ پہنچے۔ مناسک حج سے فارغ ہوئے اور شیخ الحرم علامہ عبدالوہاب طنطاوی سے جیسا کہ فرماتے ہیں: ''فوائد فن حدیث در گرفتم۔''

اور یہ کوئی ایک مثال ہے۔ علم کے دیوانوں کو فتنہ و فساد کے ان ہی دنوں میں اس ملک سے' اُس ملک میں' اس علاقہ سے' اُس علاقہ کی طرف سرگرداں دیکھنا چاہتے ہوں تو ان بزرگوں کے حالات اٹھا کر پڑھیے' کتنوں کے تذکرے

مختلف حیثیتوں سے خود اسی مضمون میں گذر چکے ہیں۔ کتاب ''منبع الانساب'' کے حوالہ سے صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے ایک سندھی عالم شیخ علی بن محمد جھونسوی کی سراسیمگیوں کا عجب حال نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ پیدا ہوئے بھکر (سندھ) میں وہی ذوق علم بھکر سے ملتان لے گیا' ملتان میں شیخ شمس الدین الحسینی العریضی اور مولانا ابوالفتح رکن الدین کی صحبتوں میں ایک مدت گذاری' لیکن دل کو قرار نہ تھا۔ ملتان سے بھی اڑے اور

''سافر الی بھار و لازم الشیخ منہاج الدین الحسن البھاری اثنتی عشرۃ سنتہ۔''

''بہار کا سفر اختیار کیا اور شیخ منہاج حسن بہاری کی خدمت میں بارہ سال مقیم رہے۔''

شیخ منہاج حسن نے ان کو پہلے

ارسل الی شیخپورہ[9] فلبث ھنا سنتین ثم ارسل الی براگ (الہ آباد) فسکن بصحرا ماوراء النھر حیث یلتقی ماجون و گنگ قریباً من قریۃ ھربونگ پور فاسلم علی یدہ خلق کثیر۔'' (صفحہ 92)

''شیخ پورہ بھیجا جہاں وہ دو سال رہے۔ شیخپورہ سے پراگ (الہ آباد) بھیجے گئے جمنا گنگا کے سنگم کے پاس جنگل میں ایک گاؤں ہڑبونگ پور کے پاس قیام کیا۔ بکثرت لوگ آپ کے ذریعہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔''

علم اور دین کے وارفتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ زمان و مکاں دونوں کے فاصلے گویا ان کی نگاہوں میں صفر کا درجہ رکھتے تھے۔ جہاں جی چاہا چلے گئے۔ جب تک جی چاہا ٹھہرے رہے۔ آخر آخر وقت تک روایات کا اثر خاندانوں میں باقی تھا' خود فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانیؒ کے مدرسہ کا تذکرہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب سے گذر چکا ہے حالانکہ یہ اس زمانہ کے آدمی ہیں جب برٹش راج کا تسلط ملک میں قائم ہو چکا ہے۔ مولانا کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے۔ بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا' مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے' یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مولانا محمد احسن کی شادی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے۔ اس عمر اور ان حالات میں تحصیل علم کا سودا سر پر سوار ہوا۔ بیوی بچے گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلان سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گذری۔ خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے۔ مختلف علوم کے اہل کمال جس جس شہر میں تھے' ان کی خدمتوں میں پہنچے۔ علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی۔ ریاضی' ہیئت' حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند حضرت مولانا عالم علی نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلویؒ سے حاصل کی۔ اسی زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کیے جن میں ''وجود رابطی'' اور ''مشاۃ بالتکریر'' والا رسالہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ ''شرح سلم بحر العلوم'' پر معرکۃ الآرا حاشیہ لکھا۔ اقلیدس کا مقالہ اولی عربی جو عام مدارس کے نصاب میں شریک ہے' پہلی دفعہ تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا۔ اسی نسخہ کی نقل آج تک مطابع میں چھپ رہی ہے اور بھی بیسوں کام اس عرصہ میں کرتے رہے۔ جب کامل

اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی اسی برگد کے درخت کے نیچے گزار دی جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل نہیں کیا ہے کہ اس سے اپنے کسی خاندانی امتیاز کا اظہار مقصود ہے کیونکہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس واقعہ میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ پرانے علمی گھرانوں میں بزرگوں کے متعلق آپ کو ہند کے طول وعرض میں اس قسم کی داستانوں کا ایک سلسلہ مل سکتا ہے۔ افسوس کہ اب اس کی یاد مٹتی جاتی ہے۔ کاش! جمع کرنے والے ان ولولہ انگیز نمونوں کو پچھلوں کے سامنے پیش کر دیتے۔ شاید اپنے اگلوں کے ان حالات سے ان پر اپنی حقیقت واضح ہو۔

رجسٹر حاضری اور ناغہ

اور اس وقت تو غرض یہ تھی کہ قدیم نظامِ تعلیم کی وہ عجیب وغریب خصوصیت یعنی بالکلیہ درس کا یہ نظام حاضری اور حاضری کے رجسٹروں سے ہمیشہ بے نیاز رہا لیکن اس پر بھی یہ واقعہ تھا کہ 75 فیصدی نہیں، تین چار فیصدی غیر حاضر یا ناغہ [10] بھی ناممکن تھا۔ خود خاکسار کو مولانا برکات احمدؒ کی درسگاہ کا تجربہ ہے۔ سات آٹھ سال کے اس عرصہ میں بجز کسی شدید ارضی وسماوی آفت یا حادثہ کے میں نہیں جانتا کہ کسی درس میں ایک دن کے لیے بھی کبھی کوئی غیر حاضر رہا ہو۔ بعض بعض اسباق ٹھیک مئی اور جون کے مہینوں میں بارہ ساڑھے بجے ہوتے تھے۔ گرمی اور تپش راجپوتانہ کی تھی، بعض [11] طلبہ کی قیام گاہیں کافی فاصلہ پر تھیں لیکن وقت پر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی نہ آیا ہو۔ شیخ محدث نے خود اپنا حال لکھا ہے کہ

> ''باوجود غلبہ برودت ہوائے زمستاں وشدت حرارت تابستاں دو بار بمدرسہ دہلی کہ شائد از منزل ما دو میل داشتہ میل می کردم۔''

مدرسہ دو میل ہے، گرمی ہو یا سردی دن میں دو دفعہ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ ''مدتے پیش تر از صبح بمدرسہ می رسیدیم و در سایہ چراغ جزو می کشیدم'' (اخبار الاخیار۔ صفحہ 313)

رات رہتے، اندھیرے منہ گھر سے نکل جاتے اور مدرسہ پہنچ کر چراغ کی روشنی میں ایک ایک جز لکھ ڈالتے، گویا رات کافی باقی رہتی ہوگی۔ دو میل چلنا اور پھر ایک جزء کا چراغ ہی کی روشنی میں نقل کرنا معمولی قلیل وقت میں ممکن نہیں۔

اِدھر طلبہ میں علم کی طلب کا یہ بے پناہ شوق اور دوسری طرف اساتذہ کا ان کے ساتھ تعلق کچھ اس نوعیت کا ہو جاتا تھا کہ ان کی معمولی ناراضگی کے خیال کو بھی طلبہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جانتے تھے کہ اساتذہ کے لیے سب سے زیادہ گراں بات طالب العلم کا وقت پر نہ آنا تھا جس سے اس کا استغنا ثابت ہوتا تھا اور کوئی استاد اپنے شاگرد کے متعلق اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس سے پڑھنا بھی چاہتا ہو اور طریقہ عمل سے یہ بھی ظاہر کرتا ہو کہ اپنے استاد کا وہ اس علم میں چنداں محتاج نہیں ہے۔

بہرحال اب اسباب کچھ ہی ہوں، موروثی روایات کا اثر ہو یا کوئی بات ہو۔ واقعہ یہی تھا کہ حاضری کے رجسٹروں کے فقدان کے باوجود طالب العلم کا سبق سے غیر حاضر ہونا اس زمانہ میں اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ

قدرت ہی نے غیر حاضری پر اسے مجبور نہ کر دیا ہو بلکہ بسا اوقات ان بزرگوں کے شوق بے پروانے قدرتی موانع کی بھی پروا نہ کی۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰنؒ کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج ہے کہ جن دنوں قاری صاحب شاہ اسحٰق محدث دہلویؒ سے پڑھتے تھے' ایک دن موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوا اور قاری صاحب قیام گاہ کی دوری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جو طلبہ حاضر تھے انہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اس بارش میں قاری صاحب کا اتنے طول طویل فاصلہ سے آنا ناممکن ہے' اس لیے سبق شروع کرا دیا جائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ''ابھی ٹھہرو وہ ضرور آئیں گے۔'' یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس برستے ہوئے پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ پائینچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں بہ حفاظت بند کیے قاری صاحب آ رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا' لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا' وہ قاری صاحب آ گئے۔ آؤ اب سبق پڑھو۔ (تذکرہ رحمانیہ۔ صفحہ 41)

بہر حال تعلیم میں اس کی وجہ سے جو تسلسل باقی رہتا تھا' نیز بجز جمعہ [12] اور غالباً رمضان کے ایک مہینہ کے سوا درس چونکہ سال بھر تک مسلسل جاری رہتا تھا اور اساتذہ کی کثرت کی وجہ سے جماعت کی پابندیوں سے لوگ آزاد تھے۔ دوسروں کی وجہ سے آہستہ چلنے پر چونکہ کوئی مجبور نہ تھا' کچھ تو قدیم طریقہ تعلیم کے ان خصوصیات اور سب سے بڑی وجہ یعنی وہی بات کہ تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری نہیں بلکہ مالم یعلم (جو آدمی نہیں جانتا) اس کے یعلم (جانے اس کو) کی صلاحیتوں کا ابھارنا' سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا تھا۔

ان ساری باتوں کا نتیجہ وہی تھا کہ عموماً لوگ بہت تھوڑی عمر میں سند فراغ حاصل کر لیتے تھے' اتنی تھوڑی عمر کہ آج اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو شاید افسانہ سے زیادہ اسے وقعت نہ دی جائے۔

ایسی ایسی ہستیاں جن کی عظمت و جلالت کے آوازے سے آج تک علم کا ایوان گونج رہا ہے' علم کے مختلف کنگروں پر ان کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ان بزرگوں کی سوانح عمریاں اٹھا کر پڑھیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج جس عمر میں لوگ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکتے' اسی عمر میں یہ حضرات فارغ التحصیل عالم قرار پا چکے تھے۔ فیضی جیسا ہمہ داں

امروز نہ شاعر و حکیم　　　　دانندہ حادث و قدیم

کا نعرہ لگانے والا

ایں کالبدم زخاک ہندست ولیک　　　　در ہر بنِ مُو ہزار یوناں دارم

لیکن ''ہزار یونان جس کے ہر بن مو'' میں پوشیدہ تھا' سنتے ہیں: ''فنون را نزد پدر در چہار دہ سالگی بانجام رسانید۔'' (مآثر الکرام۔ صفحہ 198)

مولانا فضل حق خیر آبادی صاحب ''ہدیہ سعیدیہ''

''شاگرد پدر خود مولوی فضل امام ست حدیث از مولانا عبدالقادر دہلوی اخذ کردہ......و فراغ علمی بعمر سیزدہ سالگی حاصل نمودہ۔'' (تذکرہ علماء ہند۔ صفحہ 164)

یہ وہی مولانا فضل حق خیر آبادی ہیں جو ''افق المبین'' کا سبق شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھایا کرتے تھے' علوم رسمیہ

خصوصاً معقولات اور حدیث یہ سارا قصہ کل تیرہ سال کی عمر میں ختم ہوگیا۔

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ اپنے خودنوشت میں لکھتے ہیں:

"لما وصلت الى خمس سنين اشتغلت بحفظ القرآن المجيد وحصلت فى اثناء بعض الكتب الفارسيه و تعلمت الخط و فرغت من الحفظ حين كان عمرى عشرسنين ومن بدر السنته الحاديه عشر شرعت فى تحصيل العلوم ففرغت من الكتب الدرسية فى الفنون الرسمية الصرف و النحو و المعانى والبيان والمنطق والحكمة والطب والفقة واصول الفقه علم الكلام والحديث والتفسير وغيره ذلک حين كان عمرى سبع عشرة سنته ۔" (صفحہ 112)

"جب عمر کے پانچویں سال میں میں پہنچا' تب حفظ قرآن میں مشغول ہوا۔ حفظ کے زمانہ میں بعض فارسی کتابیں پڑھتا رہا اور خط نویسی بھی' جب دس سال کی عمر ہوئی تو حفظ قرآن سے فارغ ہوگیا اور گیارہویں سال سے تحصیل علوم میں مشغول ہوا۔ رسمی فنون کی درسی کتابوں یعنی نحو' صرف' معانی' بیان' منطق' حکمت (فلسفہ) طب' فقہ واصول فقہ' علم کلام حدیث تفسیر وغیرہ علوم سے سترہویں سال کی عمر میں فارغ ہوگیا۔"

سترہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی مدت بھی داخل ہے بلکہ اسی میں بقول مولانا

"مع فترات وقعت فى اثناء التحصيل و طفرات واقعته فى آوان التكميل۔"

"اس میں بعض وقفے بھی تحصیل علوم میں پیش آئے اور تکمیل کے اس زمانہ میں بعض رکاوٹیں بھی ہوئیں۔"

میں نے قصداً مولانا کی عبارت اسی لیے نقل کی تاکہ معلوم ہو کہ اس قلیل مدت میں ان لوگوں کو کیا کیا پڑھایا جاتا تھا اور یہ چیزیں تو وہ ہیں جو اپنے والد سے انہوں نے پڑھی تھیں۔ ان کے سوا جب لکھنؤ آنا ہوتا تھا تو مولانا نعمت اللہ فرنگی محلیؒ سے جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

"قرأت عليه فى ثمان ثمانين شرح الجغمينى مع مواضع من حواشى البر جندى و امام الدين الرياضى و رسالة الاصطرلاب للطوسى و قدراً كثيراً من شرح التذكره للسيد و شرحها للحضرى و شرحها للبرجندى و ازيج الغ بيگ مع شرح البرجندى و رسال الاكرد التسطيح وغير ذلک۔"

"1288ھ میں مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے شرح چغمینی برجندی امام الدین ریاضی کے حواشی کے ساتھ میں نے پڑھی اور طوسی کے اسطرلاب کا رسالہ نیز تذکرہ کی شرح کا بھی ایک حصہ حضری و برجندی کی شرح کے ساتھ الغ بیگ کی زیج برجندی کی شرح کے ساتھ اکر کا رسالہ اور تسطیح کا رسالہ یہ ساری کتابیں بھی مولانا سے پڑھیں۔"

سترہ سال کی عمر اور اس میں علوم وفنون کے ان ہفت خوانوں کو طے کرنا اور کس طرح طے کرنا کہ ان ہی علوم کو پڑھانے بیٹھے تو ملک کے کناروں تک اپنے جلیل تلامذہ کی ایک فوج پھیلا دی۔ خود مولانا مرحوم کی پوری عمر ہی کیا ہوئی' چالیس کے قریب میں انتقال ہوگیا لیکن اس عرصہ میں ستر سے اوپر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں جن میں بعض کافی ضخیم ہیں۔ بعض ہندوستان کے سوا مصر میں بھی طبع ہوئیں۔ اس وقت تک بیسیوں کتابیں نظامی نصاب میں آپ ہی کی تحشیہ کی داخل

ہیں۔اسی کے ساتھ فتاویٰ کے مجلدات ہیں، علم کی یہ پختگی اوراس کے حصول میں وقت کی یہ نوعیت کیسی عجیب بات ہے۔

خود حضرت شاہ ولی اللہؒ کا کیا حال ہے۔''انفاس''میں رقمطراز ہیں:۔

''بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار در پانزدہم فراغ حاصل شد۔''(صفحہ 194)

صاحب''شمس بازغہ''علامہ محمود جونپوری کے ترجمہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

''نزد استاد الملک شیخ محمد افضل جونپوری تلمذ نمود ودر عرض ہفتدہ سالگی فاتحہ فراغ خواند۔''(صفحہ 202)

حضرت مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کے متعلق بھی صاحب کتاب''حدائق الحنفیہ''نے لکھا ہے۔

''سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر فائق اقران اور افاضل واماثل ہو گئے۔''(صفحہ 467)

اور کس کس کا نام گناؤں، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اسی کتاب''حدائق الحنفیہ''میں ہندوستان کے مشہور فاضل جلیل قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ جو عوام میں تو اپنی کتاب''مالابدمنہ''کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن اہل علم قاضی صاحب کی علمی بلند پائیگی کو ان کی''تفسیر مظہری''سے پہچانتے ہیں جس کا شاید میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے۔قاضی صاحب کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

''اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری سے فراغت پاکر علم طریقت کا شیخ محمد عابد سے اخذ کیا۔''(صفحہ 465)

اور صرف یہی نہیں اٹھارہ سال کی اسی مدت طالب العلمی میں ایک طرف تو قاضی صاحب نے تمام علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی اور دوسری طرف حیرت انگیز بات یہ کہ

''ایام تحصیل علم میں علاوہ کتب تحصیلیہ کے ساڑھے تین سو کتابیں مطالعہ کیں۔''(صفحہ 466)

کس قسم کی کتابیں ان کے مطالعہ سے گزری ہوں گی، اس کا اندازہ ان کے اس خاص علمی رجحان سے ہوسکتا ہے جو ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔[13] خصوصاً ہم جب اس پر غور کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمی زندگی زیادہ تر شاہ ولی اللہ جیسے بلند علمی مذاق رکھنے والے استاد کی شاگردی میں گذری۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کی جس شاخ کے اہل کمال کو آپ اس ملک میں پائیں گے، فراغت کی عمر یہی تیرہ چودہ سال سے بیس بائیس سال کی عمر سے زیادہ نظر نہ آئے گی۔مولانا غلام علی آزاد نے''مآثر الکرام''میں تقریباً ڈیڑھ سو سے اوپر علماء کا تذکرہ درج کیا ہے، اوسط عمر تحصیل کی قریب قریب یہی ہے۔

آج ہندوستان میں عصری جامعات جن لوگوں کو گریجوایٹ بنا بنا کر نکال رہی ہے، یوں کہنے کو تو ان طیلسانیوں کو سب ہی کچھ سکھایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر علم کی نمک چشی کے ساتھ زیادہ زور انگریزی دانی اور حساب و کتاب پر دیا جاتا ہے، لیکن اس پر بھی حال یہ ہے کہ ایک طرف اگر کذب[14] بیانی کو سکولی اور کالجی عمر کے اندراج میں جائز نہ ٹھہرالیا جاتا اور اسی کے ساتھ خضاب آہنی کی چلتی ہوئی ترکیب پردہ دار نہ بن جاتی تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لینے والے طلبہ کتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں کو لے کر تعلیم گاہوں سے باہر نکلتے۔

بہرحال ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں تحصیل علم کی اوسط مدت جو تھی وہ آپ دیکھ چکے لیکن نتیجے کے لحاظ سے اسی مختصر مدت تعلیم میں ہندوستان کو شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ، مولانا عبدالحیی، ملا محمود، ملا فیضی، مولانا بحرالعلوم، مولانا فضل حق

وغیرہم جیسی لازوال شہرتوں کی مالک ہستیاں مسلسل مل رہی تھیں۔

لیکن باوجود اس کے اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تعلیم کی اس زمانہ میں بھی کوئی مدت مقرر کردی گئی تھی۔ جس کے دل میں جس وقت بھی علم کا ولولہ سر اٹھاتا' آزاد تھا۔ جس استاد کے پاس چاہتا حاضر ہو جاتا تھا۔ عمر کی زیادتی کبھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ آئی۔ خود مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم (جد امجد فقیر) کا قصہ گذر چکا کہ متاہل ہونے کے بعد گھر سے پڑھنے کے لیے نکلے اور پڑھ ہی کر واپس آئے۔ مولانا آزاد نے میر درگاہی کے تذکرہ میں ان ہی کا بیان نقل کیا ہے۔

''بعد ازانے کہ پابند تاہل شدیم بہ کسب علم ترغیب نمودند'' اشارہ میر عبدالجلیل آزاد مرحوم کے نانا کی طرف ہے کہ انہوں نے کسب علم کی طرف توجہ کی۔ اسی سے پہلے یہ فقرہ ہے

''باعث تحصیل علم علامہ میر عبدالجلیل شدند۔''

چاہا جائے تو اس کے نظائر و امثال بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً پڑھنے پڑھانے کے بعد کسی جدید زبان[15] یا علم کے سیکھنے کی ضرورت اگر کسی کو پیش آ گئی ہے تو پیرانہ سری بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ''تذکرۂ علماء ہند'' میں ہے۔

''بشوق آموختن زبانِ عبرانی بہ کلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند پابند اقامت گشتہ از احبار (ہاخام) زبان عبرانی را بہ جمیع الوجوہ آموخت۔'' (صفحہ 152)

جبرو (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دستگاہ حاصل تھی' اس کا اندازہ ان کی کتاب ''بشریٰ'' اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیلؑ کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا جز بنا کر اسے شائع کیا ہے۔

علامہ تفضل حسین خاں کا ذکر پہلے کہیں گذر رہا ہے۔ یہ بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جنہوں نے تحصیل علوم رسمیہ کے بعد ''انگریزی و رومی.... آں را لاتینی نیز گویند..... یونانی را نیکو گفتے دخواندے و نوشتے۔'' (نجوم السماء۔ صفحہ 324)

چریاکوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریاکوٹی ہیں۔ صاحب ''تذکرۂ علماء ہند'' نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم زبانِ سنسکرت در دلش پدید آمد تا اینکہ در تحصیل زبان مذکور حطے دانی برگفت و بمقام بنارس کہ معدن مہرہ زبان مرقوم ست میاں ماہرانِ ایں فن امتیازے کافی یافت۔'' (صفحہ 157)

مولوی نصرت علی خاں دہلوی تخلص قیصرؔ کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے۔

''علوم رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر زبان فارسی و عربی و ترکی و انگریزی و ہندی ست۔'' (صفحہ 237)

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد مولوی ناصر الدین جو عیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں چونکہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے' اس لیے لوگوں میں ''امام فن مناظرہ'' کے لقب سے مشہور تھے۔ کنیت ابوالمنصور تھی' ان کے متعلق

بھی لکھا ہے "اکتساب علوم از والد ماجد و جد امجد خود نمودہ" جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو "تورات و انجیل بالتفسیر عبرانی و یونانی از علماء اہل کتاب خواندہ۔" (صفحہ 232)

مولوی نجف علی جھجھر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے۔ لکھا ہے کہ "پنجاہ رسائل بالسنہ خمسہ کہ دری و پاژندی و عربی و فارسی دار دو عبارت از آنست۔" (تذکرہ علماء ہند۔ صفحہ 236) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی اردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی انہوں نے تحصیل علم کے بعد غالباً کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا۔ حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ "شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بہ صنعت اہمال تصنیف کرد۔" پوری "حریری" کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب "دساتیر" کی ایک شرح "ویمزا" نامی پاژندی زبان میں اور "رمان سفرنگ" دری زبان میں لکھی تھی۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے سنی تھی۔ اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کیے۔ اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے۔ کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے۔ کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کر دے۔ اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسمؒ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ وہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا کیونکہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو کرنے سے پڑ سکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمیٰ نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی۔ کاش! یہ صورت پیش آ جاتی تو دار العلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا۔ لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جا رہا ہے، ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی۔ حضرت مولانا قاسم کے نقطہ نظر کو تو آپ سن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی (16) کی ہے۔ "النور" میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ماہ ربیع الثانی 1361ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں، میر زاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں۔"

خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میر زاہد کی لیکن حکیم الامتہ کا خیال یہی ہے۔ اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی۔"

نی وہی ''انما الاعمال'' والی بات ہے۔ جامع ملفوظ نے اس ملفوظ کو درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ''یہ بات بڑی ت سے فرمائی۔''

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطہ نظر ہوا گر بجائے امور عامہ اور صدرا و شمس بازغہ کے تمرینی اغراض کے لیے دید علوم وفنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ختیار کیا جائے۔ ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا جیسے بخاری کا ھنا باعث اجر ہے بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چونکہ اسلام کی خدمت کا موقع امور عامہ کے ھنے سے زیادہ مل سکتا ہے' اس لیے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ استاذ اساتذہ الہند' مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً جماعت دیوبندیہ کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق جب ان کے ''ملفوظات طیبہ'' میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (حبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی آ گیا تھا' حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے لیکن باوجود اس کے حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ

''فاضلے از اکابر علماء آمدہ از وتحقیق توریت بلسان عبری می کردم۔'' (ملفوظات عزیزیہ۔ صفحہ 27)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہِ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی۔ جامع ملفوظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ''چنانچہ چند آیات او (توریت) مع ترجمہ ارشاد فرمود۔'' (صفحہ 27) اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے لیکن کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں۔

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے عبری زبان سیکھی تھی' پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی' اگر ان ہی کے پیش رووں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود معمر ہونے کے اگر کر لیا ہو تو کیا تعجب ہے؟ واقعات تو یہ ہیں لیکن اب ان کو کیا کہیے جنھوں نے ان ہی مولویوں کی طرف انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کے فتوے کو اس طرح منسوب کیا کہ گویا وہ کوئی واقعہ ہے۔ خیر ایک ضمنی بات کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں اسلامی عہد کے اس دستور کا ذکر کر رہا تھا کہ عمر کی کوئی قید تحصیل علم کے لیے نہ تھی۔ ابوالفضل جیسے سر پھرے آدمی کے متعلق ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ شیخ حسن علی موصلی جو شاہ فتح اللہ کے شاگرد تھے' ان سے ''چندگاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ از وتعلیم فن ریاضی وطبعی وسائر اقسام حکمت گرفت ودقائق غوامض علوم را از وکسب کرد'' (صفحہ 36: جلد 3) خفیہ غالباً اس لیے پڑھائی ہوتی ہوگی کہ اکبر کو تو ابوالفضل نے یہ باور کرایا تھا کہ ان کے والد جامع معقول ومنقول نے سب کچھ گھول کر اس کو پلا دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور ریاضی میں یا تو خود ملا مبارک زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے یا ابوالفضل کو ان سے پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ خود ملا عبدالقادر نے اپنے متعلق بھی لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھتیجے میر تقی سے ''فقیر پارہ از بست باب اصطرلاب پیش او گزرانید۔'' (صفحہ 293 جلد 3) حقیقت یہ ہے کہ ''اطلبوا العلم من المهد الی اللحد'' پر مسلمانوں کا عمل زبانی حد تک نہیں تھا اور جب قوموں کے اقبال وعروج کا زمانہ ہوتا ہے تو ان میں یہی جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ خود ان انگریزوں کا کیا حال تھا جو شروع

شروع ہندوستان آئے۔ ان میں کتنے تھے جو عربی و فارسی سنسکرت ہندوستان کے مولویوں اور پنڈتوں سے سیکھتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پڑھ لکھ لینے یا فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اب کچھ نہیں سیکھا جا سکتا' جو کچھ پڑھنا تھا پڑھ چکے بلکہ ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا نظر آتا ہے جس نے ضرورت کے وقت نہ عمر کا خیال اور نہ وقت کا۔ دھن بندھی اور کام میں لگ گئے۔ حیدرآباد میں ایک اہلحدیث مولوی زین العابدین[17] نامی رہتے تھے۔ وطن آرہ شاہ آباد (بہار) تھا' سکول میں عربی کے معلم تھے۔ اپنا قصہ مجھ سے خود بیان فرماتے تھے کہ علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد طب پڑھ کر چھپرہ میں مَیں نے مطب شروع کیا۔ کسی مریض کے پاس گیا ہوا تھا' ایک ڈاکٹر بھی اس عرصہ میں بلایا گیا' مجھے دیکھ کر میرے منہ پر اس نے تیمارداروں سے کہا کہ اس نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے۔ جو میری تشخیص تھی' میں نے بیان کی جس پر ہنسا اور میری ناواقفیت کا اس نے مضحکہ اڑایا۔ مجھے اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گذری کہ مریض کے گھر سے مطب آیا۔ اسی وقت مطب کو بند کر کے میں نے کلکتہ کا ٹکٹ لیا' وہاں انگریزی شروع کی۔ انٹرنس پاس کیا' مقصود یہ تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اس ڈاکٹر کو جواب دوں گا' اب یہ محفوظ نہ رہا کہ ڈاکٹری بھی انہوں نے پڑھی یا نہیں لیکن اسی جھونک میں انٹرنس تک انگریزی تو پڑھ ڈالی۔

سب سے عجیب چیز جو ہندوستانی علماء کی بلند ہمتیوں کے سلسلہ میں مجھے نظر آتی ہے' وہ قرآن مجید کے حفظ کے ساتھ ان کا تعلق ہے' میرا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو بچپن میں قرآن کے یاد کرنے کا موقع نہ مل سکا اور آخر عمر میں خیال آیا کہ قرآن یاد کرنا چاہیے' ایک نہیں آپ کو بیسیوں مثالیں اس کی ملیں گی کہ کمر کس کر بیٹھ گئے اور حافظ بن کر اٹھے۔ مولانا آزاد نے میر محب اللہ بلگرامی کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

''درعنفوان جوانی ذوق حفظ کلام ربانی بہم رسانید بر بالاخانہ خود نشستہ درعرصہ شش ماہ قرآن را یاد کرد۔'' (صفحہ 128)

مشہور مدرس و محشی مولانا معین الدین کڑوی کے متعلق ''تذکرہ علماء ہند'' میں لکھا ہے:

''باواسط عمر خود باوجود کثرت درس حفظ قرآن مجید کردہ'' (صفحہ 229)

انیٹھی (اودھ) کے ایک بزرگ شیخ احمدی[18] فیاض تھے۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

''بسیار ضعیف و مسن شدہ چنانچہ قوت رفتن و گشتن نداشت'' اسی حالت میں ''آن کبیر سن بر بستر بیماری صعب افتادو قرآن مجید را در یک سال یا گرفتہ۔'' (صفحہ 83)

وہی مولانا فضل حق خیرآبادی جنہیں شطرنج کھیلتے ہوئے مولوی رحمان علی نے دیکھا تھا' جب شاہ دھومن دہلوی سے مرید ہو کر تائب ہوئے تو ان کے تذکرہ میں لکھا ہے ''قرآن مجید در چہار ماہ یاد گرفت۔'' (صفحہ 164)

اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ لاہور کے مولوی روح اللہ صاحب جو ''در صرف و نحو منطق و معانی و حدیث و تفسیر دانی نظیر نہ داشت'' جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ''بسی روز بماہ رمضان شریف قرآن مجید حفظ کرد۔'' (صفحہ 66)

انتہا اس ذوق کی یہ ہے کہ اورنگ جہاں بانی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد عالمگیر نے قرآن خود حفظ کیا اور اپنی چہیتی شہزادی زیب النساء کو بھی قرآن زبانی یاد کروایا۔

یہ رواج ہندوستان میں اتنا چلا ہوا نظر آتا ہے کہ صرف اسی پر ایک مستقل مقالہ لکھنے والے چاہیں تو تیار کر سکتے ہیں۔ ہمارے عہد میں بھی جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحئی مرحوم نبیرۂ مولانا احمد علی سہارنپوریؒ جو شہزادگان آصفی کے استاد بھی تھے' پچاس سال کی عمر کے بعد حفظ قرآن میں مشغول ہوئے اور تراویح سنا کر بلکہ دوسرے سال تراویح پڑھاتے ہوئے طاعون میں مبتلا ہو کر مولانا نے درجہ شہادت حاصل کیا۔ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے ارادت و خلافت کا تعلق رکھتے تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے بھی قریب قریب پورا قرآن حال ہی میں یاد فرمایا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی سن کہولت ہی میں قرآن کو محفوظ فرمایا ہے۔ جیل خانوں کی زندگی میں حضرت والا کا سب سے بڑا مشغلہ یہی اشتغال بالقرآن رہتا ہے اور پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات [19] میرے کان میں پہنچی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قرآن اس وقت یاد کیا جب حج کے ارادہ سے آپ جہاز پر سوار ہوئے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دیکھا گیا۔ تراویح کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہمسفر تھے۔ اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا' آخر مولانا ہی تیار ہو گئے۔ روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سنا دیا کرتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ "حدائق الحنفیہ" میں مولوی غلام محی الدین بگوی جن کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے' ان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے تراویح سننے کی ان سے خواہش کی۔ انہوں نے کہا کہ روزانہ ایک پارہ کا دور سن لیں تو سنا سکتا ہوں۔ آخر یہی ہوا کہ روز ایک پارہ کا دور جو صرف چاشت کے وقت کرتے تھے اور رات کو وہی پارہ سنا دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ معمر ہونے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شروع سے جاری رہا ہے اور سچ پوچھیے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت یہی عمل قرار پا سکتا ہے۔ آخر رسول اللہؐ نے ظاہر ہے کہ چالیس کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا۔ صحابہ میں بھی جو لوگ حافظ تھے' کھلی ہوئی بات یہی ہے کہ اس کا موقع معمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا حفظ قرآن کے ساتھ جو تعلق رہا ہے اور اسی جذبہ کے زیر اثر بچپن میں قرآن یاد کرانے کا جو ذوق شوق ہندی مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے' اس کے لیے تو کسی تاریخی شہادت کی بھی حاجت نہیں' شاید ہی مسلمانوں کی کوئی معقول آبادی ہوگی جس میں آپ کو ایک دو آدمی پورے قرآن کے حافظ نہ مل جائیں۔ پنجاب سے بنگال تک اور نیپال کی ترائی سے راس کماری تک جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں' ان شاء اللہ آپ کو یہ کیفیت نظر آئے گی۔ امیر وغریب متوسط حال' ہر طبقہ میں یہ حال عام ہے۔ دلّی میں جب مسلمانوں کی دلّی تھی' اس وقت اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔ ان کے ملفوظات میں ہے۔ "شبے در جامع مسجد شمار کردہ بودم سی و پنج (35) جا تراویح مع الجماعت حفاظ می خوانند۔" (صفحہ 47) ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب لال قلعہ کے باہر مسلمانوں کے بادشاہ کی بادشاہی باقی نہ تھی۔

خود اسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر اعظم عالی جناب نواب سر حافظ احمد سعید خاں

بالقابہ حافظ قرآن کی دولت سرمدی سے سرفراز ہیں۔ التزاماً ہر سال تراویح بھی سناتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن دنوں آپ برطانوی حکومت کی طرف سے صوبہ جات متحدہ کے گورنر (حاکم اعلیٰ) تھے' اس زمانہ میں بھی گورنر ہاؤس (دارالحکومت) میں تراویح کے سلسلہ کو آپ نے برابر جاری رکھا۔ صرف یہی نہیں کہ سلطنت آصفیہ کے باب حکومت کے آپ صدر رہے بلکہ بحمد اللہ چھتاری کی ریاست کے کابرعن کابر اباًعن جدٍ آپ کا خاندان والی چلا آرہا ہے اور اس وقت اس ریاست کے مالک آپ ہی ہیں۔

اسی طرح ریاست ٹونک کے فرمانروائے حال نواب سعادت علی خاں اور ان کے پدر بزرگوار حافظ ابراہیم علی خاں خلیل مرحوم کو بھی حفظ قرآن کا شرف حاصل تھا۔ اس فہرست کو اپنی معلومات کے لحاظ سے اگر بڑھاؤں تو غالباً چند اوراق نذر کرنے پڑیں گے۔ وہی تاریخی مثال کیا کم ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ جیسا باجبروت وجلال بادشاہ جو گجرات' کاٹھیاواڑ' کوکن خاندیس اور دکن کے ایک بڑے علاقہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا' تاریخ گجرات میں اسی بادشاہ کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ

> ''ایک روز رمضان میں حافظ قرآن کی بہت تعریف ہو رہی تھی خود (محمود بیگڑہ سلطان گجرات) کہنے لگا افسوس ہماری اولاد میں کوئی حافظ ہوتا تو ہم کو بھی جنت ملتی۔ شہزادہ خلیل نے سنا' یہ صاحب علم تھا' دل میں چوٹ لگی۔ اسی روز سے خفیہ طور پر حفظ شروع کیا۔ آئندہ سال پہلی رمضان کو باپ سے کہا' حکم ہو تو میں نماز تراویح میں تمام قرآن مجید سناؤں۔ سلطان بہت خوش ہوا اور معقول انعام دیا۔'' (مرأۃ محمدی۔ صفحہ 91)

ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق جن اساسی امور کا تذکرہ مقصود تھا' تقریباً وہ ختم ہو چکے ہیں لیکن چند ضمنی امور اور ایک اہم باب اس سلسلہ میں باقی ہے۔ اب میں اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ اسی سے وہ راز بھی منکشف ہوگا کہ ہندی مسلمانوں کا قرآن سے غیر معمولی والہانہ تعلق کیوں پیدا ہوگیا۔ کن تاریخی عوامل و موثرات کے تحت یہ چیز ہم میں پیدا ہوئی۔

علم کے ایک خطرناک پہلو کا قرآنی علاج

بات یہ ہے کہ عام حیوانات کے مقابلہ میں ''الانسان'' ایک تعلیمی حقیقت ہے یعنی جن چیزوں کے علم سے خالی اور جاہل ہو کر پیدا ہوتا ہے' تعلیم کے ذریعہ سے ان کے جاننے کی صلاحیت آدمی ہی میں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواند) تعلیم بالقلم (نوشت) کا ذکر کرنے کے بعد

علم الانسان مالم یعلم.

''سکھائی انسان کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا۔''

کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے:

کلا ان الانسان لیطغیٰ.

''خبردار! بلاشبہ انسان سرکش ہو جاتا ہے۔''

''الانسان تعلیمی حقیقت ہے'' پھر ایک تنبیہ کلمہ ''کلا'' کے بعد فرمانا کہ ''الانسان سرکش ہو جاتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے' اسی کا اظہار ہے یعنی جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی میں صلاحیت بڑھتی جاتی ہے' دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اٹھنے لگتی ہیں۔ وساوس و شکوک' تنقید واعتراض یہ قصے ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں میں نہیں پیدا ہوتے بلکہ یہ سارے عوارض علم کے ہیں۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے' اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادتی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ علم کا یہی وہ خطرناک پہلو ہے کہ اس پہلو کی جانب سے معمولی غفلت ہمیشہ خطرناک نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے۔ تعلیم اور ایجوکیشن کے خلاف بعض دلوں میں جو مخالفت پائی جاتی ہے' دراصل علم کے ان ہی طغیانی نتائج پر ان کی مخالفت مبنی ہے' خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

بہرحال مسلمانوں کو پہلی نازل شدہ سورت میں تعلیم کے اس خطرناک پہلو پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس وقت دوسرے ممالک سے بحث نہیں لیکن ہندوستان کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جس زمانہ سے اس ملک میں اسلامی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا' اسی زمانہ سے آخر وقت تک جب تک زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی شعبہ بھی مسلمانوں کا برباد نہ ہوا تھا' یہ قرآنی نکتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دماغی تربیت واصلاح کے ساتھ ساتھ لزومی طور پر قلبی اصلاح کی طرف توجہ تعلیم کی ایک ناگزیر صورت سمجھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کر سکتے ہیں' جس نے مدرسہ سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو' خود قرآن میں علم کے اس طغیانی پہلو پر چونکانے کے بعد

ان راہ استغنی!

(اس لیے آدمی سرکش ہو جاتا ہے) وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے۔

کے الفاظ سے اس سبب کو ظاہر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اہل علم میں یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا پڑھ لکھ لینے کے بعد آدمی یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اب میں خود سوچ سکتا ہوں' دوسروں سے مشورہ لینے کی مجھے کوئی حاجت نہیں' حق وباطل میں امتیاز میرا دماغ خود پیدا کر سکتا ہے۔ علم کا یہی استغناء انسانیت کی موت ہوتی ہے' الغرض مرض (طغیان) سبب مرض استغناء کے بعد

ان الی ربک الرجعی.

''(علاج اس کی طغیانی کا یہ ہے) کہ تیرے رب کی طرف واپسی ہو۔''

کو اس طغیان کا واحد علاج بتایا گیا ہے۔ اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل تھی کہ جن کے پاس ان کا رب تھا' ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا' اپنی صحبت اپنی تربیت میں رکھ کر رجوع کرنے والے کو بھی اس کے رب کی طرف وہ پھیر دیتے تھے۔ اسی

ان مثالوں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن ان شاء اللہ یہی نیکیاں حضرت والا کو اب کام آ رہی ہوں گی اور خدا سے امید ہے کہ ان کے پوتوں کے لیے آباء کا یہ صلاح باعث فلاح بن جائے۔ وما ذالک علی اللہ العزیز۔

(3) ان کا نام مولانا غلام محی الدین بگوی تھا۔ ''بگا'' پنجاب کے کسی گاؤں کا نام ہے۔ یہ بھی شاہ اسحٰق ہی کے فیض یافتوں میں ہیں۔ لکھا ہے کہ لاہور میں لال کی مسجد میں تیس سال تک درس دیتے رہے۔ آخر میں فالج کا جب اثر ہوا تو بگا اپنے گاؤں چلے گئے جہاں تیرہ چودہ سال تک اسی بیماری کی حالت میں درس دیتے رہے۔ شاہی مسجد لاہور کے مشہور مدرس مولانا غلام محمد (جو بیک واسطہ خاکسار کے بھی استاذ ہیں یعنی میرے استاذ مولانا محمد اشرف ملتانی جن سے ادب و ریاضی کی کتابیں فقیر نے پڑھی ہیں) ان ہی کے شاگرد تھے۔ فالحمدللہ۔

(4) دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی حضرت استاذ مفتی عزیز الرحمٰنؒ کو خاکسار نے دیکھا تھا' ان کا بھی یہی حال تھا۔ حالانکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسہ کے سب سے بڑے مفتی تھے اور اسی لیے اخباروں میں عموماً ان کے زمانہ میں لوگ ان کو مفتی اعظم کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن آخر عمر تک ان کو اسی حال میں دیکھا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد نہ صرف اپنے گھر کا سودا سلف بلکہ محلے ٹولے کی بوڑھی بیوہ عورتوں کی فرمائشوں کو بازار سے خرید کر ان کے گھر پہنچانا ایک ضروری کام کی حیثیت سے انجام دیتے تھے۔ ملا عبدالقادر نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میاں عبداللہ کا یہ طریقہ نیا نہ تھا بلکہ یہ روش سلف خلف کی یہ پیروی تھی' خدا کا شکر ہے کہ ان آنکھوں نے بھی خلف میں ایسی ہستیوں کو دیکھا تھا۔ ریاست ٹونک میں اسلامی ریاست کی ایک شان اب تک یہ باقی ہے کہ شریعت کا محکمہ وہاں قائم ہے' جس میں ناظم محکمہ شریعت کے سوا چند مفتی بھی ریاست سے مقرر ہیں۔ ان مفتیوں میں ایک بزرگ مولانا نورالحق قدس سرہ بھی تھے۔ خاکسار نے چند رفقاء کے ساتھ ان سے مشکوٰۃ اور جلالین کے چند اجزاء پڑھے تھے۔ مولانا نورالحق باوجود مفتی شریعت ہونے کے بازار سے بھاجی دال گھی الغرض خانگی سودا سلف گھر کا خود خرید کر لاتے۔ ساری زندگی اسی طریقہ سے گذاری۔

(5) افسوس ہے کہ پیر محمد اور ملا نور محمد ترخاں کے تفصیلی حالات نہ مل سکے۔ عبدالقادر کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر یعنی ملا پیر محمد شیروانی الاصل تھے۔ ابتدا میں بیرم خاں کے متوسلوں میں تھے۔ بعد کو ناصر الملک کا خطاب شاہی دربار سے ملا۔ نربدا میں ڈوب کر مر گئے۔ دینی حالت ان کی کچھ اچھی نہ تھی۔ ملا نور محمد کے متعلق بھی اتنا لکھا ہے کہ ''جامع اقسام علوم حکم تو کلام بود'' ہمایوں کے مقبرہ کے آخری متولی تھے' شعر بھی کہتے تھے۔

(6) یہ عبارت میں نے ''تذکرۂ علماء ہند'' سے نقل کی ہے لیکن مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں'' میں بجائے بہار کے بردوان لکھا ہے۔ واللہ اعلم کیا واقعہ ہے' میں نے خود واقعہ کی تحقیق نہیں کی ہے۔ ممکن ہے کہ بردوان کو بہار کے قرب کی وجہ سے بہار میں داخل کر لیا گیا ہو ورنہ اب اس وقت تو وہ صوبہ بنگال کے مغربی حصہ کا ایک ضلع ہے۔

(7) طلبہ اور اساتذہ میں کس قسم کے انبساطی تعلقات تھے' اس کی ایک مثال وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو ملا عبدالنبی احمد نگری نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ میرا دستور تھا ''در ایام تعطیل با طلبائے یک دل و یک رو بہ جہلت شکار ماہی دراں باغ اتفاق سیر و تفریح می شد۔'' (صفحہ 26) آں باغ سے اشارہ احمد نظام شاہ بحری کے ایک باغ کی طرف ہے جس کا نام فیض بخش تھا۔ باغ کے بیچ میں ایک عظیم ساگر بنایا گیا تھا اور اسی ساگر کے بیچوں بیچ میں عمارت پختہ دو منزلہ بادشاہ نے بنوائی تھی' چاروں طرف پانی اور بیچ میں اس شاہی قصر کا ہونا جو دلکشی پیدا کر سکتا تھا' ظاہر ہے۔ ملا عبدالنبی اسی تالاب میں طلبہ کے ساتھ شکار ماہی کے لیے آتے تھے۔ اسی قسم کی ایک نظیر استاد السلطان نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کی سوانح عمری میں درج ہے۔ لکھا ہے کہ مولانا کو مدرسہ نظامیہ (جو ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ خدا کے فضل سے اب تک موجود ہے اسی مدرسہ نظامیہ) کے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ سال میں دو تین مرتبہ تمام طلبہ کو کسی باغ یا تفریح گاہ میں لے جاتے' دو تین روز قیام فرماتے' وہاں ان سے تقریریں مناظرے بیت بازی کے مقابلے کراتے' طلبہ جب اس سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ان کو کھیلنے کی اجازت دیتے۔ (صفحہ 85) یہاں اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ طلبہ کے ساتھ مولانا مرحوم کے انبساطی تعلقات کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب مولانا مرحوم نواب فضیلت جنگ کے خطاب شاہی کے ساتھ حکومت

آصفیہ کے وزیر مذہب یعنی صدر المہام امور مذہبی تھے بلکہ اپنے ذاتی اثر و اقتدار کے لحاظ سے تو کہا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم وقت سے بھی ان کا درجہ بلند و رفیع تھا لیکن عز و جاہ کے ان مدارج عالیہ پر پہنچ جانے کے بعد بھی علم کی جو عظمت قلب مبارک میں تھی اُس نے طلبہ علم سے زندگی بھر ان کو باندھے رکھا حتیٰ کہ ان ہی طالب العلموں کے درمیان مدرسہ نظامیہ ہی کے صحن میں مدفون ہیں۔ طاب ثراہ

(8) سرونج بھوپال سے 65 میل شمال میں اور گوالیار سے 150 میل دور جنوب میں واقع ہے۔

(9) واللہ اعلم اس شیخپورہ سے کون سا شیخپورہ مراد ہے' صوبہ بہار میں بھی بہار نامی ایک قصبہ بھی ہے جو اسلامی عہد میں بہار کا عاصمہ (پایہ تخت) تھا اور اب ایک معمولی سب ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہے' اسی سے دس کوس کے فاصلہ پر بسمت مشرق شیخپورہ نامی ایک اور قصبہ آباد ہے جس کے اطراف میں زیدی سادات کے بارہ گاؤں وندھیاچل کے سلسلہ کی ایک پہاڑی کے نیچے مسلسل ایک دوسرے سے ملے جلے آباد ہیں اور یہ شیخوپورہ انہی گاؤں کا مرکزی قصبہ ہے۔ ایک بزرگ شیخ شعیبؒ کا وہاں مزار ہے۔ کہتے ہیں کہ قصبہ ان ہی کے نام کی طرف منسوب ہے۔ شیخ شعیب آٹھویں صدی کے اکابر ہیں۔ ایک کتاب ''تذکرۃ الاصفیاء'' آپ کی مشہور بھی ہے۔

(10) ''فوائد الفواد'' میں سلطان جی نظام الدین اولیاءؒ کے حوالہ سے اس ناغہ کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات نقل کی ہے۔ حضرت اپنے استاذ شمس الملک مستوفی الممالک جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے' ان کے درسی خصوصیات کا تذکرہ فرماتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جو ان سے پڑھنا چاہتا اس سے منجملہ دیگر چند معاہدوں کے ایک معاہدہ اس کا بھی لیتے تھے کہ ''ناغہ'' نہ کرو گے۔ حضرت سلطان جی فرماتے ہیں۔ اتفاقاً کسی وجہ سے کسی دن کوئی طالب العلم درس میں حاضر نہ ہو سکا تو شمس الملک کا قاعدہ تھا کہ اس سے کہتے ''چہ کردہ ایم کہ نمی آئی'' یعنی میں نے آپ کا کیا گناہ کیا تھا جو تشریف نہ لائے۔ خود اپنے متعلق بھی فرماتے کہ ''اگر مرا ناغہ شدے یا بعد از دیر رفتے در خاطر گذشتے مارا ہم چیزے خواہد گفت'' بس یہی خیال کہ استاد پوچھیں گے ناغہ سے طالب العلموں کو روکتا تھا' آج بھی بدیر آنے سے طلبہ سے عصری جامعات میں بازپرس کی جاتی ہے لیکن کس انداز میں ''پندرہ منٹ ہو چکے کلاس سے باہر ہو جاؤ'' ایک طرف بازپرس کا یہ حال ہے اور دوسری طرف سنیے سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ان کے استاذ بازپرس بھی کرتے تو کن الفاظ میں فرماتے ہیں ''ایں گفتے'' یعنی یہ شعر پڑھتے ؎ آخر کرم از انکہ گاہ گاہے آئی و بما کئی نگاہے (فوائد الفواد۔ صفحہ 68) شاگرد کی گردن شرم سے جھک جاتی' محبت کے اسی برتاؤ کا یہ اثر تھا کہ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان جی اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد ''چشم پُر آب کرد'' کہاں اساتذہ و تلامذہ کے یہ تعلقات مودت و لطف ادا' کہاں مدرسہ کو پولیس کا محکمہ بنا دینا' اساتذہ گویا تھانہ داروں کا گروہ ہے اور تلامذہ مجرموں کی جماعت۔ وشتان بینھما

(11) ان ہی بعض میں کچھ دنوں کے لیے ایک دیوانہ بھی شریک تھا۔ اللہ اللہ راجپوتانہ کی وہ لو اور بارہ کے بعد قیام گاہ کی واپسی' خس خانہ و برفاب کی تلافی تاریک حجرے میں ایک موٹے لحاف کے اندر گھس کر کی جاتی تھی۔ پسینہ سے گو سارا جسم شرابور ہو جاتا تھا لیکن لو کی شدت سے بچنے کے لیے تاریک حجرہ اور لحاف اس وقت ایک بہترین پناہ گاہ تھے۔

(12) بعض بعض علمی خانوادوں میں علاوہ جمعہ کے منگل کے دن بھی درس نہ ہوتا تھا۔ ہمارے خیر آبادی خاندان میں بھی یہی دستور تھا۔ منگل کا دن صرف اساتذہ کے لیے تصنیف و تالیف کا تھا اور طلبہ کے لیے کتابوں کی نقل کا۔ محدث پانی پتی قاری عبد الرحمنؒ کے متعلق بھی ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ منگل کے روز طلبہ کو سبق نہیں پڑھایا کرتے تھے۔ قاری صاحب چونکہ لفظاً و معناً ولی اللہی خاندان کے اتباع میں مشہور تھے اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ یہ طریقہ انہوں نے شاہ صاحب کے خاندان ہی سے حاصل کیا تھا۔

(13) قاضی صاحب کی جو وسعت نظر علم حدیث اور فقہ و اصول فقہ و تصوف میں حاصل تھی' حقیقت یہ ہے کہ ان کی تفسیر کے دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کے علماء ہندوستان میں کم ہی گزرے ہیں اور ہندوستان ہی نہیں اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو قاضی صاحب کو بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاہ عبد العزیزؒ ان کو بیہقی وقت بلا وجہ نہیں کہتے تھے۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ سے قاضی صاحب نے اگرچہ ارشاد اپنے پیر شیخ محمد عابد کے حکم سے حاصل کیا تھا لیکن خود مرزا صاحب قاضی صاحب کو علم الہدیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ تفسیر کے سوا قاضی صاحب نے ایک بڑی معرکۃ الآرا مبسوط کتاب فقہ میں لکھی ہے جو فقہ جامع کی ایک

بہترین استدلالی کتاب ہے۔اس میں ہر باب میں آئمہ اربعہ کے مسائل ولائل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔اسی کتاب سے الگ کر کے آپ نے ''ماخذ الاقوی'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس میں آپ نے ان مسائل کو جمع کیا ہے جو دلیل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک قوی تر تھے۔افسوس کہ ملک کی ناقدریوں نے اب تک ان کتابوں کی اشاعت کا موقع بھی بہم نہ پہنچایا۔''تفسیر مظہری'' متعدد بار چھپنی شروع ہوئی لیکن آج تک مکمل نہ ہوسکی۔حکومت آصفیہ سے ایک صاحب نے روپیہ بھی وصول کرلیا لیکن تفسیر چھاپ کر نہ دی۔

(14) حکومت نے یہ قانون بنا کر کہ سولہ سال کی عمر سے پہلے کوئی میٹرک پاس نہیں کرسکتا اور چوبیس سال کی عمر کے بعد کسی کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جاسکتا' اس عجیب وغریب قانون نے لوگوں کو جھوٹ بولنے اور بلوانے پر آج مجبور کردیا ہے۔حالانکہ ان عجیب وغریب قیود کا مطلب آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے' ایک لڑکے میں اگر میٹرک پاس کرنے کی صلاحیت سولہ سال سے پہلے پیدا ہوگئی ہے تو آپ اس کو زبردستی اس امتحان میں کامیاب ہونے سے کیوں روک رہے ہیں۔ممکن ہے یورپ کے سرد ملک میں لوگ دیر میں ہوش و حواس سنبھالتے ہوں لیکن ہندوستان کی تاریخ آپ کو بتارہی ہے کہ میٹرک تو علم کا ابتدائی دروازہ ہے۔یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں لوگ فارغ التحصیل ہوکر فیضی اور بحرالعلوم بنتے تھے۔یہی حال ملازمت کا ہے۔کارکردگی کی صلاحیت جس میں پائی جاتی ہو وہ ملازمت کا مستحق ہوسکتا ہے' خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو۔آج بھی یہی ہورہا ہے لیکن جھوٹ کے پردے میں حقیقت کو چھپا کر بلاوجہ ایک اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے پر لوگوں کو مجبور کرنا اس زمانہ کا عجیب مذاق ہے۔

(15) مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا' اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوسکتا ہے۔حافظ ابن حجر نے ''درر کامنہ'' میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ تاتاری نومسلم بادشاہ غازان جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو ''بالغ فی الدعا'' (یعنی اس نومسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت دعائیں دیں) یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں' حافظ لکھتے ہیں'' بالمغلی ثم بالترکی ثم بالفارسی ثم بارومی ثم بالعربی۔'' جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا۔دیکھو صفحہ 22 جلد 3

(16) صد حیف کہ شریعت وطریقت کا یہ آفتاب درخشاں 19-20 جولائی 1943ء کی درمیانی شب میں غروب ہوگیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون' رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

(17) پندرہ سولہ سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت لے کر آرہ اپنے وطن گئے اور چند سال بعد انتقال کرگئے۔عجب مزاج کے آدمی تھے۔جودھن بندھ گئی کرگذرتے تھے۔خط پاکیزہ تھا' جلدوں کی کتابیں نقل کرکے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کیں۔''تہذیب التہذیب'' ابن حجر کی بارہ جلدوں میں مولانا کے ہاتھ کی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

(18) مولانا احمدی فیاض بھی ہندوستان کے ان علماء میں ہیں جن کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے ''تفسیر وحدیث وسیر وتاریخ خوب می داست واکثر کتب متداولہ راز برداشت۔''

(19) بعد کو تذکرہ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ کی سوانح عمری میں بحمداللہ یہ الفاظ بھی مل گئے۔ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم حج بیت اللہ کو تشریف لے جارہے تھے' جہاز میں ماہ رمضان المبارک آگیا۔مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کردیا۔دن میں بمقدار تراویح یاد کر کے رات کو سنادیتے تھے۔(صفحہ 122)

(20) اس قسم کی فضول بے معنی بحثیں کہ ''صوفی'' کا مادۂ اشتقاق کیا ہے؟ وہ مادہ عربی ہے کہ یونانی' میرے نزدیک غیر ضروری ہیں۔الفاظ کچھ ہی ہوں' نظر معنی اور مصداق پر رکھنی چاہیے۔مسلمانوں نے تو روزہ اور ایمان جیسی عبادتوں کا ترجمہ عجمی الفاظ میں کرلیا ہے' کیا یہ دلیل ہوگی کہ یہ عبادتیں ایران سے حاصل کی گئی ہیں کیونکہ یہ الفاظ عربی نہیں ہیں۔علماء رسوم کو عموماً ملا یا منلا مختلف اسلامی ملکوں میں کہا جاتا ہے۔اس لفظ کی اصل کیا ہے' کیا بدھ مذہب کے مذہبی پیشواؤں کو جولامہ کہتے تھے' اسی کی یہ معکوس شکل ہے۔بالفرض اگر یہ ہو بھی تو کیا ہمارے علماء کے علوم بدھ مذہب کی کتابوں سے ماخوذ سمجھے جائیں گے؟

ہندی تصوف اور ہندوستانی صوفیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اس ملک میں تصوف اور صوفی کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہے' ان کو دیکھ کر اسلاف کے متعلق رائے قائم کرنے والوں کو اگر کچھ مغالطہ ہو تو یہ مغالطہ بے بنیاد نہیں ہے لیکن جو حالات سے واقف ہیں' ان کے نزدیک یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے جیسے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھ کر کوئی حقیقی اسلام یا پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرامؓ کے متعلق غلط فیصلہ کر بیٹھے مگر کیا کیجیے کہ آج یہی کیا جا رہا ہے۔ اسی کا نام ریسرچ اور تحقیقات رکھا گیا ہے۔ خصوصاً تصوف اور صوفیا کے ساتھ تحقیقاتی بازی گروں کی ذہنی بازیچوں کا عجب حال ہے۔ صوفیا اور تصوف کی اہمیت کو گھٹانے کا جو فیصلہ کر چکے ہیں' وہ اپنے اس طے شدہ فیصلہ کی تائید میں ایسی باتیں جمع کرتے ہیں جن سے ثابت ہو جائے کہ ہندو جوگیوں اور فلسفہ ویدانت کے زیر اثر ایک خاص قسم کی راہبانہ زندگی بعض مسلمانوں نے جو اختیار کی' اسی کا نام تصوف ہے ورنہ اسلام کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا اگرچہ اس کا بھی کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اس ملک میں آ کر ہندی اور بھاشا میں شاعری کی۔ بعضوں نے سنسکرت سیکھی۔ بعضوں نے یہاں کی موسیقی اور موسیقی کے لوازم سیکھے۔ اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے ہندوؤں کے یوگا کو بھی سیکھا ہو جس کی یوں تو بہت کچھ تعریف کی جاتی ہے' کہا جاتا ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ ہوتا ہے' وہ ہوتا ہے لیکن اگر پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کی کوشش کی جائے تو ہم مذہبی اور دینی حیثیت سے تو ہندوستان کے اس یوگا یا جوگ گیان دھیان اور خدا جانے کیا کیا کا نتیجہ یہی دیکھتے ہیں کہ ننانوے فیصدی مخلوق اس ملک کی انتہائی مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہے۔ اوپر نیچے' اندر' باہر اس ملک کے عوام ہی کیا' اکثر و بیشتر خواص کے نزدیک بھی سارا ہندوستان اور اس کی فضا صرف بھوتوں اور پریتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ٹونکے' فال' بدشگونی' جنتر منتر' جوتش ان ہی چیزوں پر یہاں کے عام باشندوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ توحید خالص کا وہ نظریہ جس کا انتخاب ویدانت والوں کی طرف کیا جاتا ہے' اس کا کوئی اثر اس ملک کے رہنے والوں پر نظر نہیں آتا۔ پھر وہ کیا خاک روحانیت ہوئی' جو لوگوں کو درختوں اور پتھروں' سانپوں' بچھوؤں کے آگے جھکنے سے بھی روک نہ سکی۔ روحانی طاقت کا سب سے بڑا استعمال اگر ہو سکتا تھا تو ان ہی بے بنیاد اوہام کی صفائی ہو سکتا تھا۔

اس میں جس حد تک یہ ملک ناکام ہے' سو ظاہر ہے۔ یہ نہ ہو سکتا تھا تو جن روحانی قوتوں کی لن ترانیاں ان کے مداحوں کی طرف سے سننے میں آتی ہیں' کاش! اس کا یہی اثر ہوتا کہ اپنی ان روحانی قوتوں سے باہر سے آنے والی مادی قوتوں ہی کا مقابلہ کیا جاتا' سو اس کا حال بھی ظاہر ہے کہ باوجود رشیوں' منیوں' گیانیوں اور دھیانیوں کے یہ مسکین ملک ہمیشہ بیرونی قوموں کی چراگاہ کا کام دیتا رہا۔ مسلمانوں سے پہلے بھی مسلمانوں کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل جانے کے بعد بھی اسی حال میں اب تک گرفتار ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مجاہدات و ریاضات کا آخر حاصل کیا ہوا۔ اگر مداریوں کے چند تماشوں کے دکھانے کی قدرت ان سے پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بیچارے مداریوں اور نٹوں کو کیوں ذلیل سمجھا جاتا ہے؟ بہر حال مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ اس قسم کے اعمال و اشغال ہندوؤں اور ان کے جوگیوں میں ضرور پائے جاتے ہیں جن سے کچھ نادرہ نمائیوں کی قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے۔

لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ ہندوستان کے اسلامی صوفیا کی طرف جو یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جوگیوں سے چیزیں سیکھی تھیں۔ آخر اس کی بنیاد کیا ہے۔ ہمارے بزرگوں کے حالات سوانح عمریاں موجود ہیں' کم از کم صوفیائے ہند کے مشاہیر اکابر کی زندگی تو سب کے سامنے ہے۔ کیا کوئی ایک دو فقرے ہی نکال کر بتا سکتا ہے جن سے اس دعوے کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے۔ ہندوستانی صوفیوں میں سب سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز طبقہ اصحاب چشت کا ہے۔ چشتی سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ بزرگ اجمیری' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ شیخ فرید الحق والدین شکر گنج' سلطان المشائخ حضرت نظام الاولیاءؒ وغیرہم حضرات ہیں۔ ان میں سے بتایا جائے کہ کس بزرگ کو جوگیوں کی صحبت حاصل ہوئی ہو۔

اور بزرگوں کی تو کوئی معتبر کتاب نہیں پائی جاتی ہے لیکن ''فوائد الفواد'' کے متعلق تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات اور ان کی نظر سے گزری ہوئی کتاب ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ اس زمانہ میں اس قسم کی کتابیں پڑھتے نہیں یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں ورنہ اسی کتاب سے لوگوں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان بزرگوں کا ہندوستان کے جوگیوں سے کس قسم کا تعلق تھا اور اس طبقہ کا ذکر وہ کن الفاظ میں فرماتے تھے۔ ''جامع ملفوظات'' نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ ایک دن شیخ صفی الدین گازرونی کا ذکر فرما رہے تھے کہ ان کی خدمت میں ایک جوگی آیا اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگا۔ شیخ گازرونی کو مخاطب کر کے بولا ''بیا قدم بنما'' آؤ اپنا مقام یا اپنی کرامت دکھاؤ۔ شیخ گازرونی نے جواب میں فرمایا کہ ''دعویٰ تو می کنی تو قدم بنما'' جوگی قدم نمائی کا اظہار ''از زمیں بر ہوا بر آمد'' سے کرنے لگا۔ یعنی زمین سے معلق ہو کر ''ہوا میں تھرانے لگا'' اور چند منٹ کے بعد زمین پر اتر کر شیخ گازرونی سے بھی اسی تماشے کا مطالبہ کرنے لگا۔ اب یہی مقام سوچنے کا ہے۔ اگر اسلامی صوفیا کو بھی اسی قسم کی کوئی مشق ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ بھی بازوؤں کو پھڑ پھڑا کر ہوا میں اڑنے لگتے لیکن شیخ گازرونی نے اس تماشے کو دیکھ کر کیا کیا۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

''شیخ صفی الدین گازرونی روئے سوئے آسماں کردو گفت خداوندا! بیگانہ را ایں قدم دادہ مرا ہم ایں معنی کرامت کن۔''

لیجیے عین وقت پر اب ان کو کرامت کی تلاش ہوتی ہے۔ اپنے مالک سے التجا کرتے ہیں کہ ہم نے تو یہ ورزشیں کبھی کی نہیں۔ اب ایک بیگانہ آپ سے ناآشنا برسرجدل آمادہ ہے۔ آپ ہی اپنے بندے کی مدد کیجیے۔ بہر حال کہا جاتا ہے کہ شیخ کو بھی حق تعالیٰ نے قوت طیران عطا فرمائی اور ایسی قوت کہ جوگی بھی دیکھ کر حیران ہو گیا کیونکہ جوگی کو لے دے کر بس اتنی ہی مشق تھی کہ سیدھے ہوا میں جائے اور پھر اسی خط مستقیم پر واپس آ جائے' اِدھر اُدھر نہیں جا سکتا تھا لیکن شیخ گازرونی کا طیران مشق کا نتیجہ تو تھا نہیں۔ وہ تو

انا لنبصر رسلنا و الذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد (مومن)

''ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا والی زندگی میں اور جب گواہ پیش ہوں گے۔''

کے وعدے کا ایفا اپنے اس مالک سے چاہتے تھے جس پر وہ ایمان لائے تھے اور اس کی نصرت جس بندہ کو حاصل ہو جائے' وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا' ہوا یہ کہ

''بعدازاں شیخ (گازرونی) از جائے برآمد جانب قبلہ طیران نمود' ازانجا بجانب شمال شد' باز طرف جنوب' باز بہ مقام خود بہ نشست'' (صفحہ 50۔ فوائد الفواد)

یہ الگ بحث ہے کہ ایمان والوں کے ساتھ اس ''الحیٰوۃ الدنیا'' میں حق تعالیٰ کی نصرت کا ظہور اس شکل میں ہو سکتا ہے یا نہیں' اس سے قطع نظر کیجیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس قصہ کے بیان کرنے والے کے متعلق کیا ادنیٰ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جوگیانہ کرتبوں سے واقف تھا یا اس کی نگاہ میں ان جوگیانہ اعمال و افعال کی کچھ وقعت تھی۔ ایک سیدھا سادہ مسلمان ان جوگیانہ اعمال کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا خیال رکھ سکتا ہے جو اس قصہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جن ہندی صوفیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ جوگیوں سے انہوں نے یوگا اور جوگا کا فن سیکھا تھا' وہ کون لوگ ہیں۔ سلطان المشائخ کا شمار اگر ہندی صوفیوں میں نہیں ہے تو کن کا ہے۔

کس قدر بات الٹی بیان کی جاتی ہے۔ جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے' واقعہ یہ ہے کہ خود ان اسلامی بزرگوں کے روحانی تقدس و جلال کو دیکھ کر پہلے بھی اور اب بھی جوگیوں میں سے بعض لوگ اسلامی بزرگوں کی خدمت میں ''درشن'' ہی کی نیت سے سہی مگر آمد و رفت رکھتے تھے اور بسا اوقات اپنے دوسرے دیوتاؤں میں اس بزرگ کو بھی دیوتا بنا کر شریک کر لیتے تھے' یہ اس قوم کی پرانی عادت ہے۔ ہندوؤں میں جو لوگ ''انگریزی قومیت'' کے زہریلے اثر سے پاک ہیں۔ وہ اسلامی بزرگوں کا اب بھی احترام کرتے ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر بابا شکر گنج کی خدمت میں جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کبھی کبھی بابا صاحب کی مجلس میں ''رمتے جوگی'' بھی وہی ''درشن'' یا تبرک حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے' سلطان جی نے حضرت کے دربار کی یہ خصوصیت بیان کی ہے۔

''بخدمت [1] شیخ الاسلام فریدالدینؒ از ہر جنس درویش و غیر آں برسیدے۔'' (فوائد۔ صفحہ 51)

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، کبھی کبھی ان جوگیوں سے آپ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے لیکن کس قسم کی باتیں، ایک دو نمونے ان کے بھی سن لیجیے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن بزرگوں کا نام ''ہندوستانی صوفیا'' ہے۔ ان کا تعلق ان بیچارے جوگیوں سے کیا تھا۔ سلطان المشائخ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

''وقتے بخدمت شیخ الاسلام فرید الدین بودم قدس اللہ سرہ العزیز انجا جوگیے حاضر بود۔''

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی مجلس میں اس کا ذکر چھڑا کہ بعض بچے فطرتاً نالائق اور ناہموار، بے ذوق پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر جوگی نے اپنے جوگیانہ علم کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ ''مردمان وقت مباشرت نمی دانند'' اور اس کے بعد کہنے لگا کہ دراصل بعض مہینے تیس دن کے ہوتے ہیں اور بعض مہینے انتیس دن کے۔

''دہر روز را خاصیتے ست مثلاً اگر روز اول مباشرت کنند فرزند چنیں آید اگر روز دوم کنند چنیں باشد، الغرض ہر روز را حکم بیان می کرد۔''

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، جوگی کی یہ عجیب بات انہیں پسند آئی اور آپ نے جوگی کی بتائی ہوئی تاریخوں اور ہر تاریخ کی جو خاصیت اس نے بیان کی تھی، اس کو دہرا کر جوگی سے پوچھا کہ تم نے یہی بتایا تھا؟ حضرت بابا صاحب جوگی اور سلطان المشائخ کی باتیں سن رہے تھے، جب دیکھا کہ سلطان المشائخ ان تاریخوں کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو بولے

''تو ازیں چیز ہا چہ می پرسی ترا ہرگز کار نخواہد آمد'' (صفحہ 246)

ایک کشفی اشارہ تھا کہ آپ کی زندگی مجردانہ گذرے گی، سو گذری۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ان جوگیوں سے اس زمانہ میں جو باتیں ہوتی بھی تھیں تو اسی قسم کی۔ ایک اور قصہ اسی ''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ ہی کی زبانی مروی ہے۔ نصیر نامی ایک طالب العلم کا قصہ آپ نے بیان کیا ہے کہ وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں بیعت کے بعد سر کے بال بڑھا رہا تھا، گویا کاکل بنانے کا ارادہ تھا۔ اتفاق سے ایک جوگی پھر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ''آں متعلم (نصیر) ازاں جوگی پرسیدن گرفت کہ موئے سر از چہ دراز شود'' سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طالب العلم کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری، گویا اس کے ذریعہ سے بال بڑھا کر وہ زور پھیلانا چاہتا تھا۔ میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل کیا تا کہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں مسلمان عموماً ان جوگیوں سے اگر پوچھتے بھی تھے تو اسی قسم کی باتیں کہ سر کے بال کن دواؤں سے بڑھتے ہیں۔ ہم بستری کی اچھی تاریخیں جن میں اچھے بچے پیدا ہو سکتے ہیں، کیا ہیں اور خدا جانے ان باتوں کا بھی علم ان جوگیوں کو ہوتا ہے یا نہیں لیکن بہرحال اپنے آپ کو وہ ان ہی چیزوں کا جاننے والا پہلے بھی مشہور کرتے تھے اور اب سنیاسی جوگی وغیرہ کا یہی کام ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان جوگیوں سے اگر کسی بزرگ نے کوئی بات پوچھی بھی ہو تو اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ اب آپ ہی خیال کیجیے کہ ''فوائد الفواد'' جو متوسط تقطیع پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب ہے اور اس میں تقریباً آپ کی سینکڑوں مجلسوں کی پوری گفتگو من و عن درج ہے، بمشکل ان سارے ملفوظات میں یہی چند مقامات ہیں جہاں جوگی کا ذکر آیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی گفتگو کا تعلق

بھی ان امور سے ہے، جن کا اہتمام ان بزرگوں کے سر اس زمانہ میں تھوپا جا رہا ہے۔ صرف ایک مقام اور ہے جس میں اجودھن ہی کا ایک اور واقعہ جوگی کے متعلق حضرت سلطان المشائخ نے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''من وقتے بخدمت شیخ کبیر در اجودھن بودم جوگیے بودبیآمد'' اور اس سے میرے اس دعوے کی توثیق ہو رہی ہے کہ خود یہ جوگی ان بزرگوں کی خدمت میں کبھی کبھی استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ (2)

بہرحال حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ''من از و پرسیدم کہ شما کدام راہ می روید اصل کار درمیانِ شما چیست'' آپ دیکھ رہے ہیں کہ سوال کا لہجہ کیا وہی نہیں ہے جو آج بھی جب کبھی ملنے جلنے والے پوچیزی ہندو یا سادھو سے کسی مسلمان کی اِدھر اُدھر ریل پر یا کسی مقام پر ملاقات ہو جاتی ہے تو عموماً تفنن طبع کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی تم لوگ کیا کرتے ہو، جوگی نے جواب دیا، سلطان المشائخ نے اسے بھی فرمایا ہے۔

''او (جوگی) گفت در علم ما چنیں آمدہ است کہ در نفس آدمی دو عالم است یکے عالم علوی و دوم عالم سفلی از تارک (چندیا) تا ناف عالم علوی ست، واز ناف تا قدم عالم سفلی است۔''

یہ انسانی نفس کی تقسیم ہوئی۔ آگے اس نے کہا کہ

''سبیل کار آن ست کہ در عالم علوی ہمہ صدق وصفا واخلاق خوب وحسن معاملہ باشد، و در عالم سفلی نگہداشت و پاکی و پارسائی۔''

مطلب جوگی کا یہ تھا کہ ناف کے اوپر جتنے اعضاء ہیں مثلاً دل ہے، آنکھیں ہیں، زبان ہے، دماغ ہے، کان ہیں، زیادہ تر اخلاقی اعمال کا ان ہی سے تعلق ہے اور ناف کے نیچے جو اعضاء ہیں عفت و پارسائی، پاکی وغیرہ کا ان ہی سے تعلق ہے۔ ایک اچھی تقسیم تھی جو جوگی نے بیان کی۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں ''مرا این سخن او خوش آمد۔''

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جن بزرگوں کا سارا سرمایہ جوگ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے، کیا وہ اس ندرت کے ساتھ جوگی کی ایک اچھی شاعری کا داد کے ساتھ تذکرہ کر سکتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان جوگیوں، سادھوؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سلطان المشائخ ہی سے ''فوائد الفواد'' ہی میں منقول ہے۔ امیر حسن علا فرماتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کی تنخواہ (مواجب) جس کی وجہ انہوں نے نہیں لکھی ہے، رک گئی تھی۔ ''توقف موجب دلتنگی بود۔'' مجلس مبارک میں حاضر ہوا۔ کسی بزرگ کے حوالہ سے حضرت نے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی شہر میں ''برہمنے بود مال بسیار داشت۔'' شہر کا والی کسی وجہ سے برہمن سے بگڑ گیا اور جو کچھ اس کے پاس تھا، سب کی ضبطی ہو گئی۔ غریب برہمن دانے دانے کو محتاج ہو گیا۔ ایک دن جا رہا تھا، راستہ میں کسی دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے حال پوچھا۔ برہمن نے کہا ''نیکو وخوش می گذرد'' یعنی خوب گذر رہی ہے۔ دوست نے کہا، ہر چیز تو تمہاری چھن گئی ہے۔ ''خوشی ترا از کجاست۔'' جواب میں برہمن کا یہ فقرہ ''زنار من بامن ست'' میرا جنیو تو میرے ساتھ ہے۔ امیر حسن کہتے ہیں کہ اس فقرہ نے میرے دل کو ہلکا کر دیا۔ خیال یہی ہوا کہ ''از توقف مواجب نایافت اسباب دنیا ہیچ غم نمی باید خورد اگر ہمہ جہاں بر ود باکے نیست محبت حق می باید کہ برقرار باشد بندہ تقریب

آں تقریر ہمیں تصور کرد۔'' (صفحہ 56)

عبرت دلانے کے لیے اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ملفوظات میں بھی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ایک ''تارک الدنیا سادھو در اجگیر رسیدہ بود'' راجگیر اس مقام کا نام ہے جہاں حضرت والا ریاضت و مجاہدہ میں ایک مدت تک مشغول رہے تھے۔ چند پہاڑیاں ہیں جن سے گرم اور سرد چشمے نا یادگار زمانہ سے ابلتے رہتے ہیں۔ ایک گرم چشمہ اس وقت تک مخدوم کنڈ کے نام سے حضرت والا کی طرف منسوب ہے۔ موجودہ قصبہ بہار سے بجانب مغرب جنوب راجگیر کی یہ پہاڑیاں ہیں' بہر حال حضرت فرماتے ہیں کہ سادھو'' بتے از سنگ تراشیدہ از دست چپ گرفتہ استادہ ناخنہا چناں بزرگ شدہ کہ گرد بہ گرد دست پیچیدہ'' الغرض اس بت کو مٹھی میں دبائے یہ جوگی سالہا سال سے یونہی کھڑا تھا ''استنجابہ پامی کرد۔'' ناگاہ ایک دن مٹھی کھل گئی' بت گر گیا۔ حضرت کا چشم دید واقعہ ہے کہ سادھو'' بہ نشست'' کھڑا تھا' بیٹھ گیا۔ ''آغاز کرد کہ من چندیں سال ترا پیش نظری دارم واز عشق و محبت تو ہمہ راترک دادہ ام اکنوں اگر تو مرا دوست داشتی از من جدائی شدی پس ہر گز مرا دوست نمی داری مازیستن نہ شاید در حال کاردے بسد ہمانجا خود را بہ برید'' اور مر گیا۔ مخدوم نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا ''ہندوے در محبت سنگ پر کالہ ایں چنیں می کند مومن در دیں حق اگر ایں چنیں کند چہ عجب'' (صفحہ 275۔ معدن المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ ان جوگیوں کا ذکر جن کی مجلسوں میں اس حیثیت سے آتا ہو' خیال کرنے کی بات ہے کہ ان ہی کے مسلک و مشرب کے کیا وہی لوگ پیرو ہو سکتے ہیں؟

واقعہ تو یہ ہے کہ بول چال کی عام زبانوں کے سوا جس کا مرکز ابوالفضل ''آئین اکبری'' میں ولی [3] کو بتاتا ہے' صوفیاء ہند کے اساطین واکابر کا عموماً ہندوؤں کی کسی علمی زبان سے بھی واقفیت نہ تھی' ان پر کتنا بڑا ظلم توڑا گیا ہے کہ ان کی ساری زندگی کو ہندوستان کے تصوف کا عکس قرار دیا جاتا ہے۔ میں تو اب تک بھی نہ سمجھ سکا کہ ہمارے بزرگوں کی طرف یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوؤں سے تصوف کا فن سیکھا تھا' آخر اس کے ثبوت میں لوگ کہتے کیا ہیں یا یونہی کسی نے بات ایک اڑادی اور بے سمجھے لوگوں نے اسے دہرانا شروع کیا۔ آخر کوئی بات تو مشترک پیدا کی جاتی' اتنا بھی یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اس زمانہ میں مسلمان اس ملک کے حاکم تھے' عام طور پر حاکم قوموں میں اپنی رفعت و بلندی کا جو شعور ہوتا ہے' وہ محکوم قوموں کی چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کب دیتا ہے۔ کسی چیز کی کسمپرسی کے لیے ہر زمانہ میں یہ بات کافی سمجھی گئی ہے کہ اس کا تعلق محکوم قوم سے ہے۔ آج خود ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے۔ ہماری محکومیت ہماری پوری زندگی کی تحقیر و توہین کے لیے کافی ہے' دوسروں میں نہیں۔ خود اپنوں میں جب مسلمانوں کی وضع قطع شکل و صورت آج جس نگاہ سے دیکھی جارہی ہے' اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کی کن چیزوں کی مسلمانوں کی نظر میں کیا قیمت ہوگی۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان صوفیا نے سب کچھ ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے اخذ کیا تھا تو آخر جب اکبر نے اپنا رجحان ہندو مذہب کی جانب ظاہر کیا تو اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش وہی لوگ کیوں تھے جن کا تعلق مسلمانوں میں طبقہ صوفیا سے تھا۔

ملا عبدالقادر ہوں یا حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی یہی لوگ تو اکبری دین کی مخالفت کے علمبرداروں میں

ہیں۔ظاہر ہے کہ دونوں ہی صوفی المشرب ہیں۔ حضرت مجددؒ کے متعلق تو خیر کچھ کہا بھی جا سکتا ہے۔ ملا عبدالقادر کی تو پوری زندگی صوفیوں کی ہے۔وہی مسلک وہی مشرب ہے جو ہندوستانی صوفی رکھتے تھے لیکن اکبر کی مخالفت میں ان سے زیادہ بدنام کون ہے۔اگر وہی خیال سچ ہوتا جسے آج پھیلایا جارہا ہے تو ہندی صوفیوں کے تو دل کی بات تھی جسے اکبر بزور حکومت انجام دینا چاہتا تھا۔

حواشی

(1) اس کا ذکر آپ نے آزاد قلندروں کے سلسلہ میں کیا ہے کہ حضرت زکریا ملتانی کے یہاں اس قسم کے بے قید فقیروں کو راہ نہیں ملتی مگر بابا فرید کے یہاں سب ہی طرح کے ''فقراء'' ''وغیراں'' سے جوگی وغیرہ مراد ہیں آتے رہتے تھے۔

(2) اسلامی صوفیائے ہند کے پاس جوگیوں کی آمد و رفت استفادہ کے لیے ہوتی تھی' چاہا جائے تو اس کے متعلق ایک الگ مضمون تیار کیا جا سکتا ہے۔بخوف طوالت میں نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ورنہ دلچسپ باتیں سننے میں آتیں' کم از کم ''ثمرۃ الفوائد'' نامی کتاب جو حضرت شاہ بھیک قدس سرہ کے حالات میں ہے مطالعہ کیجیے' بیسیوں واقعات اس سلسلہ میں آپ کو ملیں گے۔

(3) ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی اچھی تقسیم پیش کی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ اس ملک کے لوگ ''بفراواں زباں می سرائند'' لیکن ان زبانوں میں جو اختلافات ہیں' ان کی نوعیت دو قسم کی ہے۔اختلافات کی ایک شکل تو وہ ہے کہ باوجود اختلاف کے یہ اختلاف باہمی افہام و تفہیم میں مانع نہیں ہوتا یعنی ہر ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں ''آن اختلاف کہ از فہمیدگی یک دیگر باز ندارد از شمارہ بیروں'' اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے لیکن باوجود اس اختلاف کے جب باہم ایک دوسرے کی سمجھ لیتے ہیں تو ایک ہی زبان سمجھی جائے گی۔دوسری قسم وہ ہے کہ اختلاف کی وجہ سے ان مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔اسی کا نام اس نے ''انچہ نیا رند در بافت'' رکھا ہے۔اختلاف کی آخری قسم کو پیش نظر رکھ کر اکبر کے زمانہ میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی تقسیم ان کے مختلف مقامی مرکزوں کے اعتبار سے بایں الفاظ کرتا ہے۔

دہلی' بنگالہ' ملتان' مارواڑ' گجرات' تلنگانہ' مرہٹ' کرناٹک' سند' افغانستان' شان (کہ میان سندو کابل قندھار ست) بلوچستان' کشمیر جن زبانوں میں اس قسم کا اختلاف ہے کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کی نہیں سمجھ سکتے۔ابوالفضل کے حساب سے عہد اکبری میں ان کی تیرہ قسمیں تھیں جن میں بارہ قسمیں ایک طرف اور دلی کی زبان ایک طرف' جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بارہ علاقوں کے سوا ساری ہندوستان کی زبان اسی زمانہ سے ایک تھی' مقامی اختلافات سے اس زبان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی تھی۔آج کل اسی کو ہم اردو کہتے ہیں۔

ہندوستان کے خواجگانِ چشت کا تصوف

بہر حال اب تک تو اس بے بنیاد پادر ہوا بات کی تردید میں مَیں نے چند سلبی اور منفی قرائن کا ذکر کیا ہے۔ دراصل جس کا ذکر مقصود تھا' اب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ یوں تو رفتہ رفتہ ان چھ سال صدیوں میں جب سے ہندوستان باضابطہ دارالاسلام بنایا گیا' مختلف زمانوں میں اسلامی تصوف کے مختلف سلاسل اور طرق کے اولیاء اللہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو سرفراز فرماتے رہے اور اب تو یہ واقعہ ہے کہ مشہور خانوادوں میں شاید ہی اب کوئی خانوادہ باقی ہوگا جس میں منسلک ہونے والے لوگ اس ملک میں نہ پائے جاتے ہوں۔ خصوصاً قادریہ اور نقشبندیہ اور اس کے بعد سہروردیہ سلسلوں نے اس ملک میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ پہلا قدم مبارک جس بزرگ کا ایک خاص شان آن بان سے اس ملک میں آیا' وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیریؒ کی ذات بابرکات ہے۔ آج ہی نہیں اسی صدی میں یہ اشعار تقریباً ہندی مسلمانوں کے گھر گھر میں پڑھے جاتے تھے۔

انجا کہ بود نعرۂ فریاد مشرکاں   اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر ست

سمجھا جاتا تھا کہ خواجہ بزرگ کی قدموں ہی کی برکت کا نتیجہ ہے۔

پس میں اب بتانا چاہتا ہوں کہ صوفیا کے جس طریقہ کا نام طریقہ چشتیہ ہے اور جس کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جیسے نقشبندیہ کا مرکز بخارا اور ترکستان' شاذلیہ کا مغرب اور تیونس' سہروردیہ کا بغداد' بدویہ کا مصر ہے' اسی طرح چشتیہ طریقہ کو کچھ ہندوستان کے ساتھ خصوصیت ہے۔ (1)

اس زمانہ میں چشتی اور چشتیت کے مفہوم کو کچھ گانے بجانے' چنگ ونے' دف و چغانہ کے ساتھ کچھ اس طرح لازم کر دیا گیا ہے کہ لفظ چشتی کے بولنے کے ساتھ ہی گویا مخاطب کا ذہن رقص وسرود کے ان ہی سامانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ سماع کا تعلق چشتی طریقہ سے کیا ہے' اس کا ذکر تو ان شاء اللہ آخر میں کروں گا لیکن اس زمانہ میں تحقیق و مطالعہ کے بغیر کسی معمولی مناسبت کو واسطہ بنا کر جو نتائج پیدا کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ استدلال کے اسی طرز جدید کا نتیجہ ہے کہ

انسان اور بندروں میں صوری مشابہت جو پائی جاتی ہے، محض اسی مشابہت کو واسطہ بنا کر مسئلہ ارتقاء پر لائبریریاں تیار کر دی گئی ہیں۔ یہ عہد جدید کا خاص لطیفہ ہے۔

تصوف کو جوگیت قرار دینے والے تو خیر وہ لوگ تھے جنھیں صوفیا اور تصوف سے ہمدردی نہیں ہے، لیکن اس غریب تصوف کے غمگساروں نے بھی غمگساری کا جو فرض ادا کیا ہے، اس کی ایک مثال وہی توجیہہ ہو سکتی ہے جو "طریقہ چشتیہ" میں گانے بجانے کے رواج کو پا کر اس زمانہ میں بکثرت مختلف الفاظ میں مختلف دائروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک خاص قسم کا ملک تھا۔ یہاں کے عام باشندوں میں موسیقی سرود و نغمہ وغیرہ کا شدید میلان پایا جاتا تھا، باشندگان ملک میں رقاصی اور نغمہ نوازی کے اسی میلان کو دیکھ کر بزرگان چشت نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کیا کہ ان کے اسی مذاق سے نفع اٹھایا جائے اور یوں چشتی طریقہ میں اسی مصلحت سے گانے بجانے کو مروج کیا گیا۔ نادان دوستوں کی ذہانت کی داد دینی چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اس ہمت کی کہ بنیاد ہو یا نہ ہو، لیکن دماغ میں جو خیال آ گیا اس کے آگے بڑھانے میں ان لوگوں کو کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہی واقعہ سہی، ان لوگوں کو کہیں ایسا مل جاتا کہ ایک ہندو محض صوفیوں کی محفل کے گانے سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تو کہا جا سکتا تھا کہ اس زمانہ میں اس قسم کے جزئیات سے کلیات بنانے کا جب عام رواج ہی ہے تو کیا مضائقہ ہے کہ ایک جزئی واقعہ سے کلی توجیہہ پیدا کر لی گئی مگر میں جانتا ہوں اس سلسلہ میں ان کے پاس ایک واقعہ بھی تو نہیں ہے۔ اب اسے میں صرف شاعری نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں اور شاعری میں بھی بہرحال تشبیہ اور استعارہ کی وجہ شبہ ہوتی ہے، یہاں تو وہ بھی نہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ گانے بجانے کو ہندوستان کی فطرت کے ساتھ آخر کس بنیاد پر مخصوص سمجھا جا رہا ہے۔ دنیا کی کونسی قوم، کونسا ملک ہے جہاں کے لوگوں میں اس کا ذوق نہیں۔ ہم تو سنتے ہیں کہ عرب کا اونٹ بھی گانے سے متاثر ہوتا اور تال و سُر پر ناچتا ہے، تھرکتا ہے۔ آپ جنگلی جزیروں میں چلے جائیے، بش مینوں اور صحرائیوں کو پائے گا کہ ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے ہندوستان کے عوام گلے میں ڈھول ڈالے ناچتے گاتے بجاتے اچھلتے پھاندتے پھرتے ہیں۔ بجنسہ اسی شکل اسی صورت میں وہ بھی گاتے بجاتے اچھلتے کودتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اس مسئلہ میں کوئی خاص کیا ہے، سمجھ میں نہ آیا۔ یورپ باایں ہمہ دعویٰ تہذیب و شائستگی اب بھی ناچتا ہے، گاتا ہے، بجاتا ہے بلکہ ہندوستان نے تو شاید گانے بجانے کے آلات کے ایجاد کرنے میں وہ کمالات بھی نہیں دکھائے ہیں جو یورپ آج ہی نہیں ہمیشہ سے دکھلا رہا ہے۔ آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے تو نظر آئے گا کہ شروع شروع میں یورپ کے باشندے جو اس ملک میں آئے ہیں تو نچتے بجتے، تماشا گروں کی ہی حیثیت سے آئے ہیں۔ تاجروں اور سوداگروں کا بھیس تو انہوں نے بعد کو بدلا ہے۔ ابتدا میں ان کی طرف توجہ ہندی بادشاہوں کو ان کے خاص خاص باجوں ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مجدد الف ثانی والے مقالے میں بعض چیزیں اس سلسلہ میں مَیں نے نقل بھی کی ہیں۔ رہا فنی حیثیت سے میوزک کا علم ہندوؤں میں ضرور تھا لیکن اس سے پہلے مسلمانوں میں یہ چیز یونانیوں کی راہ سے آ چکی تھی اور عباسی خلافت ہی کے زمانہ سے اس فن میں

مسلمانوں کے عیاش امیروں نے اتنی سرپرستی کی تھی کہ اس میں بھی کوئی خاص فضیلت اس ملک کو باقی نہ رہی تھی اور ہو بھی تو اس کا تعلق خواص سے تھا اور یہاں تو کہا جاتا ہے کہ گلے میں ڈھول ڈال کر عام طور پر جو ہندوستان میں عوام اِدھر اُدھر ناچتے بجاتے پھرتے ہیں اُن کو مائل کرنا مقصود تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کا مسئلہ نہ اتنا آسان تھا اور نہ ہے کہ صرف چند غزلوں کے الاپنے سے اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہندو اتنے بے وقوف تھے کہ وہ صرف گانے پر شیفتہ ہو کر اپنے آبائی دین اور دھرم کو چھوڑ دیتے۔ گانا بجانا تو بڑی چیز ہے۔ آپ جن بزرگوں کو متہم فرما رہے ہیں کہ انہوں نے تبلیغ اسلام کی راہ یہ نکالی تھی' اس کی تائید میں تو کوئی چیز آپ پیش نہیں کر سکتے لیکن میں آپ کی خدمت میں تجربہ کی وہ بات پیش کرتا ہوں جو ہندو قوم کے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ''طریقہ چشتیہ'' کے رکن اعظم حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا تھا۔ ''فوائد الفواد'' میں ہے' ایک غلام جو مسلمان تھا' وہ حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور ایک ''ہندو در برابر خود آورد و گفت کہ ایں برادر من است'' جب دونوں بیٹھ گئے تو جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ''خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر ازاں غلام پرسید کہ ایں برادر تو میلے بہ مسلمانی دارد'' جواب میں اس مسلمان غلام نے عرض کیا کہ ''او را تحت اقدام بجہت ایں معنی آوردہ ام تا بہ برکت نظر مخدوم مسلمان شود'' اس مسلمان غلام سے یہ سننا تھا کہ جامع ملفوظات کہتے ہیں ''خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کرد' حضرت والا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیا خیال آیا' ظاہر ہے کہ اس غریب ہندو بیچارے کے انجام کا خیال آیا اور اسی کے ساتھ اپنی بے بسی کا جس کا اظہار حضرت ہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں ''فرمود کہ ایں قوم را چنداں بگفت کسے دل نہ گردد'' یعنی صرف باتوں سے کوئی چاہے کہ ہندو قوم کے دل کو ان کے دھرم سے پھیر دے یہ مشکل ہے۔ یہ تھی پتہ کی وہ بات جو وہی کہہ سکتا ہے جسے اس راہ کا کچھ تجربہ ہوا اور کچھ دن اس مسئلہ کو اس نے سوچا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام اپنے خواص کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہر انقلابی اقدام میں ان کی نظر ان ہی لوگوں پر رہتی ہے جن کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ہے۔ میری مراد برہمنوں سے ہے اور برہمنوں کا حال یہ ہے کہ ان کو کوئی گا بجا کر کیا مسلمان کر سکتا ہے۔ ان کا تو کسی کی تقریر اور تحریر سے بھی متاثر ہونا آسان نہیں ہے۔ آپ ان کے سامنے مذہب کو جس حد تک بھی فلسفہ بنا کر پیش کیجیے وہ آپ کے سامنے اس سے زیادہ فلسفیانہ گفتگو شروع کر دیں گے۔ اس قسم کی مذہبی اور دینی تقریروں کی اس ملک میں کیا کمی ہے؟ ان برہمنوں کو ہزار ہا ہزار سال اطمینان کے ساتھ روٹی کھانے کا موقع ملا ہے۔ ان پر نہ حکومتوں کے بدلنے کا اثر پڑتا تھا نہ سلطنتوں کے کیونکہ ایک راجہ کو مار کر دوسرا راجہ اگر گدی پر بیٹھتا تھا تو برہمن کی خدمت اس پر اسی طرح واجب ہوتی تھی جتنی پہلے پر۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کو فلسفہ بنانے کا کام ہندوستان میں بڑے اطمینان سے انجام دیا گیا۔ اپنشد جسے دیکھ دیکھ کر آج یورپ بھی حیران ہے' وہ کیا ہے؟ کیا واقعی خالص کوئی فلسفہ ہے؟ یقیناً وہ مذہب ہے جسے فلسفہ بنایا گیا ہے۔ وہ وہ لن ترانیاں ہیں اور دور کی کوڑیوں کو لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج ہندو فلسفہ کی کتابوں سے ہر اس فلسفہ کا طلسم کھڑا کیا جاتا ہے جو یونانیوں نے بلکہ آج میٹا فزکس (مابعد الطبیعیات) کے مسائل میں یورپ نے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ مذہب کو قصہ کہانی کی شکل میں جس میں خوارق اور عجائب کا ذکر ہو' اگر ان کے سامنے پیش کریں گے تو وہ آپ کے آگے

اس سے بھی عجیب تر چیزوں کو اپنے پرانوں اور مہا بھارت' رامائن وغیرہ سے اخذ کر کے رکھ دیں گے [2] اور عام طور پر غلط طریقہ سے مذہب کی تبلیغ کی جب کوشش کی گئی ہے تو عموماً یہی دو راہیں اختیار کی جاتی ہیں۔ مذہب کو فلسفہ بنایا جاتا ہے یا مذہب کو خیالی افسانوں' محیر العقول خوارق اور اعجوبہ طرازیوں سے بھر کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ ان میدانوں میں وہ آگے بڑھے ہوئے ہیں بلکہ اس ملک کے عام باشندے برہمنوں کے جن پنجوں میں ہزار ہا ہزار سال سے گرفتار ہیں' اس کی وجہ ہی یہ ہے۔ یہی دو حربے ہیں جن میں اپنشدا سے تو سوچنے والے ارباب فکر کو گھیر لیا جاتا ہے' ان کے سامنے وہ آسمان و زمین کی باتیں سنائی جاتی ہیں کہ بہر حال انہیں اپنی عقلی پرواز کی واماندگی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور پرانوں کے عجیب و غریب قصوں کا پھندا عوام کے گلوں میں پڑا ہوا ہے۔ بڑے سے بڑا معجزہ بڑی سے بڑی کرامت جو سوچی جاسکتی ہے' وہ آپ کو ان کی کتابوں کے ورق ورق پر ملے گی۔ بھلا عامیوں کا جو گروہ ان کو سنے ہوئے ہے اس پر واقعی معجزات اور کرامات کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ آپ تو واقعہ بیان کریں گے اور وہاں یہ کیا گیا ہے کہ جس قسم کے مستحیلات و ناممکنات عقل سوچ سکتی ہے سب ہی کے متعلق لکھ دیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں واقع ہو چکا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جس قوم کی نفسیاتی حالت یہ ہو۔ اس کے متعلق یہ کتنی پھسپھسی بودی بات ہوگی کہ چشتی فقراء گا بجا کر ان کو مسلمان کرنا چاہتے تھے یا اس ذریعہ سے ان کو مسلمان کرنے میں وہ کامیاب ہوئے مگر یہ تو آپ فرماتے ہیں یعنی جنہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اس ملک کے غریب ہندوؤں کے متعلق ہم پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے بھی یا نہیں۔

پر جس کا سینہ نسل آدم کی اتنی بڑی تعداد کی گمراہیوں کو دیکھ کر شق ہوا جاتا تھا' آپ نے دیکھا کہ ذکر کے ساتھ ہی وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا اور اس قوم کے متعلق جو صحیح تشخیص ہو سکتی تھی' اس کا اظہار ان مختصر الفاظ میں کیا گیا' یعنی صرف باتوں سے ان کو مسلمان کرنا آسان نہیں ہے' باتوں کی تو ان کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے اور ہر طرح کی باتوں کی۔ یہ تو اس قوم کے متعلق منفی رائے ہوئی' رہی یہ بات کہ پھر اسلام سے روشناس کرانے کی آج کوئی تدبیر ہندوؤں کے لیے ہے بھی یا نہیں۔ سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس کا بھی جواب دیا ہے' اسی کے بعد ارشاد ہے۔

''اما اگر صحبت صالحے بیابد امید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود'' (صفحہ 182)

مقصد مبارک یہ ہے کہ بات کی حد تک تو ان کے یہاں کوئی خلا نہیں ہے تو اس میں باہر سے کسی چیز کے بھرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز کی ان کے یہاں کمی ہے یعنی باوجود سب کچھ ہونے کے چونکہ ہندوؤں کے پاس دین کا جو سرمایہ بھی ہے' اس کی انتہا یقین پر نہیں ہوتی کیونکہ یقین' ایسا یقین جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ ہو' اس کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے۔ پرانوں میں عجیب عجیب قصے ضرور ہیں۔ الف لیلہ سے بھی عجیب تر قصے' لیکن عوام کا خیال کچھ ہی ہو' ان کے خواص تو جانتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں مختلف برہمنوں نے یہ قصے خود ہی گڑھ لیے ہیں اور یہی حال اپنشدوں کا ہے کہ وہ فلسفہ ہے اور فلسفہ جو صرف مطمئن دماغوں کے مالیخولیا کا نام ہے' اس میں اور یقین میں تو آگ اور پانی کا تعلق ہے۔ وہ دوسروں میں ضرور یقین پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن خود یقین سے خالی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے' بے دیکھے کہتا ہے۔ بے جانے کہتا ہے' آنکھیں بند کیے باتوں سے باتیں پیدا کرتا جاتا ہے۔ خیالات کی تعبیر کی

بھی قوت اگر کسی میں اس خیالی پرواز کے ساتھ ہوئی۔ بس یہی بنا بنایا فلسفہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کہیں ان خیالی باتوں سے آدمی اپنے اندر کسی قطعی اور یقینی پہلو کا لازوال اذعان اور نہ ٹلنے والا اٹل اعتقاد پیدا کر سکتا ہے۔ دوسروں کے سامنے ممکن ہے اپنے الفاظ سے یہی باور کرانے کی کوشش کرے لیکن اس کی مثال ٹھیک اس اندھے کی ہوگی جس کی آنکھ آفتاب کو نہیں دیکھ رہی ہے لیکن یوں ہی ایک خیال قائم کر کے کہ آفتاب نکل چکا ہوگا' اعلان شروع کر دے کہ آفتاب کے نکلنے کا مجھے قطعی یقین ہے۔ ممکن ہے کہ آفتاب واقع میں نکلا ہوا ہو بھی' لیکن اندھا تو صرف ایک خیالی بات کہہ رہا ہے اور جس کیفیت کی تعبیر وہ قطعی یقین سے کر رہا ہے' وہ واقع میں قطعی یقین نہیں ہے۔

یہی حال ہندوؤں کا ہے۔ ان کے پاس فلسفہ بھی ہے اور ان کے پاس خوارق و نوادر کے قصوں کا عظیم الشان ذخیرہ بھی' لیکن جس سے یقین کی واقعی اور حقیقی روشنی آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس ذریعہ سے وہ محروم ہیں اور جب تک خود اپنے مسلمات پر آدمی کو کامل یقین نہ ہو' اس کی زندگی ان مسلمات کے دباؤ کو جیسا کہ چاہیے محسوس نہیں کرتی' اسی لیے مذہبی مسلمات کا جو نتیجہ ہے یعنی ''صلاح و تقویٰ'' حقیقی معنوں میں یہ ان میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا' لمبی چوڑی باتوں کے باوجود فلسفیانہ عقائد رکھنے والوں کی خانگی زندگی کا جب جائزہ آپ لیں گے' اس کو ان کے عقائد کے مطابق بہت کم پائیں گے۔

ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کا صلاح و تقویٰ کے لحاظ سے کیا حال ہے۔ اس کا تجربہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان کی قوم کے لوگوں کو زیادہ ہو سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو ان کے گھر کے بھیدی خود پنڈت دیانند جی سرسوتی مہاراج ہیں۔ آپ ان کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' ہی اٹھا کر پڑھ لیجیے' برہمنوں کی اندرونی زندگی کی ناگفتہ بہ مفصل رپورٹ اسی میں آپ کو مل سکتی ہے اور یقین کی محرومی کا قصہ کچھ بیچارے برہمنوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں' آج دنیا میں جتنی بھی مذہبی قومیں ہیں مثلاً یہودی' نصرانی' بودھسٹ' پارسی وغیرہ سب ہی کا یہی حال ہے' جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہستی کا یہ معمہ ایک راز ہے' جس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ایسا پردہ ع

کہ کس نکشود نکشائد بحکمت ایں معمہ را

عقل کے ناخن اس گرہ کے کھولنے میں نہ پہلے کامیاب ہوئے نہ اب کامیاب ہیں نہ آئندہ ہو سکتے ہیں۔ ایک گرہ کھلتی ہے کہ معاً ع گشت رازِ دگر آں راز کر افشا می کرد۔ [3] لے دے کر صرف ایک ہی صورت ہے کہ خود معمہ بنانے والا اپنی مہربانی سے اس ''اٹھائے نہ بنے والے'' پردہ کو اٹھا دے' اپنی پہیلی خود ہی سمجھا دے کہ اسی کے فیصلہ کے ساتھ خود ہم میں ہر شخص کے آغاز و انجام کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ زمین کے کرہ پر جب سے انسانیت کی نمائش ہوئی ہے' خالق کردگار کی طرف سے اس مہربانی کا ظہور بھی ان لوگوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے' جنہیں خدا اپنا علم دیتا ہے اور خدا کے اسی عطا کیے ہوئے جواب کو وہ عام انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی ساری قومیں اس کی شاہد ہیں کہ اس ذریعہ سے ان کے پاس بھی جواب آیا تھا' لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا کا وہ بتایا ہوا جواب مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر اپنی خالص حالت میں باقی نہیں ہے' اس تریاق میں زہر شریک ہو چکا ہے۔ انسانوں نے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف خیالات کی اس میں آمیزش کی ہے۔ ایسی آمیزش کہ ایک کو دوسرے سے اب جدا کرنا انسانی قوت کی حد پرواز سے خارج ہے۔ [4]

پس گو خدا کا بانٹا ہوا علم جسے ہر زمانہ میں ہر قوم کو بخشا گیا تھا۔ کسی نہ کسی صورت سے سب کے پاس موجود ہے

لیکن یقین کی جو کیفیت اس علم سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کی جس چیز میں حقیقی ضمانت پوشیدہ ہے اس کے فقدان نے یعنی بیرونی آمیزشوں نے اس تاثیر کو باطل کر دیا ہے۔ آدمی لاکھ ان کے ساتھ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہے گا لیکن مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی اس بے اطمینانی کا اسے شعور بھی نہ ہو' لیکن یقین اور قطعیت سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی آفرینش اور تولید ہو ہی نہیں سکتی اور یہی ایک واحد چیز ہے جو صرف مسلمانوں کے پاس ہے' جسے دوست ہی نہیں دشمن بھی جانتے ہیں ورنہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں ایسا کونسا مذہب ہے' جس کے پاس کوئی اخلاقی نظام نامہ نہیں ہے۔ کس مذہب میں جھوٹ' چوری' زنا' دغابازی' فریب کی اجازت دی گئی ہے اور راستبازی' دیانت' امانت' پارسائی' پاک دامنی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے حتیٰ کہ خالص عباداتی چیزیں الصلوٰۃ' الزکوٰۃ' الصوم (روزہ) آپ کو قرآن ہی بتائے گا کہ قدیم سے قدیم دیانات وملل کے عناصر بھی یہی تھے۔ انتہا یہ ہے کہ الحج ماسوا اس کے کہ یہ ایک قدیم ابراہیمی نسک ہے' یوں بھی جب اقوام کے قبیلے' کسی زمانہ میں یعنی ان ہی دنوں میں جب ہر قوم کے لیے ان کا مخصوص قومی نبی ہوتا تھا۔ قبیلے بھی قومی تھے تو اس کی تردید کیسے ہو سکتی ہے کہ عیسائی یا یہودی پلگرمس اگر بیت المقدس میں جاتے تھے یا دنیا کی قومیں مختلف تیرتھ گاہوں کو جاتی تھیں' ان کی کوئی اصل نہ تھی۔ [5] رہا خالق کائنات اور اس کی توحید کا مسئلہ سو قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ **من خلق السموٰت والارض** (کس نے آسمان وزمین پیدا کیے) کا سوال جس کسی سے بھی کیا جائے گا **لیقولن الله** (وہ یہی کہیں گے کہ اللہ۔) صرف خلق کی حد تک نہیں بلکہ تدبیر وتصرف کے کلی وجزئی اعمال بارش برسانا' روزی دینا' ان ساری چیزوں کے متعلق بھی قرآن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انسانی اعتقادات کے اجزا عامہ ہیں۔ یوں ہی مجازات ومکافات کا قانون جس شکل میں بھی ہو **لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت** (یعنی آدمی کو اپنے اچھے کاموں کا نفع بھی پہنچتا ہے اور برے کاموں کا ضرر بھی۔) ان ساری باتوں کا آپ ہی بتائیے کہ دنیا کی کونسی قابل ذکر قوم منکر ہے۔ جب سارے اخلاقی قوانین عباداتی عناصر عقائد کے اصول سارے جہان کی قوموں میں مشترک ہیں تو آپ ہی غور کیجیے کہ قوموں کے مقابلہ میں آپ اسلام کا کیا امتیاز پیش کر سکتے ہیں؟ جزئیات نہ سہی کلیات میں تو سب آپ کے ساجھی اور شریک ہیں اور اس کا مخبر علاوہ واقعات کے خود قرآن ہے۔ اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو وہی دین دیا جا رہا ہے جو نوحؑ کو ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو عیسیٰؑ کو سب ہی کو دیا گیا تھا۔ قرآن میں وہی ہے جو صحف ابراہیم [6] وموسیٰ میں تھا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ بجز ایک بات کے اگلوں کو جو کچھ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔ خالق کے ان علوم کے ساتھ مخلوقات کی دماغی آمیزشوں نے شریک ہو کر اس کو مشکوک اور قابل اعتماد باقی نہیں رکھا۔ ایسی کتاب جو خدا کے نام سے نسل آدم کو ان ہی صفات رکھنے والی ہستی کے ذریعہ سے سپرد کی گئی ہو۔ جن صفات کی بنیاد پر قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو پیغمبروں کو وخشوروں کو یا اوتاروں کو مانا ہے' روئے زمین پر بنی آدم کے سارے گھرانوں اور امتوں میں قرآن کے سوا قطعاً کوئی دوسری کتاب ایسی باقی نہیں رہی ہے جو بغیر کمی بیشی اور سر مو تفاوت کے ٹھیک اسی حال میں موجود ہو' جس حال میں دینے والے نے اسے دیا ہو۔ یہ ایسی کھلی ہوئی واضح حقیقت ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کا بھی اس پر اتفاق ہو۔ جرمنی عالم وان ہیم کا یہ مشہور فقرہ ہے۔

''ہم قرآن کو محمدؐ کا کلام ایسا ہی یقین کرتے ہیں جیسے مسلمان اس کو کلام الٰہی یقین کرتے ہیں۔''

(اعجاز التنزیل۔ صفحہ 500)

کچھ عیسائیوں ہی کی یہ خصوصیت نہیں ہے۔ جو بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ علی الاتصال عہد نبوت سے موجودہ انسانی نسلوں تک یہ کتاب اس شان کے ساتھ منتقل ہوتی چلی آئی ہے کہ درمیان میں سال دو سال تو کیا لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی کوئی ایسا وقفہ نہیں پیش آیا جیسے یہودیوں یا عیسائیوں یا اسی قسم کی دوسری قوموں کی آسمانی کتابوں کو پیش آیا یعنی متعدد صدیاں ان کتابوں پر ایسی گزری ہیں کہ ان کا دنیا میں نام ونشاں نہ تھا' پھر کسی طریقہ سے ان کے نام ونشان کا پتہ چلایا گیا' خدانخواستہ قرآن کے ساتھ بھی اگر ایسا حادثہ پیش آیا کہ مسلمانوں سے (العیاذ باللہ) قرآن لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی الگ ہو جاتا تو اس وقت شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ کم از کم مسلمان اس تاریخی حادثہ میں اب تک تو بحمداللہ مبتلا نہیں ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ باایں ہمہ سرد مہریاں جو غیر اقوام کے سیاسی اور ذہنی دباؤ سے آہ! کہ اپنی کتاب کے متعلق مسلمانوں میں محسوس ہو رہی ہیں۔ حفاظت قرآن کے ذمہ دار سے امید ہے کہ ان کو خدانخواستہ اس حال میں مبتلا نہ ہونے دے گا۔ بہر حال آئندہ سے نہیں' گزشتہ اور حال کی جو نوعیت ہے' گفتگو اس میں ہو رہی ہے۔ یہ ایسا بدیہی واضح ناقابل تردید واقعہ ہے کہ دوست ودشمن کسی کے لیے مجال انکار نہیں۔

اسی لیے میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کی ان ہی باتوں کو جو غیر اقوام میں مشکوک و مشتبہ ہو گئی ہیں۔ ان ہی کی تصحیح کر کے قرآن نے ان کو قطعی اور یقینی بنا دیا ہے۔ آپ اسلام میں یہ کیا تلاش کرتے ہیں کہ وہ کیا نئی بات بتاتا ہے' وہ نئی بات کا مدعی ہی کب ہے بلکہ جو کچھ ڈھونڈھنا ہے۔ دنیا کے تمام ارباب مذاہب کو ڈھونڈنا ہے۔ وہ یہی ہے کہ معمہ کائنات اور راز حیات کے جن بنیادی سوالات کے جوابات بیرونی آمیزشوں سے مشکوک ہو گئے ہیں اور ایسے مشکوک کہ اب خدا کی بات کو آدمی کی بات سے آپ کسی طرح جدا نہیں کر سکتے' ناخن کو گوشت سے چھڑا نہیں سکتے۔ قرآن ان ہی بنیادی امور کا قطعی واضح غیر مشتبہ علم ویقین آپ کو عطا کرے گا۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہر مذہب اور دین والے قرآن میں کسی جدید دین کو نہیں بلکہ اپنے اپنے آبائی دین ہی کو بجائے مشکوک حالت کے یقینی شکل میں پانا چاہیں تو پا سکتے ہیں۔ یہودیوں کو حضرت موسیٰ کی عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی ابراہیمیوں کو حضرت ابراہیم کی نوحیوں کو حضرت نوح کی از یں قبیل ہر پیغمبر کی امت اپنے پیغمبروں کی تعلیم قرآن سے پا سکتی ہے اور بچھڑنے کے بعد قرآن کے ذریعہ سے پھر اپنے اپنے پیغمبروں تک ہر امت واپس ہو سکتی ہے۔ محمد رسول اللہؐ قوموں کو ان کے پیشواؤں سے توڑنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آئے تھے اور **مصدق لما معکم** اور ''النبیین'' کے خاتم کا حقیقی منصب ہے بھی یہی۔

انتہائی دیانتداری اور بغیر کسی پاسداری کے میں اس کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن سے ہٹ کر جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مسلمات اور تعلیمات کو مانتے ہیں' مانتے ضرور ہیں لیکن جسے واقعی یقین کہتے ہیں' اس یقین کے ساتھ جزئیات مذہب کے عام تفصیلات ہی نہیں' بلکہ بنیادی امور کا بھی ماننا ان کے لیے ناممکن ہے' انسان بہر حال ایک عقلی فطرت ہے۔ ضد' ہٹ دھرمی' آبائیت جس کی تعبیر اس زمانہ میں قومی روایات یا کلچر [7] وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ ان جذبات

کے زور سے لاکھ وہ باور کرانا چاہیں کہ جو چیزیں مشکوک ہیں، ہمیں ان پر اسی قسم کا یقین ہے، جیسے واقعی یقینی ذرائع سے حاصل ہونے والے معلومات کو مانا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا جو آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ کر مان رہا ہے، اس کے یقین کی جو کیفیت ہوگی۔ کیا اس کی برابری اس شخص کے ماننے کی کیفیت کر سکتی ہے، جس نے یونہی بعض تخمینی قرائن سے باور کر لیا ہو کہ افق سے آفتاب سر باہر نکال چکا ہے۔ مذہب کی بنیاد جن امور پر قائم ہے، جب ان ہی کے متعلق واقعی شک یا یقین نما شک ہو تو پھر ان بنیادوں پر جو تفریعات اور نتائج و آثار پیدا ہوں گے۔ ان کی گرفت میں بھی وہ قوت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو بنیادی امور کے قطعی علم والوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ قرآن میں پڑھیے یہی راز ہے کہ ان ہی چند بنیادی امور جس پر مذہب کا چکہ گھومتا ہے۔ ان ہی کی یقین آفرینی کے لیے ان کو بار بار مختلف پیراؤں میں دہراتا ہے، مثلاً حق تعالیٰ کے صفات و کمالات، قانون مجازاۃ اور ان دونوں سے بھی زیادہ ذریعہ علم یعنی رسول کی رسالت کی صداقت چاہتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کا یقین انسانی فطرت میں محلول کر دیا جائے کہ سارا دار و مدار تو علم کے ذریعہ کی قوت اور وثاقت ہی پر ہے۔ سب کچھ ہو لیکن آنکھ نہ ہو تو ٹٹول ٹٹول کر آپ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر آنکھ روشن ہو چکی ہے۔ اب کیا ہے جن چیزوں سے زندگی کا حقیقی تعلق ہے، ان کو آنکھوں سے دیکھ لینے اور ان کے متعلق قطعی فیصلہ کن علم حاصل کر لینے کے بعد غیر اہم امور میں اگر تخمینہ اور قیاس سے بھی کام لیں تو ظن غالب بھی اس کے لیے کافی ہے، لیکن بنیادی امور کو بھی بجائے قطعی اور یقینی بنانے کے جو لوگ صرف شک یا زیادہ سے زیادہ غالب گمان کی راہوں سے پا رہے ہیں۔ بظاہر اپنے آپ کو لاکھ پاوئے ہوؤں میں باور کرائیں لیکن یقین کیجیے کہ قطعیت اور لاریبیت کی خنکی سے وہ محروم ہیں، یہ انسانی فطرت کا اٹل قانون ہے۔ مذہب کے بنیادی امور اساسی حقائق کے قطعی لازوال یقین کی یہی دولت گرانمایہ ہے، جس کا سرمایہ دار کرۂ زمین پر اسی خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا ہے۔ قرآن اور صرف

ذلك الكتب لاريب فيه من رب العلمين

''وہی کتاب ایسی ہے، جس میں شک نہیں کہ جہانوں کے مالک کی طرف سے آئی ہے۔''

یہی کتاب ماننے والوں میں اس متعدی یقین کو پیدا کرتی ہے اور وہی پیدا کر سکتی ہے جو ماننے والوں سے نہ ماننے والوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ قرآنی یقین کے اسی آہنی لنگر سے صلاح و تقویٰ کی جو زندگی اور سیرت جکڑی رہتی ہے۔ اسی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ سارا فلسفہ، سارے خوارق بے زور ہو کر بازو ڈال دیتے ہیں کہ بہر حال باہر میں کچھ بھی دعویٰ کیا جائے لیکن انسانی فطرت کی گہرائیوں میں نہ فلسفہ جڑیں جما سکتا ہے اور نہ عجائب و غرائب مافوق العادات قصے اور افسانے یقین کی اس گرفت اور عدم گرفت کا لوگوں میں شعور ہو یا نہ ہو لیکن انسانی فہم عامہ دونوں کے زور میں فطرتاً فرق محسوس کرتی ہے، مقابلہ کے وقت اس درخت کو سر بسجود ہونا پڑتا ہے، جس کی شاخیں باہر میں چاہے جتنی بھی پھیلی ہوں لیکن اندر میں اس کی جڑیں جمی ہوئی نہیں ہیں، خواہ لوگوں کو ہم سے اختلاف ہو، لیکن میرے دماغ میں تو

''ایں قوم (ہندو) راچنداں بگفت کسے دل نہ گردد اما اگر صحبت صالحے بیابد امید بادشاہ کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود۔'' (صفحہ 182)

سلطان المشائخ کے قول سے یہی مطلب سمجھ میں آیا بلکہ چنداں کے لفظ سے حضرت نے اِدھر بھی اشارہ فرمایا کہ یوں بطور بخت واتفاق کے''گفت''یعنی لیکچر، تقریر وغیرہ کی لفاظیوں سے بھی کبھی کوئی متاثر ہو جائے لیکن جن حالات میں یہ قوم مبتلا ہے اس کا مقابلہ واقعی قرآنی یقین (اور قرآنی یقین کے سوا یقین کی صورت ہی کیا ہے) سے پیدا ہونے والی سیرت صلاح وتقویٰ کی زندگی ہی کر سکتی ہے۔

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے۔''گفت''کے ذریعہ سے جن لوگوں نے اس قوم میں کام کرنا چاہا اولاً تو ان کو کامیابی ہی نہیں ہوئی اور الشاذ کالمعدوم کے طور پر بعضوں کو کبھی کامیابی ہوئی مثلاً''شاہجہاں نامہ''میں ملا محب علی سندھی کے متعلق لکھا ہے جس کا ترجمہ''تاریخ برہان پور''سے نقل کر رہا ہوں۔

''ملا محب علی اہل اسلام کی حاجت روائی میں بہت سعی کرتے تھے اور کفار کو ترغیب دین اسلام کی بذریعہ وعظ ونصائح وغیرہ دلایا کرتے تھے اور بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نو مسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے۔''(صفحہ 147)

واللہ اعلم ملا صاحب کو''گفت''کے اس طریقہ سے کس حد تک کامیابی ہوتی تھی لیکن خود آگے کا فقرہ''بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نو مسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے''خود دلالت کر رہا ہے کہ اسلام کی وہ تبلیغ جس سے اسلام لانے والوں کے لیے تقرر معاش کے اجرا کے واسطے بادشاہوں سے عرض کرنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ خود اسلام لانے والے

فان ابی ووالدتی و عرضی لعرض محمد منکم فدا

(حسّان بن ثابت صحابی)

''میرے باپ میری ماں اور میری عزت آبرو سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت پر تم لوگوں کے مقابلہ میں قربان ہوں۔''کہتے ہوئے''اللہ رسول''کے سوا اپنا سب کچھ اسلام کے لیے حاضر کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ بات''گفت''والی تبلیغ میں حاصل نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ وہ تبلیغ ہی کیا ہوئی جس کی کامیابی کے لیے پہلے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے خزانوں کا انتظام کر لیا جائے۔[8]

حواشی

(1) میں نے قادریہ کا ذکر اس سلسلہ میں قصداً اس لیے نہیں کیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے طریقہ قادریہ کو کسی اسلامی ملک سے کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اسلام ہے قادریہ طریقہ بھی وہاں اس کے ساتھ پہنچا ہے۔ یہ حضرت سیدنا شیخ جیلیؒ کی جلالت قدر کا اثر ہے کہ وہ سارے اسلامی ممالک پر حاوی ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء قدمی علی رقبة کل ولی کا شاید یہی مطلب ہو۔

(2) کچھ نہیں تو''مہابھارت''ہی پڑھیے۔ جا بجا کسی درخت کا اچانک آدمی ہو جانا آدمی کا درخت ہو جانا۔ لڑکوں کا جوان، جوانوں کا لڑکوں کی صورت اختیار کرنا، لکڑی کا تلوار کی صورت اختیار کرنا، تلوار کا لکڑی بن جانا۔ غرض ہر ناممکن کو ممکن ہی نہیں بلکہ قدم قدم میں واقعے کی

شکل اختیار کرتے ہوئے آپ اس کتاب میں پائیں گے۔ اس کے ماسوا دیگر قصص و حکایات کا تقریباً ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے جس میں مذہبی رنگ کی شرکت ہے اور اس کو واقعات کا درجہ مل چکا ہے۔

(3) اس زمانہ میں یورپ والوں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میٹافزکس (فلسفہ مابعد الطبیعیات) یا حقیقت کون کے مسائل مبدأ و معاد کے متعلق ایگناسٹک (ارتیابیت) کے فلسفہ کو انہوں نے خوب منقح کر کے رکھ دیا ہے۔ گو تشکیک دنیا کے پرانے فلسفی نظریات میں ایک قدیم نظریہ ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ پہلے اس پر اتنی توجہ کبھی نہیں کی گئی جتنی کہ یورپ میں کی گئی۔ تشکیک دراصل انسانی جہل کا تحقق ہے۔ یہی جہل اس علم کی راہ درست کرتا ہے، جس سے معمہ کائنات حل ہو جاتا ہے۔

(4) تفصیل کے لیے تو دنیا کے تمام مذاہب کی آسمانی کتابوں کی تحقیقی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ خاکسار نے اپنی کتاب ''النبی الخاتم'' کے شروع میں کچھ اشارے اس طرف کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مطالعہ کے بغیر ذلک الکتب لاریب فیه کے قرآنی دعوؤں کی قیمت آدمی پر واضح ہی نہیں ہو سکتی کہ یہ عالم کی ساری لائبریریوں کے مقابلہ میں کھلا ہوا چیلنج ہے۔

(5) میں نے اپنے دیوبندی اساتذہ جن کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا، یہ بھی سنا ہے کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ یعنی حکیم الامتہؒ کے اساذ امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے، کبھی کبھی یہ فرماتے کہ ہردوار (ہر بمعنی خدا' دوار' گھر' بیت یعنی بیت اللہ) میں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے، مجھے اس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ شاید کچھ اور ہوں لیکن معنی یہی تھے اور اس سے اس بات کی توثیق کہ لکل امته جعلنا نبیا کا جب زمانہ تھا تو اس وقت بالکل ممکن ہے کہ اقوام کے قبیلے جیسے مختلف تھے' جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان کے مناسک کے مقامات بھی مختلف ہوں ولکل امتجعلنا منسکا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ والقصہ بطولہا

(6) گو اس کی کوئی تصریحی دلیل تو میرے پاس نہیں ہے لیکن تمام انبیاء میں صرف دو پیغمبروں کا یہاں انتخاب ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خیال گذرتا ہے کہ مغربی ممالک عموماً مسیح علیہ السلام (جو موسوی دین ہی پر لوگوں کو قائم کرتے تھے) ان کو پیغمبر مانتے ہیں بلکہ ان کا عملدر آمد ان کی شریعت وہی موسیٰ کی شریعت ہے اور مشرقی اقوام ایرانی' ہندی وغیرہ کے متعلق تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ ایرانی اپنا وخشور (پیغمبر) اول مہ آبابائی کعبہ کو ٹھہراتے ہیں۔ ہندو وید کے متعلق مدعی ہیں کہ برہما کے منہ سے نکلا۔ اسی بنیاد پر وید والے اپنے کو برہمن کہتے ہیں۔ نون آرین زبانوں میں یائے نسبت کا قائم مقام ہے۔ گویا مغرب اور مشرق کے دیانات کی طرف یوں اس روایت میں ایماء ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلیؒ نے اپنی کتاب ''الانسان الکامل'' میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو قسم کے لوگ ہیں' عوام تو وثنیوں (بت پرستوں) کا گروہ ہے لیکن وہاں کے خواص براہمہ دین ابراہیمی کی یادگار ہیں۔

(7) یورپ نے انسانیت پر جہاں بیسیوں مظالم توڑے ہیں' ان میں ایک بڑا ظلم اس حدیث العہد لفظ ''کلچر'' میں بھی چھپا ہوا ہے۔ قرآن سے پہلے کسی چیز یا مسلک وطریقہ کی صداقت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی تھی کہ ما وجدنا علیه اباءنا الاولین یعنی جس پر اپنے باپ داداؤں کو ہم نے پایا ہے' چونکہ یہ وہی ہے اس لیے سچ ہے۔ قرآن نے ڈانٹ ڈانٹ کر اس بیہودہ استدلال کی بنیاد کو مضمحل کیا' لوگ شرمانے لگے کہ صداقت کی دلیل میں باپ دادا کے طرز عمل کو پیش کریں لیکن یورپ نے پھر کلچر کا لفافہ ایسا عطا کیا ہے کہ اس میں لپیٹ کر بیہودہ سے بیہودہ بات پر اصرار کرنا ہر قوم کا گویا جائز قومی حق ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ بھولے مسلمان بھی اب اسی کلچر کے نیچے اپنے دین کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یاللعجب

(8) آج کل خصوصاً جب سے سرشماری پر حقوق کی بنیاد مغربی حکومت نے رکھ دی ہے' تبلیغ اسلام کا لفظی ذوق مسلمانوں میں عام پایا جاتا ہے اور سکیمیں وہی سوچی جاتی ہیں جو عموماً پادری اپنے مشن کے چلانے میں اختیار کرتے ہیں لیکن بندگانِ خدا اتنا نہیں سوچتے کہ پادریوں کا تعلق یورپ وامریکہ کے جن ساہوکاروں دولتمندوں اور حکومتوں سے ہے' غریب' محکوم' مفلس مسلمان ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ آج وہ بیچارے مسلمان جو دانے دانے کے محتاج ہیں' اس پر بھی مسلمانوں کو جب پکارا جاتا ہے' مذہب کے نام سے پکارنے والے پکارتے ہیں تو ان کی اکثریت اپنی جیب جھاڑنے کو تیار رہتی ہے۔ افسوس کہ اس کا بھی صحیح مصرف نہیں لیا جاتا۔

خواجگانِ چشت کا محورِ عمل

اب دنیا مجھے خواہ بیجا خوش اعتقادی ہی کے ساتھ کیوں نہ متہم کرے' جہاں تک میرے حقیر تتبع وتلاش کا تعلق ہے' خواجگانِ چشت کا جو سلسلہ ہندوستان کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا' ان کے پاس تو کم ازکم میں جس چیز کو سب سے بڑے کارگر حربہ کی حیثیت سے پاتا ہوں وہ حقیقی اور واقعی صلاح وتقویٰ پیدا کرنے والے یقین کی واحد ضامن ''کتاب مبین'' ہی کو پاتا ہوں جو دی گئی ہے اس لیے کہ

یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ویخرجهم من الظلمت الی النور باذنه ویهدیهم الی صراط مستقیم (مائدہ)

''راہ دکھاتا ہے' اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو (واقعتاً یقین کی حقیقی روشنی میں) اللہ کی رضامندی کو ڈھونڈھتے ہیں (اوران کتابوں سے اعتماد اٹھا چکے ہیں) جن میں خدا کے ساتھ غیر خدا کی رضامندی شریک ہوگئی ہے تاکہ وہ کتاب ان کو سلامتی کی راہوں پر ڈال دے اور نکالے ان کو (شک) کی اندھیریوں سے (یقین) کی روشنی میں (اپنی عقلی تجویزوں سے نہیں بلکہ) فرمان سے اللہ ہی کے اور لے چلتی ہے وہ کتاب سیدھی راہ پر۔''

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے مشائخ چشت قرآن کے سوا اور کچھ پڑھتے پڑھاتے ہی نہ تھے۔ ہندوستان کے تعلیمی نظام کے ذکر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہاں کے تعلیمی میدان کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اسلامیات کے چند لازمی مضامین کے ساتھ ادب' لغت' فلسفہ' منطق' ریاضی' ہندسہ حتیٰ کہ موسیقی' السنہ غیر وغیرہ سب ہی چیزیں شریک تھیں اور یہ تو اسلامی عہد میں اس ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی ماحول کا عام حال تھا' مشائخ چشت کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نرے غیر عالمانہ تصوف کی ان نگاہوں میں کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی' نہ بنگال کے شیخ الشیوخ شیخ سراج عثمان جن کا شاید پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ جب وہ اس راہ میں خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہوئے جو مشائخ چشت کا اس ملک میں کاروبار تھا تو حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا ''اول درجہ دریں کار علم ست'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 288) اور سلطان المشائخ کا یہ کوئی ذاتی خیال نہ تھا' ان کے شیخ حضرت فریدالدین شکر گنج'' کے نزدیک بھی اسلامی تصوف اور درویشی کی بنیاد علم ہی پر قائم تھی' سلطان جی

ہی ان سے ناقل ہیں کہ ''درویش راقدرے علم باید۔'' (صفحہ 107) ''قدرے علم'' کا کیا مطلب تھا' اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ سلطان المشائخ ان کی خدمت میں مروجہ درسی علوم کے نصاب کو ختم کرکے گئے تھے بلکہ فضل والے نصاب کو بھی انہوں نے تو پورا کرلیا تھا لیکن اس کے بعد بھی شیخ کبیر نے ان کو براہ راست ''تمہید سالمی'' بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی ''عوارف'' بھی پڑھائی اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ خود شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان المشائخ کو تجوید کی بھی تعلیم دی حالانکہ گذر چکا کہ سلطان المشائخ نے بچپن میں قرآن جس استاد سے بداؤں میں پڑھا تھا وہ نومسلم مقری شادی نامی تھے جو خود قرأت سبعہ کے عالم تھے لیکن باوجود اس کے بھی شیخ کبیر نے ضرورت محسوس کی کہ سلطان المشائخ کو صحیح تلفظ اور لہجہ کے ساتھ قرآن سکھائیں اور دو ایک پارے نہیں' اس توجہ' انہماک واہمیت کو ملاحظہ کیجیے کہ چھ پارے کامل تجوید کے ساتھ شیخ کبیر نے سلطان جی کو پڑھایا۔ اس کی تصریح تو مجھے ملی نہیں کہ لفظی تجوید کے ساتھ قرآن کے معانی اور مطالب بھی بیان کرتے تھے یا نہیں' واللہ اعلم بالصواب البتہ الفاظ کی تجوید وتصحیح جس طریقہ سے ہوتی تھی' اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ سلطان المشائخ ہی سے ''فوائد الفواد'' میں منقول ہے کہ ''چوں من خواندن آغاز کردم مرا فرمود کہ الحمد بخوان چوں بخواندم ودر والا الضالین رسیدم فرمود ضاد ہم چنیں بخواں کہ من می خوانم۔''

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ''ہر چند کہ می خواستم نیامد' یعنی ضاد کا جو خالص عربی تلفظ ہے' جیسے عربوں سے ٹ' ڑ وغیرہ حروف کے ادا کرنے کے لیے زبان کو جہاں جانا چاہیے وہاں عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتی' اسی طرح ہندی نژاد کے لیے ''ضاد'' کے حرف کا ادا کرنا عموماً سخت دشوار ہوتا ہے۔ یہی حال سلطان جی فرماتے ہیں کہ ہمارا تھا لیکن شیخ کبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ مشق بہت پختہ تھی' آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ صوفیوں کے جس طریقہ میں قرآن کے الفاظ اور حروف کی ادائیگی کو اہمیت دی جاتی ہو' ان کا قرآن کے معانی سے کیا تعلق ہوگا' سلطان المشائخ بھی قرآن کی اس تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ کبیر کی مہارت کے متعلق فرماتے

''ایں چہ فصاحت وبلاغت بود شیخ شیوخ العالم ضاد بہ نوعے خواند کہ ہیچ کس را میسر نشد۔''

(سیر الاولیاء' وغیرہ۔ صفحہ 71)

بہر حال جب درویشی کے ''قدرے علم'' میں قرآنی الفاظ کی تجوید وتصحیح بھی داخل تھی' اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ عام علوم درسیہ کے متعلق چشتی طریقہ کے بزرگوں کا مطمح نظر کیا تھا' وہی شیخ بنگال عثمان سراج ہی کے قصہ میں دیکھیے کہ سلطان المشائخ اس راہ میں گامزن ہونے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے ''کہ از علم او چنداں نصیبے نہ دارد' اور جب تک مولانا فخر الدین زرادی نے حضرت والا کو یقین نہیں دلا دیا کہ عام علوم درسیہ دینیہ میں نے انہیں پڑھا دیا ہے' اجازت نہ ملی۔ ''علم'' کی قدر ومنزل' اہمیت وضرورت کا احساس سلطان المشائخ کو کس حد تک تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی مجلس مبارک میں سب سے آگے علماء کی نشست ہوتی تھی اور اس کے بعد دوسرے لوگ بیٹھتے تھے۔ حضرت والا کی طرف سے آدابِ مجلس کے سلسلہ میں اس کا اعلان کردیا گیا تھا۔ ''سیر الاولیاء'' میں انہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے کہ

''من نخواہم کہ ہیچ مجعدے[1] بالا ترمتعمے بہ نشیند۔'' (صفحہ 202)

اور یہ نقطہ نظر کہ علم کے قدر ضروری کے متعلق تھا۔ باقی اس راہ میں جو لوگ دین کی خدمت کی نیت سے داخل ہوتے تھے' ان کے لیے علمی مشاغل کا ایک درجہ وہ تھا جس میں اشتغال کی ممانعت تو نہیں تھی لیکن عام طور پر ہمارے خواجگانِ چشت ان لوگوں کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے جس کے راوی میر خورد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں اودھ کے علماء کا جو گروہ آ کر شریک ہوا تھا' ایک مدت سے علمی مباحث جن کے وہ عادی تھے' خانقاہی زندگی میں ان سے کچھ بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر ایک دن سبھوں نے مل کر مشورہ کیا کہ اس باب میں حضرت والا سے استمزاج کیا جائے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ

''وقتے یاراں اعلیٰ کہ از اودھ بودند اتفاق کردند کہ اجازتِ تعلم و بحث کردن از سلطان المشائخ بستانند۔''

یہاں ''تعلم و بحث کردن'' سے مراد اصطلاحی تعلم نہ تھا بلکہ پیشہ وارانہ تحقیق و تدقیق مطالعہ ومباحثہ کا پرانا ذوق ان کے دلوں میں جو گدگدیاں لے رہا تھا' اسی ملائی ذوق کی تشفی چاہتے تھے۔ میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ

''اگرچہ ہر یکے ازیں یاراں عالمے متبحر بود لیکن ہوس ایں کار کہ عمر بداں مشغول بودند باعث می شد۔''

مگر جب یہ سوال اٹھا کہ حضرت گرامی کی خدمت میں ان کی اس خواہش اور ذوق کا اظہار کون کرے' تو ہر ایک کانوں پر ہاتھ دھرنے لگا۔ ردوقدح کے بعد طے ہوا کہ وہی مولانا جمال الدین جنہوں نے خراسان کے ''مولانا بحاث'' کے دماغ کا نشہ اتارا تھا' چونکہ حضرت نے خصوصی خوشنودی کا ان کے ساتھ اظہار کیا تھا' اس لیے ان ہی کو آمادہ کیا گیا۔ بیچارے سیدھے آدمی تھے' تیار ہو گئے اور سب مل کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آگے بڑھ کر مولانا جمال الدین نے عرض کیا ''مخدوم را اگر فرمان باشد یاراں وقتے بحثے کنند۔'' یہ سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا' گو پیش کرنے والے تو صرف مولانا جمال الدین ہی تھے لیکن ''دانست کہ ایں سوال ہمہ یاراں است کہ حاضر آمدہ اند' لایعنی غیر ضروری دماغ کاویوں میں وقت ضائع کرنے کی چاٹ جوان لوگوں کو پڑی ہوئی تھی' یہ محسوس کر کے کہ ابھی ان کا یہ غلط ذوق بالکلیہ مردہ نہیں ہوا ہے' ذرا برہمی کے ساتھ آپ نے فرمایا

''من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہم چو پیاز پوست در پوست اند۔''

یہ بڑا اہم تاریخی فقرہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مریدوں کا ایک طبقہ تو عوام کا تھا' جو مرید ہوتا تھا اور چلا جاتا تھا' ان لوگوں کو مرید کرنے کی کیا غرض ہوتی تھی' اس کا ذکر تھوڑی دیر بعد کیا جائے گا لیکن اہل علم کے ایک طبقہ کو سلطان المشائخ کسی خاص مطلب اور غرض کے لیے تیار کر رہے تھے' لیکن ان کو مایوسی ہوئی کہ مغز کار تک ان کی رسائی نہیں ہوئی' اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد ایک شیخ کا اپنے تلامذہ اور مریدوں کے ساتھ تھا لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ پیشہ وارانہ علمی مشاغل کے ایک بڑے حصہ کو خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنہیں اپنے کسی مطلوب خاص کے لیے تیار کیا جاتا تھا' ان کے لیے اس قسم کی غیر ضروری مشغولیت کو پسند نہیں فرماتے تھے' زائد از حاجت غیر ضروری مطالعہ جو زیادہ تر ذہنی التذاذ کے لیے کیا جاتا ہے' یہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے واقعی طالب العلمی کی ہو' ایک ایسا عارضہ ہے جس سے نجات آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی گہری اور عمیق عقل کی ضرورت ہے ورنہ جس بیچارے میں صرف پوست ہی پوست ہو' مغز نہ ہو اس کے

نزدیک تحقیق و تدقیق، ریسرچ و اکتشاف سے بہتر کام اور کیا ہوسکتا ہے۔ ع غالباً ایں قدر م علم کفایت باشد۔

اس حقیقت تک رسائی ہر بے مغز آدمی کا کام نہیں ہے۔ علم کو صرف علم کے لیے حاصل کرنا چاہیے' اس بے معنی فقرہ کا اہمال اگر کسی پر واضح بھی ہو جائے' پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

علم گزیدہ دماغوں سے باوجود سب کچھ سمجھنے کے اس ذوق کا سمی اثر آخر وقت تک نہیں مٹتا۔ سلطان المشائخ سے زیادہ اس قصہ کا دانائے راز حقیقت آگاہ اور کون ہو سکتا ہے' وہ بھی تو کبھی محفل شکشی اور بحاثی کی لذت اٹھا چکے تھے۔ حالت یہ تھی کہ ''علم کو علم کے لیے'' کے کاروبار کو چھوڑ دینے کے بعد کبھی کبھی خود اپنا حال بیان فرماتے جیسا کہ حسن علا سجزی نے ''فوائد الفواد'' میں نقل کیا ہے کہ ایک دن ''مشغولیِ حق'' کا ذکر ہو رہا تھا' ارشاد ہوا کہ

''کار آن دارد (یعنی کام کی بات یہ ہے) و دیگر ہر چہ جز آن ست مانع آں دولتست۔''

مگر اس تحقیق کے بعد بھی وہی دماغ سے گزری ہوئی پرانی چیزوں کا خیال آ ہی جاتا تھا' مطالعہ کے لیے ان ہی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنا شروع کرتے کہ معاً خیال آجاتا کہ یہ کیا کر رہا ہوں' خود ہی فرماتے ہیں

''اگر وقتے ازاں کتب کہ خواندہ ام مطالعہ می کنم وحشتے در من ظاہر شود با خود گویم کہ کجا افتادیم۔'' (صفحہ 91)

بہرحال غیر ضروری معلومات کے ذخیرہ کو دماغ میں بھرتے چلے جانا یا ان نکات اور پیچیدگیوں کا حل کرنا جن کا نہ دین میں نفع ہو نہ دنیا میں جو ہمارے یہاں کے علوم نہیں بلکہ سارے جہان کے اکثر علوم و فنون کا حال ہے' کوئی مرے ہوئے لوگوں کی ولادت اور وفات کے سنین کی تحقیق میں مشغول ہے۔ کوئی کسی قبر کے کتابہ کو پڑھ رہا ہے' کوئی ستاروں کو گن رہا ہے۔ کوئی آسمانی طبقات کو شمار کر رہا ہے۔ **الی غیر ذلک من المشاغل العلمیة التی یتشاغلون فیھا لانھا شغل علمی** مگر غزالی الامام نے اگر یہ لکھا ہے کہ آسمانی طبقات کا گننا اور کسی پیاز کے چھلکوں کو اتار اتار کر شمار کرنا نتیجہ کے لحاظ سے بتایا جائے کہ دونوں میں کیا فرق ہے تو اس کا آخر کیا جواب ہے' جو گلیوں کے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو چن چن کر گنتا جائے اور اپنی ڈائری میں ان کی تعداد کو نوٹ کرتا پھرے' اگر اس پر جنون کا فتویٰ لگانا صحیح ہے تو پھر جو رات رات بھر جاگ جاگ کے آنکھوں پر دوربینیں لگا لگا کر کہکشاؤں کے ستاروں کو گنتے ہیں' اس کی باضابطہ رپورٹ تیار کرتے ہیں اور اسے اسٹرانومی (نجومیات) کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں' اس فتوے سے ان بیچاروں کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

''افادہ'' کے معیار پر آپ علوم و فنون کی اس لمبی فہرست کو اگر جانچیں گے تو اکثر و بیشتر کا یہی حال نظر آئے گا۔ اس لیے حدیثوں میں ''علم لاینفع'' (ایسا علم جس پر کوئی نفع مرتب نہ ہوتا ہو) سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہی ہمارے مشائخ چشت کا علم کے باب میں نقطہ نظر تھا' تاہم پھر بھی علوم کی ان قسموں کے متعلق جن سے اگر نفع نہیں ہے تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچتا۔ بجز اس ضرر کے کہ آدمی کا وقت بیکار ضائع ہوتا ہے۔ چنداں سختی نہیں کی جاتی۔ سلطان المشائخ جب شروع شروع میں شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ کا بیان ہے کہ حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد ''عرض داشت کردم فرمان شیخ چیست ترک تعلم گیرم؟''

اس تعلم سے غیر ضروری علوم کا مطالعہ درس و تدریس تحقیق و تدقیق مراد ہے کیونکہ علم کی قدر ضروری سے تو

حضرت فارغ ہی ہو چکے تھے اور جو کچھ کمی رہ گئی تھی بابا صاحب نے اس کی تکمیل خود ہی فرمادی تھی۔ شیخ کبیر نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

''من کسے را از تعلم منع نہ کنم آن ہم کن ایں ہم کن تا غالب کہ آید۔'' (صفحہ 107)

مطلب یہ ہے کہ جس نے اس راہ میں حقیقت آگاہی کے صحیح مقام کی یافت کے بعد قدم رکھا ہے' اس کا تعلق غیر ضروری علوم سے خود بخود رفتہ رفتہ کمزور و مضمحل ہوتا چلا جائے گا اور ''علم کا جو حقیقی مقصد اور مآل کار ہے اس پر قدم جمادے گا اور اگر یونہی دیکھا دیکھی اس راہ میں آیا ہے تو پھر اپنے قدیم مالوفات کی طرف واپس ہو جائے گا اور اس سے ان بزرگوں کے حکیمانہ طریقہ کار کا سراغ ملتا ہے کہ جس پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے۔ زبردستی جبراً اس کو ایسی بات پر مجبور کرنا جس میں کوئی ضرر بھی نہیں ہے' تربیت کی صحیح راہ نہیں ہو سکتی بلکہ وہی بات کہ ''این ہم کن آں ہم کن تا کہ غالب آید'' جو کچھ اندر میں ہے' باہر اسی کا تابع ہو جائے گا۔

لیکن یہ فیصلہ صرف ان ہی علوم کی حد تک محدود رہ سکتا ہے جس سے نفع نہیں تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔ باقی تعلیم و تعلم، تحقیق و مطالعہ کی وہ راہ جس نے خدا جانے کتنوں کی راہ ماری اور جو بسا اوقات برہم زن ایوانِ انسانیت ہوئی ہے' حضرت بابا صاحب ہی سے نظام الاولیاء نے نقل کیا ہے کہ ایک دن اجودھن میں حضرت کے پاس ایک شخص آیا اور کان میں کچھ کہنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں دلی میں ہم سبق تھے' پھر علم سے کیا کیا دنیاوی فوائد حاصل کر سکتے تھے' اس کا ذکر اس نے کیا۔ شیخ کبیر کو میں نے دیکھا کہ وہ جواب میں فرمارہے تھے۔

''اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل است مخواں و بخلق ایذائے مرساں و اگر برائے عمل است ہمیں قدر کافی ست کہ می خوانند و عمل می کنند'' (صفحہ 85۔ سیر)

اور یہ علم کی وہ قسم اور اس کا وہ استعمال ہے جس کے متعلق ہمارے بزرگوں کا فیصلہ ''مخواں'' کا تھا یعنی جس کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے' خصوصاً دینی علوم کے لیے تو زہر قاتل اور سم ہلاہل ہے۔ اس کے بعد خود شیخ کبیر کا ارشاد ہے۔

''مقصود از خواندن شریعت عمل ست نہ از برائے ایذائے خلق۔''

اور یہی وہ تماشا ہے جس کا نظارہ ہندوستان میں آج تقریباً سو سال سے دیکھا جا رہا ہے۔ جب تک اس ملک کے لازمی نصاب میں لوگ دینیات کی حیثیت سے صرف قرآن اور وہی مشارق الانوار یا مصابیح السنۃ' قدوری' ہدایہ پر قناعت کر رہے تھے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کا ایک دین تھا' ایک مشرب تھا لیکن آج ادب کا غلغلہ بلند ہے۔ اخطل اور عنترہ اور ابوالعلاء اور فرزدق کی شاعری پر تنقید ہو رہی ہے۔ تحریر و تقریر کا بازار گرم ہے۔ اسماء الرجال اور تاریخ و سیر کا سمندر ہے کہ ابل رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ شاید ہی ہندوستان پر کسی دن کا آفتاب گزشتہ صدی ہی میں طلوع ہوا جس کے ساتھ کسی نئے فتنہ نے سر نہ اٹھایا ہو' کہیں اجتہاد کا دعویٰ ہے' فقہ اور آئمہ فقہ کی توہین ہو رہی ہے' کسی جگہ مہدویت و مسیحیت بلکہ نبوت کی تعمیر قلزم علم کے انہی صدف ریزوں سے عمل میں آ رہی ہے۔ کسی گوشہ سے حدیث کے انکار کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے' کسی سمت سے قرآنی آیات کی نئی نئی تفسیریں پیش ہو رہی ہیں۔ کہیں ''امت مسلمہ'' کا نظامِ نو بنایا جا رہا ہے۔ ڈنڈھی جو مچی ہوئی

ہے۔ فتنے ہیں کہ ٹوٹے ہوئے ہار کے مانند یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دینیات کا جو لازمی کورس ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں رکھا تھا' اگر علم کو جدل اور لڑائی جھگڑوں کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو عمل کے لیے وہ کافی نہ تھا؟ قرآن اور حدیث کی عام معمولی سادہ عربی سمجھنے کے لیے کیا واقعی امرء القیس اور طرفہ تابط شرا کے کلام کے نکات پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے کسی جگہ عرض کیا تھا کہ ہمارے اسلاف (قدس اللہ اسرارہم) کے جہاں اور بہت سے عجیب وغریب کارنامے ہیں۔ ان میں بڑا نمایاں کام ان کا یہ بھی ہے کہ عربی زبان کے اس حصہ کو جس میں اسلامی ادبیات محفوظ ہیں' اسے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی ملک کی مادری زبان اسے نہ بنا سکے تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی جو مادری زبان تھی' اس میں قرآن وحدیث کے ان الفاظ کو شریک کر دیا گیا تھا جس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے اس ذخیرہ سے (جسے میں اسلامی الفاظ کہتا ہوں) تقریباً 90 فیصدی الفاظ سے ہم عربی سیکھے بغیر واقف رہتے ہیں۔ مثلاً آپ سورۃ فاتحہ کو لیجیے' ایک انگریز کے سامنے بھی اسے پڑھیے اور ایک ہندوستانی مسلمان کے سامنے بھی۔ ظاہر ہے کہ عربی زبان نہ انگریز کی مادری زبان ہے اور نہ ہندوستانی مسلمان کی لیکن انگریز اول سے آخر تک ہر ہر لفظ کے معنی جاننے کے لیے اس کا محتاج ہے کہ اسے بتایا جائے مگر ہمارا حال کیا ہے۔ ہم میں کون ہے جو حمد' اللہ' رب' عالم' رحمٰن' رحیم' مالک' یوم' الدین' عبادت' استعانت' ہدایت' صراط' مستقیم' انعام' غضب' غیر' ضلالت کے معانی سے واقف نہیں۔ اب آپ ہی گن لیجیے کہ ان اٹھارہ الفاظ کو نکال لینے کے بعد سورۃ فاتحہ میں کتنے الفاظ رہ گئے جن سے ہندوستانی مسلمان ناواقف ہیں۔ بجز حروف جارہ' اسم اشارہ' اسم موصول یعنی ل' ایاک' نا' الذین' ہم' علی کے اور بھی اس پوری سورۃ میں کچھ ہے۔ جس سے ہندوستانی مسلمان عموماً واقف نہیں ہیں۔ تقریباً چوبیس الفاظ میں صرف چھ لفظوں کی عدم واقفیت کوئی عدم واقفیت قرار پا سکتی ہے اور یہ الفاظ بھی ایسے ہیں جن کی حیثیت مفردات منتشرہ کی نہیں ہے یعنی جن میں ہر ہر لفظ کے لیے لغت دیکھنے کی ضرورت ہو بلکہ کلی الفاظ ہیں یعنی اسم اشارہ' اسم موصول' حروف جارہ یا ازیں قبیل چند گنے چنے کلی الفاظ ہیں جنہیں بآسانی چند دنوں میں سکھایا جا سکتا ہے۔ گویا ان چند صنفی الفاظ کے معانی سے واقف ہو جانے کے بعد تقریباً قرآن کے پچانوے چورانوے فیصدی الفاظ کے ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ ایک چیز یہ' دوسری بات صیغوں کی خصوصی شکلیں یعنی عبادت کے معنی سے واقف ہونے کے باوجود نعبد سے یا استعانت کے معنی جاننے کے باوجود نستعین کا مطلب ہندی مسلمان جو نہیں سمجھ سکتا' یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ چند سادہ صرفی ابواب سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی وہ صیغوں کی صورت پہچاننے لگتا ہے۔ ایک فعل کی صرفی صورت سے اسے آشنا کر دیجیے واحد غائب ماضی کے سارے قرآنی الفاظ سے وہ آشنا ہو جاتا ہے اور صرفی صیغے یہ ہیں ہی کتنے۔ تیرہ چودہ شکلیں ماضی کی' تیرہ چودہ مضارع کی چھ شکلیں امر کی باقی اسم فاعل' اسم مفعول' اسم ظرف' اسم آلہ مبالغہ تفضیل' صفت مشبہ' یہ بھی اتنے کلی قاعدوں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کے یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ (2) باقی تعلیلات کا قصہ وہ دراصل اشتقاق کبیر کا علم ہے جو نفعل کو سمجھتا ہے کہ جمع متکلم کا صیغہ ہے' قرینہ سے نقول کو بھی سمجھ لے گا' خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ تلفظ میں فرق کیوں پیدا ہو گیا' اردو میں ہم تھوکنا روز بولتے ہیں' لیکن اس پر کون غور کرتا ہے کہ یہ تھوکرنا کا مخفف ہے۔ راء کلمہ بوجہ ثقیل ہونے کے حذف ہو گیا' قرآن کے چند رکوع میں ہیر پھیر کر

جب صحیح، معتل، مضاعف، مہموز کے ابواب کی صورتیں گزریں گی، دماغ خود اندازہ کرلے گا کہ عربی میں مثلاً نَصَرَ بھی ماضی کی ایک شکل ہے اور قال بھی۔ ہر زبان میں اس قسم کے تغیرات ہوتے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو کچھ کچھ کلیات ہی ہوتے ہیں، جن کے تحت یہ تغیرات پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کو بے جانے آدمی بولتا ہے، سمجھتا ہے۔ آپ روز جانا مصدر بولتے ہیں۔ گیا ماضی، جانے والا اسم فاعل لیکن کبھی اس کو بھی سوچا کہ جانے کی جیم ماضی میں گاف سے کیوں بدل گئی اور مضارع میں پھر اصلی حالت پر کیوں واپس آگئی۔ آپ تمبا کو بھی بولتے ہیں اور گڑا کو بھی لیکن اس پر آپ نے کب غور کیا کہ گڑا کو میں تین تین حروف ت م ب کو حذف کر کے گڑا کو بنایا گیا ہے۔ سوچیے تو بات میں بات نکلتی چلے آئے گی اور نہ سوچیے تو ساری باتیں اس سوچ کے بغیر آپ کی سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔

اور بالفرض اگر تھوڑے بہت تعلیلی قوانین سے صرف میں واقف ہونے کی ضرورت بھی ہو تو ان قانونوں کی تعداد ہی کیا ہے۔ یہ تو پچھلے زمانوں میں ان معلموں نے جنھیں غالباً خطرہ رہتا ہوگا کہ اگر صرف ونحو کی کتابیں جلد ختم کرا دیتا ہوں تو ہمارا سرمایہ ہی ختم ہوتا ہے۔ آگے بقاء ملازمت کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ معاملہ کو دراز کیا جائے[3] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان صرفی قوانین کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی اہمیت اسے خدا ہی جانتا ہے کہ اس ملک میں کب دی گئی، اگر ہمیشہ سے یہی حال تھا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں فاتحہ فراغ کی عمر عموماً چودہ پندرہ سے لے کر بیس بائیس کی کیسے ہوتی تھی۔ اب تو جس طریقہ سے صرفی ابواب کو پنجابی طریقہ[4] سے رٹایا جاتا ہے، اسی کے لیے یا زیادہ سے زیادہ نحو کو بھی ملا لیجیے، اتنی مدت کافی نہیں ہوتی جس کی شہادت پنجابی نحو وصرف کی وہ تعلیم دے سکتی ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے وہ مروج تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کا جو اسلامی حصہ ہے، میرے خیال میں اس کے مطالب اور معانی سے واقف ہونے کے لیے عربی زبان کے ان الفاظ اور ترکیبوں، بندشوں کے جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جن میں جاہلی شعراء کا کلام ہے اور بالفرض کہیں کہیں تھوڑا بہت ہو بھی تو تفسیروں میں وہ بیان کر دیا گیا ہے، اب تفسیروں کی ان ہی بتائی ہوئی باتوں کو پھر خود تحقیق کرنے کے لیے دواوین عرب پر عبور حاصل کرنا، اگر آپ کا ذاتی شوق ہے تو اختیاری مضامین کی حیثیت سے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں، ہر زمانہ میں جن لوگوں کو شوق تھا، ان کو کون روکتا تھا، لیکن ہر طالب العلم کے لیے خواہ اسے براہ راست ادبی تحقیقات کا شوق ہو یا نہ ہو۔ وہ بجائے جلالین یا مدارک بیضاوی کے نہیں چاہتا کہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے متعلق جاہلی شعراء کے کلام سے شاہد پیش کرے، بلکہ مفسرین نے تحقیق کر کے جو معنی لکھ دیے ہیں یا جس فقرہ کی جس ترکیب کا جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، اس مفہوم کو بتا دیا ہے تو آپ اس بیچارہ کو خواہ مخواہ اس پر کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی آپ کے اس غیر ضروری مذاق کی ہمنوائی کرے۔ آخر زمخشری، ابو عبید وغیرہ آئمہ لغت سے تو آپ کا علمی احاطہ زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ قرآن کے جس لفظ کا مطلب جاہلی شعراء کے کلام میں تلاش کرتے ہیں، وہ بیچارہ کشاف میں یا بیضاوی میں اٹھا کر دیکھ لیتا ہے، حاصل تو دونوں کا ایک ہی ہوا۔

یہی حال حدیث کا ہے، سند کے مباحث مدت ہوئی کہ ختم ہو چکے۔ امام بخاری مسلم جیسے آئمہ جن کی کتابیں تلقی بالقبول ہو چکی ہیں، یہ مان لیا گیا ہے کہ جانچ کر پرکھ کر صحیح حدیثوں کو غیر صحیح حدیثوں سے جدا کر کے ان بزرگوں نے اپنی

کتابوں میں جمع کر دیا ہے' اس لیے اب ہر حدیث کی ہر سند پر بحث کرتے ہوئے طلبہ کو پڑھانا ایک ایسے کام کو انجام دینا ہے جو آپ سے بہتر شخصیتوں کے ذریعہ سے انجام پا چکے ہیں۔ رہ جاتا ہے متن کا معاملہ متن حدیث میں ایک حصہ خلافیات کا ہے اور وہ کم ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علم حدیث کی جان ہے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ۔ ظاہر ہے کہ پہلے حصہ کے متعلق بھی پہلی ہی صدی میں بحمد اللہ امت کے بہترین دل و دماغ اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ان کے متعلق ترجیح و تطبیق و تاویل کے لیے جو کچھ کرنا تھا' سارا کام کیا جا چکا ہے اور اسی کام کے آخری نتائج کا نام فقہ ہے جو مختلف آئمہ کے ناموں سے امت کے مختلف طبقات میں معمول بہ ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ ان میں کوئی طبقہ گمراہ اور استحقاق نجات سے محروم نہیں ہے۔ اس لیے حدیث میں طلبہ کو لازمی طور پر جو پڑھانے کی چیز اور سمجھانے کی بات ہو سکتی ہے' وہ حدیث کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق خلافیات سے نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے مختلف پہلوؤں سے ہے اور اس کے لیے کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ مشارق الانوار یا مصابیح السنۃ' مشکوٰۃ المصابیح جیسی کتابیں کیا کافی نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں میں سے کسی کتاب کو جو اچھی طرح جانچ کر پڑھ لے گا آئندہ وہ حدیث کی دوسری کتابوں کا شروح' حواشی کی مدد سے یقیناً مطالعہ کر سکتا ہے۔ پھر ہمارے بزرگوں نے لازمی نصاب کا جز' انہی کتابوں میں کسی کتاب کو اگر رکھا تھا تو کیا غلطی کی تھی؟ باقی اس کے بعد بھی اگر کسی کو فن اسناد و فن خلافیات میں خصوصی مہارت پیدا کرنے کا خیال ہو تو اس سے کس نے کب منع کیا تھا اور جن لوگوں کو شوق تھا' وہ اپنے شوق کی ہر زمانہ میں تکمیل کرتے ہی رہے۔ ہندوستان بھی ایسے بزرگوں سے کبھی خالی نہیں رہا جس کا اجمالی ذکر پہلے آ چکا ہے۔

غالباً بعض خیالات جن کا میں پہلے بھی اظہار کر چکا ہوں' ان کا بالکلیہ تو نہیں لیکن بعض اجزاء کو میں نے پھر دہرایا ہے اور یہ میں نے قصداً کیا ہے۔ ایک بڑی غلط فہمی ہمارے قدیم نصاب کے متعلق پھیلی ہوئی ہے۔ چاہتا ہوں کہ لوگ اس کے افادہ کو سمجھیں اور نہ اس وقت تو مقصد شیخ کبیر کے کلام کی تشریح تھی کہ شریعت یا دینی علوم کی تعلیم سے مقصود اگر عمل ہے اور وہی ہو بھی سکتا ہے تو اس لحاظ سے ہمارا قدیم نصاب قطعاً کافی تھا اور ایسا آسان سہل الحصول تھا کہ جس طرح پہلے زمانہ میں اس کو مختلف عقلی علوم و فنون کے ساتھ جوڑا گیا تھا' اس زمانہ میں بھی بآسانی' پرانے عقلیات کو نکال کر جدید علوم و فنون کے نصاب میں ''اسلامیات'' کے اس لازمی نصاب کو بآسانی ہم شریک کر سکتے ہیں تاکہ دینی و دنیوی علوم کے جو مختلف دو دھارے دو تلواروں کی طرح ہمارے ملک میں بہہ رہے ہیں اور ان سے باہم خواص بھی کٹے جاتے ہیں' ان کا وقار برباد ہو رہا ہے اور عوام بھی ذبح ہو رہے ہیں۔ اس دوعملی کا خاتمہ ہو جائے۔ مذہب کو اپنی عملی زندگی میں شریک کرنے کا موقع اہل علم کی ہر جماعت کو براہ راست حاصل ہو جائے۔

لیکن اگر بجائے عمل کے مذہب کو نکتہ نوازیوں اور دماغی زور آزمائیوں کی صرف مشق گاہ کی حیثیت سے آپ استعمال کرنا چاہتے ہیں یا بقول شاہ ولی اللہ علم حدیث کو فصاصوں کی خودنمائیوں کی تماشا گاہ بنانا چاہتے ہیں کہ جہاں کوئی ذرا سا اجنبی و مشکل لفظ حدیث میں یا قرآن میں آیا' گویا شکار ہاتھ آیا اور بقول شاہ صاحب

''شواہداں از کلام شعراء و اخوات کلمہ و اشتقاق و محال استعمال وے۔''

کا دریا بہنے لگا۔ ہر ہر سند کے ہر ہر راوی کے متعلق ''احوال ایں قوم و سیرت ایشاں'' کا بیان شروع کر دیا گیا اور کہیں فقہ کے کسی مسئلہ کا ذکر آ گیا تو ''براں مسئلہ خصوص عیسا تخریج'' کا دروازہ کھل گیا اور ساری بحرالرائق اور شامی، عالمگیری اونڈیل دی گئی۔ کوئی تاریخی قصہ ہاتھ آیا۔ بس بادنی مناسبت قصص عجیبہ و حکایات غریبہ، نوادر امثال، محاضرات و مسامرات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ شاہ ولی اللہؒ نے اگر درس حدیث [5] و قرآن کے اس طریقہ کے متعلق یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ درس کا یہ طریقہ ''طریقہ قصاص است و قصد از اں اظہار فضیلت و علم است نہ غیراں'' تو انہوں نے کیا غلط لکھا ہے، مستعد طالب العلم پڑھنے کے بعد خود مطالعے کے ذریعہ سے جن چیزوں کو جان سکتا ہے، اسی کو سنا سنا کر اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ان چیزوں کے سمجھنے کی پوری اس میں صلاحیت بھی نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات اضاعت وقت کا سبب ہو جاتا ہے اور وہی بات صادق آتی ہے جو ہندوستان کے ایک مشہور معقولی استاد کی طرف منسوب ہے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ تہذیب میں ملا جلال کی باتیں اور ملا جلال میں شفاء و اشارات کی باتیں طلبہ کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس درجہ کے طلبہ کی سمجھ سے وہ اونچی باتیں باہر ہوتی تھیں، طلبہ جب پڑھ کر اٹھنے لگتے تو خود ہی فرما دیتے کہ پڑھانے کو تو میں نے سب کچھ پڑھا دیا لیکن میری تقریر میرے مصلی سے باہر نہیں ہوئی، گھوم گھما کر اسی میں رہ جاتی ہے۔

اور درس کے اس طریقہ میں خود نمائی ہی صرف ہو تو خیر متحمل بھی ہو سکتی ہے، آج تو جس چیز کا تجربہ ہو رہا ہے، فتنہ اور فساد کے جو دروازے بغیر کسی ضرورت کے کھولے جا رہے ہیں تو جیسا کہ شیخ کبیر شکر گنجؒ نے فرمایا تھا کہ ''اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل ست مخواں'' اس پڑھنے اور پڑھانے سے تو ملک کا جاہل ہی رہنا بہتر تھا بلکہ پرانے معقولی اگر اپنی خود نمائی کے لیے معقول کی کتابوں میں بال کی کھال نکالا کرتے تھے، میر زاہد اور ملا جلال کی ایک ایک سطر پر جھونپڑیاں ڈال ڈال کر خود بیٹھتے تھے اور طلبہ کو بٹھاتے تھے، حمد اللہ کے ایک مقام ''وجود رابطی'' پر خدا ہی جانتا ہے کہ اس زمانہ میں کتنے رسائل تصنیف ہوئے تو یہ ایک غیر دینی چیز کے ساتھ ملعبہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک قسم کی دماغی ورزش طلبہ کو کراتے تھے لیکن دین کو دماغی عیاشیوں کا تختہ مشق بنانا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ علوم کی قدر ضروری و غیر ضروری، مفید و مضر کے متعلق ان لوگوں کے جو خیالات تھے، جن کے ہاتھ میں ہندی مسلمانوں کی باگ قدرت نے سپرد کی تھی، میری مراد خواجگان چشت کے اکابر سے ہے، وہ آپ کی نظر سے گزر چکے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان بزرگوں نے اس باب میں جو رائے قائم کی تھی، اس پر اب بھی کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے علماء عموماً چونکہ انہیں بزرگوں کے زیر اثر رہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے جو ان کی علم کے متعلق رائے تھی، اسی کے ماتحت یہاں کا علمی نصاب رہا، باقی یہ سوال کہ علم کے جس قدر ضروری کو عمل کی شکل وہ دیتے تھے اس کی کیا صورت تھی اور اس کا کیا طریقہ تھا، یہی دراصل اصل سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان عموماً اور علماء خصوصاً اس پر غور کریں۔

حواشی

(1) مجعد جعد سے ماخوذ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے شوقین حضرات کاکل بھی رکھتے تھے اور کاکلوں کو چوٹی بنا کر باہم گوندھ کر اِدھر اُدھر لٹکا دیتے تھے۔ ایک اور عبارت سے جو اسی "سیر الاولیاء" میں ہے' یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوی سادات بجائے ایک ایک چوٹی کے دو دو چوٹیاں اِدھر اُدھر لٹکاتے تھے اور غیر سادات ایک ایک معمم تو ظاہر ہے کہ عمامہ سے ماخوذ ہے یعنی دستار والے۔ یہ اس زمانہ میں علماء کی تعبیر تھی گویا عوام اور خواص میں یہی فرق تھا کہ خواص علماء دین معمم ہوتے تھے اور عام لوگ مجعد۔ "فوائد الفواد" کی ایک عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں سلطان المشائخ بھی کبھی مجعد رہتے تھے۔ (فوائد الفواد۔ صفحہ 28)

(2) خاکسار نے ایک کتاب بھی ادب قرآنی کے نام سے ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھ دی ہے جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

(3) میرے گاؤں گیلانی میں ہندوؤں کا ایک ابتدائی پاٹ شالہ ہے۔ اس پاٹ شالہ کے بوڑھے گروجی کا عام قاعدہ ہے کہ دو سال میں بیس تک کے پہاڑے سے آگے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتے۔ مدت ہوئی ان سے ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ گروجی آپ دو سال میں بیس تک کا پہاڑہ سکھاتے ہیں؟ بولے کہ بابو اتنے پہاڑے تو میں چار مہینوں میں بھی سکھا سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر میری تنخواہ کا کیا سامان ہوگا؟

(4) واللہ اعلم پنجاب میں یہ رواج کب سے جاری ہوا تھا کہ شرح جامی اور اس کے حواشی تک کی تعلیم میں پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال صرف ہوتے تھے لیکن بحمد اللہ اب زمانہ بدل گیا' خود پنجاب کے ایک عالم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مرحوم نے "کتاب الصرف و کتاب النحو" لکھ کر صرف و نحو کے قصہ کو چند مہینوں تک محدود کر دیا ہے۔

(5) یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دار العلوم دیوبند اور اس کے متعلقہ مدارس میں حدیث کا جو دورہ ہوتا ہے' اس کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے اس فتنہ حادثہ کے مقابلے میں جو غیر مقلدیت کی شکل میں نمایاں ہوا' بطور اختیاری مضمون کے حدیث کے دورے کا افتتاح کیا۔ ہندوستان کے مختلف مدارس سے فارغ ہونے کے بعد جن لوگوں کو تکمیل حدیث کا شوق ہوتا تھا' وہ حضرت کے پاس جاتے تھے۔ اصل مقصود تو وہی دماغ کی اصلاح کے بعد دل کی اصلاح ہوتی تھی لیکن ضرورت وقت کو دیکھ کے حضرت نے حنفی مذہب کی تائید کے طریقہ کا اضافہ درس میں فرما دیا۔ وہی دورہ گنگوہ والا دیوبند میں جاری ہے۔ بجز ایک ترمذی کے عموماً نو مہینے میں صحاح ستہ بطور سرو کے ختم کرا دی جاتی ہے۔

علم کی تعمیلی شکل خواجگانِ چشت میں

دوسرے طرق وسلاسل کے مقابلہ میں کسی فخر و امتیاز کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارے بزرگوں کا جو طریقہ کار تھا' اس کی مثالیں پیش کرنی ہیں اور ان مثالوں سے تربیت و اصلاح کے جن اصولی ضوابط کا سراغ ملتا ہے' صرف ان کی طرف اشارہ کرنا' غرض صرف اتنی ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' ان لوگوں کے متعلق جو "قدرے علم" کے عام نصاب سے فارغ ہونے کے بعد ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے' جیسا کہ ہونا چاہیے تھا' طبعاً دو طریقہ کار اختیار کیے جاتے تھے یعنی ایک تو وہی تزکیہ' یا چاہیے تو صاف اور عام تعبیر میں یہ کہیے کہ صفائی کا کام کیا جاتا تھا' ہم سلبی اور منفی طریقہ کار اس کا نام رکھتے ہیں اور دوسری بات "تحلیہ"' یعنی صفائی کے بعد جن صفات کی پرورش ان کے پیش نظر تھی' اس کی عملی راہ پر لوگوں کو لگانا' نفوس کو ان صفات و برکات سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔

تزکیہ اور صفائی

یوں تو تزکیہ کے ذیل میں بیسیوں چیزیں آتی ہیں لیکن خیر وشر کے اس مجموعہ میں جس کا نام "الحیوۃ الدنیا" ہے جس کی کوئی بھلائی برائی سے جدا ہو کر نہیں پائی جاتی اور کوئی برائی ایسی نہیں ہے۔ جس میں بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نہ نکل آتا ہو حتیٰ کہ بقول عارفِ شیراز

چراغ مصطفوی با شرار بولہبی ست

اسی چمن کا ایک بہترین پھول علم کا بھی پھول ہے لیکن قرآن کے حوالہ سے گزر چکا کہ اس پھول میں بھی

کلا ان الانسان لیطغیٰ

"ہوشیار! کہ انسان ضرور سرکش ہو جاتا ہے۔"

کا کانٹا بھی چھپا ہوا ہے۔ سلطان المشائخ ایک دن فرمانے لگے کہ آدمی

''چوں علم بیاموز داو راشر فے حاصل آید'' (صفحہ 24۔فوائد)

اور اگر یہ علم کہیں دین کا علم ہوا اور دینی علم کے مطابق روزے‘ نماز میں بھی کوئی لگ گیا تو پھر کیا کہتے ہیں۔''چوں طاعت کند کار او بہتر رود'' سودا خوب چل نکلتا ہے۔ انگلیاں اٹھنے کے لیے‘ آنکھیں جھانکنے کے لیے ہر طرف تیار ہو جاتی ہیں۔ حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ علم اور عمل کی اس مجموعی کیفیت سے ''پندار'' کا فاسد مواد عالم کے دماغ میں پکنے لگتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے کہ بساطِ علم کے ان تازہ نوواردوں پر کوئی پختہ کار ''پیر باید تا ہر دو را اشکند یعنی علم وعمل را از نظر او فرو آرد۔''

''عملی پندار'' کی ریاح جب دماغوں میں بھر جاتی ہے اور ان مسکینوں کی گردنیں ان ہی زہریلی گیسوں سے اکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت اس کھنچی ہوئی گردن کو نرمانے کے لیے نشتر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب سے بڑا سرطانی پھوڑا جس کا نام ''خود پسندی'' اور ''عجب'' ہے‘ اس کی ٹیس سے انسانی روح کو نجات مل جاتی ہے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں ''تا بہ عجب (خود پسندی) مبتلا نہ شود۔''

بہر حال یہ پہلی سلبی کارروائی ہوتی ہے جو اس راہ میں اختیار کی جاتی ہے۔ سلطان المشائخ کا علاج شیخ کبیر نے اس سلسلہ میں کس طریقہ سے کیا تھا‘ بعد کو اس کا ذکر خود کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ''مولانا بحاث'' اور ''محفل شکن'' کے خطابات لے کر مولانا نظام الدین کے نام سے سلطان جی شیخ کبیر‘ شکر گنج'' کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پہلا کام شیخ نے یہی کیا کہ باوجود سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے حکم دیا کہ نظام! تمہیں کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی پڑیں گی۔ اسی بنیاد پر ''عوارف'' کا سبق شروع ہوا۔ غالباً چند ہی اسباق ہوئے ہوں گے کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جو نسخہ ''عوارف'' کا شیخ کبیر کے ہاتھ میں تھا ''ہمانا کہ نسخہ بود بخط باریک نوشتہ باسقیم گونہ'' یعنی اس کا نسخہ کا خط باریک تھا یا اس کی لکھائی گونہ اچھی نہ تھی۔ ہوا یہ کہ ''شیخ را در میاں ان اندک مکثے بود'' یعنی شیخ کبیر کچھ اس مقام پر اٹکنے لگے‘ بیچارے بوڑھے آدمی‘ وہ تو اس عبارت میں غور کر رہے تھے۔ اُدھر جوان عالم کے جوان علم کے گرم خون میں جوش آیا‘ سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ

''من نسخہ دیگر بخدمت شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمتہ دیدہ بودم۔''

اسی ''دیدہ بودم'' کے ذریعہ سے اپنی وسعت نظری کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ کبیر کے سامنے بایں الفاظ کیا کہ ''شیخ نجیب الدین نسخہ صحیح دارد'' بس ''دیدہ بودم'' کے علم کا اِدھر اظہار ہوا اور دوسری طرف سے ایک آواز جس میں ہیبت ملی ہوئی تھی‘ سلطان المشائخ کے کان سے ٹکرانے لگی ''درویش را قوت صحیح نسخہ سقیم نیست'' ایک دفعہ نہیں بار بار شیخ کبیر اس فقرہ کو دہراتے جاتے تھے‘ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا کہ یہ اشارہ کس کی طرف ہے لیکن چند بار مکرر سہ کرر یہی الفاظ شیخ کبیر کی زبان مبارک سے نکلتے رہے تو جماعت کے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحٰق نے سلطان جی کو اشارہ کیا کہ خطاب تمہاری طرف ہے۔ سلطان جی کے ہوش اڑ گئے۔ فرماتے ہیں کہ ''سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم'' شیخ کبیر کے قدموں پر ''محفل شکن'' ''مولانا بحاث'' کا سر پڑا ہوا تھا۔ کہتے جاتے تھے۔

''نعوذ باللہ نا کہ مرا مقصود ازیں سخن کنایتے بہ مخدوم بودہ باشد۔''

وہ یہ سمجھے کہ شیخ کبیر نے شاید میرے اس بیان سے کہ شیخ نجیب الدین کا نسخہ صحیح ہے۔ اپنی اہانت محسوس کی‘ اسی کی معافی چاہ

رہے تھے۔ حالانکہ واقعہ تو کچھ اور تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں عرض کر رہا تھا کہ

''من نسخہ دیدہ بودم ازاں حکایت کردم مرا اصلاً چیزے دیگر در خاطر نہ بود۔''

اور اسی ''دیدہ بودم'' کے نیچے تو وہ بات چھپی ہوئی تھی جس پر یہ قیامت برپا ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ''من معذرت می کردم اثر بے رضائی ہمچناں در شیخ می دیدم'' جرم ناقابل عفو قرار پایا۔ سب کچھ تج کر جو کسی کے آستانہ پر آیا تھا' صرف ایک دیدہ بودم کے دعوے نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا۔ صادق اور کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آ گیا' دنیا دیکھ رہی تھی۔ اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ کیا ''مولانا بحاث'' اور ''محفل شکن'' ہی کے لقب کو لے کر دنیا سے واپس چلے جائیں گے جیسے لاکھوں ہی بحاث اور محفل شکن آئے اور چلے گئے یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے' اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔ اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے ورنہ سچ یہی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

''چند کلیاں'' جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں' وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے' ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور میں نے غلطی ہی کیا کی ہے۔ ایک اچھے نسخے کا علم تھا' اس کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر اس پر اتنی برہمی کے کیا معنیٰ؟ یہی شوشہ اگر سامنے آ جاتا تو ہی لمبی لکیر بن سکتا تھا' اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا' مزاج میں تندی اور غصہ ہے۔ العیاذ باللہ۔ آگے بڑھ کر تو اسی کو ''نفسانیت'' کا ثبوت بھی قرار دیا جا سکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لے کر سلطان جی چاہتے تو ''اسوۂ حسنہ نبویہ'' کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنا علاج کرانے کے لیے آئے تھے' شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا۔ اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ ''معالج''' ''طبیب'' ہے' اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔ بہر حال فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی ''بے رضائی'' کو ایک حال میں دیکھ کر مایوس مجلس سے اٹھا۔ ''برخاستم ندانستم کہ چہ کنم''' ''نہ دانستم چہ کنم'' یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے آج اجودھن میں نکل رہے ہیں' جو کل تک ہر محفل میں ہر سوال کا جواب دے کر محفل کا رنگ پھاڑ رہا تھا' آج اس کی قابل رحم نادانی اور ''چہ کنم'' کا یہ حال ہے' فرماتے ہیں۔

''مبادا ہیچ کس را آں چناں روز و آں چناں غم کہ مرا آں روز بود۔''

دماغ میں جواب پیدا ہونے کی جگہ دل میں غم کی لہریں اٹھنے لگیں اور کیسی لہریں جس کی کسک آخر وقت تک نہیں بھولے تھے' دعا کرتے تھے کہ خدا کسی پر ایسا سخت دن نہ لائے اور ایسے غم میں کسی کو مبتلا نہ کرے' دل کے اس درد اور سینہ کی اس سوزش کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جو ہمیشہ غم دیدوں کا آخری علاج ہے' خود ہی فرماتے ہیں ''گریہ در من افتاد'' اور یہی ''گریہ'' اصل مقصود تھا جس سے وہ سب کچھ دھل جاتا ہے جسے اپنے ساتھ وہ دلی سے دلی کے مدرسوں سے لائے تھے' روتے تھے' روتے جاتے تھے۔ کوئی چپ کرانے والا بھی نہیں' جب تک رونا ممکن تھا' روتے رہے۔ آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اب کیا کروں۔ فرماتے ہیں کہ ''مضطرب وحیراں بیروں آمدم'' سننے والے سن رہے ہیں۔ ''بیروں آمدم'' یہ ''بیرون

آدم" کس ارادے اور کس قصد سے ہوا ہے۔ "شیخ نجیب الدین نسخہ صحیح دارد" صرف علم کے اس دعوے نے آج رونے والے کو حجرے سے باہر نکالا ہے۔ اس لیے نکالا ہے کہ "تا برسیدم برسر چاہ" کیا پانی پینے کے لیے ہاتھ منہ دھونے کے لیے' غم کی گرمی میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے "برسر چاہ" رسائی ہوئی ہے۔ انہی سے سنیے جو اس کنویں کے کنارے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ "خواستم کہ خود را دراں چاہ اندازم" معالج نے علاج سے انکار کیا ہے۔ اس مریض سے پوچھیے جو طبیب سے آخری جواب لے کر واپس ہوا ہو۔ نور اللہ ضریح السعدی۔ حیث قال

ماجرائے دل دیوانہ بگفتم بہ طبیب — کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم

گفت ازیں نوع حکایت کہ تو گفتی سعدی — درد عشق ست ندائم کہ چہ درماں سازم

پھر کچھ خیال آیا' کیا خیال آیا۔ "تا ایں بدنامی بہ کہ باز گردد" کنویں میں فقیر کو کس نے دھکیل کر مار ڈالا اس تہمت میں کس کس کی گرفتاری ہو۔ فرماتے ہیں کہ اسی خیال نے "چاہ اندازم" کے خیال سے باز رکھا۔ عقل و ہوش کا تکلفی سرمایہ اگرچہ گم ہو چکا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ تحت الشعور "خودکشی" کے جرم کا خیال بھی مانع آ رہا ہو' بہرحال کنویں کی منڈیر سے نیچے اتر آئے اور

"دریں محنت وحیرت سراسیمہ دار جانب صحرا بیروں رفتم۔"

اجودھن کی فضاؤں میں کسی کے نالہائے زار اب تک گونج رہے ہوں گے' فرماتے ہیں

"جانب صحرا بیروں رفتم با خود گریہ وزاری کردم۔"

خدا ہی جانتا ہے "گریہ وزاری" کا یہ طوفان کب تک امنڈتا رہا۔ ہفتہ گزرا یا مہینہ' شیخ کبیر کے ایک صاحبزادے نے شہاب الدین لقب سلطان جی اور ان میں میل ملاپ تھا' موقع مناسب پا کر انہوں نے سلطان جی کا حال شیخ کبیر کے سامنے عرض کیا۔ جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا۔ حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "بیادم سر در قدم مبارک آوردم" جرم کی معافی ہو گئی۔ معافی کے دوسرے دن پھر طلبی ہوئی اور ارشاد ہوا' جو راز تھا' اس سے پردہ اٹھایا گیا۔ شیخ کبیر نے مولانا نظام الدین بحاث ومحفل شکن کو جواب صرف بابا فرید کے "نظام" بن چکے تھے' مخاطب کر کے فرمانے لگے "ایں ہمہ برائے کمال حال تو می کردم" مرید سے پیر کا کیا تعلق ہوتا ہے' سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اسی دن یہ راز بھی واضح ہوا۔ شیخ کبیر نے فرمایا "پیر مشاطہ مرید باشد" مرید کی ساری ژولیدگیوں کو وہی سلجھاتا ہے' میل کچیل کو دھو دھا کر صاف کرتا ہے' غازہ ملتا ہے' بال سنوارتا ہے اور یوں "یحببکم اللہ"[1] کے مقام پر پہنچا کر اسے ملاء اعلیٰ کا اور ملاء اعلیٰ کا اثر ملاء ادنیٰ پر ملاء ادنیٰ سے محبوبیت کی وہی کیفیت قلوب انسانی میں پھیل جاتی ہے۔[2] سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے بعد "مرا خلعت فرمود' بکسوت خاص مرا مشرف گردانید۔" (فوائد الفواد۔ صفحہ 27)

پندار وخود پسندی کا فاسد مواد اگر اتنے کا' گر نشتر کے بعد بھی نہ نکلتا تو کب نکلتا' اس کے بعد سلطان المشائخ کا جو حال ہو گیا تھا' اس کی کیفیت بھی خود ہی بیان کرتے ہیں۔ شیخ کبیر نے سلطان جی کو ایک دعا سکھائی' پوچھا کہ اب سناؤ۔ سنانے لگے' ایک لفظ کے اعراب میں شیخ کبیر نے اصلاح فرمائی' فرماتے ہیں کہ گو جو اعراب میں نے پڑھا تھا "ہم معنی داشت" لیکن یہ تو ان کا نحوی علم تھا' اس سے دستبردار ہو چکے تھے۔ پس "ہمچناں کہ شیخ فرمود بخواندم" شیخ نے دوبارہ سنانے

کے لیے حکم دیا' دعا سنائی گئی' "وآں شیخ فرمودہ بود ہمچناں بخواندم۔"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں' میرے اس طریقہ عمل کو مولانا بدرالدین اسحٰق دیکھ رہے تھے۔ جب شیخ کبیر کے سامنے سے اٹھ کر ان کے پاس آیا' کہنے لگے "نیکو کردی کہ ایں اعراب ہمچناں خواندی کہ شیخ فرمودہ بود" سلطان المشائخ نے جواب میں کہا۔

"اگر سیبویہ کہ واضع ایں علم (نحو) ست وآں دیگراں کہ بانی ایں قواعد بودند بیانید مرا گویند کہ اعراب ہمچناں نیست کہ می خواندی من ہمچناں بخوانم کہ شیخ فرمود۔"

یہ تھا صفائی کا پہلا مقام جس پر پہنچنے کے بعد

کفرست دریں مذہب خود بینی و خودرائی فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست

یہ تو پندارِ علم کی شکست کی تدبیر تھی جو اس زمانہ میں اپنے مریدوں کے ساتھ پیروں کا وہ طبقہ اختیار کرتا تھا جو واقعی ان کی مشاطہ گری کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا تھا' لیکن علمی پندار سے بھی زیادہ ایک اور دوسرا عارضہ انسانی فطرت کو چمٹا ہوا ہے' عارضہ بھی ہے اور اسی پر ہماری ساری صحت مندیوں' ترقیوں اور بلندیوں کا دارومدار بھی۔ آگے نفس کشی سے متعلق بحث ہے۔

انسانیت کا "معکوس فلسفہ" جو دنیا پر چھایا ہوا ہے' اب تو اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔ بہر حال سمجھ میں آئے یا نہ آئے' مجھے تو ہندوستان کے ایک خاص عہد کی تاریخ بیان کرنی ہے جو واقعات گذرے ہیں' ان کا اظہار مقصود ہے۔ سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔ بات یہ ہے کہ مذہب کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں بجائے اپنی مرضی اور اپنے دماغی مشوروں کے حق تعالیٰ کی اس مرضی کی پابندی کی جائے جس کا اظہار پیغمبروں کے ذریعہ سے فرماتا رہا ہے اور جس کی کامل ترین محفوظ ترین آخری شکل کا نام قرآن اور اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ خدا کی مرضی جب اپنی مرضی سے ٹکرانے لگے' اس وقت خدا ہی مرضی کی رہنمائی قبول کر کے اسی کے تحت اپنے آپ کو ڈال دینا' اسی کی مشق کا اصطلاحی نام ہمارے بزرگوں میں یہ تھا کہ نفس کی خلاف ورزی کی مشق بہم پہنچانی چاہیے۔ قرآن کی آیت

ونهى النفس عن الهوىٰ (القرآن الحکیم) "اور روکا نفس کو "الہویٰ" سے۔"

سے ان کی یہ اصطلاح ماخوذ تھی' خدا کی مرضیات سے نفس کی جو خواہشیں متصادم ہوتی ہیں' ان ہی کا قرآنی نام "الہویٰ" ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نفس کی عام خواہشوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو جائے گا تو پھر جو خواہشیں مرضی حق کے مطابق نہ ہوں گی' ان کو چھوڑ کر بآسانی اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق بنانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

آزادی اور حریت کے اس دور میں جس میں نفسانی خواہشوں کی تعبیر' رائے کی آزادی' فکر کی آزادی اور خدا جانے کون کون سی آزادیوں کی خوبصورت الفاظ سے کر کے انسانیت کی بلندی کا معیار ہی اب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جو شخص جس حد تک اپنی نفسانی خواہشوں کا پابند ہے' اسی حد تک وہ آزاد ہے۔ حُر ہے اور جو حُر ہے آزاد ہے۔ اسی پر بنی آدم کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی ہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی معکوس اور اوندھی ذہنیت کے زمانہ میں "مخالفت نفس" کا نظریہ

جس حد تک بھی بے معنی ہو کر نہ رہ جائے' کم ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ پرانے ادبیات کی پیروی میں کم و بیش اب بھی اس لفظ کا استعمال دنیا میں باقی ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے' اس مشق کا کیا مقصد ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ کسی کے سامنے ان سوالات کے وہی جواب جو واقعی ان کے جواب تھے' اب باقی ہوں گے۔ کچھ دھندلا دھندلا سا اس قسم کا تصور عالم لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ صوفیہ کے نقطۂ نظر سے گویا آدمی میں ثانوی قسم کا کوئی زندہ حیوانی وجود اور بھی ہے جس کی دشمنی اور عداوت صوفیوں کے نزدیک ضروری ہے۔ حالانکہ واقعہ جو کچھ ہے' وہ میں عرض کر چکا۔ حق تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق جو زندگی گزارنا چاہتا ہے' کیا اس مشق سے بے نیاز رہ سکتا ہے؟

بہر حال اب کسی کی سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن ایک زمانہ تھا جس میں کامیابی کا بڑا راز اسی مشق میں مستور سمجھا جاتا تھا۔ چراغ دہلیؒ نے اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

''نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بمدد ہوائے شیطانی در ذات ایں کس بیخ می گیرد و محکم می شود اگر آدمی بتدریج و سکونت بزور عبادت و تقویٰ و بقوت محبت و عشق ہر روز آں درخت را بہ جنباند ہر آئینہ بیخ اوست شود و قابل قلع گردد'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 242)

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے تو پھر آدمی کو قوانین الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

فان الجنة الماوی (القرآن الحکیم)

''جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔''

کا نظارہ اسی ''نهی النفس عن الهویٰ'' کی تعمیل کے بعد ہی سامنے آ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں خواہ جو بھی فیصلہ صادر کیا جائے اور آزادی' حریت جس چیز کا بھی نام رکھا جائے' لیکن ہمارے بزرگوں کے نزدیک تو

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد　　　　که بستگان کمند تو رستگار اند

حقیقی آزادی کا صحیح ترجمہ یہی تھا' اس آزادی کی تلاش میں سلطان المشائخ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ شیخ اس سلسلہ میں ان سے کیا کیا کراتے تھے' اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اجزاء کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ سلطان جی جب اجودھن میں تھے تو ان کا ایک رفیق درس بھی اس عرصہ میں اجودھن پہنچا۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر جس میں بظاہر وہ مبتلا نظر آتے تھے' اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ

''نظام الدین ترا چہ پیش آمد۔''

میں نے لکھا تھا کہ شیخ کبیر نے اسی زمانہ میں حضرت نظام الاولیاء کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہنا کہ

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو　　　　ترا سعادت و بادا مرا نگونساری

کیا شبہ ہے کہ سننے کی حد تک اور کہنے کی حد تک شعر بڑا لذیذ ہے لیکن جب اسی پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو

کتنے ہیں جو سعادت کو چھوڑ کر نگونساری اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج نے صرف شعر سنانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسی کے بعد آپ نے سلطان جی کو حکم دیا کہ ''در مطبخ بر ود و بگو تا خوانے پر بالوان نعم آراستہ بیارند۔''

یہ اجودھن کا وہ وقت تھا کہ جہاں ایک مدت تک سلطان المشائخ کی روایت کے مطابق کہ شیخ کبیر نے جب شروع شروع

''در اجودھن ساکن گشت بنان درویشانہ و چیز ہائے کہ دراں دیار خیز و چوں پیلو و مانند آں قانع گشت۔''

لیکن اب وہ وقت باقی نہ تھا بلکہ ''از آمد و شد خلق حد نہ بود'' آنے والوں میں غیاث الدین (3) بلبن جیسے سلاطین بھی تھے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد اس اجودھن کا کیا حال ہوگا۔

نظام الاولیاء کا بیان ہے کہ

''درخانہ بہ قیاس نیم شب کم و بیش نہ بستندے یعنی پیوستہ در بانہ بودے وطعام و نعمت موجود از کرم خدائے آئندہ وروندہ را ازاں نصیب شدے ہیچ بخدمت ایشاں نیامدے کہ ارراچیزے نصیب نہ گردے۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 65)

اور سچ تو یہ ہے کہ ''تقویٰ'' کی تاریخ میں

یجعل له مخرجاً ویرزقه من حیث لایحتسب

''بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے کشائش کی راہ اور روزی پہنچاتا ہے ایسی جگہ سے جہاں سے شان گمان بھی نہ ہو''

کی قرآنی آیت کی ان تفسیروں کو دنیا نے کب نہیں دیکھا ہے۔ خصوصاً اسلام تو اراک (پیلو) ہی کے پھل کھانے والوں سے شروع ہوا اور ''الوان نعم'' پر ختم ہوا۔

بہر حال میں کیا کہنے لگا۔ قصہ نظام الاولیاء کا سنا رہا تھا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے ان کو مطبخ بھیجا کہ ایک ''مکلف خوان'' مرتب کر کے میرے پاس لایا جائے۔ خوان آ گیا۔ کس لیے آیا' سلطان المشائخ ہی سے سنیے۔ فرماتے ہیں کہ مجھ ہی کو خطاب کر کے شیخ کبیر کا ارشاد ہو رہا تھا۔

''نظام! ایں خوان طعام را بر سر کن و در مقالے کہ آں یار فرو ہ آمدہ است ببر۔''

ابھی جس ہم درس نے مولانا نظام الدین کو دتی میں محفل شکنی میں مصروف پایا تھا اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے چند گھنٹے پہلے اسی اجودھن میں اس حسنِ ظن کا اظہار کیا تھا کہ ''اگر در شہر تعلیم می کردی' مجتہد زمانہ می شدی'' اسی بیچارے ''مجتہد زمانہ'' کا یہ انجام ہے کہ اس کے سر پر خوانچہ رکھا جاتا ہے اور دورویہ بازار کے بیچ سے بھری ہوئی مخلوق کے سامنے سے اسی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس طعنہ دینے والے ساتھی کے پاس اس خوان کو لے جاؤ' خودداری کے گھاؤ رکھنے والے اس ٹھیس کو کیا برداشت کر سکتے تھے؟ آزاد فکر' آزاد رائے کیا اس بوجھ کو اٹھا سکتی تھی۔ ''ترا سعادت بادا

مرانگونساری'' کی لذت صرف کانوں تک نہیں بلکہ جب روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو پھر سب کچھ اٹھالیا جاتا ہے۔

''مجتہد زمانہ'' سمجھنے والوں کے سامنے وہی آدمی چلا جاتا ہے' سر پر خوانچہ لیے چلا جاتا ہے' دیکھو مولانا نظام الدین اسی حال میں ''اجودھن'' کے بازار سے گزرر ہے ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

''من بحکم فرمان خواجہ آں خوان رابر سر گرفتم درواں شدم ودر سرائے کہ آں یار فرود آمدہ بودم آوردم۔''

''مجتہد زمانہ'' ہونے کی صلاحیت کا حسن ظن رکھنے والا سلطان جی سے کس حد تک متاثر تھا' اس کا اندازہ آپ اسی سے کیجیے کہ خود حضرت ہی کا بیان ہے۔

''چوں نظر آں یار برمن افتاد گریہ کناں دوید۔''

جو دنی میں اتنا بلند تھا کہ دنیا اس کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی' آج وہ ایک معمولی خدمتگاروں کی مانند برسر بازار اپنے سر پر خوانچہ لیے چلا آرہا ہے۔ یہ حال تھا ہی اتنا رقت انگیز کہ وہ چیخ اٹھا۔ روتے ہوئے دوڑا ''وخوان از سر من فرود آوردو پرسیدن گرفت کہ ایں چہ حال ست'' سلطان جی' اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ ع ''کاں تجمل کہ تو دیدی ہمہ برباد افتاد۔''

جو دل چاہے' دماغ چاہے' وہ نہ چاہا جائے۔ اس کی مشق گاہ میں یہ سب کچھ کیا جاسکتا ہے' جھوٹی عزت اور جھوٹے ناموس کا علاج کرنے والے یہی علاج کرتے ہیں۔ سننے والا اور دیکھنے والا بھی آدمی تھا' انسان کسی حال میں بھی ہو کسی دلدل میں پھنسا ہو لیکن حقیقت شناسی کے فطری جواہر پھر بھی انہی کیچڑوں میں کسی سخت ضرب سے چمک اٹھتے ہیں۔ اب وہ بھی روشنی میں تھا' اعتراف کرنے لگا کہ

''ایں چنیں شیخ معظمے داری کہ نفس ترا بدیں حد ریاضت دادہ ست۔''

''نفس ترا بدیں حد ریاضت دادہ ست'' یہ تھی سارے قصہ کی روح جسے افسوس اس زمانہ میں وہ بھی پالیتے تھے جو کچھ پائے ہوئے نہ تھے۔ اس نے بھی شیخ کبیر کی قدم بوسی کی تمنا ظاہر کی۔ سلطان جی نے کھانا کھانے پر اصرار کیا' کھانا کھا لیا گیا' اب خوانچہ خالی ہو چکا تھا' سلطان جی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

''دانشمند (وہی ان کا عالم دوست) خدمتگار خود را گفت کہ ایں خواں برسر کن برابر ما بیا۔''

وہ خدمتگار سے یہ کہہ رہا تھا لیکن خدمت لینے والے نے یہ خدمت جس کے سپرد کی تھی۔

''خیر چنانکہ اں خوان آوردہ ام ہمچناں ببرم وبرسانم۔''

کہتے ہوئے جس خوان کو ان کے شیخ نے سر پر چڑھایا تھا' پھر سر پر اٹھالیا' دانش مند مجبور تھا' کیا کرتا۔ اسی حال میں ''آں دانشمند برابر سلطان المشائخ بخدمت شیخ شیوخ العالم آمد۔''

اس قصہ کے براہ راست راوی حضرت چراغ دہلوی نے یہ فرما کر فقرہ کو ان الفاظ پر ختم کیا ''واز سر رعونت رابر خاک درگاہ آں بادشاہ اہل محبت نہاد'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 240)

میر خورد نے چراغ دہلوی کی زبان مبارک سے اس قصہ کو سنکر اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب ''انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں طریقہ چشت کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

مخالفة النفس راس العبادة موافقة الناس اساس الكفر

''النفس'' کی مخالفت (چشتیوں) کے یہاں عبادت کی جان ہے اور عام راہ ورسم کی پابندیوں میں پھنسے رہنا یہ ان کے یہاں کفر کی بنیاد ہے۔''

اور یہ کہ ''النفس هو الصنم الاکبر'' (چشتی صوفی) نفس کو ''صنم اکبر'' کہتے ہیں۔

چشتی مجاہدات کی یہی بنیادی اینٹ ہے' ان کا ''طریقہ خاص'' جیسا کہ شاہ صاحب نے اسی کے بعد نقل کیا ہے' اس دستور پر مبنی تھا۔

''گر حیاتِ خوب'' خواہی نفس را گردن بزن — زانکہ از نفست قوی تر ہیچ دشمن وار نیست

اور ''حیات خوب ستھری زندگی'' کے حاصل کرنے کی یہ سلبی شرط تھی یعنی اپنی مرضی' اپنی خوشی' اپنی خواہش سے۔ جس وقت بھی دستبردار ہونے کا حکم دیا جائے' آدمی اسی وقت بغیر کسی کشمکش لیت ولعل کے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ملکہ کو پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گو ''طریقہ چشت'' میں مجاہدہ کے اس پہلو پر بظاہر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور راہ کی پہلی منزل یہی ٹھہرائی گئی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اور بھی جتنے دوسرے طرق و وسائل ہیں' اس کی مشق تو سب ہی میں کرائی جاتی ہے حتیٰ کہ اس حد تک تو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک نفس کی مخالفت کی مشق بہم نہیں پہنچائی جائے گی غیب کی راہ آدمی پر نہیں کھلتی۔ جوگیوں سے یوگیوں سے راہبوں سے۔ جس سے بھی آپ پوچھیں گے' پہلی بات وہ آپ کے سامنے یہی پیش کرے گا اور وہ دل ہلا دینے والے ریاضات ہائلہ جن کا انتساب مختلف مذاہب کے درویشوں اور فقیروں کی طرف سے کیا جاتا ہے' دریافت سے معلوم ہوگا کہ سب کی تہ میں یہی بات چھپی ہوئی ہے' گو جس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (4) غلو پسند انسان جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اپنی ''نشان زدہ'' حدود پر ٹھہرا نہ رہا اور نفس کی مخالفت میں بڑھا تو اتنا بڑھا کہ جس مقصد کے لیے یہ مشق تھی' خود اس مقصد کی مخالفت کی بھی پروانہ کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کی مخالفت کے مشق کی غرض جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہی تھی کہ حق کی مرضیات کی تعمیل آدمی پر آسان ہو جائے لیکن دیوانوں نے مخالفت نفس ہی کو مقصد بنا لیا اور اس حد تک اب اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے کہ خدا کی مرضی کی بھی اس سلسلہ میں اگر مخالفت ہو رہی ہے تو اس سے بھی وہ بے پروا ہو گئے۔

خصوصاً ہمارے ملک ہندوستان نے تو ''مخالفت نفس'' کے مسئلہ میں وہ وہ عجیب تماشے تاریخ میں پیش کیے ہیں کہ شاید دنیا اس کی نظیر کے پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس ملک کے ہندو درویشوں ہی کا ایک فرقہ وام مارگی فرقہ تھا جو تنہائی میں عورتوں اور مردوں کے مخلوط مجمع میں شراب پی پی کر اس کا امتحان لیتا تھا کہ عورتوں کے متعلق مردوں کو اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں سارا برِ اعظم ہند ایسی خانقاہوں اور آشرموں سے بھرا ہوا تھا جن میں جوان مرد اور جوان عورتیں عریاں ہو کر نفس کشی کی مشق کرتی تھیں اور بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی تھی۔

اگھوری پنتھ کے فرقے بھی ''مخالفت نفس'' ہی کے ایک غلیظ نظریہ کے ساتھ اس ملک میں پیدا ہوئے اور اپنے سارے گندے کاموں کی تعبیر ''نفس کشی'' سے کر کے مدعی تھے کہ ان کی آتما (روح) اس طریقہ سے مہا آتما (روح اعظم) کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی جی کا تو ''ستیارتھ پرکاش'' میں یہ بیان بھی ہے کہ اس ملک میں نفس دشمن فرقوں میں ایک فرقہ ''یا سمپر دائے'' ان لوگوں کا بھی تھا جو اپنے مسلک کی تعبیر ''مانگ ودیا'' سے کرتے تھے۔ پنڈت جی ہی نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں مخالفت نفس کا سب سے اعلیٰ مقام یہ تھا کہ آدمی اپنی ماں سے بھی بدکاری کر گزرے کہ یہ سب سے بڑی مخالفت ہے نفس کی جس پر وہ کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا۔ گویا جب یہ بھی کر گزرا تو اب اس راہ کی کوئی منزل باقی نہ رہی اور یہی ہوتا ہے ہمیشہ انجام ان لوگوں کا جو خدا کی باتوں میں اپنے دماغی وسوسوں کو شریک کر کے اسی کو اپنا مذہب ٹھہرا لیتے ہیں۔ ہا! کتنا پاکیزہ اصول تھا لیکن نفس کے بندوں نے نفس ہی کی موافقت میں مخالفت نفس کے نام سے کن تباہیوں اور بربادیوں کا اسے ذریعہ بنا دیا۔

بہرحال یہ انجام تو ان کا تھا جنہوں نے مخالفت نفس کے طرز عمل کو حق تعالیٰ کی مرضیات کی موافقت کا ذریعہ نہیں بلکہ خود اسی کو ایک اہم مقصد بنا لیا لیکن ظاہر ہے کہ اسلام میں مخالفت نفس کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس مخالفت کو رضائے حق کی موافقت کا ذریعہ بنایا جائے' مخالفت نفس کے سلبی اور منفی مجاہدہ کے بعد قدرتاً یہ سوال ہوتا ہے کہ اس مشق کی قیمت حاصل کرنے کی صحیح راہ کیا ہے؟ زندگی کو مرضیات حق پر آسانی منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا جب یہی اس مجاہدہ کی اصل غرض تھی تو اب یہی تلاش کرنے کی چیز تھی کہ ''حق کی مرضیات'' کے ملنے کی ایسی راہ کون سی ہے جس میں خالق کے سوا کسی مخلوق کے دماغی مشوروں کے کانٹوں سے الجھ جانے کا قطعاً اندیشہ نہ ہو کیونکہ اگر خالق کی مرضی کے ساتھ ساتھ مخلوق کی مرضی پر بھی ہمیں چلنا ہے تو پھر مخلوقات میں بجائے دوسروں کے خود اپنی مرضی ہی کی شرکت کے ساتھ خدا کی مرضی کی اطاعت ہم کیوں نہ کریں۔

دنیا کی جن قوموں کے پاس ''خدا کی مرضی'' جو پیغمبروں کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھی جب ''خالص خدا کی مرضی'' باقی نہ رہی تو مخالفت نفس کی ساری ورزشوں کے بعد ظاہر ہے کہ اس ورزش سے نفع اٹھانے کی کوئی صورت ہی ان کے پاس باقی نہ رہی' غالباً غیر اقوام وادیان کے پیروؤں میں مخالفت نفس کی بوالعجبیوں کے رواج پذیر ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جس مقصد کے لیے ان کے بزرگ نفس کشی کراتے تھے' جب اس مقصد کا حصول ہی ان کے لیے ناممکن ہو گیا تو انہوں نے بذات خود ''نفس کشی'' ہی کو اپنا بالذات مقصود بنا لیا' چونکہ مخالفت نفس کی انتہائی ہولناک بلکہ مہلک غیر فطری شکلوں میں بعضوں کو ''یکسوئی'' کے مواقع ہاتھ آجاتے ہیں' آخر جس نے کھانا بھی چھوڑ دیا ہو' پینا بھی چھوڑ دیا ہو' پہننا بھی چھوڑ دیا ہو' ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں حرکت ہو تو کیوں ہو۔ انسانی دل ودماغ میں حرکت وجنبش تو ان ہی ضروریات حیات کی فراہمی کے لیے ہوتی ہے اور یہ ایک مذہبی نہیں بلکہ فطری بات ہے۔ انسان کی فطرت کا قانون ہے کہ یکسوئی کے بعد آدمی کی پوشیدہ قوتیں فعالیت کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ ضروریات حیات میں ژولیدہ قلوب ان قوتوں کے آثار سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ ان پوشیدہ قوتوں کے کرشموں کے دکھانے والوں کے معتقد ہو

جاتے ہیں، وہ مسکین یہ سمجھ لیتا ہے کہ لوگوں کا معتقد ہو جانا ہی یہی مذہب کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسی کو ''وصول حق'' قرار دے کر خود بھی فریب میں مبتلا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اندھوں کے مقابلہ میں اگر سو آنکھوں کے پاس بینائی کی قوت پائی جاتی ہے، ایسی بینائی جس سے رنگ روشنی وغیرہ کو وہ دیکھ سکتا ہے، جن کے دیکھنے سے اندھے معذور ہیں تو کیا یہ سو آنکھوں اور بینائی والوں کا یہ حال اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا رسیدہ اللہ کے برگزیدہ ہیں، چونکہ میں سنتا ہوں اس لیے میں ولی ہوں۔ چونکہ میں دیکھتا ہوں اس لیے قطب ہوں۔ اگر دعویٰ اور دلیل کی یہ صورت مضحکہ خیز ہے تو پھر یہ بات کہ میں چونکہ تھاٹ ریڈر ہوں، اس لیے ولی ہوں، مجھے اشراف علی الضمائر ہوتا ہے۔ لوگوں کے قلبی اور دماغی خطرات کا علم ہو جاتا ہے۔ اس لیے برگزیدۂ حق ہوں، میں کچھ پیش گوئیاں کر سکتا ہوں۔ اس لیے رسیدۂ حق ہوں۔ بتایا جائے کہ دعویٰ اور دلیل کی ان صورتوں پر بھی ہنسی کیسے رک سکتی ہے۔ دین کا مقصد تو خدا کی مرضی کو خدا کی خالص مرضی کی شکل میں پانا ہے کہ شخصی ہستی ہو یا کائناتی ہستی دونوں ہی معمہ کا حل اس مرضی کی یافت کے بغیر ناممکن ہے، عقل اس معمہ کے حل میں درماندہ ہو چکی ہے۔

لیکن لوگوں نے بجائے اس کے باطنی قوتوں کے بیدار کرنے، احساس وعلم کی بعض چھپی ہوئی طاقتوں کے ابھارنے ہی کا نام دین اور مذہب رکھ لیا، حالانکہ اگر اسی کا نام مذہب ہے تو پھر وہ بیچارا پہلوان جو مٹی اور گرد کو بازوؤں پر مل مل کر اپنے مسل اور عضلات میں مقاومت کی قوتوں کو برسر کار لاتا ہے، ان کو یا جمناسٹک والے یا مداریوں کے تماشہ والوں کو بھی دین اور مذہب کی بلندی کا کوئی حصہ کیوں نہیں عطا کیا جاتا، آخر یہ لوگ بھی تو اپنی پوشیدہ قوتوں ہی کو بیدار کرتے ہیں، ان ہی چھپی ہوئی طاقتوں کو ابھارتے ہیں جن کے امکانات ان کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔

یہ ساری بے تمیزیاں دراصل پیدا ہی اس سے ہوئیں کہ ''حق کی مرضی'' کو ان قوموں نے ''حق کی مرضی'' کی شکل میں باقی نہ رکھا، مقصود کا چہرہ نگاہوں سے چھپ گیا، وہ واپس ہوئے اور وہاں واپس ہوئے جہاں سے خدا ہی جانتا ہے کہ ''مرضی حق'' کی تلاش کی طرف انہیں کب واپسی میسر آئے گی۔ وہ قومی نخوتوں کے شکار ہیں، اپنی قوم اپنے وطن اپنی زبان کے سوا کسی دوسری قوم کسی دوسرے ملک کسی دوسری زبان میں وہ ''خدا کی مرضی'' کو ڈھونڈنا نہیں چاہتے حالانکہ جس ذات گرامی نے (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری دفعہ کامل ترین شکل میں ''خدا کی مرضی'' کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اس نے اپنی دعوت کو، اپنی آواز کو اپنی ہمدردیوں کو کسی قوم کسی ملک کسی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا ہے۔ وہ جہاں کا رسول بن کر آیا ہے۔ عالمین کے لیے رحمت لے کر آیا ہے لیکن قومی نشوں کے متوالے اسے اب تک عرب ہی کا رسول، امیوں ہی کا پیغمبر مسلمانوں ہی کا نبی باور کر رہے ہیں۔

میں پھر دور نکلا چلا جا رہا ہوں، عرض یہ کر رہا تھا کہ ہندوستان کے ''خواجگانِ چشت'' ''مخالفت نفس'' کی ممارست ومشق کے سلبی مجاہدے کے بعد پھر کس اثباتی مجاہدہ میں لوگوں کو مشغول کرتے ہیں؟

ایک سوال ہے اور بڑا بلکہ بڑے ہونے کے ساتھ دلچسپ سوال بھی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں اپنے دعوے کا اعلان کیا ہے کہ اس سلبی مشق کے بعد جس ایجابی مشغلہ میں اپنے وابستوں کو وہ غرق کرتے تھے، دنیا سن کر ضرور جھجکے گی۔ جن

چشتیوں کا کام آج صرف گانا بجانا سمجھا جاتا ہے' یقیناً ان ہی کے متعلق یہ سن کر اچنبھا ضرور ہوگا' جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ یقین خالص کے تحت دینی زندگی کو منظم کرنے کے لیے اس کتاب میں غوطے دیتے تھے جس کے سوا رب العلمین کی طرف منسوب ہونے والی کتابوں میں ریب اور شک سے دنیا کی کوئی کتاب اب پاک نہیں ہے۔ جس ملک میں مذہب کو فلسفہ بنانے یا میتھالوجی بنانے میں آخری زور دکھلایا گیا ہو' میں نے عرض کیا تھا اسی ملک میں اس کے سوا ''چارہ کار'' بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ لوگوں میں ''مرضی حق'' کے اسی لاریبی مظہر اتم ''القرآن الحکیم'' کے ذریعہ سے لازوال یقین کی روشنی پیدا کی جائے اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ ''خواجگانِ چشت'' کے طریقہ میں بھی ذکر و شغل' مراقبہ وغیرہ کے صوفیانہ مشاغل پائے جاتے ہوں' جیسا کہ عام طور پر صوفیا اسلام کے دوسرے طرق و سلاسل میں پائے جاتے ہیں یا نہ پائے جاتے ہوں۔

لیکن جن بزرگوں کو سرزمین ہند میں ''طریقہ چشتیہ'' کے معمارانِ اول کا مقام حاصل ہے جہاں تک میں نے ان کے حالات کا مطالعہ کیا ہے' اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایجابی مجاہدات کے سلسلہ میں ان کا سارا زور اس ''یقین'' کی پیدائش پر مرکوز تھا جو قرآن سے پیدا ہوتا ہے کہ یقین کا یہی ایک ایسا سرمایہ یا کارگر حربہ ہوسکتا ہے جیسا کہ تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ اس سے فلسفیانہ دین یا قصاصانہ دھرم والوں کا عملی مقابلہ ممکن ہے۔ اس ''لازوال یقین'' سے پیدا ہونے والی عملی زندگی کے سامنے یقین کیجیے کہ نہ وہ زندگی ٹھہر سکتی ہے جو فلسفیانہ نظریات کے زیر اثر منظم ہوئی ہو اور نہ وہ زندگی جس پر صرف مبالغہ آمیز خوارق و عجائب کے افسانوں کا دباؤ ہو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ فلسفہ ہو یا افسانوی وسوسہ' ظاہر ہے کہ دونوں کی بنیاد میں صرف شک ہے' ظن ہے' تخمینہ ہے' رجم بالغیب ہے' جو کچھ کہا گیا ہے' بے دیکھے کہا گیا ہے۔ بے جانے کہا گیا ہے۔ دونوں طریقوں سے پیدا ہونے والی مذہبی زندگیوں کی گرفت دکھانے والے خواہ قوت کی جس شکل میں اسے بھی دکھاتے ہوں' لیکن جس کی آخری بنیاد میں یقین نہیں ہے' انسانی فطرت پر اس کی گرفت اتنی سخت ہو ہی نہیں سکتی جو صرف کامل یقین ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ جس ملک میں کام کرنے کی خدمت چشت کے پیشواؤں کے سپرد ہوئی' اس میں تو خوارق اور کرامتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ میں بتا بھی چکا ہوں اور کون نہیں جانتا کہ ''مخالفت نفس'' کی پریکٹس نے عوام نہیں تو اس ملک کے خواص میں وہ ساری خصوصیتیں پیدا کردی ہیں جن سے ان خوارق کا تعلق ہے جو ہر اس شخص سے صادر ہوسکتے ہیں جس نے ''مخالفت نفس'' کی مشق کے ذریعہ سے یکسوئی پر قابو حاصل کیا ہو۔ اس کے لیے تو خدا کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔ آج یورپ میں کتنے اسپریچولزم' مسمریزم' ہپناٹیزم اور خدا جانے کون کون سے ازم والے ہیں جن کی زندگی کو خدا کے عقیدہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ دیکھنے' سننے' سونگھنے' سمجھنے کی احساسی و ادراکی قوتوں کے لیے اگر خدا کا ماننا ضروری نہیں ہے تو پھر اسی قسم کی بعض پوشیدہ ادراکی قوتیں اگر کسی کی برسرکار ہوجائیں تو اس کے لیے خدا کا ماننا کیوں ضروری ہو۔

مگر ظاہر ہے کہ ان سارے تماشوں سے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ آدمی ہوا پر اڑ سکتا ہے۔ پانی پر چل سکتا ہے۔ دلوں کے بھید بتا سکتا ہے' لیکن ''معمہ کائنات'' کے ''یقینی حل'' کی جو قدرتی راہ ہے' دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ''خالق

کائنات کی مرضی'' کی یافت کا جو طبعی طریقہ ہے' اس سے بے تعلق ہونے کے بعد ''یقین'' و ''سکینت'' کی کیفیت سے وہ اسی طرح محروم رہے گا جیسے ایک عام آدمی کا حال ہے اور یہی ایک چیز ہے جو قرآن کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خواجگانِ چشت اور قرآن

''چشتی اور غزلوں کے دیوان'' کی جگہ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں ''چشتی اور قرآن'' کی ترکیب لوگوں کو ایک عجیب اکھڑی اکھڑی سی اَن میل بے جوڑ بات محسوس ہو رہی ہوگی' لیکن میں کیا کروں کہ میرے معلومات یہی ہیں اور آپ کو چاہیے کہ میرے بیان سے پہلے انکاری یا استعجابی فیصلے کے صادر کرنے میں عجلت نہ کریں۔ تمہیدی گفتگو بہت طویل ہوگئی' مختلف اغراض و مقاصد کے تحت مجھے اپنی اس تمہید میں بہت سی باتوں کو طے کرنا تھا' خدا کرے جو میں نے سوچا ہے' وہی اثر قلوب پر مرتب بھی ہو۔ اب سیدھے سادے الفاظ میں اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے متعلقہ معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ خواجگانِ چشت میں پہلی ہستی جو اس ملک میں آئی' وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیریؒ کی ہے۔ اتنا تو مسلم ہے کہ حضرت خواجہ حافظِ قرآن تھے'' ''مناقب العارفین'' میں ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد حضرت خواجہ

''مدتے در سمرقند و بخارا ماند و حفظ قرآن و علوم ظاہری تحصیل کرد'' (صفحہ 250)

مگر اس سلسلہ میں حضرت والا کے متعلق مجھے جس تفصیل سے عرض کرنا ہے' ابھی نامکمل ہونے کی وجہ سے میں ان کے متعلق سر دست اسی پر اکتفا کر کے درخت پر بحث کرنے کے بجائے چاہتا ہوں کہ اس کے پھلوں کا کچھ ذکر کروں۔

آخر جس درخت کے پھلوں کو ہم پہچانتے ہیں' آپ مجھے روک نہیں سکتے' اگر خود اس درخت کے پہچاننے کا بھی دعویٰ کروں' اس لیے خواجہ بزرگؒ کے متعلق تو اپنے بیان کو ملتوی' صرف ملتوی کرتے ہوئے ان کے بعد کی کڑیوں پر آتا ہوں۔

سب جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں پہلا نام مبارک حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ المعروف بقطب صاحبؒ کا آتا ہے۔ حضرت قطب کے ان سلبی مجاہدات کا ذکر مقصود نہیں ہے جو اپنے مرشد کے زیر ہدایت انجام دیئے گئے کیونکہ نمونہ کے لیے میں شیخ کبیر کے طرزِ عمل کو پیش کر چکا ہوں۔ بتانا یہ ہے کہ جب سلب اور نفی کی ساری منزلیں طے ہو چکیں تو ان کا آخری مشغلہ کیا رہ گیا تھا؟ سنیئے ان کے بیک واسطہ مرید و جانشین حضرت سلطان المشائخ کی شہادت سنیئے۔ ''فوائد الفواد'' میں ہے۔ حسن علاء سجزی لکھتے ہیں' یہ بیان 31 شوال روز چہار شنبہ 711ھ کا ہے۔

''لختے حکایت بزرگی شیخ قطب الدین بختیار افتاد اقدس اللہ سرہ العزیز فرمود۔''

کیا فرمائیں گے' کیا یہ کہ قطب بختیارؒ قرآن کی تلاوت بہت کیا کرتے تھے یا یہ فرمائیں گے کہ وہ حافظ تھے' بچپن میں انہوں نے قرآن یاد کیا تھا' نہیں یہ نہیں بلکہ

''فرمود کہ در آخر عمر قرآن یاد گرفت چوں تمام محفوظ شد اں گاہ نقل فرمود۔'' (صفحہ 79)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب سب کچھ کر چکے' تزکیہ و تصفیہ کے سارے مراتب سے فارغ ہو چکے' تو دل اور دماغ کی جو تختی دھو کر صاف کی گئی تھی' اسی صاف شدہ تختی پر جو نقوش آخر عمر تک سرزمین ہند کے اسلام کا دوسرا بنیادی معمار ثبت کرتا رہا' وہ صرف ''یقین'' و ''اذعان'' کا وہی لاریبی سرمایہ تھا جس کا نام ''القرآن'' ہے۔ اس کے بعد زندگی کی آخری سانس تک یہی مجاہدہ جاری رہا تا اینکہ جب یہ مجاہدہ بھی پورا ہو گیا' یقین کا یہ سارا سرمایہ ہضم ہو گیا' تب ''آں گاہ نقل فرمود'' یہ خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہ العزیز کے پہلے خلیفہ اور جانشین کے متعلق شہادت ہے۔ ایسی شہادت جس سے زیادہ معتبر قابل وثوق شہادت اور کیا مل سکتی ہے کہ خود سلطان المشائخ کا یہ براہ راست بیان ہے۔

طریقہ چشت کا جو پہلا پودا اس سرزمین میں آ کر نصب ہوا' اس کے ایک ممتاز پھل (قطب صاحبؒ) کے متعلق تو یہ رپورٹ ہے' عوام واقف نہ ہوں لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ خواجہ اجمیری قدس سرہ کے ایک اور نامور خلیفہ حضرت حمید الدین انا گوری السوالی ہیں۔ شیخ محدث ان کے ذکر میں لکھتے ہیں ''از اعاظم خلفاء حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین است۔'' صاحب ''سیر الاولیاء'' ''ہم خرقہ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ'' سے ان کو روشناس کراتے ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے ایک دلچسپ سوال کے جواب میں لوگ ان ہی حمید الدین الناگوریؒ کا نام پیش کرتے ہیں یعنی دلی کو پایۂ تخت بنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کو باضابطہ دار الاسلام بنانے کا اعلان جب کیا تو اس نئے جدید دار الاسلام میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا مسلمان کون تھا؟

شیخ محدث دہلوی نے خود خواجہ حمید الدین سے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ

''اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلمانان آمدم منم'' (اخبار۔ صفحہ 30)

ابو الفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معزز دولتمند اسلامی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا' لکھتا ہے۔

''شیخ حمید الدین سوالی ناگوری پور شیخ احمد در سر آغاز جوانی بس نکورد و خواستہ (ثروت دولت) دار بود۔'' (صفحہ 7)

یعنی صرف کسی خواستہ دار گھرانے ہی سے تعلق نہ تھا بلکہ بذاتِ خود بھی امیرانہ شکل و صورت رکھتے تھے جو عموماً ناز و نعمت میں پلنے والوں کی خصوصیت ہے۔ درمیان میں کن ذہنی اور قلبی انقلابات سے گذرنا پڑا' بڑا طویل قصہ ہے۔ آخر میں اسی ''نیکو رو خواستہ دار'' نوجوان کو ماڑواڑ کے علاقہ ناگور (نواگرام) کے ایک گاؤں سوالی میں ان کو دیکھا گیا۔ میر خورد نے لکھا ہے:

''یک بیگہ زمین واشت نیم بیگہ ازاں بدست مبارک بکلند (کدال) راست کردے و چیزے بکاشتے تا ایں غایت کہ آں رسیدے (فصل تیار ہو جاتی) نیم بیگہ دیگرے راست کردے و چیزے بکاشتے۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 30)

خواجہ بزرگ نے اپنے محبوب اور راستباز مرید کو سلطان التارکین کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ فرماتے' پیار کے لہجہ میں فرماتے:

''التارک الدنیا والمنازع عن العقبیٰ سلطان التارکین حمید الدین الصوفی۔'' (اخبار۔ صفحہ 30)

علوم رسمیہ میں بھی پایہ بڑا بلند تھا' عمر بھی کافی طویل ہوئی۔ بعض تحریری یادگاریں اب بھی پائی جاتی ہیں جن سے علمی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ علم کا جو بوجھ آپ پر لدا ہوا تھا' جب ارادہ ہوا کہ ہم ہی اس پر لد جائیں' محمول کی جگہ علم ہی ہمارا حامل ہو جائے' اسی کی عملی ترکیب سیکھنے خواجہ اجمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خاندانی اعزہ نے بری طرح ان کا پیچھا کیا کہ آخر میں ناصحانِ مشفق کو خطاب کر کے فرمایا۔

''برید و بشینید منکہ از ار بند خود چناں محکم [5] بستہ ام کہ فردا شاید بحوراں جنت ہم باز نکنم۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 156)

آپ کے خطوط کا ایک بڑا مجموعہ حضرت زکریا بہاء الدین ملتانی کے نام ہے' جن کا نقطہ نظر اس راہ میں ابوذری نہیں' سلیمانی وعثمانی تھا۔ اس لیے دونوں میں سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان کے مکاتیب کی قیمت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ

''کلمات اور ا از تصنیفات او انتخاب نمودہ'' [6] (صفحہ 30)

سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری ہندی خواجگانِ چشت میں جس مقام رفیع کے مالک ہیں' اس کے لیے مذکورہ بالا اجمالی تعارف غالباً کافی ہے۔ اب سنیے حضرت شیخ محدث دہلوی شیخ عبدالحقؒ کی زبانی سنیے کہ ان کا طریقہ خاص جو صدیوں ان کے سلسلہ میں معمول بہ رہا' وہ کیا تھا؟

واقعہ یہ ہے' جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ دلی کی مرکزی حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر چند حصوں میں جب تقسیم ہوگئی تو ان میں ایک مستحکم علم دوست دین پژوہ حکومت شادی آباد مانڈو کی بھی تھی۔ شادی آباد مانڈو کے بادشاہوں میں ایک مشہور بادشاہ محمود خلجی ہیں جنہوں نے مالوہ کے سوا ''تمام ولایت بوندی وماڑ واڑ بزور شمشیر برگفت'' (سیر المتاخرین۔ صفحہ 171)

اسی وجہ سے اجمیر' ناگور وغیرہ کے علاقے بھی اسی کی دائرہ حکومت میں شریک ہو چکے تھے۔ محمود خلجی کی عظمت وشوکت کا چرچا ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں تک پہنچا ہوا تھا۔ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں لکھا ہے۔

''خواجہ جمال الدین استر آبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا باگزیں ارمغاں (قیمتی تحفوں) پیش آورید''

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی۔ ہندوستان کی اس نئی طاقتور حکومت کا شہرہ سن کر حسب دستور مختلف بلاد وامصار سے لوگ شادی آباد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے' شاید پہلے بھی کہیں ذکر آیا ہے کہ علماء اور صلحاء کو اپنے شہر میں لا کر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا۔ ''مآثر رحیمی'' میں محمود خلجی (سلطان مالوہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''چون سلطنت باوقار گرفت وتربیت علماء وفضلاء کوشید و مدارس ساختہ۔''

اس نے صرف یہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ

''زر بہ اطراف واکناف عالم فرستاد و مستعداں را طلب داشت۔''

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس عجیب وغریب ذوق وشغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مالوہ کے جنگلوں کے بیچ کا یہ شہر (7) ''درزمان او یونانِ ثانی گشت۔'' (صفحہ 125)

بہر حال اطراف واکناف عالم میں روپے بھیج بھیج کر جن اہل علم وکمال والوں کو محمود خلجی نے مالوہ بلایا تھا' ان میں حضرت امام محمدؒ بن حسن الشیبانی صاحب ابی حنیفۃ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ بھی تھے جنہیں بادشاہ نے تاج الافاضل کا خطاب دیا تھا' اجمیر شریف کی قضاءت ان کے سپرد ہوئی تھی۔ قیام گاہ راجپوتانہ کے مشہور شہر نارنول میں تھا جو کسی زمانہ میں شرفاء اسلام کا ایک بڑا مرکز تھا۔ تاج الافاضل کے صاحبزادے علامہ مجد الدین الشیبانی تھے جو قاضی مجد کے نام سے مشہور تھے۔ قاضی مجد کے سات صاحبزادے تھے۔ شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ

''قاضی مجد الدین راہفت پسر بود' ہمہ دانشمند (عالم) متقی ومتدین۔''

لیکن ان ساتوں بھائیوں میں شیخ احمد مجد شیبانی نے اپنے وقت میں بڑی عظمت وشہرت حاصل کی۔ یہ نارنول سے اٹھارہ سال کی عمر میں اجمیر شریف چلے آئے تھے۔ اجمیر شریف میں اس وقت سلطان التارکین خواجہ حمید الدین ناگوری جن کا تعارف کرا چکا ہوں' انہی کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ حسین ناگوری کی معرفت وہدایت کا چراغ روشن تھا۔ شیخ احمد مجد خواجہ حسین ناگوری ہی کے ''شاگرد ومرید'' (اخبار) ہیں۔ میں نے شیخ احمد مجد کے متعلق ذکر کیا تھا کہ عربی زبان پر ان کو اتنی دسترس حاصل تھی کہ ''درعربی وفارسی تقریر کردے۔'' (اخبار)

تقریباً چورانوے سال کی عمر ہوئی' عمر کا زیادہ حصہ اجمیر میں گزرا لیکن وفات ناگور میں ہوئی۔ شیخ محدث نے انہی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے معمولات میں ایک اہم ضروری معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد ''تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے۔'' یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہفتاد سال دراجمیر برہمیں سنوال گذار دند۔''

''مدارک'' پڑھاتے وقت ان پر جو حال طاری رہتا تھا' شیخ محدث نے اس کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

''دربیان وعدو وعید چنداں گریہ وحالت کردے کہ صوفیاں درحالت سماع کنند وچشماں او راز غایت بکاو بیداری سرخ' ومرمد آشوب (وہ) بودے۔''

لیکن اس شیبانی بزرگ نے اس طریقہ کو کیا ہندوستان سے باہر کسی دوسرے اصلاحی ملک سے یہاں داخل کیا تھا؟ مجھے اسی کے متعلق عرض کرنا ہے۔ شیخ محدث کی شہادت ہے۔

''وایں وظیفہ تفسیر مدارک طریقہ سلوک مشائخ ایشان ست۔''

''مشائخ ایشاں'' کون لوگ ہیں' ایشاں کی شرح میں محدث ہی فرماتے ہیں۔

''کہ خواجہ حسین ناگوری وشیخ حمید الدین صوفی نیز ہمچنیں می کردند۔'' (اخبار الاخیار۔ صفحہ 186)

مطلب اس کا اور کیا ہوا کہ خواجہ حمید الدین صوفی جن کے متعلق آپ سن چکے کہ یکے از اعاظم خلفاء خواجہ بزرگ وہمرفتہ قطب الدین بختیار اوشی ہیں۔ یہ ان ہی کے عرفانی سلوک کا طریقہ تھا۔

اب خود ہی غور کرنا چاہیے کہ خواجہ بزرگ اجمیری کے دو ہی خلفاء نے ہندوستان میں خواجہ کی نیابت کا فرض

انجام دیا۔ دونوں میں سے ایک کے متعلق سلطان المشائخ کی گواہی گذر چکی کہ کامل قرآن "چوں محفوظ شد آنگاہ نقل فرمود" اور دوسرے صاحب کے متعلق محدث دہلوی کی شہادت ہے کہ "تفسیر مدارک" کو سلوک کا طریقہ بنا کر اپنے سلسلہ میں اس کو رائج کیا کہ اسی وظیفہ سے ان پر وہ حال طاری ہوتا تھا۔

"کہ صوفیاں در حالت سماع کنند۔"

کیا اسلام کا جو ایمانی و عرفانی شجرہ طیبہ سب سے پہلی دفعہ کفرستان ہند میں نصب ہوا اس کے دونوں پھلوں، خواجہ بختیار و خواجہ حمید رحمتہ اللہ علیہما کے اس رنگ و مزہ کو دیکھ کر ہم اس "شجرہ طیبہ" کے طریقہ سلوک کے متعلق فیصلہ کرنے میں اب بھی شک کر سکتے ہیں؟[8]

خواجہ بزرگ کو روپوش ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے۔ حضرت قطب صاحب زندہ ہیں، اجمیر شریف کی جامع مسجد کے امام ایک بزرگ مادھو نامی ہیں۔ معلوم نہیں اصلی نام کیا تھا، سلطان المشائخ نے اسی نام سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اجمیر کی جامع مسجد کے انہی امام صاحب کے سامنے سے ایک نوجوان لڑکا گذرتا ہے، احمد نام ہے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے "بافندہ بود" (صفحہ 47) آواز میں درد ہے، ہندی زبان کے گیت لوگوں کو سنا رہا ہے۔ امام جامع اجمیر ان کو پاس بلاتے ہیں، سلطان المشائخؒ کی روایت ہے کہ اسی گانے والے نوجوان کو خطاب کر کے امام نے کہنا شروع کیا۔

"چنیں آوازے تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرچ کنی۔"

"یعنی جس قسم کی آواز تم رکھتے ہو، افسوس کی بات ہے کہ ہندی گانوں میں اسے خرچ کرو۔" نوجوان پوچھتا ہے کہ پھر کیا کروں؟ اجمیر کو اجمیر والے نے جس فضا سے معمور فرمایا تھا، کیا امام جامع کا یہ جواب فضاء کی اس تاثیر کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا، سلطان المشائخ کے حوالہ سے "فوائد الفواد" میں مشورہ کا یہ فقرہ منقول ہے "فرمود کہ قرآن یاد گیر۔" مشورہ قبول کیا جاتا ہے اور چند ہی دنوں میں ہندوی گیت والے بافندہ کے متعلق خبر ملتی ہے کہ "قرآن یاد گرفت" (فوائد الفواد۔ صفحہ 174) کیا صرف "یاد گرفت" کا تعلق محض الفاظ سے تھا۔ شیخ محدث نے لکھا ہے خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سامنے جب یہی احمد جواب "خواجہ احمد نہروانی" کے نام سے مشہور تھے، پیش ہوئے تو فرمایا۔

"اگر مشغولی احمد بسنجند مایہ دہ صوفی باشد" (اخبار۔ صفحہ 47) "یعنی دس صوفیوں کا سرمایہ ایک شیخ احمد کی مشغولی کے مساوی ہے۔"

شیخ محدث نے زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کی یہ رائے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ "شیخ الاسلام زکریا ملتانی قدس سرہ کم کسے را پسندیدے" لیکن جس نے قرآن پیا تھا، بھلا اس کی پسندیدگی میں بھی کسی کو شک ہو سکتا تھا۔ قول ثقیل سے جو وزن پیدا ہو سکتا ہے، یقین کیجیے کہ اس وزن کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ پہاڑ جس سے پھٹتے ہوں، خود سوچنا چاہیے کہ اس کو کون پھاڑ سکتا ہے۔[9]

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ بزرگ کے دونوں خلفاء میں سے حضرت قطب صاحب کو تو بجائے اجمیر کے دلی رہنا

پڑا۔ شمس الدین التمش نے بڑی بڑی خوشامدوں سے ان کو خواجہ بزرگ سے مانگ لیا تھا۔ میر خورد کی روایت ہے کہ جب دلّی میں رہنے کی اجازت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو عطا فرمائی تو

''سلطان شمس الدین سعادت قدم بوس شیخ را در یافتہ ہمراہ شیخ قطب الدین بشادی تمام متوجہ شہر گردید۔''

(سیر الاولیاء۔ صفحہ 55)

لیکن ماڑواڑ اور راجپوتانہ میں خواجہ اجمیری کی روشنی کو پھیلانے کے لیے وہی ایک بیگہ زمین کے کاشتکار سلطان التارکین شیخ حمید ناگوری ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے طریقہ چشتیہ کے حقیقی رنگ کو پیش کیا۔ آہ! کہ جو رنگ آج نگاہوں سے اتنا پوشیدہ ہو رہا ہے کہ میں دعویٰ کرتا جا رہا ہوں اور خود سمجھ رہا ہوں کہ لوگ اسے میری زبردستی قرار دینے پر تلے ہوئے ہوں گے مگر اب تک جو واقعات آپ کے سامنے پیش ہو چکے ہیں' کیا ان میں میرے دعوے کے ثبوت کی جھلک بھی آپ کو محسوس نہیں ہو رہی ہے' مگر نہیں مجھے ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے۔ میں نے شیخ احمد مجد شیبانی کے پیر خواجہ حسین ناگوری کا ذکر کیا تھا۔ بتایا تھا کہ یہ خواجہ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں۔ ''مدارک'' کے وظیفہ کے سواء جواباً عن جد ''طریقہ سلوک'' کے طور پر ان کے خاندان میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا تھا' انہی کا وہ قرآنی ذوق تھا جس کا تذکرہ میں نے کسی اور جگہ بھی کیا ہے یعنی تیس جلدوں میں ''نور النبی'' نامی تفسیر انہی خواجہ حسین ناگوری کی لکھی ہوئی ہے۔ ہر پارہ کی تفسیر کے یے الگ جلد ارقام فرمائی گئی تھی۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجمیر اور مارواڑ کا علاقہ محمود خلجی کے عہد میں حکومت مالوہ سے ملحق ہو چکا تھا' محمود خلجی کے بعد مانڈو کے تخت پر غیاث الدین خلجی بیٹھا' اسی کے عہد حکومت میں خواجہ حسین ناگوری اجمیر میں افسادہ واستفادہ کی مسند بچھائے ہوئے تھے۔ غیاث الدین ان کا بے حد معتقد تھا لیکن ساری عمر اسی آرزو میں اس کی گذری کہ کسی دن مانڈو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہو۔ شیخ کی طرف سے باوجود رعیت ہونے کے نفی میں جواب ملتا رہا۔ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ غیاث الدین کو کسی نے ترکیب بجھائی۔ بادشاہ کے پاس کسی نے موئے مبارک نذر میں پیش کیا تھا' ترکیب بتانے والے نے مشورہ دیا کہ موئے مبارک کی زیارت عام کا اعلان کیجیے۔ شیخ کھنچے کھنچے خود ہی چلے آئیں گے۔ یہی ترکیب کی گئی اور چل گئی۔ محدث دہلوی کا بیان ہے کہ خبر پاتے ہی خواجہ حسین

''ہماں ساعت بے توقف سماع کناں ودرود گویاں' احرام دیار منڈو بست۔''

بادشاہ کو اپنے نسخہ کے کارگر ہونے کا جب علم ہوا شیخ کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا۔ بیسیوں بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ان ہی میں ایک خستہ حال گاڑی شیخ کی بھی تھی۔ اسے خیال بھی نہ گزرا' بعد کو پتہ چلا۔ بڑی معذرت سے پیش آیا۔ بعض کرامات کا بھی تجربہ ہوا۔ محمود خلجی کی قبر پر لے جا کر مغفرت کی دعا کرائی۔ شیخ نے منظور فرمایا۔ یوں غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری میں تعلقات پیدا ہوئے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ''سلطان تحفہائے عالی پیش آورد وقبول نہ کرد۔'' شیخ نے تو خیر سلطان کے تحفے قبول کیے یا نہ کیے لیکن ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں' اسی غیاث الدین خلجی سلطان مانڈو کے ذکر میں پڑھتے ہیں' فرشتہ راوی ہے ''ہزار کنیزک حافظ قرآن درحرم داشت'' یعنی صرف شاہی محل سرا میں قرآن کا ذوق اتنا پیدا ہو گیا

تھا کہ بادشاہ کی لونڈیوں میں ایک ہزار عورتیں قرآن کی حافظ تھیں' اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پھر مردوں کا کیا حال ہوگا۔ ظاہری حکومت مانڈو کی اجمیر پر قائم تھی لیکن بباطن خدا نے یوں مانڈو کو اجمیر کے قرآنی مذاق کا ماتحت بنادیا تھا۔ غیاث الدین کا یہ حال تھا کہ اس نے محل کی عورتوں کو حکم دے رکھا تھا۔

''کہ جہت نماز تہجد اورا بیدار کردہ می باشند وعندالاحتیاج آب برروئے اومی پاشیدہ باشند اگر در خواب گراں باشد بزور بجنبانند واگر باآں ہم بیدار نشود دستش گرفتہ برخیزانند۔''

یہ بھی فرشتہ ہی کا بیان ہے' آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس نے بادشاہ کی دنیا رد کی تھی' بادشاہ پر اس کے دین کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا اور یہ ترکیب تو بادشاہ نے مادی نیند سے بیدار کرنے کی اختیار کی تھی' غفلت کی خواب سے چونکنے کے لیے اس نے اپنے درباریوں کو یہ عجب حکم دے رکھا تھا کہ جب

''در وقت عشرت ومشغولی بحستان دنیا ہر چہ کہ اسم کفن برونہادہ بودند بنظرش می آورند تا تنبیہ شدہ عبرت گرفتہ از مجلس می برخواست وتجدید وضو کردہ باستغفار وتوبہ وانابت می پرداخت۔''

اور یہی بات مجھے پیش کرنی تھی کہ خواجگانِ چشت کا تعلق قرآن سے کیا تھا' خواجہ حسین ناگوری کا چونکہ ذکر آ گیا ہے' اس لیے ایک اہم تاریخی بات جس کا ان کی ذات سے تعلق ہے' جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دوں۔ شیخ محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں خواجہ بزرگ اجمیری کی قبر شریف کے متعلق یہ واقعہ درج کیا ہے۔

''دراجمیر کہ موضع اقامت او بود مدفون گشت اول قبر خواجہ از خشت بود۔''

غالباً ''خشت'' سے کچی اینٹیں ہی مراد ہیں' سلطان المشائخ سے شیخ کبیر شکر گنج کے روضہ طیبہ کے متعلق یہ مروی ہے کہ

''بجہت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام شد' چوں موجود نمی شد درخانہ شیخ شیوخ العالم کہ بخشت خام بر آوردہ بودند ازاں خشت ضرور آوردند تا در لحد خرچ شد طیب اللہ ثراہ''

(سیر الاولیاء۔ صفحہ 91)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ چشتیہ کے معماران اولین کی قبروں میں کچی اینٹوں ہی کے لگانے کا رواج تھا' محدث دہلوی نے خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کے متعلق یہ تاریخی بیان بھی دیا ہے کہ جس زمانہ میں خواجہ حسین ناگوری نے جوار خواجہ میں قیام فرمایا' اس وقت

''حوالی او بیشہ شیراں گشتہ ودراں زماں بالائے قبر شریف عمارت نہ بود۔''

یہ بھی لکھا ہے کہ اطراف میں کوئی خانقاہ وغیرہ بھی نہ تھی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ

''دروازہ وخانقاہ بعضے از ملوک مندو ساختند۔'' (صفحہ 23)

بعضے ملوک مندو سے یہی غیاث الدین خلجی ہی مراد ہے کیونکہ غیاث الدین ہی کے عہد میں غالباً اپنے قیام اور واردین صادرین کے قیام کے لیے جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے

''اول کسے کہ در مقبرہ خواجہ عمارت کرد خواجہ حسین ناگوری بود۔'' (صفحہ 23)

اور انہی کے زیر اثر اس عجیب و غریب بادشاہ نے اس مقام میں جو "بیشہ شیراں" بن گیا تھا' خانقاہ اور خانقاہ کا دروازہ بنوایا' واللہ اعلم بالصواب

میری غرض تو اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ خواجہ حسین ناگوری اور غیاث الدین خلجی سلطانِ مالوہ کے تعلقات کو دکھاؤں' انہی تعلقات کی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ شادی آباد مانڈو کے صرف شاہی محل سرا کی لونڈیوں میں ہزار ہزار عورتیں پورے قرآن کی حافظ تھیں۔

اب دنیا خواہ کچھ ہی خیال کرے لیکن غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری کے جن تعلقات کا میں نے ذکر کیا ہے' انہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر غیاث الدین کے اس قرآنی ذوق کو خواجگانِ چشت کے قرآنی شغف کا نتیجہ قرار دیا جائے تو اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے طریقہ چشتیہ کی حمیدیہ ناگوریہ کی شاخ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے کم از کم بابر کی آمد کے زمانہ تک "مدارک" کے درس کو طریقہ سلوک کی حیثیت مسلسل بغیر کسی انقطاع کے حاصل رہی' وجہ اس کی یہ ہے کہ خواجہ احمد مجد جن کے تذکرہ میں شیخ محدث نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے' اجمیر شریف سے ہجرت کرکے ناگور آخر عمر میں چلے گئے تھے اور وہیں وفات ہوئی۔ شیخ محدث نے ان کی اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے کہ

> "چوں در اجمیر خلل شدہ قلعہ را رانا سانگا کہ گبرے عظیم بود از دست مسلماناں بگرفت و اکثر مسلماناں را شہید ساخت احمد مجد پیش ازیں حادثہ بہفت روز بحکم اشارت خواجہ بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر برآمد و بہ مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے برایں شہر نظر جلال ست فرمان بندگی خواجہ بریں ست کہ مسلمانان از شہر برآیند در روز دوشنبہ 922ھ با جماعہ از مسلمانان از اجمیر برآمدہ دوشنبہ دیگر کافراں بر سر اجمیر آمدند و آں دیار وز یروز بر ساختند۔" (صفحہ 185)

واللہ اعلم شیخ احمد مجد کو یہ اشارہ خواب میں ہوا یا کوئی کشفی واقعہ تھا۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ گبر عظیم رانا سانگا جس کا شیخ محدث نے ذکر فرمایا ہے کہ یہ وہی رانا سانگا ہے جو بیانہ کے میدان میں حضرت بابر بادشاہ سے نبرد آزما ہوا اور خاص غیبی تائید نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں تیموری خاندان کا تخت بچھے گا۔ بدترین شکست کے ساتھ رانا سانگا نے راہ گریز اختیار کی۔ شیخ احمد مجد کا انتقال 927ھ میں ہوا ہے اور بابر نے 933ھ میں پانی پت کا میدان ابراہیم لودھی کے مقابلہ میں جیت کر کچھ ہی دن بعد رانا سانگا سے وہ مقابلہ کیا جس کی نظیریں دنیا کی تاریخوں (10) میں کم مل سکتی ہیں اور یہی میری غرض تھی کہ بابر کے عہد تک طریقہ چشتیہ کی ناگوری حمیدی شاخ میں مسلسل تفسیر "مدارک" کے سلوک کا طریقہ جاری رہا۔ اسی شاخ کے ایک بزرگ نے قرآن کی وہ ضخیم تفسیر لکھی اور اسی بزرگ کے معتقد غیاث الدین خلجی کو ہم اس حال میں پاتے ہیں جس کا تذکرہ فرشتہ سے میں نے نقل کیا ہے جس کے قرآنی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف شاہی محل میں ہزار ہزار عورتیں قرآن کی حافظات پائی جاتی تھیں۔ کیا ان واقعات کو پیش نظر رکھنے والوں کے لیے اب بھی میرے دعوے کی تصدیق میں شک کی گنجائش ہے؟

اور یہ تو صرف چشتی شجرۂ طیبہ کے ایک پھل کا حال ہے۔ دوسرے دہلوی خلیفہ حضرت قطب صاحب کا قرآن

سے جو ذاتی تعلق تھا' اس کا ذکر تو گزر ہی چکا لیکن اس شاخ میں بھی بات انہی تک ختم نہیں ہوگئی ہے۔ یاد ہوگا کہ قطب صاحب کے خلیفہ برحق شیخ کبیر شکر گنج خود قرآن کا درس دیتے تھے۔ سلطان المشائخ نے چھ پارے تجوید کے ساتھ انہی سے پڑھے تھے لیکن یہ پڑھنا اور پڑھانا تو دیکھ کر تھا' میر خورد نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ

''سلطان المشائخ بقلم مبارک خود نبشتہ ست۔''

یہ چیز کیا تھی جسے سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے ثبت فرمایا تھا' میر خورد نے وہ عبارت بجنسہٖ نقل کی ہے۔ میں بھی وہیں سے نقل کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

''شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند''

اس کے بعد فرماتے ہیں

''روز آدینہ (جمعہ) بعد از فراغ نماز بست وپنجم مادی جمادی الاول 660ھ تسع وستین و ستمانہ لعاب از دہن مبارک در دہن کاتب (سلطان المشائخ) کرد۔''

شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان جی کے منہ میں دہن مبارک کا لعاب کس لیے ڈالا تھا' اسی کا ذکر مقصود ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

''ووصیت فرمود بحفظ کلام مجید رزقہ اللہ تعالیٰ'' (کتاب مذکور۔ صفحہ 123)

گو مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے کہ خود شیخ کبیر شکر گنج کو زبانی قرآن یاد تھا یا نہیں لیکن قرآن کے ساتھ ان کا شغف اسی سے ظاہر ہے کہ پچانوے سال کی عمر تک تراویح کی نماز جو ظاہر ہے' فرض نہیں ہے' پڑھتے رہے۔ آخر عمر میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ قرأت وتجوید کے ساتھ قرآن پڑھانے کا حال بھی سن چکے ہیں۔ سلطان المشائخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خانقاہ حافظوں سے بھری رہتی تھی۔ میر خورد نے حضرت ہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب پچھلی دفعہ اجودھن میں میری حاضری ہوئی اور شرف بیعت سے سرفراز ہوئے' اس کے بعد شیخ کبیر نے خدام خانقاہ کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

''بجہت ایں متعلم (طالب العلم) غریب در جماعت خانہ کھٹ راست کنید۔''

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں جب جماعت خانہ میں واپس آیا تو دیکھا کہ میرے لیے پلنگ (کھٹ) بچھایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل میں خیال کیا بلکہ ارادہ ہوا۔

''من ہارے ہرگز بر کھٹ نخواہم خفت۔''

اسی موقع پر ''نخواہم خفت'' کے خیال کی جو وجہ سلطان المشائخ نے بیان فرمائی تھی' وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''زیراچہ چندیں مسافراں عزیزاں وحافظاں کلام ربانی وعاشقانِ درگاہ رحمانی می بینم کہ برخاک می غلطند من چگونہ بر کھٹ بغلطم۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان عز وجاہ (عزیزاں) وعاشقانِ درگاہ رحمانی کے ساتھ خانقاہ فریدیہ کا ایک حصہ خاص حافظانِ کلام ربانی کا بھی تھا۔

سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ شیخ کبیر عموماً لوگوں کو حفظ قرآن کی ایک وِردی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے یعنی فرماتے تھے غالباً حضرت والا کا خود تجربہ تھا۔

''بجہت یادگرفتن قرآن اول سورۂ یوسف فرمودے کہ یاد باید کردنا بہ برکت آں حق تعالیٰ حفظ تمام قرآن روزی کند۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 439)

سنداً اس حدیث میں ممکن ہے بعضوں کو کلام ہو جس پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے لیکن شیخ کبیر عموماً اپنے لوگوں کو یہ حدیث بھی سنایا کرتے تھے۔

''ہر کرا نیت یار گرفتن قرآن باشد و بداں برسد دہم دراں نیت از جہاں سفر کند چوں (11) اورا بگور نہند فرشتہ بیاید و ترنجے از بہشت آوردہ بدست او دہداں کس آں ترنج ابتلاع (نگل جانا) کند تمامہ قرآن اورا محفوظ گردد فرداچوں حشر شودْ او حافظ مبعوث گردد۔''

(سیر الاولیاء۔ صفحہ 439)

اور اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وابستوں میں وہ قرآن سے کس قسم کا تعلق پیدا کرنا چاہتے تھے' جس کا حاصل یہی ہوا کہ جس سے جتنا بھی ممکن ہو زندگی کا ایک حصہ اس کام میں وقف کرے' کامل قرآن محفوظ نہ ہو سکے تو جتنا بھی اپنے اندر قرآن کو اتارنے والا اتارلے گا' یہی چیز دوسری زندگی میں اس کی تکمیل کی ضمانت بن جائے گی۔ گو پارے دو پارے سے بھی کم ہی محفوظ کر کے مرا ہو لیکن اٹھے گا تو پورے قرآن کا حافظ بن کر۔ ظاہر ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی زبانِ مبارک سے اس مفت کی دولت کا حال سن کر حضرت والا کے دست گرفتوں میں کون ہوگا جس کے دل میں کم از کم اس نیت کی گدگدی نہ پیدا ہوتی ہوگی۔

سب کچھ پڑھنے' پڑھانے دینے دلانے کے بعد آخری وصیت بابا صاحب کی اپنے خلیفہ اکبر ومحبوب (سلطان المشائخ) کو ''قرآن جا کر یاد کرو'' کی ہے اور اس اہتمام کے ساتھ وصیت ہو کہ لعاب مبارک سلطان المشائخ کے دہن پاک میں ڈالا جاتا ہے اور جیسا کہ میر خورد نے سلطان جی کی اسی یادداشت سے جو ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی تھی' اسی کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ کلام اللہ کے حفظ کی وصیت کے بعد شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا ''نظام!'' میں نے ''لبیک'' کے ساتھ جواب عرض کیا۔ اس کے بعد سلطان المشائخ ارقام فرماتے ہیں کہ ''خواجہ گفت دین ودنیا ترا دادہ اند۔'' کیا یہ اشارہ اسی قرآن کی طرف تھا؟ جس کے متعلق اجتماعی اور انفرادی تجربات تیرہ سو سال سے یہی ہیں۔ آگے ہے کہ شیخ کبیر نے فرمایا ''ایں جا ہمہ ایں ست۔'' یہ بجنسہٖ الفاظ ہیں جو میں ''سیر الاولیاء'' سے نقل کر رہا ہوں۔ واقعی مطلب کیا ہے' بولنے والے اور بولنے والے کا خدا ہی اسے جان سکتا ہے لیکن گفتگو جس مسئلہ میں ہو رہی ہے' اس کا تو کھلا ہوا اقتضاء یہی ہے کہ ''ہمہ این ست'' سے وہی قرآن مراد ہے' جس کے حفظ کی وصیت کے لیے خاص مجلس نماز جمعہ کے بعد آج قائم کی گئی ہے' بہرحال میرے نزدیک ''ہمہ این ست'' کے ایں کا مطلب اور مشارٌ الیہ قرآن معلوم ہوتا ہے اور ''این جا'' کی ''این'' کا اشارہ خواجگانِ چشت کے اس طریقہ کی طرف ہے جو ہندوستان کے خصوصی حالات کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اس ملک میں

جاری کیا تھا۔ شیخ الاسلام فرید الحق والدینؒ کا آخری فقرہ اس کے بعد یہ ہے:

''برو ملکِ ہندگیر نظرۃ منک یکفینی''

قرآن حوالہ کیا جاتا ہے۔ اسی کو سب کچھ بتایا جاتا ہے اور اسی کے بعد ''ہندگیری'' کی بشارت سنائی جاتی ہے۔ اگر اسے بشارت قرار دیا جائے یا للکارا جاتا ہے' ایک ہتھیار دے کر جس سے ہندگیری کی مہم میں کامیابی ہو سکتی ہے' آگے عربی فقرہ

نظرۃ منک یکفینی ''تمہاری ایک نگاہ میرے لیے کافی ہے۔''

واللہ اعلم مرشد نے اپنے اس مرید اور خلیفہ کو جسے قرآن دے کر ''ہندگیری'' کی مہم پر بھیج رہا ہے' یہ کیا کہا؟ کیا یہ مطلب ہے ایمان و یقین کی جو روشنی قرآن سے پیدا ہوتی ہے' اس کی صرف ایک نظر ان لوگوں پر قابو پانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے' جن کی پوری زندگی صرف شرک کے انگاروں پر لوٹتے کٹی ہے یا کٹ رہی ہے۔ ایک دوسرے موقع پر سلطان المشائخ ہی کے حوالہ سے میر خورد ہی نے قرآن کے متعلق ایک عجیب بات نقل کی ہے۔ سوال کرنے والے وہی مولانا فخر الدین زرادی ہیں جن کے غیر معمولی علم و فضل کا ذکر آ چکا ہے۔ مولانا زرادی نے عرض کیا:

''مشغول شدن بکلام اللہ فاضل تر یا بذکر۔''

تصوف جس کی بنیاد ہی ذکر و اذکار پر سمجھی جاتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت تھی یقیناً وہاں کے لیے ذکر اذکار اشغال و مراقبات کے ذرائع مفید بھی ہوئے لیکن سوال ہندوستان میں پوچھا جا رہا تھا۔ ''ہندگیری'' کی مہم اپنے پیر کی طرف سے جسے سونپی گئی تھی اس سے دریافت کیا گیا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا۔

''ذاکر را وصول زود تر بود' اما خوف زوال ہم بود فاما تالی را وصول دیر تر بود لیکن خوف زوال نہ باشد۔'' (صفحہ 446)

وجہ ظاہر ہے کہ ذکر سری ہو یا جہری' دونوں کی کثرت و مزاولت خصوصاً جب حضورِ قلب اور شعورِ معنی کے ساتھ ہو تو مذکور سے اشتیاق و انہماک' حب و الف کی نسبتوں کے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ جن ممالک کے باشندے مسلمان ہو چکے ہیں' اجمالاً ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی مجمل کو مفصل کرنے کے لیے انہیں ذکر و فکر' مراقبہ اور مطالعہ کے مشاغل میں مشغول کیا جاتا ہے' ایمان کی حلاوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکور کی محبت کی آگ جو ایمانی فطرت میں بہر حال دبی ہوتی ہے' وہ ذکر کے ضربات سے بھڑک اٹھتی ہے اور یہی ان کا مطلوب ہوتا ہے لیکن یہ سارے ذکری ذوق و شوق' ولولے اور شورش اسی وقت تک تر و تازہ رہتے ہیں جب تک ذاکر ذکری و فکری مشاغل کو بھی تازہ کرتا رہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وجہ سے ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو جیسی اور جتنے دن کی رکاوٹ ہو گی' اسی نسبت سے ذکری کیفیات کی شدت میں بھی ضعف اور ذوق و شوق کی لذت کم ہوتی جاتی ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ گو ذکر سے مقصد تک رسائی تو جلد ہو جاتی ہے' ایمان مجمل پر ایمان مفصل کے آثار تھوڑی محنت کے ساتھ ہی مرتب ہونے لگتے ہیں بلکہ غلبہ ذکر سے یکسوئی جو پیدا ہوتی ہے' بسا اوقات اس کی وجہ سے کشف و کرامات جیسی چیزوں کا صدور بھی ہونے لگتا ہے لیکن نتائج

کا تعلق چونکہ تجدیدِ ذکر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے' اس لیے مرض وحرج یا دوسرے اسباب کے تحت یہ بالکل ممکن ہے کہ اس راہ پر چلنے والے اپنے آپ کو ان تمام حالات سے خالی پائیں جنہیں اتنی محنت ومشقت سے انہوں نے حاصل کیا تھا اور یہی مطلب ہے ''خوفِ زوال'' سے۔

لیکن قرآن کا حال بالکل مختلف ہے۔ کچھ نہیں' ایک بات اور صرف ایک ہی بات ہے' جس پر اس کے افادہ کا دار ومدار ہے یعنی جس ذریعہ سے بھی ہو کسی طرح یہ طے ہو جائے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک العیاذ باللہ غلط بیانی کے الزام سے پاک وبری ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سراسر ایک عقلی مقدمہ ہے۔ آنحضرتؐ کا تعلق کسی دوسرے غیبی عالم سے نہیں اسی عالم محسوس و شہادت سے ہے۔ وہ ہم انسانوں ہی میں پیدا ہوئے' ہم ہی میں رہے' منٹ دو منٹ کے لیے نہیں جیسے بعض دفعہ کسی غیبی ہستی سے سالک کا احساس متاثر ہو کر پھر اپنے سامنے کچھ نہیں پاتا۔ یہ حالت نہیں ہے۔ سالہا سال تک وہ ہم ہی میں رہے' ہم ہی میں زندگی گزاری۔ گورے' کالے' مشرقی ومغربی' ہندو' مسلمان' عیسائی' یہودی ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے آپؐ کو سب جانتے ہیں' آپؐ ہی کے جانے بوجھے دیکھے بھالے ہیں۔

اسی واضح' محسوس' بدیہی حقیقت کے متعلق' ہمیں اپنی فطرت اور اپنے اندرونی احساسات کو صرف اس حیثیت سے ٹٹولنا ہے کہ العیاذ باللہ کیا وہ سچ نہیں بولتے تھے' اس کے تصور کی بھی صلاحیت کیا ہم میں باقی ہے؟

ایسی بات جسے شاید اب کوئی غیر مسلم بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایک پیدائشی مسلمان کے سینے میں اس کی کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

اِدھر یہ مقدمہ طے ہوا اور اچانک وہی درماندہ عقل جس کی آخری رسائی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ‫ ‫ پردہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کی روشنی میں جگمگا اٹھتی ہے۔ اب اپنے آپ کو وہ اس علم محیط کی رہنمائی میں پاتی ہے' جس سے نہ ماضی غائب ہے نہ مستقبل' نہ شہادت پوشیدہ ہے نہ غیب اوجھل۔ ایسی روشنی جو ظاہر ہے کہ اپنی خالص ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک کیفیت کے ساتھ کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو اب کہیں میسر نہیں آ سکتی اور یہ سب کچھ ایک صرف کہ ایک ''نظرۃ''

خرابانیاں می پرستی کنید ‫ ‫ محمدؐ بگوئید و مستی کنید

کا نتیجہ ہے ؏ بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

جسے اس ایک ''نظرۃ'' کی دولت حاصل ہو چکی ہے دراصل ''معمۂ کائنات'' کے وہ سارے اسرار جو دانش ماضی وحاضر کے کسی سرمایہ سے کسی پر کبھی کھل نہیں سکتے تھے' اس کے حل کی ایک ایسی راہ اس کے سامنے آ گئی ہے' جس پر چلنے والا اپنے اردگرد پس وپیش میں شک وشبہ' ظن وتخمینہ کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا کیونکہ ظاہر ہے کہ اب اس سلسلہ میں جو کچھ جانے گا' جو کچھ سمجھے گا' وہ محدود عقل رکھنے والے انسان کا کوئی تخمینی نتیجہ نہ ہو گا جس میں ہر تھوڑی دیر بعد دغدغہ ہوتا ہے اور اس دغدغہ کو ہونا چاہیے کہ بے جانے صرف قرائن وقیاسات سے جن لوگوں نے نتائج پیدا کیے ہیں' کیا ضرور ہے کہ وہی

واقعہ ہو، خصوصاً جب آئے دن عقل کے تخمینی نتیجوں کے متعلق مسلسل تجربہ ہوتا چلا آ رہا ہے کہ کل جس چیز کے واقعی قرار دینے پر عقل کو اصرار تھا' آج وہی عقل جہل کے قہقہوں سے اسی کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ فکر انسانی کی ہزار ہا ہزار سال کی تاریخ بے جا اصرار و بیجا تمسخر کی داستانوں سے لبریز ہے۔

حالانکہ یہ سارا قصہ صرف اسی ایک ''نظرۃ'' کی تصحیح کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ آئندہ مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہے' وہ راہ کا نہیں بلکہ راہ پر چلنے کا ہے۔ سلطان المشائخ نے علماء رسوم (علماء ظاہر) اور صوفیہ میں فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ دونوں ہی دراصل محمد رسول اللہؐ کے اسی ''لاریبی علم''، ''القرآن الحکیم'' اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی دعوت دیتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ

''ہر چہ علماء بزبان دعوت کنند مشائخ بہ عمل دعوت کنند (سیر الاولیاء) بحوالہ نوشتہ دستہ خاص'' سلطان المشائخ۔ (صفحہ 321)

اور اتنے دھوم دھام سے آپ شیخ کبیر کو جو دیکھ رہے ہیں کہ آخری وصیت اپنے خلیفہ خاص کو حفظ قرآن کی کر رہے ہیں۔ اس حفظ سے غرض وہی ہے کہ ''ہندگیر دعوت'' کی جس مہم پر سلطان المشائخ کا انہوں نے تقرر کیا تھا' ضرورت تھی کہ پہلے اس دعوت کو وہ خود اپنی عملی زندگی بنالیں کہ ان کو زبان سے نہیں اپنے عمل سے دعوت دینی تھی۔

خواجگانِ چشت میں قرآن کے علم کو عمل بنانے کی کیا تدبیر کی جاتی تھی' تلاوت و حفظ کا تو خیر الفاظ سے تعلق تھا لیکن اپنے الفاظ سے قرآن جن معانی کو عطا کر رہا ہے' ان کو اپنے اندر ہضم کس طریقہ سے کرنا چاہیے۔ مشائخ چشت بیعت لیتے ہوئے پہلا معاہدہ جو یہ لیتے تھے جیسا کہ سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ

''پیر او را (مرید را) تلقین کند دیدہ را نادیدہ کنی وشنیدہ را ناشنیدہ'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 321)

اس کا یہی مطلب تھا کہ اپنے حسی و عقلی معلومات کو ان معلومات کے مقابلہ میں جو قرآن عطا کرے گا' جلا دینا پڑے گا کیونکہ بہر حال عقل و حواس کے معلومات جیسے کچھ بھی ہوں' ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں جن کی رسائی محدود ہے اور محدود رسائی رکھنے والے ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوں گے' ظاہر ہے کہ وہ ناقص ہوں گے۔ ناقص مقدمات سے جو نتائج پیدا کیے جائیں گے' خواہ بظاہر جتنے بھی یقینی اور بدیہی معلوم ہوں لیکن ان معلومات بیّنہ قطعیہ کا تو مقابلہ نہیں کر سکتے جو حق تعالیٰ کے علم محیط کلی سے ماخوذ ہوں گے۔

سلطان المشائخ ہی سے ''فوائد الفواد'' میں منقول ہے کہ معلومات جن ذرائع اور طرق سے آدمی کو حاصل ہوتے ہیں' ان کے تین اطوار ہیں' فرماتے ہیں:

''یکے طور حس دوئم طور عقل سوئم طور قدس۔''

طور قدس سے اشارہ علم کے اسی قطعی لاریبی ذریعہ کی طرف ہے جو ہر قسم کے اندیشوں' شکوک و شبہات سے مقدس اور پاک ہے۔ عقلی طور کے معلومات کی دونوں مشہور قسموں یعنی غور و فکر کے بعد آدمی جن نتیجوں تک پہنچتا ہے' جنہیں منطق میں کسبی اور نظری کہتے ہیں اور غور و فکر کے بغیر جو معلومات ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں جنہیں بدیہی کہتے ہیں۔

سلطان المشائخ نے ان دونوں قسموں کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ

''بدیں علم قدس نیست تا کسی چگونہ باشد۔'' (فوائد۔ صفحہ 69)

بہر حال یوں شنیدہ کو نا شنیدہ اور دیدہ کو نا دیدہ بنا کر بزرگانِ چشت جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، قرآنی معانی کو جونے کا حکم دیتے تھے۔ ''فوائد الفواد'' ہی میں تلاوت کے جن قاعدوں کا ذکر ہے، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرتبہ اس کا یہ ہے کہ

''انچہ می خواند معانی آں بر دل گذرانند۔''

دوسرا مرتبہ اس کا یہ ہے کہ

''درحالت قرآن خواندن، جلال وعظمتِ حق بر دل بگذرانند۔''

اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ

''وقت خواندن قرآن باید کہ دل خواندہ را تعلق بحق باشد۔'' (صفحہ 71)

اس آخری عمل کا مطلب یہی ہوا کہ براہ راست حق تعالیٰ سے گفتگو اور مناجات کی سعادت اسے حاصل ہو رہی ہے، گویا وہی چیز ہے جس کی تلاش میں لوگ سرگرداں ہیں، مجاہدات و ریاضات برداشت کرتے ہیں کہ شاید غیب کی کوئی کرن چمک اٹھے، کسی ایماء اور اشارہ سے سرفرازی ہو، قرآن کے پڑھنے والے کو بہ سہولت تمام یہی مقام حاصل ہے۔

سلطان المشائخ لوگوں سے فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے کم از کم اس شعور کو تو ہر شخص میں ہونا چاہیے کہ

''این دولت چہ لائق منست و مرا چہ محل، ایں سعادت باشد۔''

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس ناسوتی زندگی میں اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی بغیر کسی واسطہ کے حق تعالیٰ سے ان ہی کے الفاظ میں ان علوم کو حاصل کر رہا ہے، جن کے حاصل کرنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ اب باقی نہیں ہے۔

شیخ محدث دہلوی نے ملتان کے ایک بزرگ سید صدر الدین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے۔

''دو نعمت در عالم بالفعل موجود است کہ فوق جمیع نعمتہا ست لیکن مردم قدر آں دو نعمت رانمی شناسند و بداں پے نمی برند واز تحصیل آں غافل اند۔''

پھر ان دونوں نعمتوں کی شرح کرتے ہوئے ایک تو اسی نعمت کا ذکر کرتے کہ

''قرآن مجید کلام پروردگار ست دوے سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بداں متکلم وخلق از اں غافل اند۔''

اور دوسری نعمت یہ ہے کہ

''وجود مبارک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست''

(اخبار۔ صفحہ 215)

اور اس سے ہندوستانی صوفیا کے اس نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے جو میرے نزدیک مشائخ چشت کی برکتوں میں ایک برکت ہے۔

سید صدرالدین کا زمانہ سلطان المشائخ کے بہت بعد کا ہے۔ لودیوں کے عہد میں ملتان میں رہتے تھے۔

بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں تو خواجگان چشت کے طرز عمل کا ذکر کر رہا تھا کہ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں کس قسم کا قرآنی مذاق پیدا کیا تھا اور اس سے استفادہ کے طریقے ان کے یہاں کیا تھے۔ میر خورد نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ کا عام حکم قرآن خوانی کے متعلق یہ بھی تھا کہ

''ایک سیپارہ بہ سکونت حرفاً بعد حرف خواندن بہتر از پانزدہ سیپارہ بسرعت خواندن ست۔''

فرماتے تھے کہ

''درچنیں خواندن نور تلاوت بیش تر باشد اگر چہ دررواں خواندں ہم از نور خالی نبود۔''

خود آخر عمر تک جو اسی (80) سے متجاوز تھی' پوچھنے والے نے جب یہ پوچھا کہ

''شما ہر روز چہ مقدار می خوانید' فرمود یک سیپارہ۔''

ظاہر ہے کہ اس ''ایک سیپارہ'' کے پڑھنے کا وہی مطلب تھا کہ ''بہ سکونت حرفاً بعد حرف خواندن'' کے طریقہ پر حضرت والا کا عمل تھا' تلاوت کے اس طریقہ سے جیسا کہ سلطان المشائخ ہی سے میں نقل کر چکا ہوں کہ ''تالی (قرآن پڑھنے) راہ وصول دیر تر بود۔''

لیکن گو ذکر کے عام طریقہ سے یہ وصول دیر میں ہوتا ہو لیکن واقعہ وہی ہے کہ

''چنداں خوف زوال نبود۔''

اس لیے زوال کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ العیاذ باللہ کسی مسلمان کے دل میں خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدانخواستہ ''غلط بیانی'' کا شبہ پیدا ہو لیکن جس شبہ کی گنجائش اب غیر مسلموں کے قلوب میں بھی اگر سچ پوچھیے تو باقی نہیں رہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عام وزن نسل انسانی پر اتنا پڑ چکا ہے کہ کھلے بندوں بغیر کسی جھجک کے اس کی ہمت کسی میں باقی نہیں رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہہ سکتا ہو کہ خاکم بدہن ''آپ جھوٹ بولتے تھے'' تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے اندر اس شبہ کی گنجائش کہاں سے پا سکتا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن سے استفادہ صرف ایک اسی مقدمہ پر مبنی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ''وصول حق'' کے لیے اس سے زیادہ مختصر' قطعی اور یقینی راہ اور کیا ہو سکتی ہے' دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کے سامنے سب کچھ پیش کر سکتی ہیں لیکن قرآن ہی ایک دولت مسلمانوں کے پاس یقین کی ایسی دولت ہے جس کا مقابلہ نہ یورپ کا فلسفہ کر سکتا ہے اور نہ ہندوستان کا ''اپنشد'' نہ یہاں کے قصاصوں کے خوارق اور عجائب کا وہ طومار' صرف ایک مقدمہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے تھے' اچانک علم و یقین کے ایک ایسے دروازے کو قرآن کی صورت میں کھول دیتا ہے جس کے بعد علم کے سارے دروازے جن میں بہر حال کچھ نہ کچھ شک ہے' بے اعتمادی اور عدم وثوق کے جراثیم ان کی بنیادوں میں بھرے ہوئے ہیں' خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ عقلی تخمینوں کی تاریکیوں سے نکل کر آدمی براہ راست حق تعالیٰ کے علم کی روشنی میں آ جاتا ہے' البتہ اس علم سے استفادہ کے جو مذکورہ بالا طریقے مشائخ چشت میں مروج تھے' ان پر جب آدمی عمل کرنا شروع کرتا ہے اور جو ضابطے

تلاوت قرآن کے ان بزرگوں نے اس ملک میں نافذ کیے تھے جو ان کے نہیں بلکہ سلف ہی سے منقول تھے' جب ان کو اپنا دستور العمل سلوک بناتا ہے تو گو دیر ہی میں سہی لیکن وصول کے نتائج اس کے سامنے اسی زندگی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ سلطان المشائخ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ قرآنی راہ سے وصول کی جو سعادت اس زندگی میں میسر آتی ہے' وہ کیا ہوتی ہے؟ آپ نے اس کا جو جواب دیا تھا ''فوائد الفواد'' میں آپ ہی کے الفاظ میں وہ منقول ہے۔

''فرمود در حالت تلاوت و سماع سعادتے کہ حاصل آید آں بر سہ قسم ست انوار ست احوال ست و آثار ست۔''

ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں تجربے سے تعلق رکھتی ہیں' الفاظ سے ان کی تعبیر مشکل ہے۔ تاہم سلطان المشائخ نے اس کی کچھ تفصیل بھی فرمائی ہے۔ آخری چیز یعنی ''آثار'' کا چونکہ تعلق اسی عالم حس سے ہے یعنی آدمی کے جسم پر آنکھوں پر یہ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں' اس لیے اس کو تو ہم آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ سلطان المشائخ نے فرمایا تھا کہ گویا آثار جہاں سے آتے ہیں' اس کا اصطلاحی نام ''عالم ملک'' ہے لیکن یہ انوار احوال آثار میں سے آخری چیز چونکہ ''جوارح'' یعنی بدن اور اعضاء بدن پر نازل ہوتے ہیں' اس لیے اس کا احساس دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ

''بکائے و حرکتے و جنبشے کہ ظاہر می شود آں را آثار می گویند و آں از عالم ملک ست بر جوارح۔''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سابقہ ضوابط کے تحت جب قرآن آدمی پڑھتا رہتا ہے تو آخر میں پڑھتے پڑھتے اس پر گریہ طاری ہوتا ہے۔ بدن میں حرکت اور جنبش پیدا ہوتی ہے۔ گویا قرآنی آیت

الله انزل احسن الحديث كتابا متشابها مثانى تقشعر منه جلود الذين يخشون ر بهم ثم يلين جلود هم و قلوبهم الى ذكر الله.

''اللہ ہی نے اتاری اچھی بات اس کتاب کی صورت میں نازل فرمایا جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں جو دہرا دہرا کر پڑھی جاتی ہیں۔ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں' ان کی جلدیں کانپنے لگتی ہیں' پھر ان کی جلدیں اور قلوب نرم پڑ جاتے اللہ کی یاد کے لیے۔''

کی کیفیت اس پر شروع ہو جاتی ہے لیکن جوارح کے یہ آثار در اصل باطنی انقلابات کے ثمرات ہوتے ہیں۔ سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عالم ملکوت سے پڑھنے والے کی روح پر انوار [12] کا نزول ہوتا ہے۔ انوار کے بعد عالم جبروت سے قلوب پر احوال نازل ہوتے ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں

''نخست (یعنی تلاوت کے فوائد کا ظہور شروع شروع میں) انوار از ملکوت بر ارواح و بعد ازاں احوال از جبروت بر قلوب' بعد ازاں آثار از ملک بر جوارح۔''

سلطان المشائخ کے مشہور ''محبوب ترک'' حضرت امیر خسرو جنہیں حضرت نے سلوک بالقرآن پر لگا دیا تھا اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا وہ سات پارے روزانہ تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ مجلس مبارک میں حاضر ہوئے' پوچھا گیا۔ ''ترک! حال مشغولیہا چیست؟''

حضرت امیر خسرو نے جواب میں فرمایا

''مخدوما! چندگاہ باشد کہ بوقت آخر شب گریہ مستولی میشود۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 302)

یعنی

اذا سمعوا ما انزل علی الرسول تریٰ اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق

''جب سنتے ہیں وہ چیز جسے اتارا اللہ نے رسولؐ پر تو دیکھتے ہو تم ان کی آنکھوں کو کہ پُر ہیں آنسوؤں سے کیونکہ ''حق'' کو انہوں نے پہچانا۔''

کی حلاوت امیر کو ملنے لگی۔ سلطان المشائخ نے سن کر فرمایا۔

''الحمد للہ اند کے ظاہر شدن گرفت۔''

آیات قرآنی کی تلاوت حرفاً بعد حرف اس طریقہ سے کہ ان کے معانی کو بھی دل پر گذارا جائے۔ اس سلسلہ میں مشائخ چشت کی فہم قرآنی کا کیا انداز تھا' ہم ان کے اس مذاق کا اندازہ مثالوں سے کر سکتے ہیں' میرا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآنی علم کو جو ''عمل'' کی شکل دیتے تھے' اس باب میں ان کا نقطہ نظر کیا تھا اور عمل سے ان کی غرض کیا تھی۔

شیخ کبیر شکر گنجؒ سے سلطان المشائخ راوی ہیں کہ حضرت والا نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ

''فقیر صابر بر غنی شاکر رجحان دارد۔''

یعنی مفلس ہونے کے باوجود جو صابر ہو' اس کو شکر کرنے والے آسودہ حال مسلمان پر ترجیح ہوگی۔ یہ تو دعویٰ تھا' دلیل میں شیخ کبیر نے جو بات پیش کی اسی سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ سلطان المشائخ ہی راوی ہیں کہ شیخ کبیر نے دعویٰ کو پیش کر کے دلیل یہ بیان کی کہ

''زیرا کہ غنی شاکر را بر شکر وعدہ چیست؟''

یعنی دیکھنا یہ چاہیے کہ تونگروں کو شکر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں کس چیز کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت

ولئن شکرتم لا زیدنکم

''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا۔''

تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ ''وعدہ مزید نعمت'' ہے لیکن

''در صبر بشارات چیست؟ نعمت معیت۔''

اور ثبوت میں آیت قرآنی

ان اللہ مع الصابرین

''یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

حاصل یہ ہوا کہ شکر میں تو وہی نعمتیں جو آدمی کو ملتی ہیں' ان ہی کے اضافہ کی بشارت قرآن میں دی گئی ہے لیکن صبر میں تو نعمت ہی نہیں' صاحب نعمت کی رفاقت اور معیت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ شیخ کبیر نے اس کے بعد فرمایا۔

''میان ایں مرتبہ وآں بہ بیں آں فرق از کجا تا کجاست۔''

جس وقت سلطان المشائخ شیخ کبیر کے اس قول کو بیان فرما رہے تھے' حضرت کے ممتاز مریدوں میں سے قاضی محی الدین کاشانی بھی موجود تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ

ھو معکم ایما کنتم

''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔''

اس بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابر وغیر صابر ہر ایک کو معیت حق حاصل ہے۔ پھر صبر کی خصوصیت بیان ہوئی۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صبر میں

''معیت با عنایت است یعنی بحب و برضی۔''

یعنی صرف ''معیت'' ذاتی یا علمی نہیں بلکہ محبوبیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ معیت صابر کو میسر ہوتی ہے اور صابر کو محبوبیت کے اس مقام کا قرآن میں جتنی بار ان **اللہ یحب الصابرین** بیان کرتا ہے قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کو دہرایا گیا ہے یا اسی قسم کی آیتوں سے قرآن کے پڑھنے والوں میں کوئی ناواقف ہے' نص محکم قطعی کے رُو سے صابر محبوب الٰہی بن جاتا ہے۔

بہر حال یہی ایک مثال کافی ہو سکتی ہے کہ قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب بزرگوں کے نزدیک کیا تھا' قرآن پر عمل کرنا چاہیے جو ایک عام بات ہے۔ جس کا چرچا خصوصاً اس زمانہ میں بہت زیادہ ہے کیونکہ مغرب نے آج جو ذہنیت ملک میں پیدا کی ہے' اس میں ایمان یا علم صحیح کی کوئی قیمت نہیں۔ آپ کا علم کچھ ہی کیوں نہ ہو' دس خدا کے آپ قائل ہوں' شرک جیسی بدترین بغاوت کا کوئی مرتکب نہ ہو لیکن اگر اس کی زندگی کا کوئی عملی پہلو اگر اچھا ہو تو اس زمانہ میں اس کے عقائد سے قطع نظر کر کے عمل کی صرف اسی خوبی کی وجہ سے اس کا شمار نیکوکاروں بلکہ بعضوں کے نزدیک تو خدا رسیدوں میں کیا جاتا ہے اور یہ عارضہ اس کا ہے کہ ''الحیوٰۃ الدنیا'' کے بعد ''الحیوٰۃ الاخریٰ'' کے یقین میں ضعف پیدا کیا ہے۔ جو منکر ہیں وہ تو خیر منکر ہی ہیں لیکن بظاہر جو اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں' ان کے نزدیک بھی قیمت صرف ان ہی چیزوں کی ہے جن سے موجودہ زندگی میں کچھ فائدہ ملتا ہو' چونکہ علوم صحیحہ یا اعتقاداتِ حقہ کے نتائج عموماً دوسری زندگی میں ظاہر ہوں گے' اعمال صالحہ کے نتائج یہاں بھی ہویدا ہونے لگتے ہیں' جھگڑا فساد مٹتا ہے' امن حاصل ہوتا ہے' عافیت میسر آتی ہے' اس لیے مذہب کا عملی پہلو اب بھی ان تنگ نظروں کو اپیل کرتا ہے اور یہی راز ہے اس بات کا کہ سارا زور اس زمانہ میں عمل ہی عمل پر دیا جا رہا ہے۔ بربادی وتباہی کے جتنے مراثی خواہ محراب ومنبر پر پڑھے جاتے ہوں یا پنڈال وڈائس پر ہر جگہ عمل کا رونا رویا جاتا ہے' قرآن پر عمل جاتا رہا۔ اس لیے مسلمان تباہ ہو گئے حتیٰ کہ بعض جوشیلوں کا غلو تو اس باب میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یورپ کے ملاحدہ جن کی ساری زندگی جاہلیت کی زندگی ہے' ان کو عموماً عمل بالقرآن کی سند دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان قوموں نے قرآن کو پکڑا' اس لیے آج حکومت وسلطنت کے مزے بھوگ رہے ہیں اور مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا' اس لیے افلاس ونکبت' خواری اور ذلت میں گرفتار ہیں۔

یورپ عامل بالقرآن ہے اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

آنکھیں رکھتے ہوئے جو اندھے بنتے ہوں انہیں کون دکھلا سکتا ہے لیکن دوسری بات کہ مسلمانوں کا چونکہ قرآن پر عمل باقی نہ رہا اس لیے وہ تباہ و برباد ہو گئے اس میں شک نہیں ہے کہ کہنے والے جس معنی میں یہ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن واقع کے لحاظ سے اس کا کون انکار کر سکتا ہے اس لیے میں تو عمل بالقرآن کے عصری مطالبوں کو مانتا ہوں۔

کلمة حق یراد بها الباطل سچی بات ہے لیکن اس سے جو مقصد ہے وہ لا حاصل بے نتیجہ غلط ہے۔ کچھ بھی ہو اتنا ضرور ہے کہ قرآن پر عمل آج مسلمانوں میں نہیں ہو رہا ہے مگر سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن پر عمل کیا کیا جائے قرآن کی حالت تو یہ ہے کہ اسلامی اعمال کے مہمات نماز و روزہ حج و زکوۃ تک کے تفصیلات تو اس میں نہیں پائے جاتے [13] بلکہ قریب قریب سب کی حیثیت عنوان اور باب کی ہے تفصیلات کا علم تو پیغمبر کی زندگی سے حاصل ہو رہا ہے۔

اور جب نماز و روزہ جیسے امہات الاعمال کا قرآن میں یہ حال ہے تو پھر اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرنا چاہیے میں نے ایک دفعہ نہیں بسا اوقات عمل بالقرآن کے مطالبہ کرنے والوں سے پوچھا ہے کہ قرآن پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اس میں نہ زراعت کا طریقہ بتایا گیا ہے نہ صنعت کا نہ حرفت کا ان چیزوں کا اگر ذکر قرآن میں ہے تو بھی تو محض ضمنی طریقہ سے۔ لفظ دو لفظ میں کسی دوسرے مقصد کے ذیل میں ان کا ذکر بھی آ گیا ہے یہ تو ان اعمال کا حال ہوا جن کا تعلق دنیا سے ہے اور دینی اعمال کی کیفیت تو آپ سن ہی چکے کہ قریب قریب ان میں اکثر کے عنوانوں کا ذکر ہے تفصیل جیسی کہ چاہیے وہ ان کی بھی نہیں۔ اگر صرف قرآن ہی کو پیش نظر رکھ کر کوئی نماز کے اجزاء کو مرتب کرنا چاہے تو اس میں شک نہیں کہ قیام رکوع سجود یہ مختلف اجزاء تو قرآن میں مل جائیں گے لیکن ان میں کس جز کو مقدم رکھا جائے کن کو موخر کیا جائے قرآن سے اس کا فیصلہ کیا ممکن ہے؟ جب تک کہ پیغمبر کی زندگی سے ہم اس کو نہ سمجھیں۔ پھر عمل بالقرآن کا کیا مطلب؟ میں نے تو نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کا کوئی معقول جواب دیا ہو۔

لیکن شیخ کبیر نے قرآن کی دو آیتوں "لئن شکرتم لازیدنکم" "ان الله مع الصابرین" کو جس طرح سمجھایا ہے اور عمل سے ان دونوں کا جو تعلق دکھایا ہے اگر آپ اس طرح قرآن کو پڑھنا شروع کریں اور اپنے دیدہ کو نادیدہ اپنے شنیدہ کو ناشنیدہ بنا کر قرآن سے پھر علم لینا شروع کر دیں یعنی آپ سارے دیدوں اور شنیدوں کو باہر نکال کر ان ہی قرآنی علوم کو اپنی فطرت کی گہرائیوں میں یقین و اذعان کی بنیادوں پر جمانا شروع کر دیں صبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے جو مواعید ہیں توکل پر جن ثمرات کی بشارتیں سنائی گئی ہیں ذات حق کے ساتھ آپ کا تعلق تقویٰ کا جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات و آثار قرآن نے جو بیان کیے ہیں اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر آپ قرآنی آیات کو سکون کے ساتھ حرفاً بعد حرفٍ پڑھنا شروع کیجیے تو یقین مانیے کہ ہر آیت آپ کو عمل کے لیے ایک نیا اور جدید علم دے گی لیکن جو کچھ آنکھوں سے کانوں سے خود دیکھا یا سنا ہے یا آپ ہی جیسے کسی آدمی نے دیکھ سن کر جو ناقص معلومات اپنے اندر جمع کیے ہیں ان دیدوں اور شنیدوں کو دیدہ اور شنیدہ ہی باقی رکھتے ہوئے آپ قرآن سے اگر کچھ لینا چاہیں گے تو یقین مانیے کہ آپ کو کچھ نہ ملے گا اور

اس زمانہ کی محرومیوں کے نیچے دراصل تنگ نظری دماغی انحطاط کا یہی زہر چھپا ہوا ہے وہ پیغمبر کے پاس آتے ہیں۔ عقل و حس کے سوا ان کے ذریعہ سے کچھ جدید معلومات حاصل ہوں گے لیکن جب پیغمبر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے کہ عالم محسوس کے پیچھے غیب کے عوالم ہیں ان عوالم کو ملائکہ میں جنات ہیں حوریں ہیں قصور ہیں نار ہے نور ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں تو ہمیں پہلے سے معلوم نہ تھیں میری آنکھوں نے تو ان کو نہیں دیکھا ہے پھر ان کو میں کیسے مان لوں۔ آپ ہی غور کیجیے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ آپ کو پہلے سے معلوم ہے اس عمل پر آپ بال برابر اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی دماغی پستی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو کہ جو کچھ پہلے سے اسے معلوم ہے اس پر اضافہ کے نام سے کان میں انگلیاں ٹھونستا ہو چیختا ہو چلاتا ہو کیا اس کو اس جدید علم کی راہ سے کچھ بھی مل سکتا ہے ان مسکینوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب تمہارا یہی حال ہے کہ حس وعقل کے حدود کے آگے قدم رکھنے سے تمہارے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے تو آپ پیغمبر کے پاس تشریف ہی کیوں لاتے تھے حسی اور عقلی معلومات کے لیے تو آپ کے پاس پیغام پہنچانے کے لیے آپ کے حواس آپ کی عقل موجود ہی تھی۔ پیغمبر کی پیغمبر کے جدید ذریعہ علم وحی ونبوت کی ضرورت تو ہوتی ہے اس لیے ہی کہ حواس وعقل جہاں جواب دے دیتے ہیں۔ وہاں سے علم کی ایک نئی راہ ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ قدرت نے کھولی ہے لیکن حواس عقل کی راہ سے جو کچھ جانا جا چکا ہے اب مزید جاننے سے جو گھبراتا ہے بھاگتا ہے آپ خود بتائیے کہ خدا کا کلام اسے کیا دے گا۔ بہر حال اب دنیا جس طرح چاہے قرآن کو استعمال کرے لیکن ہندوستان کے جس عہد کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندی مسلمانوں کو قرآن سے استفادہ کا جو طریقہ بتایا گیا تھا اس کی ایک معمولی مثال شیخ کبیر شکر گنج کی فرمودہ وہ مثال تھی۔ کتابوں میں ان بزرگوں کے جو اقوال اس سلسلہ میں بکھرے ہوئے ہیں اگر ان کو کوئی جمع کرے تو وہ اچھی خاصی ایک کتاب بن سکتی ہے ظاہر ہے کہ میرے لیے یہاں ان سب کے ذکر کی کیا گنجائش ہے تاہم خواہ بزرگ اجمیری کے ایک سلسلہ یعنی قطبی سلسلہ کے بزرگ کا جب نقطہ نظر آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے تو جی نہیں مانتا کہ طریقہ چشتیہ کی دوسری شاخ حمیدیہ جس کے متعلق گذر چکا کہ صدیوں تک "مدارک" کا درس طریقہ سلوک کے ایک حزب کی حیثیت سے ان میں جاری تھا۔ اس سلسلہ کے ذوق قرآنی کا بھی ایک نمونہ تو کم از کم پیش کر ہی دوں شیخ محدث نے "اخبار الاخیار" میں شیخ حمید الدین کے ترجمہ میں ان کے بعض مکتوبات نقل کیے ہیں ان ہی میں قرآنی آیات کی چند تفسیروں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز قرآن کی مشہور آیت

الذین اصطفینا من عبادنا منهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات باذن الله

"اپنے بندوں سے جن لوگوں کو ہم نے چنا ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اپنے نفس کے لیے ظالم ہیں کچھ میانہ رو ہیں کچھ ان میں نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اللہ کے فرمان کے تحت۔"

کے متعلق ایک ملحظ پیش کیا ہے۔ تفسیروں میں اس آیت کے مطلب میں لوگوں نے کیا فرمایا ہے اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں بلکہ شیخ حمید الدین نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے صرف اس کا خلاصہ پیش کرنا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا

آیت میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ **ظالم لنفسہ** (اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنے والا) **مقتصد** (میانہ رو) **سابق بالخیرات** (نیکیوں کے ساتھ آگے بڑھنے والا۔)

سوال ہوتا ہے کہ یہ تینوں قسمیں کیا ایسی ہیں جن میں مومن غیر مومن سب ہی شریک ہیں یا اہل ایمان ہی کے اندر یہ تیس طبقات پائے جاتے ہیں۔ شیخ ناگوری نے اس قرینہ سے کہ ذکر ان لوگوں کا ہے جو ''چنے'' گئے یعنی ''اصطفینا من عبادنا'' (ہم نے اپنے بندوں سے جنہیں چن لیا ہے) ان ہی کی یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ اس لیے غیر مومن عباد ان قسموں کے نیچے داخل نہیں ہو سکتے۔ شیخ نے اس کے بعد اہل ایمان کے ان تینوں طبقوں کی تعبیر اپنے الفاظ میں معذوران' مشکوران' فانیان سے کی ہے۔ گویا ظالم لنفسہ والے ان کے خیال میں ''معذوراں اند'' کے نیچے داخل ہیں' یہ معذوران کون لوگ ہیں:

''آنہا کہ بعد ایمان باللہ واقرار ہم بالتوحید بحضرت حاضر نیائند' دیر آئند و آہستہ آئند واز خطاب سارعوا (تیزی دکھاؤ تعمیل احکام میں) غافل باشد۔''

گویا ان لوگوں نے اپنے ان فرائض کو جو ان کے نفوس پر عائد ہوتے تھے' ان میں ظلم کا ارتکاب کیا۔ ان حقوق کی ادائیگی میں کمی کی' اس لیے وہ ظالم لنفسہ ٹھہرے۔

مشکوران یعنی مقتصد کون لوگ ہیں: ''بایمان ہم عنان آئند و باقرار ہم رکاب۔''

مقتصد (میانہ رو) کا مطلب شیخ کے نزدیک یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے مانا تھا' جن باتوں کا اقرار کیا تھا' ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آرہے ہیں اور یہ ہوا اقتصاد و ہمعنانی کا مطلب۔

فانیان یعنی سابق بالخیرات کون لوگ ہیں' شیخ نے لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی فطرت میں ''الست بربکم'' کے سوال کا جواب ''بلیٰ'' (کیوں نہیں) دب کر اپنے آثار کو کھو نہیں چکا ہے بلکہ اس کا شعور ان میں باقی تھا' اس لیے

''دریں جہاں پیش از دعوت بحکم خطاب ازل وجواب لم یزلی' اجابت کردہ۔''

شیخ نے اس قسم کے تمام واقعات یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت علی مرتضیٰؓ وغیرہم اصحاب سے جو یہ مروی ہے' کہ بغیر کسی تذبذب کے آنحضرتؐ کی دعوت سننے کے ساتھ ہی ایمان لے آئے یا اویس قرنیؓ نے بے دیکھے پیغمبر کو مان لیا یا سلمان فارسیؓ کو تلاش حق میں اس ملک سے اُس ملک' اس راہب سے اُس راہب کے پاس پھرے پھرتے تھے' تا اینکہ مدینہ منورہ پہنچے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔

شیخ نے ان تمام بزرگوں کے ابتداء اسلام کے قصوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے' جس سے ان کی اس وسعت نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے' جو معرفۃ الصحابہ کے فن میں انہیں حاصل تھی لیکن میرا مقصود اس وقت صرف خواجگانِ چشت کے قرآنی ذوق کا ایک دوسرا نمونہ پیش کرنا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شیخ نے جو مطلب آیت کا بیان کیا ہے' اس کی طرف دوسری تفسیروں میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے لیکن جس خوبی کے ساتھ انہوں نے اہل ایمان کے تینوں طبقوں پر ان تینوں لفظوں کو منطبق کیا ہے' کم از کم میرے علم کی حد تک اتنی اچھی ستھری سلجھی ہوئی بات کسی اور تفسیر میں نہیں گذری ہے۔ (14)

اور یہ تھا اس زمانہ میں قرآن کی تلاوت کا طریقہ جسے ہندوستان میں بزرگان چشت نے جاری کیا تھا' ان ہی بزرگوں نے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ڈھول سارنگی' ستار کے سوا اس ملک میں وہ اور کچھ نہیں لائے۔

گفتگو دراصل اس میں ہو رہی تھی کہ حضرت سلطان المشائخ کو شیخ کبیر شکر گنج ؒ نے قرآن کے حفظ کی وصیت فرمائی۔ اسی سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود تھا' یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حفظ سے ان بزرگوں کی غرض صرف الفاظ قرآنی کا یاد کر لینا تھی۔ اسی لیے مناسب معلوم ہوا کہ مشائخ چشت میں تلاوت قرآن اور تدبر قرآن کا جو طریقہ تھا' اس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ اب میں پھر اسی مضمون کی طرف واپس ہوتا ہوں' مطلب یہ ہے کہ یہ تو شیخ کبیر کی وصیت تھی۔

وصیت کی تعمیل

میں نے عرض کیا تھا کہ 669 ہجری 25 جمادی الاولی نماز جمعہ کے بعد شیخ کبیر نے سلطان المشائخ کو حفظ بالقرآن اور ''ہندگیری'' کی مہم کی خدمت سپرد کی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ خوش قسمتی سے اس سلسلہ کی بعض چیزیں میر خورد صاحب ''سیر الاولیا'' کے ذریعہ سے ایسی مل گئی ہیں جو سلطان المشائخ کی خودنوشتہ یادداشت سے ماخوذ ہیں' جمادی الاولی کا مہینہ تو گویا گذر ہی چکا تھا' دو مہینے بعد یعنی جمادی الثانیہ اور رجب کے بعد پہلی شعبان کو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی خدمت میں میری طرف سے دعا کی یہ درخواست پیش ہوئی' میر خورد نے ان ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

''از برائے آں کہ کاتب در بدر خلق نہ گردد۔'' (صفحہ 123)

عجب درخواست! مہم اتنی بڑی سپرد کی گئی ہے کہ سارے ہندوستان پر قبضہ کرنا پڑے گا اور شرط یہ لگائی جاتی ہے کہ کسی مخلوق کے دروازے پر مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ آج اس کا تصور کون کر سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس مہم میں مشغول ہونے کے بعد سلطان المشائخ کے لیے اس کا موقع تو کہاں تھا کہ اب کسی کی وہ ملازمت کرتے' ملازمت کی آمدنی ہو یا کسی اور ذریعہ کی انفرادی آمدنی' کھلی ہوئی بات ہے کہ اتنی بڑی ہم خدمت کی سرانجامی کے لیے جسے بعد کو سلطان المشائخ نے انجام بھی دی' اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی لیکن چندوں کا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سلطان المشائخ اس کو بھی برداشت کرنا نہیں چاہتے' سب کچھ ہو جائے اور کسی مخلوق کے دروازے پر پھٹکنا بھی نہ پڑے' یہی ان کی درخواست تھی۔ فرماتے ہیں کہ شیخ نے درخواست قبول فرمائی۔

''باجابت وفاتحہ مقرون فرمود۔''

''فاتحہ'' یہ اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب کوئی کسی کے لیے دعا کرتا تھا تو سورۃ فاتحہ پڑھ کر دعا کی جاتی تھی' اسی بنیاد پر محاورہ ہو گیا تھا کہ کسی دوسرے سے جب کوئی دعا کی درخواست کرتا تو یہی کہتا کہ ''برائے من فاتحہ بخوانید۔''

بہرحال یہ تو اس دن کا قصہ ہوا۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ایک خاص موقع پر شیخ کبیر نے یہ بھی فرمایا کہ

''من از خدا خواستہ ام کہ ہر چہ از خدائے بخواہی بیابی۔''

اور اپنی عصا بھی ان کے حوالہ کی' سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شیخ کبیر حجرہ میں چلے گئے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

''درحجرہ سر برہنہ کردہ وبشرہ متغیر کردہ می گشت۔''

یعنی سر سے ٹوپی اتار کر شیخ کبیر حجرہ میں ٹہل رہے تھے۔ چہرہ متغیر تھا۔ فرماتے ہیں کہ اسی خاص حال میں سن رہا تھا کہ ایک خاص کیفیت کے ساتھ شیخ کبیر کی زبانِ مبارک پر یہ اشعار جاری ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے توزیم — خاکے شوم و بزیر پائے توزیم
مقصود من خستہ زکونین توئی — از بہر تو میرم از برائے توزیم

گویا آیت قرآنی

ان صلوتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین

''میری نماز (عبادت) میری قربانیاں' میری زندگی' میری موت اسی اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

کا ترجمہ ہو رہا تھا۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب یہ اشعار ختم ہو گئے تو شیخ کبیر

''سر بسجدہ نہاد چند کرت (بار) من مثل این دیدم۔''

جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کسی کے قدموں پر بار بار شیخ کبیر سر رکھتے تھے اور اٹھاتے تھے' یہ کیا ہو رہا تھا' کیا اس کے لیے جس نے دعا کرائی تھی کہ ''دربدر خلق نہ گردد' اسی کو دربدر گردی کی جھنجھٹوں سے نجات کی تدبیر بتائی جا رہی تھی؟

''سیر الاولیاء'' ہی میں دوسری جگہ سلطان المشائخ کے خلیفہ اعظم حضرت چراغ دہلیؒ کے حوالہ سے شیخ کبیر کے ایک قول کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کبیر کے مشہور وابستوں میں شیخ جمال الدین ہانسوی تھے۔ انہوں نے کسی شخص کے ذریعہ سے شیخ کبیر کو کہلا بھیجا تھا کہ آج کل ذرا تکلیف اور ضیق میں گذرتی ہے۔ شیخ کبیر نے جواب میں کہلا بھیجا تھا

''چوں ولایت بکسے دادہ شود اورا واجب سل استمالت آں ولایت۔'' (صفحہ 180)

جس کا ظاہر مطلب تو یہ تھا کہ آدمی کو جہاں کی حکومت ملتی ہے' چاہیے کہ اس ملک کے باشندوں کی دلدہی کرے اور ان کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے۔

چراغ دہلیؒ سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو دنیا کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ ہے تو کیا دین کے بادشاہوں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ شیخ کبیر کے اس فقرہ کا جو واقعی مطلب تھا' چراغ دہلیؒ نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

''استمالت ملوک آخرت توجہ القلب الی اللہ من کل الوجوہ۔''

یعنی آخرت کے بادشاہوں کو بھی ''استمالت'' سے کام لینا پڑتا ہے لیکن وہاں کے باشندوں کے قلوب کو نہیں بلکہ قلوب جس کی دانگلیوں کے درمیان ہیں' ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگانا یہ ہے آخرت کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ۔

قرآن کا تاریخی بیان ہے کہ

ما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیه انه لا الا انا فاعبدون (سورۃ الانبیاء)

''نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی کی اس رسول کی طرف اس بات کی نہیں ہے کوئی ''الہ'' مگر میں تو مجھی کو پوجے چلے جاؤ۔''

خاتم الرسل اور خاتم الرسل سے پہلے جو بھی آخرت کی بادشاہت کا پیغام لے کر آئے یہی کہتے آئے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جسے ''الہ'' بنایا جائے۔ من کل الوجوہ قلب کی ساری توجہات کا' ساری آرزوؤں کا' ساری تمناؤں کا مرجع خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات مبارک ہی ہے۔ اپنی ''ہندگیری'' کی مہم میں سلطان المشائخ نے دراصل اسی قوت کی درخواست تھی' شیخ کبیر اپنے طرز عمل سے بھی بتارہے تھے کہ اس قوت سے کام لینے اور استفادہ کا کیا طریقہ ہے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں نے شیخ کبیر شکر گنج'' کو دیکھا کہ بار بار وہ سجدے میں سر رکھتے ہیں اور اٹھاتے ہیں' ان پر ایک خاص حال طاری ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور بے اختیار مضطربانہ حجرہ میں داخل ہو گیا اور حضرت کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ ایک عجب جلال کا عالم تھا۔ اس وقت فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کی دعا کی اس وقت درخواست کی تھی' فرمایا ''استقامت خواستم۔''

لا الہ الا اللہ پر استقامت ہی کا وہ نشہ تھا جو شیخ کبیر کی صحبت نے سلطان المشائخ میں بھرا تھا۔ ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دلّی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے الہ پر اجمائے بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہے جس کی زبان کی معمولی حرکت سے لوگوں کے تن سے سر جدا کر رہی ہے' وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے' مناصب بٹ رہے ہیں' روپے لٹائے جا رہے ہیں' گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں' سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں' آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دلّی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے' کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی اور صدر جہانی کے خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا تھا' سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی۔ قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہ کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے۔

''ایمان کسے تمام نہ شود تا ہم خلق درنزد یکی او ہم چو پشک نماید۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 551)

مجلس مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لیے ساری ساری رات نمازیں پڑھتا تھا' اپنی ان ہی نمازوں کو نگاہ خلق میں حصول عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ

''دریں میان خواجہ ذکر اللہ بالخیر چشم پر آب کردو بر لفظ مبارک راند کہ بسوز اول شیخ الاسلامی را و پس خانقاہ را بعد ازاں خود را۔'' (فوائد الفواد۔ صفحہ 23)

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ کو جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے۔ پہلے بداؤں پہنچے' والدہ اور ہمشیرہ گھر میں اور جو لوگ تھے' سب کو ساتھ لے کر جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی' اسی کے پایہ تخت میں پہنچ گئے۔ دلّی میں جب آپ شروع شروع قیام کے ارادے سے پہنچے ہیں اور اس ارادے سے کہ سب کچھ ہوگا لیکن کسی مخلوق کے دروازے پر جانا نہ پڑے' آخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ

ام حسبتم ان تدخلو الجنة و لمايا تكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم الباساء والضرّاء وزلزلوا حتى يقول الرسول والذين امنوا معه متي نصر الله؟

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور تم سے پہلے جو گذرے ہیں ان جیسی باتیں تم پر نہ آئیں گی' ان کو سختی اور دکھ نے چھوا' وہ جھنجھوڑے گئے' خوب اچھی طرح جھنجوڑ کے ساتھ تاآینکہ بول اٹھے پیغمبر اور ایمان والوں میں جو ان کے ساتھ تھے' کب اللہ کی مدد ہو۔''

تفصیلات دیکھنا ہو تو ''سیر الاولیاء'' میں دیکھیے جس میں میر خورد نے براہ راست اپنے والد میر مبارک کرمانی کے حوالہ سے اس زلزال شدید (سخت جھنجھوڑ) کے ان تفصیلات کو نقل کیا ہے' جن سے حضرت سلطان جیؒ کو گذرنا پڑا' خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء دلّی میں ''سرائے نمک'' کے نام سے کوئی سرا تھی' وہاں کچھ دن ٹھہرے' پھر امیر خسرو کی کوشش سے ان کا ناٹہیالی مکان جو راوت (16) عرض کے مکان سے مشہور تھا' یہاں قیام رہا۔ یہ مکان آرام بخش تھا۔ میر خورد نے لکھا ہے کہ ''سہ پوشش داشت''' یعنی سہ منزلہ مکان تھا۔ درمیانی منزل میں سلطان المشائخ کا قیام تھا' باقی اوپر اور نیچے والے حصہ میں آپ کے وابستگان میں سے کچھ لوگ رہتے تھے' جن میں میر خورد کے والد کا خاندان بھی تھا لیکن کچھ ہی دن بعد راوت عرض کے لڑکے اضلاع سے آگئے اور انہوں نے شبا شب مکان خالی کرالیا۔

لکھا ہے کہ سراج بقال کی دکان کے پاس کوئی مسجد تھی' اسی مسجد میں کوئی علیحدہ چھپر دار تھا۔ غالباً سائبان ہوگا' وہاں رہنا پڑا۔ وہاں سے اٹھے تو رکابدار کی سرائے میں کچھ دن قیام رہا۔ پھر کوئی محمد میوہ فروش کی دکانوں سے متصل کوئی شخص شادی گلابی کا مکان تھا' وہاں رہے۔ الغرض یونہی آج تک یہاں ہیں' کل وہاں ہیں۔ دلّی میں قیام کی صورت نہ تھی (17) لیکن بایں ہمہ پراگندہ خاطری' سلطان المشائخ کس مشغلہ میں مصروف تھے۔ میر خورد نے لکھا ہے

''دراں ایام اتفاق ماندن در شہر نہ بود۔''

پھر کہاں رہتے تھے۔ ''سیر الاولیاء'' اور ''فوائد الفواد'' دونوں ہی میں آپ کا بیان ہے کہ

''بر سر حوض قتلغ خاں بودم۔''

شہر سے باہر قتلغ خاں کا کوئی تالاب تھا' اسی تالاب کے کنارے زیادہ وقت گذرتا تھا۔ کس چیز میں گذرتا تھا' خود فرماتے ہیں۔

''دراں ایام قرآن یاد می گرفتم۔'' (صفحہ 110)

یعنی سب کچھ گذر رہا تھا لیکن شیخ کبیر کی وصیت کی تکمیل کی دھن تھی جو الہ آپ کو دیا گیا تھا' من کل الوجوہ قلب کو اسی سے متعلق کرنے میں ''یقین'' کے اس نسخہ سے زیادہ مقوی نسخہ اور کیا ہو سکتا تھا اور سچ پوچھیے تو گو اپنی جامعیت کے لحاظ

سے قرآن میں وہ سب کچھ ہے۔جس کی تشریحی شکل کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے' بار بار قرآن میں جن چیزوں کو دہرا دہرا کر بیان کیا گیا ہے' ان میں سب سے زیادہ نمایاں یہی دو مقدمات ہیں۔

(1) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کے دعوے میں سچے ہیں۔

(2) اور دوسری بات یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہی ایاک نعبد (ہم تجھی کو پوجتے ہیں) وایاک نستعین (تیری ہی اعانت ہم چاہتے ہیں) وہی معبود وہی ہر حاجت اور ہر ضرورت کا مستعان ہے۔

پہلے مقدمہ پر یقین اور وثوق کی بنیاد قائم ہے اور اس بنیاد پر جس علم کو بنی آدم کے لیے قدرت سب سے زیادہ یقینی قرار دینا چاہتی ہے' وہ یہی ہے کہ ہمارا الٰہ ہمارا معبود و مستعان اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ساری ضرورتوں' ساری حاجتوں کا واحد مستعان کسی مخلوق کی ذات نہیں بلکہ خالق تعالیٰ جل مجدہ ہی کی ذات بے ہمتا ہے تو اس کو چھوڑ کر جو اپنی حاجتوں کے لیے جہاں بھی جاتا ہے' قدرت کے قانون سے ٹکرا کر جا رہا ہے۔ قدرتی قوانین سے ہٹنا اور ٹکرانا اسی کا نام تو ظلم ہے' مقررہ حد سے تجاوز ہے' یہی مطلب ہے تسبیح یونسی

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین

''یعنی الٰہ آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا' آپ کی الوہیت میں کوئی دوسرا شریک ہو' اس سے آپ کی ذات پاک ہے تو میں ہی ظالم تھا کہ جو الٰہ تھا اس کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا جو الٰہ نہ تھے۔''

کا' اف جن دلوں کو اپنے حقیقی الٰہ یعنی اپنی حاجتوں' ضرورتوں اپنے رجحانات و میلانات سب کا مرجع حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی نظر آتی ہے' آپ کے سارے فطری مطالبات کی تکمیل کا سرچشمہ صرف اسی علی کل شئی قدیر کی قوت بن جاتا ہے' ایسے قلوب میں طلب حق کی جو آگ بھڑکتی ہے بقول سلطان المشائخ

''بایں آتش جمیع اخلاق رذیلہ و ذمیمہ سوختہ می شود و صفا پیدا آید و شایان محبت حق گردد۔'' (سیر۔ صفحہ 46)

اسی لیے مشائخ چشت کو آپ جو پاتے ہیں کہ اخلاق اور اس کے اقسام رذائل و فضائل مہلکات و منجیات اور ازیں قبیل تصوف کے دوسرے مسائل پر انہوں نے کتابیں لکھی ہی نہیں [18] یا لکھی ہیں تو مختصر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بات کو طول دینے کی انہوں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ''الٰہ'' کے لفظ کو سمجھانا یعنی جیسا کہ مولانا روم نے سیبویہ کے حوالہ سے الٰہ کے معنی

یولھون فی حوائجھم الیہ

یعنی ''الٰہ'' اس کو کہتے ہیں جس کی طرف انتہائی ولہ اور وارفتگی کے ساتھ لوگ اپنی حاجتوں میں رجوع کریں۔''

نقل فرمایا ہے' بس اسی کا تحقق اسی کی یافت کہ حاجتوں میں جس کی طرف گڑگڑا کر بلبلا کر آدمی ٹوٹ پڑے وہ ارحم الراحمین رب ودود رحیم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جس نے اس کو پالیا' سب کچھ پالیا' اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ چشتیہ طریقہ کی بنیاد ولہ اور

عشق پر مبنی ہے گویا ع

سو علاجوں میں یہ ایک علاج اچھا ہے

بہر حال دلّی میں سلطان المشائخ کی گذر رہی ہے، قرآن ہے، قتلغ خان کا تالاب ہے اور وہ ہیں، آئندہ کیا ہوگا۔ ''ہندگیری'' کی مہم سر کرنے کے اسباب کیا پیدا ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز ایک الٰہی تدبیر کے اور کسی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زلزال شدیدکا یہ زمانہ مہینوں اور دنوں کا تھا۔ ''سیر الاولیاء'' سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال اس حال میں گذر گئے اور وہ گذارتے رہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان دنوں میں ان پر کیسی کیسی سخت گھڑیاں گذر گئیں۔ میر خورد نے آپ ہی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے

''کہ در عہد غیاثی (غیاث الدین بلبن) کہ دراں وقت در دو جیتل (19) منے خربزہ بود، لیکن بیش تر از فصل گذشتہ بود کہ من خربزہ نہ چشیدہ بودم۔''

اور خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ سننے کی بات تو آگے کی ہے۔

''براں خوش می بودم و آرزوی بردم کہ اگر باقی فصل ہم خربزہ خوردنہ شود نیکو باشد۔'' (صفحہ 113)

اور جب ''ہر انچہ ساقی من ریخت'' میں کسی کو لطف آجاتا ہے تو پھر اس کا یہی حال ہوتا ہے، توحید کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں جن سے موحد لذت گیر ہوتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلدوز جگر خراش وہ واقعہ ہے جو آپ ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج ہے کہ

''فرمودہ، یک شبا روز گذشتہ بود و شب دیگر آمدہ نصفے ہم گذشتہ کہ چیزے نخوردہ بودم۔'' (صفحہ 113)

اور یہ ارزانی کے کس زمانہ کی بات ہے، خربزوں کا حال تو سن چکے کہ دو جیتل میں ایک من کے حساب سے دلّی میں بک رہے تھے، اب جو ایک دن ایک رات اور پھر دوسرے دن کی بھی آدھی رات اس شان سے گذری کہ ''چیزے نخوردہ بودم'' اس وقت کی ارزانی یہ تھی کہ

''دراں ایام بہ یک جیتل دو سیر نان میدہ می وادند۔''(20)

جس کے معنی یہ ہوئے کہ پکی پکائی گیہوں کی دو سیر میدہ کی روٹی ایک دمڑی میں ملتی تھی لیکن اس ارزانی کے باوجود جو ''الباساء'' ''والضراء'' کی کسوٹی پر جو پرکھا جا رہا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ

''مرا یک دانگ ہم نہ بودے تا نان ہم بخورم۔''

اور خود یہ کیفیت اکیلے تنہا آپ ہی کی ذات پر نہیں گذر رہی تھی، بلکہ خود فرماتے ہیں۔

''ووالدہ و ہمشیرہ من و دیگر آدمیاں خانہ کی در مونت من بودند ایشاں را ہم ہمیں حال بود۔'' (صفحہ 112)

اور ظاہر ہے جیسا کہ سلطان المشائخ سے ہی ''سیر الاولیاء'' میں ان کا یہ قول منقول ہے کہ درویشوں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے یعنی

''ہر دری معنوی کہ ظاہر خود را بطریق مشغولاں حق می نمائند و باطن در بدری گردد۔''

قلب کی اس کیفیت کے متعلق جس کا خیال ہو۔

''نعوذ باللہ کہ کسے راایں معاملہ باشد۔''

کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی دوسرا خیال قائم کرسکتا ہے۔ بلکہ جہاں تک واقعات وحالات سے معلوم ہوتا ہے' یہ ''عہد زلزالی'' عام اوراد ووظائف کے ساتھ ساتھ زیادہ تر شیخ کبیر شکر گنج'' کی وصیت کی تکمیل ہی میں گذرتا تھا' غالباً یہ اشتغال بالقرآن ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ پر یہ حال طاری ہوگیا تھا جس کا ذکر بعد کو فرمایا کرتے تھے کہ

''درمبدء حال باخود جزم کردہ بودم کہ نہ کتاب بنویسانم ونہ بہ بہا (قیمت) بستانم۔'' (سیر صفحہ 145)

گویا قرآن کے سوا نہ کچھ پڑھنا چاہتے تھے نہ کسی سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ شیخ نے یہی کتاب حوالہ کی تھی' اسی کو پی رہے تھے' پیتے جارہے تھے۔ بالآخر پیغمبر کے اس نسخہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا یعنی حدیث میں جو آیا ہے' حدیث قدسی ہے' ترمذی اور دارمی اس کے راوی ہیں۔

من شغلہ القرآن عن ذکری و مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین

''القرآن'' میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر کسی کو ذکر یا دعا کا موقع نہ مل سکے تو میں اس کو دعا کرنے والوں اور مانگنے والوں سے (بے مانگے ہی) بہت زیادہ کردیتا ہوں۔''

سلطان المشائخ نے اس حدیث کا ایسا زندہ تجربہ پیش کیا ہے کہ جس کے چرچوں سے چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں' آج بھی ان کے دسترخوان کا تذکرہ لذت بخش کام ودہن بنا ہوا ہے اور ایک دسترخوان کیا پھر خدا نے ان کو جس جاہ وجلال کے ساتھ اسی دلی میں رکھا' سب جانتے ہیں کہ سلاطین وقت کو بھی اس پر رشک آتا تھا جس کی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے اور جس مقصد سے میں نے ان کے حالات کے تذکرہ میں ایک خاص قسم کی تفصیل سے کام لیا ہے' اس مقصد کے رو سے نہ اس کی ضرورت ہے۔

بہرحال یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ حفظ بالقرآن کی وصیت کی تکمیل کا موقع آپ کو کتنے دنوں میں میسر آیا' تاہم اس کے تو بیسیوں قرائن ہیں کہ آپ نے کامل قرآن اسی عمر میں زبانی یاد کرلیا۔ ''فوائد الفواد'' میں بچپن کے استاد جن کی فیض بخشی مشہور تھی' ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

''بہ برکت آں قرآں یاد شد۔'' (صفحہ 154)

اگرچہ اس کے بعد آپ کا وہ ارادہ کہ نہ کوئی کتاب لکھواؤں گا اور نہ خریدوں گا باقی نہ رہا اور نہ اس کو رہنا چاہیے تھا کہ وہ بہرحال ایک کیفیت تھی جو آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ سلطان المشائخ کا ادبی مذاق فارسی زبان کا طبعی تھا۔ اس لیے علاوہ دینی کتابوں کے کبھی کبھی ادبی کتابیں بھی دوسروں سے سنا کرتے تھے اور امیر خسرو کی شاعری کے پیچھے تو سچ پوچھیے سلطان المشائخ ہی کی شعریت چھپی ہوئی ہے۔ جس کا ظہور ان کے ''ترک [21] اللہ'' کے ذریعہ سے ہوا' امیر خورد نے لکھا ہے۔

''امیر خسرو درایام آغاز شعر گفتن بود ہر نظمے کہ گفتے بخدمت سلطان المشائخ گذرانیدے تاروزے حضرت سلطان المشائخ فرمود بہ طرز صفاہانیاں بگوی۔''

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں امیر نے ایسی شاعری شروع کی جس میں حقیقت کا اظہار مجاز کے پردہ میں کیا گیا ہے' یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے

''دیوان مبتدا و منتہی برابر قاضی معزالدین پانچہ پدر مولانا رفیع الدین پانچہ بخدمت سلطان المشائخ بتمام گذرانید و رموز اشارات آں را تحقیق کرد۔'' (صفحہ 301)

واقعہ یہ ہے کہ سلطان جی سے اگر ہندوستان کو اور کچھ نہ ملتا' صرف امیر خسرو ہی ملتے تو اس ملک کی سپاس گذاری اور منت شناسی کے لیے یہی کافی تھا لیکن باوجود ان مشاغل کے بھی قرآن سے جو آپ کا تعلق تھا' اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ آپ جب کبھی حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر کے متعلق اس مشہور قصہ کا ذکر فرماتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو جن سے بے تعلق ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ اٹھا کر چاہا کہ مطالعہ کریں' غیب سے آواز آئی ''ابوسعید عہد نامہ بازدہ۔'' حضرت سلطان المشائخ اس قصہ کا ذکر فرماتے۔ علا سجزی راوی ہیں کہ

چوں بریں حرف رسید بگریست و ایں دو مصرعہ برزبان مبارک راند۔

جائے کہ خیال دوست زحمت باشد تو سایہ دشمنی کجا در گنجی

(فوائد۔ صفحہ 91)

قرآنی ذوق کا یہ حال تھا' کسی طرف سے ذرا خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی آواز آئی۔ رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ بقول امیر خسرو۔

''از شنیداں آں حالے و ذوقے و شوقے پیدا شد۔'' (صفحہ 276)

اسی طرح آپ کے دست گرفتوں میں جن لوگوں کی موزوں طبیعتیں تھیں' آپ شعر گوئی سے ان کو منع تو نہیں فرماتے بلکہ آپ دیکھ چکے کہ امیر خسرو کی شاعری کو تو آپ ہی نے راہ پر لگا دیا' خود ان کے دواوین کو سنا' اصلاح اور مشورے دیئے لیکن اسی کے ساتھ اس کی کوشش فرماتے تھے کہ شاعری کا ذوق قرآنی ذوق پر جو طریقہ چشت کی خصوصیت خاصہ ہے' اس پر غالب نہ آئے۔ حسن علاء سجزی نے ''فوائد الفواد'' میں لکھا ہے کہ

''بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید۔'' (صفحہ 249)

پھر اپنی حالت عرض کی۔ میری غرض تو یہ تھی کہ ادبی حوصلہ افزائیوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے ساتھ جو خصوصی تعلق اپنے وابستوں کا حضرت رکھنا چاہتے تھے' اس کا ثبوت پیش کروں اور یہ بات ''بارہا'' کے لفظ سے ظاہر ہے۔

اسی ''بارہا'' اصرار ہی کا نتیجہ وہ تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسا مکثر شاعر جن کی کتابوں کے متعلق لوگ کا خیال ہے کہ سو تک پہنچ گئی ہیں' روزانہ تہجد میں سات پارے اس طریقے سے پڑھتے تھے جس سے ان پر تلاوت کے آثار طاری ہوتے تھے۔

ایک غلطی جو غالباً صدیوں سے چلی آتی ہے' اس کے ازالہ کے لیے کیا کروں' مجبوراً مجھے طوالت سے کام لینا پڑ

رہا ہے ورنہ لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا اور حضرت نظام المشائخ ہی کے گردوپیش کے واقعات' ان کی خانقاہ جو جماعت خانہ کے نام سے موسوم تھی' اگر اسی کا حال غور سے پڑھتے تو ان پر کھل سکتا تھا کہ اس کا سارا ماحول تلاوت قرآن سے بھرا ہوا تھا بلکہ کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ان کا جماعت خانہ دراصل ایک قسم کا مدرستہ الحفاظ تھا۔

واقعہ یہ ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ سلطان المشائخ نے آخر وقت تک تجرد کی زندگی گذاری۔ کن مصالح نے ان کو اس مسلک کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا جو امام شافعیؒ کے نزدیک تاہل سے افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ میری بحث سے یہ اس وقت خارج ہے' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بظاہر وہ تاہل کے جھنجھٹوں سے آزاد تھے لیکن جس کے دل کا حال یہ ہو جیسا کہ حضرت کے خادم خواجہ عبدالرحیم سحری کھلانے والے صاحب کا بیان ہے کہ باوجود عموماً روزہ رکھنے کے سحری برائے نام ہی آپ کے پاس آتی تھی' خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ

''عرضداشت می کروم کہ مخدوم وقت افطار ہم طعام کمتری خورد' اگر طعام سحر ہم اندکے تناول کند حال چہ شود و ضعف قوت گیرد۔''

خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میری اس عرضداشت پر

''دریں محل بگریستے وگفتے چندیں مسکیناں و درویشاں در کنجہائے مساجد و دکانہا گرسنہ و فاقہ زدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرورود۔''[22] (سیرالاولیاء۔ صفحہ 125)

روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے' خواجہ عبدالرحیم بیچارے سحری جیسی کی ویسی اٹھا لیتے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس کے سینہ میں ایسا دل رکھا گیا ہو وہ اصطلاحی تاہل کے خرخشوں سے اگر آزاد بھی رہا تو کیا واقعی اسے آزادی میسر آسکتی ہے' خدا ہی جانتا ہے کہ دلّی میں پچاس ساٹھ سال تک جس کا دستر خوان الوانِ نعمت ہزار ہا ہزار انسانوں کو تقسیم کرتا رہا' اس تقسیم سے اس کی کیا نیت تھی۔ یقیناً اس زمانہ کے غرباء تک سلطان المشائخ کے ذریعہ سے وہ نعمتیں پہنچائی گئیں جن کا وہ بیچارے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور کیا معلوم کہ اللہ والوں کے کام کے پیچھے کس قسم کی نیتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ خیر یہ تو ایک طویل قصہ اور مستقل بحث ہے' مجھے اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غیر متاہل ہونے کے علاوہ ان عام لوگوں کے جو روزانہ بعد مغرب سلطان المشائخ کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے' جن کی تعداد کبھی کبھی سینکڑوں سے متجاوز ہو جاتی تھی' ان عام لوگوں کے سوا آپ کی خصوصی تربیت اور نگرانی میں مختلف خاندانوں کے بچے پرورش پاتے تھے۔ آپ ہی ان کے قیام و طعام ولباس و تعلیم اور دیگر ضروریات کے متکفل تھے۔ ان بچوں میں حضرت شیخ کبیر شکر گنجؒ کے نواسے خواجہ محمد' خواجہ موسیٰ' خواجہ عزیز الدین' شیخ کمال الدین وغیرہ تھے جن کے والدین کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا تھا اور سلطان المشائخ نے سب کو دلّی بلا کر اپنے زیر پرورش فرما لیا تھا۔ یوں ہی آپ کے بھانجوں یعنی بہن کے بچوں کا ایک گروہ تھا جن میں خواجہ رفیع الدین' ہارون' خواجہ تقی الدین' خواجہ ابوبکر مصلی دار' مولانا قاسم' خواجہ عزیز الدین بن خواجہ ابوبکر مصلی دار اور ان کے سوا بھی بعض دوسرے شریف خاندان کے بچے تھے جن کا اقامت خانہ سلطان المشائخ کا جماعت خانہ تھا۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا' ان سب کی تعلیم وتربیت بھی حضرت والا کی خاص نگرانی میں ہوتی تھی' آپ کو یہ سن کر

تعجب ہوگا اور اس سے حضرت سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق اور شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ہر بچے کو التزاماً سلطان المشائخ نے قرآن مجید حفظ کرایا' خصوصیت کے ساتھ حفظ کے اس کام کو آپ نے مولانا علاء الدین اندپتی کے سپرد کیا تھا۔ میر خورد نے لکھا ہے

''مولانا علاء الدین اندپتی کہ درغایت بزرگ بود وعلوم بسیار وفضائل بے شمار داشت' وحافظ کلام ربانی واقربائے سلطان المشائخ بیشترے ازاں بزرگ حافظ شدند۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 316)

سلطان المشائخ کے چھوٹے بھانجے [23] تقی الدین نوح جب کبھی حضرت والا کی مجلس میں آجاتے تو لوگوں سے فرماتے۔

''یاراں ایں راعزیز دارید کہ ایں نیکو کسے ست۔''

مگر ان کی ''نیک کسی'' کی دلیل میں جو بات ارشاد فرمائی جاتی تھی' وہ یہ تھی

''ایں قران یاددارد' وہر شب آدینہ (جمعہ) ختم می کند۔'' (سیر الاولیاء۔ فوائد الفواد)

سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق کی یہ حالت تھی کہ آپ کے دسترخوان کا یہ دستور تھا کہ قبل کھانا شروع کرنے کے قرآن مجید کی کچھ آیتیں خوش الحانی سے کوئی قاری سناتا' عموماً یہ خدمت شیخ کبیر شکر گنج'' کے نواسوں حافظ محمد و حافظ موسیٰ کے سپرد تھیں۔ یہی دونوں بھائی نماز میں بھی عموماً امامت کرتے تھے۔ آواز میں بلا کا درد تھا۔ لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے جب قرآن پڑھا جاتا تو مسلسل سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے ''رحمت باد' رحمت باد'' (صفحہ 199) کے الفاظ بے اختیار نکلتے رہتے۔ آپ نے ان وابستگان دامن کے اندر قرآن کا وہ راسخ مذاق پیدا فرما دیا تھا کہ میر خورد کا بیان ہے کہ ان کے پھوپھی زاد بھائی خواجہ عزیز الدین جن کی تعلیم و تربیت بھی سلطان المشائخ نے فرمائی تھی اور دسترخوان کی قرأۃ جس کا نام ہی ''دعاء مائدہ'' تھا' کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کرتے جیسا کہ قاعدہ تھا کہ سلطان المشائخ کی زیر نگرانی تعلیم پانے والے بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا' ان کو بھی قرآن حفظ تھا۔ میر خورد کی شہادت ہے کہ جب مرض الموت میں خواجہ عزیز الدین بیمار ہوئے تو

''دوسہ روز کہ زحمت (بیماری) بود یک ساعت لب مبارک از تلاوت کلام اللہ بے کار نماندہ' ہمدریں زحمت برحمت پیوست۔'' (صفحہ 199)

واقعہ تو یہ ہے کہ سلطان المشائخ کو قرآن کے ساتھ جو غیر معمولی شغف پیدا ہو گیا تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو اپنے ہر ایک مرید پر حفظ قرآن کے مسئلہ کو لازمی قرار دے دیتے لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ کام آسان نہ تھا' تاہم آپ کی کوشش یہی تھی کہ جس سے جتنا ممکن ہو' سلوک بالقرآن کے لیے قرآن زبانی یاد کرلے۔ خیال تو کیجیے حسن علاء سجزی جو علاوہ شاعر ہونے کے ایک بڑے فوجی افسر تھے' اور اسی فوجی سلسلہ میں ان کو دیو گیر (دولت آباد) آنا پڑا جہاں ان کا اب مزار ہے' عمران کی کافی ہو چکی تھی' جب شرف بیعت سے سرفراز ہوئے۔ شاعری کا جنون الگ سر پر مسلط تھا لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حسن علاء کو حکم تھا کہ شعری ذوق کو کم کر کے قرآنی مذاق کو اپنے اوپر غالب

کریں۔ جب یہ مذاق ان کا غالب ہو گیا تو پھر ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس معمر سن رسیدہ مرید کو بھی آپ نے حفظ قرآن میں لگا دیا تھا۔ آپ ان سے دریافت فرماتے رہتے کہ ''چہ قدر یاد کردہ۔'' حسن کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایک ثلث قرآن یاد کر چکا تھا۔ ''ثلثے یاد گرفتہ ام''۔ ارشاد ہوا۔

''دیگر ہا اندک اندک یاد گیر دیاد گرفتہ پیشینہ را مکرر حی کن۔'' (فوائد الفواد۔ صفحہ 93)

اور اس سے اس طریقہ کا بھی پتہ چلتا ہے جو حضرت والا نے سن رسیدہ ہونے کے بعد قرآن کو یاد کیا تھا۔ یہی واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ایک دو دو آیتیں بھی روزانہ آدمی یاد کر لیا کرے اور ان کے معانی کو اپنے اندر چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' گھلاتا رہے تو حق تعالیٰ کے اس علم مقدس سے بتدریج سینہ میں جو روشنی پیدا ہوتی ہے' شاید کسی ذریعہ سے ممکن نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے' آدمی کا دماغ بھی سلجھنے لگتا ہے۔ قرآن کی جو خاص منطق ہے' ذہن کو اس سے مناسبت ہونی لگتی ہے۔ ہر بات میں جو واقعہ ہے توازن کو قائم کرتے ہوئے آدمی اس میں غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ البتہ وہی بات جس کا صحیح حدیثوں میں بھی ذکر آیا ہے کہ محفوظ حصہ کی اگر نگرانی نہ کی جائے تو وہ فوراً نکل بھی جاتا ہے۔ اس لیے ''یاد گرفتہ پیشینہ'' کو مسلسل مکرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے حساب کیا ہے کہ اگر ''اندک اندک یاد گرفتن'' کے اصول کے تحت کوئی روزانہ ایک آیت بھی یاد کر لیا کرے تو سات سال میں پورا قرآن اس کو محفوظ ہو جائے گا۔ بہر حال کچھ میر حسن ہی کے ساتھ یہ خصوصیت نہ تھی' حضرت والا کے دست گرفتوں میں ایک بڑی جماعت حفاظ کی نظر آتی ہے۔ بعضوں کا تو عمر بھر یہی پیشہ رہا کہ وہ قرآن لکھ کر زندگی گذارتے رہے۔ مولانا فخر الدین مروزی کے ذکر میں پہلے بھی اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

خود امیر خسرو جو تہجد کی نماز میں روزانہ سات پارے پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حفظ کے بغیر یہ ممکن نہ تھا لیکن مجھے اب تک ان کے کامل حافظ ہونے کی سند نہیں ملی ہے۔ بعض قرائن جن کی تفصیل کا موقع نہیں ہے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بلوغ کے بعد ہی اپنے محبوب شیخ کی اتباع میں قرآن یاد کیا تھا۔ ان کا تو عہدہ ہی شاہی دربار میں مصحف برداری کا تھا' گویا قرآن ہی میں معاش اور معاد دونوں کی فلاح حق تعالیٰ نے ان کی بلند قسم کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ امیر خسرو تہجد کی نماز میں سات سات پارے پڑھتے تھے۔ اسی سے خیال گذرتا ہے کہ سلطان المشائخ کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں

''چہار صد و پانصد رکعت نمازمی گذارد۔'' (صفحہ 128)

کو صراحتہً اس کا ثبوت تو ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن خیال گذرتا ہے کہ جس قرآن کو سلطان جی نے یاد کیا تھا' اسی کو

''یاد گرفتہ پیشینہ را مکرر کن۔''

کے اصول کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ان سینکڑوں نفلوں میں روزانہ پڑھ لیا کرتے ہوں گے۔ اس سے نمازوں کے ساتھ ساتھ قرآن کی تازگی کا موقع بھی آپ کو مل جاتا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

بہر حال اب کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المشائخ کے عہد میں دتی قرآن ہی

قرآن سے بھر گیا تھا۔ بڑے بڑے شاہی عہدیدار مقربان بارگاہ حکومت ہمیں اس زمانہ میں حافظ نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو، حسن علاء سجزی آخر یہ کون لوگ ہیں؟ انتہا یہ ہے کہ اس زمانہ میں دلّی کے کوتوال (کمشنر پولیس) بھی حافظ تھے۔ میر خورد نے لکھا ہے

''مولانا ظہیر الدین کوتوال منده که حافظ کلام ربانی۔'' (صفحہ 17)

اس عہد کے شاہی ولاۃ و حکام چونکہ زیادہ تر حضرت سلطان المشائخ ہی سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے تو کیا تعجب ہے اگر طریقہ چشتیہ کا قرآنی مذاق ان حکام و ارباب مناصب امراء تک بھی متعدی ہو گیا ہو۔

اور یہ ذکر تو ان لوگوں کا تھا جو سلطان المشائخ کے عہد میں تھے۔ حضرت کے بعد یوں تو آپ کا سلسلہ بیسیوں وسائط اور ذرائع سے پھیلا۔ لیکن آپ کے خلیفہ اعظم سب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا نصیر الدین چراغ دہلیؒ تھے۔ ان کے متعلق تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے سوا اور کسی چیز کے آگے سر جھکانے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ خود سلطان المشائخ کے زمانہ ہی میں لوگوں نے ان پر بھی الزام لگایا، مشہور بات ہے کہ کسی مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع شروع ہوا، چراغ دہلیؒ اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔ فرمایا ''خلافِ سنت است۔'' لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ مطلقاً سماع سے آپ کو انکار ہے، یہ اعتراض کیا کہ ''از سماع منکر شدی واز مشرب پیر برگشتی؟'' ''اخبار الاخیار'' میں شیخ محدث نے نقل کیا ہے کہ اس وقت حضرت نے فرمایا کہ ''دلیل از کتاب و حدیث می باید'' (صفحہ 82) لوگوں نے یہ خبر سلطان المشائخ تک شکایۃً پہنچائی، لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، جب وہاں سے بھی جواب ملا کہ ''راست می گوید۔''

بہرحال چراغ دہلیؒ کی زندگی تو اتنی عالمانہ تھی کہ ان پر لوگوں کو خشک مُلّا ہونے کا شبہ اس وقت بھی تھا اور شاید اب بھی ہو، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ صاحب گلبرگہ نے تو صاف لفظوں میں اس مسلک کی تصریح فرمائی ہے جو طریقہ چشت کی خصوصیت ہے۔ مولانا آزاد[24] نے اپنی کتاب ''روضۃ الاولیاء'' میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل کیا ہے

''فتح کار من بیش تر از تلاوت قرآن و سماع بود۔'' (روضہ۔ صفحہ 24)

یہ بھی اسی کتاب میں آپ ہی کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت سیدؒ کا معمول تھا کہ

''وقت چاشت و بعد از نماز ظہر درس می گفت و بیش تر درس در علم تفسیر و حدیث و سلوک می گفت و گاہے علم کلام۔'' (صفحہ 23)

قرآن سے آپ کا کتنا گہرا تعلق تھا، اس اعتراف کے علاوہ کہ ان کا فتح کار ہی قرآن کی تلاوت سے اور ان اشعار سے ہوا جن کے متعلق جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت نظم کی صورت میں قرآنی آیات کے وہ ترجمے ہیں، ان ہی ترجموں کو نغمہ کے ساتھ سننا۔ یہی ان بزرگوں کا سماع تھا اسی لیے میں ''قرآن و سماع'' کی ترکیب میں معطوف کو معطوف علیہ سے کوئی الگ چیز نہیں قرار دیتا اور اس پر تھوڑی بہت بحث بقدر ضرورت آئندہ بھی شاید آئے۔ بہرحال اس اعتراف کے سوا حضرت سید محمد حسین گیسو دراز نے ایک ہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی دو دو تفسیریں لکھ کر اپنے اس

خاندانی مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے جو اکابر چشت سے منتقل ہو کر ان میں پیدا ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''تصانیف حضرت سید ملتقط تفسیر قرآن بطور سلوک وتفسیرے دیگر بطریق کشاف پنج جزو۔'' (صفحہ 24)

دکن ہی میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے' سلطان المشائخ کے متوسلین وخلفاء میں ایک حضرت برہان الدین غریب قدس سرہ صاحب خلد آباد ہیں' ان کے براہ راست خلیفہ اور جانشین مولانا زین الدین شیرازی کے متعلق مولانا غلام علی نے جس قرآنی ذوق کی روئداد لکھی ہے' وہ عجیب وغریب ہے۔ لکھا ہے کہ محمد تغلق نے دلی اجاڑ کر دکن میں دولت آباد کو بسایا لیکن جب دولت آباد میں اسماعیل فح نے بغاوت کی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خود دولت آباد آیا' اپنے ساتھ دولت آباد سے لوگوں کو پھر دلی لے گیا تو ان میں مولانا زین الدین بھی تھے۔ دلی میں آپ کو چھوڑ کر خود سندھ چلا گیا۔ اس زمانہ میں مولانا زین الدین کا مشغلہ دلی میں یہ تھا جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

''دو ماہ شد کہ ہر روز یک ختم کلام اللہ برروح پرُ فتوح سلطان المشائخ می کنم۔''(25)

اس واقعہ کے بعد ہی بادشاہ جو سندھ (ٹھٹھہ) میں تھا' خدا جانے کیا احساس اس کو ہوا۔ اس نے مولانا زین الدین کے متعلق فرمان بھیجا کہ وہ جہاں رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں' لیکن ابھی وہ دلی سے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کے مرنے کی خبر سندھ سے آئی اور اسی کے ساتھ فیروز تغلق بھی دلی پہنچ گیا۔ اس نے مولانا پر اصرار کیا کہ دلی ہی میں قیام کریں لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا۔

''مرا بگذار بہ آستانہ خواجہ خود یعنی برہان بمیرم۔''

فیروز نے زیادہ اصرار مناسب نہ خیال کیا اور سامان زادِ راہ نیز بہت کچھ دے دلا کر اس نے دلی سے رخصت کر دیا' لیکن آپ کو خیال ہوا کہ دکن جانے سے پہلے اپنے دادا پیر بابا فرید شکر گنج'' کی قبر شریف پر فاتحہ پڑھ آؤں۔ اس لیے اجودھن روانہ ہو گئے۔ اجودھن میں ان کا قیام جس شان سے رہا ہے' اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ مولانا غلام علی آزاد کے الفاظ یہ ہیں۔

''در گنبد شیخ فرید الدین دربستہ مشغول ماند غیر از اوقات نماز برنمی آمد و شبانہ روز چہار قرآن ختم می کرد در عرصہ سہ روز مجموعہ دوازدہ قرآن ختم کرد۔''

وہاں سے رخصت ہو کر دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں اجمیر (26) میں ٹھہرے اور وہاں بھی وہی ''یک ہفتہ در روضہ مقدسہ گزید و روزے چہار ختم مجموع بست وہشت قرآن ختم کرد'' چونکہ مولانا زین الدین نے قرآن حفظ فرما لیا تھا' اس لیے ان کو پڑھنے میں آسانی ضرور ہوتی ہوگی لیکن روزانہ چار ختم کرنا پھر بھی میں نہیں سمجھتا کہ اسے معمولی بات سمجھی جائے۔ اب لوگوں کو کیا کہیے' طریقہ علیہ چشتیہ کی ایک دوسری شاخ صابریہ ہے۔ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے متعلق ان کے صاحبزادے مولانا رکن الدین سے ''مناقب العارفین'' میں یہ روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے۔

''پدر بزرگ من از اولیاء بودند تلاوت قرآن وظیفہ داشتند و مسائل شرعی ہمیشہ مطالعہ کردند۔'' (صفحہ 357)

بتایا جائے کہ چشتیہ طریقہ کا اب کونسا سلسلہ باقی رہ گیا جس کا قرآن سے وہ تعلق ثابت نہیں ہوتا جس کا میں دعویٰ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ بہر حال کچھ بھی ہو اب اسے کوئی خوش اعتقادی قرار دے یا جو بات بھی سمجھی جائے' مختلف قرائن و قیاسات' منتشر معلومات نے مجھ میں یہ حسن ظن پیدا کر دیا ہے کہ حفظ قرآن کی دولت ہندوستان میں جو عام ہے' اتنی عام کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی ملک میں حافظوں کی اتنی تعداد پائی جاتی ہو' جتنی بوقت واحد ہندوستان میں نکل سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں کچھ دوسرے اسباب کو بھی دخل ہو' لیکن ایک بڑی وجہ اس کی میرے نزدیک خواجگانِ چشت ہی کا وہ مذاق ہے جو حفظ قرآن کے متعلق ہم ان میں پاتے ہیں۔

ان مثالی اور جزئی شہادتوں کے سوا جن کا ایک ذخیرہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے' ایک عجیب و غریب شہادت اس بات میں ایک غیر چشتی بزرگ حضرت شاہ [27] شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی ہے۔ آپ کے ملفوظات ''معدن المعانی'' نامی میں براہ راست حضرت والا کا ایک بیان درج ہے۔ میں بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

''مخدوم فرمود کہ من از شیخ زادہ شنیدہ ام کہ می گفت پدر مرا ہزار ختم قرآن بودستہ صدور خارج صلوٰۃ و ہفتہ صدور صلوٰۃ۔''

مخدوم نے فرمایا کہ میں نے شیخ زادہ سے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے میرے والد نے قرآن مجید کو ہزار دفعہ ختم کیا تھا۔ تین سو تو نماز سے باہر اور سات سو ختم نماز کے اندر۔

''معدن المعانی'' ہی کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شیخ زادہ'' کے لفظ سے مراد خاندان چشت کے ایک بزرگ ہیں۔ ملفوظات میں متعدد جگہ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نام کا تو ان کے پتہ نہ چل سکا' لیکن شیخ زادہ چشتی سلمہ اللہ تعالیٰ کے عنوان سے ان کا ذکر مختلف مقامات میں پایا جاتا ہے۔ ملفوظات کے صفحہ 249 سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یہ آخر میں بہار پہنچے اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے وہیں ملاقات ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے

''من چندیں زبانہائے می دانستم از ترکی و فارسی و عربی۔''

بہر حال کچھ بھی ہو' حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ان ہی شیخ زادہ چشتی سے ان کے والد کے طریقہ ختم کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

''و ہمہ خواجگان چشت را رحمہم اللہ ہم بریں منوال است۔'' (صفحہ 186)

اس کے سوا اور کیا مطلب اس کا لیا جاسکتا ہے کہ شیخ زادہ چشتی کے پدر بزرگوار کا جو دستور ختم قرآن کے متعلق تھا' وہی دستور ''ہمہ خواجگان چشت'' میں مروج تھا اور اسی شہادت کا پیش کرنا میرا مقصود تھا بلکہ اسی کتاب کے دوسرے مقام میں ایک اور دلچسپ چیز ملتی ہے' جامع ملفوظ ارقام فرماتے ہیں کہ

''بندگی مخدوم بحاضران مجلس روئے مبارک آوردو پرسید کہ کسے راایں آیت یادست کہ در کدام سورہ ست کسے رایادنہ بود۔''

حضرت نے اس وقت عجب حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ ''انچہ مرایادمی باید ہماں یادنیست۔'' پھر اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

''درایام خوردگی چندیں کتابہامارایادکرانیدند چنانکہ مصادر ومفتاح اللغات وجزاں کتابہا' مفتاح اللغات جزوے بستے خواہد بود مقدار یک جلد یادکرانیدندو ہر بار یاد تمامی می شنیدند۔''

اس سے کم از کم مجھے تو ہندوستان کی آٹھویں صدی کے مکتبی نصاب کے بعض اجزاء کا سراغ ملتا ہے۔ مصادر سے مراد غالباً کوئی اس قسم کی کتاب ہے جس کو مکاتب میں آج کل بھی ''آمدنامہ'' یادکن میں جسے ''آمدن نامہ'' کہتے ہیں' ''صفوۃ المصادر'' یا ''مصدر فیوض وغیرہ مختلف ناموں سے لوگوں نے فارسی کے مصادر ایک جگہ جمع کردیئے ہیں' بچوں کو ابتدا میں وہی کتاب یادکرائی جاتی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ زندگی بھر بچپن کی یہ محنت لوگوں کے کام آتی ہے' یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علاوہ مصادر کے لغت کی کوئی کتاب بھی زبانی یادکراتے تھے جس کا اب رواج باقی نہیں رہا۔ ''ہر بار یاد تمام شنیدند'' سے آموختہ سننے کا جو قاعدہ تھا' اس کا بھی پتہ چلتا ہے' خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہے' حضرت نے مندرجہ بالا فقرہ کو ختم کرکے پھر ارشاد فرمایا۔

''یالیت بجائے آں قرآن یادمی کرانیدند۔'' (صفحہ 43)

اور اس سے میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ حفظ قرآن کا مذاق چشتی طریقہ سے کوئی خاص خصوصیت رکھتا ہے اور آئندہ ملک میں اس کا جو عام مذاق پھیل گیا' وہ ان ہی بزرگوں کے انفاس طیبہ کی برکت ہے۔ اس کے بعد سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ایک اور جز کا اضافہ آپ نے فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ شرف الدین یحیٰی منیریؒ جو عام طور پر مخدوم الملک کے نام سے کم از کم صوبہ بہار میں مشہور ہیں' ان کی ابتدائی تعلیم سنارگاؤں (بنگال) میں ایک عالم علامہ شرف الدین توامہ سے ہوئی تھی جو دلی سے بنگال بھیجے گئے تھے' کہتے ہیں کہ جہاں پر آج ڈھاکہ شہر کی آبادی ہے' اسی کے قریب کسی جگہ یہ سنارگاؤں آباد تھا' حفظ قرآن کا ذکر جب چھڑا تو آپ کو اپنے ان ہی استاد شرف الدین توامہ کے حلق درس کا قصہ یاد آ گیا۔ فرمانے لگے:

''درسنارگاؤں برادر مولانا یعنی (شرف الدین توامہ) زین الدین نام داشت اور اقران نیکو یاد بودْ در وقت سبق خواندن' اگر در سبق کسے آیتے برائے تمسک حلکے آمدے درآں محل مولانا (شرف الدین توامہ) محتاج می شدند کہ در کدام سورہ است [28] ومولانا زین الدین نشستہ بودے دریافتے کہ مولانا تتبع می کنداں آیت در کدام سورہ است۔''

مخدوم الملک فرماتے ہیں کہ مولانا کے بھائی زین الدین ایسے موقع پر

''برائے طیبت وحرکت زمانے خاموش ماندے دوم نزدے ویاراں راچشمک دادے کہ

اکنوں کہ خوار گفت۔''

گویا سارا مجمع ایسے موقع پر اپنے عجز کے اعتراف پر مجبور تھا' فرماتے ہیں کہ تب

''مولانا (شرف الدین توامہ) روئے مبارک سوئے اومی آوردندومی گفتند کہ بس کنید

اکنوں بگوئید کہ در کدام سورہ است۔''

جب مولانا بھائی کو اس لہجہ میں حکم دیتے تب ''گفتے کہ در فلاں سورت است۔''

میری غرض اس تفصیل کے نقل کرنے سے ایک تو یہ ہے کہ کچھ اس زمانہ کے درس وتدریس کے طریقہ کا پتہ اس بیان سے چلتا ہے اور دوسری بات وہی ہے کہ حفظ قرآن کے ساتھ طریقہ چشت کے بزرگوں کو جو وابستگی تھی' ان واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کوئی خصوصی مذاق تھا' آج ان بزرگوں کو جس نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے' جو باتیں بھی ان کی طرف منسوب کی جاتی ہوں لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ اسلام وایمان کی روشنی اس کفرستان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پھیلانے میں جن بزرگوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے' وہ خانوادۂ چشت ہی کے اکابر ہیں۔ اسلام کی جڑیں اس ملک میں مضبوط ہو گئیں' اس وقت تو یقیناً اوروں کو بھی یہاں کام کرنے کا موقع ملا اور بڑی ناشکری ہوگی' اگر دوسرے طرق وسلاسل کے بزرگوں کی عظیم الشان خدمات اور قربانیوں کو بھلا دیا جائے۔

قادریہ' سہروردیہ اور آخر میں جب مغل آئے تو ان کے بعد نقشبندیہ سلسلہ کے جان فروشوں نے محمد رسول اللہؐ کے دین کے پرچم کو سربلند رکھنے میں جو مجاہدات کیے ہیں' یقیناً وہ بڑے قیمتی ہیں' علی الخصوص عہد اکبری کے فتنہ ایمان سوز کے مقابلہ میں سرہند کے فقیر بے نوا نے جو کام کیا ہے' یہ واقعہ ہے کہ ہماری پچھلی نسلیں بحمد اللہ اسی جہادِ اکبر کی بدولت آج اسلام صحیح' اور ایمان واقعی سے قریب ہیں ورنہ اکبری عہد میں اسلام کو مسخ کر کے جس خود ساختہ نئے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا گیا تھا' اگر نام کے ہم مسلمان باقی بھی رہتے تو کیا واقعی ہمارا اسلام وہ اسلام ہوتا جو اللہ کے آخری رسولؐ نے ہمیں سونپا ہے۔

لیکن گفتگو کے آخر میں نہیں اول کار میں ہو رہی ہے اور اسی لیے ذرا درازنفسی بلکہ تلخ نوائی پر مجھے مجبور ہونا پڑا کہ بعض خاص مؤثرات وعوامل جن میں بڑا حصہ مغربی دسیسہ کاریوں کا بھی ہے' میں دیکھ رہا ہوں کہ بزرگانِ چشت کی جانب سے قلوب میں عام سرد مہری بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے کارناموں کی اہمیت گھٹا کر لوگ شدید قسم کی محسن کشی کا ارتکاب کر رہے ہیں' ان بزرگوں کے کام تو کام بتدریج ناموں تک کے بھلانے کی غیر شعوری کوششیں ہو رہی ہیں۔ ارادہ تو زمانہ سے تھا اور جو کچھ اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں کہا ہے' لیکن ہندوستان کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں چونکہ ان بزرگوں کا ذکر ناگزیر تھا' جن کے دینی اور روحانی دباؤ کے نیچے اس ملک کے خواص وعوام صدیوں دبے رہے ہیں' اس لیے صرف ایک پہلو یعنی ان کا قرآن سے جو تعلق تھا' محض اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو سے مجھے کام لینا پڑا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ پر اپنے موضوع سے ہٹ جانے کا الزام بھی قائم کیا جائے' لیکن ہر لکھنے والا اپنے لکھنے کی ایک غرض سامنے رکھتا ہے۔ مجھے نہ ریسرچ کرنا ہے نہ اپنے تحقیق کی داد لینی ہے' اپنا ایک فقیرانہ خیال تعلیم کے متعلق جو ہے' جو کچھ

میری سمجھ میں آیا ہے' اسے بیان کر رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا خواجگانِ چشت کے متعلق مختلف دائروں میں چونکہ طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور اب وہ بتدریج اتنی گہری ہوتی چلی جارہی ہیں کہ تفصیل سے اگر کام نہ لیا جاتا اور چند سرسری حوالوں کو دے کر گزر جاتا تو اسے میری ایک نری خوش اعتقادی کے سوا شاید اور کچھ نہ قرار دیا جاتا بلکہ اس حملہ سے تو اب بھی اپنے آپ کو میں محفوظ و مصئون نہیں پاتا مگر جو واقعات آپ کے سامنے معتبر حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں' ان کے بعد اب بھی کیا یہ صرف میری خوش اعتقادی ہی باقی رہتی ہے؟

کتنا بڑا ظلم توڑا گیا کہ جن لوگوں نے اس ملک میں قرآن کو پھیلایا' اسی کو اپنے طریقہ کا املاک کار قرار دیا' بے دیکھے' بے پڑھے' محض افواہی روایات' نے سنائے قصوں' اسلاف کی راہ چھوڑنے والے اخلاف کے غلط نمونوں کو دیکھ کر آج یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ چشتی طریق کے بزرگوں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ اسلام جیسے متین اور سنجیدہ باوقار دین میں انہوں نے طبلہ اور سارنگی کو داخل کر دیا۔ یہ الفاظ ہیں جو میرے سنے ہوئے ہیں اور اسی زمانہ سے دماغ گھول رہا تھا' قلم جب ہاتھ میں آیا تو اختصار پر صبر نہ کر سکا' افسوس ہے کہ بات بہت طویل ہو چکی ورنہ اس ''چنگ و چغانہ'' کے قصہ پر بھی تفصیلی گفتگو ہو سکتی تھی جس کا الزام ہم چشتیوں کے اکابر و اسلاف پر بے دردی کے ساتھ لگایا جارہا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے اتنے معتبر ذریعہ سے جس سے زیادہ قابل اعتماد ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن علاء سجزی براہ راست حضرت سلطان المشائخ سے راوی ہیں کہ ایک دن آپ نے اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے یعنی امام کو جب نماز میں سہو ہو جائے تو یاد دلانے کا طریقہ جیسا کہ فقہ کا مشہور مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد یاد دلانا چاہتا ہے تو چاہیے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہے' لیکن یاد دلانے والی اگر عورت ہو تو مسئلہ یہ ہے کہ بجائے زبان کے وہ تصفیق سے کام لے یعنی بجائے سبحان اللہ کہنے کے ''دستک'' سے کام لے' مگر فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ دستک کا جو عام طریقہ ہے وہ صورت اختیار نہ کرے' مطلب یہ ہے کہ ''کف بدست برکف دست نزند۔'' سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس امتناعی حکم کی توجیہہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''آں بلہوی مانَد'' یعنی ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ جوڑ کر پیٹنے میں ایک قسم کے کھیل اور لہو کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ بجائے اس کے ''پشت دست برکف دست زند'' ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی ٹیکے' گویا اس شکل میں لہو اور کھیل تماشے والی تالیوں سے یہ صورت جدا ہو جاتی ہے۔ میر حسن کا اس کے بعد بیان ہے کہ سلطان المشائخ نے اس فقہی مسئلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ

> ''تا این غایت از ملاہی (کھیل تماشے) وامثال آں احتراز آمدہ ست' پس در سماع بطریق اولی کہ ازیں بابت نہ باشد۔''

آگے اپنے مقصد مبارک کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

> ''یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است' در منع مزامیر (باجہ وغیرہ) بہ طریق اولے۔''

یہ تھا خیال مزامیر و چنگ و چغانہ' دف و نَے میں' طریقہ چشتیہ کے ایک معمار اعظم کا' وہی جسے آج اس مسئلہ میں سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے' اللہ اللہ جس کے نزدیک ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پٹک کر تالی کی صورت بنانی بھی

ناجائز ہو' ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ اس کی مجلس سماع میں ڈھول اور طبلے ٹھنکتے تھے' ستار اور سارنگی' بانسری اور منجیرا بجایا جاتا تھا' ان ہی حسن علاء سجزی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت والا سے کسی نے آ کر عرض کیا کہ آج فلاں مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع سنا جا رہا تھا' سننے کے ساتھ ہی حضرت کا چہرہ بدل گیا اور فرمانے لگے ''من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نہ باشد۔''

آپ دیکھ رہے ہیں' مزامیر کو جو محرمات قرار دے رہا ہو' کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود محرمات میں مبتلا تھے۔ امیر حسن نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

''دریں باب بسیار غلوی فرمود۔'' (فوائد۔ صفحہ 95)

میں اس وقت مزامیر کے مسئلہ کو نہیں بیان کر رہا ہوں بلکہ صرف اس ظلم کو دکھانا چاہتا ہوں جو مشائخ چشت کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ آپ کو' بجائے خود اختیار ہے' جو چاہے کیجیے اور جس قسم کا مسلک اپنے اجتہاد سے یا کسی مجتہد کے اجتہاد سے اختیار کیجیے لیکن خدارا جھوٹ تو نہ بولیے' جس سلسلہ کے اساطین کا مزامیر کے باب میں اتنا غلو ہو' اسی سلسلہ کی آڑ لے کر تو ان چیزوں کو جائز نہ قرار دیجیے۔ امیر علاء حسن ہی نے ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ کسی نے حضرت والا سے یہ عرض کیا کہ مزامیر کے ساتھ جو لوگ سماع سن رہے تھے' ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیا حرکت کی تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ ''ماچناں درسماع مستغرق بودیم کہ ندانستیم کہ ایں جا مزامیر ہست یا نہ۔''

امیر حسن کہتے ہیں کہ ''خواجہ ذکر اللہ بالخیر چوں آں سخن بشنید فرمود کہ ایں جواب ہم چیزے نیست۔'' صرف یہی نہیں کہ ''چیزے نیست'' بلکہ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ''ایں سخن در جملہ معصیتہا باید نوشت'' (صفحہ 227) یعنی ایک گناہ تو مزامیر ہی میں مبتلا ہونے کا تھا اور اس قسم کی لغو توجیہہ دوسرا گناہ ہوا' جو سب لکھا جائے گا۔ یہی میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ مزامیر کا سننا نہ سننا یہ الگ مسئلہ ہے' لیکن اس کو سننا بھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا کہ مشائخ چشت کا یہ طریقہ ہے' کیا اپنے گناہ میں مزید گناہ کا اضافہ نہیں ہے' یہ خوب توجیہہ ہوئی کہ ''ہمیں مزامیر کے ہونے یا نہ ہونے کا پتہ نہ چلا۔'' کیا شراب اس لیے حلال ہو جائے گی کہ پینے والے یہ کہیں کہ ہمیں پینے کے وقت پتہ نہیں چلتا کہ شراب پی رہا ہوں یا شربت پی رہا ہوں۔ سلطان المشائخ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا جیسا کہ اسی مجلس کے ملفوظات کے شروع میں امیر حسن نے نقل کیا ہے کہ

''خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود' چیزے کہ حرام ست بحکم کسے حلال نہ شود' و چیزے کہ حلال ست بحکم کسے حرام نشود۔'' (صفحہ 227)

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک مزامیر ہی کا مسئلہ کیا' بلکہ ان لوگوں کو جو حضرت والا سے دینی عقیدت رکھتے ہیں' ان کو طریقہ چشتیہ کا یہ کلیہ یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت نے جس چیز کو حرام کیا ہے' کسی امتی کو خواہ وہ کوئی ہو' صحابی ہو یا مجتہد ہوں' امام ہوں یا ولی ہوں کسی کو اختیار نہیں ہے کہ اسے حلال ٹھہرائے اور جو چیزیں حلال ہیں' کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ اسے وہ حرام کرے۔ نبوت محمد رسول اللہؐ پر ختم ہو چکی' شریعت اسی دن کامل ہو چکی جس دن آنحضرتؐ ''ان الدین عند اللہ

الاسلام'' مسلمانوں کے سپرد کر کے رفیق اعلیٰ تشریف لے گئے۔ بالفرض اگر کسی امتی کی طرف سے ایسی بات کسی نے منسوب بھی کی ہو تو ہم یا اس انتساب ہی کو غلط ٹھہرائیں گے' اگر اس کا انتساب کسی ایسے بزرگ کی طرف کیا گیا ہے جس کی امانت و دیانت' اخلاص و للّٰہیت پر طبقہ بعد طبقہ مسلمانوں نے اتفاق کیا ہے یا اس کی تاویل اگر ممکن ہو گی تو کی جائے گی اور ان باتوں کا بھی امکان نہ ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ ان سے غلطی ہوئی کیونکہ مسلمان بہر حال مسئول اسی شریعت کا ہے جس کی تعمیل کا مطالبہ حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ سے کیا ہے۔ قیامت کے دن شریعت کے کسی مسئلہ کی خلاف ورزی کے متعلق یہ جواب قطعاً قابل شنوائی نہیں ہوگا کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کا یہ طرز عمل یا قول تھا' اب کوئی نبوت نہیں کر سکتا' خدا کی جدید رسالت اب قیامت تک کوئی نہیں لا سکتا' محمد رسول اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی مرضی کی یافت کا دعویٰ کرنا آنحضرتؐ کے دعوئے ختم نبوت کی تکذیب ہے۔ کیا تماشا ہے لوگ کچھ الفاظ بولتے ہیں اور معنی سے بے تعلق ہو کر بولتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ سمجھ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ شریعت کی رو سے درست نہ ہو لیکن طریقت میں اس کی اجازت ہے۔ حالانکہ ان دیوانوں کو یہی معلوم نہیں کہ طریقت سے مراد کیا ہے۔ کیا محمدؐ کی نبوت کے سوا ان کے لائے ہوئے قرآن کے سوا وہ کوئی اور چیز ہے۔ طریقت کا مادہ طریق ہے یعنی شریعت کی راہ پر جو عملاً چلنے لگتا ہے' اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طریق اور راہ پر لگ گیا۔ شریعت تو ان علوم کے مجموعہ کا نام ہے جو محمد رسول اللہؐ نے ہم مسلمانوں کو عطا کیا ہے' ان ہی علوم کے مطابق عمل کرنے کا نام طریقت ہے۔

آخر یہ لفظ بولنے والوں کا تو بنایا ہوا نہیں ہے' یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے۔ ان ہی سے پوچھنا تھا کہ آپ کی کیا مراد ہے؟ سلطان المشائخ نے مزامیر ہی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''اگر کیے از مقامے بیفتد بارے در شرع افتد مبادا اگر از شرع بیروں افتد پس چہ ماند۔''

(فوائد الفواد۔ صفحہ 95)

مطلب وہی ہے کہ طریقت تو شریعت ہی پر اخلاص اور صداقت سے چلنے کا نام ہے' فرض کیجیے کہ کسی بیچارے کو یہ چلنا جس راستبازی' صداقت' اخلاص' جوش و ولولہ کے ساتھ چاہیے' میسر نہ آتا تو کم از کم وہ ان چیزوں کو جو شریعت میں حلال ہیں' انہیں حلال ہی مانتا ہے۔ جو حرام ہیں انہیں حرام ہی سمجھتا ہے لیکن جس نے اس ماننے سے بھی بغاوت کی تو طریقت تو خیر دور کی چیز ہے' وہ شریعت اور اسلام ہی کے دائرہ میں کب باقی رہا۔

بہر حال یہ واقعہ بھی ہے اور یہی ''مشرب ناب'' ہمارے خواجگان چشت کا تھا' آپ دوسروں کے تصریحات میں تو ممکن ہے شاخسانے نکال سکتے ہیں لیکن خدا کا بڑا اکرم ہوا' ہندوستان کے مسلمانوں پر کرم ہوا کہ اس ملک میں اسلام جن بزرگوں کے ذریعہ سے پہلی دفعہ داخل ہوا' ان ہی میں سے ایک مسلم الثبوت ہستی نظام الاولیاء کے ملفوظات نے قلمبند ہو کر متواتر کی شکل اختیار کر لی کہ آج اسی کے ذریعہ سے بیسیوں غلط فہمیوں کے متعلق جو اصل واقعہ ہے' اس کا سراغ لگانا ہمارے لیے آسان ہو گیا اور مزامیر کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق صرف حسن علاء سجزی ہی کی یہ روایتیں نہیں ہیں بلکہ میر خورد جن کی کتاب ظاہر ہے کہ اعتماد و وثوق میں ''فوائد الفواد'' کی ہم رتبہ نہیں ہے بلکہ بعض خاص حالات کے تحت اس کی

بعض چیزیں محل غور و تامل ہیں۔ میر خورد[30] کی بعض تعبیریں بھی موحش ہیں لیکن باوجود اس کے سماع و شرائط سماع کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے مسلک کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے کہ

''چندیں چیزے می باید کہ تا سماع مباح شود مسمع (سنانے والا کون ہے) مستمع (سننے والے کیسے لوگ ہیں) مسموع (جو چیز سنائی جا رہی ہے' وہ کیا ہے) آلہ' سماع (کن آلات سے سماع ہو رہا ہے۔)''

پھر ہر ہر جزو کی خود تفصیل کرتے ہیں۔

''مسمع (سنانے والے کی شرط یہ ہے) کہ کودک نہ باشد' عورت نہ باشد' مستمع (یعنی سننے والوں کے متعلق یہ شرط ہے) از یاد حق خالی نہ باشد' مسموع (جو چیز سنائی جائے اس کی شرط یہ ہے کہ) فحش و مسخرگی نہ باشد۔''

آخر میں ''آلہ' سمع'' کے متعلق لکھتے ہیں۔

''آلہ سماع مزامیر است چوں چنگ و رباب و مثل آں می باید کہ درمیاں نہ باشد۔''

(صفحہ 492)

میر خورد ہی نے حضرت سلطان المشائخ سے نقل کیا ہے کہ گانا سننے والوں کا

''اگر میل بکلی طرف مجاز است آں حرام است۔''

یعنی مزامیر ہوں یا نہ ہوں' لیکن جن لوگوں کے قلوب مادی حسن و جمال سے مالوف ہیں' ان کے لیے تو ہر قسم کا گانا سننا ''حرام'' ہے۔ یہ سلطان جی کا فتویٰ ہے جو انہوں نے نقل کیا ہے لیکن آج ان مسلمانوں کو کون جا کر سنائے جو علانیہ بے دھڑک اپنے نوجواں بچوں اور عورتوں تک کو سینماؤں میں بھیجتے ہیں۔ خود ہر قسم کے گیت جو جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں' لوگ سنتے ہیں۔ اپنے لڑکوں' لڑکیوں' بیویوں کو سنواتے ہیں اور اس طور پر مسلمانوں میں یہ عمل جاری ہو گیا ہے کہ گویا ان کے مذہب کا اس باب میں کوئی حکم ہی نہیں ہے۔

آج ہمارے صوفیا اس پر تو آستین چڑھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو ان کے سماع پر معترض ہو اور جواب میں بزرگوں کا فعل یا قول پیش کیا جاتا ہے لیکن جن بزرگوں کے قول سے آپ سماع کا جواز ثابت کرتے ہیں اور ان کی نصرت و تائید کی حمیت آپ کو آپے سے باہر کر دیتی ہے' بندگانِ خدا! ان ہی بزرگوں کا تو یہ فتویٰ بھی ہے کہ آج جن خصوصیات کے ساتھ تھیٹروں میں سینماؤں میں گانا گایا جاتا ہے' یہ گانا ''حرام'' ہے۔ پھر آپ میں اس فتوے کی تعمیل کا کیوں جوش پیدا نہیں ہوتا؟ اس میں حمیت کی رگ کیوں نہیں پھڑکتی' کچھ نہیں تو جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں' ان ہی سے جہاں اور امور کا معاہدہ لیا جاتا ہے' حرمت غنا کے اس صوفیانہ فتوے کا بھی معاہدہ لیا جاتا ہے' یہ نہیں تو جو لوگ آپ کے زیر اثر ہیں' ان کو کم از کم یہ بھی بتا دیا جاتا کہ غنا کی یہ شکل جو سینماؤں میں مروج ہے' یہ صرف فقہاء اسلام ہی نہیں بلکہ صوفیا اسلام خصوصاً ہندوستان کے طریقہ چشتیہ میں بھی حرام ہے۔ آخر کچھ تو لوگوں پر اس کا اثر ہوتا' اب تو کچھ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے کہ زیادہ سے

زیادہ سینماؤں کی شرکت ایک قسم کا غیر شریفانہ فعل ہے اور وہ بھی ان لوگوں میں جن میں اسلام کا دباؤ کچھ نہ کچھ ابھی باقی ہے' حالانکہ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ گانے بجانے کے مسئلہ کو جن بزرگوں کی آڑ لے کر ایک حد تک جائز ٹھہرایا جا رہا ہے' ان کے نزدیک بھی ''سینمائی گانے'' حرام ہیں۔ آج اسلام کے اس حکم کی قیمت لوگوں کو نہیں معلوم ہو رہی ہے لیکن انسانی فطرت کی خصوصیات پر جن کی نظر ہے' جو جانتے ہیں کہ ''گانا'' اور ''نغمہ'' کا تعلق آدمی کے جذبات کے ساتھ کیا ہے' خصوصاً جب ہیجان انگیز قصوں کی جیتی جاگتی تصویروں کے ساتھ اس کا میل کیا گیا ہو' انسان کی نقل اتارنے والی فطرت ان تماشاؤں سے کن خطرناک عناصر کو چراتی ہے اور اپنی عملی زندگی میں اس کو شریک کر کے لوگ اپنے آپ پر' اپنی آئندہ نسلوں پر جن کے وہ امین و محافظ ہیں' ان پر کیا کیا مظالم ڈھاتے ہیں اور ڈھائیں گے' اس کا اندازہ ابھی نہیں' اس ملک کو اس وقت ہو گا جب علاج کا بھی وقت باقی نہ رہے گا۔

اور بوالعجبی تو یہ ہے کہ ہندوستان کے کے طول و عرض میں ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کی جو یونیورسٹیاں آج ٹھیکیدار ہیں' جن جوامع و کلیات و مدارس و معاہد کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ ''انسانی اخلاق'' کے نشو و نما اور بالیدگی کے وہ واحد ذرائع ہیں' ان میں خود نوجواں بچوں سے تمثیلی تماشے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے نام سے علانیہ کرائے جا رہے ہیں' خام عمر کے ان بچوں کو جن کی شبابی زندگی بالکلیہ اس وقت جذبات و عواطف کے زیر اثر رہتی ہے' عقل کی خوابیدگی کے ان دنوں میں ان کو تباہی کے جن غاروں میں دھکیلا جا رہا ہے' اس کی فریاد کس سے کیجیے۔

یقین مانیے کہ اس کا بھی واحد علاج صرف نظامِ تعلیم کی وحدت ہے۔ کاش اس مسئلہ کی اہمیت کو جتنا میں سمجھ رہا ہوں' دوسروں کی سمجھ میں بھی یہ بات آ جاتی تو مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ آخر اتنا مشکل تو نہیں ہے جتنا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ لیکن زمانہ کو اختیار ہے' جس چیز کو چاہے اہم قرار دے اور جسے چاہے بے معنی' لغو' فضول کہہ کر ٹال دے۔ لوگ ''فرعون'' سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ ''فرعونیت'' سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔

یعقوب کی اولاد اور اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے پنجہ سے رہائی مل چکی تھی لیکن ''فرعونیت'' اور اس کے لوازم و شعائر کا بھوت ان پر پھر بھی سوار ہی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ''مصری تمدن'' کے شعار خاص ''البقرۃ'' گائے کے متعلق سوال و جواب کی بھرمار کے ساتھ

فذبحوها وما کادوا یفعلون

''تو بنی اسرائیل نے گائے تو ذبح کر ڈالی لیکن قریب تھا کہ اس کام کو وہ نہ کرتے۔''

کی ہچکچاہٹ میں کیوں مبتلا ہوتے۔

آپ خوش ہیں کہ یہ سارے عوارض صرف ان تعلیم گاہوں تک محدود ہیں جہاں بقول آپ کے صرف ''دنیاوی علوم'' کی تعلیم دی جاتی ہے' باور کیے بیٹھے ہیں کہ ''دینی علوم'' کے مدارس ابھی ان آفات سے محفوظ ہیں' بلاشبہ ابھی ماحول کے کچھ اثرات دینی مدارس میں کم منتقل ہوئے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ دینی مدارس کے بکروں کی ماؤں کو خیر منانے کا موقع

کب تک ملتا رہے گا۔

پرانی صحبتوں کے دقیانوسیوں کی آنکھوں کو بند ہونے دیجیے اور ظاہر ہے کہ بالآخر انہیں بند ہونا ہی پڑے گا' پھر ہم ہوں گے یا نہ ہوں گے لیکن دبے پاؤں جو چیز مختلف راہوں سے دینی علوم کے ان قلعوں میں گھس رہی ہے' خصوصاً سیاسی سوراخوں سے نامحسوس لہریں مخفی طور پر پہنچ رہی ہیں جو آنچ لگ رہی ہے' ایسی صورت میں بس ان کا محافظ اللہ ہی ہے۔

واللہ خلیفہ علی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کچھ مصر کے عصری تجربات بھی ان امور کی طرف اشارے کر رہے ہیں جنہیں میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ کاش! نہ دیکھتیں کہ اس بصیرت نے جگر کو خون بنا دیا' جنون کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ جب اس مستقبل کا دھیان آتا ہے جن کی طرف سے دیکھ رہا ہوں کہ عام طور پر غفلت برتی جا رہی ہے۔

اُف میں پھر بہنے لگا' گفتگو خواجگانِ چشت کے مسلک سماع میں ہو رہی تھی اور نکل آیا پھر وہی سکولوں اور کالجوں کی طرف' میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کا ارادہ نہیں ہے لیکن مزامیر کے متعلق جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے' اس کے متعلق جو صحیح واقعات تھے شاید ان کا ذکر نہ کرنا گناہ ہو جاتا' آپ دیکھ چکے کہ ''سماع'' کے متعلق جس چشتی بزرگ کی سب سے زیادہ شہرت ہے' عام تاریخوں میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ آج ہی نہیں خود سلطان المشائخ کے زمانہ میں بھی اس مسئلہ نے مختلف طریقوں سے فتنہ کی صورت اختیار کی۔ غیاث الدین تغلق کے دربار میں باضابطہ مناظرہ کی مجلس مرتب ہوئی۔ سوال و جواب ہوا' حالانکہ اس کی کل حقیقت اتنی تھی کہ کبھی کبھی سلطان المشائخ ان خاص شروط کے ساتھ جن کا ذکر میں نے قصداً امیر خورد کے حوالہ سے کیا ہے' اس لیے کہ ان کو ''مسئلہ سماع'' سے خاص دلچسپی ہے۔ ان کی کتاب کا ایک بڑا حصہ اسی مسئلہ کے متعلقہ مباحث سے بھرا ہوا ہے۔

لیکن باوجود اس اصرار کے وہی راوی ہیں کہ ان ہی شروط کے ساتھ سلطان المشائخ کبھی کبھی سماع سن لیا کرتے تھے۔ ان شروط کے ساتھ بھی ان کے سماع کی کیا کیفیت تھی اور اس کا مقصد کیا تھا؟ اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان شعراء نے فارسی میں بہت زیادہ اور عربی میں کم۔ بقول غالبؔ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ایک خاص طریقہ کلام کا اختیار کیا تھا' جو آدمی ان شعراء کی اصطلاحوں سے ناواقف ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو نہ مسلمان ہیں اور نہ ہماری شاعری کی اس خصوصیت سے واقف ہیں۔ ان کو اس پر حیرت ضرور ہوتی ہے کہ ''مے و ساغر'' سے ''مشاہدۂ حق'' کی گفتگو کا کام مسلمان کیسے لیتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ تقریباً تیسری چوتھی صدی سے اسلامی شعراء کے کلام میں یہ رنگ پیدا ہوا' ہمارے شاعروں نے اپنی کثرتِ مشق سے مسلمانوں کو ان الفاظ سے اتنا مانوس کر دیا ہے کہ حقیقی معانی کی طرف ذہنوں کا منتقل ہونا گویا اب دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے سوا بھی صوفیہ اسلام نے اس کے دائرہ کو یوں وسیع کر دیا کہ بولنے والے کی خواہ کچھ ہی مراد ہو' ہمیں اس سے بحث نہیں' انہوں نے ان الفاظ کا جو عام طور پر شعراء استعمال کرتے ہیں خاص خاص مطلب طے کر لیا تھا اور ان مطالب کے ساتھ ان کی مشق اتنی بڑھ گئی تھی کہ گویا وہی مطالب ان کے نزدیک

ان الفاظ کے حقیقی مطالب اور معانی ہوتے تھے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی راز کی بات نہ تھی۔ سلطان المشائخ کی مجلس کے محدث وعالم مولانا فخر الدین زراوی نے تو صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ

''اگر مستمع (سننے والا) سماع حمل کند بر صورت مخلوق' معین یا غیر معین' ایں سماع جواناں ذی شہوت بود۔''

الغرض سماع میں بڑی شرط یہ تھی کہ الفاظ کو ان معینہ مطالب پر محمول کرنے کی صلاحیت ومشق پیدا ہو چکی ہو جو صوفیہ میں معین ہیں۔ مثلاً۔

''مستمع (سننے والا) سماع را حمل کند بر احوال نفس خوذ بہ تقلیب احوالے کہ با خدا تعالیٰ دارد۔''

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک بندے کا تعلق اطاعت و نافرمانی کے حساب سے حق تعالیٰ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے جس کا احساس خود اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کا خدا سے معاملہ ہے' اسی لیے صوفیہ اشعار کو

''در سلوک احوالے کہ پیش آید از قبول ورد و وصل وہجر طمع ونومیدی۔''

ان ہی باتوں پر حمل کرتے ہیں اور سلطان المشائخ سے اشعار کے محمول کرنے کے متعلق جو بیان سیر الاولیاء میں منقول ہے یعنی

''از زلف قرب خواہد بقولہ تعالیٰ لیقربونا الی اللہ زلفی واز لون جنت واز چشم نظر رحمت ولتصنع علی عینی وکفر پوشیدن باشد.... یعنی تا ہستی واعمال وصدق بر تو پوشیدہ نشود دعویٰ عشق از تو درست نیاید۔'' (صفحہ 494)

اور یہی میرا خیال ہے کہ دراصل قرآنی آیات کے ترجموں کو ایک خاص طریقہ سے یہ حضرات خوش الحانی کے ساتھ کبھی کبھی سن لیا کرتے تھے' میں نے کسی جگہ شیخ کبیر کا حال نقل کیا ہے کہ حجرۂ مبارک میں ٹہلتے اور کبھی کبھی سر بسجود ہو کر یہ اشعار پڑھتے۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے توزیم | خاکے بشوم و بزیر پائے توزیم
مقصود منِ خستہ ز کونین توئی | از بہر تو میرم از برائے توزیم

میں نے بتایا تھا کہ یہ آیت قرآنی صلوتی ونسکی کا حاصل ہے جسے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ میر خورد نے بعض ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جس سے سلطان المشائخ کبھی کبھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ مثلاً

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں | زین ذوق مست بے خبرم کیں سخن چہ بود

آپ ہی بتایئے کہ اگر اس شعر کو سن کر کسی کا ذہن

وجوہ [31] یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرہ

''کچھ چہرے اس دن تر وتازہ ہوں گے اپنے رب کے نگراں۔''

یا

کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون

''ہاں! وہی لوگ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔''

کی طرف منتقل ہو جائے اور اسی کیفیت میں وہ ڈوب جائے۔ تو وہ قرآن میں ڈوبا یا کسی اور چیز میں ڈوبا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ اپنے ان تعلقات کو جو قرآن نے عبد و معبود یا امتی و رسول میں پیدا کیے ہیں، اسی کو ذرا بیدار اور زندہ کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ خاص احباب کا مجمع ہو، ہم مذاق لوگ ملے جلے بیٹھے ہیں۔ کسی نے چند اشعار گا کر سنا دیئے۔ اس میں کچھ خاص پیشہ ور قوالوں کی بھی حاجت نہ تھی۔ بکثرت آپ کو واقعات سلطان المشائخ ہی کے حالات میں ملیں گے کہ امیر خسرو نے یا ان کے صاحبزادے امیر حاجی نے پڑھنا شروع کیا۔ کبھی شیخ نظام الدین پانی پتی جو قوال نہ تھے، وہ سناتے تھے۔ انتہا تو یہ ہے کہ حضرت شیخ کبیر کے حقیقی نواسے خواجہ محمد جو سلطان المشائخ کے باضابطہ پنج وقتہ نماز کے امام بھی تھے۔ وہی سنا دیتے، کچھ اشعار کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر ان میں لطف نہ آتا تو فرما دیتے کہ

''سماع را بدارید، و بہ حکایات و مآثر بزرگاں مشغول شوید۔'' (صفحہ 201۔ سیر الاولیاء)

اور اب تو اس کا دستور نہ رہا لیکن خواجگانِ چشت کے ایک مشہور رکن رکین خواجہ ممشاد علو دینوری کے زمانہ سے یہ روایت چلی آتی تھی، ان کا بیان تھا کہ خواب میں سرورِ کائنات کو ان کی زیارت ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے سماع کے متعلق دریافت کیا کہ حضور کو ہمارا یہ طریقہ اشعار سننے کا ناپسند ہے؟ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں میں ناپسند تو نہیں کرتا لیکن

قل لهم يفتحون قبله بالقرآن و يختمون بعده بالقران (صفحہ 494۔ سیر الاولیاء)

''لوگوں سے کہو کہ وہ قرآن سے آغاز کریں اور قرآن ہی پر ختم کریں۔''

لیکن افسوس کہ بتدریج یہ رسم غالباً مٹ گئی اور اب تو سماع کی مجلسوں کا جو حال ہے، اچھا ہی ہوا کہ قرآن کو ایسی مجلسوں سے الگ کر دیا گیا۔

بہرحال جس قسم کے سماع کا رواج خواجگانِ چشت کے معمارانِ اولین میں تھا، اس کی تو یہ حالت تھی اور مقصود اس کا وہی تھا، جو میں نے عرض کیا، حسن علاء سجزی نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

''مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر است اگر روزے وقتے خوش وقت دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں روز پناہ آں وقت باشد۔'' (فوائد الفواد۔ صفحہ 96)

اسی کے ساتھ ظاہر ہے کہ خوش الحانی کے ساتھ اشعار سننے کو صرف جائز سمجھتے تھے نہ کہ فرض و واجب یا سنت و مستحب۔ آپ کا یہ ضرور خیال تھا کہ جو لوگ اس طریقہ سے بھی اشعار سننے کو حرام سمجھتے ہیں تو ان لوگوں کو بھی اس پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ

''خود نشود اما با دیگراں خصومت نہ کند۔'' (فوائد۔ صفحہ 228)

اور یہ منافع تو وہ تھے جو اشعار سننے سے ان بزرگوں کے پیش نظر تھے لیکن اوروں کا تو میں نہیں کہتا، البتہ سلطان المشائخ نے جس طریقہ سے اس سماع کو سنا ہے، جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ہی تک محدود نہیں رہتی تھی،

واللہ اعلم بالصواب کیا حال تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ

''دراں ایام ہر بیتے وصوتے کہ حضرت سلطان المشائخ را در سماع ذوق دادے آں صوت وآں بیت مدتے مدید درمیان خلق مشہور شدے، خورد و بزرگ، وضیع وشریف در مجمعہا ومحلت ہا ومحفلہا۔ کوچہا وقبہا می گرفتند۔''

اسی کے بعد لکھا ہے کہ

''کارِ محبت وعشق را روز بازارے در جہاں پیدا آمدے'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 510)

یہ اس شخص کا بیان ہے جو اس زمانہ میں خود موجود تھا۔ آپ اس کے ساتھ علاء الدین خلجی کے اس مشہور فقرہ کو ملایئے جس کے ناقل بہت سے لوگ ہیں یعنی سلطان المشائخ کی دن دونی مقبولیت کو دیکھ کر گو دوسروں کے اشارے سے سہی لیکن اس کو خطرہ ہوا کہ سلطان المشائخ کی موجودہ مقبولیت عامہ روزے از روز ہا کوئی سیاسی کروٹ نہ لے۔ علاء الدین کے یہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

''مقربان، ولوازم وجوانب تخت من وسائر خلق بندہ ومرید او (سلطان المشائخ) شدہ اند حیلہ باید انگیخت تا از ضمیر او چیزے مارا روشن شود۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 133)

علاء الدین نے اس کے لیے جو حیلہ کیا مجھے اس سے بحث نہیں ہے بلکہ بتانا ہے کہ عہد علائی کے اکثر امراء و ملوک وعمائد سلطان المشائخ کے مرید ہو گئے تھے حتیٰ کہ خود علاء الدین کا ولی عہد خضر خاں جسے دیول رانی کے قصہ کی وجہ سے امیر خسرو نے ذکر دوام کی سند دے دی ہے، وہ بھی حضرت کے خاص مریدوں میں تھا۔ میر خورد اسی زمانہ کے آدمی ہیں، ان کی بھی یہی شہادت ہے:۔

''بعضے از علماء ومشائخ وامراء ملوک مرید آں حضرت گشتند۔''

بہر حال اتنا تو سب ہی کو مسلم ہے کہ عہد علائی وہ زمانہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی طرف سے سلطان المشائخ کے حسن قبول کا آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا، عموماً مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمومی پیشہ فوجی خدمت ہی تھا۔ حضرت والا کے دونوں مشہور شاعر مرید امیر خسرو اور امیر حسن علاء ان دونوں بزرگوں کو بھی ہم مختلف فوجی مہموں میں شریک پاتے ہیں۔

ان واقعات کے بعد ایک تاریخی سوال ہے جو آج ہی نہیں جب سے واقع ہوا ہے، اٹھایا گیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ مسئلہ مخفی نہیں ہے جیسا کہ طباطبائی نے بھی لکھا ہے۔

''فتوحاتیکہ دراطراف ممالک ہند ودکن، سلطان را میسر آمد واحداث عمارات وادخار خزائن در کمال وفور در عہد او صورت گرفت ہیچک از سلاطین ہند را دست نداد۔'' (صفحہ 119)

واقعہ یہ ہے کہ علاء الدین ہی کے زمانہ میں اسلام کی راہ دکن میں کھلی، اسی نے چتوڑ، رنتھنبور کے ناممکن التسخیر قلعوں کو فتح کیا، جنوبی ہند میں نہ صرف دیوگڑھی کے مشہور قلعہ کو اس نے فتح کیا بلکہ ورنگل کی حکومت بھی اسی کے ہاتھ سے مسخر ہوئی اور بقول بداؤنی

''در 710 ولایت معبر (مدراس) تا دھور سمند [32] در حوزہ تصرف اہل اسلام در آمد۔'' (صفحہ 147 جلد 1)

حتیٰ کہ اپنی اسی فوجی قوت پر اس کو اتنا ناز ہوا کہ پہلے تو دماغی فتور میں مبتلا ہوا کہ کوئی نیا مذہب ہی جاری کرے لیکن جب علاء الملک نے اس کی تفہیم کی تو اس سے باز آیا' پھر اس کا خیال جمانے لگا کہ

''مانند سلطان سکندر رومی بہ تسخیر اقالیم سبعہ پرداز و فرمود تا او را سکندر ثانی در خطبہ خوانند و در سکہ نیز ہمیں لفظ دخل کرد۔'' (سیر المتاخرین۔ صفحہ 117)

گو علاء الدین اس ارادہ سے بھی باز آ گیا اور اسی کے مقابلہ میں ہندوستان کے باقی ماندہ حصوں کے فتح کا عزم کیا جس میں وہ کامیاب ہوا لیکن علاء الدین تو خیر مر گیا اور اس کی موت کے بعد حکومت کا نظام کچھ درست نہ ہو سکا لیکن علاؤالدین کی موت کے کل نو سال بعد اسی فوجی قوت کے بھروسہ پر جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مہیا ہو گئی تھی' محمد تغلق بھی وہی ''چوں سکندر رومی اقالیم سبعہ را تسخیر نمائد'' (صفحہ 125) کا قصد مصمم کرنے لگا۔

یقیناً سوال ہوتا ہے کہ آخر ہندی فوجیوں میں یہ بے نظیر طاقت جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس زمانہ کے بعد' اس کے اسباب کیا تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندی حکومت کی قوت اس زمانہ میں اتنی قوی نہ ہوتی تو تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ تاتاریوں کے مسلسل حملوں کی مدافعت ناممکن تھی' ہر برس دو برس کے بعد ٹڈی دل شکلوں میں چنگیز خانی تاتاری کفار ہندوستان کے اسلامی ممالک میں سر نکالتے تھے لیکن ہر بار ان کو بری طرح ہزیمت اٹھا کر واپس جانا پڑا۔ تاتاریوں کا یہ ہجوم جب آتا تھا تو لاکھ دو لاکھ سے کم نہ ہوتا تھا۔ تفصیلات کے لیے اس عہد کی قدیم تاریخیں پڑھیے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا' یہ سوال نیا نہیں بلکہ پرانا ہے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے یعنی عہد علائی کے حیرت انگیز فتوحات اور مدافعات دونوں کے متعلق جو توجیہیں کی جاتی تھیں وہ یہ تھیں۔ ملا صاحب کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

> ''ایں فتوحات را بعضے حمل بر استدراج (یعنی ظالم کی خدا نے رسی دراز کی ہے) و بعضے بر کرامات سلطان علاء الدین می کردند و بعضے امن و امان عہد را از برکات بے نہایات سلطان المشائخ نظام الاولیاء قدس سرہ می دانستند۔''

ظاہر ہے کہ علاء الدین نے اپنے مربی و سرپرست چچا و خسر سلطان جلال [33] الدین خلجی جیسے نیک' دیندار بادشاہ کو انتہائی سفاہت کے ساتھ ضرور قتل کیا تھا لیکن

> لیس ھذا اول قارورۃ انکسرت فی الاسلام
>
> ''لیکن یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں ٹوٹا تھا۔''

کوئی پہلا آبگینہ نہیں تھا جو اسلام میں ٹوٹا تھا۔ پھر علاء الدین ہی کے ساتھ استدراج کے کیا معنی ہو سکتے تھے۔ نیز فوجی طاقت کا یہ ناز تو محمد تغلق تک باقی تھا' اگر قوت محسوس نہ ہوتی تو ہفت اقلیم کی فتح کا غلط ارادہ بھی کیوں پیدا ہوتا۔ رہی علاء الدین کی کرامت سو ظاہر ہے کہ گو بعد کو وہ تائب ہو گیا تھا' شراب بھی اس نے چھوڑ دی تھی لیکن با ایں ہمہ ایک معمولی

دنیادار بادشاہ سے زیادہ حیثیت اس کی کبھی نہ رہی۔

پھر آپ کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں جاں فروشی' جانبازی کی ایسی بے پناہ قوت کہاں سے آ گئی تھی کہ بڑے سے بڑے قلعے جو برسوں میں فتح نہیں ہو سکتے تھے' ہفتہ دو ہفتہ میں ان کا سقوط ہو جاتا تھا' حوصلوں کی وہ بلندی کہ آج دلی میں ہیں' کل لکھنوتی' پرسوں دیوگڑھی' چوتھے دن کھمبائت' معبر' ورنگل کے قلعوں کے نیچے ان کے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ رعب کی یہ حالت کہ آنکھ ملانے کی ہمت بھی دشمنوں کو نہیں ہوتی۔ ایک طرف یہ حال ہے۔ دوسری طرف تاتاریوں کا سیلاب آتا ہے اور سرحد ہی پر یا جس مقام پر وہ ظاہر ہوتے ہیں' وہیں روک دیئے جاتے ہیں۔

یہ واقعات ہیں خیالات نہیں ہیں۔ پھر انقلاب کی وجہ کیا ہوئی' یہ قوت مسلمانوں میں کس سرچشمہ سے بھری گئی؟ بات یہ ہے کہ یوں کہنے کو تو جو کچھ کہا جائے اور کہنے والوں نے جب علاء الدین کی کرامت ہی کا دعویٰ کیا ہے تو ظاہر ہے اور جو توجیہہ بھی کی جائے گی وہ اس سے زیادہ کیا تعجب انگیز ہو گی؟

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس میں سلطان المشائخ کے وجود کو جیسا کہ اس زمانہ میں بھی محسوس کیا گیا تھا' ہندوستان کی ''فوجی قوت'' کی اس خاص کیفیت کے پیدا کرنے میں ان کو بالکل بے تعلق نہیں کہا جا سکتا اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جسے ہم ماورائے عقل قرار دیں بلکہ واقعہ وہی ہے جس کا ایک دفعہ نہیں' متعدد بار تجربہ کیا گیا ہے اور جس کا جب جی چاہے تجربہ کر لے۔ وہ قرآنی آیات اور اس کی تعلیمات کا بے پناہ زور ہے۔ آپ سن چکے کہ سلطان المشائخ جس شعر سے خاص ذوق و مستی کی حالت میں آ جاتے تھے اور وہ زیادہ تر

فاعلم انه لا اله الا الله

''پس جان لے کہ نہیں ہے ''الٰہ'' مگر اللہ ہی۔''

کا فارسی ترجمہ ذرا شاعرانہ رنگ میں ہوتا تھا۔ اسی وقت وہ شعر سارے شہر بلکہ ملک میں مشہور ہو جاتا تھا۔ گلیوں میں کوچوں میں لوگ اسی کو دہراتے پھرتے تھے۔ سلطان المشائخ کے جن حالات کے ساتھ ان خاص اشعار کی شہرت مسلمانوں میں ہوتی رہتی تھی' کیا یہ ممکن تھا کہ جس دل میں ایمان کا حبہ خردل بھی ہوتا ہو گا' اس کا سینہ سلطان المشائخ کی اس بھڑکائی ہوئی آگ سے بھبھک نہ اٹھتا ہو گا۔ سلطان المشائخ کے زمانہ میں فراخنائے ہند کے قدیم جغرافیہ میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا' ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے۔ کاش! اس پر کچھ لکھا جاتا' صورت حال کے اندازہ کے لیے میں ''چندیری'' کی فتح کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوں جسے میر خورد نے خود سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے یعنی

''در عہد علائی والی از بادشاہ برائے فتح چندیری بالشکر بسیار متعین شد داد (والی) از معتقداں حضرت سلطان المشائخ بود۔''

میر خورد نے لکھا ہے کہ والی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور التماس کیا۔

''اگر یارے (خلفائے خاص میں سے کوئی خاص خلیفہ) از حضرت سلطان المشائخ نیز برمانام زد شود۔''

حضرت والا نے مولانا وجیہہ الدین یوسف کو لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

''و در ولایت چندیری رواں کرد۔''

اب خدا ہی جانتا ہے کہ حضرت کے یہ خلفاء فوج میں کس قسم کے جذبات پیدا کرتے تھے کہ

''در اندک روز فتح آں مقام شد۔''

آج اس غریب چندیری کا تو بہتوں کو نام بھی معلوم نہ ہوگا لیکن جس زمانہ میں مسلمانوں کو اس علاقہ پر کشمکش کرنی پڑی تھی، اس کا حال تاریخوں میں پڑھیے۔ ہر ہر پرگنہ جس کا سنگین اور خشتین قلعوں سے پٹا ہوا تھا، ابوالفضل نے صرف اس علاقہ کا جس کا نام اس زمانہ میں بارہ تھا، لکھا ہے۔

''محل، و ہر پنج پرگنہ قلعہ دارند ازاں جملہ چہار سنگین و پرگنہ مال خشتین۔''

خود چندیری خاص اور اس کے قریب للت پور تھنوارہ ہر جگہ ''قلعہ سنگیں'' بنے ہوئے ہیں لیکن اس علاقہ کی قلعہ کشائیوں کا جو کام برسوں میں بھی انجام نہیں پا سکتا تھا، بلبن کی قاہرہ حکومت بھی چندیری کی فتح سے مایوس ہو چکی تھی۔ آپ سن چکے کہ ''در اندک روز فتح آں مقام شد'' اور کیا صرف فتح کر کے ہی یہ سرزمین چھوڑ دی گئی؟ مجھے ذاتی علم تو نہیں ہے لیکن ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں اس علاقہ کے صرف ایک مرکزی شہر چندیری کے متعلق لکھا ہے کہ

''از بزرگ شہرہائے پاستانی (قدیم ہند) قلعہ سنگین دار و درو چہاردہ ہزار سنگین خانہ بزرگ و سہ صد و ہشتاد بازار و سہ صد و شصت فراخ سرا و دوازدہ ہزار مسجد۔'' (صفحہ 94)

آپ چودہ ہزار سنگین کوٹھیوں اور تین سو اسی بازار تین سو ساٹھ سراؤں کے متعلق جو چاہے رائے قائم کیجیے، خواہ انہیں قبل الاسلام کے کارناموں میں شمار کیجیے لیکن اس گمنام شہر کی بارہ ہزار مسجدوں کی توجیہہ میں بھی کیا اس کے سوا کچھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد یوسف وجیہہ الدین کے سوا یہ مسجدی مذاق کسی اور کا پیدا کیا ہوا تھا۔ تاریخ ہمیں جب یہ بتاتی ہے کہ

''خلق چندیری بخدمت مولانا محمد یوسف توجہ کرد'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 287)

میر خورد اپنی چشم دید گواہی کا بھی اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''کاتب حروف ایں بزرگ را دریافتہ بود، ذوق مجلس او گرفتہ بیشترے خلق چندیری مریدان او اند۔'' (صفحہ 280)

سچی بات یہی ہے کہ حضرت سلطان جی کے زمانہ میں ایمانی عواطف و جذبات کو بیدار کر کے جب قرآنی یقین کے قابو میں ان جذبات کو کر دیا جاتا تھا ''از بہر تو میرم از برائے تو زیم'' کی ٹھوکر سے جو آگ پیدا ہوتی تھی، اسے عقل

ان صلوتی ونسکی و محیای و مماتی لله رب العلمین٥

''میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب کچھ جہانوں کے پالنے والے اللہ ہی کے لیے ہے۔''

کے قطعی یقین کی گرفت میں دے دیتی تھی اور گو ''قرآن'' کی یہ ''روح'' بظاہر چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن سارے مخلوقات سے ٹوٹ کر واقعی اپنی پرورش کرنے والی لامحدود قوت کے ساتھ جو جٹ جاتا ہے، کیا دنیا بھر کی پھر کوئی طاقت

اس کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لاانفصام لھا

''اور جس نے طاغوت (خدا سے ہٹانے والی قوتوں سے رشتہ توڑا یعنی لا الٰہ کا مقام طے کیا) اور اللہ کو اس نے مان لیا (اللہ پر ڈٹ گیا) تو اس نے ایک ایسے مضبوط کڑے کو تھاما جس میں مشک بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔''

میں یہ نہیں کہتا کہ حضرت سلطان المشائخ جان بوجھ کر اس ذریعہ سے ہندوستان کی فوجی قوت کو بڑھانا چاہتے تھے' میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان کے عشق جہاں سوز کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں' جس قوت سے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھاما تھا' یقین کے جس نہ مسکنے والی چٹان پر انہوں نے قدم جمایا تھا' ان کے زمانہ میں انسانیت کو اپنے مالک کے قدموں پر جس اضطراب و بے تابی سے تڑپتے ہوئے ہندی مسلمانوں کی شکل میں پایا گیا تھا' ایمان کا یہ ذوق' یہ وارفتگی' یہ شوق' یہ ولولہ شاید اس ملک کو نہ اس سے پہلے نصیب ہوا اور نہ بعد' پھر اگر اس کے نتائج بھی بے مثال ہیں تو آخر آپ ہی بتایئے کہ اور ہوتا ہی کیا؟

ولئن متم او قتلتم لا الی اللہ تحشرون٥ (آل عمران)

''اگر تم مر گئے یا قتل ہوگئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔''

کے غیر مشتبہ علم کا دباؤ بھڑکے ہوئے جذبات پر پڑ جاتا تھا' تو کوئی وجہ ہوسکتی ہے کہ

سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا کعرض السموت والارض (آل عمران)

''لپکو اپنے مالک کی آمرزش اور بخشائش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمانوں اور زمین کی فراخی جیسی ہے۔''

کی تعمیل میں پھر کوئی پس وپیش کرسکتا تھا۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ)

مول لے چکا ہے اللہ ایمان والوں سے ان کی جانوں کو اس معاوضہ میں کہ انہیں ''الجنت'' ملے گی۔

کے ''وعدہ'' کے متعلق کسی مومن کا ایمان مجمل مفصل بن بن کر اگر ان خوارق ونوادر کا ظہور ان سے کراتا تھا جن کا مشاہدہ ہم اس زمانہ میں کر رہے ہیں تو جذبات وعقل وایمان تینوں کے باہمی اجتماع کا ہمیشہ لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے' افسوس ہے کہ بعد کو صرف جذباتی ہیجانات تو رہ گئے لیکن عقل ''یقین'' کے جس لازوال سرچشمہ سے سیراب ہوکر ان کے جذبات کو عملی پیکروں میں جلوہ گر کرتی تھی' بتدریج اس کا قرآن سے تعلق ٹوٹتا چلا گیا اور آخر میں وہی سماعی اشعار جن سے عمل پیدا ہوتا تھا' صرف ایک وقتی ہیجان اور کیفیت پیدا کر کے عمل کے میدان میں اپنے سارے زور وشور کھو بیٹھے تھے اور وہی بات صادق آتی تھی جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ

الغنا ینبت النفاق

''گانا نفاق اگاتا ہے۔''

وجد و حال کی مجلسوں کے سارے دعوے اعمال کے حلقوں میں پہنچ کر ایسی صورت میں جھوٹ بن جاتے ہیں اور

ع في الشمس ما يغنيك عن زحل اور یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں' جو کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر آپ جو چاہے رائے قائم کیجیے لیکن آپ جو کچھ سن رہے ہیں' آپ کو جو کچھ اب تک سنایا گیا ہے' کیا ان شنیدوں پر اپنے دیدوں کا قیاس کرنا صحیح ہوگا۔ کسی نے شیخ کبیر شکر گنج" سے ذکر کیا کہ مشائخ چشت کے طریقہ سماع پر بعض علماء کو اعتراض ہے۔ فرمانے لگے

''سبحان اللہ یکے سوخت وخاکستر شد' ودیگرے ہنوز در اختلاف ست۔''

آج کیا دیکھا جا رہا ہے اور کل کیا دیکھا گیا تھا' دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے۔ پچانوے سال کے بعد شیخ کبیر شکر گنج" کی اس ناسوتی دنیا میں آخری رات تھی' سلطان المشائخ راوی ہیں۔

''نماز خفتن (عشاء) بجماعت بگذارد' بعد ازاں بیہوش گشت ساعتے بہ ہوش آمد پرسید کہ نماز خفتن گذاردہ ام گفتند آرے' گفت یکبار دیگر بگذارم کہ داند چہ شود' دوم کرت نماز بگذارد باز بے ہوش شد ایں بار بے ہوش بیش تر شد باز بہوش آمد پرسید کہ من نماز خفتن گذاردہ ام گفتند دوبارہ بگذارم۔'' الخ (سیر الاولیاء۔ صفحہ 89)

الغرض یوں ہی پچانوے سال کی مشق سجدہ گذاری انہیں ہوش آنے کے بعد پھر اسی کام پر مجبور کرتی تھی جس کے لیے عمر بھر جیتے رہے' غالباً تین دفعہ یہ صورت پیش آئی۔ بعد ازاں ''برحمت پیوست'' اور اسی سیرت فریدی میں فانی ہو کہ جس نے بقا حاصل کی تھی' ایک کم نوے سال (89) کی عمر پائی تھی۔ ان ہی سلطان المشائخ کا بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ حال تھا

''پنج وقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع است فرود آمدے و بار درویشاں وعزیزاں کہ در آں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز گذارے دے۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 124)

اور ''عمارتے بس رفیع'' سے پانچوں وقت نیچے اتر کر جماعت کی شرکت عموماً روزہ کی حالت میں ہوتی تھی کیونکہ یہ تو صحیح نہیں ہے کہ آپ ایام محرمہ کے سوا ہمیشہ روزہ دار رہتے تھے' لیکن یہ صحیح ہے کہ مہینے کے زیادہ دن روزوں ہی میں بسر ہوتے تھے۔ علاوہ ان خاص مریدوں کے جن کا لقب آپ کے حلقہ میں ''یارانِ نظام الدین'' تھا اور جن کی تربیت کی شرط حضرت کے نزدیک

''در صحبت ما باش' یا ما در صحبت تو باشیم۔'' (صفحہ 321)

ان یارانِ خاص کے سوا' آپ نے بیعت کے دائرہ کو جب بہت زیادہ وسعت دے دی تو مولانا ضیاء الدین برنی جو آخر میں حضرت ہی کے آستانہ پر آکر پڑ گئے تھے' ان کا بیان ہے کہ حضرت نے ایک دن مجھ سے اس بیعت عام کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا' آپ نے پہلے تو اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ بیان کی جس کا حاصل یہ ہے کہ ابتدا میں مشائخ

طریق ان ہی لوگوں کی تربیت فرماتے تھے جو بالکلیہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اللہ اور رسول کے دین اور دین کی خدمت میں مستغرق ہونا چاہتے تھے لیکن شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابوسعید ابوالخیر سیف الدین باخرزی کے زمانہ سے بیعت، توبہ اور تبرک کا رواج بھی جاری ہوا۔ شیخ کبیر شکر گنج نے بھی یہی مسلک اختیار فرمایا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ کی اتباع میں اب یہی کرنے لگا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ

''بہ تواتر می شنوم کہ بسیاراں از درآمدن ارادت من، دست از معصیتے میدارند و نماز بجماعت می گذارند بار ورادو نوافل مشغول می باشند۔''

درد بھرے لہجے میں اس کے بعد ارشاد ہوا۔

''می بینم مسلمانے بعجز واضطراب و مسکنت و بیچارگی بر من می آید و می گوئد کہ از جملہ گناہاں توبہ می کنم من بہ نیت آں کہ شاید سخن او راست باشد دست بیعت می دہم۔'' (صفحہ 347)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی اصلی غرض عام پیری مریدی سے کیا تھی؟ ہا! جن کی ساری عمر اسی سوز و ساز درد و تپش میں گذری کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر کی امت کو پیغمبر کے قدموں تک پہنچا دیا جائے۔ سلطان المشائخ عموماً فرمایا کرتے کہ ہمارے طریق کی پہلی شرط یہ ہے کہ ''طلب جاہ و کرامت نباشد'' صرف توبہ اور استقامت مطلوب ہے، پھر استقامت کا مطلب خود ہی یہ فرماتے کہ

''استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد و ہیچ مستحبے و آدابے از وفوت نہ شود۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 328)

یہی طریقہ میں داخل ہونے کی غرض تھی۔ لوگوں کو ''مرگ'' کے ساتھ پکڑا جاتا تھا، تب جا کر کہیں ''فرائض'' ''نماز جماعت وغیرہ کی'' ''تپ'' پر راضی ہوتے تھے لیکن آج امت کی پچھلی نسلیں پہلی نسلوں پر لعنت کرتے ہوئے جسے پیغمبر ہی نے قیامت کے ہولناک علامات میں شمار کیا ہے، ان ہی بزرگوں پر خلاف سنت او بلکہ بعض تو خلاف اسلام تک چلنے کا فتویٰ لگا رہے ہیں۔ گذر چکا کہ آج اس کی ریسرچ ہو رہی ہے کہ مسلمان صوفیوں نے افلاطن جدید مصری سے کیا لیا، یونانیوں سے کیا سیکھا، ایران کے آتش پرستوں سے کون کون سی چیز اخذ کی۔ ہندوستان کے جوگیہ کے کن کن اشغال و اعمال کو اپنے طریقہ میں داخل کیا، گویا اسلام کا خود اپنا کوئی سرمایہ کسی باب میں کچھ نہیں ہے۔ فقہ رومیوں اور ایرانیوں سے لی گئی، تصوف اشراقیوں اور جوگیوں سے چرایا گیا، ظاہر و باطن کی تعمیر ان ہی دونوں چیزوں سے ہوتی ہے۔ جب دونوں ہی ہمارے اکابر عیاذ باللہ منتحل اور سارق نکلے تو پھر اپنا ہمارے پاس کیا رہ گیا۔ قرآن نے ہمیں کیا دیا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا ملا؟ مگر میں کیا کروں، ڈھونڈ ھتے ڈھونڈ تے تھک گیا۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور مرکزی صوفی سلطان المشائخ کا مطالعہ ایک زمانہ سے کر رہا ہوں، اب تک ان کے متعلق ہمیں اس کا بھی ٹھیک طریقہ سے پتہ نہیں چلا کہ وہ ذکر اور مراقبہ کے عام طریقہ کے سوا کسی خاص طریقہ ذکر یا مراقبہ کی بھی تعلیم دیتے تھے، مثلاً فلاں رگ دبائی جائے، فلاں عضو کو فلاں جگہ رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ چیزیں اگر ملتی بھی ہیں تو اسی قسم کی، مثلاً ذکر ہو رہا تھا کہ مربع طریقہ کی نشست بنا کر

یعنی آلتی پالتی مار کر اگر کوئی بیٹھے اور ذکر کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس طریقہ سے بیٹھ کر ذکر کرنے کی ایک صورت جائز ہے اور ایک ناجائز۔ جائز صورت کے متعلق الفاظ مبارک یہ ہیں۔

''جائز خلاف نشستن جوگیان است کہ ہر دو قدم زیر ہر دو زانو باشد۔'' (صفحہ 444)

ظاہر ہے کہ اٹھنے بیٹھنے کا معاملہ چنداں اہمیت (34) نہیں رکھتا' اسی لیے جواز و عدم جواز کے الفاظ کو اولیٰ اور خلاف اولیٰ ہی پر محمول کیا جائے گا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی بات یعنی بیٹھنے کی ہیئت تک کے متعلق بھی ان کا خیال تھا کہ جوگیہ کی چونکہ وہ نشست ہے' اس لیے مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے' انہیں بزرگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے اپنا سارا طریقہ جوگیہ یا اشراقیہ کو دیکھ کر مرتب کیا ہے' کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے' پہلے بھی بعض اجزا کا اس کے متعلق ذکر آچکا ہے۔ کیا تماشے کی بات ہے جس کے تربیت یافتوں کی یہ ذہنیت ہو اور جس کی مجلس مبارک میں اس حدیث کے متعلق جس میں ہے کہ کوئی مسافر اگر بیابان ٹاپو میں تنہا پڑ جائے یا ایسی حالت میں کسی کی سواری کا جانور بھاگ جائے تو ایک صحابی سے نہیں' ابن مسعود ابن عباس عقبہ بن غزوان تین تین صحابیوں سے مروی ہے کہ ایسے وقت میں مسافر کو چاہیے کہ

اعینوا یا عباد اللہ رحمکم اللہ

''مدد کرے اے اللہ کے بندو! اللہ آپ پر رحم کرے۔''

یا بعض روایتوں میں ہے

یا عباد اللہ اعینو نی یا عباد اللہ اعینونی

''اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو اللہ کے بندو میری مدد کرو۔''

حصن حصین میں مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے۔ نووی نے ''کتاب الاذکار'' میں مسند بزار اور ابن السنی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ محدثین کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تحسین و توثیق کی ہے۔ اگرچہ بعضوں کو روایت کے بعض راویوں کے متعلق شک بھی ہے' تاہم شراح حدیث میں سے بعض معتبر لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً نووی ارقام فرماتے ہیں۔

حکی لی بعض شیوخنا الکبار فی العلم انفلتت بہ دابة اظنھا بغلة وکان یعرف ھذا الحدیث فقال لہ حبسھا اللہ علیھم فی الحال وکنت مرة مع جماعة فانفلتت بھیمة فعجزو اعنھا فوقفت فی الحال بغیر سبب سوی ھذا الکلام

''میرے بعض کبار اساتذہ نے مجھ سے بیان کیا یعنی علم میں جن کا مقام بڑا تھا' انہوں نے بیان کیا کہ ان کا جانور سواری کا چھوٹ پڑا' میں خیال کرتا ہوں کہ خچر تھا' ان بزرگ کو یہ حدیث معلوم تھی' وہی الفاظ انہوں نے دہرائے جو حدیث میں آئے ہیں' معاً جانور وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ خود میں بھی ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ تھا کہ جانور چھوٹ پڑا۔ پکڑنے والے عاجز ہو گئے۔

میں نے اس وقت حدیث کے الفاظ کا استعمال کیا' جانور وہیں کھڑا ہو گیا اور کوئی سبب اس کے کھڑے ہونے کا پیش بھی نہ آیا بجز اس کے کہ حدیث والے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔''

مگر باوجود ان تمام باتوں کے آپ اندازہ کیجیے' اس ذہنیت کا جو سلطان المشائخ کی صحبت مبارک میں پیدا ہوتی تھی یعنی اسی ''اعینونی یا عباد الله'' والی روایت کا ذکر کر کے کوئی خارجی آدمی نہیں بلکہ مقربین خاص میں جن کا شمار تھا اور جو ازسرتاپا سلطان المشائخ کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا' میری مراد خود جامع ملفوظات امیر حسن علاء سجزی سے ہے وہی لکھتے ہیں کہ

''بندہ عرضداشت کرد کہ این دعا چہ گونہ است کہ مردمان می خوانند اعینونی یا عباد الله رحمکم الله۔''

پوچھنے کی کیا غرض تھی خود ہی لکھتے ہیں

''مقصود بندہ این بود کہ معونت از غیر خدا خواستن چہ گونہ بود۔'' (فوائد الفواد۔ صفحہ 146)

''معونت از غیر خدا خواستن چگونہ بود'' بس مجھے صرف اسی فقرہ کی طرف توجہ دلانی ہے' باوجودیکہ دعا حدیث کی ہے' ایسی حدیث بھی نہیں جو موضوع اور بالکلیہ بے سروپا ہو بلکہ گذر چکا کہ محدثین ثقات کا ایک طبقہ اس کی تحسین کرتا ہے بلکہ اپنے مختلف تجربات سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہے' خود طبرانی نے بھی اس حدیث کی روایت کے بعد

وقد جرب ذلک

''اس کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔''

لکھا ہے' یوں بھی کسی خاص شخص کو پکارا نہیں جاتا بلکہ اللہ کا کوئی بندہ ہو' ملائکہ میں ہو' جن میں ہو' انسان میں ہو' کوئی بھی ہو۔ اگر یہاں موجود ہو تو میری مدد کرے اور پکارا بھی جاتا ہے تو معبود بنا کر نہیں بلکہ عباد اللہ (اللہ کے بندوں) کے الفاظ سے پکارا جاتا ہے۔ رحمکم الله (اللہ تم پر رحم کرے) کے الفاظ سے اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ ہماری طرح تم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے محتاج ہو۔ اب اس کے ساتھ اس کو ملا لیجیے کہ قرآن مجید کے

ان کل نفس لما علیها حافظ ان علیکم لحافظین

''ہر شخص پر ایک نگران یقیناً ہے۔ تم پر نگران قطعاً ہیں۔''

وغیرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ کچھ فرشتے بھی رہتے ہیں' حدیثوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ اطراف ارض میں گھومتے رہتے ہیں۔ نیز روایتوں کا ایک مجموعہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے جن سے ابدال کے نظریہ [35] کی تائید ہوتی ہے۔ عام طور پر جنہیں رجال الغیب کہتے ہیں اور ان سب کو بھی جانے دیجیے' پکارنے والا تو پکارتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں کوئی ہو تو آ کر میری مدد کرے۔ کون جانتا ہے کہ کسی چلنے پھرنے والے یا جھاڑ جنگل میں کوئی آدمی ہی ہو' جس کے کان میں آواز پہنچ جائے۔ جب عباد اللہ کا لفظ عام ہے تو سب ہی کی اس میں گنجائش ہے اور شراح حدیث نے عموماً سارے احتمالات لکھے بھی ہیں۔ خود سلطان المشائخ نے امیر حسن

علماء کو جو جواب دیا کہ

''دریں عباد اللہ مسلمین ومخلصین مضمرست۔''

یعنی اللہ کے نیک اچھے مخلص بندے مقصود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا اشارہ ابدال والے رجال الغیب کی طرف ہو یا یہی بات کہ اِدھر اُدھر کوئی اللہ کے اچھے نیک بندے ہوں' وہ اس آواز کو سن کر پہنچ جائیں۔ بہرحال اس طریقہ سے عباد اللہ کو عون اور مدد کے لیے پکارنا ظاہر ہے کہ ایسی نامحسوس غیبی ہستیوں کو بھی پکارنا نہیں ہے' جن کے وجود کا کوئی ثبوت (36) نہ ہو مگر آپ دیکھ رہے ہیں' توحیدی معرفت کے احساس کی نزاکتوں کو دیکھ رہے ہیں کہ اس میں بھی سلطان المشائخ کے صحبت یافتوں کو ''معونت از غیر خدا خواستن'' کا شبہ ہوتا ہے۔

اللہ اللہ جس کے حلقہ اخلاص وصفا میں وحدت کا یہ رنگ پیدا ہوتا تھا' اسی شاہباز فضاء تفرید ویکہ تاز میدان تجرید پر آج الزام لگایا جارہا ہے کہ قرآن کے نص محکم

ماکان اللہ لبشران یوتیہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول الناس کونوا عباد الی من دون الناس

''خدا ایسا نہیں کرتا کہ کسی آدمی کو کتاب اور ''حکم'' والنبوت عطا کرے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے نہیں بلکہ میرے بندے تم لوگ بن جاؤ۔''

کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے فرمان ربانی

واسجدو للہ ان کنتم ایاہ تعبدون

''اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔''

کے علی الرغم محمد رسول اللہؐ کے ان ہی امتیوں کو جن کے نزدیک غیر اللہ کی عبادت انسانیت کی سب سے بڑی تباہی اور جہنم کے ابدی عذاب کا مستحق بناتی ہے' ان ہی لوگوں سے اپنے آگے سجدے کراتا تھا' ان کو بجائے اللہ کے ''عباد الی'' (اپنا بندہ بناتا تھا) اور دلیل میں کیا پیش کیا جاتا ہے؟ چند مشتبہ الفاظ یعنی جہاں دست بوسی' پائے بوسی کے الفاظ کی صراحت پائی جاتی ہے۔ وہیں بعض عبارتوں میں ''سر برزمیں نہاد'' کے الفاظ بھی کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس ''سر برزمین نہادن'' کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعتہً لوگ سلطان المشائخ یا شیخ کبیر شکر گنج'' کے سامنے سجدے کرتے تھے؟ اب میں لوگوں سے کیا کہوں' مختلف زمانوں میں مختلف محاورات چل پڑتے ہیں۔ لغوی معنی ان الفاظ کے اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی دوسرے' سارا فتنہ محض اس پر مبنی ہے کہ اس زمانہ کی جو اصطلاح تھی' جو دستور تھا' اس سے قطع نظر کر کے حریفوں نے ان الفاظ کے معانی لغت کی کتابوں میں دیکھنے شروع کیے؟ حالانکہ کچھ نہیں تو کم از کم یہ لوگ اسی کو دیکھتے کہ اس فعل کے جواز میں جو دلیل سلطان المشائخ سے منقول ہے' وہ کیا ہے۔ وہی دلیل بتا سکتی تھی کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے۔ میر خورد تو عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں سمجھے جاسکتے۔ وہی یہ لکھنے کے بعد کہ ''کاتب حروف بخط مبارک سلطان المشائخ نوشتہ دیدہ است'' ارقام فرماتے ہیں کہ اس فعل کے جواز کی دلیل یہ ہوسکتی ہے کہ

قال صہیب رأیت علیا یقبل ید العباس ورجلہ (صفحہ 340)

''حضرت صہیبؒ فرماتے ہیں' میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔''

یعنی حضرت علیؓ اپنے چچا عباس کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں کو بھی احتراماً چومتے تھے' اب آپ خود غور کیجیے اس سے کیا ثابت ہوا' صرف یہی نا کہ پاؤں چومنے کے وقت چومنے والے کا سر چونکہ بالکل زمین کے قریب ہو جاتا ہے' اس لیے ثابت ہوا کہ پاؤں چومنے کی وجہ سے اگر سر کسی کے سامنے اتنا جھک جائے کہ پاؤں سے اور زمین جس پر پاؤں عموماً رکھے رہتے ہیں' قریب ہو جائے تو صہیب کی اس روایت سے اتنا انحناء اور جھکاؤ کا جواز نکلتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پائے بوسی کی وجہ سے سر میں اتنا جھکاؤ جو پیدا ہو جاتا ہے کہ قریب قریب سر زمین ہی پر چلا جاتا ہے' اس لیے ایک صورت سجدے کی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے چاہیے یہی تھا کہ جب غیر اللہ کے سجدے کو اسلام میں حرام کر دیا گیا ہے' پائے بوسی بھی جس میں سجدے کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے' ناجائز ہو جاتی لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پائے بوسی کا ثبوت ملتا ہے تو پائے بوسی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ تو کوئی اور بات اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتی۔ پھر کیا ہوگا؟ یہی بات کہ لوگ قدم بوسی پر اس زمانہ میں معترض ہوتے تھے کہ اس میں سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کا قصہ بھی ''فوائد الفواد'' میں منقول ہے کہ روم و مصر و شام کی سیاحت کر کے آیا تھا' کسی کو قدم بوسی کرتے ہوئے اس حال میں جو اس نے پایا تو اس نے منع کیا کہ سجدہ اسلام میں ناجائز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ بذات خود اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ لوگ ہاتھ کے سوا قدم چومنے کے لیے بھی میرے سامنے سر جھکائیں' خود ''سیر الاولیاء'' میں میر خورد نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''در پیش من کہ روئے بر زمین من آورند من کارہ ام۔'' (صفحہ 341)

اور وہ چاہتے تھے کہ قدم بوسی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ لوگوں کے سر زمین کی طرف چلے جاتے ہیں' ایک گونہ سجدے کی شکل پیدا ہو جاتی ہے' اس کو منع کر دیں لیکن ان کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج بھی قدم بوسی سے لوگوں کو منع نہیں فرماتے تھے' اس لیے منع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ عجب جملہ لکھا ہے کہ

''از دو چیز یکے لازم آید یا تحصیل مشائخ یا تفسیق ایشاں۔''

یعنی یہ سمجھا جائے کہ شیخ کبیر اس حکم ہی سے ناواقف تھے کہ قدم بوسی جائز نہیں ہے یا عدم جواز کے علم کے باوجود شریعت کے حکم کی خلاف ورزی العیاذ باللہ کرتے تھے جو ظاہر ہے کہ فسق ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت علیؓ کے اس اثر سے بھی ان کو گونہ مدد مل گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ''کارہ'' ہونے کے لوگوں کو انہوں نے اس فعل سے منع نہیں کیا۔

لوگوں کو فقہاء کا مسلک چونکہ معلوم نہیں ہے' اس لیے سمجھتے ہیں کہ اگر صرف ''قدم بوسی'' ہی کا مسئلہ تھا حالانکہ قدم بوسی کی وجہ سے سر گویا زمین ہی سے آ لگتا ہے ورنہ آخر قدم بوسی کی صورت ہی کیا ہوگی۔ کیا جس کے قدم چومنا چاہے گا' اس کی ٹانگ اٹھا کر اوپر کرلے گا۔ مقصود جب اعتراف فضل اور اظہار احترام ہے تو ظاہر ہے کہ چومنے والے کو ہی جھکنا پڑے

گا اور اتنا جھکنا کہ جہاں قدم رکھے ہوئے ہیں' وہیں تک اپنا منہ لے جائے۔ ایسی صورت میں سر یقیناً زمین سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور گونہ سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے بعض فقہاء نے علماء اولیاء صالحین بلکہ سلاطین کی دست بوسی کی اگر اجازت بھی دی ہے تو قدم بوسی کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مخلوق کے ہاتھ چومنے کی اجازت دے رہے ہیں تو اسی مخلوق کے پاؤں چومنے میں کیا خرابی ہو سکتی تھی مگر وہی بات کہ قدم بوسی میں سر زمین تک آ جاتا ہے۔ عدم جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ ''عالمگیری'' میں ہے۔

طلب من عالم او زاهد ان يدفع اليه قدمه ليقبله لا يرخص فيه

''کسی عالم یا زاہد سے کوئی استدعا کرے کہ اپنے قدم اس کی طرف بڑھائیں تا کہ وہ ان کو بوسہ دے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

حتیٰ کہ اسی انحناء اور جھکاؤ کی وجہ سے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلام کرنے کے وقت آدمی کو بالکل سیدھا رہنا چاہیے' بدن یا سر میں کسی قسم کا جھکاؤ نہ پیدا کرنا چاہیے۔ ''عالمگیری'' میں ہے۔

يكره الانحناء عندالتحية وبه ورد النهى كذا فى التمرتاشى

''سلام کے وقت بھی جھکاؤ مکروہ ہے' اس سے منع کیا گیا ہے' التمر تاشی میں مسئلہ یونہی ہے۔''

اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی فقہی عبارتوں کی وجہ سے سلطان المشائخ کا دل اس جھکاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا جو قدم بوسی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا مگر ان کی یہ قلبی ناپسندیدگی عملی شکل اختیار نہ کر سکی جس کے اسباب انہوں نے خود ہی بیان بھی فرما دیئے ہیں کہ اپنے اسلاف کی تجہیل یا تفسیق کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ سلطان المشائخ کا یہ فعل یعنی قدم بوسی اور قدم بوسی کے انحنا و مفرط کی وجہ سے سر بر زمین نہادن کی جو شکل پیدا ہو جاتی ہے' واقع میں یہ جائز ہے یا ناجائز۔ اس کا فیصلہ تو علماء ہی کر سکتے ہیں' فقہ کی عبارت آپ دیکھ چکے۔ ایک طرف یہ قصہ ہے' دوسری طرف حضرت علیؓ کا یہ اثر امام بخاری کی ''کتاب الادب المفرد باب'' (445) میں ہے۔ اسی باب میں وفد عبدالقیس کے ایک رکن الوازع بن عامر سے روایت ہے کہ ہم جب خدمت میں آئے تو آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ ہم سب نے دیا۔ مشکوٰۃ کی کتاب الایمان میں روایت ہے کہ دو یہودی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کی ''نو آیات'' کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہیں۔ آنحضرتؐ نے جواب میں نو چیزیں جو شریعت موسوی میں ممنوع تھیں' جن میں بجز سبت کے حکم کے اسلام میں بھی ممنوع ہیں' ان کا ذکر فرمایا۔ دونوں یہودیوں نے حضورؐ کے اس جواب کو جب سنا تو حدیث میں اس کے بعد ہے کہ

فقبلا يديه ورجليه وقالا نشهد انك نبى

''پس ان دونوں یہودیوں نے رسول اللہؐ کے دونوں ہاتھوں اور پائے مبارک کو بوسہ دیا اور بولے کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔''

آگے اور باتیں ہیں۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ حضرت علیؓ والا اثر معلوم نہیں کس کتاب میں ہے لیکن یہ حدیث تو صحاح

ستہ کی مشہور حدیثوں میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کی قدم بوسی ان یہودیوں نے کی۔

بہر حال اہل علم کا فتویٰ جو کچھ بھی ہو لیکن میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں' ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں جنہوں نے اسی قدم بوسی اور انحناء مفرط والی شکل کو باضابطہ سجدہ بنالیا اور دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ سلطان المشائخ کا مذہب تھا کہ مرید پیر کو سجدہ کرسکتا ہے' العیاذ باللہ بات کہاں سے کہاں پہنچادی گئی۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے بجائے قدم بوسی کے واقعی وہی نماز والا سجدہ کرایا کرتے تھے تو جن فقہاء نے ان پر سماع کا الزام لگا کر طرح طرح سے بدنام کیا تھا تا آنکہ بات حکومت تک پہنچی' خود غیاث الدین تغلق کو اپنے شاہی دربار میں مجلس مناظرہ منعقد کرانی پڑی' دونوں طرف کے علماء جمع ہوئے۔ وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ آج چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اس مجلس مناظرہ کا شور وغوغا گونج رہا ہے۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہو' سماع وہ بھی بغیر مزامیر والا کیوں کہ گذر چکا کہ مزامیر کو تو خود سلطان المشائخ محرمات میں شمار فرماتے تھے' اس غیر مزامیری سماع کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں تھا جتنا کہ سجدہ والا مسئلہ۔ سجدہ کا حال کہ غیر اللہ کے سامنے بہ نیت عبادت تو کفر ہے شرک ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کے کسی فرقہ کو بھی اس کے کفر وشرک ہونے میں اختلاف ہوگا۔ رہ گیا وہ سجدہ جس میں ساجد اپنی عبدیت اور بندگی اور غایت فقر وتذلل کو نہیں بلکہ جسے سجدہ کیا جائے یعنی مسجود لہ کے احترام اور عظمت کا اظہار اپنے سجدوں سے کرنا چاہتا ہو' وہی جسے عموماً سجدہ تعظیمی کہتے ہیں چونکہ کسی دوسرے کی عظمت یا فضل کا اعتراف جو سجدۂ تعظیمی کی روح ہوتی ہے' یہ ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے بظاہر اس سجدہ میں وہ خرابی جو سجدۂ عبادت میں پائی جاتی ہے' نہیں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے فقہاء اسلام تعظیمی سجدہ جو غیر اللہ کو کیا جائے' اس کو کفر وشرک تو نہیں قرار نہیں دیتے لیکن چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ نے خود اپنے لیے بھی صحابہ کو سجدہ کی اجازت نہیں دی تو ظاہر ہے کہ اور کسی کو کب اس کی اجازت ہوسکتی ہے۔ خود قرآنی آیت

واسجدو للہ ان کنتم ایاہ تعبدون

''اللہ ہی کو سجدہ کرو' اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو۔''

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے' اسے چاہیے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرے۔ بہر حال ان ہی وجوہ سے سجدہ تعظیمی کے متعلق فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لیے وہ بھی جائز نہیں ہے۔ ''عالمگیری'' میں تو لکھا ہے

لایکفر ولکن یاثم لارتکابہ الکبیرۃ وھو المختار۔ (صفحہ 369)

''غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائے گا' اس لیے کہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔''

جس سے معلوم ہوا کہ مذہب مختار فقہاء کا یہی ہے کہ سجدہ تعظیمی کفر تو نہیں ہے لیکن کبیرہ گناہ ہے۔

یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ العیاذ باللہ اگر فی الحقیقت سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے تھے' خواہ تعظیمی ہی سہی' تو فقہ کی کتابوں میں جسے ''کبیرہ'' قرار دیا گیا ہے' اس الزام کو چھوڑ کر غیر مزامیری سماع کا الزام ان پر کیوں لگاتے۔ اس قسم کے سماع کا مسئلہ اتنا تو سخت نہ تھا جتنا کہ سجدہ کا مسئلہ۔ سماع میں تو بہت کچھ گفتگو ہوسکتی (37) تھی'

دیگر آئمہ کے سوا غیر مزامیری سماع کی حد تک تو فقہ حنفی میں بھی گنجائش پیدا ہو سکتی تھی، بخاری اور مسلم کی حدیثوں سے اس قسم کے سماع کا جواز پیدا کیا جا سکتا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ کا رجز پڑھنا اور آنحضرتؐ کا بھی ساتھ دینا ''ابینا ابینا'' کے لفظ کو ذرا بلند آواز کے ساتھ ادا فرمانا انجشہ والی روایت، جواری مغنیات کی روایت عبداللہ بن رواحہ سے ''ھات من ھتیاتک'' وغیرہ وغیرہ۔ بیسیوں صحیح آثار اس کے ثبوت میں پیش ہو سکتے تھے لیکن سجدہ کے جواز کی کیا صورت تھی۔ ان کو گرفت کرنی تھی تو سب سے آسان بات تو یہی تھی خدانخواستہ اگر واقعی ان کے سامنے لوگ سجدے کرتے تو سلطان المشائخ کے پاس اس کے جواز کی کیا سند ہوتی، نہ کوئی قرآنی آیت، نہ حدیث، نہ فقہ، میرے نزدیک یہ خود دلیل ہے کہ وہ سجدہ ہی نہ تھا بلکہ وہی قدم بوسی کی شکل تھی جس میں انحناء مفرط کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ آپ ''فوائد الفواد'' اٹھا کر پڑھیے۔ میر حسن علاء سجزی عموماً یہی لکھتے ہیں۔

''سعادت پائے بوس بدست آمد۔'' ''سعادت پائے بوس حاصل شد۔''

''بہ سعادت پائے بوس رسید۔'' ''دولت پائے بوس حاصل آمدہ۔''

میں نے یونہی کتاب کھولی اور صفحہ 154، صفحہ 155، صفحہ 156 سب ہی جگہ یہی الفاظ نظر آئے۔ اگر یہ لوگ سجدہ کرتے تھے تو پھر وہی لکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کیفیت کی تعبیر کبھی انہوں نے ''سر بر زمین آورد'' وغیرہ الفاظ سے کی ہو۔ گو مجھے خیال نہیں ہے لیکن اس کا مطلب بھی وہی ہے اور یہی ہونا چاہیے۔ مجھے تو حضرت والا کے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے شکایت ہے۔ دوست تو اس کے درپے ہیں کہ عیاذاً باللہ ان کی تفسیق کا سامان مہیا کریں اور دشمن شاید تجہیل کے درپے ہوں لیکن مسلمانوں نے کابراً عن کابرٍ اً عن جد مسلسل جن کے صلاح و تقویٰ کی روایتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچائی ہو، کیا یہ مناسب نہ تھا کہ ہم ان اکابر کی تفسیق یا تجہیل کی جگہ اگر کوئی بات ایسی نظر آئے تو اس کی تاویل کریں اور میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، یہ تو تاویل نہیں بلکہ ان شاء اللہ یہی واقعہ ہے اور اسی کی واقعیت پر مجھے اصرار ہے۔ (38)

حضرت سلطان المشائخ پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ باوجود ان گراں قدر فتوحات اور ''لامحدود آمدنی'' کا ذکر کر کے یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان پر حج فرض ہو گیا تھا اور باوجود فرض ہونے کے انہوں نے اعراض کیا، یہ صحیح نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کا ''زلزالی عہد ابتلاء'' جب ختم ہو گیا تو ان پر فتوحات کے دروازے ضرور کھلے اور خوب کھلے لیکن اغنیا سے جو کچھ لیا جاتا تھا، لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ خود اپنے لیے لیا جاتا تھا، ان کے محبوب رسول (علیہ السلام) کا تو حکم تھا کہ

توخذ من اغنیائھم وتقسم علی فقرائھم

''لیا جائے امیروں سے اور بانٹا جائے مسلمانوں کے غرباء اور فقراء پر۔''

جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی ''قاسم'' ہونے کی حیثیت سے گذاری، دیوانوں نے سمجھ لیا کہ وہ ان آمدنیوں کے مالک تھے، مالک ہوتے تو چوبیس گھنٹوں میں اپنے لیے ''صرف چند پرکالہائے نان و سبزی و کریلہ تلخ'' کی افطاری اور کھچڑی کی سحری جو کبھی کھائی جاتی تھی اور کبھی یوں ہی واپس کر دی جاتی تھی کہ بہت سے لوگ دکانوں میں اور سڑکوں پر

بھوکے پڑے ہیں۔

صرف پنڈالوں اور تقریر کے اسٹیجوں تک غرباء کے حقوق کے محافظ کو کون سمجھا سکتا ہے کہ جن غریبوں کی صورت دیکھنی بھی تمہیں ناگوار ہو کاش! تم دیکھتے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ان ہی بزرگوں کے دسترخوان پر ان بیچاروں کو وہ سب کچھ ملتا رہتا تھا جس کے نام سے بھی امراء نے ان کو محروم رکھا تھا۔ کیا ان بزرگوں کے دسترخوان پر صرف امراء بیٹھتے تھے؟ اب میں کیا بتاؤں سلطان المشائخ ہی ایک شخص کی تصویر ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں۔

''مردے ژندہ پوشے گلیمے سیاہ در بر و سر بندے ریمگیں بر سر۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 115)

پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔

''در جماعت کندوری[39] (دسترخوان) کشیدہ بودند و آمد سلام کرد و مائدہ (خوان) نشست۔''

صرف کھانے ہی کی اجازت نہ تھی کہ جو کچھ دسترخوان پر موجود ہو آزادی کے ساتھ کھا سکتے ہو بلکہ اس کی بھی کہ لے جانے کی خواہش ہو تو لے بھی جا سکتے ہو۔ اسی خستہ حال فقیر ہی کے ذکر میں ہے کہ جب دسترخوان بڑھایا جا چکا تو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ

''بعد فراغ طعام اور اندیدم پرسیدم کہ آں درویش چیزے خورد۔''

سنیے نظماء دسترخواں کیا جواب دیتے ہیں۔

''گفتند چہار نان و قدرے شوربا در کاسہ چوبیں انداخت و پیش خانقاہ مقابل بلندی بود بہ نشست و نان بخورد و رفت۔'' (صفحہ 11)

یہ ایک جزئی واقعہ ہے۔ اسی سے آپ کو ان بزرگوں کے دسترخوان کا قانون معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کس قسم کے لوگوں کو اس ''خوانِ یغما'' پر بیٹھنے کی اجازت تھی بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ شناسائی کی بھی ضرورت نہ تھی اور جن کا حال یہ ہو کہ جیسا کہ میر حسن علاء نے ''فوائد الفواد'' میں نقل کیا ہے کہ

''دولت پائے بوس بدست آمد طعام پیش آوردند' خوردن گرفتند۔''

کھانا شروع ہو گیا' اس وقت سلطان المشائخ ایک قصہ کسی بزرگ کا ان الفاظ میں بیان فرمانے لگے۔

''بزرگے گفتہ است کہ خلق پیش من طعام می خورند من آں طعام را در حلق خود یابم یعنی گوئی آن طعام من می خورم'' (صفحہ 77)

ظاہر ہے کہ اگر کسی بزرگ کا یہ حال ہوگا تو خود کہنے والا اس قصہ کو اپنے کسی تجربہ کی بنیاد پر اس وقت دہرا رہا ہوگا جب اس کے دسترخوان میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

آج جن میزوں پر الوانِ نعمت کے لقموں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے' گویا یہ بھی ایک قسم کا حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں۔ ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج

داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا' گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا' لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مال گذاری داخل کرنی پڑتی تھی۔ اسی بادشاہ کے ذکر میں طباطبائی نے لکھا ہے۔

''شیخ نظام الدین معروف باولیاء درزمانِ او (علاء الدین) بود اگرچہ سلطان در ظاہر باشیخ ملاقات نمی کرد' امابار سال رسل ورسائل وتحائف وہدایا رسم اخلاق می سپرد۔'' (صفحہ 119)

علاؤالدین کو جتنا بھی بے شعور قرار دیا جائے لیکن آخر دور والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو کیا اتنے قریب سے بھی اپنی فوجی قوت کے حقیقی مخزن کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی فوجی قوت نے غیر معمولی طور پر جو اہمیت حاصل کرلی تھی' اس کی تہ میں حضرت سلطان المشائخ کے توحیدی جوش وخروش کا زور چھپا ہوا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غرباء فقراء تک ان کا حصہ پہنچایا جاتا تھا اور یہی مطلب ہے اس مشہور فقرہ کا کہ ''مال صوفی سبیل ست'' (فوائد الفواد۔ صفحہ 95) یعنی راستوں پر پانی پلانے کی جو سبیلیں لوگ کھولتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کو اختیار ہے کہ بغیر کسی معاوضہ کے پانی پیے' صوفیا کے پاس جو آمدنی آتی ہے' اس کا بھی یہی حال ہے۔ ''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے بھی یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے۔ خود سلطان جی نے وفات سے پہلے حکم دیا کہ جو کچھ غلہ ساز وسامان میری خانقاہ میں ہے' اسے لوگوں میں تقسیم کردیا جائے اور وفات ہی کے وقت نہیں' یوں بھی عام دستور ساری زندگی میں یہی رہا کہ جو کچھ آمدنی ہفتہ بھر میں ہوتی' وہ تقسیم ہوتی رہتی اور

''در ہر جمعہ تجرید فرمودے وحجر ہا وانبار خانہا خالی کنانیدے چنانکہ جاروب می کردند بعدہ در مسجد جمعہ رفتے۔''

میر خورد نے لکھا ہے کہ اگر کسی دن اتفاق سے غیر معمولی آمدنی آ جاتی یعنی

''وقتے اگر فتوحے گراں رسیدے گریہ بیش تر کردے وجہد بیش تر فرمودے کہ زود تر تفرقہ جلد تقسیم کردکنید وساعۃ۔'' ''فساعۃ کساں می فرستاد کہ تفرقہ کردند؟''

گویا مسلسل آدم پر آدمی بھیجتے چلے جاتے' پوچھتے کہ سب خرچ ہوگیا۔

''چوں می شنیدند کہ درحال قسمت کردند وبجتا جاں رسانیدند خاطر مبارک قرار گرفتے۔'' (صفحہ 131)

میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاوہ دسترخوانی طعام کے سلطان جی کا قاعدہ تھا کہ افطار اور نماز مغرب کے بعد بالاخانہ پر تشریف لے جاتے۔ مغرب اور عشاء کے وقت ہر قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت تھی' اس وقت بھی

''از ہر جنس میوہائے خشک وتر وماکولات ومشروبات لطیفہ ولذیذ پیش می آوردند وآں عزیزاں تناول می کردند وایشاں را دلداری می فرمود وراز عالم ہر یکے پرسش می کرد۔''

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ صرف واقعی کھلانے پلانے ہی کی حد تک محدود تھا' خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے

غریبوں کو کپڑے، لباس، جوتے اور دوسری ضروریات کی چیزیں ملتی رہتی تھیں۔ میر خورد نے ایک موقعہ پر لکھا ہے۔

''آئندہ درروندہ از غریب وشہری ہر کہ بیامدے وسعادت پائے بوس حاصل کردے ہیچ کس رامحروم نگذاشتے از جامہ وجیتل وتحف وہدایا کہ از عالم غیب رسیدے ہمہ بہ مصرف رسانیدے وہر کہ آمدے، بہر وقت کہ آمدے توقف نہ نمودے درحال پیش می فرمودند۔''

یعنی ملنے کے لیے جو بھی جس وقت آتا تھا، حکم تھا کہ فوراً اس کو خدمت اقدس تک پہنچا دیا جائے۔ میر نے لکھا ہے کہ ایک دن سلطان المشائخ دوپہر کو قیلولہ فرما رہے تھے، کوئی حاجت مند کسی ضرورت سے آیا۔ اخی مبارک حضرت کے خادم نے اس کو ٹال دیا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے ہیں۔ ادھر یہ واقعہ ہوا اور دوسری طرف نیند میں سلطان جی شیخ کبیر شکر گنج ؒ کو دیکھتے ہیں کہ فرما رہے ہیں۔

''اگر درخانہ چیزے نیست بقدر وسع حسن رعایت آئندہ واجب است ایں کجا آمدہ ست کہ چنیں خستہ دل راباز گردانید۔''

یعنی آنے والوں کے ساتھ برتاؤ تو اچھا ہونا چاہیے۔ نیند سے چونک پڑے، اخی مبارک بلائے گئے، پوچھا کہ کوئی آیا تھا، بولے کہ ہاں میں نے حضرت کے آرام کا خیال کر کے واپس کر دیا۔ میر نے لکھا ہے کہ

''سلطان المشائخ بروتفت کرد کہ خدمت شیخ المشائخ را در غضب دیدہ ام مراعتاب می کرد۔''

اسی کے بعد عام حکم ہو گیا کہ میں جس حال میں بھی رہوں، آنے والوں کی فوراً خبر ہونی چاہیے۔ ''اگر در قیلولہ باشم مرا خبر کنی۔'' قیلولہ سے اٹھنے کے بعد اسی لیے عام عادت تھی کہ دو سوال کرتے ''یکے آں کہ سایہ گشت'' یعنی زوال ہو گیا، ظہر کی نماز کے متعلق سوال تھا اور دوسرا یہ کہ ''آئندہ آمدست نباید کہ منتظر باشد۔'' (صفحہ 129)

''فوائد الفواد'' میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ قصہ میر حسن علاء نے نقل کیا ہے کہ

''در بغداد درویشے بود کہ ہر روز یک ہزار دولت کاسہ در مائدہ او خرچ شدے وا در اہشیر دہ مطبخ بود۔'' (صفحہ 118)

مگر اٹھارہ باورچی خانوں والے خود ان درویش صاحب کا کیا حال تھا، جن کے یہاں سے اتنا کھانا پک پک کر لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا، اسی کے بعد ہے کہ ایک دن لوگوں سے درویش صاحب نے پوچھا کہ کوئی کھانے والا رہ تو نہیں گیا۔ نظم کرنے والوں نے کہا کہ

''خیر ما ہمہ را یاد می کنم وہمہ را طعام می دہم۔''

درویش صاحب بار بار یہی پوچھتے جاتے تھے کہ کسی کو فراموش تو نہیں کیا گیا ہے۔ ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ ''ما کسے را فراموش نمی کنیم ہمہ را وقت طعام حاضر کنیم'' آخر میں انہوں نے کہا کہ ''امروز سہ روز است کہ مرا طعام ندادہ اید۔'' وجہ یہ تھی کہ ''مطبخ بسیار بود مطبخیاں می دانستند کہ از دیگر مطبخ رسیدہ باشد۔'' حقیقت جب معلوم ہوئی تو لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اور خیر یہ تو ایک قصہ ہے۔ معلوم نہیں بغداد کے کس بزرگ کا ہے لیکن یہ واقعہ تو آپ کو ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں ملے گا کہ جلال الدین خلجی کے عہد میں مولہ (40) نامی دِلّی میں ایک درویش تھے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ ان کی خانقاہ میں

''ہزار من میدہ پانصد من مسلوخ (گوشت بنا بنایا) وسہ صد من شکر خرچ یومی شیخ بود کہ در لنگر بکار می رفت۔'' (صفحہ 170)

اگر من سے وہی چالیس سیر والا ہندوستانی من مراد ہے اور غالباً وہی مراد ہے بھی کہ اور جہاں کہیں بھی من کا لفظ اس زمانہ کی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے اس سے وہی ہندوستانی من مقصود ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہزار ہزار من آٹے کی روٹیوں اور پانچ پانچ سو من گوشت کے روزانہ کھانے والوں کی تعداد کیا ہوگی اور واقعہ تو یہ ہے کہ بجائے خود یہ اس اولوالعزمی کی دلیل ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی تھی۔ اللہ اللہ ہم آج جس چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے، حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کے عوام افراد اسے انجام دیتے تھے۔ آخر روزانہ اتنی بڑی مقدار میں کھانا پکوانا اور کھلانا بغیر کسی معمولی سلیقہ نظم کے ممکن ہے؟ لیکن قومیں جب زندہ ہوتی ہیں تو ان پر ایسی باتیں بلکہ ان سے بھی عجیب تر باتیں آسان ہو جاتی ہیں (41) اور جب مردنی چھا جاتی ہے تو دو آدمی کے کھانے پینے کا انتظام بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ جب سیدی مولہ کے اس ''خوانِ یغما'' کی خبر بادشاہِ وقت (جلال الدین خلجی) کے کانوں تک پہنچی تو خود اسے بھی تعجب ہوا اور شاید کچھ خطرہ بھی آخر

''شبے بہ لباس ناشناس در خانقاہ او رفتہ تصرف او را انچہ شنیدہ بود زیادہ یافت۔''

ملا عبدالقادر نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ سیدی مولہ کا دستر خوان سب کے لیے کشادہ تھا۔ عامی اور خاصی کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

''مردم نامی وسرداران (42) معتبر وسائر خواص وعوام پیوستہ ملازم خانقاہ او بودندے۔''

شیخ محدث نے بھی ''اخبار الاخیار'' میں سیدی مولہ کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ

''اتباع ومریداں بسیار داشت و بمردم طعامی می داد۔'' (صفحہ 73)

جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی مقدار و وسعت کے لحاظ سے سیدی مولہ کا دستر خوان جو کچھ بھی خصوصیت رکھتا ہو لیکن خانقاہی لنگر خانوں کے دروازے عموماً ہر کہ ومہ خاص وعام کے لیے کھلے رہتے تھے، اس میں ان کی کوئی خصوصیت نہ تھی؛ اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ فخر الدین نامی ایک بزرگ تھے۔ ملا عبدالقادر ہی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سماع کے بعد دستور تھا کہ

''سفرہ (دستر خوان) می کشیدند شاہ ودرویش گزدا وبرابر بود۔''

انتہا اس عمومیت کی یہ تھی کہ بیرم خان خاناں جو اس زمانہ میں وزیر ہی نہیں بلکہ مدار کل اور حقیقی معنوں میں وہی حکمراں تھا، لکھا ہے کہ

''بیرم خان نماز جمعہ اکثر در مسجد اوی گذارد...... و در تناول طعام و سائر آداب مجلس ہیچ امتیاز از سائرالناس نداشت۔'' (صفحہ 8 جلد 3)

غربت و امارات کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء و غرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے۔ اس نظم سے غریب حاجت مند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں

توخذمن اغنیائھم و تقسم علی فقرائھم

''امیروں سے ان کے لیا جائے اور غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔''

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا۔ خصوصاً جن بزرگوں کو کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا' یوں سمجھیے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی۔ گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں ایک مشہور ہستی حضرت شاہ بھیک کی تھی' جن کا اصلی نام سید محمد سعید تھا لیکن عوام میں آپ کا یہ عرفی ہی نام مشہور ہو گیا اور اب تک اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ہمارے مخدوم و مکرم جناب مولوی غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل انبالہ کے نام کا انتساب آپ ہی کے اسم گرامی کی طرف ہے۔

یہ شاہ بھیک قدس سرہ حضرت شاہ ابوالمعالی (انبیٹھا) ضلع سہارنپور کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب معزالدین جہاندار شاہ دلی کے تخت پر قابض ہو گیا تو اس زمانہ کا ایک امیر ظفر خاں حضرت سے مشورہ گیر ہوا کہ جہاندار شاہ کے مقابلہ میں فرخ سیر جو اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں کس کا ساتھ دوں۔ آپ نے فرخ سیر کی رفاقت کا مشورہ دیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ فرخ سیر سے جا ملا۔ جیسا کہ معلوم ہے قسمت نے دلی کے تخت کا فیصلہ فرخ سیر کے لیے کیا۔ ظفر خاں کی بن آئی اور نواب روشن الدولہ ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ سہ ہزاری کا منصب بخشی گیری کا عہدہ فرخ سیر کی طرف سے ان کو عطا ہوا۔ چونکہ یہ کامیابی حضرت والا کے مشورہ کی راہ سے روشن الدولہ کو حاصل ہوئی تھی۔ قدرتاً وہ شاہ بھیک صاحب کے انتہائی عقیدت کیشوں میں تھا اور نواب روشن الدولہ کی وجہ سے فرخ سیر خود اور اس کے دربار کے امراء حضرت کے معتقدوں میں شریک ہو گئے۔ ان کے تذکرہ میں جس کا نام ''ثمرۃ الفوائد'' ہے اور ان کے براہ راست مرید مولوی محمد لطف اللہ مرحوم کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں حضرت شاہ بھیک کے داد و دہش کے قصوں کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ مولوی لطف اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت کی خانقاہ میں ذاکرین و شاغلین کی تعداد ''پانصد کس در اوائل حال بدائرہ (خانقاہ) شریف...... بیاد الٰہی مشغول می بودند۔'' ان کے سوا ''ہمیں قدر مجمع صادر و وارد ہر روز تا ہزار کس بودہ باشد'' (صفحہ 172) اور دونوں وقت انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حضرت کی خانقاہ سے کھانا پہنچایا جاتا تھا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ روشن الدولہ خود حضرت والا کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ حضرت کی خانقاہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائے۔ اپنے ساتھ ''مبلغ ہفتاد ہزار روپیہ بجہت روضہ شریفہ آوردہ اور عرض گذار ہوا کہ ''ایں قدر زر را ہمراہ آوردہ انچہ دیگر مطلوب خواہد باشد طلبیدہ می شود۔''

شاہ بھیک نے روشن الدولہ سے یہ سن کر فرمایا کہ

''بالفعل مبلغ رایک جاجمع دارند شما آرام کنید بوقت سہ پہر تہیہ آں نمودہ معماراں راطلبیدہ شروع عمارت کردہ خواہد شد۔''

روشن الدولہ ستر ہزار کی ان تھیلیوں کو حضرت کے پاس چھوڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف آرام کے لیے چلا گیا۔ادھر شاہ بھیک صاحب نے

''درویشاں راطلبیدہ زر مذکور خانہ بخانہ بیوہ زناں ومحتاجاں ومسکیناں ساکنانِ انبالہ و تھانیسر وسرہند وپانی پت وغیرہ تقسیم نمودند کہ یک حبہ باقی نگذاشتند۔'' (صفحہ 119)

روشن الدولہ بیچارہ سہ پہر کے وقت حاضر ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں۔

''بناء خانقاہ راچہ قبولیت شدہ کہ بچندیں گوشہ نشیناں محتاجاں رسیدہ مافقیررا عمارت عالی چہ کارست۔''

روشن الدولہ نے یہ سن کر عرض کیا ''بسیار مستحسن وبجاشد خزانہ دیگر ہم موجوداست۔''

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

''روزے قاصد مرسلہ بادشاہ محمد فرخ سیر ونواب روشن الدولہ ونواب عبداللہ مع عرائض و ہنڈیات مبلغ سہ لک روپیہ رسید۔''

شاہ صاحب کو خبر ہوئی' ارشاد ہوا کہ حسب استحقاق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

''بموجب امر حالی قصبہ پانی پت ورام پور وکرنال وانبیٹھ وگنگوہ وغیرہ قسمت نمودہ۔'' (صفحہ 119)

اسی میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بھیک کا۔

''معمول چناں بود کہ در سفر وحضر تانصف اللیل دروازہ بازمی ماند وسائلے کہ می آمد محروم نمی رفت از نقد وجنس وطعام وپارچہ ہرچہ میسر وموجود بودے انعام می فرمودے۔'' (صفحہ 118)

اس کتاب میں آپ کے داد ودہش اور عام بذل وکرم کے جو قصے درج ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے۔خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادیاں حضرت نے کرائیں۔کتنوں کو ان امیروں کے پاس نوکریاں دلوائیں' کتنے مظلوموں کو ظالم حکام کے پنجوں سے اپنے اثر سے کام لے کر آپ نے خلاصی دلوائی۔جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی ایک شخص کا حال نہ تھا' ان بزرگوں کے دیگر مشاغل ومکاسب میں ایک اہم چیز یہ بھی تھی۔ان ہی دنوں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے شیخ سیف الدین بن عروۃ الوثقی شیخ محمد معصومؒ تھے۔جن کا قیام عموماً دلی میں رہتا تھا۔لکھا ہے کہ

''محمد اورنگ زیب وشاہزادگان وامراء رابخدمت ایشاں ارادتے پیدا شد درامر معروف و نہی منکر کوشش بلیغ می داشتند۔''

لیکن امراء کی ارادت سے جو نفع اٹھایا جاتا تھا' وہ یہ تھا کہ

''یک ہزار و چہار صد کس را موافق رغبت و فرمائش ہر یک از خانقاہ ایشاں ہر روز دو وقت طعام عنایت می شد۔'' (مناقب العارفین)

ہر شخص کی رغبت اور فرمائش کے مطابق ہزار ہزار چودہ چودہ سو آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا کوئی معمولی بات ہے لیکن وہ بیٹھے اسی لیے تھے کہ منجملہ دیگر مہمات کے ایک مہم ان غریبوں تک روزی پہنچانے میں ذریعہ بننا بھی تھا۔

ایک دلچسپ کہیے یا دلدوز واقعہ اسی سلسلہ کا یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے ایک بزرگ جن کا عرفی اور مشہور نام شاہ بولن تھا' سہوارہ کے رہنے والے تھے۔ صاحب ''مناقب العارفین'' جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں' انہوں نے لکھا ہے

''در خانقاہ خود وارد و صادر را طعام می دادند' گویا لنگر خانہ وے حضرت سفرہ عام بود چہ دشمن و چہ دوست دریغ نمی داشتند۔''

اتفاق سے اسی زمانہ میں غدر کا فتنہ ہندوستان میں شروع ہوا لیکن اس زمانہ میں بھی شاہ بولن کا لنگر خانہ جاری رہا۔ اسی کتاب میں ہے

''در ایام غدر ہندی در لنگر خانہ وے حضرت دوست و دشمن می آمدند و طعام می خوردند و می رفتند۔''

انگریزی حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد اسلامی فقراء کے اس طرز عمل سے واقف نہ تھے۔ ان تک یہ خبر پہنچی کہ شاہ بولن نامی فقیر سرکار کے باغیوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ حالانکہ ان بیچارے کو کیا خبر کون باغی ہیں اور کون غیر باغی۔ بقول صاحب مناقب ''وے حضرت با کسے حاجتے و کارے نداشتند'' لیکن حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ امیروں سے لے کر مفت غریبوں کو کھانا بلاوجہ تقسیم کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا اور

''بجرم آں کہ دشمنان حاکم را مدارات می کردند و طعام می دادن.... باعث گرفتاری و رسانیدں وے حضرت در جزیرہ مذکور (انڈمان) شدہ بود۔'' (مناقب۔ص 547)

زندگی کا آخری حصہ عبور دریائے شور کی اسی سزا کی وجہ سے انڈمان ہی میں گذرا اور

''در جزیرہ انڈمان مدفون گشتند۔''

اپنے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے نمونے تکسب[43] **المعدوم و تحمل الکل و تعین الاخرق** کی اتباع میں ان کو جو لذت ملتی تھی' درد نا آشنا قلوب اس کی حلاوتوں کو کیا محسوس کر سکتے ہیں۔ ملا عبدالقادر نے شنیدہ نہیں بلکہ اپنی یہ دیدہ شہادت شیخ عزیز اللہؒ کے متعلق نقل کی ہے کہ ان کا عام حال یہ تھا

''از جہت شفاعت ہر فقیرے بیچارہٗ کہ رجوع باو کردے ہر چند در اعتکاف اربعین ہم بودے اگر ہمہ بخانہ بے گانہ از دین بائستے رفت مسافت بعیدہ را پیادہ طے می نمود بعد از انجاح حاجت آں محتاج باز بہ حجرہ اعتکاف رفتہ مشغول می شد۔''

''جو کوئی محتاج بے وسیلہ آدمی ان کے پاس سفارش کے لیے حاضر ہوتا' شیخ خواہ چلہ ہی میں کیوں نہ بیٹھے ہوں اور کسی ایسے شخص کے پاس ہی سفارش نہ کرنی پڑتی ہو جو دین سے بیگانہ ہوتا

لیکن باوجود ان تمام باتوں کے شیخ پیدل اس شخص کے گھر جاتے مکان اس کا جتنے فاصلہ پر بھی ہو' ضرورت مند کی حاجت جب پوری ہو جاتی تب پھر چلہ کے حجرہ میں واپس ہو کر اپنے اشغال میں مشغول ہو جاتے۔''

ملا صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفارش کے لیے چلہ کے اعتکاف سے باہر ہونے کو چلہ کشی کے منافی نہیں خیال کرتے تھے۔ ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

''گویا شکستے در اعتکاف واقع نہ شد۔''

''گویا سمجھتے تھے کہ ان کے اعتکاف کا تسلسل اس سے نہیں ٹوٹتا تھا۔''

واللہ اعلم اعتکاف کو پھر نئے سرے سے شروع کرتے تھے یا نفلی اعتکاف ہونے کی وجہ سے اس قسم کے اربعینات میں وہ اس لیے باہر نکلنے کو جائز سمجھتے تھے۔ خیر یہ تو فقہ اور تصوف کا علمی مسئلہ ہے۔ امام محمد وغیرہ کی جو رائے نفلی اعتکاف کے متعلق ہے' اس کے لحاظ سے گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے۔ مجھے اس وقت ان بزرگوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنا ہے۔ قومی ہمدردیوں کے مدعیوں کے لیے اس میں کتنی بصیرتیں ہیں۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ

''ایں عبادت متعدی را تقدم بر عبادت لازم نہادے۔''

یعنی ان کا خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کی حاجت براری کا کام چونکہ ایسی عبادت ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہے یعنی متعدی ہے۔ اس لیے لازمی عبادت پر جس کے نافع صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رہتی ہیں' اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے سفارش کو چلہ کشی کی عبادت سے مقدم خیال کرتے تھے۔

ذرا ان بزرگوں کی نگاہ کی بلندیوں کو دیکھیے' صرف یہی نہیں کہ اعتکاف اور چلہ کو توڑ دیتے تھے بلکہ ملا صاحب کا جیسا کہ بیان ہے' کسی قسم کا آدمی ہو' دین سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو' فاسق ہو' فاجر ہو لیکن غریب مسلمان کا کام نکلتا ہے' اس لیے ان کو ایسوں کے پاس جانے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا۔ کل کیا دن تھے اور آج ان ہی کے اخلاف کا کیا حال ہے اور بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی ہے' ملا صاحب نے اس کے بعد جو یہ اضافہ کیا ہے کہ

''گاہے چناں بودے کہ اگر کافرے یا ظالمے مرتبہ اول شفاعتش قبول نہ کردہ یا عمداً از خانہ بدر نیامدہ شیخ تمام روز بر خانہ اونشستہ۔''

''کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر کسی کافر یا ظالم حاکم کے پاس شیخ کی سفارش کارگر نہ ہوتی اور وہ اس کو قبول نہ کرتا یا قصداً گھر سے باہر نہ نکلتا تو دن دن بھر شیخ اس کے دروازہ پر بیٹھے رہتے۔''

سن رہے ہیں' فاسق اور فاجر ہی نہیں کافر اور ہندو عہدیداروں کے پاس بھی اس غرض کے لیے جانے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ نفس (44) کا یہ حال ہے کہ قصداً عہدیدار باہر نہیں نکل رہا ہے لیکن وہ ہیں کہ اس کے دروازے پر اس لیے دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ محمد رسول اللہؐ کے ایک امتی کا کام نکلتا ہے۔ نہ عزت کی پروا ہے اور نہ پوزیشن کی کیونکہ شیخ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کے علمی وقار کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ ملا عبدالقادر جیسے آدمی ان کے شاگرد ہیں اور اس تلمذ پر ان کو

فخر ہے۔ خود لکھا ہے کہ

''دردرس آں صاحب کمال بعضے کتب رسائل تصوف استفادہ نمودہ الحمدللہ۔''

''اس باکمال بزرگ کی خدمت میں تصوف کے چند رسالوں کے پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا ہے۔ الحمدللہ۔''

علاوہ علوم باطنی کے ملا صاحب کا بیان ہے

''درعلوم ظاہری ہم کامل و مکمل بود و تفسیر عرائس و عوارف و فصوص الحکم و شروحش بہ تلامذہ درس گفتے' صاحب تصانیف مشہورہ ست۔''

بہرحال اگر عہدیدار اس دن ہاتھ نہ آتا یا شیخ کی سفارش نہ سنتا تو شیخ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ

''روز دیگر بدربار او مکرر رفتہ ودم نزدہ وازیں معنی ہیچ رنگ کدورتے برآئینہ خاطر غیب نمائش نہ نشستہ۔''

''دوسرے دن پھر (اسی کافر یا ظالم عہدیدار) کے دربار میں جاتے اور کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرتے نہ ان کے دل میں اس طرز عمل سے کوئی کدورت پیدا ہوتی۔''

کچھ اس طرح لپٹ جاتے تھے کہ بالآخر

''تا آنکہ مشفوع عنہ خود شرمندہ و خجلت زدہ در پائے اومی افتاد و حاجت آں فقیر راسمعا و طاعۃ برمی آورد۔''

''وہ شخص جس سے سفارش کی جاتی تھی' خود شرمندہ اور خجل و نادم ہو کر شیخ کے پاؤں پر گر پڑتا اور یوں بخوشی و رضا اس بیچارے غریب کا کام نکل جاتا۔''

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیے اور اس پر غور کیجیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ امراء اور غرباء کے درمیان ان ہی بزرگوں کا وجود باجود حلقہ اتصال بنا ہوا تھا اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسرے اغراض رکھتے تھے' ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں' مسافروں' بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو۔

مسلمان جس ملک میں بھی پہنچے تھے' اس کے طول و عرض میں آپ کو اس قسم کی خانقاہوں کا جال بچھا ہوا نظر آئے گا۔ خیال تو کیجیے عہد التمش و بلبن یہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے لیکن دتی ہی میں نہیں پایہ تخت سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہم دیکھتے ہیں کہ غرباء کے لیے ان ہی خانقاہوں کے ذریعہ سے لنگر جاری ہیں۔ ''سیر الاولیا'' میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج ؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے'' در

اوائل از آئندگان می شنیدم کہ شیخ خضر پارہ دوز در بہار خانقاہے درویشاں را خدمت می کند'' (صفحہ 112) سلطان المشائخ کا ابتدا ہی میں ان کے پاس بہار جانے کا خیال تھا۔ ''نیست جزم کردم کہ بردم۔ غلام بچگاں اور اتعلیم بکنم۔''

غور کرنے کی بات ہے کہ یہ زمانہ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کی نوعمری کا زمانہ ہے۔ غالباً ناصرالدین بن التمش کا زمانہ ہوگا اور اسی زمانہ میں دلّی سے اتنی دور بہار میں درویش کی خانقاہ جاری ہے اور درویشوں کی خدمت ہو رہی ہے۔

بہرحال ''فتوحات'' و ''نذور'' شکرانوں کی آمدنیاں ان خانقاہوں میں ضرور ہوتی تھیں لیکن جب تک ہماری خانقاہیں واقعی خانقاہیں تھیں' دکانوں کی شکل انہوں نے نہیں اختیار کی تھی تو اس وقت خانقاہ کے درویش کی حیثیت مالک کی نہیں صرف قاسم کی رہتی تھی۔

فتوحاتی آمدنیوں کے مالک نہیں بلکہ قاسم اور صرف قاسم ہونے پر جن خانقاہوں میں اصرار کیا جاتا تھا اور اتنا شدید اصرار کہ شیخ کبیر شکر گنج خواب میں آ کر سلطان المشائخ کو تنبیہ کرتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے متعلق حج کی فرضیت اور عدم فرضیت میں کسی کو شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ ہا! جن دینی بادشاہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ محمد رسول اللہ کی دین کی خدمت میں صرف کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر بنائے رکھا' آج ان پر زبانیں کھل رہی ہیں۔ ان لوگوں کی جن کا سرمایہ دینی جدوجہد کی راہ میں زبان سے نکلنے والے چند تقلیدی الفاظ یا قلم سے بننے والے چند فرسودہ پامال حروف کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جن سے بمشکل پانچ وقت کی نماز بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ خدا کی شان ہے وہی آج ان بزرگوں کو ٹوکنے کی ہمت کر رہے ہیں جن کی زندگی میں ''دین'' اور دین کی حقیقی سچی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اللہ کے ان دوستوں کے معاملہ میں اپنے عزیزوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا کی غیرت کو حرکت میں نہ لائے۔ تنقید و تحقیق' ریسرچ و تنقیر کے کھیل کھیلتے رہیے لیکن خدارا ریش بابا تک تو آپ کی یہ بازیاں نہ پہنچ جائیں۔

من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب

''میرے کسی ولی سے جو دشمنی کرتا ہے میں اس کو جنگ کا اعلان دے دیتا ہوں۔''

کی حدیث اگر آپ نے سنی ہوگی تو بیٹھے بٹھائے اس اعلان جنگ کو کیوں دعوت دیتے ہیں جس کا جواب تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

کیا آپ واقعات کا انکار کر سکتے ہیں' ہندوستان کی تاریخ سے ''محمد تغلق'' اور اس کی بے نظیر خونیں داستانوں' بے مثال مجنونانہ افسانوں کے نقوش کیا مٹائے جا سکتے ہیں؟ دولت آباد بسانے کے لیے دلّی اجاڑی گئی' اس حد تک اجاڑی گئی کہ کسی گوشہ کے کسی گھر سے دھواں بلند نہیں ہو رہا ہے۔

عجیب بات ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی کی بعض معمولی باتوں کو تو لوگوں نے اہمیت دی کہ غیاث الدین تغلق پر جب نو تعمیر دعوتی مکان گرا تو کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ کے ستانے کا چونکہ ارادہ رکھتا تھا' حضرت سے لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو وہ جمنا کے ساحل پر آ گیا' دو ایک روز میں دلّی پہنچ کر معلوم نہیں کیا مصیبت پیدا کرے' بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت زبانِ مبارک سے ''ہنوز دلّی دور است'' کا فقرہ نکلا جو نسلوں اور پشتوں سے منتقل ہوتے ہوئے آج تک زبان

زدعام ہے۔ عموماً تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح خلجی فاسق سیہ کار بادشاہ قطب الدین مبارک جب اپنے غلام خسروخاں کے ہاتھ سے مارا گیا تو عموماً اس موقع پر بھی مورخین ذکر کرتے ہیں کہ جس رات کو مارا گیا' اسی کی صبح کو وہ سلطان المشائخ کے ساتھ گستاخی کا عزم کیے ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ ہی کی بددعا کا شکار ہوا۔ (45)

بجائے خود اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں واقعات کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ خصوصاً قطب الدین مبارک کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت اور چار سال تک اسی کشمکش میں دلّی ہی کے گویا ایک محلہ میں رہنا' سلطان المشائخ کی ایمانی استقامت کی بڑی عجیب وغریب شہادت ہے۔ شخصی حکومت کے مطلق العنانہ اختیارات کا اندازہ کیجیے اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے یقیناً ابتلاء کی یہ چار سالہ مدت کم مدت نہیں ہے۔

مگر پھر بھی مجھے لوگوں پر تعجب ہے کہ جب تاریخی کتابوں میں سلطان المشائخ کے متعلق اس قسم کے واقعات درج ہی کیے جارہے تھے تو اس سلسلہ کا جو سب سے بڑا واقعہ تھا' اسی کو قلم انداز کیوں کردیا گیا۔ حالانکہ میر خورد نے اسی زمانہ میں اپنی ''سیر الاولیاء'' میں بہ تفصیل اس کا تذکرہ کیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں ''سماع'' کے مسئلہ نے ایک سخت فتنہ کی شکل اختیار کی۔ سلطان المشائخ کے دربار کا جاہ وجلال' دسترخوان کی وسعت ارباب حاجات کا ہر طرف سے آنا اور ان غریبوں کی عام اعانت وامداد کی وجہ سے ملک میں جو ہر دلعزیزی آپ کو حاصل تھی' یہی چیز بعض علماء وقت کے حسد کا باعث ہوئی۔ اور تو کوئی چیز قابل اعتراض بات سلطان المشائخ کی زندگی میں ملی نہیں۔ اسی غیر مزامیری سماع کے مسئلہ کو اہم بنا کر مولویوں نے محضر نامہ کی صورت میں غیاث الدین کے پاس پیش کیا۔ ایک صاحب کا نام شیخ زادہ جام حسام الدین تھا۔ سلطان المشائخ ہی کی خانقاہ کے رہے ہوئے بلکہ پلے ہوئے' میر خورد نے لکھا ہے کہ

''پاتابہ غریبی درخانہ سلطان المشائخ کشادہ بود۔''

یعنی شروع شروع جب دلّی آئی تو حضرت ہی کے یہاں فروکش ہوئے۔ بڑے آدمی شیخ جام کے خاندان سے تھے۔ اس لیے ''بانواع تربیت وشفقت سلطان المشائخ پرورش یافتہ۔'' بعد کو شاہی دربار میں ان کو رسوخ خاص حاصل ہو گیا تھا۔ یہی حضرت اس محضر نامہ کے پیش کرنے میں آگے آگے تھے۔ غیاث الدین کو حیرت ہوئی جب اس نے سنا کہ غیر مزامیری سماع بھی حرام ہے۔ اس نے فرمان صادر کیا۔

''چوں علماء دین درحرمت سماع فتوی کردہ بجہت ایں کار مزاحم شدہ سلطان المشائخ را حاضر کنند وجملہ علماء شہر واکابر را طلب کنند۔''

فرمان کی تعمیل ہوئی۔ سلطان المشائخ بھی حاضر ہوے اور شہر کے علماء واکابر بھی بلائے گئے۔ اس زمانہ میں نائب السلطنت کے عہدہ پر قاضی جلال الدین لوانجی سرفراز تھے۔ مجلس میں یہی سلطان المشائخ سے مخاطب ہوئے۔ بادشاہ بھی موجود تھا' طرفین میں گفتگو ہو رہی تھی۔ دونوں کی سن رہا تھا۔ درمیان میں فریق مخالف کے علماء جب شور برپا کرتے تو تغلق کہتا

''غلبہ مکنید بشنوید کہ شیخ (سلطان جی) چہ می فرماید۔''

اس عرصہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے مولانا علم الدین بھی مجلس مناظرہ میں کہیں سے آپہنچے۔

غیاث الدین ان کا کچھ معتقد تھا۔ ان ہی کو اس نے حکم بنایا اور کہا کہ

''شما در بغداد وشام وروم گشتہ مشائخ آں دیار سماع می شنوند یا نے؟ وایشاں را دریں کار کسے مانع شود یا نے۔''

مولانا علم الدین نے جواب میں جو واقعہ تھا' وہ بیان کیا۔ فرمایا۔

''در ہمہ شہر ہا بزرگان ومشائخ سماع می شنوند۔''

بلکہ یہ بھی کہا کہ بعض مقامات میں تو ''دف وچغانہ'' کے ساتھ بھی سنتے ہیں۔ ''وکسے ایشاں را مانع نمی شود۔'' تغلق نے ان کی یہ رپورٹ جب سنی ''ساکت شد وہیچ نہ گفت۔'' نائب السلطنت قاضی جلال الدین نے بادشاہ پر اصرار کیا کہ ممانعت سماع کا فرمان جاری کر دیجیے۔ سلطان المشائخ نے کہا' بادشاہ ایسا حکم نہ صادر کریں۔ تغلق نے سلطان المشائخ ہی کی بات مان لی یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ جو حال اب تک تھا وہی باقی رہا۔ مولانا فخر الدین زراوی کے عربی رسالہ سے یہ فقرہ میر خورد نے نقل کیا ہے جس میں اس مجلس مناظرہ کی کیفیت درج ہے۔

وکان ذٰلک من اول الضحیٰ الی اوان الفئی ثم قام اھل المجلس من عند السلطان

''ابتداء وقت چاشت سے سایہ ڈھلنے تک مناظرہ کی یہ مجلس قائم رہی۔ پھر لوگ بادشاہ کے سامنے سے اٹھ گئے۔''

بہرحال یہ تو مجلس مناظرہ کا مختصر حال ہے' میر خورد نے دیگر جزئیات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

میر خورد نے اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی صاحب ''تاریخ فیروز شاہی'' کے رسالہ ''حسرت نامہ'' سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

''چوں حضرت سلطان المشائخ از محضر مذکور در خانہ آمد بوقت نماز پیشیں (ظہر) مراد مولانا محی الدین کاشانی وامیر خسرو شاعر را طلب فرمود۔''

برنی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت کی خدمت میں جمع ہوگئے اس وقت حسب ذیل تقریر سلطان المشائخ نے شروع کی۔

''گفت کہ دانشمنداں (علماء) دہلی بعداوت وحسد من پر بودند میداں فراخ یافتند وسخنہائے پُر از عداوت ایشاں بسیار گفتند۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جو تقریریں ہوئی تھیں' ان سب کا خلاصہ سلطان المشائخ نے ذکر فرمایا۔ آخر میں ارشاد ہوا۔

''عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند وہمیں گویند کہ در شہر ما عمل بروائت فقہ مقدم ست بر حدیث۔''

اور صرف یہی نہیں' برنی نے براہ راست سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

''ہر بار کہ حدیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور می شد بری آمدند ومنع می کردند وی

گفتند ایں حدیث متمسک شافعی است داو دشمن علماء ماست مانمی شنویم۔''

اسی کو ''بدنام کنندہ نکونامے چند'' کہتے ہیں۔ کیا واقعۃً یہی حنفیت ہے؟ یہی امام ابوحنیفہ اور علمائے احناف کا مسلک ہے؟ کیا ان خرافات کا اظہار جب ان مولویوں کی زبانوں پر ہورہا تھا تو وہ اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے لیکن ان کو حسد اندھا بنائے ہوئے تھا۔ اس وقت ان کا ایمانی نور گہن میں آگیا تھا۔ سب کچھ جانتے تھے مگر جیسا کہ سلطان المشائخ نے فرمایا

''با اعتقاد اندیانہ کہ بحضور اولی الامر بمکابرہ می آیند۔''

ظاہر ہے کہ صرف دھاندلی اور مکابرہ سے محض اپنی بات کی بیجا طرف داری بادشاہ کے سامنے کررہے تھے۔ تعجب ہے کہ سلطان المشائخ کے اسی بیان کو بعض لوگوں نے اس کی دلیل بنالیا ہے کہ ہندوستان کے علماء حدیث سے ناواقف تھے۔ حالانکہ یہ جو کچھ کہا جارہا تھا' ناواقفیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف ضد' ہٹ دھرمی' حسد' شرارت' نفس کا نتیجہ تھا۔ اسی کے بعد سلطان المشائخ ہی کے الفاظ یہ ہیں۔

''ہیچ عالمے ندیدم ونشنیدم کہ پیش او احادیث صحیح حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کردہ آید واو گوید کہ من نمی شنوم من نمی دانم۔''

سلطان المشائخ بیچارے تو ہندوستان سے باہر ایک دن کے لیے بھی کہیں تشریف نہیں لے گئے۔ ان کا ''ندیدم'' کھلی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان ہی کے علماء سے متعلق ہوسکتا ہے۔ جس کا یہی مطلب ہوا کہ اس مجلس خاص میں جو گفتگو ہو رہی تھی' وہ علمی نہیں بلکہ صرف حسدی گفتگو اور معاندانہ جو د و تعنت تھا' ورنہ کیا عام علماء ہند کا وہی حال تھا جسے سلطان المشائخ نے دیکھا تھا۔ بھلا ایسا کونسا مسلمان ہوسکتا ہے جو حدیث کو رسول اللہ کی صحیح حدیث ماننے کے بعد بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے نہیں مانتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو یہی کہ مثلاً نسخ کا تخصیص کا تاویل کا دعویٰ کرے' نہ کہ علانیہ اقرار کرے کہ رسول اللہ کی حدیث ماننے کے باوجود میں نہیں مانتا۔ کیا ایسے شخص کا اسلام باقی رہ سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان مولویوں کی غرض بھی یہی ہوگی یعنی جس مقصد کو اس حدیث سے لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں' ہم اس مقصد کے لیے اس حدیث کو مفید نہیں سمجھتے لیکن بادشاہ جاہل تھا' علمی اصطلاحات کو کیا سمجھتا۔ انہوں نے اس کے سامنے ایسی تعبیروں میں اپنے مدعا کو پیش کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ایمان کانپ جاتا ہے۔

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا' واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ پر علماء کے اس طرزِ عمل کا سخت اثر تھا اور کیوں نہ ہوتا' علانیہ رسولؐ کی حدیث کی توہین کی گئی تھی۔ ضیا برنی نے اس کے بعد لکھا ہے' سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلنے لگے۔

''ایں چہ روزگار است دراں شہرے کہ ایں چنیں مکابرہ کنند چہ گونہ آباداں ماند۔''

دین کی غیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خون کھول رہا تھا۔ اپنے محبوب رسولؐ کی حدیث کی اس اہانت نے دامن صبر کو ان کے ہاتھ سے الگ کردیا اور خاص حال میں جو اہل اللہ پر ایسے مواقع پر طاری ہوجاتا ہے' یہ الفاظ کیا

تھے۔ صرف خدا کا حصہ قہرِ الٰہی کے شعلے تھے جو فضا میں بھڑکنے لگے۔ برنی ناقل ہیں کہ سلطان المشائخ نے فرمایا "عجب است کہ خشت خشت نہ شود" پھر فرمایا کہ

"بعد ازیں بادشاہ وامراء وخلق کہ از قاضی شہر وعلماء شہر بشنوند کہ دریں شہر عمل بر حدیث نیست۔"

ظاہر ہے کہ جس پیرایہ میں قاضی شہر اور علماء نے مسئلہ کو پیش کیا تھا' اس کا ظاہر مطلب تو یہی ہو سکتا تھا کہ باوجود اسلامی شہر ہونے اور باوجود محمد رسول اللہؐ کے امتی اور ان کے دین پر ایمان لانے کے رسول اللہ کی باتوں پر چلنا ضروری نہیں ہے۔ سلطان جی نے سچ فرمایا کہ جب اسی قسم کی تعبیریں پیش کی جائیں گی تو پھر "سنت" پر اس ملک کے مسلمانوں کا عمل کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

"چہ گونہ اعتقاد بر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راسخ ماند۔"

آخری الفاظ آپ کے یہ تھے:

"ازاں وقت باز کہ ایشاں روایت کردن حدیث منع کردند' من ترسانم کہ شومت ایں چنیں بداعتقادی کہ بر علماء شہر معائنہ شد از آسمان بلا وجلا وقحط ووبا بر سر شہر خواہد بارید۔" (صفحہ 532)

یہ مولانا ضیاء الدین برنی کی روایت ہے جو براہ راست سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے انہوں نے نقل کی ہے۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بجے گی' اس شہر کے لوگ جلاوطنی کی مصیبت کا شکار ہوں گے۔ قحط میں مبتلا ہوں گے۔ وبا کی ماران پر پڑے گی۔ بادشاہ کے دربار میں علماء شہر اور قاضی الملک نے رسول اللہ کی حدیث کے ساتھ جو گستاخی کی ہے' اس کی سزا ان شکلوں میں لوگوں کو بھگتنی پڑے گی۔ سلطان المشائخ نے تو "می ترسانم عجب است کہ خشت خشت نہ شود" کے الفاظ سے صرف اندیشہ کا اظہار فرمایا۔

لیکن واقعہ اس کے بعد کیا ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کی وفات "روز چہارم شنبہ ہیزدہم ماہ ربیع الآخر 725ھ" (صفحہ 58) میں ہوئی اور ملا عبدالقادر بداؤنی لکھتے ہیں

"ایں واقعہ (یعنی قصر افتادن بر غیاث الدین تغلق) در سنہ خمس وعشرین وسبعماً تہ 725ھ روئے نمود۔" (صفحہ 225)

اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجانے والا' دلی کے ایک ایک متنفس کو دلی سے جلاوطن کر کے دیوگڑھی (دولت آباد) لے جانے والا اور ان سارے مصائب ہائلہ کا سرچشمہ جس کا نام محمد تغلق ہے۔

"سلطان محمد عادل شاہ بن تغلق شاہ کہ الغ خاں باشد در سنہ خمس وعشرین 725ھ باتفاق امراء وارکان دولت بر مسند سلطنت نشست۔" (صفحہ 225۔ بداؤنی)

میں اب اس پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا' صرف اتنی بات کہ برنی نے جو الفاظ سلطان جی کی زبانی نقل کیے ہیں' ان کو سامنے رکھ لیجیے اور "محمد تغلق"' جس نے خود تو اپنا نام "عادل" رکھا تھا لیکن عوام میں "محمد تغلق خونی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی چھبیس سال کی حکومت کی تاریخ پڑھ لیجیے اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے۔ ہو سکتا ہے کہ محمد تغلق کی مختلف

الآثاروالجوانب' متضاد صفات والی حقیقت عامہ مورخین واہل نظر کے لیے جو معمہ بنی ہوئی ہے' وہ معمہ حل ہو جائے۔

مشہور ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ تابعی کو حجاج نے شہید کیا اور اس پر وہ خاص کیفیت طاری ہوئی یعنی

کان اذا نام رأی سعید بن جبیر اخذ بمجا مع ثوبه یقول یا عدو الله فبم قتلتنی فاستبنظ مذعوراً ویقول مالی ولسعید (الیافعی۔صفحہ 198)

''جب حجاج سوتا تو خواب میں حضرت سعید کو دیکھتا کہ وہ اس کے کپڑوں کو پکڑے ہوئے فرما رہے ہیں' اے خدا کے دشمن! کس قصور میں تُو نے مجھے قتل کیا' حجاج اس خواب کو دیکھ کر ڈرا ہوا اٹھ جاتا اور بولتا کہ سعید کو ہم سے کیا تعلق ہو گیا ہے۔

اور ابن جبیر ہی کے قتل کے بعد اس کو وہ بیماری ہوئی جس کا نام لوگ ''زمہریرہ'' بتاتے ہیں۔ ایسی سخت سردی کلیجے سے اٹھ کر سارے جسم پر چھا جاتی تھی کہ کانپتا رہ جاتا تھا اور

وکانت الکوانین تجعل حوله مملوۃ ناراً وتدنی منه حتی یحرق جلده وهو لا یحس بها

''انگیٹھیاں آگ سے بھری اس کے پاس لائی جاتی تھیں اور اس سے قریب کی جاتیں تا اینکہ اس کی کھال بھی جل جاتی لیکن اس کو حس بھی نہ ہوتا۔''

پیٹ میں اطباء نے سرطان تجویز کیا۔ افعی وغیرہ نے لکھا ہے کہ

فدعا بالطبیب فاخدلحماو علقه فی خیط و سرحه فی حلقه و ترکه ساعة ثم اخرجه وقدعلق به دود کثیرة (یافعی۔جلد1 صفحہ 195)

''حجاج نے طبیب کو بلایا' طبیب نے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا اور اس میں تاگا باندھا اور گوشت کے اس ٹکڑے کو حجاج کے حلق میں اتار دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تاگے کو کھینچا تو دیکھا کہ اس گوشت کے ٹکڑے میں بکثرت کیڑے لپٹے ہوئے ہیں۔''

کہتے ہیں کہ جب مادی تدبیروں سے حجاج مایوس ہو گیا تو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو بلوایا اور دعا کی درخواست کی۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ حضرت حسن اس کے اس حال کو دیکھ کر چیخ مار کر رونے لگے اور حجاج کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

تدغیتک ان تتعرض للصالحین (للیافعی وغیرہ۔صفحہ 195)

''میں نے حجاج تجھے منع کیا تھا کہ نیک بندوں کو نہ چھیڑنا۔''

ظاہر ہے کہ حجاج کے پیٹ کا آکلہ (سرطان) ہو یا زمہریرہ (سردی) کی بیماری ہو' یہ تو بجائے خود ایک واقعہ ہے لیکن یہ بات کہ یہ کیفیت حضرت سعید بن جبیرؒ کے قتل اور خون ناحق کی آواز بازگشت تھی جس کی طرف خواجہ حسن بصریؒ نے ارشاد فرمایا۔ اس کا آپ کو اختیار ہے کہ مانیے یا نہ مانیے[47]۔ بجنسہٖ یہی کیفیت محمد تغلق کی ہے۔ اس کا جنون اور عجیب و غریب جنون جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد' کہ لاکھوں کی آبادی رکھنے والے معمور شہر کو بہ یک گردش قلم ویران کرتا ہے اور ایسا ویران کہ بقول ملا عبدالقادر بداؤنی

''دہلی چناں خراب شد کہ سگ وگربہ ہم دراں نہ ماند وایں بیت حسب حال آں بود ؎

جائے کہ بوداں دلستاں بادوستاں در بوستاں
شد گرگ دوروبہ رامکاں شد گرگ وکرگس را وطن

عجیب وغریب جلاوطنی کا یہ واقعہ ضرور پیش آیا' دوآبہ کی رعایا پر سخت قسم کے ٹیکس عائد کرنا۔

''گاؤ(48) شماری وخانہ ورسوم بدعتہائے دیگر نیز پیدا کرد کہ موجب خرابی وویرانی آں ولایت بالکلیہ گردید و ضعیفاں نابود شدند' اقویاء بنیاد فساد نہادند۔''

نیز ''سکہ'' کے مسئلہ میں جو حماقتیں باایں ہمہ عقل وہوش اس بادشاہ سے سرزد ہوئیں کہ لوگ

''مس بدار الضرب آوردہ مسکوک می گردانیدند وامتعہ واسلحہ باں خریدہ در اطراف عالم می فرستند .... وبدیں حیلہ زرہائے بسیار اندوختند اما مردم دارالسلطنت (دہلی) بخاک سیاہ برابر شدند'' (سیر المتاخرین۔ صفحہ 125)

قحط کی وہ صورت نمایاں ہوئی کہ

''گندم قیمت آدم پیدا کرد و برنج ہم سنگ طلا گردید' غلہ کمیاب چہ نایاب گردید تہی دستاں بگرسنگی مردند ومتوسطین ہم جاں بحق تسلیم کردند۔''

اور اس پر کریلے کو نیم پر دتی میں یوں اور چڑھا دیا گیا کہ

''سلطان بے رحم سیاہ دروں دروازہائے شہر (دہلی) بند کرد تا ہیچ کس از شہریاں بیروں نہ رود عامہ خلائق بدیں سبب زیادہ از حد شمار بگرداب فنا فرو شدند۔'' (صفحہ 126)

ظالم بادشاہ نے بالا خانہ سے جب اپنی بربریت ووحشت کے اس دردناک نتیجہ کا معائنہ کرلیا' تب اس کی تسلی ہوئی۔ کہا جاتا ہے' ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اندھے فقیر کو دتی سے گھسیٹ کر سپاہی دولت آباد کی طرف لے چلے' وہ مرگیا۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو راستہ میں گرتا چلا گیا تا ایں کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل اس شکل میں ہوئی کہ گھسٹتی ہوئی لاش کا صرف ایک ہاتھ دولت آباد کی سرزمین میں لاکر دفن کیا گیا۔

واقعہ یہ ضرور ہوا' اسی طرح ہوا جیسے ہمالیہ کی راہ سے چین پر چڑھائی کی مہم روانہ کی گئی جواب تک واپس نہیں ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب تک دتی میں رہا۔

''پیوستہ پیش سراپردۂ سلطانی ودرگاہ دیوانی او از کشتہ پشتہ واز مردہ تودہ بود وکناساں وجلاداں از کشیدن کشتن انبوہ بہ ستوہ آمدہ بودند۔'' (بداؤنی۔ صفحہ 238)

کشتوں کے یہ پشتے اور مردوں کے تودے جن جن شکلوں میں ڈھیر کیے جاتے تھے' طباطبائی کا بیان ہے کہ

''بریدن دست وپا وگوش وبینی ومیل کشیدن در چشم' وگرفتن' استخواں ہا بہ میخ کوب وسوختن اندام ذی حیات بآتش وکشیدن پوست بدن' ودوپارہ ساختن آدمی بستن وانداختن درپائے فیل و

بردار کشیدن۔''

جس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

''مردم ہر طائفہ از صوفی وقلندر ولشکری ونویسندہ وعمال ورعیت وتاجر باندک تقصیر وکمتر لغزش سیاست عظیم کردے۔'' (صفحہ 124)

واقعہ سب کے سامنے ہوا لیکن کیوں ہوا' دلی پر بلکہ ہندوستان پر اچانک یہ آفت کہاں سے ٹوٹ پڑی' لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا؟

یہ جستہ جستہ فقرے ان لوگوں کے لیے میں نے معتبر تاریخوں سے نقل کر دیئے ہیں تاکہ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر نہ ہو یا واقعات متحضر نہ ہوں' ان کے سامنے تازہ شکل میں وہ نقشہ گھوم جائے جس کا اندیشہ سلطان المشائخ نے علماء دلی کی توہین حدیث نبویؐ کے بعد ظاہر فرمایا تھا۔ تعجب تو اس پر ہے کہ یہ حیرت انگیز مدہش فقید المثال ساری باتیں کس بادشاہ سے سرزد ہوئیں جس کے متعلق ارباب تاریخ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ

''دراکثر علوم خصوص تاریخ ومعقولات ونظم وانشاء وغیرہم مہارت تمام داشت۔''

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ

''گاہ درنماز وروزہ وترویج احکام شرع قیام نمودہ دراجتناب ملاہی ومسکرات وسائر مناہی کوشش بلیغ نمودہ بہ تعصب می رسانید۔ (سیر المتاخرین۔ صفحہ 124)

اب آپ کا جی چاہے جیسا کہ قرآن نے روشن خیالوں کا یہ نظریہ حوادث کائنات کے متعلق نقل کیا ہے کہ

قد مَسّ اباء نا الضرّاء والسراء

مصیبتیں اور مسرتیں دونوں قسم کے واقعات گذشتہ نسلوں پر بھی گذرتے رہے ہیں۔'' (اس لیے ان کے پیچھے کسی اخلاقی قانون کی حکومت کو پوشیدہ سمجھنا حماقت ہے۔)

کی عام مادی ذہنیت والوں کی تعبیر کی چادریں اڑھا کر جو چیز محسوس کرائی گئی ہے' اسے اپنے لیے نامحسوس بنا لیجیے یا خوش اعتقادی وغیرہ کے الفاظ کی عصری گالیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہو تو آپ بھی تغلقی عجائب وغرائب جلاو بلا قحط ووباء میں وہی دیکھیے جو آج ہی نہیں' اسی زمانہ میں جب دلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا' دیکھنے والے دیکھ رہے تھے' میر خورد نے مجلس مناظرہ کے واقعات بالا کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

''ازاں بود کہ در چہارم سال ازیں ماجرا تمامی علماء کہ دریں محضر (مجلس مناظرہ) بودند و دیگراں راہم بہ سبب ایشاں در دیو گیر جلا کردند وبیشترے ازاں علماء' در دیو گیر سر نہادند قحطے مہلک و وبائے سخت در شہر پیدا شد۔''

میر خورد کے سامنے کی بات ہے' آخر میں لکھتے ہیں۔

''تا ایں غایت ایں بلا ہا بکلی دفع نمی شود سبحان اللہ ہر سخنے کہ بزبان مبارک سلطان المشائخ

گذشتہ بود عین آں معائنہ ومشاہد باشد۔'' (صفحہ 532)

اور اسی پر مجھے تعجب ہے کہ محمد تغلق کی فتنہ سامانیوں کے پیچھے اسی زمانہ میں لوگوں کو علماء دلی کی وہ گستاخیاں نظر آئیں جو اللہ کے ایک دوست اور محبوب کو ذلیل کرنے کے لیے پیغمبر کی حدیث کی تحقیر وتوہین پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اتنا بڑا واقعہ تو بھلا دیا گیا اور صرف ''ہنوز دلی دور است'' یا قطب الدین مبارک کے اچانک قتل کا واقعہ لوگوں کو یاد رہ گیا۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے جہاں ایک عجیب وغریب تاریخ واقعہ کی ایک توجیہہ کا تذکرہ ہے' اسی کے ساتھ ان عزیزوں سے بھی التماس ہے جو اپنے چند سرسری سطحی بے سروپا معلومات کو سامنے رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر رہے ہیں جن کا حاصل اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت تھی' دولت تھی' اقبال تھا' جلال تھا' اس وقت تک وہ خود ان کے علماء ان کے اولیاء سب اسلام سے دور تھے لیکن جب سب کچھ جاتا رہا تو غلامی کے اس دور میں اب حقیقی اسلام ان کے سامنے چہرہ پرداز ہوا ہے۔

پچھلے دنوں میں ایسے بعض مضامین شائع ہوئے جن سے دل کو سخت دکھ پہنچا اور گو مجھے بہت کچھ لکھنا ہے لیکن جیسے جیسے موقع ملتا جائے گا' اس سلسلہ میں جو اپنی حقیر معلومات ہیں' انہیں پیش کرتا چلا جاؤں گا۔ شاید غلط فہمیوں کا اس سے کچھ ازالہ ہو۔ میں نے قصداً اپنے اس مضمون میں خواجگانِ چشت اور ان میں بھی سلطان المشائخ کے حالات کے تذکرہ میں ذرا زیادہ طوالت سے اسی لیے کام لیا کہ ہندی مسلمانوں کی قلبی تربیت اور اخلاقی نشوونما' ایمانی رسوخ' اعتقادی شگفتگی' شرح صدر کا زیادہ کام اسی خانوادے سے متعلق رہا اور ان میں بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء کے خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان ہی کے حالات پر دوسرے بزرگوں کے حالات کو بھی قیاس کیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی حقیقی نمائندگی اور اپنے پیغمبر کے دین کی مخلصانہ خدمت جتنی راستبازی' وفاشعاری' بے نفسی کے ساتھ ان بزرگوں نے انجام دی ہے' بڑی ناشکری ہوگی اگر غیروں کے اغواء سے جس کا اکثر حالات میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا' ان کے خدمات کی اہمیت گھٹائی جائے۔ اصل حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا جس دن ''السرائر'' کو ''الظواہر'' کا رنگ دیا جائے گا لیکن یوں بھی عام مسلمانوں کا ''تلقی بالقبول'' میرے نزدیک تو ان بزرگوں کی مقبولیت الٰہیہ کی دلیل ہے۔ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن اسی زمانہ کے لوگوں کی یہ روایت ہے کہ جب سلطان المشائخ پر وقت ناگزیر آ گیا تو ٹھیک جو حال شیخ کبیر شکر گنج کا نماز کے باب میں تھا کہ بار بار پوچھتے اور دہرا دہرا کر ایک ہی نماز کو ادا کرتے۔ یہی حال سلطان المشائخ پر بھی طاری تھا۔ نیم بے ہوشی کی سی حالت تھی' اسی حالت میں پوچھتے۔

''وقت نماز شدہ است ونماز گذاردہ ام' اگر گفتند کہ شمار نماز گذاردہ ایدمی فرمود بار دیگر بگذارم۔''

پھر جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں بیان کیا ہے کہ انبار خانہ اور جو کچھ بھی گھر میں تھا' سب کو آپ نے بٹوا دیا' لٹوا دیا۔ لوگوں نے ''مقام مستودع'' یعنی قبر کے متعلق دریافت کیا' فرمایا

''من زیر عمارت کسے خفتنی نہ ام' من در صحرا خواہم خفت۔''(49)

عیادت کے لیے شیخ زکریا ملتانی کے پوتے مولانا رکن الدین آئے۔ بعض تشفی وتسلی کے کلمات فرما رہے تھے اور یہ کہ اللہ آپ کو ہم لوگوں میں زیادہ دیر تک سلامت رکھے۔ ''تا ناقصاں را کمالے حاصل شود۔'' اس وقت سلطان المشائخ ''چشم پُر آب کرد و فرمود'':

''من حضرت رسالت راصلی اللہ علیہ وسلم درخواب دیدہ ام کہ می فرمود نظام! اشتیاقِ تو مارا بسیار است۔''

مجلس ان کلمات کے سننے کے ساتھ چیخ اٹھی' مولانا رکن الدین پر بھی گریہ طاری تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے خدمات کی قیمت آج گھٹائی جا رہی ہے بلکہ جن پر رسولؐ کے دین کے بگاڑ کا الزام لگایا جا رہا ہے' خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہ میں اس کا اور اس کے کارناموں کا کیا مقام ہے' رضی اللہ ورسولہ عنہم ورضو عنہما۔ خدا جانے اصل مضمون کو میں نے کہاں چھوڑا تھا' غالباً اسی کا ذکر ہو رہا تھا کہ ہمارے قدیم تعلیمی نظام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دماغوں کی تصقیل وتشحیذ کے بعد میدان عمل میں آنے سے پہلے عموماً قلوب کی تصحیح کا مسئلہ قریب قریب ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی سلسلہ میں خواجگانِ چشت اور ان کے قرآنی ذوق کا ذکر آ گیا' بات چونکہ عام خیالات کے خلاف تھی' ضرورت ہوئی کہ ذرا تفصیل سے کام لیا جائے۔ سلطان المشائخ کا وجود میرے نزدیک صرف چشتیوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے عام صوفیا میں ایک مثالی وجود تھا اور ان کے حالات بھی ایسے ذرائع سے جو ممکنہ حد تک تاریخ میں معتبر ترین ذرائع سمجھے جا سکتے ہیں' بآسانی مل سکتے تھے۔ اس لیے ان کے تذکرہ میں کافی طوالت سے قصداً کام لیا گیا' گویا سمجھنا چاہیے کہ ایک طرح سے سلطان المشائخ کی سوانح عمری ہی درج ہو گئی۔ اگرچہ اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے' خدا کرے کہ اس کے لکھنے کی مجھے توفیق میسر ہو۔ واللہ علی مایشاء قدیر۔

اب میں اپنے اصل مضمون کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ نری دماغ کی تصحیح سے علم صحیح کے فوائد وثمرات نہ خود عالم کو حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو جیسا کہ چاہیے وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس خیال کی تائید غالباً سلطان المشائخ کی زندگی کے واقعات سے بھی ہو سکتی ہے۔ علی الخصوص محضر سماع والی مجلس میں دل کی اصلاح سے غافل ہو کر محض دماغ والے مولویوں نے جو مکروہ نمونے اپنی نفسانیت' دنائت' حسد' انانیت وغیرہ کے پیش کیے' اس لیے بھی قلبی تصحیح کی ضرورت آپ خود انصاف کیجیے کہ کتنی اہم ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قاضی جلال الدین لوانجی جیسا عالم بھی باوجود سب کچھ جاننے کے محض سلطان المشائخ کی شخصی عداوت اور حسد کے نشہ میں سرشار ہو کر علانیہ بھرے دربار میں اس قول کی ہمت کرتا ہے کہ

''ایں حدیث متمسک شافعی ست' او دشمن علماء ماست مانمی شنویم ونمی دانیم۔''

اور یوں رسول اللہ کی صحیح حدیث کے متعلق مدعی ہوتا ہے کہ میں اس کو نہیں مانوں گا۔ میر خورد کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین نے بادشاہ کے سامنے سلطان المشائخ کو اس کی بھی دھمکی دی کہ

''اگر سماع بشنوی من حاکم شرع ام ترا بیازارم۔''

سلطان المشائخ قاضی کی تمام باتوں کو سن کر ''حلم می ورزید وتحمل می کرد'' لیکن اس کی اس دھمکی پر زبان مبارک سے صرف ''معزول باد'' کا فقرہ نکل گیا۔ کہتے ہیں کہ ''بعداز دوازدہ روز معزول شد۔''

خیر یہ تو الگ بات ہے' میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ علم جب تک دماغ اور تن سے تعلق رکھتا ہے' اس وقت تک آستین کے سانپ سے زیادہ اس کی وقعت نہیں۔ اس کی یہ کتنی اچھی مثال ہے۔

اسی کے مقابلہ میں اسی دلی کے دوسرے قاضی محی الدین کاشانی کو دیکھیے۔ شیخ محدث وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ التمش کے عہد کے مشہور قاضی شہر قاضی قطب الدین کے نواسے تھے اور مدتوں خود بھی درس وتدریس کا کام انہوں نے شہر میں انجام دیا تھا۔ اسی وجہ سے ''استاد شہر بود'' لیکن دماغ کے ساتھ ان کو اپنے قلب کی اصلاح کا موقع بھی سلطان المشائخ کی صحبت میں مل گیا تھا۔ ان کی استعداد وصلاح مزاج کو دیکھ کر سلطان المشائخ نے ان کی خاص تربیت کی تھی۔ جس خاص خدمت کے لیے ان کا انتخاب سلطان المشائخ نے کیا تھا۔ اس کا اندازہ خلافت نامہ اس فقرہ سے ہو سکتا ہے جو سلطان المشائخ نے ان کو لکھ کر دیا تھا۔ آخری فقرہ یہ تھا۔

فان فعلت ما امرتک فظنی بک ان تفعل کذلک فانت خلیفتی وان لم تفعل فاللہ خلیفتی علی المسلمین

''پس اگر تم نے وہی کام کیا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے تو میرا گمان تمہارے ساتھ یہی ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے اور اس صورت میں تم میرے خلیفہ اور جانشین بن سکتے ہو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر مسلمانوں کی نگرانی کے لیے میرے خلیفہ اللہ تعالیٰ ہیں۔''

مجھے یہی دکھانا ہے کہ یہ سارا قصہ بھی ''المسلمین'' کے لیے تھا۔ محمد رسول اللہ کی امت کی حفاظت وصیانت کے لیے تھا' قاضی کاشانی میں باوجود خاندانی قاضی ہونے اور مولوی ہونے کے چند ہی دنوں میں سلطان المشائخ کی صحبت میں وہ ایمانی قوت پیدا ہوئی کہ

''مثال ادرا دکہ مایۂ دانشمنداں ست بخدمت سلطان المشائخ آورد وپارہ کرد۔''

اسی چیز نے سلطان المشائخ کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر پیدا کر دی تھی۔ لکھا ہے کہ سروقد ہو کر بجز قاضی کاشانی کے سلطان المشائخ اپنے مریدوں میں اور کسی کو تعظیم نہیں دیتے تھے لیکن یہی رتبہ کی بلندی بیچارے کے لیے ایک دفعہ مصیبت بن گئی۔ شاہی وظائف سے دست برداری کے بعد ظاہر ہے کہ امارت اور اس کا سارا ساز وسامان ٹھاٹھ باٹھ باقی نہیں رہا تھا۔ فقر وعسرت میں بسر ہوتی تھی۔ علاء الدین خلجی کو اس کی خبر ہوئی' اس نے فرمان صادر کیا کہ

''قضائے اودھ کہ مورث قاضی محی الدین ست با انعامات قریات بسیار بدو مفوض دارند۔''

شاہی فرمان قاضی صاحب کے پاس آیا' بس غلطی یہ ہو گئی کہ اسی وقت واپس کر دینے کی جگہ وہ اس فرمان کو لے کر سلطان المشائخ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

''سلطان بغیر خواست من ایں چنیں فرمانے دادہ ست تا فرمان مخدوم چہ شود۔''

اس کے سپرد ''المسلمین'' کی خدمت ہوئی تھی' اپنے اسی خلیفہ کی زبان سے ان الفاظ کا سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ و فرمود

''البتہ مثل ایں معنی در خاطر تو گذشتہ باشد آنگاہ ایں معنی برائے تو پیش آوردہ اند۔''

اس فقرہ کا مطلب اس زمانہ میں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا لیکن کسی زمانہ میں قلوب کی صفائی اس درجہ کو پہنچ جاتی تھی کہ خیال اِدھر دل میں آیا اور دوسروں پر اس کا عکس پڑتا تھا۔ اسی مسئلہ کی طرف سلطان المشائخ نے اشارہ فرمایا' تنے برہم ہوئے کہ اسی وقت حکم دیا کہ ''خلافت نامہ'' واپس کر جاؤ یعنی جب تم سے وہ کام سرانجام نہیں ہو سکتا اور وہی شاہی ملازمت کے شغل میں الجھنا چاہتے ہو تو پھر تم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کے لیے المسلمین پر تمہیں نائب بنایا گیا ہے۔

سلطان المشائخ کی یہ خفگی کہتے ہیں کہ سال بھر قائم رہی۔ قاضی بیچارے حیران تھے کہ کیا کروں' سال بھر کے بعد پھر ان کو جدید معاہدہ کا موقع دیا گیا۔ افسوس ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے ورنہ جو عہد کیا تھا' شاید ان کے بعد وہ مسلمانوں کی خدمت کرتے۔

یہ تھا اس زمانہ میں ان لوگوں کی تربیت کا طریقہ جو اپنی زندگی قومی خدمات کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ آج بھی لوگ ''المسلمین'' کا نام لے کر اٹھتے ہیں لیکن اس جلیل خدمت کے لیے دل سے کن کن چیزوں کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان بیچاروں کو اس کا موقع نہیں ملتا' پھر بجز چند اخباری بیانوں' مجلسی تجویزوں کے عام طور پر جو شکایت ہے کہ قومی لیڈروں سے اور کچھ بن نہیں آتا تو آپ گولر کے درختوں سے انجیر توڑنے کا خیال کیوں پکاتے ہیں۔ صورت اور نام کی شباہت سے حقیقت نہیں بدلتی۔ دماغی علم اپنے بڑے اہم کام کے لیے جو دراصل سچ پوچھیے تو پیغمبروں کی نیابت ہے' یقین کیجیے قطعاً کافی نہیں ہو سکتا۔ اس راہ میں ذروں کو آفتاب سے اور رائی کو پربت سے کاہ کو کوہ سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ مولانا فخر الدین زراوی اور ان کے علم و فضل کا ذکر مختلف طریقے سے ہو چکا ہے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ منجملہ اور مالیخولیاؤں کے محمد تغلق پر اس کا جنون سوار ہوا کہ ہندوستان سے باہر نکل کر براہ راست تاتاریوں کے ملک میں پہنچ کر ان کا قلع قمع کر دے۔ اس کے لیے اس نے ''جہاد'' کی مہم کا اعلان کیا۔ عظیم الشان بارگاہ نصب ہوئی' اس میں منبر رکھا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسی منبر سے بادشاہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے گا لیکن دعوت سے پیشتر اس نے چند علماء سے مشورہ ضروری سمجھا جن میں ایک مولانا فخر الدین زراوی بھی تھے۔

مولانا کی حاضری کا حکم ہوا۔ قطب الدین دبیر جو سلطان المشائخ کے مریدوں میں تھے اور محمد تغلق کے دبیر (سکرٹری) تھے۔ یہی مولانا فخر الدین کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے جوتے اتار کر فرش پر جب قدم رکھا تو قطب الدین دبیر نے ان کی جوتیاں اٹھا لیں اور بغل میں دبا کر پیچھے پیچھے چلے۔ تغلق قطب الدین کی ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے۔ کس بادشاہ کے سامنے؟ ''محمد تغلق خونی'' کے سامنے۔ بادشاہ مولانا سے خطاب کر کے پوچھتا ہے۔

''ما می خواہم کہ آل چنگیز را برانداز یم' شما دریں کار ما موافقت خواہید کرد۔''

مولانا نے جواب میں فرمایا ''ان شاء اللہ تعالیٰ۔''

دیوانے تغلق کی اس سے کیا تشفی ہو سکتی تھی۔ بولا کہ ''ایں کلمہ شک است۔''

سننے کی بات ہے' سامنے تغلق ہے۔ تغلق کے جلاد ہیں۔ اس کی کھینچی ہوئی تلوار ہے' بغیر کسی جھجک کے جواب میں مولانا نے فرمایا ''در مستقبل ہمی آید۔''

مطلب یہ تھا کہ یہی ہو کر رہے گا یعنی خود تمہارا عزم مشکوک اور مشتبہ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ تغلق کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا' خون کھولنے لگا لیکن کسی معمولی کردار کا سامنا نہ تھا' بات بدل دی اور بولا کہ ''شما مارا نصیحت کنید۔''

نصیحت کی درخواست تغلق کر رہا ہے' خدا جانے کتنے نصیحت کرنے والوں کو جو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ کشتوں کے پشتوں سے بھرے ہوئے دربار کا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا لیکن مولانا اسی سنجیدگی اور وقار سے تغلق کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

''غضب فرو خورید۔''

پوچھتا ہے ''کدام غضب؟'' مولانا فرماتے ہیں ''غضب سبعی۔''

یعنی درندوں جیسا غصہ تم نے اپنے اندر پیدا کر لیا ہے کہ کسی کی ادنیٰ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے۔ اس غصہ کو پی جاؤ۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جواب کے بعد مولانا کے سامنے اپنا جو انجام ہو سکتا تھا' وہ ظاہر ہے۔ شاہی دربار کی طرف جس وقت قطب الدین دبیران کو لے چلے تھے' اسی وقت یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے۔

''من سر خویش بر در سرائے ایں مرد (تغلق) غلطیدہ می بینم باو مساحت نخواہم کرد و زندہ نخواہد گذاشت۔''

سیکڑوں کا انجام ان کے سامنے تھا۔ اسی پر قیاس کر رہے تھے۔ کچھ ہی دن پہلے اسی حق گوئی کے الزام میں مولانا عماد غوری کا سر اسی محمد تغلق کی تلوار سے اڑ چکا تھا۔ شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں محمد تغلق پر جدید دین کی تجویز کا خبط سوار تھا' مولانا عماد غوری کو بلا کر اس نے پوچھا۔

''فیض خدا منقطع نیست چرا باید کہ فیض نبوت منقطع شود۔''(51)

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ''مولانا عماد بر فور گفت'' کہ ''گہہ مخور چہ می گوئی۔'' آخر جہنم میں گہہ خوری کے لیے اس نے حکم دیا کہ ''اور اذبح کنید و زبانش بر آرند۔'' (صفحہ 201)

اور ایسے واقعات تو ہر دن بلکہ دن کے اکثر گھنٹوں میں پیش آتے رہتے تھے۔ البتہ زیادہ تر اس کے ستم کے تختہ مشق بیچارے وہی لوگ تھے جو اس کے دربار کے ملازم تھے۔ معمولی قصور پر قتل کی سزا پاتے تھے۔ مولانا عمادؒ ان عاشقانِ پاک طینت میں ہیں جنھوں نے اپنے وقت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے عشق میں ''بخاک و خون غلطیدن'' کی رسم کو زندہ کیا تھا۔

بہر حال مولانا زراوی بھی اسی رسم کی تازگی پر کمر ہمت چست کیے بیٹھے تھے لیکن خدا ہی جانتا ہے کیا صورت پیش آئی کہ تغلق مولانا کی زبان سے ایسی سخت بات سننے کے بعد بھی خاموش ہی رہا بلکہ بجائے اس کے خاصہ طلب کیا اور مولانا

کو اپنے ساتھ بٹھا کر

''در یک صحنک بطعام خوردن مشغول شدند۔''

مولانا کھانے میں شریک تو ہو گئے لیکن چہرہ کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر سخت بار ہے۔ تغلق کو بھی ان کے اس بار کا احساس ہو رہا تھا لیکن خلاف معمول وہ اور نرم پڑتا جاتا تھا حتیٰ کہ مولانا کی دلدہی کے لیے

''گوشت از استخواں جدا می کرد و پیش مولانا فخر الدین می نہاد۔''

مگر مولانا پر وہی ناراضگی کی علامت برابر باقی تھی۔ ''با کراہ تمام اندک اندک تناول می کرد۔'' خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور مولانا کو رخصت کرتے ہوئے تغلق نے حکم دیا کہ روپیہ کی ایک تھیلی اور اونی کپڑے کا ایک تھان ہدیہ میں پیش کیا جائے۔ اس کی نیت فاسد تھی، ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس ہدیہ کو اگر مولوی نے واپس کیا، بس رد ہدیہ کو خلاف سنت قرار دے کر گردن اڑا دوں گا۔ اس وقت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ قطب الدین دبیر جان پر کھیل گئے اور قبل اس کے کہ مولانا کی طرف ہدیہ بڑھایا جائے۔ دبیر نے ان کی طرف سے خود لے لیا۔ دبیر کو یقین تھا کہ مولانا واپس کریں گے اور دیوانہ اسی کو کار براری کا ذریعہ بنائے گا۔ خدا خدا کر کے مولانا کو تغلق کے دربار سے نجات ملی اور بخیر وخوبی گھر واپس ہوئے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ مولانا کے چلے جانے کے بعد قطب الدین دبیر پر تغلق کا سارا نزلہ رجوع ہو گیا۔ چلا چلا کر ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اے مزوّر شکال ایں چہ حرکتہا بود کہ کردی اول کفشہائے فخر الدین راز یر بغل گرفتی بعدہ جامہ وسیم او خود پسندی، و اورا از تیغ من خلاص دہانیدی و بلائے او بر خود گرفتی۔''

لیکن دبیر نے جو کچھ کیا تھا، طے کر کے کیا تھا۔ بادشاہ کے ان غضبناک بلکہ پیغام موت کے فقروں پر آزادی کے ساتھ انہوں نے بھی جواب دیا۔

''او استاد من است وخلیفہ مخدوم من مرا شاید کہ کفشہائے او بتعظیم بر سر گیرم فکیف کہ زیر بغلے وجامہ وسیم را خود چہ اعتبار ست۔''

تغلق ان کی صاف گوئی سے متاثر ہوا، پہلے تو بولا۔

''ایں اعتقاد ہائے کفر آمیز را بگذار والا ترا ہم خواہم کشت۔''

گویا استاد اور پیر کی عظمت اس کے نزدیک ''اعتقاد ہائے کفر آمیز''(52) تھی مگر ''خواہم کشت'' کی دھمکی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کا ایک واقعہ تغلق ہی کے ساتھ سلطان المشائخ کے ایک اور تربیت یافتہ بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور کا بھی ہے۔ یہ شیخ کبیر شکر گنجؒ کے مشہور خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں۔ ہانسی ہی میں ان کا قیام رہتا تھا۔ محمد تغلق بر سبیل دورہ ہانسی پہنچتا ہے۔ اطراف کے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں لیکن شیخ قطب الدین منور اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ہیں، محمد تغلق کو اس کی خبر ملتی ہے۔ حاضری کا فرمان صادر کرتا ہے اور حسن برہنہ نامی امیر کو حکم دیتا ہے کہ فوراً شیخ کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کیا جائے۔ حسن برہنہ ہانسی پہنچتا ہے۔ شیخ کو بادشاہ کا حکم سناتا

ہے۔ شیخ پوچھتے ہیں، جبراً لانے کا حکم ہے یا میری مرضی کو بھی دخل ہے؟ اس نے کہا کہ جبراً جس طرح ممکن ہو لاؤ' اسی کا حکم ہے۔ شیخ بیوی کے پاس جاتے ہیں۔ خدا کے حوالہ ان کو اور بال بچوں کو کرتے ہیں۔ ''مصلی برکتف' عصا در دست گرفتہ پیادہ پا رواں شد۔''

حسن گھوڑا پیش کرتا ہے' انکار کیا گیا۔ ہانسی سے باہر نکلتے ہوئے اپنے آباؤ اجداد کے مقبرے کے سامنے سے گذرتے ہیں' فرماتے ہیں۔

''من از کنج شما باختیار خود بیروں نہ آمدہ ام مارا می برند۔''

شاہی بارگاہ ہانسی نامی قریہ میں تھی جو ہانسی کے قریب ہے لیکن بادشاہ بجائے ملاقات کرنے کے حکم دیتا ہے کہ شاہی کیمپ کے ساتھ ان کو دلّی لے چلو' اب ساتھ ساتھ منزل بمنزل دلّی پہنچتے ہیں۔ دلّی میں ان کے صاحبزادے میاں نور الدین بھی آ جاتے ہیں۔ تغلق شیخ کی حاضری کا حکم دیتا ہے۔ شیخ نور الدین صاحبزادے بھی ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ شاہی محل سرا میں دونوں باپ بیٹے داخل ہوتے ہیں۔ ہر طرف ننگی تلواریں لیے سنتری ٹہل رہے ہیں۔ در و دیوار سے دہشت و خوف کی بارش ہو رہی ہے۔ شیخ قطب الدین مطمئن آگے بڑھے چلے جاتے ہیں لیکن کمسن نوجوان شیخ نور الدین کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ بیٹے کو پلٹ کر شیخ اس حال میں پاتے ہیں' فرماتے ہیں۔

''بابا نور الدین العظمۃ والکبریا اللہ۔'' (یعنی بابا نور الدین بڑائی اور عظمت صرف اللہ ہی کے ہے۔)

یہ وہ نشہ تھا' توحید کا جو سلطان المشائخ کی مجلس میں پلایا جاتا تھا' نور الدین سنبھل جاتے ہیں' تخت سامنے نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں تیر و کمان ہے' بادشاہ کا غصہ سے چہرہ بگڑا ہوا ہے' آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔ شیخ السلام علیکم کہتے ہیں' مصافحہ کے لیے بادشاہ ہاتھ بڑھاتا ہے۔ شیخ ہاتھ ملاتے ہیں' ہاتھ کا ملانا تھا کہ تغلق کا رنگ فق پڑ جاتا ہے۔ خدا جانے کیا کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھا تھا لیکن اب زبان سے جو الفاظ اس کے نکلتے ہیں' وہ یہ ہیں۔

''من در دیار شما رسیدیم تربیت نہ فرمودند و بملاقات خویش شرف نہ گردانیدند۔''

شیخ اسی توحیدی سکینت و وقار کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

''ایں درویش خود را دریں محل نمی دارد کہ ملاقات بادشاہاں کنہ' در گوشہ بدعا گوئی بادشاہ و کافہ اہل اسلام مشغول می باشد' معذور می باید داشت۔''

تغلق چپ ہو جاتا ہے اور فیروز باربک جو بعد کو فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہوئے' ان کو حکم دیتا ہے۔ ''انچہ مطلوب شیخ ست ہمچناں کنید۔''

شیخ پھر فرماتے ہیں ''مقصود من فقر و مطلوب من کنج جد و پدر ست۔''

محمد تغلق یہ سن کر ان کو رخصت کر دیتا ہے۔ میر خورد نے تغلق کے ایک نامی امیر اعظم ملک کبیر معظم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ شیخ کی روانگی کے بعد محمد تغلق نے اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا کہ جس کسی نے مجھ سے آج تک مصافحہ کیا

''البتہ دست اولرزید مگر ایں بزرگ کہ بقوت دین دست ما محکم گرفتہ بود از سیمائے او مہابت دین احساس کردم۔''

لیکن دین کی یہ مہابت اور ہاتھ میں یہ قوت کہ محمد تغلق جیسا جبار بھی ان کی نگاہوں میں پرپشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ یہ کہاں سے پیدا ہوا تھا؟ آگے قصہ سنیئے' تغلق نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین برنی کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ان کو مطلع کرو۔

''بادشاہ یک لک تنکہ انعام فرمود۔''

خبر شیخ کو پہنچتی ہے۔ بے ساختہ زبان مبارک سے ''نعوذ باللہ ایں درویش یک لک تنکہ قبول کند۔'' ٹکہ سا جواب دے دیا جاتا ہے۔ دونوں بادشاہ کی خدمت میں شیخ کے انکار کی خبر پہنچاتے ہیں۔

''فرمان شد کہ پنجاہ ہزار بدہید۔''

مگر شیخ کو انکار ہی پر اصرار رہا۔ آخر میں تغلق عاجزی کے ساتھ کہلا بھیجتا ہے۔

''اگر شیخ ایں مقدار قبول نہ کند خلق مرا چہ گوید۔''

بالآخر بڑے ردوکد کے بعد دو ہزار پر بات طے ہوئی۔ شیخ اس رقم کے لینے پر راضی ہو گئے اور اس لیے راضی ہو گئے کہ فیروز شاہ اور برنی دونوں نے عرض کیا کہ ''ما کم ازیں نتوانم پیش تخت ذکر کردن کہ شیخ ایں ہم قبول نمی کند۔''

شیخ قطب الدین نے دونوں کو جواب دیا۔

''سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی دانگے سیر روغن کفاف باشد او ہزار را چہ کند۔''

یہی چیز تھی جو سلطان المشائخ دین کے خادموں کے قلوب میں پیدا کرتے تھے۔ جس دل سے ہزار ہا کا وزن نکل گیا۔ اگر ''تغلق'' کا وزن پشک شتر سے بھی کم اسے محسوس ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ روپے والوں کا بوجھ تو وہی اپنے اندر پاتے ہیں جن کے دل پر روپیہ کا وزن ہو' جب روپیہ ہی کا وزن نہ رہا صرف دو سیر کھچڑی اور دانگے سیر روغن زرد زندگی گذارنے کے لیے جنہیں بس کرتا ہو وہ بھلا کسی کے بس میں آسکتے ہیں؟

سبک روح تجرد بھی کہیں پابند ہوتے ہیں۔ **انما ذلکم الشیطن یخوف اولیائہ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین**

''شمیم گل کے نقاشو! ذرا تصویر تو کھینچو۔ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو دہلاتا ہے۔ پس نہ ڈرو ان سے اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اگر تم ایمان والے ہو۔''

کے قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل ہے بلکہ اس کا زندہ اور کھلا ہوا تجربہ ہے کہ ''الشیطان'' کی ولایت سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کی ولایت ہی کو جو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں' ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی دھمکی نہیں دے سکتی۔ ''محمد تغلق'' کی عناں گسیختہ طغیانیاں بھی جس دل کو ہلا نہیں سکیں' خود اندازہ کرنا چاہیے کہ ایمان قوت کے جن لامحدود خزانوں سے قلوب کو بھر دیتا ہے' اس قوت کو جانچنے کے لیے اس سے بھی بہتر کسوٹی کیا اور مل سکتی ہے۔ جس کے کام ہی سے نہیں صرف نام کے سننے سے بھی روح لرز جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ولایت الٰہیہ کے وارثوں کا صرف مصافحہ بلکہ صرف ''**سیماھم فی وجوھھم**

من اثر السجود'' کی ایک جھلک اسی کو کپکپا دیتی ہے۔ شیخ قطب الدین منور کے صاحبزادے شیخ نورالدین کا بیان ہے' میر خورد نے غالباً براہ راست ان کی زبان سے سنا ہے کہ بارگاہ شاہی کے سراوق جلال سے مرعوب ہوکر جب ان کے پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی اور شیخ منور نے ان کو''الکبریاء للہ'' کی ڈانٹ سے چونکایا تو فرماتے ہیں۔

''بہ مجرد آں کہ این سخن (العظمۃ والکبریاء للہ) بسمع من رسید تقویتے در باطن من ظاہر گشت و اطمینانے واستظہارے حاصل شد۔''

کیسا اطمینان' کیسی پشت پناہی' جس کا احساس ان کے نوجوان قلب نے محسوس کیا؟ خود کہتے ہیں:''چنانکہ آن ہیبت و رعب از دل من بکلی زائل شد۔''

تغلق کے دربار میں''دورویہ آہن پوش تیغ بکمر دگرز بدوش'' امراء و ملوک پراباندھے جو لوگ کھڑے تھے' غالباً شیخ نورالدین اسی نظارہ ہوش ربا سے متاثر تھے لیکن فرماتے ہیں کہ احساس کی تبدیلی کے ساتھ ہی'' آن امراء و ملوک در نظر من ہمچو وسپنداں نمودند۔''

یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں ہے' ذاتی تجربہ ہے۔ اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ ہے۔ پہلی دفعہ نہیں بلکہ جب کبھی''ایک ہی کا خوف دل میں قائم ہوا ہے تو ہر ایک کا ڈر یوں ہی نکل بھاگا ہے'' آدم اور آدم کی اولاد ڈرنے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی سرشت کی افتاد اور فطرت کی ساخت یہی ہے۔ مجانین یا پاگلوں کے سوا آدمی کی عقل جب تک سلامتی اور صحت کی حالت میں رہتی ہے' ڈرنے کا مشورہ دیتی رہے گی لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ''ایک'' سے اگر آپ نہیں ڈریں گے جس سے ڈرنے کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہے تو عقل مجبور ہے کہ''ہر ایک'' سے ڈرنے کا آپ کو مشورہ دے لیکن بجائے''ہر ایک'' کے اگر''ایک'' ہی کی خشیت اور ڈر میں آپ کا دل ڈوب گیا' اسی کی عظمت اور کبریا کے استحضار و شعور میں غرق ہوگیا تو اس وقت وہی عقل ایمان کی روشنی میں''ہر ایک'' سے بے پرواہ ہونے پر اصرار کرتی ہے۔

میرے نزدیک صحیح حریت اور آزادی یہی ہے' باقی جو لوگ نہ ایک سے ڈرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہر ایک سے بھی نہیں ڈرتے' کم از کم میری سمجھ سے یہ باہر ہے کہ اپنے عقلی احساسات کے کچلے بغیر اس دعوے کی ہمت ان میں کیسے پیدا ہوتی ہے' جو بے زور ہے۔ اس کو زور والوں سے قطعاً ڈرنا چاہیے جو نہتا ہے اس کو ان لوگوں سے دبنا چاہیے جن کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں' بندوقیں ہیں' اس وقت تک ڈرنا چاہیے' دبنا چاہیے۔ جب تک کہ کسی زیادہ زور آور کی ولایت و حمایت کا اسے یقین نہ حاصل ہو جائے' زندگی میں بھی۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل

''اللہ ہمیں بس ہے بڑا اچھا وکیل۔''

کی نہ ہلنے والی چٹان پر اپنے آپ کو جو کھڑا پاتا ہو اور موت یا قتل کے متعلق بھی۔

ولئن متم او قتلتم لا لی اللہ تحشرون

''اور اگر تم مرے بھی یا قتل ہوئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔''

کی نہ بجھنے والی روشنی اس کے سامنے جگمگا رہی ہو لیکن اس کے بغیر جن کمزوروں کی زبان سے ''ہم کسی سے نہیں ڈرتے'' ''دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی'' کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ یقین کیجیے کہ یا ان کی عقل جنون کی آفت سے ماؤف ہے یا جو کچھ وہ بولتے ہیں' صرف بولنے کے لیے بولتے ہیں۔ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے' صرف کہنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے دماغی تصحیح کے ساتھ قلبی اصلاح کا جو ایک مرکب نظام اس ملک میں قائم کیا تھا' اس کے حیرت انگیز نتائج و آثار ہندی اسلام کی پہلی صدیوں ہی تک محدود رہے۔ اس میں شک نہیں کہ نتائج کی آب و تاب' ان کی تازگی اور رونق میں دن بدن انحطاط پیدا ہوتا رہا۔ ان چھ صدیوں میں اتار چڑھاؤ کے بیسیوں حوادث سے اسے گزرنا پڑا' لیکن یقین کیجیے کہ اس وقت تک جب تک کہ ہماری زندگی کی واپسیں سانس اس ملک میں پوری ہوئی' حکومت کے چراغ کی آخری ٹمٹمانے والی لو جب تک نہ بجھی تھی اور بزرگوں سے تعلیم و تربیت کا جو نظام وراثت میں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا تھا' جب تک کہ آخری برہمی کا وہ شکار نہ ہوا تھا' اس وقت تک ان انقلابی ہستیوں کے سوا جو اس ملک کی دینی و علمی تاریخ میں ''مقامِ خاص'' کے مالک ہیں' یوں بھی ملک کا کوئی گوشہ ان رسیدہ پھلوں سے خالی نہ تھا جس کا پھلنا تعلیم و تربیت کے اس ''شجرۂ طیبہ'' میں تقریباً لازمی تھا جسے صدیوں کے مسلسل تجربات کے بعد ہمارے بزرگوں نے یہاں نصب فرمایا تھا' ضخیم تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اگر کتابوں سے ان کے بکھرے ہوئے حالات ایک جگہ جمع کیے جائیں۔

سمجھانے کے لیے میں نے آپ کے سامنے تقریباً ہندی اسلام کی پہلی صدیوں کے چند نمونے اب تک پیش کیے ہیں' اب تک میری گفتگو کا دائرہ زیادہ تر ان ہی بزرگوں کی حد تک محدود رہا ہے جن کا تعلق ساتویں اور آٹھویں صدی کے آغاز سے ہے۔ اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں گیارہویں بلکہ بارہویں صدی ہجری کی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مختصر کتاب ''مآثر الکرام'' سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں جس کا کسی صوبہ یا ضلع یا تعلقہ کے باشندوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اودھ کے قصبہ ''بلگرام'' ہی کے لوگوں سے تعلق ہے۔ ایک قصبہ کی پیداواروں کا جب یہ حال تھا تو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سارا ملک کس رنگ میں رنگین ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بلگرام کا شمار ہمیشہ سے ہندوستان کے ایک مردم خیز قصبوں میں ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کو علم یا دین کی کوئی خاص مرکزیت حاصل تھی۔ خود مولانا آزاد بھی باوجود وطن دوست ہونے کے یہ مانتے ہیں کہ خود اودھ ہی میں بلگرام جیسے بیسیوں قصبات تھے' ابوالفضل نے تو بلگرام کے ذکر میں لکھا ہے۔

''قصبہ ایست خوش ہوا' بیشتر مردم آں خوش فہم و سرود سرا۔''

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خوش فہمی کے ساتھ جہاں سرود سرائی کا بھی لوگوں کو عارضہ ہو' وہاں خوش فہمی سے صحیح استعمال کہاں تک لیا جا سکتا ہے۔ گو اسی کے ساتھ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''درآنجا چاہے ست کہ ہر کہ چہل روز آب از وآشامد شناسائی و حسن منظر فزاید۔''

شناسائی کا واللہ اعلم کیا مطلب ہے۔ دقت نظری یا معرفت کچھ بھی ہو لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو خود اعتقادی کے زمانہ کی باتیں ہیں' خوش اعتقادی کا ایسا زمانہ کہ ابوالفضل جیسے بداعتقاد آدمی کو بھی اس کے تذکرہ میں ندامت محسوس نہیں ہوئی

لیکن بداعتقادی کے اس عام دور میں اب کنوؤں کے پانی سے حصول شناسائی کی کون توقع کرسکتا ہے۔

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ ان مثالوں کو مثالوں ہی کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے۔ یہ خیال غلط ہوگا کہ یہ بلگرام کی خاص خصوصیت تھی بلکہ اس زمانہ کے ماحول کی یہ عام پیداوار یں تھیں جن میں بلگرام نے بھی اپنا حصہ پایا تھا۔

میں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستانی تصوف خصوصاً طریقہ چشتیہ کی خاص خصوصیت ''سلوک بالقرآن'' تھی' گو میرا یہ دعویٰ عجیب تھا لیکن بحمد اللہ جو شواہد اور وثائق آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں' ان کے دیکھنے کے بعد بھی کیا لوگوں کا تعجب باقی رہا ہوگا لیکن وہ مثالیں تو ساتویں اور آٹھویں صدی کی تھیں۔ اب آئیے گیارہویں یا بارہویں صدی میں آئیے۔ دیکھیے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت تک بھی قرآن کو کس طریقہ سے استعمال کر رہے تھے۔

مولانا آزاد نے سید نور اللہ نامی ایک صاحب کا ذکر کیا ہے۔ مولانا ان کے دیکھنے والوں میں ہیں' اس لیے جو کچھ سنایا جائے گا' شنیدہ نہیں بلکہ زیادہ تر وہ دیدہ ہی ہوگا۔ ان ہی سید نور اللہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ دماغی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قلبی تصحیح کی فکر یں گھر سے باہر نکلے۔ دلّی پہنچے' کس پر نظر جمی نہیں۔ سیدھے سلطان المشائخ کے جوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ کچھ دن کے بعد یہاں سے پھر بلگرام ہی واپس گئے۔ بلگرام میں اس وقت دوائے دل کا کام سید لطف اللہ بلگرامیؒ کے سپرد تھا۔ مولانا آزاد بھی خود ان ہی کے دست گرفتہ ہیں۔ عوام سید صاحب کو میر لدھا یا پیر لدھا کے نام سے پکارتے تھے اور مولانا آزاد اپنی کتاب میں ہر جگہ ان کو سید العارفین کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں۔ سید نور اللہ سید العارفین میر لدھا صاحب کے برادر صغیر تھے۔ ان ہی سے آ کر بیعت حاصل کی اور ان ہی کی صحبت میں اپنے علم میں عمل کے رنگ بھرنے کی مشق بہم پہنچانے میں مشغول ہوئے۔ استعداد بالغ تھی' رنگ بہت جلد نکھرنے لگا۔ مولانا ہی فرماتے ہیں ''حالتے عجب بہم رسانید۔'' یہ حالت عجیب کیا تھی ''شبہا چشم کم برہم می زد۔''

لیکن رات کی ان تاریکیوں میں کیا ستارے گنتے تھے' دور بین لگا لگا کر آسمانی فضاؤں میں دب اصغر اور دب اکبر کی جستجو کرتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

''اکثر اوقات می گریست در رکوع گاہے وگاہے در سجود شب را صبح کردے۔''

استغراق کا یہ عالم تھا کہ

''احیاناً (بعض اوقات) حالت رو داد کہ تا یازدہ روز بیشتر اکل و شرب نمی پرداخت۔''

مگر باوجود اس استغراق کے جوان کا ایک خاص حال تھا' بیداری کی یہ کیفیت تھی کہ سید العارفین کی مجلس میں ایک رند قلندر بیٹھا تھا' کہیں سے مزامیر (باجوں) کی آواز آئی' قلندر نے میر صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا

''جائے کہ مزامیر ست رواں بائید شد۔''

سید نور اللہ جو عموماً خاموش رہتے تھے' وہ بھی سامنے بیٹھے تھے' مہر سکوت ان کی ٹوٹتی ہے' قلندر سے پوچھتے ہیں

''در انجا چیست؟''

قلندر نے قلندرانہ جواب یہ دیا۔ گفت ''اللہ ست۔''

یعنی ''جہاں باجا ہے وہاں خدا ہے۔'' اس فقرہ کا سننا تھا کہ سید نور اللہ میں حمایت شریعت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے' کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قلندر کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور گرجتی ہوئی آواز میں ''برخیز اللہ را بنما۔''

صرف دعویٰ نہیں دلیل کا سوال تھا' قلندر کی ساری قلندریت غائب ہو گئی۔ کھسیانی صورت بنا کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ سید صاحب پر جلال طاری تھا۔ آخر سید العارفین نے اٹھ کر قلندر کو ان کے ہاتھ سے نجات دی۔

محمد رسول اللہؐ کے فرمان کی توہین ہو رہی تھی۔ سید صاحب کو ہوش آ گیا مگر جانتے ہو یہی ہوش بے ہوشی سے کب بدلتا تھا' کیا طبلہ کی کسی تھاپ یا کسی راگ کے الاپ پر؟ مولانا آزاد راوی ہیں۔

''شبے نماز تراویح بہ جماعت می خواند۔''

قرآن سن رہے تھے' براہ راست خالق کائنات کے مخاطب تھے۔

''امام بریں آیت رسید فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً (تم کم ہنسا کرو اور چاہیے کہ زیادہ رویا کرو) درعین نماز بے ہوش افتاد۔''

جس ''اللہ'' کو الہ بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سپرد کیا تھا' اسی الہ کی تلاش میں سید صاحب کو کہیں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ پیر سے عرض رسا ہوئے' بعض اشغال اور تدبیریں بتائی گئیں' مشکل حل نہ ہوئی۔

میں جب کہتا ہوں کہ ہندوستان کا تصوف قرآنی تصوف تھا تو لوگ حیران ہوتے ہیں۔ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ سن چکے' وہ تو سن ہی چکے لیکن وہ تو ہندی اسلام کی ابتدائی قرون کی باتیں تھیں' سنیے بارہویں صدی میں بھی سلوک کی راہ میں مرید رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ پیر علاج تجویز کرتا ہے۔

''برو قرآن مجید حفظ کن۔'' (مآثر الکرام۔ صفحہ 120)

جس کی تلاش تھی' اس کے پانے کی قریب ترین راہ یہی ہو سکتی تھی' محبوب مل بھی جائے ع ''تم ہمارے سامنے ہو' ہم تمہارے سامنے'' کا نظارہ بھی پیش آ جائے لیکن دل کی بے کلی'' کچھ اپنی ہم سنائیں' کچھ وہ سنائیں اپنی'' کے بغیر کیا مٹ سکتی ہے؟'' قرآن حفظ کن۔'' اسی کی تدبیر تھی' مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

''چند جز از قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت۔''

اب بات ہی کیا باقی رہتی ہے' عمر زیادہ گذر چکی تھی لیکن چند جز کے بعد کل اجزاء قرآنی کے حفظ کی دھن سوار ہو گئی' جب تک جیتے رہے اسی شغل میں جیتے رہے۔

''بست و پنج جز یاد کردہ بود۔''

کہ جس وقت کے لیے جی رہے تھے' وہ وقت آ گیا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جب ''وقتِ احتضار رسید۔'' پوچھا گیا ''تمنائے بہ خاطر دارید۔''

ساری آرزوؤں کو سینے سے نکال کر ایک ہی آرزو کی لذتوں میں جو ڈوب گیا تھا' سنتے ہو' بارہویں صدی کا ہندی مسلمان بھی یہی جواب دیتا تھا۔

''ہمیں تمنا باخود دارم کہ پنج جز از قرآن باقی ماند فرصت حفظ نہ یافتم۔''

پانچ پاروں کے حفظ کی تمنا گور تک لے جانے والے کی وفات کی تاریخ مولانا آزاد کو ''بشریٰ لکم الیوم جنات'' ملی۔

جس قرآن میں حفظ کرتے تھے' وہ گم ہو گیا۔ گھر کے لوگوں کو تلاش تھی' خواب میں آئے اور اطلاع دی کہ ''قرآن درخانہ فلاں درفلاں محل ست'' اور بیداری میں لوگوں نے ''چوں خبر گرفتند ہمانجا یافتند۔''

اللہ کی راہ میں مرنے والوں کے متعلق قرآن میں ''بل احیاء'' یعنی وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں' کی خبر دی گئی تھی' خواب میں جس خبر دینے والے کی بات بیداری میں دیکھی گئی کیا خواب کی اس تجربی تفسیر کے بعد بھی یہی سمجھا جائے گا کہ ایسے لوگوں کا صرف نام زندہ رہتا ہے ورنہ واقع میں وہ معدوم (53) ہو جاتے ہیں۔

مولانا آزاد نے بارہویں صدی کے اس واقعہ کے ساتھ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار جو حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد میں ہیں' یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک قاری حضرت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا' ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ' خوش الحانی کے ساتھ سورۂ ق کی تلاوت اس نے شروع کی۔ جونہی کہ

''تا بہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید (میں اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں) رسید حالت شوق غلبہ کرد' سہ مرتبہ کلاہ از سر مبارک برقص آورد۔''

قاری طبع عالی کا مذاق شناس تھا' اب تک جو قریب سے آگے بڑھ کر اقرب کی شکل میں محسوس ہو رہا تھا' قاری نے جیسا کہ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

''باز حافظ آیت ھو الاول والاخرو الظاھر والباطن وھو بکل شئی علیم''

(وہی اول بھی ہے' وہی آخر بھی ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے' وہی ہر شے کا دانا و علیم ہے) پڑھنا شروع کیا' مولانا لکھتے ہیں کہ

> ''شیخ را طرفہ ذوقے و حالتے بہم رسانید چوں قرآن تمام کرد و آیت سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین خواند' حضرت شیخ ہر دو دست مبارک برروئے مشکبوے فرود آورد و بر سینہ فیض گنجینہ برد۔''

اہل مجلس کی نظر اسی پر تھی کہ اچانک انہیں محسوس ہوا کہ شیخ ''جان بجاناں تسلیم نمود۔'' (مآثر الکرام۔ صفحہ 57)

میں صرف نمونہ دکھا رہا ہوں' ہندوستانی مسلمانوں کا جو تعلق قرآن سے تھا' ہندی اسلام کی ابتدائی وسلطانی و آخری صدیوں سب ہی کے نمونے اور سب ہی کی شہادتیں آپ کے سامنے گزر رہی ہیں۔ استیعاب مقصود نہیں صرف ان چھوٹوں سے جو آج اپنے بڑوں سے اسی لیے روٹھے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان میں پہنچ کر انہوں نے خدا کے کلام سے رشتہ توڑ لیا' رسول کی حدیثوں کو اس ملک میں آ کر چھوڑ دیا' ان نو آگاہوں کی آگاہی کی ایک راہ کھولنی ہے ورنہ ان واقعات کی اس ملک میں کب کمی رہی ہے' واقعہ یہ ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی وفات ان کی قرآن پر نہیں بلکہ کسی

شعر پر ہوئی ہے' کسی نے

کشتگانِ خنجر تسلیم را　　　　ہر زماں زغیب جانے دیگرست

شہادت کے کشتوں میں شریک ہو کر غیب کے زندوں میں اپنے آپ کو شریک کیا۔ ''بجن المومن'' سے آزادی کسی کو ''خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی'' پر میسر آئی تو کیا واقع میں یہ سب شعر تھا' لوگ غور نہیں کرتے ورنہ جسے وہ شعر سمجھ رہے ہیں' قرآن میں پا سکتے ہیں اور کیا یہ کوئی ایک دو قصے ہیں' تعلیم کا وہ نظام ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جینے والوں میں مرنے کا صحیح سلیقہ پیدا ہو جائے۔ ساری تربیت کا حاصل اسی دن سامنے آتا تھا' جس دن اس دنیا سے وہ روپوش ہوتے تھے۔ (54)

میں نے کسی جگہ سید محب اللہ بلگرامی کا ذکر کیا ہے کہ عہد جوانی میں ''در شش ماہ قرآن یاد کرد' مولانا آزاد نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ''سرحال شعار خود ساخت۔'' سپاہیوں کے لباس میں رہتے تھے' عالمگیر کے صاحبزادے محمد اعظم کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے' شہزادہ کو اُجین مالوہ کی صوبہ داری سپرد ہوئی' فوج بھی ساتھ گئی' میر صاحب بھی اندر قرآن اور باہر میں ڈھال وتلوار لگائے شہزادے کی فوج کے ساتھ اُجین پہنچے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اجین کے قریب ایک مقام جس کا نام ''سرائے سیسی'' ہے' گھوڑے پر سوار جا رہے تھے۔ وہیں ''سرائے سیسی'' کے کسی باغ میں گھوڑے سے اترے' زین پوش بچھائی' خدام جو ساتھ تھے' ان کو بھی روک لیا۔ گٹھڑی سے نیا سفید لباس نکالا' پہنا' شربت بنایا' پیا اور ''بہ تلاوت قرآن مشغول گشت۔'' تلاوت ختم ہوئی۔ قرآن جزدان میں رکھا گیا اور خود ''چادر کشیدند۔'' چادر تنی کی تنی رہ گئی' لوگوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ

''جاں بحق سپردہ است'' رحمۃ اللہ علیہ (ماثر۔ صفحہ 128)

عالم نہیں' فاضل نہیں' پیر نہیں' فقیر نہیں' فوج کے ایک سپاہی کو دیکھ رہے ہو جو قرآن نے اپنا اثر اس پر قائم کیا تھا۔

قرآن کے ساتھ جن کے اگلوں کا بھی یہی رشتہ تھا' پچھلوں کا بھی یہی تعلق تھا جو درمیان میں تھے۔ ان پر بھی یہی کیفیت طاری تھی۔ خواص بھی اسی رنگ میں عوام بھی اسی حال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بھی کیا اپنے بزرگوں سے منہ پھلانا ان عزیزوں کا درست ہو سکتا ہے جن کے منہ خواہ جتنے بھی پھولے ہوئے ہوں لیکن ان میں شاید کسی ایک کا دل بھی قرآن کے لیے اتنا پھیلا ہوا نہ ہوگا جس انشراح اور وسعتوں کا نظارہ ہم ان بزرگوں کے قلوب میں کر رہے ہیں۔

فاذ نقر فی الناقور

''جب صور میں پھونکا جائے گا۔''

والی مشہور قرآنی آیت سے اثر پذیر ہو کر جامع ترمذی میں ہے کہ ایک تابعی خر مغشیا علیہ (چکرا کر نماز میں گر پڑے) اور اسی بے ہوشی میں وفات پا گئے۔ بلاشبہ یہ واقعہ بھی اہم تھا اور ہے۔ اسی لیے ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو جگہ دی لیکن پوری کتاب میں ایک واقعہ ہے لیکن قرآنی محذرات کی دلیریوں بلکہ جاں بر آریوں کے کرشموں کو دیکھ رہے ہو' ہندوستان میں ان کی کوئی کمی ہے' یاران عزیز!

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن

آخر حدیث میں بھی تو ہے

اذکروا موتاکم بالخیر

''اپنے موتی کا ذکر نیکی سے کیا کرو۔''

هذا والسلام علی من اتبع الهدی

اس سلسلہ میں سر دست جو کچھ کہنا چاہتا تھا' کہہ چکا۔ آخر میں ایک بات جس کا گذشتہ بالا واقعات میں مولانا آزاد نے تذکرہ کیا ہے' دل چاہتا ہے کہ تنبیہ کیے بغیر اسے نہ چھوڑا جائے' میرا اشارہ سید نور اللہ کے ترجمہ کے اس جز کی طرف ہے یعنی مولانا آزاد نے جو یہ لکھا ہے۔

''وقتے اورا در طے ایں را مشکلے پیش آمد بخدمت سید العارفین اظہار کرد' حضرت شغلہا فرمودند عقدہ وانہ شد آخر فرمودند بروقرآن مجید حفظ کن' چند جز از قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت' آمدہ بہ پائے حضرت افتاد باقی قرآن یاد کردن گرفت۔'' (صفحہ 120)

اس واقعہ کا بتفصیل ذکر ہو چکا ہے۔ اس وقت اس کے نقل کرنے سے میری غرض پھر اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ ''حفظ قرآن'' کو اس راہ کی مشکل کے حل کا ذریعہ کیا جوگیوں میں بتایا جاتا ہے۔ ہندوستان کا تصوف جوگیہ اور یگیہ سے ماخوذ ہے۔ اس دعوے کے مدعیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسی تصوف کا نام جوگیت اور بیراگیت ہے؟ یہ سید العارفین جنہوں نے اپنے مرید کو حفظ قرآن کا مشورہ دیا' ان کے طریقہ عمل کی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان کی ہے

''ریاضیات شاقہ کہ آدمی را مزمن سازد نمی فرمودند واگر در اربعین من نشانند اغذیہ لطیفہ می خواندمی فرمودند کہ قوام انسان غذا ہست اگر تندرست است جہاد از خوب می آید واگر ناتواں قصور واقع شود۔''

اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً ان کے مرید سید نور اللہ کے متعلق جو یہ بات گذری کہ گیارہ گیارہ روز تک کچھ نہیں کھاتے تھے' یہ ان کا خاص حال تھا۔ یہ خیال کرنا کہ خود مرشدوں کی طرف سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی' میرے نزدیک اکثریتہً یہ صحیح نہیں ہے اور کبھی کبھی اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس کی حیثیت کسی وقتی علاج کی تھی' اسی قسم کا وقتی علاج جیسے حضرت کعب بن مالک صحابی کا علاج بارگاہ نبوت سے وقتی طور پر کیا گیا تھا کہ عموماً صحابہ کو ان سے ملنے جلنے' بات چیت کی ممانعت کر دی گئی تھی حتیٰ کہ آخر میں ان کی اہلیہ کو بھی اسی کا حکم دیا گیا تھا جس کی تفصیل بخاری میں موجود ہے لیکن ظاہر ہے کہ چالیس پچاس دن کے لیے حضرت کعب کو یا ان کے ساتھ دو اور صحابیوں کو جو اس حال میں رکھا گیا تھا' ان کا تعلق ان کے خاص ذاتی خصوصیات سے تھا۔ اس کی حیثیت عام قانون کی نہ تھی' مولانا آزاد نے یہ بھی ان ہی سید العارفین کے متعلق لکھا ہے کہ

''از دلق پوشیدن، و مرقع دوختن و خود را در نظر خلق وانمودن، منع می کردند و از تاہل و کسب معاش (55) کہ سنت سنیہ انبیاءست باز نمی داشتند۔''

سید العارفین سے ان کے تصوف کا حاصل مولانا نے جو نقل کیا ہے، وہ صرف یہ ہے

''مرد آں ست کہ ظاہرش با معاملہ خلق متفق باشد، و باطنش دریاد مولیٰ مستغرق۔'' (صفحہ 111)

آپ اگر دیکھیں گے تو عام اسلامی صوفیا کا آپ کو یہی مسلک نظر آئے گا، البتہ ان میں جو حضرات ملی اور دینی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پابند بنا لیتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ کسب معیشت کا ان کو موقع کہاں سے مل سکتا تھا، خود سرور کائناتؐ نے بھی تو منصب نبوت و دعوت پر سرفراز ہونے کے بعد کوئی معاشی پیشہ اختیار نہیں فرمایا تھا، لوگ باوجودیکہ عموماً ان باتوں سے واقف ہیں مگر پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہندوستانی جوگیت اور ہمارے بزرگوں کے طریقہ کار میں لوگوں کو کیا مشابہت نظر آئی جو یورپ کے اس افتراء کے تسلیم کرنے پر مضطر ہو گئے۔ یورپ تو تصوف ہی نہیں، ہمارے سارے علوم بلکہ خود ہمارے دین ہی کو بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل کی تعلیم سے ماخوذ قرار دیتا ہے، پھر ایک بیچارے صوفیا نے کیا قصور کیا تھا کہ اسلامی صفوں سے ان ہی کو باہر نکال کر سرقہ وانتحال کے الزام میں ان ہی کو گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اس الزام سے اسلام کا کونسا شعبہ محفوظ ہے۔ ہندو فقیروں، جوگیوں، بیراگیوں کا طرزِ عمل کوئی ایسا پوشیدہ راز بھی تو نہ تھا کہ اسلامی صوفیہ کے طریقہ کار اور اس کا موازنہ اور مقابلہ ناممکن تھا۔ ابوالفضل طباطبائی سبھوں نے تحقیق کے ساتھ ''ہندی تصوف'' کی کیفیت لکھی ہے۔ کم از کم لوگ اسی میں پڑھ لیتے ہیں، طباطبائی کی کتاب ''سیر المتاخرین'' سے نقل کرتا ہوں کہ اس کے الفاظ ذرا مانوس ہیں۔ یہ بتا کر کہ ہندو درویشوں کی چند قسمیں ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

''نخستیں (اول قسم) صنف سناسیاں ازاں خاک نشیناں جمعے مہر خاموشی برلب نہادہ حرف زدن ندارند''

یہی لوگ مُنی ہوتے ہیں، یہ صوم صمت پر گویا عامل ہیں، جس کی آنحضرتؐ نے ممانعت فرما دی ہے۔ اگرچہ حضرت مریم کے قصہ میں قرآن نے اس روزہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''فریقے ہر دو دست را مائل بآسمان گذارند و بعضے خود را معکوس در درخت آویختہ تکمید تن خویشتن بآتش می نمائند و چندے نظر بسوئے آسماں برداشتہ نظر بر آفتاب دوختہ دارند و برخے بہ پا ایستادہ شب و روزی گذارند۔''

آپ ہی بتائیے کہ جو پانچوں وقت کی نماز اور وہ بھی باجماعت جس کے لیے پڑھنا ضروری ہو، کیا وہ اسلامی صوفی ان عجیب و غریب مشاغل کو مذہباً اختیار کر سکتا ہے۔ میری گفتگو کا تعلق ان بازاری بھنگڑوں سے نہیں ہے، جنہوں نے بے دینی کا نام دین اور مذہبیت کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے بلکہ اکابر وائمہ صوفیا سے بحث ہے۔ خصوصاً خواجگانِ چشت کے سربرآوردہ بزرگوں سے کہ ان ہی کی طرف ہندوستان کی خصوصیت کی وجہ سے اس قسم کے خرافات کا انتساب اس زمانہ میں ذرا زیادہ جسارت سے کیا جا رہا ہے۔ ان پر سب سے بڑا الزام سماع کا لگایا جاتا ہے لیکن اس کی جو اصل حقیقت بزرگوں

میں تھی' اسے آپ سن چکے اور سماع کے متعلق تو میرا خیال ہے کہ جس خاص طریقہ سے بعض صوفیوں میں یہ مروج تھا' اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں بمشکل مل سکتی ہے۔ بلاشبہ گانے بجانے اچھلنے کودنے کا رواج بعض غیر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ہمارے بزرگوں کی سماع کی مجلسوں کا جو وقار تھا اور جن خاص خصوصیتوں کے ساتھ اکابر سماع سنتے تھے' میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں اس قسم کی مجلسوں کا رواج ہو۔ اب اگر کہیں مروج ہوا بھی ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسلامی صوفیہ ہی سے یہ طریقہ ماخوذ ہے ورنہ کہاں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے سامنے اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر بھجن خوانی اور کہاں پاکوں کے یہ روحانی مجالس' کاش جن لوگوں کو ریسرچ کا شوق ہے' وہ اسی مضمون پر ریسرچ کرتے۔ میرے لیے تو اتنا وقت نہیں ہے کہ اس پر کوئی مفصل مضمون لکھ سکوں' اس لیے ان چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

خیال تو کیجیے کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی جادوگروں اور ساحروں کی نفسانی قوتوں سے جو متاثر ہو جاتے ہیں اور اس کے ازالہ میں وہ اسی طرح عاملوں وغیرہ کے محتاج ہوں جیسے مادی امراض میں طبی تدبیروں کے' کیا ان ہی کے متعلق یہ قابل تصور بات ہو سکتی ہے' وہ بھی کچھ اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے اپنے اندر تصرف وغیرہ کی قوت پیدا کرتے تھے۔ ''فوائد الفواد'' میں حسن علاء سجزی نے براہ راست حضرت سلطان المشائخ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے' یہ لکھنے کے بعد کہ

''بندہ ایں خبر ناخوش آنحضرت ہم در لشکر شنیدہ بود کہ کسے سحر کردہ بود ایں معنی عرضداشت کردہ شد کہ چہ گونہ بود۔''

جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا' میرنے اسے بجنسہ نقل کیا ہے یعنی

''فرمودند کہ آرے مدت دو ماہ زحمت (بیماری) دیدم زحمتے عظیم شد تا مردے را بیاوردند کہ او در بیروں آوردن علامات سحر مہارتے داشت' القصہ آں مرد بیامد پیش خانہ وحوالی آں می گشت وہر بار قدرے گل (مٹی) از زمین برمی داشت وبوئے می کرد دریں میاں گلے را بوے کرد وگفت ایں جا بکاوید (کھودو) بکافتند (لوگوں نے کھودا) علامات سحر پیدا شد' آں گاہ اندک مایہ خفتے پیدا شد' دریں میاں آں مردم گفت من آں قدر مہارت می دارم کہ اگر بگویند ان کس را کہ سحر کردہ است نام آں ہم بگویم خبر بمن رسانیدند' گفتم زنہار او را منع کنید تا نگوید ہر کہ کرد من از او عفو کردم۔''

(فوائد الفواد۔ صفحہ 178)

سوچنے کی بات ہے کہ سحر اور جادو اور اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے جو ایک عام آدمی کے طریقے سے متاثر ہوتے ہوں اور رد عمل کرنے والے کی دفع سحر کے لیے ان کو بھی ایسی ہی ضرورت ہو' جیسے ایک عامی آدمی کو ہو سکتی ہے۔

کیا ان کے متعلق جوگیانہ مشقوں کا شبہ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ سلطان المشائخ ہی کے متعلق سحر کا یہ قصہ نہیں ہے۔

اسی کے بعد امیر حسن علاء نے لکھا ہے کہ

''دریں میاں عرضداشت کرد شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز را نیز سحر کردہ بودند'

فرمود آرے' آں سحر بروں آمد (یعنی ازالہ کیا گیا) وطائفہ راکہ ایں حرکت بود دریافتند۔''

آگے طویل قصہ ہے کہ اجودھن کے والی نے ان ساحروں کو گرفتار کر کے حضرت شیخ کبیر شکر گنج ؒ کے پاس بھیجا۔ آپ نے سب کو بخش دیا اور حاکم سے سفارش کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ واللہ اعلم۔ والی اجودھن نے بخشا بھی یا نہیں کیونکہ اسلامی قانون میں تو ساحر واجب القتل ہے۔

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ بھی ہے کہ خود سرور کائنات ﷺ کے متعلق بھی بعض صحیح روایتوں میں جو آتا ہے کہ آپ پر سحر کیا گیا تھا' لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسپر یچولزم' مسمریزم وغیرہ ساحرانہ اعمال کا جو شبہ خواہ مخواہ دلوں میں ایسی ہستیوں کے متعلق ہوتا ہے' جن کی ساری کرامت یا سارا معجزہ تعلق باللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے واقعات سے اسی شبہ کی تردید قدرت کی طرف سے ہوتی ہے۔

پلٹ پلٹ کر اس خاص مسئلہ میں میری واپسی ممکن ہے کہ بعضوں کو گراں بھی گزر رہی ہو لیکن دلوں کی ویرانی کا جو عام حال ہے' اس نے میرے اندر جو زخم پیدا کیے ہیں' کیا کروں۔ رہ رہ کر ان ہی میں ٹیس اٹھتی ہے۔ خصوصاً ان مخلص نوجوانوں پر افسوس ہوتا ہے' جو ہوائے دل کی بساط کے تازہ وارد ہیں' دماغی تنور ہی کو کافی سمجھ کر ان میں اکثر اخلاص کے ساتھ عمل کے میدان میں اتر پڑے ہیں لیکن ہلکی سی آزمائش معمولی سا ابتلاء ان کے قدم میں لغزش پیدا کر دیتا ہے اور یہ اس خامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو غیر تربیت یافتہ قلوب میں بہرحال باقی رہ جاتی ہے' خواہ دماغوں کو کتنا ہی روشن کیا گیا ہو' آخر جس کی بینائی قوی ہے' کیا ضرور ہے کہ شنوائی بھی اس کی ضعیف نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سارا اخلاص معمولی ٹھیس کی برداشت کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اچانک نفسانیت' تعصب' بے انصافی کے زہر سے سینے معمور ہو جاتے ہیں' چاہتا ہوں کہ قلبی تربیت کی جو حقیقی موروثی راہ ہے' جن سے حریفوں نے بے بنیاد باتوں کے ذریعہ سے انہیں بدکا دیا ہو' اس کی متعلقہ غلط فہمیاں دور ہوں' ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی خیر کے ساتھ موفق ہو۔

ان ارید الا الا صلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

''نہیں چاہتا ہوں لیکن صرف سلجھاؤ' جہاں تک میرے بس میں ہے (صداقت) کی توفیق اور اس کے ساتھ میل اللہ ہی کے حکم سے ہوسکتا ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف جھکتا ہوں۔''

میں تو چند اوراق میں ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تھا لیکن بے اختیار مضمون نے مقالہ کی اور مقالہ نے اب تک تو شاید ایک مستقل کتاب ہی کی شکل اختیار کر لی۔ بات میں بات نکلتی چلی آئی' قلم کو میں نے بھی نہیں روکا۔ واللہ اعلم حق تعالیٰ کی کیا غرض ہے۔

اشرار ید بمن فی الارض ام اراد بھم ربھم خیرا

''زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ (میرے ان ہفوات کے اظہار سے) کیا گیا ہے یا ان کے رب نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔''

بہرحال جب طوالت کا مجرم ہو ہی چکا ہوں تو اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کیوں تشنہ چھوڑ دی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تصوف وصوفیا کے متعلق جہاں ایک طرف جوگیت اور بیراگیت کے اتہام کو اچھالا گیا ہے' اسی سلسلہ میں بعضوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ تصوف کا رشتہ تشیع سے ملاتے ہیں۔ منشاء صرف اتنا ہے کہ عموماً صوفیہ کرام کا رجحان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف بظاہر زیادہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہی ہو یا نہ ہو لیکن بات مشہور کر دی گئی' سوچنے اور غور کرنے سے پہلے چیزوں کو چلتا کر دینے کی عادت جن لوگوں میں ہوتی ہے' وہ اسے لے اڑے۔ پھیلا دیا گیا کہ صوفی ایک قسم کے شیعہ ہیں بلکہ بعض لوگ تو شیعیت کی ذمہ داری صوفیوں ہی کے سر تھوپتے ہیں۔

اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ساتھ حضرات صوفیا کے جس رجحان طبع کو مشہور کیا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے یا اہل بیت نبوت سے کیا واقعی صوفیوں کا تعلق جادۂ اعتدال اور ایمان واسلام کے حقیقی اقتضاؤں سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے لیے تو بجائے میرے زیادہ مناسب ہوگا کہ خود ان حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ غزالی' ابن عربی' سلاسل صوفیہ کے آئمہ حضرت سیدنا الشیخ جیلی' سیدنا شہاب الدین سہروردی' سیدنا بہاء الدین نقشبند عارفِ روم اور ہندوستان [56] کے مشائخ چشت' اکابر مجددیہ وغیرہم کے اقوال' ملفوظات' مکتوبات وتالیفات پڑھیے۔ آپ پر خود حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ان میں اکثر بزرگوں کی خود لکھی مستند کتابیں موجود ہیں اور جن کی کتابیں نہیں ہیں' ان کے ملفوظات یا مکتوبات پائے جاتے ہیں۔

بہرکیف اس وقت جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس مسئلہ پر اس حیثیت سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کے سامنے میں ایک نئی چیز پیش کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کرام کی طرف تشیع کا انتساب صحیح ہو یا نہ ہو لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود شیعوں کا حضرات صوفیہ کرام کے متعلق کیا خیال ہے۔ حضرت غوثِ پاک یا مجدد الف ثانی کے متعلق تشیع کے حلقہ میں جو ناگفتہ باتیں کہی جاتی ہیں' اس کی تو شاید یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگوں سے نفرت شیعوں کو شخصی حیثیت سے ہے مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ اشخاص وافراد نہیں پورے طبقہ صوفیوں کے متعلق ارباب امامیہ کے کیا خیالات ہیں۔ ''نجوم السماء'' شیعہ علماء کی تاریخ ہے۔ اس کے مصنف مولوی مرزا محمد علی ہیں جن کے نام کے آگے دو سطروں کے طویل القاب لکھے ہوئے ہیں یعنی شیعوں کے کوئی مستند عالم ہیں۔ انہوں نے مذہب امامیہ کے ایک عالم شیخ حر عاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

''شیخ حر عاملی در رسالہ اثناء عشریہ فی رد صوفیہ آوردہ کہ جمیع شیعہ انکار بر صوفیہ داشتہ اند وتکفیر ایشاں نمودہ اند ودر روایات مذہب ایشاں از ائمہ معصومین علیہم السلام نقل کردہ اند'' (نجوم السماء۔ صفحہ 32)

سنا آپ نے جن بیچاروں پر تشیع کا الزام لگایا جا رہا ہے' ان پر ایک دو طرف سے نہیں بلکہ جمیع شیعہ کی طرف سے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ بعض شیعی علماء مثلاً نور [57] اللہ شوستری یا بہاء الدین عاملی کی کتابوں میں بعض اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابن عربی وغیرہ کی تعریف پائی گئی ہے۔ مصنف کتاب نے سب کو تقیہ پر محمول کیا ہے۔ بہاء الدین عاملی کے متعلق تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ تقیہ کے طور پر انہوں نے جو کچھ کہا ہو' لیکن اصل اعتقاد صوفیوں کے متعلق ان کا جو تھا' اس کا اندازہ

ان کے اس طرزِ عمل سے ہوسکتا ہے کہ

''ہرگاہ در مجلس شیخ بعضے ازاں فرقہ حاضر شدے بعد از بیروں رفتن او جناب شیخ بہ تطہیر فرش امرمی فرمود۔'' (صفحہ 33)

یعنی فرقہ صوفیا کا کوئی آدمی اگر ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوتا تو اس کے باہر نکلنے کے بعد ملا نور اللہ اس فرش کے دھونے کا حکم دیتے تھے جس پر غریب صوفی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح اہل سنت والجماعت میں ایک گروہ اہل حدیث کا پیدا ہوگیا ہے' جو صوفیا سے بدگمان ہے' اسی طرح شیعوں میں بھی ''اخباریوں'' کا ایک طبقہ جو حال ہی میں ظاہر ہوا ہے اور وہ بھی ''اجتہاد و قیاس'' کا دشمن ہے۔ شاید صوفیا سے یہ ناراضی اخباری جماعت کی کوئی خصوصیت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مصنف کتاب نے یہ بتاتے ہوئے کہ امامیوں میں اخباری جماعت کی ابتداء ملا محمد امین ابن محمد شریف استر آبادی سے ہوئی جیسا کہ اسی کتاب میں ہے:۔

''اوست (یعنی ملا امین) اول کسے کہ دروازہ طعن بر مجتہدین کشاد و فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ را بدو قسم منقسم گردانید[58] یکے اخباری و دیگر مجتہد۔'' (صفحہ 41)

بہرحال مصنف کتاب نے اس تفریق کی یہ تاریخ بتا کر لکھا ہے کہ ملا امین نے

''در کتاب خود فوائد مدینہ طعن و تشنیع بسیار در حق مجتہدین نمود بلکہ گاہے ایشاں را بسوئے تخریب دین نسبت کردہ است۔''

مصنف کی اس باب میں جو رائے ہے' اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''لیکن (ملا امین) سخن نیک نگفتہ است و کلام خوب نہ کردہ و بموافقت صواب و سداد نرسید زیرا کہ فسادے عظیم بریں مرتب شدہ است۔'' (صفحہ 42)

مندرجہ بالا قول جیسا کہ ظاہر ہے اس کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ مصنف کتاب کا تعلق اخباریوں (یا شیعہ بابیوں)[59] سے نہیں ہے بلکہ وہی پرانے خیال کے مجتہدیہ یا گروہ مقلدہ سے تعلق ہے ورنہ اگر اخباریوں سے ان کا تعلق ہوتا تو اپنے پیشوا ملا امین کی شان میں وہ یہ الفاظ لکھ سکتے تھے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی ہے اور سیدھی راہ پر نہیں چلے ہیں۔ ان کی وجہ سے بڑا بھاری فساد پیدا ہوا۔

میری غرض اس تفصیل سے یہ تھی کہ صوفیا کرام سے ناراضی اور اتنی سخت ناراضی کہ صوفی جس فرش پر بیٹھ جاتا تھا' اس فرش کو دھلوالیا جاتا تھا جن شیعوں میں صوفیا اور تصوف کے متعلق یہ خیال ہو' کیا تماشے کی بات ہے کہ ان ہی صوفیوں پر شیعہ ہونے کی تہمت جوڑی جاتی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں کا تشیع کی طرف میلان بھی ہوتا تو کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ شیعوں کی طرف سے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا اور ائمہ کی طرف سے ان کی مذمت میں روایتیں پیش کی جاتیں۔

اس وقت صوفیا کے باب میں انتساب تشیع کے متعلق مجھے صرف اتنی بات کہنی تھی' لوگوں کی معکوس فہمیوں کا ماتم کس سے کیجیے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ میں واقعات کی روشنی میں بتاتا کہ شیعہ تحریک کا

جتنی سختی سے مگر بطرز حکیمانہ کارگر و مؤثر مقابلہ حضرات صوفیا نے کیا ہے' علماء ظاہر سے وہ بات بن بھی نہیں پڑی ہے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت (60) جو اہل سنت کی شکل میں بحمد اللہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ سنیت کے مسلک پر کم از کم عامہ مسلمین کو قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ حضرات صوفیہ ہی نے لیا ہے۔ اہل بیت اطہار کے ساتھ ان کا ایک خاص ربط باوجود شدید تسنن کے اس کامیابی کی بہت کچھ ذمہ دار ہے ورنہ مولویوں کے مناظرانہ مباحث کتابوں میں جس شکل میں پائے جاتے ہیں' ان کے پڑھنے والوں کے اندر کسی ایک طرف غلو اگر پیدا کر دے تو کچھ تعجب نہیں۔

بہر حال ''تعلیم'' اور ''تربیت'' دونوں کا جو نظام اس ملک میں قائم تھا' قریب قریب تمام اسلامی ممالک نہیں تو اسلام کے مشرقی علاقے یعنی خراسان' ترکستان' ایران' ہندوستان وغیرہ میں صوفیوں سے اسی اصول پر تعلیم بھی ہو رہی تھی اور تربیت بھی اور یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک بجائے مشرق کے مغرب سے ایک عجیب تعلیم اور غریب تربیت کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد تو خیر قیامت ہی برپا ہوگئی۔ ہند میں بھی' مصر میں بھی' ترکی میں بھی' ایران میں بھی حتیٰ کہ اب تو اس کی شعاعیں عرب کو بھی گرما رہی ہیں اور اسلام غریب اسلام کا آخری کوہستانی حصار یا پناہ گاہ افغانستان بھی اسی کی روشنی نما تاریکی میں بتدریج گھرتا چلا جا رہا ہے۔ **ولعل الله يحدث بعد ذلك امرا**

حواشی

(1) خدا کے تم محبوب ہو جاؤ گے' اگر تم اپنے اندر میرا رنگ ڈھنگ' میری شان و ادا پیدا کرو گے۔ حضرت حق سے محبوبیت ذاتی کا جسے تعلق ہے' اسی کی زبان مبارک سے قرآن میں یہ اعلان کرایا ہے: **قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله** کی آیت سے کون واقف نہیں۔

(2) ایک صحیح حدیث جو عام طور سے مشہور ہے' یہ اسی کا حاصل ہے۔

(3) سلطان المشائخ ہی کی روایت ہے کہ جس زمانہ میں بلبن سلطان ناصر الدین محمود کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو ملتان جاتے ہوئے اجودھن بھی حاضر ہوا۔ ساری اسلامی فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا تھا۔ ہر ایک شیخ کبیر سے تبرک حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کوٹھے سے ایک آستین شیخ کی لٹکا دی گئی اور فوج کے لوگ اسی کو بوسہ دے کر آگے بڑھتے جاتے تھے تا اینکہ ''آں ہم پارہ پارہ شد'' والقصہ بطولہا۔ آخر میں بلبن نے خدمت مبارک میں نقد اور چار گاؤں کا فرمان پیش کیا۔ گاؤں کے فرمان کو تو واپس کر دیا گیا اور نقد فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے قبول فرما لیا گیا۔ میں نصیحت کا طلبگار ہوا' دو شعر سنا دیئے گئے ؎

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود ۔۔۔ زعود و زعنبر سرشتہ نہ بود

زداد و دہش یافت آں نیکوئی ۔۔۔ تو داد و دہش کن فریدوں توئی

(4) غلو کی ایک اچھی مثال مولانا غلام علی نے نقل کی ہے۔ حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید مولانا شمس الدین فضل اللہ نامی تھے۔ ایک دن جوش میں آ کر شیخ سے عرض کرنے لگے ''ایں بیچارہ می خواہد کہ ترک فضل دارد می کند۔'' شیخ نے پوچھا کیوں تو بولے کہ قرآن میں ہے **من عمل صالحاً فلنفسه** جو عمل نیک کرتا ہے' اپنے نفس کے لیے کرتا ہے' بولے کہ ''من برائے نفس گندہ خود عمل نخواہم کرد۔'' (صفحہ 12) ظاہر ہے کہ اسی کا نام غلو ہے۔ شیخ مسکرائے اور فرمایا ''فرمان چنیں ست باید کرد'' اور جب فرمان کے مطابق ہوا تو

نفس کے لیے کب رہا۔

(5) اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ برہم چاریوں کی زندگی آپ نے اختیار فرمائی تھی' آپ بیوی بھی رکھتے تھے' بال بچے بھی ہوئے' نسل آپ کی مدتوں باقی رہی۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی ہو' آپ کی بیوی صاحبہ کا ایک دلچسپ لطیفہ تاریخوں میں نقل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ناگور کے مقطع (صوبہ دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ اس کی امداد قبول کریں لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ غالباً نصیر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے۔ دلی سے پانصد تنکہ نقرہ و فرمان یک دیہ صوبہ دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبے دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے' صوبہ دار نے حال سنایا' کچھ نہ بولے' اندر زنانہ میں تشریف لے گئے۔ بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی اور شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے۔ مگر سنتے ہو اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سنئے ہو' شیخ سن رہے تھے ''اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسماں بدست خود رشتہ ام ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا فوطہ (لنگی) و مرادامنے (اوڑھنی) مرتب خواہشد''۔ (سیر۔ صفحہ 157) ظاہر ہے کہ جس کی بیوی کا یہ حال ہو اس کا شوہر سلطان التارکین اگر ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔

(6) میر خورد نے انتخاب کے طریقہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مطالعہ کی کتابوں میں نشان لگانے کا اس زمانہ میں کیا طریقہ تھا۔ اس کا پتہ چلتا ہے ''سلطان المشائخ بقلم مبارک خود بعلامت ''ح'' در حاشیہ اختیار کردے۔ ''ح'' سے شاید ترجیح مراد ہو یا جحت کا مخفف ہو۔ واللہ اعلم۔ ایک اور دلچسپ بات میر خورد نے یہ لکھی ہے کہ شیخ حمید الدین اور شیخ زکریا بہاء الدین میں خط و کتابت جو ہوتی تھی' اس میں ذریعہ یہ تھا کہ ''سوداگرے بود در ناگور کہ کنجد (تل) از ناگور در ملتان بردے واز ملتان پنبہ (روئی) در ناگور آوردے۔'' یہی سوداگر دونوں کے درمیان ڈاکیہ کا کام انجام دیتا تھا' معلوم ہوتا ہے کہ ماڑواڑ ناگور وغیرہ میں روغنی دانے اور ملتان میں کپاس کی کاشت اس زمانہ میں ہوتی تھی۔ کیا تعجب ہے کہ شیخ ناگوری بھی تل ہی کی کاشت کرتے ہوں کہ تھوڑی زمین سے نفع اٹھانے والے زیادہ تر اسی قسم کی قیمتی کاشت اختیار کرتے تھے۔

(7) ابوالفضل نے مانڈو کی اسی توجیہہ اور جنگل میں اس شہر کو بسا کر جس راجہ نے منگل منایا تھا' یہ خرافی قصہ نقل کیا ہے کہ کسی کسان کی درانتی سنگ پارس جو اس علاقہ میں ''کار آ گہاں ہندی نژاد'' کے خیال کے مطابق پایا جاتا ہے' اس سے چھوگئی۔ بجائے سیاہی کے رنگ اس کا پیلا پڑ گیا۔ کسان غریب بیچارہ پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت آئی۔ مقامی لوہار کے پاس اصلاح کے لیے گیا۔ لوہار نے پہچان لیا کہ یہ تو سونا ہوگئی ہے' واقعہ پوچھا کسان نے اس پتھر کا پتہ دیا جس کا یہ کرشمہ تھا۔ لوہار نے اس پتھر کو اٹھالیا' کچھ دن خود نفع اٹھایا اور آخر میں اس عہد کے راجہ بکرماجیت سنگ دیو کی خدمت میں اس پتھر کو اس نے نذر گذران دیا۔ تمنا صرف یہ ظاہر کی کہ میرے نام سے ایک قلعہ بنا دیا جائے۔ لوہار کا نام 'مانڈن' تھا۔ اسی کے نام پر راجہ نے بارہ میل کے دور میں قلعہ بنوایا۔ پتھر جو قلعہ میں لگائے گئے ہیں لوہار کی مناسبت سے سندان (نہالی) کی شکل کے ہیں۔ جب مالوہ کی مستقل حکومت کا مانڈو دارالسلطنت قرار پایا تو اس کا نام شادی آباد رکھ دیا گیا لیکن چلا نہیں۔ مسلمانوں نے اپنے عہد میں اس قلعہ کی عمارتوں میں بہت کچھ ردوبدل کیا بلکہ گویا نیا قلعہ تعمیر کیا۔ ایک ہشت منظری مینار درمیان قلعہ میں تھا جس سے دور دور کے مقامات نظر آتے تھے۔ شاہ ہوشنگ کی قبر پر جو گنبد ہے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں اس سے پانی جھڑتا رہتا ہے۔ لوگ اس کو ہوشنگ کی کرامت خیال کرتے ہیں۔ ''ژرف نگاہ داند کہ حال چیست'' واللہ اعلم۔ ژرف نگاہ نے کیا تحقیق کی ہے۔ تقریباً ایک سو ستر سال تک مالوہ میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم رہی۔ اکبر کے زمانہ میں دلی سے الحاق ہو گیا۔

(8) اجمیر شریف میں اب بھی عہد خواجہ کا جو تبرک دکھایا جاتا ہے' واللہ اعلم تاریخی سند اس کی کیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے جو خواجہ بزرگ کی تلاوت میں رہتا تھا' اگر صحیح ہے تو پیر و مرید دونوں کے ذوق کا ثبوت ملتا ہے کہ۔

بعد مرنے کے مرے گھر سے تو قرآں نکلا

(9) اشارہ قرآن کے ان چند امتیازی صفات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن ہی میں کیا گیا ہے۔ سورۂ مزمل میں اس کو ''قول ثقیل'' (وزنی

بات) سورۂ حشر کی مشہور قرأت والی آیتوں میں ہے کہ اگر اس قرآن کو پہاڑ پر ہم اتارتے تو تم دیکھتے کہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ جھک گئے اور پاش پاش ہو گئے۔

(10) کہتے ہیں کہ پتھورا اجمیر کے راجہ نے "مسلمانے از پیوستگان خواجہ قدس سرہ را بہ سببے از اسباب رنجانید۔" (اخبار) اسی ایک مسلمان کے ستانے کی علت میں راجہ پتھورا کو یہ سزا ملی کہ خواجہ بزرگ کی زبان مبارک سے مشہور فقرہ نکل گیا "پتھورا زندہ گرفتیم و دادیم۔" شیخ محدث نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں شہاب الدین غوری کے مقابلہ میں پتھورا کو شکست ہوئی "و بدست معز الدین سام اسیر گشت۔" غور کرنے کی بات ہے کہ اس گبر عظیم رانا سانگا نے اجمیر کو لوٹا اور وہاں کے مسلمانوں کو شہید کیا۔ اگر اسی کی سزا میں بجائے شہاب الدین کے اندرجان (پایہ تخت بابر در مراغہ) سے بابر ہندوستان آیا اور ابراہیم لودھی جو لاکھوں لاکھ فوج کے باوجود مسلمانانِ اجمیر کی شہادت کا تماشا چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کو بھی اور خود رانا سانگا کو بھی اپنے کیے کی سزا ملی تو عقلاً کیا یہ مستبعد ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ظہیر الدین بابر جس شان کے ساتھ رانا سانگا سے لڑا ہے وہ خود تاریخ کا ایک عجوبہ طراز واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بابر کے پاس یونہی کل دس بارہ ہزار فوج تھی۔ ہندوستان کی گرمی اس فوج کے لیے ناقابل برداشت بنی ہوئی تھی۔ رانا سانگا کی ٹڈی دل فوج جو ایک لاکھ سے متجاوز تھی اس کو دیکھ کر افواج بابری کی ہمت چھوٹ گئی اور مقابلہ سے ہچکچانے لگی۔ بابر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ شاہی خیمہ جس میں پینے پلانے کا سامان رکھا ہوا تھا پہلے تو اس نے ایک ایک گلاس اور قرابہ شراب کو توڑ پھوڑ کر برابر کیا غسل کیا نماز پڑھی سجدہ میں گر گیا۔ گڑگڑانے لگا۔ "حکومت کے خیال کو سر سے نکالتا ہوں خالص جہاد کی نیت کرتا ہوں۔" دل کو قرار آیا۔ باہر نکل کر اس نے اعلان عام کر دیا اب جنگ نہیں جہاد ہوگا۔ جو رہنا چاہے رہے جسے جانا ہو چلا جائے۔ بہت سے فوجی جو کرایہ پر آئے تھے چلے گئے۔ بمشکل پانچ چھ ہزار فوج رہ گئی۔ انہی کے ساتھ تکبیر کے نعروں میں رانا سانگا کی فوج پر حملہ ہوا۔ کچھ ایسی صورت پیش آئی کہ رانا کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رانا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور تقدیر نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت صدیوں کے لیے بابر کی اولاد میں رہے گی۔ نواب علامہ صدر یار جنگ کی کتاب "ظہیر الدین بابر" میں تفصیلات پڑھیے۔

(11) مشہور حدیث فان منزلک عند اخر ایۃ تقرء (آدمی قرآن کی جس آیت کو پڑھتے ہوئے مرتا ہے اس کو مقام ہوتا ہے) جو ابوداؤد و ترمذی کی روایت ہے اور ترمذی نے "حسن صحیح" سے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ اگر اس حدیث کے اول و آخر کے الفاظ پر غور کیا جائے تو جو مفہوم شیخ کبیر کی بیان کردہ روایت کا ہے اس کی نتیجتاً اس سے تصدیق ہوتی ہے۔

(12) بخاری میں ہے کہ بعض صحابہ یعنی سید بن حضیر کو عالم حس میں بھی ان قرآنی انوار کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ سے جب انہوں نے قصہ بیان کیا کہ میں قرآن پڑھ رہا تھا کہ گھوڑی میری بھڑکی آسمان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک "ظلہ" روشنی سے جگمگاتا ہوا آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ قرآن کے انوار تھے۔

(13) اور جن لوگوں نے قرآنی آیات ہی سے تفصیلات کے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کی بوجھ بجھکڑی تفسیروں کا مطالعہ ان کے جنون کی کافی دلیل ہے۔ چکڑالویوں کی تفسیر پڑھیے زعفران زار کشمیر کی سیر سے آپ کو مستغنی کر دے گی۔

(14) مدت ہوئی دلی میں کسی صاحب کے پاس سلطان التارکین ناگوری کی بعض چیزیں نظر سے گزری تھیں۔ ایک قرآنی لطیفہ کا خیال بھی آ گیا۔ خواجہ بزرگ اجمیری نے ان کو خطاب کر کے کہا کہ جب تک میں متاہل نہ تھا بال بچے نہیں ہوئے تھے۔ یہ حالت تھی کہ دل میں کسی بات کا خیال آیا اور حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ پوری فرما دیتے تھے لیکن بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد اب یہ حالت نہیں رہی ہے۔ دعا قبول تو ہوتی ہے لیکن تاخیر کے ساتھ۔ سلطان التارکین نے عرض کیا کہ مریم علیہا الصلوٰۃ کے متعلق بھی قرآن میں ہے کہ جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں پیدا ہوئے تھے "من عند اللہ رزق ان کے پاس آ جاتا تھا لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں تو اسی رزق کے لیے ان کو وھزی الیک بجذع النخلۃ (ہلا اپنی طرف کھجور کے درخت کو) کا حکم دیا گیا یعنی اب خواہ جیسے کچھ ہوں ان کی وہ محتاج ہو گئیں۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کا طریقہ تدبر فی القرآن کا کیا تھا۔

(15) میں نے بھی مختلف مقامات پر شیخ کبیر اور سلطان المشائخ دونوں حضرات کی طرف خانقاہ کا انتساب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشائخ چشت کی منجملہ اور خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اصطلاحی صوفیوں والی خانقاہ کا نظام ان کے یہاں نہ تھا۔ ''فوائد الفواد'' میں شیخ کبیر کا قول سلطان جی نے نقل کیا ہے ''پیراں ما رارسم خانقاہ نبود'' اس لیے جہاں جہاں میں نے خانقاہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے باضابطہ خانقاہ نہ سمجھا جائے۔ ٹھیک جیسے اس چشتی ملک ہندوستان میں باضابطہ مدارس کم تھے۔

(16) واللہ اعلم یہ ''راوت'' کا لفظ کیا ہے۔ اعظم گڑھ بہار میں ''روتاڑا'' شیوخ کا ایک بڑا قبیلہ آباد ہے۔ کیا یہ ''تاڑا'' اسی ''راوت'' سے بنایا گیا ہے۔ تاڑ تو ہندی میں غالباً خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں۔

(17) ان تفصیلات کا تذکرہ میں نے ایک اور مقصد سے بھی کیا ہے۔ اس زمانہ (یعنی ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی) میں دتی اور دتی کی زندگی طریقہ بود وباش وتعمیر وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سہ منزلہ مکانات بھی بن گئے تھے۔ چھپر کی مسجد بھی ہوتی تھی۔ مسلمان بھی بقالی میوہ فروشی گلاب فروشی وغیرہ کے پیشے اس زمانہ میں کرتے تھے وغیرہ وغیرہ

(18) ''فوائد الفواد'' میں ہے کہ سلطان جی کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ اودھ میں ایک صاحب نے مجھے کتاب دکھائی اور کہا کہ حضرت والا کی لکھی ہوئی ہے۔ فرمایا ''من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام۔'' عجب شان ہے نہ کتاب ہے نہ خانقاہ لیکن کام کتاب والوں اور خانقاہ والوں سے بھی زیادہ کیا گیا۔

(19) شاہ عبدالعزیزؒ کے حوالہ سے کسی جگہ میں نے جیتل کا ترجمہ دمڑی کیا ہے اور دمڑی پیسہ کی چوتھائی کو کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کرنا چاہیے کہ اس وقت کی چیزوں کا بھاؤ کیا تھا۔

(20) عہد اسلامی میں ہندوستان نے کن ارزانیوں کا لطف اٹھایا ہے میرے خیال میں اس سے بہتر شہادت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ شہادت ادا کرنے والے سلطان المشائخ ہیں اور جس کتاب سے شہادت نقل کی گئی اس کے مصنف سلطان المشائخ کے مرید خاص ہیں۔

(21) امیر خسرو کا یہ مشہور خطاب ہے جو اپنے پیر سے ان کو ملا تھا۔

(22) عجیب بات ہے کہ دن کے روزے اور رات کے کھانے کا یہ حال افطار میں سبزی یا تلخ کریلے کے ساتھ روٹی آدھ روٹی پر کفایت لیکن باوجود اس کے عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ

''چوں روز شدے ہر کرا نظر بر جمال مبارک سلطان المشائخ افتادے تصور کردے گزشتی طافح است وچشمہائے مبارک سرخ بودے از بیداری شب۔'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 128)

کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کا مشہور شعر

تو شبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب — کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

اسی لاہوتی کیفیت کی تصویر ہے۔

(23) ان کے بڑے بھائی کا نام رفیع الدین ہارون تھا میر خورد نے لکھا ہے کہ ''بواسطہ شفقت سلطان المشائخ حافظ کلام ربانی گشتہ'' ان کی ایک خاص خصوصیت میر خورد نے یہ بتائی ہے کہ ''در تیر وکمان وسباحت (شناوری) وکشتی ہوسے تمام داشت'' لکھا ہے کہ ان کے اس رجحان کو پاکر سلطان المشائخ ان کو اس قسم کے ملاعب سے روکتے نہ تھے جیسا کہ کچھ دن پہلے مسلمانوں میں دستور ہوگیا تھا لیکن یہ دستور عہد موت کا تھا زندگی کے دنوں میں سلطان المشائخ جیسی ہستی بجائے روکنے اور زجر وتوبیخ کے ''از حال ایں ہنرہائے پسندیدہ کہ شرعاً مشروع ست بہ پرسیدے بلکہ غوامض ایں ہنر با تلقین فرمودے'' (سیر الاولیاء۔ صفحہ 203) واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بزرگوں میں اس قسم کی خود ساختہ سختیاں جن کے پچھلے دنوں مسلمان تربیت کے مسئلہ میں عادی ہوگئے تھے بہت کم تھیں۔ میر خورد نے لکھا ہے کہ ان کے چچا سید حسین کی نوجوانی کا زمانہ تھا اس خاص وضع میں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں ''در آوان جوانی در عین کامرانی روپاک (رومال) کشیدہ در سر بستہ دستار چہ نازنین بر کتف مبارک انداختہ بطریق جواناں خراماں از در آمد'' لیکن نوجوانی کی اس ترنگ کو دیکھ کر جو عمر کا اقتضا

ہے۔ کیا سلطان المشائخ نے ان کو سامنے سے نکلوادیا۔ لکھا ہے کہ

''دریں حال سلطان المشائخ فرمود کہ سید بیاد بہ نشیں وسعادتے بہ بر''

پھر حسب دستور جس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے ان سے اور چراغ دہلوی سے جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے' کرتے رہے۔ میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ بزرگوں نے نوجوانوں کو نوجوانی کے حقوق عطا کرنے میں بشرطیکہ حدود شرع سے متجاوز نہ ہوں' عموماً مسامحت برتی ہے۔ اصلاح کا یہی طریقہ مفید تھا۔ یہی صاحب سید حسین کا ایک زمانہ فیشن کا وہ تھا کہ صرف پان خوری کی حالت یہ تھی۔

''یک ساعت از تنبول دہن خالی نبودے یعنی متواتر تنبول خوردے اگر چہ یک برگ بدہ تنگہ رسیدے۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنبول خوری کی عادت مسلمانوں کو ہندوستان پہنچ کر ابتدائی صدیوں میں پڑ گئی تھی۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج'' بھی پان کھاتے تھے (صفحہ 194) سلطان جی بھی عادی تھے (صفحہ 142) بلکہ آپ نے پان کا نام ہی ابوالیاس رکھ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ پان کھانے کے بعد پھر کسی چیز کے کھانے کی امید باقی نہیں رہتی' نمک کا نام آپ کے دسترخوان پر ابوالفتح تھا' دستور تھا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لوگ نمکدانوں سے ایک انگلی نمک پہلے ضرور چکھ لیتے تھے' تب کھانا شروع ہوتا تھا۔

(24) مولانا غلام علی آزاد جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن ہی میں گزرا ہے' حضرت گیسو درازؒ کے متعلق دکن کے عوام جن میں ہندو اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے' ان کی عقیدت مندیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو عجیب باتیں نقل کی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ''شخصے بہ یکے از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہ بزرگ تر است یا سید محمد گیسو دراز۔ جواب داد کہ محمد رسول اللہؐ اگر چہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید محمد گیسو دراز چیزے دیگر ست۔'' (صفحہ 23) دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ کے نواح میں کوئی تالاب ہے ''از حضرت سید نقل می کنند کہ فرمود کسے کہ دریں تالاب غسل کند سعید می شود یعنی نیک بخت واز گناہاں پاک می گردد۔'' بہر حال روایت جیسی کچھ ہو' لطیفہ میر صاحب نے یہ درج کیا ہے کہ سعید کے لفظ کو لگاڑ کر عوام سادہ لوح ''گویند کہ حضرت سید فرمودے کسے کہ دریں تالاب غسل می کند سید می شود و بہ نیت تحصیل سیادت غسلہا بجامی آرند۔'' (صفحہ 24) اب بھی لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے یا نہیں' مجھے معلوم نہیں۔ دکن میں عموماً ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین طبقہ جس کا کام عموماً خدمت گزاری کرنا ہے' جھلکے ہنکانا ہے۔ ان کی اکثریت سے جب پوچھیے تو اپنے نام کے ساتھ سید کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں' حالانکہ اعلیٰ طبقوں میں بہت زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے۔ مشکل ہی سے ان میں کوئی اپنے کو سید کہتا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس طبقہ کی سیادت غالباً اسی تالاب کی کرامت کا نتیجہ ہے۔

(25) اب کوئی اسے مانے یا نہ مانے لیکن سلطان المشائخ کی روح کو مولانا زین الدین کی اس قرآن خوانی سے کتنا سکون حاصل ہوتا تھا' اس کے متعلق مولانا آزاد ہی کی کتاب میں شیخ زین الدین شیرازی کے حوالہ سے یہ بیان درج ہے کہ جن دنوں میں اس طرح قرآن خوانی میں ان کے روضہ پر مصروف تھا' ایک دن بگوش سر یہ شعر میں نے سنا

بیاسائے زحسنِ خود کہ جانم از تو آسودست تو حسن من برافزودی خدا حسنت بیفزائد

یعنی تم اپنے حسن کے ساتھ آسودہ رہو کہ میری روح کو تم سے آسودگی حاصل ہوئی ہے۔ تم نے میرے حسن کو بڑھایا' خدا تمہارے حسن کو بڑھائے۔ مولانا زین الدین کے الفاظ یہ ہیں'' این بیت از مرقد مطہر سلطان المشائخ استماع نمودم'' (صفحہ 28)

(26) اجمیر شریف کے بعد مولانا زین الدین خلد آباد پہنچ گئے۔ یہاں اس زمانہ میں محمد شاہ بہمنی کی حکومت تھی۔ لکھا ہے کہ چونکہ شراب نوشی کا عادی تھا' اس لیے بھی اور ملک میں امن وامان قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی' اس لیے باوجود سخت آرزو کے آپ نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا اور غائبانہ طور پر اس نے چاہا کہ اپنی تحریری بیعت بھیج دیں' اس سے بھی آپ نے انکار کیا' کہلا بھیجا۔

''سزاوار ریاست خلق کسے ست کہ در حفظ شعار ملت محمدی کوشیدہ سراً وعلانیتہً پیرامون شاہی نہ گردد۔''

سلطان بار بار آدمی شیخ کے پاس بھیجتا رہا۔ آخر میں قاضی القضاۃ کو بھیجا کہ بیعت نامہ پر شیخ کے دستخط کرالاؤ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ قصہ کہلا بھیجا کہ کسی کافر بادشاہ نے ایک مسلمان عالم وسید وبجوے کو گرفتار کر کے بت کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ عالم اور سید

دونوں نے اس کو اکراہ قرار دے کر بظاہر سجدہ کی صورت بنائی۔ جب ہیجڑے (مخنث) سے کہا گیا تو اس بیچارے نے کہا "تمامی عمر من درار تکاب ناشائستہ گذشت" بولا کہ بھی نہ میں عالم ہوں نہ سید "سرمایہ من لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ست اگر ایں راہم زدست دہم فردا حال من چہ باشد اگر سراز تن جدا کنند من بت را سجدہ کردنی نیستم۔" شیخ زین الدین نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا کہ "من مخنث بلکہ بدتر از مخنث اگر مجلس حاضر شوم یا بخلاف تو اقرار نمائم۔" بادشاہ پھر بھی جبر واکراہ کرتا رہا مگر آخر میں خدا نے اس کے دل میں شیخ کی ہیبت ڈال دی اور پشیمانی کا خط لکھا۔ حضرت نے کہلا بھیجا کہ سلطان محمد شاہ غازی شریعت محمدی کے مطابق شراب کی دکانیں ممالک محروسہ میں بند کرادے اور اپنے علماء وقضاۃ وصدور کو حکم دیں کہ لوگوں کو دین محمدی پر قائم کریں تو "زین الدین فقیر دوست تر کسے نخواہد بود۔" "غازی" کے خطاب پر سلطان بہت خوش ہوا اور تمام ملک سے یک قلم شراب نوشی کو حکماً بند کرادیا۔ ملک میں ڈاکہ اور چوری کی وارادات بکثرت ہو رہی تھی۔ سب کا انسداد سختی سے کیا۔ لکھا ہے کہ چھ سات مہینوں میں اتنے چور ڈاکو ٹھگ مارے گئے کہ بیس ہزار گلبرگہ میں جمع ہو گئے اور شہر کے کنارے ان سروں سے ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور شیخ میں بہترین تعلقات پیدا ہو گئے۔ "شیخ خوشحال شدہ مکاتیاب بہ لطف بقلم می آورد۔"

(27) آپ کا ذکر پہلے بھی مختلف سلسلہ میں آیا ہے۔ بقول شیخ محدث "از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند۔" (اخبار۔ صفحہ 117) لیکن یہاں اتنی بات بتانی ہے کہ آپ طریقہ سہروردیہ کی ایک شاخ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے' یہ یاد رکھنے کی چیز ہے کہ حضرت والا کے پیر طریقت شیخ نجیب الدین فردوسی تھے اور ان کے پیر شیخ رکن الدین فردوسی۔ شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین اولیاء کے معاصر ہیں' کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی جب سلطان المشائخ سے برسر پرخاش ہوا تو اس نے حضرت شیخ رکن الدین کو ان کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ بزرگوں میں تو کیا مقابلہ ہوتا لیکن عام مریدوں کو شیخ رکن الدین کے طریقہ چشت سے ایک گونہ رقابت پیدا ہو گئی۔ اسی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے جو آپ کو شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں نظر آئے گا کہ وہ سلطان جی کو اپنی مجلس میں مختلف طریقہ سے ستائش فرماتے۔ فردوسیوں میں خواہ مخواہ جو ایک غلط خیال پیدا ہو گیا تھا' جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو مٹانا چاہتے تھے۔ تعجب اس پر ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین کو جن لوگوں نے بہار کے قیام پر مجبور کیا' ان میں زیادہ تر حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے خلفاء ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام میں اگر کچھ لوگوں میں رقابت ان مختلف سلاسل وطرق کے متعلق پیدا بھی ہو جاتی تھی تو اکابر ہمیشہ اس کے ازالہ کے درپے ہوتے تھے کہ سارے راستے اللہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر بھی مذکورہ بالا شہادت چونکہ کسی چشتی کی تھی ہے' اس لیے اس کو زیادہ وقعت دینی چاہیے۔

(28) اس موقع پر حضرت الاستاذ الامام مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا خیال آتا ہے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو۔ کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ہزار با ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے۔ جس کتاب پر ایک دفعہ نظر پڑ گئی گویا ان کے حافظہ کی الماری میں بند ہو جاتی تھی۔ جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا' درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کر کے دریافت فرماتے "پوری آیت کیا ہے؟" فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا' پھر یہ کیا بات ہے؟ جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت' واللہ اعلم کیا بات تھی۔

(29) اصل یہ ہے کہ ایران وخراسان سے ہندوستان میں ایک فرقہ قلندروں کا بھی آدھمکا تھا جو ٹاٹ پہنے' چار ابرو کا صفایا کیے ادھر ادھر مارا پھرتا تھا۔ ان کو حیدریان بھی کہتے تھے۔ حیدر کوئی ان کے مرشدوں میں تھے۔ یہ فرقہ بھنگ بھی پیتا تھا' بے قید تھا' ڈھول ڈھمکے میں رہنا ان کی عام عادت تھی۔ مشائخ چشت نے ہمیشہ ان کو بری نظر سے دیکھا ہے۔

(30) چونکہ اپنے مقالہ میں میر خورد کی کتاب کے حوالے میں نے بکثرت نقل کیے ہیں' اس لیے میر صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ سادات کے ایک شریف گھرانے کے صاحب علم بزرگ ہیں' میں بتا چکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخ سے براہ

راست شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہے اور حضرت کی خانقاہ کے متصل ہی ان کے والد کا مکان تھا۔ تعلیم بھی ان کی سلطان جی کے خلفاء سے ہوئی ہے۔ خود لکھتے ہیں کہ ''نعمت دیدار و مشاہدہ آں بزرگوار'' (سلطان المشائخ) بھی ان کو مسلسل حاصل ہوتی رہی اور ذوق مجلس ارادت و مساس دست مبارک سلطان المشائخ۔'' (صفحہ 359) سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ اسی لیے میں ان کے بیان کو عام تذکروں کے بیان سے خصوصاً سلطان جی اور ان کے خلفاء کے متعلق ایک ایسا تاریخی بیان قرار دیتا ہوں جس کا مقابلہ دوسری تاریخی کتابوں سے مشکل ہے مگر اسی کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت والا کی بیعت ان کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی کہ بقول خود ''درک معانی دراں ایام چنداں نہ بود'' (صفحہ 359) اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت والا کی وفات کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ ''معاملہ نفس کہ دشمن دینی ست برحسب مطلوب آنحضرت (سلطان المشائخ) نہ بود۔'' اور اس کی وجہ بیچارے نے خود ہی لکھ دی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ''از غلبہ جوانی چنانکہ افتد دانی مزاحم شد۔'' (صفحہ 363) یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سلطان جی کو خواب میں جب دیکھا تو میں قدموں کی طرف بڑھتا لیکن ''کسانیکہ بودند مانع ایں دولت می شدند'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت والا کا وہ پختہ چشتی گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو سلطان جی کے خلفاء اور مریدوں کی خاص شان ہے' اسی لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ کچھ ان میں ایک رنگ تعصب کا بھی ہے یعنی حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابریہ کے شیخ حضرت علی صابر صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا ان کو بابا صاحب کے یہاں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں ''شیخ علی صابر درویشے قدے ثابت ونفسے گیرا داشت ساکن قصبہ ڈیکری بودے و پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم داشت اور از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود۔'' یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کبیر سے شیخ علی صابر نے کچھ چاہا تو فرمایا ''بھوگا خواہی کرد'' بھوگا کا ترجمہ کیا ہے ''عیشے خوش خواہد گشت'' مگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جاتے ہیں۔ شیخ محدث بھی متنبہ ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ یہ طرز تحریر ''خالی از غرابت نیست'' بلکہ ان کو یہ شبہ ہے کہ کسی دوسرے علی صابر کا تو یہ تذکرہ نہیں ہے۔ (اخبار الاخیار۔ صفحہ 69)

(31) شیخ العلماء سیدنا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے یہ مروی ہے' فرماتے تھے کہ دھمکی آدمی کو اسی چیز کی دی جاتی ہے جس کا خواہش مند ہو۔ قرآن کی ایسی دھمکیاں کہ حق تعالیٰ اس کی طرف نگاہ نہیں کریں گے یا قیامت کے دن اپنے رب سے وہ محجوب ہوگا۔ یہ دھمکی اسی وقت ہوسکتی ہے جب مانا جائے کہ آدمی کی فطرت میں اس کی تڑپ موجود ہے۔ فرماتے تھے اوروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن میرے لیے تو جہنم اور اس کے عذاب کی دھمکیوں سے لاینظر الیھم کی دھمکی زیادہ زہرہ گداز ہے۔

(32) اب میسور کا ایک غیر مشہور قصبہ یہ ''دہور سمند'' کا شہر ہے' کسی زمانہ میں اس علاقہ کا یہی مرکزی مقام تھا۔

(33) اصل قصہ تو تاریخ میں پڑھیے لیکن اس لیے کہ بسا اوقات معمولی عورتوں کے خاندانی جھگڑے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اتنا ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ سلطان جلال الدین خلجی جو بڑے دیندار مسلمان تھے' انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی علاء الدین اپنے بھتیجے سے کر دی تھی لیکن علاء الدین کی ساس اور اس کی بیوی دونوں کی علاؤ الدین سے نہیں بنتی تھی۔ اسی خانگی زندگی کی تلخیوں سے مجبور ہو کر اپنے علاقہ کڑہ مانک پور سے گویا اچانک تھوڑی سی فوج لے کر جنوبی ہند کی طرف غائب ہوگیا' جس کی جلال الدین کو بھی خبر نہ تھی۔ اب ''خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔'' علاؤ الدین کے ساتھ جو فوج تھی' وہ سرفروشوں کا ایک مجمع تھا۔ دکن میں جو بھی ان کے سامنے آیا ٹھہر نہ سکا۔ اس غیر متوقع کامیابی کے بعد علاؤ الدین پھر اپنے علاقہ میں واپس آیا اور خانگی تلخیوں کو مٹانے کی کوئی تدبیر اس کے سامنے نہ تھی۔ بجز اس کے کہ اس نمک حرامی اور سنگدلی پر آمادہ ہو جائے جس کا ذکر عام تاریخوں میں ہے یعنی سلطان جلال الدین کو بڑی بے رحمی کے ساتھ اس نے قتل کر دیا اور خود تختِ ہند پر متمکن ہوگیا۔

(34) مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کثرت ذکر کا ظاہر ہے بار بار مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم (اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اپنے پہلوؤں پر) میں ہر طریقہ سے ذکر کی عام اجازت دی گئی' اب اگر بزرگوں کو کسی

خاص طریقہ نشست یا طریقہ اداد وغیرہ سے تجربتہً وہ بات مفید معلوم ہوئی اور لوگوں سے ذکر اسی طریقہ سے کرانے لگے تو کیا وہ قرآن سے باہر گئے؟ سچ یہ ہے کہ قرآن نے جسے مطلق چھوڑا ہے' آپ اس میں تعین کس بنیاد پر کرتے ہیں۔

(35) ہر زمانہ میں طبقہ صالحین کے بعض افراد کو ابدالیت کے مقام سے حق تعالیٰ سرفراز فرماتے ہیں' یہ ایک ایسا خیال ہے جو سلف سے خلف تک مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس بات میں حضرت انسؓ' ابن مسعودؓ' ابو درداءؓ' معاذ بن جبلؓ' عوف بن مالک صحابیوں اور ام المومنین ام سلمہؓ سے حدیث کی کتابوں میں روایتیں بھی نقل کی گئی ہیں۔ گو محدثین وائمہ نقد ان کی سندوں سے مطمئن نہیں ہیں لیکن شارحین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کا بطور قدر مشترک جو مفاد ہے' اس کا انکار مشکل ہے۔ یوں بھی امام بخاری' امام شافعی' امام احمد بن حنبل جیسے کبار آئمہ حدیث اپنی کتابوں میں اس قسم کے الفاظ (کہ فلاں بزرگ کا شمار ابدال میں تھا یا مسلمانوں کا فلاں طبقہ ابدال کا طبقہ ہے) پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں چالیس افراد کا مردوں اور چالیس ہی کا عورتوں میں سے اس روحانی خدمت کے لیے انتخاب ہوتا ہے۔ کوئی ایک ان میں جب مر جاتا ہے تو اسی وقت کسی دوسرے سے اس جگہ کو معمور کر دیا جاتا ہے۔ ابدال کہنے کی یہی وجہ بھی ہے کہ ہمیشہ ایک کی جگہ بطور بدل کے دوسرے کا انتخاب ہوتا ہے۔

(36) مثلاً اصنامی نظام والے بت پرستوں کا جو حال ہے کہ خود ہی کسی پتھر یا مٹی کے تودہ کو فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ فلاں روح کا تعلق ہو گیا اور اپنی ساری امیدوں آرزوؤں کا ماویٰ ملجا اب اسی پتھر یا تودہ خاک کو بنا لیتے ہیں لیکن یہ بات کہ واقعتہً اس روح کا اس پتھر یا تودہ خاک سے تعلق ہے بھی یا نہیں۔ حساً یا عقلاً یا کسی اور ذریعہ سے ان کو اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا' اس لیے بت پرستی علاوہ اس ناقابل عفو جرم کے جس کا نام شرک ہے' یوں بھی وہ ایک بے بنیاد وہم ہے' میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خود تراشیدہ فرضی پتھروں یا خود ساختہ مٹی کے تودوں کے ساتھ کسی زندہ وجود کا جو یہ تعلق مانتے ہیں' آخر اس کی بنیاد کیا ہے۔ جہاں چاہا ایک پتھر رکھ دیا گیا' گویا یہ پتھر ایک قسم کے الہ الدین الف لیلہ والے کا چراغ ہے کہ جلا نہیں کہ موکلین حاضر ہو گئے۔ یوں ہی جہاں کہیں ذرا چھیل چھال کے کوئی پتھر جما دیا یا پتھر نہیں مٹی ہی کو پانی میں سان کر کہیں تھوپ دیا اور روح مخفی کا اس کے ساتھ تعلق ہو گیا' بخلاف خالق تعالیٰ جل مجدہ کے گو بظاہر حواس سے اس کا وجود بھی مخفی ہے لیکن کائنات نام ہی ہے ان کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ کا۔ ہر ذرہ اس عالم کا اپنے خالق کے افعال کا صفات کا وجود کا آئینہ بردار ہے۔ خالق قیوم کے تصور کے بغیر کسی قیومی مخلوق کا وجود ناقابل تصور ہے' دھوپ کا تصور آفتاب کے بغیر ناممکن ہے' انفس و آفاق اس کے آیات ونشانیاں اور اس کے پتے ہیں اسی لیے وہ علی کل شی شھید بکل شی محیط ھو معکم اینما کنتم ہے لیکن تراشیدہ پتھر اور روح جن میں نہ کوئی کسی کا خالق ہے نہ کوئی کسی کا مخلوق' ان دونوں مخلوقوں میں آخر رشتہ کس بنیاد پر قائم کر لیا جاتا ہے اور ایسا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے جدا نہیں ہو سکتا' پتھر کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روح کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس سے مانگنا اسی مخفی روح سے مانگنا ہے جو اس حجری عمل تسخیر سے حاضر کی جاتی ہے۔

(37) حتیٰ کہ مشہور عالم حدیث جو اپنی سخت گیری وظاہریت میں شہرت عام رکھتے ہیں یعنی علامہ ابن حزم جیسی ہستی مزامیری وغیر مزامیری ہر قسم کے غناء کی اباحت وجواز کے مدعی ہیں۔

(38) پہلے کسی موقعہ پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سجدہ تحیت کا رواج بادشاہوں کے سامنے بھی ہندوستان میں اکبر سے پہلے نہ تھا بلکہ اکبری عہد میں ایک شرار الناس شرار العلماء کی شرارت تھی اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا انسداد ہو گیا' جیسا کہ تمام تاریخوں میں لکھا ہے۔ پھر جب سجدہ تحیت کا رواج بادشاہوں میں بھی نہ تھا تو فقراء میں کیا ہوتا۔ لوگوں کو اکبری عہد کے سجدہ تحیت سے مغالطہ ہوا کہ شاید یہ سجدہ بادشاہوں کے سامنے ہندوستان میں پہلے سے چلا آتا تھا اور ان ہی کی دیکھا دیکھی جیسے ''شاہ'' کا لفظ صوفیوں نے اپنے متعلق استعمال کیا' اس سجدہ کو بھی اپنے سامنے کرانے لگے۔

(39) اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار میں شادیوں میں رواج ''کندوری'' کا ہے۔ لوگ عموماً اس کو ہندوؤں سے ماخوذ کوئی رواج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترکی لفظ ہے۔ معنی دسترخوان ہیں۔ جو کھانا برادری کو کھلایا جاتا ہے' اس کو کندوری کہتے ہیں۔

(40) ''ظفرالوالہ'' جو گجرات کی عربی زبان میں ایک مبسوط تاریخ ہے' اس میں اس لفظ ''مولہ'' کا تلفظ درج ہوئے لکھا ہے' بتشدید اللام المفتوحہ ہے یعنی ''مُولَّہ'' اس کا صحیح تلفظ ہے۔ اس میں شیخ مولہ کے متعلق لکھا ہے کہ ''کان سید مولہ مع سعتہ تصرفہ فدیقتصر فی الملبوس علی رداء من قطن و ازا رونی الماکول علی قرص خبز من دقیق الا رز و قلیل الادم من جنس البقول الحب کثیر الریاضتہ و المجاھدۃ لازوجتہ لہ ولا غلام یخدمہ ولا یقبل الفتوح'' (صفحہ 766 جلد 2) یعنی سیدی مولہ ان تصرفات کے باوجود خود سادہ لباس رکھتے تھے۔ ایک سوتی چادر' ایک لنگی' کھانے میں چاول کی روٹی کسی ترکاری کے ساتھ جس میں گوشت وغیرہ کچھ نہ ہوتا' مجاہدہ اور ریاضت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ ان کی نہ بیوی تھی نہ کوئی غلام خدمت کرنے والا' لوگوں سے نذر نذور فتوحات بھی نہیں لیتے تھے' پھر یہ خرچ کہاں سے مہیا ہوتا تھا؟

(41) ''مآثر الامراء'' میں الہ وردی خاں ایک جہانگیری امیر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے شکاروں کو گھیرنے اور پھنسانے کے لیے ایک خاص قسم کا جال بنوایا تھا۔ ''مآثر الامراء'' میں اس جال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ''دامے ست در کمال استواری بار ہشتاد شتر۔'' ایک جال تھا اور اسی اونٹوں پر لد کر شکارگاہ پہنچتا تھا۔ لکھا ہے کہ ''طول دہ ہزار ذرعہ بادشاہی و ارتفاع شش'' اللہ اکبر دس ہزار گز بادشاہی طوالت ملاحظہ فرمائیے۔ اسی اونٹوں پر اگر جاتا تھا تو کیا تعجب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ٹکڑوں میں منقسم تھا۔ جب اسے شکار کا کام لینا چاہتے تو ''بساں سرا پردہ بہ ستونہا سترگ برپا کنند و انواع سباع (درندے) و وحوش درآں گرد آوردہ صید نمایند'' (صفحہ 258 جلد 1) گویا وہ سارے جانور جو اس جال کے احاطہ میں آ جاتے تھے' خود بخود شکار ہو جاتے تھے۔ میں نے یہ اس لیے نقل کیا ہے کہ شکار جو صرف دل بہلانے کی ایک چیز ہے لیکن اتنی غیر اہم چیزیں بھی زندگی کے دنوں میں قوموں سے کیسے عجیب کارنامے صادر کرا لیتی ہیں۔ ''سیر المتاخرین'' وغیرہ میں اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے جشن منانے کا حکم دیا۔ حسب دستور بارگاہ شاہی نصب ہوا جس میں ''دروازہ ہزار کس در سایہ آں تواند گنجید'' یعنی دس بارہ ہزار آدمی کی گنجائش اس بارگاہ میں تھی' اتفاق سے اس میں آگ لگ گئی۔ لکھا ہے کہ ''اندازہ ایں نقصان ہیچ محاسبے نہ تواند یافت'' مگر قلوب میں جب قوت اور زندگی رہتی ہے تو جس نقصان کا حساب کوئی محاسب نہیں کر سکتا' اس کی پروا بھی نہیں ہوئی۔ اسی کتاب میں ہے کہ ''بعد اطفائے التہاب آتش مذکورہ (یعنی آگ کے بجھ جانے کے بعد) حکم شد کہ بجہت بزم شرف کہ نزدیک رسیدہ بود از سرنو بارگاہ والا درست گردد در اندک روز بارگاہِ فلک اشتباہ صورت انجام یافت'' (سیر المتاخرین۔ جلد 1 صفحہ 203)

کسی جگہ میں نے شیخ محدث کے حوالہ سے بنگالی بادشاہ غیاث الدین خلجی کے متعلق نقل کیا ہے کہ بنگال میں اتنا بڑا پل بادشاہ نے بنوایا تھا جس پر بارہ دن تک لوگ چلتے رہتے تھے۔

(42) ان سرداران معتبر میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ ''ملوک و امراء معزول بلبنی'' بھی شریک رہتے تھے' غالباً ان ہی لوگوں کی شرکت جلال الدین خلجی کی غلط فہمی کا باعث ہوئی۔ اس کو خطرہ ہوا کہ شاید سیدی مولہ کے اس خانقاہی کاروبار کے پیچھے کوئی سیاسی سازش تو پوشیدہ نہیں ہے۔ خود جا کر خانقاہ اور لنگر خانے کی جو حالت اس نے دیکھی' اس سے بدگمانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ بالآخر اس نے سیدی مولہ کو پابہ زنجیر دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ پوچھ گچھ ہوئی۔ شیخ نے قسمیں کھا کر باور کرایا کہ میری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔ دربار کے امراء اور علماء سبھوں نے سلطان کو سمجھایا اور شیخ کی طرف سے صفائی پیش کی لیکن اس کے دل سے کانٹا نہ نکلا۔ قاضیوں سے اس نے چاہا کہ شیخ پر کوئی شرعی الزام قائم کریں لیکن بالاتفاق سبھوں نے اظہار کیا کہ ہمارے نزدیک شیخ پر کوئی شرعی الزام عائد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض علماء بادشاہ کے زیر عتاب بھی ہوئے۔ مجبور ہو کر جلال الدین نے اس زمانہ کے بعض آزاد منش قلندروں کو جنہیں ''حیدریہ'' کہتے تھے۔ شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا اور ان ہی بدبختوں کے ہاتھوں شیخ کو شہید ہونا پڑا۔ بداؤنی' شیخ محدث دونوں نے لکھا ہے کہ جس دن سیدی مولہ شہید کیے گئے سخت آندھی آئی' طوفاں کا سماں قائم ہو گیا۔ شیخ محدث کا تو بیان ہے کہ ''گویا قیامت برپا شد' عالم تاریک گشت۔'' بداؤنی کا بیان ہے کہ ''قحطے چناں واقع شد کہ ہندواں از غایت گرسنگی مخمصہ جماعہ جماعہ دستہائے یک دیگر را گرفتہ خود را در

آب جون انداختہ طعمہ نہنگ فنامی شدند و مسلمانان نیز با آتش گرسنگی سوختہ غریق بحر عدم بودند۔'' عام خیال یہی تھا کہ شیخ مولہ کے خون ناحق کا یہ اثر ہے لیکن بقول عبدالقادر ''بریں طور چیز ہا مدار اہم نہ تواں نہاد کہ شاید از جملہ اتفاقیات باشد۔'' بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ قتل ہونے سے چند دن پیشتر سیدی مولہ کی زبان سے یہ اشعار سنے جاتے تھے۔

در مطبخ عشق جز نکورانہ کشند لاغر صفتاں زشت خورانہ کشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز مردار بود ہر انچہ اورا نہ کشند

(43) بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں کا وہ مشہور فقرہ ہے جسے خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین علیہا السلام نے سرور کائنات کو مخاطب کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا' جب غار حرا سے آپ پہلی دفعہ تشریف لائے۔ اس وقت تک آنحضرت کی زندگی جن مشاغل میں گذری تھی' گویا اس کا اظہار تھا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ناداروں کو مواد دیتے ہیں' دوسروں کا بار خود برداشت کرتے ہیں' جو اپنا کام اچھی طرح انجام نہیں کر سکتے تھے' ان کی مدد فرماتے ہیں۔ صوفیاء کرام میں عبادت کے اس طریقہ کو یعنی ''برآوردن کار امیدوار'' کو جو اہمیت حاصل تھی' یہ کسی خاص بزرگ کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ آپ کو ان بزرگوں کے حالات میں بکثرت اس کی مثالیں ملیں گی۔ ان کا امراء اور سلاطین پر جو اثر تھا' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشکل ہی سے ان کی سفارش رد ہو سکتی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی جن کا شمار روسا طریق میں ہے' حلب کا بادشاہ الملک الظاہر بامر اللہ حضرت کے عقیدت مندوں میں تھا۔ فتوحات میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے۔

لقد کلمت الملک الظاهر بامر الله صاحب حلب فی حوائج کثیرة فقضا لی فی یوم واحد مائه حاجة و ثمانیه عشر حاجة للناس و لو کان عندی فی ذلک الیوم اکثر من ذلک لقضاة بطیب النفس (جلد 3 صفحہ 197)

''میں نے حلب کے بادشاہ ملک ظاہر بامر اللہ سے مختلف امور کے متعلق سفارش کی۔ بادشاہ نے میرے کہنے سے ایک سو اٹھارہ حاجتیں لوگوں کی ایک دن میں پوری کیں اور اس وقت اگر میرے پاس کچھ اور ضرورتیں ہوتیں تو اسے بھی بخوبی وہ پوری کرتا۔''

(44) کسر نفسی اور تواضع کے سلسلے میں ملا عبدالقادر ہی نے ان کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کی خانقاہ میں سماع کی مجلس تھی۔ شیخ عزیز اللہ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ اتنے میں کسی قلندر آزاد نے ایک چیخ ماری اور ''دست برزانوئے شیخ بردہ و برداشتہ او را سرنگوں برزمین زد تا دستارش پریشاں شد والے نیز رسید'' بھری مجلس میں ان کو پٹک دیتا ہے۔ پگڑی بکھر جاتی ہے۔ تکلیف بھی پہنچتی ہے لیکن شیخ نے خود ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید وجد اور حال میں اس قلندر سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے مگر دراصل اس نے شرارتاً یہ حرکت کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ شیخ کے ساتھ کیا' حاکم شہر بھی مجلس میں موجود تھا' اسے بڑا غصہ آیا'' و ارادہ زجر و ضرب تہدید آں پریشاں کرد'' مگر جانتے ہو شیخ نے کیا کہا ''شیخ عذر خواہی او بسیار نمود دست و پائے او (یعنی اس قلندر کے دست و پا کو) بوسیدہ در حاجت خویش نگاہ' داشت و نہ گذاشت کہ تعرض باو رسانند۔'' (صفحہ 10 جلد 3)

(45) واقعہ یہ ہے کہ یہ خسرو خاں جو چار مہینوں کے لیے دلی کا بادشاہ بھی ہو گیا تھا' دراصل گجرات کا ایک خوش رو وجیہ چھوکرا تھا۔ اصلی نام حسن پردار بچہ تھا' قطب الدین اس کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا۔ یہ تو واقعہ ہے لیکن اس کے پیچھے کیا کسی اللہ کے ولی کی بددعا تھی' جیسا کہ میں نے کہا تاریخوں میں بھی سلطان المشائخ کے قصہ کو ذکر کرتے ہیں لیکن مجمل لفظوں میں میر خورد نے ''سیر الاولیاء'' میں اس قصہ کا ذکر کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاؤ الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غضب کی تھی' اس لیے قطب الدین حضرت سے بھی ناراض رہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد ''جامع میری'' کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ وعلماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ ''مسجد نزدیک داریم وایں احق است بمیں جا خواہم گذارد' اور وہ جامع میری نہیں گئے' بادشاہ سخت برافروختہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان و مشاہیر شہر

دربارِ شاہی میں پیش ہو کر نذر گردانتے تھے۔ سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ ادائے رسم کے لیے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے۔ اس سے بھی وہ برہم تھا۔ اس نے اپنے تمام امراء وزراء کو حکم دیا کہ "کسے بزیارتِ شیخ غیاث پور نرود" میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ "بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ بیارد و ہزار تنکہ زر او را بدہم۔"

ایک روز شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا۔ سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا' قطب الدین نے جواب نہ دیا۔ یوں مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کی چار سالہ مدت میں پیش آئے۔ نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ اگر "در غرہ ماہ آئندہ نیامد بیاریم چنانکہ دانیم" گویا یہ اس کی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسوا کر بلواؤں گا۔ شاید قتل ہی کا ارادہ ہو' سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم صمم کی خبر پہنچی "سلطان المشائخ ہیچ نگفت۔" اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا "ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روے پیش تر می داد" الغرض مہینہ ختم ہوا' چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا' کل پہلی تاریخ ہے۔ شہر کے اعیان وامراء دربار میں جائیں گے لیکن سلطان المشائخ یہی طے کیے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا۔ قطب الدین بھی فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ اگر "نیامد بیاریم چنانکہ دانیم" "صرف شب درمیان ست۔ دل میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ دنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے' رات گذرنے بھی نہ پائی کہ

"ہمدریں شب ماہ بلائے از آسماں بر جان بادشاہ نازل شد"

یعنی خسرو خاں پردار بچہ "موئے سر سلطان را گرفت و باہم در آویختند و پہلوئے سلطان را بہ خنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سر آں مشوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستوں بزیر افگند" (طباطبائی) صبح کو سر او را بالائے نیزہ کردہ بخلق نمود۔" میر خورد کہتے ہیں کہ جس رات کو یہ واقعہ پیش آیا' سلطان المشائخ اپنے بالاخانہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے زبانِ مبارک سے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے ۔

اے روبہک چرانہ نشستی بجائے خویش　　باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

میر خورد نے اس شعر پڑھنے کے واقعہ کو نہیں لکھا ہے۔ دوسرے تذکروں میں ہے۔ البتہ سعدی کے نام سے اسی مقام پر میر نے بھی اس شعر کو استعمال کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

(46) خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے بیٹھے ہندوشاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اڑائی کہ امام غزالی کا قول "یجوز الاهله ولا یجوز بغیر اهله" کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا' کیا تماشا ہے دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے' اسی مجلس میں مولانا فخر الدین زرادی موجود تھے۔ گذر چکا کہ وہ دعوے کے دونوں پہلو جواز وعدم جواز پر دلیل پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔

(47) بلاتشبیہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ولادت باسعادت نبوت کبریٰ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے' بحیرۂ ساوہ خشک ہو گیا۔ اب بعض لوگ خواہ مخواہ عقلی محفلوں میں اونچی جگہ حاصل کرنے کے لیے ان واقعات ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ واقعات تو تاریخی ہیں۔ کہتے ہیں کہ طاق کسریٰ کے کھنڈر مدائن میں ابھی جس حال میں موجود ہیں' ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ زدہ عمارت ہے اور اسی زلزلہ میں اس کے مشہور کنگرے گر گئے تھے۔ یونہی عرب کا نقشہ اٹھا کر دیکھیے' آپ کو حضر موت کی وادی میں ایک خشک دریا ساوہ نامی نقشہ میں نظر آئے گا۔ بہرحال ان واقعات کا انکار کرنے کی تو وجہ نہیں' ہاں ہم مسلمان لوگ اپنے پیغمبر کی ولادت کے علامات میں ان حوادث کو شمار کرتے ہیں اور جنہیں پیغمبر سے عقیدت نہیں ہے وہ اس کی توجیہ کسی کونی قانون کے تحت کر سکتے ہیں۔

(48) اعداد وشمار کا خبط جن فاسد اغراض کو سامنے رکھ کر یورپ نے اس زمانہ میں پھیلایا ہے' خدا کی پرانی دنیا جو لا معلوم زمانہ سے موت و حیات کی ایک خاص گردش کے ساتھ چل رہی ہے' اس کے حوادث پر قابو پانے کا جو ارادہ اس زمانہ میں ان ہی عددی مواد کی بنیاد پر کیا جا

رہا ہے۔ گویا اس کی ابتدا کم از کم سرزمین ہند میں اسی ہندی بادشاہ نے کی کہ بیلوں اور بھینسوں کو بھی گنوانا شروع کیا۔

(49) میر خورد نے لکھا ہے کہ حضرت والا کو لوگوں نے ایک کھلے میدان میں ہی حسب خواہش دفن کیا تھا "آنجا کہ روضہ متبرکہ سلطان المشائخ است صحرا بود" لیکن بعد کو اسی محمد تغلق نے قبر شریف پر "گنبد عمارت کنانید۔" (سیر اولیاء۔ صفحہ 154)

(50) مخدوم الملک شاہ شرف الدین منیری بہاریؒ کی وفات جس وقت ہو رہی تھی' دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ زبان مبارک پر "اللہ اغفر امتہ محمد اللہم ارحم امتی محمد" (اے اللہ! محمد کی امت کو بخش دے' اے اللہ! محمدؐ کی امت پر رحم فرما) جاری تھا۔ ایک سو بیس سال کی عمر کس تڑپ اور درد و سوز میں اللہ کے اس فقیر کی گزری تھی' اس کا اندازہ سکرات کے ان آخری الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔

(51) یہی فقرہ ہے جو ہندوستان کی جدید نبوت اور جدید وحی کے مدعی قادیانی مرزا کو ہاتھ لگا۔ اسی تغلقی فقرہ پر ان کے تنبی کی دیوار قائم ہے۔ کاغذ اور سیاہی کی کمی قادیان میں تو کبھی محسوس نہیں ہوئی لیکن تحلیل و تجربہ کے بعد سارے ہفوات کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں مندرج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ صدیوں کے بعد پھر اسی تغلقی مالیخولیا نے قادیان میں زور باندھا۔

(52) کاش! اس زمانہ میں تغلق نہ ہوا' بہت پہلے پیدا ہو گیا ورنہ قادیان کے سوا' ہندوستان کے اور بہت سے دائروں میں اس کی پوجا ہوتی۔ گویا جن باتوں کو آج ہم سن رہے ہیں' ان سب کا بانی اول وہی تھا۔

(53) فقیر سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی سابق صدر الصدور سرکار آصفیہ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کے چچا نواب عبدالشکور خاں مرحوم کے پاس حضرت مولانا عالم علی صاحب نگینویؒ تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا کو کشف قبور میں خاص ملکہ تھا۔ ایک دن قبرستان تشریف لے گئے۔ ایک بی بی صاحبہ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا' ان کی قبر پر مراقب ہوئے اور فرمایا کہ ان بی بی صاحبہ کے پاس کسی نے اپنی جوتیاں امانتاً رکھنے کو دی تھیں۔ اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کہتی ہیں کہ ان جوتیوں کی وجہ سے ان کو تکلیف ہے۔ پتہ یہ بتاتی ہیں کہ فلاں کمرے کے فلاں مقام پر جو صندوق رکھا ہوا ہے' اس کے کپڑوں کے نیچے جوتیاں ہیں جس کی امانت ہے پہنچا دی جائے۔ لوگوں نے تلاش کیا' ٹھیک جوتیوں کا جو پتہ انہوں نے دیا تھا' وہیں نکلیں۔ حافظ ابن قیم نے "کتاب الروح" میں عہد صحابہ کا بھی واقع کچھ اسی نوعیت کا درج کیا ہے کہ خواب میں اپنے دوست صحابی کو مرنے کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ میرے مکان کے چھپر میں سینگ کے اندر اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں جو ایک یہودی سے میں نے لی تھیں۔ تم یہودی تک ان کو پہنچا دو۔ صحابی جنہوں نے خواب دیکھا تھا' ان کے گھر آئے۔ پردہ کیا اور چھپر میں دیکھا تو ٹھیک جہاں انہوں نے اشرفیوں سے بھرے سینگ کا پتہ دیا تھا' ملا۔ گھر والوں سے انہوں نے قصہ خواب کا بیان کیا اور ان کی اجازت سے یہودی کو دے آئے۔ یہودی اس قصہ کو سن کر مسلمان ہو گیا۔ اس قسم کے تجربات کا ایک ذخیرہ کتابوں میں بھی ملتا ہے۔

(54) میری ایک کتاب "دم واپسیں" کا بکھرا ہوا مواد غیر مرتب حال میں پڑا ہوا ہے۔ چند اجزاء "احتضاریات" کے عنوان سے "القاسم" دیوبند میں شائع بھی ہوئے تھے۔ پھر سمیٹنے کا موقع نہ ملا۔ خدا کرے کہ توفیق میسر ہو' عجب واقعات ہیں۔ ان کے بھی جو مرنے کے لیے جیتے تھے اور ان کے بھی جو جینے پر مصر تھے لیکن بہرحال ان کو مرنا پڑا۔ میں نے مذکورہ بالا دو واقعات میں دراصل حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ الچشتی مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا محمد حسین الہ آبادی کی وفاتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو عام طور پر مشہور ہیں۔ قطب صاحب کا انتقال پہلے شعر پر اور مولانا الہ آبادی کا دوسرے شعر پر ہوا۔

(55) اور سید العارفین کے متعلق تو آپ یہ سن رہے ہیں کہ وہ کسب معیشت سے لوگوں کو صرف "باز نمی داشتند" یعنی منع نہیں کرتے تھے مگر کسی مولوی یا کسی معاشی مسلمان نہیں بلکہ طبقہ صوفیہ کے سرخیل اس راہ میں ایک خاص مکتب خیال کے بانی حضرت علاؤ الدولہ ابوالمکارم سمنانیؒ کے حوالہ سے مولانا جامی نے "نفحات" (صفحہ 518) مطبوعہ کلکتہ میں ان ہی کا یہ قول نقل فرمایا ہے' یہ فرمانے کے بعد کہ "حق تعالیٰ زمین و مزارع را بحکمت آفریدہ" یعنی زمین اور اس کی کھیتیوں کو خدا نے مصلحت اور حکمت سے پیدا کیا ہے۔ حضرت سمنانی فرماتے تھے "می خواہد کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد" یعنی خدا چاہتا ہے کہ زمین اور اس کی قابل کاشت زمین آباد رہیں اور ان سے

خلق اللہ کو نفع پہنچے۔ اس کے بعد ہے "اگر خلق بداند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ ودخل کنند نہ بوجہ اسراف چہ ثواب است ہر گز ترک عمارت نہ کند" یعنی دنیا کی آبادی جو بغرض فائدہ اور آمدنی کی جائے محض فضول خرچی مقصود نہ ہو اگر لوگوں کو اس کا ثواب اور اجر معلوم ہو تو ہر گز زمین کو غیر آباد نہ رکھیں۔ اسی طرح "اگر بدانند کہ از ترک عمارت وگذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود ہر گز نہ گذارند کہ اسباب واخراب شود" یعنی غیر آباد رکھنے میں جو گناہ ہوتا ہے اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو ہر گز آبادی کے اسباب وذرائع کے برباد ہونے پر کوئی تیار ہو سکتا ہے۔ بات یہی ختم نہیں ہوتی ہے۔ آخر میں ارشاد ہے۔ تمثیل سے سمجھایا گیا ہے۔ ہر "کسے کہ زمینے دارد کہ ہر سال از اں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد اگر بہ تقصیر واہمال نہ صد من حاصل کند وسبب آں صد من از علق خلق دور افتد بقدر آں از وے باز خواست خواہند کرد" یعنی کسی کے پاس زمین ہے جس سے ہزار من غلہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن قصداً کوتاہی اور غفلت کو کام میں لا کر بجائے ہزار من کے نو سو من ہی غلہ اس کھیت میں پیدا ہوا تو سو من جو محض اس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے خلق اللہ کے منہ تک نہ پہنچ سکا تو یہ سو من غلہ اس غافل سست عمل کا کاشتکار سے وصول کیا جائے گا اور اس کی باز پرس ہوگی۔ بتایئے جس طریقہ کا یہ خیال ہو اس پر رہبانیت اور جوگیت کا افتراء کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "اسلامی معاشیات۔"

(56) ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خود اور ان کے بعد اس خاندان کے اکابر شاہ ولی اللہ مرزا مظہر جانجاں شاہ عبدالعزیز وغیرہم حضرات نے تشیع کے خلاف میں جو کام کیا ہے وہ آج کس پر پوشیدہ ہے۔ اسی ہندوستان میں حضرت مولانا عبدالعلی بحر العلوم تھے جو مجدد ہی نہیں بلکہ شیخ ابن عربی کے خالی عقیدت مندوں میں ہیں ان کا نام ایک سطر کے آداب والقاب کے بغیر نہیں لیتے' ان کے متعلق "حدائق الحنفیہ" میں یہ لکھا ہے' ان کا (مولانا بحر العلوم کا) قول تھا کہ مجھ کو عالم رویا میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھ کو اپنی بیعت میں داخل کیا اور تعلیم وارشاد طریقت کا حکم دیا۔ پس میں خاص ان ہی کا مرید ہوں اور ان کے واسطے سے آنحضرتؐ کے ساتھ مجھے سلسلہ انتساب بیعت کا پہنچتا ہے۔ (صفحہ 467) مولانا بحر العلوم کو اس باب میں اتنا غلو تھا کہ اسی کتاب میں ہے "چنانچہ جو شخص اس سلسلہ میں ان سے بیعت کرتا تھا' آپ اسے ایک واسطہ سے شجرہ لکھ کر اس کو دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تصوف کا اگر تشیع سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو سب سے زیادہ اس کا اثر سرخیل صوفیہ ابن عربی اور ان کے پیروؤں میں ہونا چاہیے' حالانکہ نہ شیخ ہی کا یہ رنگ ہے نہ ان کے ماننے والوں کا۔"

(57) ان ہی شیعی مولویوں میں صدر شیرازی المشہور بہ صدرا بھی ہیں۔ چونکہ وہ صویوں کے معتقد ہیں' اس لیے طبقہ شیعہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے' ان کے بیٹے ابراہیم نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔ "مرزا (ابراہیم) از علماء متبحرین وبخلاف پدر خورد (صدر الدین شیرازی) سالک مسلک حق وتعیین بود۔" یہ بھی لکھا ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملا صدرا سے مصداق "یخرج الحی من المیت بود" (صفحہ 58)

(58) شیعوں میں گویا یہ اہل حدیث کا فرقہ ہے۔ ملا محمد امین کی وفات 1033ھ میں ہوئی ہے یعنی گیارہویں صدی کے آدمی ہیں' یہ ٹھیک وہی زمانہ ہے جب یورپ میں عیسائی بھی دو فرقوں میں منقسم ہو کر باہم ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں تھے یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ (احتجاجیہ)۔ عجب اتفاق ہے کہ قسطنطنیہ جو یورپ اور ایشیا بلکہ اسلام اور عیسائیت کا سنگم تھا' وہاں چونکہ ترکوں کی کڑی حکومت تھی' یورپ کے اس مذہبی فتنہ کا اثر نہ پڑا لیکن بجائے قسطنطنیہ کے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران کا ایک شیعی عالم مجتہدین یا عیسائی اصطلاح میں کہیے کہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا ہے اور اس کے کچھ ہی دن بعد جامع ازہر کا ایک طالب علم عرب کے ایک دور افتادہ علاقہ نجد میں پہنچ کر سنیوں کے اندر بھی یورپ کی اسی آواز کو دہرا رہا ہے کہ ہم پر علماء وآئمہ کا قول حجت نہیں' براہ راست قرآن وحدیث سے جو بات میری سمجھ میں آئے گی' وہی مانیں گے' یعنی وہی بات کہ کلیسا کی تشریح سے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کو اختلاف تھا۔ تورات وانجیل سے براہ راست اجتہاد کرنے کے وہ مدعی تھے۔ کیا ان ہی دنوں میں نصرانیت نے یورپ سے پاؤں نکال کر اسلامی ممالک کو اپنے سیاسی اقتدار کے نیچے دبانا شروع کیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے' میں نے صرف اشارہ کیا۔

(59) میرے اس اصطلاحی لفظ پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملا امین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "اودر مدینہ منورہ اختیار مجاورت

نمودہ بود و بعدازاں در مکہ معظمہ رحل اقامت انداخت۔" وہ مرے بھی ہیں' مکہ معظمہ ہی میں تاریخ کی کڑیوں کے ملانے والے اگر چاہیں تو بہت سی باتیں جو ابھی صیغہ راز میں ہیں' ان کو پا سکتے ہیں' میں تو ابھی صرف اسی پر اس وقت قناعت کرتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(60) مشاہدات و محسوسات کے خلاف دنیا میں چند خلاف واقعہ باتیں جو مشہور ہو گئی ہیں' بے سوچے سمجھے ہر شخص ان کو دہراتا رہتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا فریب اور سفید جھوٹ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی شہرت ہے۔ جہاں جائیے جس سے سنیے یہی سنیے کہ فرقہ بندیوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کی بربادی اور تباہی میں تو شبہ نہیں لیکن فرقہ بندیوں کا دعویٰ قابل غور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب غیر اقوام کے افراد شروع شروع اسلام میں داخل ہوئے تو اپنے آبائی اور موروثی جراثیم اپنے ساتھ لائے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جراثیم کا اثر مسلمان ہونے کے بعد بھی کچھ دنوں ان میں باقی رہا۔ ان ہی آثار میں مذہبی اور اعتقادی اختلاف کا عارضہ بھی تھا۔ اسلام کے سوا آپ کسی مذہب کا جائزہ لیجیے' ایک ایک مذہب میں بیسیوں کمیونیاں سمپر والے فرقے آپ کو نظر آئیں گے اور کیسے فرقے کہ باہم خدا تک ان کے الگ الگ ہیں' کسی کا معبود شیو ہے تو کسی کا وشنو' کوئی مسیح و بیٹے کا پجاری ہے' کوئی باپ کا' کوئی ماں کا' میں نے جیسا کہ کہا کہ ابتدائی صدیوں میں غیر قوموں نے اپنے اس عارضہ کو مسلمانوں میں بھی منتقل کیا۔ نحل والملل کی کتابوں میں ان اسلامی فرقوں کی ایک طویل الذیل فہرست نظر آتی ہے لیکن کیا یہ حال ہمیشہ باقی رہا' واقعہ یہ ہے کہ بتدریج یہ سارے فرقی اختلافات مٹتے مٹتے کچھ ہی دن کے بعد اسلام نے زمین کے اس کرہ پر اپنا یہ حیرت انگیز معجزہ پیش کیا اور شاید ایک حد تک یہ تماشا ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ نسل انسانی کی اتنی بڑی برادری جس کی تعداد چالیس سے ستر کروڑ کے لگ بھگ سمجھی جاتی ہے' ان میں شیعوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا جن کی عددی حیثیت ایک فیصدی بھی مشکل ہی سے ہے' بحمد اللہ ایک عقیدہ ایک خیال ایک قسم کے جذبات رکھتے ہیں یعنی جس کی عام تعبیر اہلسنت والجماعت سے کی جاتی ہے' نادانوں کا گروہ جو یا تو فرقہ کے مفہوم سے ناواقف ہے یا آئمہ اربعہ امام ابوحنیفہ' شافعی' مالک' احمد بن حنبل کے اتباع اور پیروؤں کے باہمی اختلافات کی جو نوعیت ہے' اس سے جاہل ہے۔ بہر حال جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہلسنت والجماعت میں بھی حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی چار فرقے ہیں' کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں باہم عملاً کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن کیسے اختلافات؟ اسی قسم کے جیسے خود حنفیوں میں امام محمد' ابو یوسف' زفر' ابو حنیفہ وغیرہ کے آراء میں اختلاف ہے۔ غور تو کیجیے کہ جب حنفی' شافعی کے پیچھے نمازیں پڑھتا ہے' باہم ایک دوسرے سے بیعت ہوتے ہیں۔ تمام سنی مسلمانوں کے سب سے بڑے شیخ طریقت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی" حنبلی ہیں' مگر حنفی' شافعی' مالکی تمام مسلمانوں کے وہ پیشوا ہیں' کیا جن لوگوں میں اس قسم کے تعلقات ہوں' ان لوگوں کو مختلف فرقوں سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ لوگ کتابوں میں معتزلہ کرامیہ کے ساتھ خدا جانے کن کن فرقوں کا نام پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں وہ اب بھی موجود ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیعہ فرقہ کے سوا تقریباً تمام فرقے صدیاں گزریں کہ ختم ہو چکے' شاید خارجیوں کی تھوڑی تعداد مسقط وغیرہ میں سنا جاتا ہے کہ پائی جاتی ہے' ورنہ بحمد اللہ شیعوں کے سوا سارے مسلمان اس وقت ایک فرقہ اہل سنت والجماعت کی شکل میں موجود ہیں۔ بعض فرقوں مثلاً داؤدیہ' سلیمانیہ' اسماعیلیہ' دروزیہ وغیرہ دراصل شیعوں ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ کل شیعہ طبقہ جب سو میں ایک کی حیثیت رکھتا ہو تو وہ قابل لحاظ کب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس یکسانیت کے پیدا کرنے میں حضرات صوفیا کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے لیکن صوفیہ کا زور جب سے گھٹ رہا ہے یا اغیار کی دسیسہ کاریاں اسے گھٹا رہی ہیں' اب پھر حالات بدل رہے ہیں۔ اسلامی حکومتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ عام مسلمانوں پر اقتدار رکھنے والی نہ روحانی قوتیں باقی ہیں اور نہ سیاسی۔ ایسی حالت میں اب جو کچھ بھی پیش آئے یا آ رہا ہے تو اس کا گلہ کس سے کیجیے' شاخ پر بیٹھ کر جڑوں کو کھودنے والوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ درخت کے ساتھ خود ان کو بھی گرنا پڑے گا۔

خاتمہ

اب آخر میں اسی مرحوم تعلیم و تربیت جو ہندوستان میں جاری تھی' اسی کے بعض دیگر خصوصیتوں کا ذکر کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بلکہ ان سے پہلے حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانیؒ کے بعد ہندوستان کے دینی و علمی کاروبار میں جو نئی ہلچل پیدا ہوئی اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف سے بعض ایسی چیزیں دنیائے علم میں یا کم از کم اسلامی علوم کے حلقہ اثر میں پیش کی گئی ہیں' ان کے متعلق اگر ہمارا یہ ملک امتیاز کا دعویٰ کرے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اسلامی ممالک نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو جس نظر سے دیکھا ہے' اس کا اندازہ آپ کو اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان کے فارسی خطوط کا عربی زبان میں ترجمہ قازان (روس) کے ایک مہاجر مکہ عالم ملا مراد نے کیا' سلطان عبدالحمید خان خلیفۃ المسلمین ترکی مرحوم کے عہد میں بغداد کے ایک عالم جلیل شہاب محمود آلوسی نے نو جلدوں میں "روح المعانی" کے نام سے جو قیمتی معلومات سے مملو تفسیر لکھی' بکثرت اس تفسیر میں آپ کو مجددؒ کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات عربی شکل میں نظر آئیں گے۔

یوں ہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات بدیعہ خصوصاً "حجۃ اللہ البالغہ" کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم اسرار الدین میں یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے۔ متعدد بار مصر میں اس کا شائع ہونا خود اس کتاب کی افادیت کی دلیل ہے اور شاہ صاحب کے بعد مسلسل ہندوستان کا اسلامی علوم کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا' اس نے چودھویں صدی تک پہنچتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کے متعلق ہندوستانی علماء اسلام کے خدمات کو اتنا وزنی کر دیا ہے کہ اس وقت اگر یہ کہا جائے کہ اس باب میں ہندی مسلمانوں کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو اسے شاید مبالغہ نہیں سمجھا جا سکتا' صرف فنِ حدیث ہی میں ان پچھلے دنوں میں جو کام ہندوستان نے کیا ہے' مصر ہو یا عرب' ترکی ہو یا ایران' تیونس ہو یا مراکش کیا اس کے مقابلہ میں اپنا کوئی سرمایہ پیش کر سکتا ہے؟ اجمالاً میں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ہندوستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہو سکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے مقابلہ میں قابل لحاظ قرار

دے سکتے ہوں۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے' وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ باوجود مہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور کوئی تفسیر اس خاص نقطہ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسن قبول اہل علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کے ابتداء میں پیش ہوئی' وہ ہندوستان ہی کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے یعنی اپنی تفسیر ''تصیر الرحمٰن'' نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانہ کی بات ہے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا' ولی اللٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے' میرا اشارہ حضرت الاستاد مولانا حمید الدین الفراہیؒ کی تفسیر ''نظام الفرقان'' کی طرف ہے۔ جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔

بہرحال حدیث کے سوا عربی زبان میں بھی اور عربی سے زیادہ ہندوستان کی جدید مقامی زبان اردو میں ہندوستانی علماء نے اسلامی علوم کے مختلف شعبوں کے متعلق بعض ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ ہندوستان کا اگر اسے طغرائے امتیاز و سرمایہ ناز قرار دیا جائے تو اس کا وہ بجا طور پر حقدار ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسلام کا ایک خاص فلسفہ عہد جدید کی ذہنیتوں کے مطابق جو تیار کیا ہے یا مجلس دار المصنفین اعظم گڑھ نے سیرۃ النبیؐ کی ترتیب جس نئے انداز میں انجام دی ہے بلکہ دے رہی ہے' حتیٰ کہ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ اردو کی اس کتاب کے چند حصوں کا ترجمہ ترکی زبان میں شائع ہو چکا ہے اور عربی میں بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے' ترجمہ کی تیاری ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے' اسی تالیفی ادارہ نے معرفۃ الصحابہ کے علم میں جو ضخیم مجلدات اردو میں شائع کیے ہیں' نیز اس کے سوا دوسرے علمی شعبوں پر جن تحقیقی اور تصنیفی کاموں کا سلسلہ جاری ہے' مشکل سے ان کی نظیر اس وقت آپ کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں نظر آئے گی۔ خود مولانا شبلی مرحوم جو اس ادارہ کے بانی ہیں' شخصی طور پر اسلام کی سیاسی و علمی تاریخ کے متعلق جو مختلف کتابیں انہوں نے لکھی ہیں' انصاف سے اگر کام لیا جائے اور مذہبی اختلاف کو اعتراف فضل میں بلاوجہ دخل نہ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کاموں کا اکثر حصہ ایسا ہے جو اپنی خصوصیات کی بنیاد پر اچھوتا ہے' اردو ہی میں نہیں عربی میں بھی مولوی صاحب مرحوم کے تصنیفات و مقالات امتیازِ خاص کے حصہ دار ہیں۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی ''اسلامیات'' کے متعلق اس وقت تک جتنا اچھا سواد مسلمانوں کے قلم سے منتقل ہوا ہے' اس میں بھی سب سے بڑا حصہ ہندوستان ہی کا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو مصر کے جدید

مصنفین کی کتابوں سے ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر ان کے اقتباسات اور شواہد سید امیر علی اور صلاح الدین خدا بخش مرحوم کی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اہل قلم کے سوا گویا انگریزی بلکہ شاید کسی دوسری مغربی زبان میں بھی دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

بہر حال ہندوستان کے یہ سارے کارنامے جو شاہ ولی اللہؒ کے بعد کے ہیں، جن کی اگر تفصیل کی جائے تو میں نے جو کچھ اجمالاً عرض کیا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کاش! اس کام کو کوئی الگ کر کے دکھاتا کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں حقیقت یہ ہے کہ بالکل نئی ہیں مگر میری بحث کا زیادہ تر تعلق چونکہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم اور اس کے نتائج سے ہے، اس لیے چند ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنہیں بظاہر چنداں اہمیت حاصل نہیں لیکن خصوصیت بہر حال خصوصیت ہے۔ جب اس تعلیم اور اس کے نتائج کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہی ہو رہی ہے تو خصوصیت و امتیاز کے اس پہلو کو کیوں چھوڑ دیا جائے بلکہ ممکن ہے جیسا کہ آئندہ شاید معلوم بھی ہو کہ خصوصیت کے سوا ہندوستان کے ان خصوصی خدمات کی کوئی چاہے تو قیمت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں بارہویں صدی کے وسط میں ایک کام ہندوستان کا وہ ہے جسے ہم چاہیں تو اسلامی علوم کا اسے انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں۔

میں حضرت شیخ محمد علی بن علی التھانویؒ کی کتاب ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ عربی دائرۃ المعارف کے مصنف بستانی نے بھی ''التھانوی'' کے عنوان سے مولانا کی اس کتاب کا وزن دار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے جلد ششم صفحہ 347۔ دائرۃ المعارف البستانی)

افسوس ہے کہ صاحب کتاب کے متعلق باوجود تلاش و کوشش کے اب تک صرف اتنا ان ہی کی کتاب سے معلوم ہو سکا کہ ان کا نام اور نسب تو یہ تھا جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

یقول العبد الضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بسن مولانا اتقی العلماء محمد صابر الفاروقی السنی الحنفی

> ''یعنی عرض کرتا ہے بندہ ضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا محمد صابر جو اتقی العلماء کے لقب سے ملقب تھے (اپنے نسب کی طرف) فاروقی کے لفظ سے اور عقائد و عمل کے لحاظ سے سنی حنفی ہونا اپنے کو بیان کیا ہے۔''

جس سے پتہ چلتا ہے کہ علمی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا۔ غالباً آپ کے خاندان میں قضا کا عہدہ بھی چلا آرہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں سب اپنے والد سے پڑھی تھیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فلما فرغت من تحصیل العلوم العربیه والشرعیه من حضرت جناب استاذی و والدی

> یعنی علوم عربیہ اور دینیہ شرعیہ کی تعلیم سے میں فارغ ہوا اور یہ تعلیم حضرت جناب والد سے میں نے حاصل کی۔

البتہ علوم عقلیہ مثلاً طبعیات' الہیات' ریاضیات وغیرہ فنون کا استاد کی امداد کے بغیر خود مطالعہ کیا ہے، جوان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

شمرت عنان ساق المجدالی اقتناء ذخائر العلوم الحكمية الفلسفيه والحكمية الطبيعه والالهيه والرياضيه كعلم الحساب والهندسه والهيته والاسطرلاب ونحوها فلم يتيسر تحصيلها من الاساتذه فصرفت شطر امن الزمان الى مطالعة مختصراً تها الموجودة عندى فكشفها الله على

''میں علوم حکمیہ 'فلسفیہ اور حکمت طبعی' الٰہی' ریاضی مثلاً حساب' ہندسہ' ہیئت' اسطرلاب وغیرہ کے سیکھنے کے لیے آمادہ ہوا لیکن ان فنون کے اساتذہ سے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ تب میں نے ان فنون کی مختصر کتابوں کا مطالعہ شروع کیا جو ہمارے پاس موجود ہیں' خدا نے ہم پر ان کے مسائل کھول دیئے۔''

بس ان چند اجمالی باتوں کے سوا اور کوئی تفصیلی چیز ان کے متعلق کسی کتاب میں اب تک نہیں ملی ہے۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں بھی ان کا ترجمہ درج نہیں ہے جو محل حیرت ہے۔ دیباچہ کے آخر میں مصنف نے یہ لکھ کر ''احصل الفراغ من تسوید ہاسنتہ الف ومائتہ وثمانیہ وخمسین'' (یعنی 1158ھ میں اس کتاب کی تصنیف سے وہ فارغ ہوئے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بارہویں صدی کے عالم ہیں' گویا حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہمعصروں میں ہیں۔)

بہر حال مصنف کتاب کے حالات نہ معلوم ہوں تو کام تو موجود ہے' میں نہیں جانتا کہ ہندوستان سے پہلے اس قسم کا جامع اور حاوی کام کسی اور اسلامی ملک میں انجام دیا گیا ہے۔[1] زیادہ سے زیادہ دو کتابیں یعنی میر سید شریف کا مختصر رسالہ ''تعریفات'' اور ابوالبقاء کی ''کلیات'' کے سوا مجھے کسی دوسری کتاب کا اس سلسلہ میں حال معلوم نہیں لیکن ''کشاف'' کے مقابلہ میں جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو کتابوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور کلکتہ سے مدت ہوئی ٹائپ کے حروف میں دو ضخیم جلدوں کی شکل میں یہ کتاب شائع کی گئی لیکن اب تقریباً نادر الوجود ہے۔ صرف یہی اس کتاب کی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر قسم کے علوم عقلیہ ونقلیہ جو مسلمانوں میں ان کے زمانہ تک مروج تھے' ان کے اصطلاحات کی تعریفیں کتابوں سے اخذ کر کے اس کتاب میں درج کردی گئی ہیں بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق سے بھی مصنف نے بکثرت کام لیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتاب دنیا کی انسائیکلوپیڈیاؤں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے بشرطیکہ چینی اور جاپانی انسائیکلوپیڈیاؤں کو مستثنیٰ کردیا جائے کیونکہ وہ خصوصاً چینی انسائیکلوپیڈیا تو دیوار چین کی طرح دنیا کے عجائبات میں ہے لیکن ان کے سوا یورپ میں بھی جو انسائیکلوپیڈیائیں لکھی گئی ہیں' جہاں تک میرا خیال ہے التھانوی کی اس عجیب وغریب کتاب کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ انگریزی' فرنچ وغیرہ مغربی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا کا رواج اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہوا۔

البتہ فارسی میں ایک کتاب ''نفائس الفنون فی عرائس الفنون'' ضرور ایسی کتاب ہے جسے ''حاویات'' اور محیطات کے سلسلہ میں جگہ دی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی ''کشاف الاصطلاحات والفنون'' کے مقابلہ میں یہ کتاب نہیں آسکتی۔ امام

رازی نے بھی ایک کتاب ''حدائق النوار فی حقائق الاسرار'' نامی ترکی بادشاہ کے نام سے لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ساٹھ علوم کے مسائل جمع کر دیئے گئے ہیں مگر اسی کے ساتھ غالباً اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان (جس سے میں کشمیر وغیرہ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتا) کے ایک کشمیری عالم شیخ الاسلام مفتی قوام الدین محمد جن کی وفات 1219ھ میں ہوئی ہے' صاحب ''حدائق الحنفیہ'' نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ نے ''کتاب صحائف سلطانی ساٹھ علم میں تصنیف کی۔'' (صفحہ 464)

واللہ اعلم بالصواب یہ امام رازی کی کتاب سے ماخوذ ہے یا شیخ الاسلام نے کوئی الگ کتاب لکھی ہے۔ بہر حال ہے تو ہندوستان کی یہ بھی ایک چیز۔ اس طرح واجد علی خان کی کتاب ''کشاف الاصطلاحات والفنون'' کے بعد دوسری چیزیں اس سلسلہ میں جو قابل ذکر ہے' وہ وہی ہے جس کے متعلق میں نے پہلے بھی وعدہ کیا ہے' فیضی کی غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام فیضی اور ابوالفضل دونوں کے پدر بزرگوار کے دینی پہلو کے متعلق جو میرے خیالات ہیں' مختلف حیثیتوں سے بغیر کتمان کے میں اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں لیکن

''عیبہا جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو''

ناانصافی ہوتی' اگر میں اس کے ذکر سے لاپروائی برتتا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی۔ اشارہ ملا ابوالفیض فیضی کی مشہور تفسیر ''سواطع الالہام'' کی طرف کر رہا ہوں' یوں تو اہل علم میں ایسا کون ہوگا جو ان کی اس تفسیر اور اس کی خصوصت خاصہ سے واقف نہ ہو' میں نے بھی شاید اشارے اس کی طرف کیے ہیں لیکن اس تفصیل کے پیچھے جو واقعات ہیں' ان پر لوگوں کی کم نظر گئی۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہوں گے کہ ملا فیضی نے عربی زبان میں کامل تیس پاروں کی تفسیر ایسے الفاظ میں کی ہے جن میں ہر لفظ غیر منقوط ہے۔ یہ تفسیر مدت ہوئی چھپ چکی ہے۔ اہل علم کی نظروں سے عموماً گذرتی رہتی ہے۔ یوں تو ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی تفسیر کا کام ابتداء اسلام سے اس وقت تک جاری ہے اور ٹھیک جس طرح حق تعالیٰ کے کام کے مظاہر کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے اور ہر دن اس عالم کون کے نئے ناموسِ فطرت کے نئے قانون کا علم بنی آدم کو ہو رہا ہے' باوجود اس کے طے شدہ ہے کہ جو کچھ جانا گیا ہے' وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی نہیں جانا گیا ہے۔ بجنسہٖ یہی حال اللہ کے کلام کا بھی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں' جلد ہا جلد میں اس کی تفسیر لکھ رہے ہیں لیکن ہر قرآن پڑھنے والے کو کم از کم اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ اس کتاب کو جتنا سمجھا گیا ہے' اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں سمجھا گیا ہے' خواہ جو نہیں سمجھایا گیا ہے وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور روایت

لاتنقضی عجائبه ولا یخلق وعلی کثرة الود

''قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے اور بار بار دہرانے سے وہ پرانی نہیں ہو سکتی۔''

میں قرآن کی اس لامحدودیت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ اپنے ایک رسالہ ''کائنات روحانی'' میں مدت ہوئی' بعض

نقاط خیال کا اظہار کیا گیا تھا۔ خیر یہ ایک مستقل بحث ہے' اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ مذہبی اور دینی حیثیت سے فیضی اور اس کے طرزِ عمل کے متعلق جو رائے بھی رکھی جائے اور ملا عبدالقادر نے جو حالات اس شخص کے بیان کیے ہیں' کون ایسا مسلمان ہے جو اس کے بعد بھی اپنے دل میں فیضی کے متعلق کوئی گنجائش پا سکتا ہے لیکن میری گفتگو اس وقت صرف علمی اور ادبی حیثیت سے ہے اور اسی لحاظ سے ملا فیضی کے اس کام کو ہندوستانی تعلیم کے نتائج میں کم از کم میرے نزدیک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس تفسیر کی ضخامت پچھتر جز ہے اور یہ واقعہ ہے۔ مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود مُلا نے یہ کمال کیا ہے کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق عموماً جو کچھ لکھا جاتا ہے' اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہے' ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہے۔ جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بھی اپنے زمانہ تک اس کا دعویٰ کیا ہے۔

''کہ دریں ہزار سال پیشتر ما ہیچ مستعدے رامیسر نہ شد۔''

اور اس سے بھی طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ پچھتر جزوں کا یہ ضخیم مجموعہ کتنے دنوں میں تیار ہوا ہے' مولانا لکھتے ہیں۔

''طرفہ ایں کہ ایں چنیں کار دشوار در عرض دو سال از مبدء (آغاز) با منتہیٰ (ختم) رسانید۔''

ہندوستان کے نظامِ تعلیم کا دماغی ارتقاء پر کیا اثر پڑتا تھا۔ ملا فیضی کے ذاتی عقائد کچھ ہوں لیکن ان کی اس تفسیر کو تو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے یا دو سال کی مختصر مدت میں ایسے عجیب وغریب کام کا پورا ہونا کیا کوئی معمولی بات ہے' رہ گئی یہ بات کہ آخر اس ادبی زور جس کا عملاً ظاہر ہے کہ ایک ''فخریہ قصیدہ'' سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں ہے' اس کے محرکات عقبی کیا ہیں؟

واللہ اعلم بالصواب' پہلی بات تو میری سمجھ میں وہی آتی ہے۔ جس کا اظہار ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں کیا ہے۔ ابوالفضل نے ایک مستقل باب اپنی اس کتاب ''ہندوؤں کے علوم وفنون'' کی تفصیل کے لیے مختص کیا ہے اور اس کے ذیل میں اس نے سنسکرت زبان کی نحو وصرف' قرأۃ' بدیع' بلاغت وغیرہ وغیرہ مختلف علوم کا ذکر کیا ہے۔ وہیں لکھتے لکھتے آخر میں اس کے قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں۔

''پیش از اں کہ بدیں زبان (سنسکرت) سخنے آشنا شود۔''

یعنی سنسکرت زبان کا تھوڑا بہت علم میں نے جو حاصل کیا ہے' اس سے پہلے

''چناں می دانست کہ ضابطہ لغت عرب بے ہمتا باشد۔''

مگر جب سنسکرت زبان سے آگاہی حاصل ہوئی تو آپ فرماتے ہیں۔

''اکنوں چناں پیدائی گرفت (ظاہر شد) کہ ہندی نژاداں فراواں کوشش بجا آوردہ اند وکار را استوار ساختہ۔''

گویا عربی زبان جو عہدِ اکبری میں ہر قسم کی تحقیر وتوہین کی مستحق قرار پا چکی تھی' اس کے مقابلہ میں ایک اور باضابطہ زبان کا سراغ لگایا گیا' گو ابوالفضل نے کھل کر تو اظہار نہیں کیا ہے لیکن انداز کا رجحان بتا رہا ہے کہ سنسکرت کو عربی کے مقابلہ میں فضیلت بخشی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگ جو سنسکرت زبان سے قطعاً ناآشنا ہیں' ابوالفضل کے اس دعوے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں لیکن جس خاندان سے اس دعوے کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے' شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی گھر

سے عربی زبان کے متعلق کم از کم عظیم سرمایہ داری کا جو ثبوت فیضی کی اس تفسیر سے ملتا ہے، میں تو گو نہ ابوالفضل کی اس تعریض کا اسے ایک قدرتی جواب سمجھتا ہوں بلکہ عہد اکبری میں بھی ''عربی الفاظ'' سے فارسی زبان کی العیاذ باللہ تطہیر کی جو خفیہ تحریک اٹھی تھی، جس کے ثبوت میں علاوہ ملا عبدالقادر کے بیان کے خود ابوالفضل کی طرز تحریر کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اپنی پوری کتاب میں گویا قسم کھائے ہوئے ہے کہ سمتوں کے بیان میں مغرب اور مشرق کے عام الفاظ استعمال نہیں کرے گا بلکہ اس زمانہ میں ٹھیک جس طرح پچھمی اور اُتری وغیرہ کے الفاظ سے شائستہ کانوں کو مجروح کیا جا رہا ہے، ابوالفضل بھی مغرب کی جگہ باختر اور مشرق کی جگہ خاور کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ شمال اور جنوب کے متعلق فارسی میں جو الفاظ تھے، شاید وہ اتنے نسیاً منسیا ہو گئے کہ ابوالفضل کو غالباً لغتوں میں بھی اس کا پتہ نہ چلا، اس لیے مجبوراً شمال و جنوب کو استعمال کرتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ کسی ملک کی مشرقی حد کو ''خاور رویہ'' مغربی سرحد کو ''باختر رویہ'' کہنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ ''مرکز'' کی جگہ التزاماً ''بن گاہ'' کی بھونڈی ترکیب شاید اسی کی تراشی ہوئی ہے اور یہی حال اس کا دوسرے عربی الفاظ کے متعلق ہے۔ یقیناً اس تنگ دلی کا یہ ایک زندہ جواب ہے، کسی زبان کا سرمایہ اتنا وسیع ہو کہ وہ سارے معانی اور مطالب جو عربی تفسیروں کی ضخیم مجلدات میں بیان کیے گئے ہیں، غیر منقوط الفاظ میں ادا کر دیے جائیں، کیا یہ معمولی بات ہے۔ دوسری زبانوں میں اس قسم کے التزامات شاید چند سطروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہے، تاہم بہرحال وہ ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کا آدمی تھا۔ بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہے جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر بات بھی ہے۔ ''مآثر الامراء'' میں اکبری عہد کے ایک عجیب واقعہ کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ جس زمانہ میں اکبر کے دربار میں دنیا کے تمام مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کو مدعو کر کے ان کے مذہب کی حقیقت کی تحقیق ہو رہی تھی، ان ہی دنوں میں پارسیوں کے ایک پیشوا جس کا نام آذر کیوان مجوسی تھا، اکبر نے پٹنہ [2] سے اسے طلب کیا۔ کیوان خود تو نہیں آیا لیکن ایک کتاب لکھ کر اکبر کے پاس بھیجی جس کی خصوصیت ''مآثر الامراء'' میں یہ بیان کی گئی ہے۔

> ''کیوان مجوسی کتابے ہر چہار جز بر در اکبر فرستاد اہر سطرش پارسی بحت (یعنی شدھ فارسی تھی) و تصحیف آن عربی، و چوں قلب می کردند ترکی و مصحف آن ہندی۔''

مطلب یہ ہے کہ اصل کتاب کو سیدھے سادھے طور پر اگر پڑھیے تو خالص فارسی جس میں عربی الفاظ کا میل نہ ہو، آپ کو نظر آئے گی لیکن اسی عبارت کے الفاظ کی تصحیف کر دیجیے یعنی نقطوں کو حذف کر کے ان ہی الفاظ کو ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو بجائے فارسی کے آپ کو یہ کتاب عربی زبان کی کتاب معلوم ہوگی، پھر ان الفاظ کو الٹ دیجیے یعنی حروف کو الٹ کر بنائیے جسے صنعت قلب کہتے ہیں تو اب یہ ترکی زبان کی کتاب ہو جاتی ہے۔ ان مقلوبہ الفاظ کی اس کے بعد تصحیف کیجیے یعنی وہی نقطوں کو ادل بدل کر کے ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو اب یہی کتاب آپ کو ہندی زبان کی کتاب نظر آئے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیوان نے اپنی کتاب کی ان ہی خصوصیات کو اپنے مذہب کی صداقت کی دلیل قرار دیا تھا

کیونکہ "ماثر الامراء" میں اسی کے بعد یہ فقرہ بھی درج ہے۔

"شیخ ابوالفضل می گفت 'ایں نامہ افصح از قرآن ست۔" (ماثر۔ جلد2 صفحہ 386)

اس ابوالجہل کے نزدیک اگر اسی لفظی کرتب کا نام فصاحت ہے تو آپ کی فضیلت کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ منشیانہ بازیگری جس کا کسی زمانہ میں پرانے مکتبوں میں رواج تھا"[3] اس شخص کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ اسے فصاحت قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کی فصاحت پر اسے ترجیح دیتے ہیں۔

میرے پاس اس کا کوئی بیّن تصریحی ثبوت تو نہیں ہے لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آذر کیوان کی اس کتاب کی لفظی "صناعیوں" نے اگر واقع میں ایسی کوئی کتاب اس نے لکھ کر بھیجی بھی تھی' اس زمانہ میں کچھ خاص اہمیت حاصل کی۔ شاید فیضی کی اگر دینی نہیں تو نسلی اور علمی حمیت کی رگ پھڑک[4] اٹھی اور اسی کتاب کے مقابلہ میں ایک دوسری لفظی صنعت کا التزام کر کے اس نے یہ تفسیر لکھی' اب خواہ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو اور فیضی کے سامنے آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ ہو یا نہ ہو لیکن میں تو اس کو بھی قرآن کی طرف سے ایک غیبی جواب سمجھوں گا کہ اصل قرآن کا مقابلہ تو خیر کوئی کیا کر سکتا ہے' جس طرح خدا کے بنائے ہوئے کسی پتہ کا بھی جواب ہو بہو جیسا کہ وہ ہے آسمان و زمین کی کوئی طاقت پیش نہیں کر سکتی' یہی چیز قدرتی اور مصنوعی امور میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن کے قدرتی ہونے کی دلیل میں متعدد جگہ اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس جیسا کلام نہیں بنا سکتا مگر فیضی کے کام نے یہ ثابت کر دیا کہ آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ قرآن کی ایک تفسیر سے کیا جا سکتا ہے جو معمولی آدمی کی لکھی ہوئی ہے۔ آخر آذر کیوان کی کتاب کی اس سے زیادہ تو کوئی خصوصیت نہیں کہ انشاء یا کتابت کی چند صفتوں کے التزام کے ساتھ چار جز کا ایک رسالہ اس نے لکھ دیا۔ لیجیے اسی قسم کی انشائی صنعت میں چار جز نہیں پچھتر جز کی تفسیر تیار ہے۔

فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" کے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے جیسا کہ میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ اس تفسیر کے چند اجزاء بطور نمونے کے فیضی نے اسلامی ممالک میں بھی روانہ کیے تھے۔ اگرچہ ملا عبدالقادر نے رفیعی شاعر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اکبر اور دوسرے امراء سے انعام و اکرام لے کر رفیعی جب اپنے وطن کاشان واپس جا رہا تھا اور فیضی نے اس کے ساتھ

"چند جز راز تفسیر بے نقط بہ توقیعات (تقریظات) فاضل و دیوان بولایت برائے شہرت فرستادہ بود۔"

لیکن خدا جانے کیا نحوست پیش آئی۔ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ جہاز پر سوار ہو کر رفیعی جب ایران جا رہا تھا تو:

"چوں از ہرمز (جزیرہ) گذشت نزدیک بہ کچ و مکران رسید کشتی او بہ تباہی شد ہر چہ داشت بہ تاراج رفت۔" (صفحہ 232)

اور اسی ہر چہ داشت میں فیضی بیچارے کا سرمایہ شہرت بھی تھا۔ وہ بھی دریا برد ہو گیا مگر ملا صاحب ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے اپنی کتابوں کی نقل کے لیے ایک سررشتہ قائم کر رکھا تھا۔

''زرہائے جاگیر صرف کتاب و تذہیب (مثلاً و مذہب کرنے میں) تصانیف خود ساختہ۔'' (320 صفحہ 285)

ایک ایک کتاب کے کتنے نسخے فیضی نے تیار کرائے تھے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ مرنے کے بعد جب اس کا کتب خانہ شاہی خزانہ میں منتقل ہو رہا تھا تو ملا صاحب نے لکھا ہے

''اوران کتابوں میں ''صد و یک کتاب نل دمن بود۔'' (جلد 3 صفحہ 306)

یعنی صرف ''مثنوی نل دمن'' کے ایک سو ایک نسخے تو وہ تھے جو تقسیم و اشاعت کے بعد کتب خانہ میں بچ گئے تھے' ایسی صورت میں کیا تعجب ہے کہ رفیعی کے ساتھ جو نمونہ تفسیر کا بھیجا گیا تھا' وہ ڈوب گیا ہو مگر اور ذرائع سے جو نسخے اسلامی ممالک میں بھیجے گئے تھے' وہ وہاں پہنچ گئے ہوں۔ اگر چہ اس تفسیر کا ذکر باہر کے علماء کی کتابوں میں ہم نہیں پاتے مگر جس کی ایک ایک کتاب کے سو سو نسخے بانٹنے اور تقسیم کرنے کے بعد باقی بچ جاتے ہوں جو اپنی جاگیر کی آمدنی کا بیش قرار حصہ صرف اپنی کتابوں کی کتابت و زیبائش پر خرچ کرتا ہو' اس کے متعلق یہ کیوں سمجھا جائے کہ اگر ایک نقل اس کی ڈوب گئی تو دوسری نقلیں اس کی کتابوں کی اسلامی ممالک میں نہ پہنچی ہوں گی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ دن ہوئے قسطنطنیہ سے ایک تفسیر ''درر الاسرار'' نامی چھپ کر آئی ہے۔ مصنف اس کے سید محمود آفندی ہیں' دمشق کے رہنے والے ہیں۔ اپنی اس تفسیر میں محمود آفندی نے بھی اسی صنعت اہمال کا التزام کیا ہے یعنی پوری تفسیر غیر منقوط ہے۔ سلطان عبدالمجید خاں خلیفۃ المسلمین مرحوم کے نام یہ کتاب معنون ہے۔ سنہ تالیف 1242ھ ہے یعنی سو سال سے کچھ ہی زیادہ زمانہ گذرا ہے۔

ظاہر ہے کہ فیضی کی تفسیر کے دو سو سال بعد یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ چونکہ فیضی سے پہلے اس صنعت میں تفسیر لکھنے کا جہاں تک میں جانتا ہوں' رواج نہ تھا۔ مفتی عنایت احمد نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا قصد اس صفت کے ساتھ کہ مسئلہ بھی بے نقط ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام سے کی جائے۔ تفسیر میں ''**وعلم الآدم الاسماء کلها**'' کی آیت اور حدیث میں **کل مسکر حرام** رواہ مسلم منتخب فرمائی تھی' بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ سفر حج میں مسودہ مصنف کے ساتھ سمندر کے سپرد ہو گیا۔ کیا ایسی صورت میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ شام کے ایک عالم کے دل میں اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ ہندوستان کے ایک مُلا کے کام کو دیکھ کر پیدا ہوا تو کوئی دور از قیاس بات ہو سکتی ہے۔ میں نے فیضی کی تفسیر کے بعض مقامات کا مقابلہ محمود آفندی کی تفسیر سے کیا ہے۔ شاید دوسروں کو مجھ سے اختلاف ہو لیکن اس مقابلہ سے مجھ پر تو یہی ظاہر ہوا کہ عموماً اظہار مطالب میں الفاظ کے ان ہی ذخیروں سے محمود آفندی نے بھی کام لیا ہے' جن سے فیضی پہلے کام لے چکا تھا۔ فرق دونوں میں اگر کچھ نظر آیا تو صرف اجمال اور تفصیل کا۔ فیضی نے جس مطلب کو دس سطروں میں مثلاً ادا کیا ہے' محمود آفندی نے اسی خیال کو مثلاً دو تین سطروں میں سمیٹ لیا ہے اور اسی چیز نے دونوں کتابوں میں فرق پیدا کر دیا ہے ورنہ اگر محمود آفندی بھی اسی تفصیل سے کام لیتے تو دونوں کتابوں میں اس وقت شاید امتیاز مشکل ہو جاتا۔

جن لوگوں کو بایزید یلدرم عثمانی ترکی بادشاہ اور تیمور کے تعلقات کا علم ہے اور جو عثمانی خانوادۂ شاہی اور تیموری

خاندان کی موروثی چشمکوں اور رقابتوں سے واقف ہیں' وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تیموری دربار کے ایک مُلا کے کام کا جواب ''اخوندروم''[5] کے دربار کے عالم کی طرف سے اگر دیا جائے تو یہ چنداں محل تعجب نہیں ہوسکتا۔

بہرحال سید محمود آفندی کی بے نقط تفسیر ''دررالاسرار'' کے باوجود پھر بھی اس قسم کی تفسیر کی اولیت کا سہرا ہندوستانی نظام تعلیم کے سر سے اتارا نہیں جاسکتا بلکہ اگر واقعہ یہی ہے کہ بایزید یلدرم کے وارثوں نے تیمور کے وارثوں کو اس طریقہ سے خاموش جواب دیا ہے تو یہ بات کہ فیضی کے کارنامے کے ساتھ بیرون ہند کے اسلامی ممالک نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا' درست نہیں رہتا۔

خیر فیضی کی تفسیر سواطع تو گونہ ایک انشائی کمال کا اظہار ہے۔ گو ضمناً اس ذریعہ سے اس زبان کی عجیب وغریب حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ایک زندہ ثبوت مہیا ہو جاتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام کرہ زمین کی ساری نسلوں اور قوموں کے لیے نازل کیا گیا ہے اور رہتی دنیا تک اس کو کافی ووافی قرار دیا گیا۔

اسی سلسلہ میں ہندوستانی نظام تعلیم کے ایک اور نتیجہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا کی کسی ملک اسلامی ہو یا غیر اسلامی اور ان ممالک کی کسی زبان میں کسی دینی یا دنیوی علم یا فن کے مسائل کو اس طریقہ کے التزام کے ساتھ ادا کیا گیا ہو کہ فن کا ہر مسئلہ خود ہی اس مسئلہ کی مثال بھی ہو۔

لیکن عوام تو خیر کیا واقف ہو سکتے ہیں شرح مُلا جامی کے پڑھنے والے طلباء کہیں کہیں اسی کتاب میں کافیہ کی شرح ہندی کا تذکرہ پاتے ہیں۔ اسی شرح ہندی کے مصنف [7] ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ نے ایک کتاب ''الارشاد'' نامی علم نحو میں لکھی تھی' عجب کتاب مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

''ارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کردہ وطرزے تازہ برروئے کار آوردہ۔'' (مآثر۔ صفحہ 189)

یہ کتاب چھپ چکی ہے لیکن اب نایاب ہے۔ غالباً کسی زمانہ میں درسی نصاب میں شریک تھی۔ محدث دہلوی نے اپنے حالات میں لکھا ہے' اپنے تعلیمی نصاب کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

''از مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد'' (اخبار۔ صفحہ 311)

اغلب یہی ہے کہ ارشاد سے مراد ملک العلماء کا یہی ''متن عجیب'' ہے۔

اس زمانہ کے علمی ماحول کی ایک اور نادر دلچسپ چیز جسے لوگوں نے شاید کم کیا' کچھ اہمیت نہ دی' وہ اس ملک کے ایک نہیں بلکہ متعدد اہل علم کا ایک عجب کارنامہ ہے۔ شاید لوگوں تک یہ بات پہنچی ہوگی کہ ابن حاجب کی ''کافیہ'' سے ہندوستانی مولویوں نے اپنی عقیدت اس حد تک بڑھادی تھی کہ بجائے علم نحو کے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کافیہ نحو نہیں بلکہ تصوف اور حقائق کی کتاب ہے۔[8] صرف دعویٰ نہیں بلکہ عملاً کافیہ کے الفاظ کی شرح اسی طریقہ سے کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے صاحب ''سبع سنابل'' میر عبدالواحد بلگرامی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

''از نوادر تصانیف او شرح کافیہ ابن حاجب است بطور حقائق (یعنی تصوف) تا مبحث غیر منصرف۔''

یعنی غیر منصرف کی بحث تک کافیہ کے جتنے مسائل ہیں' سب کو بجائے نحو کے معارف وحقائق کی تعبیر قرار دے کر میر

صاحب نے اسی التزام کے ساتھ اس کی شرح لکھ بھی ڈالی اور کچھ میر صاحب ہی اس کام میں متفرد نہیں ہیں۔ مولانا آزاد ہی لکھتے ہیں۔

''مخفی نماند کہ دو شرح بعبارت عربی و فارسی تا مبحث غیر منصرف بطور حقائق در نظر فقیر آمدہ۔''

پھر ان دونوں شرحوں' عربی و فارسی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''نام شارح اول میر ابوالبقا است ظاہر معاصر میر باشد و نام شارح فارسی ملا موہن بہاری ست کہ از میر متاخرست۔'' (مآثر۔ صفحہ 32)

میر ابوالبقاء کا حال تو معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں اور ملا موہنؒ بہاری کا ذکر تو پہلے بھی آ چکا ہے کہ حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ کے یہی استاد (9) تھے۔

اپنی طالب العلمی کے دنوں میں ''کافیہ'' کی ان صوفیانہ شرحوں کا ذکر جب میں نے سنا تھا تو قدرتی طور پر جیسا کہ چاہیے یہ کچھ عجیب بے معنی سی بات معلوم ہوئی۔ اس وقت بجز ایک لاحاصل کام کے اس کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آیا اور میں خیال کرتا ہوں کہ جو بھی یہ سنے گا' حیرت کے ساتھ اس کا بھی یہی خیال ہوگا کہ بیٹھے بٹھائے ان لوگوں کو یہ کیا سوجھی' مگر دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں ہوتی' اس کا تجربہ مجھے شرح کے اسی طریقہ کے متعلق اس وقت ہوا جب مدت ہوئی دارالعلوم دیو بند کے قیام کے زمانہ میں دہلی آنا ہوا۔ یہاں اس زمانہ میں قرآن کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارہ کے بعض طلبہ سے ملاقات ہوئی' گفتگو کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اس ادارہ میں قرآنِ مجید کو سیاسی نقطہ نظر سے پڑھایا جاتا ہے۔ صاحب تفسیر یورپ کے موجودہ پارلیمانی نظام' ووٹنگ' حزب الاختلاف' ریزولیشن وغیرہ وغیرہ ساری باتیں قرآن سے ثابت کرتے ہیں' جونہی کہ یہ بات میں نے سنی معاً میرا خیال ''کافیہ'' کی اس صوفیانہ شرح کی طرف منتقل ہوگیا۔ میں نے خود تو ان شروح کو دیکھا نہیں تھا لیکن جن صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی' ان سے میں نے عرض کیا کہ اگر الفاظ سے معانی پیدا کرنے میں اتنی آزادی برتی جائے گی تو بقول اکبر مرحوم

''مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے''

ہر مدعا جو بھی پیش کیا جائے' اپنی تفسیر کے زور سے اس مدعا کو قرآن سے نکال کر دکھایا جانے لگے تو لیجیے میں آپ کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ ''کافیہ'' نحو کی نہیں بلکہ ''النبوات'' کی کتاب ہے۔ میں نے معاً اسی کے ساتھ مطلب برآری کا کام شروع کر دیا۔ بات تو لمبی تھی لیکن کافیہ کے ابتدائی فقروں کا جو مطلب میں نے عرض کیا تھا' وہ غالباً یہ تھا ''الکلمہ'' سے مراد النبی ہے۔ عقلاً تو اس لیے کہ کلمہ بھی ایک پوشیدہ مافی الضمیر حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ یوں ہی حق تعالیٰ کی غیبی حقیقت کی ترجمانی نبی کرتے ہیں اور نقلاً اس کی تائید قرآن ہی سے ہوتی ہے کہ مسیح علیہ السلام جو اللہ کے نبی تھے' ان کو کلمتہ منہ کہا گیا ہے۔ قرآن میں **لاغلبن انا ورسلی** بھی ہے اور ان **کلمة الله هی العلیاء** بھی۔ معلوم ہوا کہ کلمتہ اللہ سے یہاں رسل ہی مراد ہیں جن کو غلبہ عطا کیا جاتا ہے۔ آگے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ عالم علوی سے طرف عالم سفلی کے نبی ملفوظ ہوتے ہیں یعنی پھینکے جاتے ہیں۔ ان کی حقیقی غرض چونکہ **مالکم من الله غیرہ** اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کی دعوت ہی ہوتی ہے' اس لیے **وضع لمعنی مفرد** (بنایا گیا ایک مفرد معنی کے لیے) یعنی کلمہ توحید اور معبود کی انفرادیت کا

اعلان یہی نبی کا منصب حقیقی ہے جس کے لیے وہ بنائے جاتے ہیں یوں ہی میں نے کہا کہ ایک قسم انبیاء کی تو وہ ہوتی ہے جن کی نبوت زمان ومکاں کے قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ جیسے آنحضرتؐ کی نبوت عامہ ہے۔ سمو اور بلندی کی وجہ سے ان کو اسم کہہ سکتے ہیں۔ بعضوں کی نبوت کا تعلق کسی خاص قرن اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جیسے انبیاء سابقین اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نبوت کسی دوسرے نبی کی نبوت سے ملے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت ہارون کی نبوت کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے ہے۔ پس یوں فعل، حرف اور اسم تینوں قسمیں النبی یعنی الکلمہ کی پیدا ہو جاتی ہیں۔ الی غیر ذلک من الخرافات۔ وہ صاحب میرا منہ تاکنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی بڑی ذہانت کی بات نہیں ہے اور نہ یہ تفسیر ہے بلکہ تحریف ہی تغییر ہے۔ (10)

واقعہ یہ ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ''کافیہ'' کی صوفیانہ شرح کی گوش زدہ بات ہی اس دن مجھے کام آگئی۔ اس وقت سے علماء ہند کے اس عجیب وغریب طرزِ عمل کی بے حاصلی کا جو خیال تھا' وہ بدل گیا۔

دل سوچنے لگا کہ ہندوستان کے علماء کو کسی کتاب کی ایسی شرح جس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ ہو' آخر سوجھی تو کیوں سوجھی۔ بیرون ہند کے علمی حلقوں میں اس نوعیت کی شروح کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا کہ سمجھا جاتا تقلید میں ایسا کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ تو سراسر ان کا اجتہاد اور ابتدائی طریقہ ہے جس کا کوئی نمونہ کم ازکم میرے لیے علم کی حد تک اس سے پہلے اسلامی ادبیات میں نہیں ملتا۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال آتا تھا کہ میر ابوالبقاء کے سوا جن کی حقیقت کا صحیح علم اب تک حاصل نہ ہوسکا' باقی دو صاحب یعنی میر عبدالواحد بلگرامی کا شمار تو اپنے عہد کے ممتاز اور سربرآوردہ بزرگوں میں ہے۔ ایک مدت تک ان کی کتاب سبع سنابل علم ومعرفت کے اونچے حلقوں میں خاص قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ مولانا آزاد نے براہ راست شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی زبانی ایک قصہ (11) نقل کرنے کے بعد یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

''سنابل تصنیف اودر جناب حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم مقبول افتاد۔'' (صفحہ 30)

اکبر جیسا بدعقیدہ آدمی بھی میر صاحب سے متاثر ہوتا تھا۔ پانچ سو بیگہ زمین بطور جاگیر بلگرام میں میر صاحب کو اکبر ہی نے عطا کی تھی اور ملا موہن بہاری کی عظمت وجلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت نے ہندی اسلام کو وہ فرزند سعید عطا کیا جس کا نام محی الملۃ والدین اورنگزیب عالمگیرؒ ہے۔ آج اس ملک میں مسلمانوں کا وجود مختلف وجوہ سے اسی کی حمیت دینی اور حق پژوہی کی رہین منت ہے۔ (12)

پھر کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان فاضلوں کا واقعی یہ خیال تھا کہ ابنِ حاجب نے ''کافیہ'' میں بجائے نحوی مسائل کے صوفیانہ حقائق ومعارف بیان کیے ہیں۔ اگر یہ بات نہ تھی بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے ''کافیہ'' کے الفاظ میں صوفیانہ خیالات بھرنے کی کوشش کی تھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس کا حاصل کیا ہوسکتا ہے۔ ان بزرگوں کو حقائق و معارف ہی کے مسائل بیان کرنے تھے تو اسے ''کافیہ'' کی شرح بنائے بغیر یوں بھی لکھ سکتے تھے یا کم ازکم تصوف کی بیسیوں کتابیں سینکڑوں متون مل سکتے تھے۔ ان ہی کو بہانہ بنا کر دل کا ارمان نکالتے' یہ بے جوڑ ان میل رشتہ ''کافیہ'' اور تصوف میں قائم کرنے کی کیا حاجت تھی؟

واللہ اعلم کوئی تصریحی شہادت تو اس باب میں مجھے نہیں مل رہی لیکن دلی کا جو قصہ میں نے سنایا' اسی قصہ کی بنیاد پر میرا ذہن ادھر جاتا ہے کہ شاید ان بزرگوں پر بھی کوئی اس قسم کی افتاد پڑی تھی جس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ ورسولؐ کے الفاظ کو آڑ بنا کر جو لوگ اپنے خود تراشیدہ دماغی پیداواروں کو دنیا میں پھیرانا چاہتے ہیں اور اسی کو اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے ہیں کہ جس لفظ سے جس معنی اور جس مطلب کو چاہوں لوگوں کو نچوڑ کر بتا سکتا ہوں' گویا ایک قسم کا جادو کرتے ہیں' گائے کے تھن سے عرق انار اور انار کے پھل سے گائے کا دودھ نچوڑتے ہیں۔

دل سوچتا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق تو نہیں کہتا لیکن ہندوستان کا علمی دماغ موجودہ زمانہ سے پہلے تو کبھی اس آفت میں مبتلا نہیں ہوا تھا جس کا گذشتہ چالیس پچاس سال یا یوں کہیے کہ مغرب زدگی کے آسیب میں مبتلا ہونے اور یورپ کی علمی للکاروں سے مرعوب ہونے کے بعد شکار ہوا ہے۔ قرآن سے ثابت کیا گیا کہ زندہ مستقل ہستیوں کا نہیں بلکہ عناصر کی عام قوتوں کا نام ملائکہ ہے۔ معجزہ کا ظہور ناممکن ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک جنت اور دوزخ کا جو مطلب بارہ تیرہ سو سال سے سمجھا جاتا ہے' قرآن کی رو سے وہ قطعاً غلط ہے اور ان تمام قرآنی الفاظ سے وہی مراد ہے جو یورپ ان مسائل میں اپنا خیال رکھتا ہے۔ خدا کا پیغام لے کر جبرئیل نامی فرشتہ کسی انسان پر نازل نہیں ہو سکتا' عقل کا بھی یہی تقاضا ہے اور قرآن بھی اسی کا مدعی ہے۔

انیسویں صدی کی یہی چیز اس زمانہ میں اور آگے بڑھی' تا ایں کہ سرزمین ہند کے پیدا ہونے والوں میں سے بعض صاحبوں نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ تمہارے قرآن میں ہمارا ذکر موجود تھا اور تم لوگ اب تک اس کو عرب کے رسول محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر منطبق کرتے رہے۔ خاتم النبیین کے دعویٰ کو جس قرآن نے سب سے پہلے دنیا کے آگے پیش کیا تھا' عرب وعجم کے مسلمان اس کے جو معنی سمجھتے تھے' اسی معنی کو ''خاتم النبیین'' کے الفاظ سے پوچھ کر صاف کیا گیا اور اپنی طرف سے خود ایک مستقل معنی چھیل چھال کر بنائے گئے اور اسی خود ساختہ معنی پر ''خاتم النبیین'' کا قالب کس دیا گیا۔

بدتمیزی کا یہی طوفان بالآخر بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ کر رہا کہ دنیا کی وہ ساری قومیں جو قرآن کو اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ کو اللہ کا رسول مانتی ہیں' ثابت کیا گیا اور قرآنی آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہ سب کے سب کافر ہیں' جہنمی ہیں لیکن قرآن خداوند تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اور محمد اللہ کے سچے رسول ہیں۔ جنہیں ان دونوں باتوں سے انکار اور قطعاً انکار ہے' ثابت کیا گیا۔ قرآن کے نصوص اور آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہی لوگ مومن اور مسلم ہیں' خدا کی رضامندی ان ہی کے لیے ہے۔ جنت کے وارث یہی لوگ ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ تماشے جن شکلوں میں بھی پیش ہو رہے ہیں' یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب تعلیم کے نظام کو دینی اور دنیوی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا اور دماغ کی بیداری کے ساتھ دل کی جانب سے صرف غفلت ہی نہیں برتی گئی بلکہ اس کو غافل بنانے اور سلا دینے کی جو ممکن ترکیبیں تھیں' وہ اختیار کی گئیں۔

لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے تو بس ملک کو وطن بنانے کے بعد تعلیم کا جو خاکہ تیار کیا تھا' اس میں نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ علم کی طغیانی کے نشہ پر ان الی ربک الرجعی (تیرے رب کی طرف رجعت (اس کا

علاج ہے) کی ترشی کا نچوڑنا بھی تعلیم کا قریب قریب ایک لازمی جزو قرار دیا گیا تھا تاکہ دماغ کی لگا میں ہمیشہ دل کے ہاتھوں میں یا عقل کی باگ ایمان کے پنجوں میں دبی رہے۔ شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جن دنوں میں اپنی دماغی بیداری کی تیاری مدرسوں میں کر رہا تھا تو بار باران کے والد شیخ سیف الدینؒ متنبہ کرتے تھے کہ

''ہاں! تا ملائے خشک و ناہموار نہ باشی۔'' (صفحہ 314 اخبار)

ملائیت (تعلیم یافتگی) کی یہ خشکی جس کا لازمی نتیجہ ناہمواری ہے' ہندوستان کے مسلمان علم کے ان طغیانی آثار سے واقف تھے چونکہ اس ملک میں اسلام جب آیا تو دین کا سارا ذخیرہ بحمد اللہ منقح ہو چکا تھا' حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی۔ فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے۔ یہاں کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں مل تھیں' اس لیے مذہب کے متعلق صرف عمل کا کام رہ گیا تھا یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لامحدود ہیں۔ ان کے متعلق فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت تک اس وقت تک جب تک مذہب کو دماغی بازی گاہ کی گیند کی حیثیت سے استعمال کرنے کا لوگوں پر دورہ نہیں پڑا تھا' خاموشی کے ساتھ مذہب جن زندہ کمالات اور ارتقائی زینوں کے طے کرنے کا ذریعہ ہے' ان ہی مقاصد کے حصول تک مذہب کا استعمال محدود رہا۔ اس وقت تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا نہ جھگڑے' ایک روح پرور سکون کا عالم تھا جو طاری تھا۔

تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شیعہ اور سنّی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا' اسی لیے سارا زور جس طرف ڈھلک گیا تھا' وہ عمل اور اخلاص کا زور تھا۔ چرچے تھے تو اسی کے' محفلیں تھیں تو اسی کی' کتابیں لکھی جاتی تھیں تو اسی پر۔ لوگوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ بہ نسبت دوسرے علوم و فنون کے ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کے سلسلہ میں تصوف کی کتابیں زیادہ اور بہت زیادہ کیوں نظر آتی ہیں' بے سوچے سمجھے جواب دینے والے خیال کر لیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو اس جواب کی جرأت بھی کر گزرتے ہیں کہ ان کو آتا ہی کیا تھا۔ تصوف کے چند رٹے رٹائے مقررہ مسائل تھے' بس ان ہی کو یہ تختہ مشق بنائے ہوئے تھے۔

ہندوستانی علماء کو آتا کیا تھا؟ اس کا جواب تو بحمد اللہ گزر چکا اور جتنا لکھا گیا ہے' وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ جو نہیں لکھا گیا ہے اور اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ تصوف کی کتابوں کی کثرت کی وجہ یہی تھی کہ اس ملک کے لوگوں پر اسی کی دھن سوار تھی۔

ہمیشہ رسد طلب کی تابع رہی ہے۔ اسی پُر سکون فضا میں جو اکبری عہد سے پہلے اس ملک کے دینی اور علمی دائروں پر چھائی ہوئی تھی' مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

افسوس کہ بات بہت طویل ہو جائے گی ورنہ بتاتا کہ اخلاص و عمل پر ابھارنے والا جو تیز اور سریع النفوذ ادب نظم کے سوا نثر میں ہندوستانی مسلمانوں کے قلم نے تیار کیا ہے' علی الخصوص حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بہاری' حضرت شاہ نور عالم پنڈوی بنگالی' سید محمد بن جعفر' حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز وغیرہم حضرات سلف میں اور اکبری فتنہ کے بعد شیخ مجدد سرہندی' شاہ ولی اللہ الدہلوی' شاہ عبدالعزیز' شاہ اسمٰعیل رحمہم اللہ اجمعین کی کتابیں تیر و نشتر کے جن خزانوں سے

لبریز ہیں، مجھ پر شاید ہندوستان کی بے جا پاسداری کا الزام لگا دیا جائے گا ورنہ کہہ سکتا تھا کہ ان بزرگوں نے اس خاص فن میں جو کچھ لکھا ہے، دوسرے اسلامی ممالک میں ان کی نظیریں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔[13]

مذہبی سکون کے اس زمانہ میں آپ چاہتے ہیں کہ ایام فتنہ کی وہ کتابیں ملیں جن سے صدی ڈیڑھ صدی کے اندر اندر ہندوستان کو کیا بتاؤں کہ کیا ہو گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ محکومیت کے اس قلیل عرصہ میں خلافیات کا جو لٹریچر ہندوستان نے تیار کر لیا ہے، حاکمیت کے قرون متطاولہ میں اس طرز کا رسالہ نکالنا بھی مشکل ہے۔ اکبر کے عہد میں سنتے ہیں جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے ملا عبدالنبی گنگوہی اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری میں کچھ مذہبی جھگڑے چلتے تھے لیکن وہ اکبر کا زمانہ تھا، اکبر کے زمانہ میں جو کچھ بھی نہ ہوتا، کم تھا۔ اس سے پہلے اور جب تک حکومت اسلامیہ کا شباب رہا، نہ اس کے بعد ہم شقاقیات بعیدہ کی کوئی کتاب اس طرز کی پاتے ہیں۔ کچھ نوک جھونک اس زمانہ میں اگر ہو بھی جاتی تھی تو عقلی مسائل میں مولانا آزاد نے ملا محب اللہ بہاری صاحب ''سلم و مسلم'' کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ان کا اور مولانا حافظ امان[14] اللہ بنارسی کا اجتماع اتفاقاً لکھنؤ میں ہو گیا۔ یہ عالمگیرؒ کا عہد تھا، ملا محب اللہ لکھنؤ کے قاضی تھے اور حافظ صاحب صدر الصدور۔ دونوں ایک ہی استاد مولانا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد تھے۔ اسی معاصرت نے دونوں میں مقابلہ کا بازار کچھ دن کے لیے گرم رکھا تھا، مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

''باہم طریق مباحثہ علمی مسلوک می داشتند۔'' (صفحہ 212)

مگر یہ ''مباحثہ علمی'' تھا جو دونوں میں جاری تھا۔ ''مکافرہ جہلی'' جس کے شکار عہد حاضر کے علماء ہیں، اس سے تو اس چھ سو سال میں غریب ہندوستان جہاں تک میرا خیال ہے، واقف بھی نہ تھا۔ عجب تماشا ہے محمدؐ کے امتی ہونے کا دونوں کو دعویٰ ہے اور ہر امتی دوسرے کی گردن پکڑ کر اسلام سے اس کو خارج کر رہا ہے۔

بہر حال ہم نے تو جہاں تک غور کیا ہے، مذہب اور مذہبی علوم کو ہمارے بزرگوں نے صرف عمل اور اخلاص کے لیے استعمال کیا تھا۔ دماغی ورزشوں کے لیے عقلی اور ادبی علوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اگر سعدی و حافظ اپنے ادبی تحفے طوطیانِ ہند کی شکر شکنی کے لیے بھیج رہے تھے تو کیا اسی زمانہ میں ہندوستان خسرو اور حسن کی شکر ریزیوں سے ایران اور ترکستان کو شیریں کام نہیں بنا رہا تھا۔ امیر خسرو اور امیر حسن علاء (مریدان سلطان المشائخ) کا جب انتقال ہوا تو مولانا جامی کے قلم سے بے اختیار یہ اشعار نکلے۔

ان دو طوطی کہ بہ نوخیزی شاں بود در ہند شکر ریزی شاں
عاقبت سدرۂ افلاک شدند خامشان قفس خاک شدند

(البداونی۔ صفحہ 201)

اور ان ہی دونوں پر کیا موقوف ہے، بیدل اور غالب جیسے شعرا جن کا سکہ سارے فارسی سمجھنے والے علاقوں میں رواں ہے، ہندوستان میں ان کی کیا کمی ہے۔ میر جرجانی اور علامہ تفتازانی اگر اپنے عقلی اور ذہنی کمالات سے ہمیں سرفراز فرما رہے تھے تو سیالکوٹی، جونپوری، خیر آبادی، دولت آبادی کیا اس احسان کا معاوضہ نہیں ادا کر رہے تھے۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے جب نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کے ساتھ ہندوستان میں اس بازی گری کا رواج نہ تھا۔ جس کا تماشا ہم آج کر رہے ہیں کہ ہر وہ نظریہ ہر وہ اصول حیات جو یورپ سوچتا ہے' قرآنی آیات میں اس کی گنجائش نکل آتی ہے۔ جب تک سرمایہ داری کا زور رہا تو قرآن ہی سے ثابت کیا جا رہا تھا کہ وراثت کا قانون قانون نہیں بلکہ مالک جائداد کے اختیاری فعل کے لیے ایک نیک مشورہ ہے اور جب اشتمالیت اور اشتراکیت کے ڈنکے پر یورپ نے چوٹ لگائی تو ہر طرف سے قرآنی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے لوگ باہر نکل آئے کہ اشتراکیت کے سوا تو قرآن نے کسی بات کی تعلیم ہی نہیں دی ہے۔

میں اس جستجو میں حیران تھا کہ ''کافیہ'' کی شرحیں اگر اسی طرز عمل کے جواب میں لکھی گئی ہیں تو اس وقت جب کہ اس ملک میں یہ سوال ہی نہیں اٹھا تھا' جواب کی کیا حاجت تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے باہر بعض دماغوں میں اس قسم کی کج روی کے جراثیم ضرور پیدا ہوئے تھے اور خصوصاً فرقہ باطنیہ جنہیں قرامطہ بھی کہتے ہیں' ان کے عقیدہ کی تو بنیاد ہی یہی تھی کہ قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے' وہی سمجھنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا بے ایمانی ہے بلکہ ہم جو کچھ قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں' اس پر ایمان لانا بھی عین ایمان (16) ہے لیکن ظاہر ہے کہ قرامطہ کو ہندوستان کے اس دور سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کا ایک مخذول و مذموم طائفہ کہیں سے بھٹک بھٹکا کر ملتان یا سندھ کے بعض علاقوں میں اگر آ بھی گیا تھا تو غزنوی کی تلوار ان کا صفایا اس زمانہ سے بہت پہلے کر چکی تھی۔ جب سلطان غوریؒ کی بدولت ہندوستان کو اسلام کا وطن بنایا گیا تھا' بہر حال ''کافیہ'' کی ان عجیب وغریب شرحوں کے متعلق کوئی خاص بات میری سمجھ میں مدتوں نہ آئی۔

لیکن کچھ دن بعد جب اس پر نظر پڑی کہ جس زمانہ میں ''کافیہ'' کے ساتھ یہ کارروائی کی گئی یعنی مغلوں کے عہد میں یہ شرحیں لکھی گئی ہیں اور مغلوں سے پہلے دلی میں جو لودیوں کی حکومت قائم تھی' کہیں ذکر آ چکا ہے کہ ان ہی لودیوں میں ایک بڑا علم دوست معارف پژوہ بادشاہ سکندر لودھی بھی گذرا ہے۔ اسی سکندر لودھی کے زمانہ میں ایک صاحب جن کا نام شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری ہے' یہ شیخ محدث دہلوی کا بیان ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات میں ان بخاری صاحب کا عرف عجیب بتایا گیا ہے یعنی

''عبدالوہاب بخاری مشہور بہ مچھی روٹی'' (ملفوظات عزیزیہ۔ صفحہ 97)

شاہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو دلی والے مچھی روٹی کیوں کہتے تھے' بظاہر یہ کچھ مجذوب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خود ان کا یہ عرف ''مچھی روٹی'' گونہ ان کی مجذوبیت کی دلیل ہے۔ ان کا مولد ومنشاء ملتان تھا' ملتان ہی سے یہ متاہل ہونے کے بعد ایک خاص جذبہ کے تحت

''براہ خشکی بزیارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بشتافت۔'' (اخبار' صفحہ 215)

اور ایک دفعہ نہیں متعدد بار ممالک اسلامیہ کی سیر کی اور حجاز آتے جاتے رہے۔ آخر میں ملتان چھوڑ کر دلی آ گئے۔ سکندر لودھی بادشاہ اہل دین وعلم کا قدردان تو تھا ہی' ان کے ساتھ بھی خاص حسن سلوک سے پیش آیا۔ ان کے پیر شیخ عبداللہ تھے

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ پیر کے ساتھ حب مفرط رکھتے تھے۔ شیخ محدث کے الفاظ ہیں۔

''اورا بادشاہ عبداللہ نسبت محبت دنیاز وطلب واسترشاد چنداں می بود کہ انچہ می گویند کہ فنافی الشیخ می باشد ایں چنیں خواہد بود نسبت'' (صفحہ 215)

اس سے بھی افتاد مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالوہاب بخاری صاحب نے قرآن کی ایک عجیب وغریب تفسیر عربی میں لکھ ڈالی۔ عجب تفسیر؟ شیخ محدث فرماتے ہیں

''اکثر قرآن بلکہ تمام قرآن راار جاع بہ نعت پیغمبر و ذکر او کردہ صلی اللہ علیہ وسلم۔''

یعنی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن اور قرآن کی ہر آیت سے آپ نے یہ معنی پیدا کیا کہ اس میں رسول اللہؐ کی نعت اور تعریف بیان کی گئی ہے۔ صرف دعویٰ ہوتا تو غنیمت تھا' پوری تفسیر اسی دعوے کے اثبات میں لکھ بھی ڈالی۔ اس قسم کی تفسیر میں جو کچھ کہا جاسکتا ہے' وہ ظاہر ہے شیخ محدث نے یہی لکھا ہے۔

''غالباً وقوع آں در غلبہ حال واستغراق وقت بودہ است۔''

ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی چونکہ مخلصوں کی زندگی سمجھی جاتی تھی اور یہی معلوم بھی ہوتا ہے' اس لیے اس کے سوا اس کی اور کیا توجیہہ کی جائے کہ جذب اور استغراق میں یہ کام انہوں نے کیا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہوگی۔ سارا قرآن پیغمبر کی نعت ہے۔ عام مسلمانوں کے لیے بظاہر ایک بڑا دلکش فقرہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے سوا قرآن کی ایسی تفسیر کہیں اور لکھی گئی ہو۔ ''کشف الظنون'' وغیرہ میں بعض ایسی الٹی پلٹی تفسیروں کا ذکر تو کیا گیا ہے' جس میں من مانے مطالب قرآنی الفاظ میں بھرے گئے ہیں' بعض تو اس میں ناگفتہ بہ ہیں لیکن غنیمت ہے کہ ہمارا ہندوستان اس زمانہ میں اگر بہکا بھی تو کسی بری بات کی طرف نہیں بہکا۔ اگرچہ بہکنے کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا اور اگر قرآنی تعبیرات میں اس قسم کے کھینچ تان کی اجازت دیدی جائے تو جہاں کسی اچھے رجحان رکھنے والے آدمی نے سارے قرآن کو پیغمبر کی نعت بنا دیا' ہوسکتا ہے کہ شیطان کی کوئی ذریت سارے قرآن کو شیطان کی مدح ثابت کرنے پر آمادہ ہو جائے اور ہو جائے کیا معنی؟ اس زمانہ میں دنیا جہان کے سارے مسلمانوں کو قرآن ہی کے رو سے کافر اور کافروں کو مومن و مسلم جب ثابت کیا جاچکا ہے تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب شیطانی مدح کے اثبات کی ہمت نہ کر گذریں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ لودیوں کے بعد مغلی حکومت جب قائم ہوئی اور اکبری زیغ کا عہد شروع ہوا' اس وقت اشرار نے بیچارے حاجی مچھی روٹی صاحب کے اس طریقہ کار سے بھی ممکن ہے نفع اٹھایا ہو۔ غالباً یہ تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اکبر کو تناسخ کے مسئلہ پر سخت اصرار تھا جس کا تفصیلی ذکر حضرت مجدد الف ثانی والے مقالہ میں مَیں نے کیا ہے' اب کتاب کا تو نام صحیح طور پر اس وقت یاد نہیں لیکن اسی تناسخ کے مسئلہ کو قرآن کی آیت سے اس میں ثابت کیا گیا تھا' بات ذرا فحش سی ہے لیکن عبرۃً لاولی الابصار نقل کفر' کفر نہ باشد کے طور پر ذکر کرتا ہوں' سورۂ یٰسین کی آیت

فاذا نفخ فی الصور فاذا هم من الاجداث الی ربهم ینسلون۔

''پھر جب ''الصور'' میں پھونکا جائے گا تو اچانک مردے قبروں سے اپنے رب کی طرف قطار در قطار نکلتے چلے آئیں گے۔''

صور کے معنی سینگ کے ہیں۔ صوری مشابہت کی وجہ سے صور سے مردوں کے واسطہ توالد کو لے کر اب آگے مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس میں نفخ کی حالت پیدا ہوتی ہے تو اسی سے نکل کر الاجداث یعنی رحم کی قبروں سے گذرتے ہوئے لوگ اپنے رب کے زیر پرورش بننے کے لیے قطار در قطار نکلتے چلے آتے ہیں اور یہی صورت تناسخ میں پیش آتی ہے کہ مرنے کے بعد لوگ اسی طریقہ سے دوسرا جنم لیتے رہتے ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں ڈاڑھی منڈانے کا زور ہوا' کسی نے فقہی دلیل یہ نکالی کہ **کمایفعله عصاة العراق** کو قضاۃ العراق بنا کر پیش کیا گیا' طبی نکتہ پیش کیا گیا کہ ''ریش از خصیتیں آب می خورد' اس لیے اس چیز کا رکھنا کیا ضرور ہے اور شاید اسی زمانہ کا استدلال ہے کہ حدیثوں میں واعفو اللحی کے الفاظ ہیں۔ عفو کے معنی بڑھانا اور مٹانا دونوں آئے ہیں۔ **عفت الدیاء مجلها و فمقامها** میں عفو سے مٹنا ہی مراد ہے۔ قرینہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ اس حدیث میں اور نو باتیں مثلاً ناخن کٹوانا' بغل کے بال کا ازالہ اور مونچھوں کا کٹانا ان سب کا تعلق ازالہ سے ہے۔ پھر ایک چیز کا تعلق ابقاء سے کیوں ہو۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طبقۃً بعد طبقۃٍ جس آیت یا جس حدیث کا مطلب مسلمان عہد صحابہ سے اس وقت تک منتقل کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں' اگر اس سے قطع نظر کر کے جس مطلب کو جو چاہے قرآنی آیات و احادیث پر چسپاں کرتا چلا جائے۔ اگر اس کی عام آزادی لوگوں کو دے دی جائے جیسا کہ اس زمانہ میں اس کی عام وبا پھیلی ہوئی ہے تو اس ذریعہ سے بدیہی سے بدیہی مسائل کو بھی نظری بنالیا جا سکتا ہے۔ ڈاڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کترانا صرف سنت نہیں بلکہ اسلام کا ایک متواتر اور متوارث شعار ہے جسے غیر مسلمان بھی جانتے ہیں لیکن یاروں کے جی میں آیا تو اسی حدیث سے جس سے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم پیدا ہوتا ہے۔ العیاذ باللہ لوگوں نے ڈاڑھی کے مٹانے کا حکم پیدا کر لیا ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے خواہ وہ اچھے رجحان ہی کے تحت کیوں نہ ہوا ہو لیکن اس طریقہ عمل کی ابتداء سکندر لودی کے عہد میں ان ہی ''مچھی روٹی'' والے صاحب سے ہوئی اور اکبر کے زمانہ میں مختلف قرائن ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلط رجحانات کی توجیہہ میں اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی صریح شہادت تو اس کی موجود نہیں ہے لیکن میرا غالب گمان یہی ہے کہ ''کافیہ'' کی صوفیانہ شرح بجائے ایک کے تین تین جو اس ملک میں لکھی گئیں وہ اسی قسم کے فتنوں کے سدباب کا ایک بہترین طریقہ تھا۔ اس قسم کی گمراہ ذہنیتوں کا یہ بہترین علاج ہے۔ قرآن و حدیث میں تحریف معنوی کی قینچیاں جو چلائی جاتی ہیں تو چلانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی دور کی کوڑی لا رہے ہیں' گویا ابھی ابھی عقد ثریا سے کوئی تازہ خوشہ توڑ کر لائے ہیں' حالانکہ میرے خیال میں یہ بدترین غباوت اور دماغی توازن سے محرومی کی دلیل ہے۔ کسی چیز کا نہ ماننا یہ اور بات ہے' سمجھ میں نہیں آتا ہے تو اس کا انکار صاف لفظوں میں کر دینا چاہیے۔ آپ کی سمجھ میں آدمی کا وجود تو ممکن ہے' مٹی کا یہ پتلہ دیکھ سکتا ہے' سن سکتا ہے۔ الغرض اس سے سارے حیاتی آثار ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن زندگی اور احساس کے یہی آثار اگر

کسی غیر مرئی عنصر مثلاً ہوا یا نار یا نور وغیرہ کے کسی ٹکڑے یا قطعہ خاص میں ظاہر ہوں تو آپ کی عقل میں اگر یہ بات نہیں سماتی ہے، جن اور ملائکہ کا وجود اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو علمی دیانت کا یہ اقتضا ہے آپ اس کا علانیہ انکار کر دیجیے لیکن اس خیانت اور مردہ ضمیری کا ثبوت تو نہ پیش کیجیے کہ قرآن میں بھی نہ ملائکہ کا ذکر ہے نہ جنوں کا اور یہ الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں ان سے مراد آپ کا دماغی مقصد ہے یعنی عناصر کے قوی یا جنگلی آدمی وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے نزدیک مسلمان اگر بدترین قوم ہے۔ خدا کی معتوب ہے، مقہور ہے، جہنمی ہے تو آپ اس قوم سے جدا ہو جائیے اور جو آپ کی نظروں میں بہترین قومیں ہیں، خدا کی جو پیاری ہیں، جنت جن کا اجارہ ہے، ان میں جا کر شریک ہو جائیے لیکن اپنے اس خیال کو قرآن پر تو نہ لاد یے۔ آپ اس طریقہ سے خدا پر افتراء کر رہے ہیں، رسول پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

بہر حال اس قسم کے ماؤف عقول و اذہان کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ قرآن و حدیث کے جن الفاظ میں انہوں نے اپنے دماغی مطالب پہنائے ہیں اور ان کو غلط فہمی ہو رہی ہو کہ ان کے ان دور از کار مطالب کی شاید قرآنی یا نبوی الفاظ میں کچھ گنجائش نکلتی ہو، ان کو چاہیے کہ ہندوستانی علماء کی ان ترقیاتی شرحوں کا مطالعہ کر لیں جن میں نحو جیسے علم کی کتاب سے تصوف کے مسائل نکالے گئے ہیں۔ اس وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ بھینس سے انڈے اور انڈوں سے روغن گل نکالنے کا کرشمہ جو آپ بڑے ناز و انداز، فخر و غرور سے دکھا رہے ہیں۔ یہ شاطروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ اسی کو داہنے ہاتھ سے کھیلنے کی ناحق تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ آپ کی ذہنی سمیت ان شاء اللہ ان کتابوں سے زائل ہو جائے گی۔ آخر اتنا غبی کون ہو گا جو واقع میں یہ باور کرنے لگے کہ ابن حاجب کی مراد ''کافیہ'' کی عبارتوں سے حقائق و معارف کے مسائل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کچھ بھی کسی میں سمجھ ہو گی، ضمیر میں تھوڑی سی زندگی بھی جن کے باقی ہو گی، ان کی گردنیں ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد شرم سے جھک جائیں گی۔ ثابت ہو گا کہ انہوں نے بڑا برا کھیل کھیلا، کھیلنا تھا تو کچھ اسی قسم کی کتابوں کو بساط بنا کر کھیلتے جن کے ساتھ اس قسم کی بازیگری شاید گناہ نہ ہو۔

ہندوستانی نظامِ تعلیم کے سلسلہ کی ایک اور بات جو بظاہر خواہ جتنی بھی ناقابل لحاظ نظر آئے مگر میرے خیال میں ارباب فکر کے لیے خاص توجہ کی دعوت دے رہی۔ وہ شیخ محدث دہلوی کی خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری کا وہ جزء ہے جس میں انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی یہ عجیب خصوصیت بیان کی ہے۔ شیخ نے اپنے حالات ''اخبار الاخیار'' کے آخر میں لکھے ہیں، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے

''اول از قرآن مجید بے سابقہ تعلیم و قواعد حروف تہجی کہ اطفال خوانند دو سہ جزء بلکہ کمتر واللہ علم تعلیم فرمودند۔''

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ہجاء کے حروفِ مفردہ کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن کے حروفِ مرکبہ ہی سے شیخ کی تعلیم شروع ہوئی اور یہی بات سوچنے کی ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ

''سبق در سبق ایشاں می نوشتند و من می خواندم۔''

یعنی روزانہ قرآن کی چند سطریں لکھ لکھ کر ان کو پڑھاتے تھے۔ حروف تہجی کی شناسائی کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم کا آغاز

اوراس میں اتنی کامیابی کہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہی ''دوسہ جز'' جواس طریقہ سے والد نے پڑھایا تھا۔

''قرآن ہمیں مقدار تعلم کردہ ام۔''

آگے قرآن خوانی کا ایسا ملکہ پیدا ہوگیا اور

''چناں قوت رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشاں (والد) می گذرانیدم۔''

سنتے ہیں وہی قرآن جسے عموماً بچے برس برس بلکہ اس سے زیادہ مدت میں ختم کرتے ہیں۔شیخ فرماتے ہیں۔

''دردوسہ ماہ ختم قرآن تمام کردم۔'' (اخبار۔صفحہ 311)

بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مجھے ذاتی تجربہ نہیں ہے لیکن شیخ نے جو بات لکھی ہے۔اگر یہ ان کے والد کی کرامت یا خون ان کی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے تو ان لوگوں کے لیے جواس مسئلہ میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور عملی تجربات کے مواقع بھی ان کو حاصل ہیں۔کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس کا تجربہ کریں' بظاہر اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ حروفِ مفردہ کی تعلیم میں بچوں کو جیسے حروف سکھائے جاتے ہیں' الف با کی شکلیں پہنچوائی جاتی ہیں' بجائے ان کے خود الحمد اور اللہ وغیرہ کی شکلیں ان کو کیوں نہ پہنچوائی جائیں' تاہم مسئلہ غور طلب ہے۔ہندوستان کی تاریخ میں چونکہ اس کا تجربہ ہوا ہے۔اس لیے اربابِ نظر وفکر کے لیے اس کو پیش کردیا گیا' مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ چند سال ہوئے حیدرآباد کی نمائش میں ایک صاحب نے اردو کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کے تجربہ کا دعویٰ کیا تھا لیکن معلوم نہ ہوسکا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔غالباً انہوں نے اپنی کتاب کا نام ''بولتا قاعدہ'' رکھا تھا۔کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے' مجھ سے بھی ملے تھے۔کہتے تھے کہ میرا قاعدہ تجربہ کی منزل سے گزر چکا ہے لیکن کسی نے توجہ نہ کی' شیخ نے اسی سلسلہ میں اپنی فارسی تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے' لکھا ہے کہ

''شاید کہ چند جزو از بوستاں وگلستاں ودیوان خواجہ حافظ تعلیم کردہ باشد۔''

ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی نظم ونثر کی تعلیم ان کی بس ان ہی چند کتابوں کے انتخاب تک محدود تھی۔اس کے بعد انہوں نے جو کچھ پڑھا عربی زبان ہی کے متعلق پڑھا اور اس سے میرے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے فارسی کی جو شکل بنادی ہے اور عربی الفاظ سے اس زبان کو انہوں نے مالا مال کرکے جو قالب اس کا تیار کردیا ہے' کم ازکم اس فارسی میں قابلیت حاصل کرنے کے لیے مسلسل فارسی ہی کی کتابیں پڑھتے چلے جانا جیسے کسی زمانہ میں رواج تھا یعنی ''یوسف زلیخا'' کی مثنوی ''سکندرنامہ'' ''بدرچاچ'' ''بہادر دانش'' ''طغرا'' ''مینا بازار'' ''رقعات عالمگیری'' ''سہ نثر ظہوری'' ''ترشیزی'' ''ابوالفضل کے مکاتیب'' ''انشائے خلیفہ'' ''انوار سہیلی'' وغیرہ وغیرہ بیسیوں کتابوں کا ایک طومار تھا لیکن پھر بھی جہاں کہیں کوئی قرآن کی آیت' عربی کا کوئی شعر یا فقرہ یا عربی کا کوئی نامانوس لفظ یا نادر ابواب کے الفاظ ان کتابوں میں آجاتے تو طلبہ ہی کی نہیں مدرس صاحب کی پالکی بھی وہیں رکھ دی جاتی تھی۔بچپن کے زمانہ میں خیال آتا ہے کہ ''گلستاں'' کے عربی اشعار کا ترجمہ مکتب کے جو مولوی صاحب بآسانی کراسکتے تھے' ان کا شمار فضلاء وقت میں ہوتا تھا۔میرا خیال ہے کہ نظم' خصوصاً نثر کی ان تمام فارسی کتابوں کی ساری دشواریاں عربی الفاظ سے پیدا

ہوئی ہیں۔ معمولی صرف و نحو قدرے عربی ادب کے جاننے والوں کے نزدیک ''طغرا'' اور ''بدر چاچ''، ''درہ نادرہ''، ''انوار سہیلی'' وغیرہ کی عبارتوں کا حل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہوتا کہ ان کی دشواری عربی الفاظ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ فارسی کی تھوڑی سی مناسبت پیدا کر دینے کے بعد فارسی اور اردو ادب کی تکمیل کے یے ضروری ہے کہ بچوں کو عربی کی ابتدائی کتابیں بلکہ قرآن اور حدیث کے ذریعہ سے ادب عربی کی تعلیم صرف و نحو کی معمولی تعلیم کے بعد دلانی زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ جس کی شہادت میں شیخ محدث دہلوی کو میں پیش کر سکتا ہوں۔ ''گلستاں''، ''بوستاں'' اور ''دیوانِ حافظ'' کے چند انتخابات کے سوا انہوں نے فارسی میں کچھ نہیں پڑھا تھا لیکن فارسی زبان پر ان کو جو قدرت حاصل ہے' اس کا اندازہ ان کی فارسی کتابوں سے ان کے مکاتیب وغیرہ سے ہو سکتا ہے۔ ان کی معیاری فارسی کا کون انکار کر سکتا ہے۔ فارسی کے بڑے سے بڑے انشاء پرداز کے مقابلہ میں شیخ کا قلم پیچھے نہیں رہ سکتا۔ نظم بھی اچھی لکھتے ہیں [17] اور یہی مشورہ میرا اردو کے لیے ہے کہ اردو کے لیے اردو ہی کی کتابوں پر کتابیں پڑھانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تھوڑی بہت فارسی وہی جزوے چند از گلستاں و بوستاں و خواجہ حافظ قسم کے منظومات و منثورات سے گذارنے کے بعد بچوں کو عربی میں لگا دیا جائے۔ عربی کی تعلیم میں فارسی اور اردو دونوں کی قوت اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ کم وقت میں فائدہ زیادہ اور بہت زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ عربی کی تعلیم اگر قرآن کے پاروں اور مختصر حدیثوں کے ذریعہ سے دی جائے یعنی بجائے ادبی قصوں اور اشعار کے ان ہی کو ادب عربی کے سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے تو پھر مسلمان جس دینیات کے لزوم کا مطالبہ کر رہے ہیں' اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وقتی طور پر دینیات کے چند مسائل کا سکھا دینا اور عمر بھر کے لیے بچوں میں اس کی صلاحیت پیدا کر دینی کہ براہ راست خطاب الٰہی کے وہ مخاطب اور اپنے پیغمبرؐ کے مقاصد کو پیغمبر ہی کی زبان میں سمجھنے پر قادر ہو جائیں' دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے۔ میں نے پہلے بھی اپنے اس مالیخولیا کا ذکر کیا ہے اور دوبارہ پھر دہرایا ہے۔ شاید کہ کسی صاحب دل صاحبِ عمل کو ان ناچیز مشوروں کی طرف توجہ ہو جائے۔

ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام میں جس چیز کی ہمیں کمی نظر آتی ہے یا کم از کم اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا وہ عجیب بات ہے کہ ریاضی (حساب) کا مسئلہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں ہندوؤں کے سوا خود مسلمانوں میں بھی بعض بڑے بڑے محاسب گزرے ہیں [18] لیکن مکتب خانوں میں بچوں کو حساب بھی سکھایا جاتا تھا یا نہیں' اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوؤں کے یہاں تو جیسا کہ اب تک پاٹھ شالوں میں رواج ہے' تقریباً حساب ہی سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور یہ خاص قومی مزاج کی علامت ہے۔ جس پر یہ قوم مفطور رہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں پر خواہ وہ کسی حال میں ہوں' دین کا پہلو ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اسی لیے سب سے پہلی چیز جس سے ان کے یہاں تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے' وہ قرآن کے حروف ہجا کی تعلیم ہے۔ ان کا خیال ہے اور بجا خیال ہے کہ آئندہ بچہ کے ساتھ کس قسم کے حوادث پیش آئیں گے' اسے کون جان سکتا ہے۔ تعلیم میں وہ کہاں تک جا سکتا ہے' ظاہر ہے کہ اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ اسی لیے ان کی نگاہ میں جو چیز ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے' یعنی قرآن' اس سے بچوں کو آشنا کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ آئندہ اگر کچھ بھی نہ پڑھ سکا تو بیچارہ مر پٹ کر قرآن تو

پڑھتا رہے گا۔ دنیا نہ سہی دین تو سنبھال لے گا۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو لیکن قرآن کی حرف شناسی کا جو مرحلہ ہے' اس کو تمام مراحل تعلیم پر مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک دلچسپ چیز اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' میں نظر آئی۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں جدید نظامِ تعلیم کا رواج ہوا ہے' مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو معنی مطلب سمجھے بغیر بچوں کو قرآن پڑھانے کا مخالف ہے اور یہ گروہ اس طبقہ کے سوا ہے جو سرے سے قرآن پڑھانے کا ہی قائل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ تو قابل خطاب بھی نہیں ہے کیونکہ ان کا مسلمانوں سے صرف نسلی تعلق ہے۔ دینی حیثیت سے وہ محمد رسول اللہؐ کے دامن دولت کو چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے مرنے جینے کا فلسفہ انہوں نے خود گڑھ لیا ہے۔ بجائے محمدؐ کے اس سلسلہ میں وہ کسی دوسرے کے مشوروں پر ایمان لا چکے ہیں۔

لیکن جو بھی مسلمان ہیں' مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہی مرنا چاہتے ہیں' خود بھی یہی چاہتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی چاہتے ہیں مگر باوجود اس کے ان کے دماغ میں کسی نے یہ وسوسہ پھونک دیا ہے کہ معنی مطلب سمجھے بغیر قرآن کے خود پڑھنے یا بچوں کو پڑھوانے کا کیا فائدہ ہے۔ یہ ترقی پسندوں کا گروہ ہے۔ شروع شروع میں ترقی پسندوں کی جو ٹولی ہندوستان میں بنی تھی' اس کے ایک سرگرم رکن جیسا کہ سب جانتے ہیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب بھی تھے' تجدد مآبی کا جنون جب شباب پر تھا' اس وقت ڈپٹی صاحب کے خیالات بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق جو تھے' اسی کتاب میں ڈپٹی صاحب کے ایک خط سے (جو اپنے لڑکے مولوی بشیر احمد مرحوم) کے نام انہوں نے لکھا تھا' ان الفاظ میں منقول ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

> ''تم کو پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا کہ تم اس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا دہرانا بے فائدہ اور لاحاصل ہے۔''

لیکن جوں جوں ''ترقی پسندی'' کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا' قبر کا گڑھا منہ پھاڑے سامنے جھانکتا نظر آنے لگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کے ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے۔ اس کے بعد بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق اپنی بدلی ہوئی رائے جو انہوں نے قلمبند کی تھی' وہ اسی کتاب میں یہ ہے۔

> ''بڑے ہو کر خدا جانے اعصاب دہن (یعنی منہ کے رگ پٹھوں) میں کچھ ایسی خشونت (سختی و کرختگی) آ جاتی ہے کہ زبان جن حروف کے ادا کرنے کی ابتدا سے خوگر نہیں ہوتی پھر وہ اس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہو سکتے۔''

اور اسی تجربہ اور مشاہدہ نے ڈپٹی صاحب کو اس خیال کے قائم کرنے پر مجبور کیا کہ

> ''طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمان بچوں کے لیے ضروری ہے۔''

ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے بعد ایک اور دلچسپ دلیل اس کی یہ پیش کی ہے۔

> ''اگر یہ بے سود ہو تو مولد (پیدا ہونے والے نوزائیدہ بچے) کے کان میں اذان کا دینا اس

سے بھی زیادہ بے سود فعل عبث ہے۔''

کوئی شبہ نہیں کہ ڈپٹی صاحب کا یہ سوال ایک چبھتا ہوا سوال ہے مگر ظاہر ہے کہ اس دقیانوسی ترقی پسند انسان کو کیا معلوم کہ جس چیز کو آپ حجت میں پیش کر رہے ہیں یعنی نومولود بچوں کی کان والی اذان خود اسی کے افادہ پر ان ہی کے پروردہ ترقی پسند نوجوانوں کو کب اعتماد ہے۔

ڈپٹی صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ اور تجربہ کی بات یہ بھی بیان کی ہے کہ

''سب سے بڑا فائدہ بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہم مطلب قرآن پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ چاہے کوئی اس کو حسن عقیدت سمجھے یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مؤدب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف پڑھنے کے لیے مؤدب بٹھائے جاتے ہیں اور ادب رفتہ رفتہ داخل عادت ہو جاتا ہے۔''

ایک فائدہ یہ بھی بتایا ہے کہ

''قرآن سے بچوں کو تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مماثلت خطی کے سہارے قرآن کا اردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں' بہ یک کرشمہ دو کار۔''

یہ بھی ان ہی کا آخری تجربہ ہے۔

''تعلیم کے پرانے طریقے کے رو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیے یاد کرلیا کرتے تھے یا اب یہ حال ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقہ سے تعلیم پا رہے ہیں' ان کو الحمد تک پوری نہیں آتی۔ درود اور التحیات کی کون کہے اور آئے کہاں سے' بیچاروں کو راستہ پڑا ہی نہیں۔'' (صفحہ 12۔ حیات النذیر)

ایجوکیشنل کانفرنس کے پرانے جلسوں میں قدیم تعلیم کی تضحیک و تحمیق پر لیکچر دینے والوں کو دیکھ رہے ہیں۔ وہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ سے پھیرا تھا' آج اس کا دکھڑا لے کر بیٹھے ہیں کہ مسلمان بچوں کو ''الحمد'' بھی پوری یاد نہیں ہوتی۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ عفا اللہ عنہم

بہر حال اگر ہمیں اس ملک میں مسلمان ہو کر جینا ہے اور مرنا بھی ہے اسلام اور ایمان کے ساتھ' اپنے متعلق بھی جن کا یہی خیال ہے اور اپنے بچوں کے متعلق بھی جن کی یہی آرزو ہے' ان کے لیے ناگزیر ہے' خواہ کچھ بھی کہا جائے' کچھ بھی سنا جائے لیکن قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم کی ابتدا کا جو قاعدہ تیرہ سو سال سے نسلاً بعد نسلٍ ہر ملک اور خطہ میں چلا آرہا ہے' اس کو بہر حال باقی رکھنا چاہیے۔

موجِ خوں سر سے گذری ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

لیکن اسی کے ساتھ اس زمانہ کے جدید سکولوں میں بچوں کو حساب کی تعلیم جس وقت اور جس عمر سے شروع کرائی جاتی ہے' اس سے بھی غفلت نہ برتنی چاہیے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا' ہندوستان میں کیا ہوتا تھا' اس وقت تک کوئی وثیقہ اس باب میں نفیاً یا اثباتاً مجھے نہیں ملا ہے لیکن ابن خلکان سے ابن سینا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو فقرہ میں نے نقل کیا تھا' اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ ساتھ ''حساب الہند'' اور دوسرے حسابی قواعد بچوں کو قدیم زمانہ سے سکھانے کا رواج مسلمانوں میں پایا جاتا تھا۔ [19] بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے کہ عام سرکاری مدارس کے میٹرک کلاس تک حساب کی جتنی تعلیم دی جاتی ہے' اسلامی مکاتب میں اتنی تعلیم حساب کی تو ضروری ہے۔ گویا اردو اور اردو کو قوی کرنے کے لیے فارسی' فارسی میں زور پہنچانے کے لیے عربی کا ایک سلسلہ جاری رہے گا اور دوسرا مضمون اسی کے ساتھ ساتھ حساب کا بھی مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ میٹرک کی منزل تک اسی سلسلہ کو پہنچا دینا چاہیے۔ نیز حکومت وقت کی جو زبان ہو اس کی تعلیم کی بھی گنجائش آغاز تعلیم کے تیسرے چوتھے سال سے نکالنی چاہیے۔ قرآن کے سوا ان تینوں سلسلوں کو مکاتب میں جہاں تک میرا خیال ہے' لازمی طور پر ہر بچہ کے لیے جاری رہنا چاہیے۔ البتہ عمر کے حساب سے بعض سلسلے' مثلاً حکومت کی زبان کا سلسلہ خصوصاً جب اجنبی زبان ہو' مناسب ہوگا کہ چند سال کے بعد شروع کیا جائے۔

ان تین لازمی سلسلوں کے ساتھ اور بھی کچھ گنجائش نکلے تو ایسے مضامین جو تعلیم کے بغیر نہیں آ سکتے' ان کو بھی رکھا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کو بہر حال بزرگوں کا وہ طریقہ یعنی قرآن سے تعلیم کی ابتدا اس کو کسی حال میں قطعاً کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ البتہ سہولت پیدا کرنے کے لیے طریقہ تعلیم میں ردو بدل ممکن ہے۔ مثلاً شیخ محدث نے جو طریقہ اپنی تعلیم کا بتایا ہے' اس کو آزما کر دیکھا جائے۔ بہر حال کچھ بھی ہو' قرآن سے آغازِ تعلیم یہ ہمارے بزرگوں کا وہ متروکہ ہے جس پر ہر زمانہ میں ہر اسلامی ملک نے اصرار کیا ہے۔ اسلامی گھرانوں میں بشرطیکہ وہ اسلامی باقی بھی رہ گئے ہوں' تسمیہ خوانی کی رسم کو جن خصوصیتوں کے ساتھ ہم آج پا رہے ہیں۔ بجنسہ اپنے ان ہی لوازم کے ساتھ یہ رسم اسی ملک میں آج سے پانچ چھ سو سال پیشتر بھی ادا ہو رہی تھی۔ ''فوائد الفواد'' میں امیر حسن علاء سجزی ناقل ہیں کہ

> شنبہ شانزدہم ماہ محرم 716ھ سعادت دست بوس حاصل شد' بندہ آں روز خرد کے را از اعزہ پیش برد' عرضداشت کرد کہ ایں را بہ قرآن خواندن فرستادہ می شود اول بخدمت مخدوم آوردہ شدہ است تا بہ برکت نظر مخدوم و نفس پاک خدائے تعالیٰ اورا قرآن روزی کند۔ (صفحہ 101)

اور یہی رواج بحمد اللہ مسلمانوں میں اب تک جاری ہے کہ شہر یا قصبہ' گاؤں میں نسبتاً جو زیادہ صاحب دین و علم ہو' بچوں کا مکتب ان ہی سے کراتے ہیں۔ امیر حسن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے یہ سن کر'' دعا خیر ارزانی داشت''

جب دعا ہو چکی

''بعد ازاں تختہ بدست مبارک گرفت و نوشت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی یاد تو ہر کام سے پیشتر مسلمانوں کا دستور ہی ہے لیکن عجب بات ہے کہ جن الفاظ کے

ساتھ آج بھی بچوں کے مکتب کا آغاز ہوتا ہے' سلطان المشائخ کے زمانہ میں بھی آغاز کے وہی الفاظ مروج تھے۔ حسن لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے بعد حضرت والا نے ارقام فرمایا۔

''رب یسر و لا تعسر'' (اے اللہ علم کو آسان کر اسے دشوار نہ بنا)

''اب ت ث ج''

ہجا کے یہ حروف سلطان المشائخ نے اپنے دست مبارک سے لکھے' خردک آگے بڑھایا گیا اور حضرت والا نے

''آں گاہ ایں حروف رابزبانِ مبارک خود تلقین کرد۔''

یہ چھ سو سال کی تسمیہ خوانی اور آغاز مکتب کی رپورٹ دلّی کی ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مسلمان اس ملک کے جس گوشہ میں بھی آباد تھے' باوجود مسافت کے رنگ سب کا ایک تھا' عہد خلجی و تغلقی میں یہ تماشا آپ کو دلّی میں نظر آرہا ہے۔ آیئے سینکڑوں میل دور دلّی سے مشرق چلے آیئے' بہار آجایئے۔ یہاں مخدوم الملک حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہیں۔ ان کے ملفوظات طیبہ ''معدن المعانی'' کے نام سے مطبوع ہو چکے ہیں' ایک مجلس کا ذکر جامع ملفوظ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''قاضی شرف الدین خواہرزادہ خود بردہ بود و عرضداشت کہ امروز روز تعلیم خواہ زادۂ بندہ ماست' مطلوب ایں است کہ اول تختہ پیش مخدوم آغاز کند۔''

ایک ذہنیت' ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں جن کے ذریعہ سے دلّی میں بھی بچے آغاز مکتب کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں اور بہار میں بھی۔

دلّی میں بھی آپ نے دیکھا تھا کہ تختہ کو لے کر سلطان المشائخ نے اس میں ارقام فرمایا تھا' یہاں بھی دیکھیے جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ قاضی شرف الدین نے عرض کیا

''اول تختہ بندگی مخدوم بدست مبارک نویسد' بندگی مخدوم عظمۃ اللہ اجابت فرمود بدست مبارک ایں چہار حرف بہ نشست اب ت ث بعدہ اورا ہمیں چار حرف تعلیم کرد۔''

البتہ یہاں طریقہ تلقین میں ذرا سا فرق ہے یعنی مخدوم الملک نے اس کے بعد خواہرزادہ قاضی کو کہا۔

''بگو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان یسرک۔'' (اللہ الرحمٰن الرحیم کے نام سے کہ علم کو تجھ پر آسان کرے)''

بچہ نے

''بسم اللہ تمام گفت بعدہ اں چہار حرف تعلیم تلقین فرمود۔''

اور بچہ سے صرف چار حروف ہی بسم کے ساتھ ادا نہیں کرائے گئے بلکہ

''ان یسرک نیز چنانچہ بندگی مخدوم تعلیم فزودہ ہمچناں حروفہا را بگفت۔''

واللہ اعلم خود بچے نے سب کے ساتھ اسے بھی ادا کر دیا یا ادا کرایا گیا' مکتب کی رسم ادا ہوگئی۔

''بعدہ برلفظ مبارک راند کہ ''الحمد للہ'' وایں دعا در حق وے ارزانی فرمود کہ حق تعالیٰ ترا عالم گرداند۔''

بچہ کا مکتب ختم ہوگیا۔ اب بڑوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ اسی مناسبت سے حضرت والا نے انسانیت کی ان بلندیوں کی طرف اشارہ فرمایا جو آدمی زادہ کو تعلیم عطا کرتی ہے' فرمایا عجب بات فرمائی۔

''ازاالف تا باوتا کجا بائید رسانید۔''

خود جو یہ کہہ رہا تھا' اسی الف تا بانے دنیا اور دین کی مخدوم الملکی کے کس مقام تک اسے پہنچایا کہ ابوالفضل جیسا طاغی بھی ان کے ترجمہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہا۔

''فراواں تصنیف او دیادگار ازاں میان مکتوبات او در سرشکنی نفس آزموں دارد۔'' (جلد 3 صفحہ 172)

شیخ محدث نے تو بجائے تعارف کے یہ ارقام فرما کر

''وے از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند اوراتصانیف عالی ست۔'' (صفحہ 117)

اور صرف چند مکاتیب کو نقل کر کے بجائے بگوئد کے مشک کے لیے یہ بوید کے تجربہ پر ان کے فضائل کو محول کر دیا۔

مکتب کے اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلطان المشائخ کی مجلس میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حسب دستور مکتب کے بعد دعوت یا مٹھائی وغیرہ کوئی چیز تقسیم ہوئی یا نہیں' غالب گمان یہ ہے کہ یہ رسم ادا ہوئی ہوگی۔ امیر حسن علاء نے ذکر نہیں فرمایا لیکن مخدوم الملک کے جامع ملفوظات نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں

''طعامے نیز آوردہ بودند پیش یاراں کشیدند و یک کاک (بسکٹ) وقدرے شیرینی بندگی مخدوم بستد وہماں پسرک راخورانیدن گرفت وایں لفظ فرمود کہ ''ماخدمت تو کنم۔'' (معدن المعانی۔ صفحہ 42)

ہر پہلی نسل پچھلی نسل کی خادم ہے۔ گویا اسی نظریہ کی طرف گو مزاحاً سہی اشارہ تھا رحم اللہ اجمعین۔ شاید اس بہاری مخدوم کے اس بہاری خادم کی غرض اپنی بکواس سے بھی یہی ہو۔ **اللھم ارزقنا اتباعھم وتقبل منا انک انت السمیع العلیم ھذا واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین**

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

17 ربیع المنور 1361ھ پنجشنبہ

حیدر آباد دکن' جوار الجامعۃ العثمانیہ

دعائے خاتمہ

کتابوں میں ''خاتمہ'' لکھنے کا بھی عام دستور ہے۔ جب میرے اس مضمون نے کتاب ہی کی شکل اختیار کر لی تو یہ رسم بھی کیوں چھوڑی جائے لیکن کیا لکھوں؟ بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ دیباچوں یا تمہیدی کلام ہی میں ان کے مصنفین کتاب کے ناظرین سے صلہ کی خواہش خواہ وہ کسی شکل میں ہو' مثلاً دعا ہی کی آرزو اپنے لیے' اپنے والدین کے لیے کرتے ہیں مگر بظاہر میرے خیال میں یہ استدعا کچھ قبل از وقت ہے' حقیقی مقام اس کا خاتمہ ہی ہوسکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد اگر کسی کو اس کتاب سے یا اس کے کسی جز سے کسی قسم کا کوئی فائدہ محسوس ہوا ہو تو غالباً اس کے بعد ''دعاء ظہر الغیب'' کی تمنا بے جا نہ ہوگی۔ اسی بنیاد پر اب میری التجا ہے کہ خود مجھے' میرے والدین مرحومین اور میرے اساتذہ کرام کو ناظرین حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعاؤں سے محروم نہ فرمائیں گے۔ علی الخصوص عم محترم استاذ معظم حضرت مولانا الحکیم الحاج السید محمد ابوالنصر الگیلانیؒ جن کی آغوشِ تربیت میں فقیر کی تعلیم ہوئی اور سلامت روی کی راہ کا بڑا حصہ ان ہی کی پاک صحبتوں میں میسر آیا' فاتحہ خیر سے ان کی روح پُرفتوح کو سکون بخشیں گے۔

اللہ ارحمہ کما ربیانی صغیرا

اسی کے ساتھ آخر میں اپنے عزیز دوست وصاحب مولوی محمد مخدوم محی الدین صاحب حیدرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ خود اپنی طرف سے اور ان تمام لوگوں کی طرف سے ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں جو اس کتاب کو اپنے مطالعہ سے سرفراز فرمائیں گے۔ مخدوم صاحب نے بڑی جانکاہی اور محنت سے میرے مسودہ (نامہ سیاہ) کو سچ پوچھیے تو بیضہ (نامہ سفید) کی شکل میں بدل دیا ہے۔ اگر ان کی دستگیری میسر نہ آتی تو جس طرح میرے بہت سے مسودے مسودوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے' اس کا حال بھی یہی ہو جاتا۔ ناظرین اپنی دعاؤں سے ان کو بھی اور ان کے والد مرحوم کو فراموش نہ فرمائیں گے۔

غالباً خواہد کشود از خامہ ام کارے کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح آمیں می دمید

(عارف شیرازی)

26 ذی الحجہ 1361ھ یکم اسفندیار 1352ف

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔ آج 4 جنوری 1943ء وروز دوشنبہ بعد الظہر اپنے وطن گیلانی (بہار) میں اس بیضہ کی نظر ثانی سے فراغت میسر آئی۔

کہف الایمان ''گیلان'' (بہار)

حواشی

(1) ایک کام قریب قریب اسی نوعیت کا ہندوستان کے جنوبی علاقہ احمد نگر میں مولانا عبد النبی احمد نگری نے ''دستور العلماء'' نامی کتاب کے ذریعہ سے دیا ہے، جس کے بعض اقتباسات کا ذکر اس کتاب میں بھی میں نے کیا ہے۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے مدت ہوئی یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

(2) یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ مولانا شبلی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ لکھا ہے۔ آذر کیوان ہندوستان آیا' عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی اور 1027ھ میں 85 سال کی عمر پا کر مر گیا۔ (صفحہ 17) مجموعہ مقالات

(3) بداؤنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک عالم میاں الہ داد نامی رہتے تھے۔ فقہ' اصول فقہ میں بڑی دستگاہ تھی' ملا عبد القادر ان سے لکھنؤ میں خود بھی ملے ہیں۔ انہوں نے ملا صاحب کو اپنی مصنفہ چند کتابیں دکھائیں جس میں ایک کتاب کی خصوصیت یہ تھی۔ ''رسالہ کہ ارفلول چہاردہ سطر و از عرض ہماں قدر سطور بجدول نوشتہ بودند و احکام و مسائل چہاردہ علوم ازیں استخراج می یافت۔'' (صفحہ 86) یعنی لکیریں کھینچ کر انہوں نے طول اور عرض دونوں میں چودہ چودہ سطریں ایسے الفاظ میں لکھی تھیں کہ ان سطروں کے ایک ایک خانہ سے طولاً و عرضاً چودہ علوم کے مسائل پیدا ہوتے تھے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ دو چیزوں میں ایک غریب اور نادر چیز تو ان کے پاس یہ دیکھی اور کوئی شبہ نہیں کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے ایسی عبارت بنانا کہ ایک طرف سے مثلاً طول کی طرف سے پڑھیے تو ایک فن کا مسئلہ ہو اور عرض کی طرف سے پڑھیے تو دوسرے فن کا' یوں ہی ایک ایک خانہ کو چھوڑ کر پڑھتے چلے جایئے' الگ الگ فن کے مسائل کی وہ عبارت بنتی چلی جائے گی۔ یہ عبارتی عجائب نگاری کا ایک دلچسپ کمال ہے اور میرے خیال میں آذر کیوان کے کام سے کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ دوسری چیز ''یقطون'' نامی ان کی ایک اور کتاب تھی۔ لکھا ہے کہ ''مثل مقامات حریری داشت'' مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا کمال یا غایت تھی' البتہ ایک اور کتاب کا جو ذکر کیا ہے کہ وہ نحو میں تھی' جس عبارت میں مسئلہ بیان کیا گیا تھا' وہی عبارت مثال کا کام بھی دیتی تھی لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ اس میں میاں اللہ داد کو تفرد و تقدم حاصل نہیں ہے۔ اسی ہندوستان میں نحو کا ایک ''متن'' اسی صنعت میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی لکھ چکے تھے جس کا نام ''ارشاد'' ہے' وہ چھپ بھی چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہو کیونکہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے کہ میاں اللہ داد کے بنی اعمام کہتے تھے کہ ''رسالہ چہاردہ علمی و قیطون تصنیف حکیم زبرتی ست کہ در جونپور آمدہ با قاضی شہاب الدین مشہور معاوضہ نمودہ۔'' کیا تعجب ہے کہ یہی حال نحو کے اس متن کا بھی ہو۔ ملا عبد القادر کو اس کی خبر نہ ہو۔ علامہ شرف الدین اسمٰعیل پشاوری کے رسالہ ''عنوان الشرف'' میں اسی طرز سے فقہ' صرف' نحو' عروض چار فن لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بھی یہ رسالہ طبع کیا گیا ہے۔

(4) چند سال ہوئے کہ مسٹر ظریف نامی ایک صاحب نے اسلام اور مذہب کے خلاف میں ایک سخت کتاب لکھی تھی' جس کے متعلق ہنگامہ بھی سخت ہوا تھا۔ مولانا عبد الباری ندوی فرماتے تھے کہ مسٹر ظریف کشمیر میں تھے' میں بھی وہیں تھا۔ کانپور کی مسجد مچھلی بازار والی کا قضیہ اسی زمانہ میں پیش آیا تھا۔ میں نے مسٹر ظریف کو دیکھا کہ جو لوگ اس مسجد کے سلسلہ میں شہید ہوئے تھے' ان سے ہمدردی کرتے ہوئے حکومت کے خلاف سخت لعن طعن کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو جب اسلام ہی سے انکار ہے تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ بولے کہ واہ تو کیا میں فوجی حیثیت سے بھی مسلمان نہیں ہوں۔ مذہبی حیثیت سے مجھے ہمدردی نہ ہو لیکن قومی حیثیت سے تو

میرا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے اور مسجد سے بھی۔

(5) مغل سلاطین سلاطین ترک کو ''اخوندروم'' ہی کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے امیر پر الزام بھی لگایا تھا کہ اندرونی طور پر اخوند روم سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مجدد الف ثانی کے مقالہ میں خاکسار نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(6) حال میں ایک مضمون مولانا ابوالاسرار رمزی کے قلم سے مجلہ ''ندائے حرم'' میں شائع ہو رہا ہے۔ میں مولانا سے شخصاً واقف نہیں ہوں لیکن ادھر چند دنوں سے انہوں نے اپنی شعریت کا استعمال جس پاک مقصد کے لیے شروع کیا ہے' اس کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان شاء اللہ مستقبل ان سے مستفید ہوگا۔ ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔'' کہنا یہ ہے کہ ''ندائے حرم'' کے اسی مضمون میں ''گرائمر آف لینگویج'' نامی کتاب سے جو کسی نصرانی کی ہے' آپ نے ایک بڑا اچھا فقرہ یہ نقل فرمایا ہے۔ ''درحقیقت انسانی زبانوں میں یہ (عربی زبان) سب سے زیادہ قابل انتقال اور مالدار زبان ہے۔'' اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ منجملہ اور دلائل کے عربی زبان کی مالداری کا ایک ثبوت ہندوستانی نظام تعلیم کا ایک ''نمایاں ثمرہ'' فیضی کی تفسیر میں بھی ہے۔ پچھتر جزوں کی کتاب میں سارے جہان کی تفسیری معلومات کا غیر منقوط الفاظ میں ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

(7) ملک العلماء کا خطاب ان کو جونپور کی حکومت شرقیہ کی طرف سے ملا تھا' دتی میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے لکھا ''تولداو دولت آباد دہلی ست۔'' معلوم ہوتا ہے دتی میں دولت آباد نامی کوئی محلہ تھا' ملک العلماء مولانا خواجگی دہلوی کے شاگرد ہیں جو چراغ دہلوی کے اجلہ خلفاء میں تھے۔ کہتے ہیں کہ مولانا خواجگی نے قاضی شہاب الدین کے متعلق طالب العلمی کے زمانہ میں فرمایا تھا ''بہ پیش من طالب العلمے آمد کہ پوست او علم مغزو او علم' استخوان او علم ست' یہ تھی اس زمانہ کی سند اور اس عہد کا ڈپلومہ جو اساتذہ اپنے خاص خاص طلبہ کو دیا کرتے تھے۔ فیروز تغلق کے بعد دتی کے تخت پر عموماً نالائق جانشینوں کا قبضہ ہوا تا اینکہ ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہوگیا۔ تیمور نے موقع کو خالی پا کر حملہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس حملہ کی اطلاع حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز صاحب گلبرگہ قبل از قبل دے چکے تھے جو دتی چھوڑ کر بہمنیوں کی حکومت میں جو دکن میں قائم تھی' چلے آئے۔ کچھ لوگ جونپور کی حکومت کی طرف چلے گئے۔ قاضی شہاب الدین جونپور جانے والوں میں تھے۔ وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ قضا کا عہدہ سپرد ہوا اور ملک العلماء کا خطاب ملا۔ عربی زبان میں مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں جیسا کہ محدث دہلوی نے لکھا ہے ''در حیات او مشہور عالم گشتہ۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کا اس زمانہ میں کیسا نظم تھا۔ جونپور میں کتاب لکھی جاتی ہے اور ترکستان میں جامی اس پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی ایک تفسیر ''بحر مواج'' فارسی میں ہے۔ نظر سے گزری ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شرح ملا جامی دراصل دولت آبادی کی شرح کا ایک نسخہ ہے لیکن میں نے خود ہندی کی شرح نہیں دیکھی ہے' اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(8) کتابوں کے ساتھ عقیدت مندی کبھی حد سے گزر جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ''مفتاح السعادۃ'' میں لکھا ہے' کان شمس الدین شیخ الربوۃ المعروف بابن ابی طالب یقول زعم بعضہم ان المقامات وکتاب کلیلہ ودمنہ رموز فی الکیمیا'' یعنی مقامات حریری اور کلیلہ ودمنہ دراصل کیمیا کی کتابیں ہیں۔ گلستاں کے متعلق بھی بعضوں کا یہی خیال ہے۔

(9) کچھ عجیب بات ہے کہ بہار باوجودیکہ دارالسلطنت سے کافی فاصلہ رکھتا تھا لیکن عموماً بادشاہی خاندان کے اساتذہ میں ہم بہار کے علماء کو پاتے ہیں۔ عالمگیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ عالی گوہر کے استاد مولوی سراج الدین صاحب کے متعلق تذکرہ ''صبح گلشن'' میں لکھا ہے۔

''متوطن فرید پور کہ بہ فاصلہ شانزدہ کردہ از عظیم آباد ست وایں مولوی سراج الدین احمد شاہ عالم عالی گوہر بادشاہ دہلی را استاد بود۔''

زیب النساء کے استاد ملا سعید کے متعلق بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مونگیر میں مدفون ہیں۔ ''ماثر الامراء'' میں ہے کہ سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے خلفاء کا مقدمہ حکومت دہلی کے سامنے پیش ہوا تو فیصلہ کے لیے ملا بدھ حقانی بہاری کے پاس مقدمہ بھیجا گیا۔ واللہ اعلم کیا بات تھی خود سید محمد جونپوری کو لوگ جونپور کا بتاتے ہیں لیکن ان کے واقعات وحالات میں داناپور کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے جو پٹنہ کا گویا ایک محلہ ہے' ان کے تذکروں میں لکھا ہے کہ دعوئے مہدویت سے پہلے اسد العلماء کا خطاب ان کو داناپور کے علماء نے دیا تھا۔ خود سید صاحب کے صاحبزادے سید محمود جن کی قبر گجرات میں ہے' سارا گجرات ''بہاری پیر'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہی چیز شک میں ڈالتی ہے کہ مہدیوں کا مقدمہ ملا بدھ حقانی کے پاس بہار کیا اسی تعلق سے بھیجا گیا کہ سید محمد صاحب کا حقیقی وطن بہار ہی تھا۔ شرقیوں کی

حکومت جب جونپور میں قائم ہوئی تو مقبوضہ رقبہ کے تمام باشندوں کو لوگ جونپوری ہی کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ صاحب ''شمس بازغہ'' ملا محمود جونپوری کے نام سے مشہور ہیں۔ حالانکہ ان کا اصلی وطن ولید پور ضلع اعظم گڑھ تھا' ہوسکتا ہے کہ سید محمود کو اسی بنیاد پر بجائے بہار کے جونپور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔ ملا الہداد ''ہدایہ'' اور ''بزدوی'' کے مشہور شارح ومحشی بھی عموماً الجونفوری کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن ملا جیون نے اپنی ''تفسیرات احمدیہ'' کے دیباچہ میں غالباً ان ہی کو الشیخ الہداد البہاری کی نسبت سے ذکر کیا۔ (صفحہ 7) دیباچہ ''تفسیرات احمدیہ'' میں ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ سید محمود جونپوری کے والد کا نام بھی بدھ بتایا جاتا ہے اور اسی زمانہ میں بہار میں ملا بدھ نامی ایک مشہور عالم گزرے ہیں یعنی شیخ محدث نے لکھا ہے کہ وہ ''فصوص الحکم'' اور وحدت الوجود صوفیانہ خیالات کے سخت مخالف تھے اور یہ وہی ملا بدھ ہیں جن کی جوتیاں شیر شاہ سوری اپنے ہاتھ سے ملا صاحب کے سامنے سیدھی کیا کرتا تھا۔ (دیکھیے اخبار الاخیار۔ ذکر شیخ حسن طاہر۔ صفحہ 195)

(10) خیال آتا ہے کہ میں نے ان ہی صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کسی کلام میں مطلب کو یوں ہی باہر سے داخل کیا جاسکتا ہے تو پھر داغ مرحوم کا سب سے افحش ترین شعر

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک   مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

کے متعلق دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں تیمم کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے یعنی حور حوراء کی جمع ہے' حوراء حواری سے مناسبت رکھتا ہے۔ حواری ماہی گیر تھے۔ ماہی گیروں کو پانی سے لزومی تعلق ہوتا ہے۔ پس لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا یعنی پانی کا حشر تک سے یہ مراد ہے کہ آفتاب اتنا جھک جائے کہ نیزہ سوا نیزہ کے قریب آجائے۔ عصر کا وقت جب اتنا تنگ ہو جائے تو پانی کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ شباب یعنی وقت کے بھڑ کاؤ کا وقت جب ہو' جوانی کی طرح فانی نظر آ رہا ہو تو مٹی پر ہاتھ رکھ کر تیمم کر لینا چاہیے۔

(11) خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ شاہ کلیم اللہ کو مدینہ منورہ میں خواب کے اندر ذات ختمی مآب کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس مجلس میں ایک شخص کو دیکھا کہ ''حضرت باولب تبسم شیریں کردہ حرفہامی زنند والتفات تمام دارند'' سے معلوم ہوا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی ہیں۔ کتاب ''سبع سنابل'' ان کی مقبول ہوئی ہے۔ میر صاحب کی عمر سو سال سے متجاوز تھی' کہتے ہیں کہ ''یکے از کفار جینان'' بر دست حضرت میر بدولت اسلام مشرف اندوز شد۔ (مآثر۔ صفحہ 31)

(12) یہ واقعہ ہے کہ اکبر اور دارا شکوہ کے ذریعہ سے اسلام کا حشر قریب تھا کہ اس برہمن کدہ میں وہی ہو جائے جو بدمست کے ساتھ حادثہ پیش آیا لیکن حضرت مجدد کی روحانی اور اورنگزیب کی سیاسی قوت نے اس قیامت کو برپا ہونے سے روک دیا اور ان شاء اللہ خدا کی غیبی تائیدوں کا یہ سلسلہ بند نہ ہوگا۔

(13) پچھلے بزرگوں خصوصاً حضرت مجدد شاہ' ولی اللہ' مولانا اسمٰعیل کے متعلق شاید عام لوگوں کو بھی واقفیت ہو۔ اگرچہ مولانا اسمٰعیل کی ''عبقات'' نامی کتاب باوجود مطبوع ہونے کے لوگوں تک نہ پہنچ سکی۔ اس لیے کہ اس کتاب کی منزلت کا اندازہ نہ ہوسکا۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ فن تصوف کو پہلی دفعہ اس کتاب میں فن کی صورت بخشی گئی ہے۔ باقی سلف کے جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہے' کچھ نہیں تو ''اخبار الاخیار'' محدث دہلوی میں ان کے کلام کے چند نمونے جو درج ہیں' وہی دیکھ لیے جائیں۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاریؒ کے متعلق ایک واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر فلسفہ مولانا عبدالباری ندوی جو اسلامی ومشرقی فلسفہ کے سوا اس وقت مغربی فلسفہ کے بھی مستند علماء میں ہیں۔ مدت تک مغربی فلسفہ کی کتابیں ایم اے تک جامعہ عثمانیہ میں آپ پڑھاتے رہے ہیں۔ جدید فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے اور مستقل کتابیں آپ نے جو لکھی ہیں' ان کی تعداد نصف درجن کے شاید قریب قریب ہو جو دارالترجمہ سرکار عالی ودار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہو چکی ہیں۔ بہرحال مولانا عبدالباری صاحب کو ایک دن میں نے شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکاتیب پڑھنے کے لیے دیئے۔ پڑھنے کے بعد کتاب جب انہوں نے واپس کی تو دیکھا کہ بیسیوں جگہ سرخ پنسل کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا' یہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کے کلام میں سطر دو سطر نہیں صفحے کے صفحے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا موجودہ زمانے کے مغربی مفکرین کی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہے۔ کانٹ' ہیگل' برکلے' ہیوم' از قبیل فلاسفہ جدید کے نظریات جن پر موجودہ فلسفہ کو ناز ہے' شاہ صاحب کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے بطور یادگار کے اس نسخہ کو اپنے کتب

خانہ کے تبرکات میں شریک کر لیا ہے۔ شاہ شرف الدین یحییٰ منیری حضرت سلطان المشائخ کے معاصرین میں ہیں۔ آپ کی مستقل سوانح عمری ''سیرۃ الشرف'' کے نام سے مولوی ضمیر الدین احمد مرحوم بہاری سابق چیف سیکرٹری بیگم صاحبہ بھوپال نے بڑی جانکاہی سے مرتب کر کے شائع کر دی ہے۔ غالباً صوفیائے ہند کے حالات میں عصری رنگ میں ''سیرۃ الشرف'' پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریزی خواں طبقہ کے فاضل نے مرتب کیا۔ بعض مکاتیب کا حضرت کے انگریزی میں غالباً مسز سروجنی نائڈو نے بھی ترجمہ کیا ہے' مزارِ پُر انوار قصبہ بہار شریف میں ہے۔

(14) ملا محب اللہ بہاری سے تو خیر کون ناواقف ہے' بقول مولانا شبلی مرحوم جس نے دو ڈھائی صدی تک اسلامی نصاب کی نصف کتابوں کو اپنی سلم و مسلم کے نیچے دبائے رکھا' باقی حافظ امان اللہ بنارسی سے اب لوگ غالباً کم واقف ہیں۔ اپنے وقت میں مشاہیر مدرسین میں ان کا شمار تھا۔ بیضاوی' عضدی' تلویح' شرح مواقف' شرح حکمت العین' شرح عقائد جلالی تقریباً اکثر درسی کتابوں پر ان کے قیمتی حواشی ہیں۔ محکم الاصول فقہ میں ایک مستقل متن ان کا بھی ہے۔ مسلم میں بھی ملا محب اللہ نے محکم پر چوٹیں بھی کی ہیں۔ حافظ صاحب نے میر باقر اور ملا محمود جونپوری کے درمیان مسئلہ دہر پر محاکمہ بھی لکھا ہے۔ دوانی کے قدیم و جدیدہ پر بھی ان کے حواشی ہیں۔ رشید مناظرہ کی کتاب پر تنقید بھی لکھی ہے۔

(15) تعمیرات' نباتیات' فلاحت' پارچہ بافی' طباخی اور سب سے زیادہ فنون حرب میں ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس کی نظیر دوسرے ممالک میں مشکل سے ملتی ہے۔

(16) اہل علم کے لیے یہاں ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ صوفیا اسلام کے متعلق ایک چیز کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے یعنی کسی قسم کے اشعار ہوں' ان میں مے و معشوق ہی کا ذکر کیوں نہ ہو لیکن اس شر سے بھی وہ خیر نکالنے کے عادی ہو گئے تھے اور یہ ایک عام رواج عربی اور فارسی دونوں قسم کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ اسی مشق نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ بعض دفعہ بازار کے صدا لگانے والوں کی صدا پر بھی ان کو حال آ جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ بغداد کے بازار میں ککڑی بیچنے والا ککڑیاں بیچتے ہوئے یہ صدا لگا رہا تھا ''عشر خیار بدانق'' دس ککڑیاں ایک پیسہ میں' عربی میں خیار ککڑی کو بھی کہتے ہیں اور نیک لوگوں کو بھی' حضرت جنید یا شبلی بھی اُدھر سے گزر رہے تھے' کان میں یہی صدا آئی' چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے' پوچھا گیا کہ کیا ہو گیا تھا' بولے کہ بھائی خیال گذرا کہ جب ایک پیسہ میں دس نیک بکتے ہیں تو بروں کا کیا حال ہوگا۔ بس اسی کا خیال آ گیا' طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اب ظاہر ہے کہ ان کی غرض یہ قطعاً نہ تھی کہ بیچنے والے کا مقصد ککڑیوں کے نیک لوگ ہیں بلکہ ان کا ذہن نیک لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ گو ایسا کم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بعض قرآنی آیات یا احادیث سے ان بزرگوں کا ذہن کسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور زبان یا قلم سے کبھی وہ نکل بھی گیا ہے لیکن حاشا وکلا ان بزرگوں کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ یا اللہ کے رسول کی بھی یہی غرض ہے۔ اپنے اس ذہنی انتقال کا انہوں نے نام بھی رکھ دیا ہے یعنی اعتبار اور ''الاشارہ'' کہتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی اس اصطلاح یا طرز عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے کبھی کبھی ان پر بھی فرقہ باطنیہ کی جیسی باتوں کا شک گزرتا ہے لیکن جب وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اسے مراد حق نہیں کہتے تو پھر باطنیوں کے طریقہ کار اور ان کے طریقہ عمل میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ باطنیوں کی کتابیں عام طور سے نہیں ملتیں لیکن بازاروں میں ایک تفسیر شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے نام سے مشہور ہے جو دراصل اسی قسم کے ایک گمراہ کاشانی نامی کی کتاب ہے۔ نمونہ دیکھنا ہو تو اسے دیکھ سکتے ہیں۔ ہر آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے۔

(17) ''حدائق الحنفیہ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ کی مکتوبہ سطروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہے۔

(18) ''مآثر الامراء'' دیکھیے' خود فتح اللہ شیرازی خان اعظم ان لوگوں کا شمار تو اس فن کے نوابغ (جینئیس) میں ہے۔

(19) ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں عہد اکبری کے نصاب کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اور چیزوں کے ساتھ حساب و ریاضی کا بھی ذکر ابتدائی مکتبی تعلیم کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

ختم شد

اُردو ادب ـــــ تاریخ و تنقید ـــــ شاعری

- اسلامی معاشیات — سید مناظر احسن گیلانی
- حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی — سید مناظر احسن گیلانی
- بوستانِ سعدیؒ — مترجم: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
- گلستان سعدیؒ — ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
- کلیاتِ سودا — مرزا محمد رفیع سودا
- کلیاتِ ظفر: ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ (مکمل چار جلد) — بہادر شاہ ظفر
- کلیاتِ میر — میر تقی میر
- کلیات میراجی (ترمیم اور اضافوں کے ساتھ) — ڈاکٹر جمیل جالبی
- کلیات شکیب جلالی — شکیب جلالی
- کلیات داؤد رہبر — داؤد رہبر
- کلیاتِ آتش — خواجہ حیدر علی آتش
- کلیاتِ فانی — شوکت علی خاں فانی بدایونی
- اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (ستائیسواں ایڈیشن) — ڈاکٹر سلیم اختر
- اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ تک — ڈاکٹر تبسم کاشمیری
- تاریخ ادب اُردو — رام بابو سکسینہ، مرزا محمد عسکری
- پنجاب میں اُردو (حافظ محمود شیرانی) — محمد اکرام چغتائی
- گذشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر) — محمد اکرام چغتائی
- امیر خسرو کا ہندوی کلام — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- اُردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

طلسم ہوشربا
ترجمہ داستان: امیر حمزہ صاحبقران
(۸ جلد)

فسانۂ آزاد
پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۴ جلد)

سیرِ کہسار
پنڈت رتن ناتھ سرشار

باغ و بہار
(۱۸۵۱ء)
میر امن دلّی والے، ڈنکن فاربس

www.sang-e-meel.com

Rs. 1200.00

ISBN-10: 969-35-2123-4
ISBN-13: 978-969-35-2123-8
9789693521238